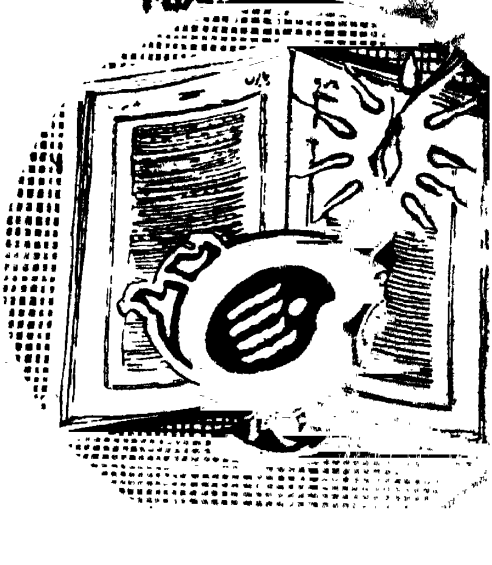
ہمایوں

جنوری ۳۶ء



ایڈیٹر: بشیر احمد بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں بی۔ اے

جلد (۲۹) نمبر (۱)

سالگرہ نمبر ۱۹۳۶ء
قیمت بارہ آنے

فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہِ جنوری ۱۹۳۶ء

تصاویر — (۱) روح اور بدی (رنگین) (۲) ہٹلر (۳) مسولینی (۴) حسنِ بلوریں (۵) فطری تناسب (۶) مصنوعی تناسب (۷) جھولا (۸) قہقہہ (۹) بچپن (۱۰) بڑھاپا۔

چندہ سالانہ مع سالگرہ نمبر ۶ؔ — ششماہی ۳ؔ مع محصول — قیمت سالگرہ نمبر ۱۲ؔ

کلامِ ہمایوں

میخانہ ایسا چاہیئے ہم مشربو! جہاں
کوئی نہ مست ہو نہ کوئی ہوشیار ہو

پیمانۂ شکستہ کے ٹکڑے ہوں منتشر
ساقی نہ ہو نہ مے نہ کوئی بادہ خوار ہو

پیرِ مغاں کے گرد ہو اک انجمن لگی
عقلِ جواں بھی جان سے جس پر نثار ہو

روشن ہو نور سینے میں اک شمع کی طرح
قربان اُس پہ دِل مرا پروانہ وار ہو

حضرتِ ہمایوں (مرحوم)

بزمِ ہمایوں

پانچ چھ ہفتے ہوئے مدیر ہمایوں ۱۹۳۵ء کے بہت سے اُردو رسائل کے پرچے اپنے ارد گرد پھیلائے دیکھ رہا تھا کہ اس سال میں اردو زبان کو کتنی ترقی ہوئی اور کتنا تنزل اور اس ترقی و تنزل میں "ہمایوں" کا کتنا حصہ ہے؛ گھنٹوں گزر گئے آخر طبیعت اِس دفترِ بے معنی سے تنگ آ گئی اُٹھا نیچے اُترا باہر نکلا اور جلد جلد ٹہلتے ہوئے کتابوں کی ایک دکان میں جا پہنچا۔ تازہ ترین کتابوں کی الماری کے سامنے جا کر کھڑا تھا کہ معًا اس کتاب پر نظر جا پڑی :-

"کاہلی کی تعریف میں" *In Praise of Idleness*

برٹرنڈ رسل *Bertrand Russell*

فوراً باچھیں کھل گئیں۔ رسل اُس کے نزدیک دُنیا کے عظیم ترین فلسفی مفکروں میں تھا، رسل نے کاہلی کی تعریف کی ہے! خدا کا شکر ادا کیا کہ قدرت نے ایک ایسے مشہور و معروف فلسفی کے ذریعے سے ہماری زندگی کی داد دی ہے۔ فوراً کتاب خرید لی۔ پہلا مضمون تو وہی تھا "کاہلی کی تعریف میں"، دوسرا بھی ماشاءاللہ تھا "بے سود" علم، سیاسی ہند کی مصروف دُنیا میں اُردو ادیبوں کے علم کو عموماً "بے سود" کہا جاتا ہے، سو اس سے بھی تسلی ہوئی اور دل نے اپنے آپ سے باآوازِ بلند کہہ دیا کہ رسل واقعی دُنیائے حاضر کا سب سے عقلمند آدمی ہے جو طبیعی و تمدنی معلومات کے مقابل میں خالص ادبیات کے "بے سود" نظری و خیالی مضامین کی تعریف کرتا ہے۔

ہم عصر اجازت دیں تو مثال کے طور پر اُن کے بعض مضامین کی تقسیم یوں ہو سکتی ہے :-

مضامین

"بے سُود"	"سُود مند"	
ضرب الامثال اور اُن کے ماخذ	قاضی نذر الاسلام کی تین انقلابی نظمیں	(اُردو)
فلسفۂ جمال	کرۂ زمین	(ہندوستانی)
فلسفۂ ترقی	ہندوستان کا تعلیمی نصب العین	(جامعہ)
مکتوبات	ملاحظات	(نگار)
ہندی فنِ رقص	اُردو ہندی کا قضیہ	(زمانہ)
سسلی میں مسلمانوں کا تمدن	ترکوں کی تعلیمی حالت	(معارف)

دو ٹنگا جانور (ڈراما)
ڈرامے کے ڈھائی ہزار سال
بزمِ تحقیق
مشورہ (اصلاحِ زبانِ اُردو)
اُردو شاعری اور شراب
افسانہ اور حقیقت نگاری

پردہ اور بے پردگی (ساقی)
ہمارا ڈراما کدھر جا رہا ہے (ادبی دُنیا)
اصلاحات، ذاتیات، تعلیمات (شاہکار)
ایشیا کی بیداری اور ہندوستان (نیرنگِ خیال)
تلوار (عالمگیر)
پھوہڑ بیوی کی اکاون لاکھ علامتیں (ہمایوں)

لیکن اپنا اپنا مذاق اپنی اپنی پسند! ہم کاہلوں کو اگر "بے سُودوں" میں سُودمندی نظر آئے اور "سُودمندوں" میں محض بے سُودی تو اِن "پرچالاکوں" کو چیں بہ جبیں نہ ہونا چاہیئے۔ البتہ عہدِ حاضر کی ترقی کے نقطۂ نظر سے کہا جا سکتا ہے کہ اُردو ادب کی "سُودمندی" کی جانچ کرنے کا بہترین طریق یہ ہے کہ ترازو کے ایک پلڑے میں اِدھر والے دوسرے میں اُدھر والے مضامین کا انبار لگا کر دیکھ لیں کہ کونسا بھاری ہے ؛

بدقسمتی سے مدیرِ ہمایوں بھی باوجود خود رسل کا پیرو اور اُس کے تازہ ترین فلسفے کا عملی معتقد ہونے کے اپنے مضمون نگاروں اور خریداروں کو بجائے سُستی کے چُستی ہی کی تعلیم دیتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو؛ کہنا کچھ کرنا کچھ، یہ خود ساختہ ادیبوں کا پُرانا شیوہ ہے۔

ہرچند اکثر اوقات جی چاہتا ہے کہ اس موٹر کار کی دُنیا میں بیل گاڑی میں بیٹھ کر آہستہ آہستہ لہلہاتے کھیتوں کی سیر کریں لیکن مسولینی ہٹلر، کمال، سٹیلن، ہندو سبھا، مسلم لیگ دم بھر کو چین نہیں لینے دیتیں، بلکہ ستم ظریفی یہ کہ اُردو کا خالص "ادبی" رسالہ بھی نذر الاسلامی نظموں سے امن پسندوں کے قلبی اطمینان میں خلل انداز ہو جاتا ہے پھر ہمایوں تو ہمیشہ یہی "سودمند" نعرہ لگاتا ہے کہ دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا! زمانے کا ساتھ لازم ہے سو میر و سودا، غزل کے رجحانات، حقیقت نگاری نظموں غزلوں وغیرہ کی لُطف اندوزی کو کم کرو اور مشاہیرِ عالم و ہندوستان کا جدید دستُور اور موجودہ تعلیم اور ایسی ہی اور قلابازیوں کی طرف توجہ کرو کہ اب علم و ادب کو بھی خدا جانے کب تک تمدن و سیاست کا دست نگر ہو کر رہنا پڑے گا۔

اخیر میں ہم اپنے اِن "سُودمند" و "بے سُود" مضمون نگاروں کا دِلی شکریہ ادا کرتے ہیں :۔

(نثر نگار) حضرات: کیفی، فلک پیما، ادیب، سعادت حسن منٹو، فیاض محمود، عطاء اللہ کلیم، مہدی علی خاں، شمسی گاکوی، حمید احمد خاں، محشر عابدی، وقار عظیم، ماہر القادری، فہیم بیگ، تمنائی، صغیر احمد، طاہرہ دیوی، عثمانی، فاروقی، ابنِ مریم، حسن عباس، ابوسعید، وقار انبالوی، قریشی، بیگم محمد اسلم خان، محمد صدیق تائبی، طاہر قریشی، دوست محمد خاں، احمد وجودی، بابر بٹالوی، عبدالقادر جیلانی، باری، پرسرام۔

(شعراء) حضرات: جوش، احسن مارہروی، عدم، مقبول، اثر صہبائی، نشتر جالندھری، اکبر منیر، روش صدیقی، راشد وحیدی، صدق جائسی، جلال، ح ب صاحبہ، اختر شیرانی، نجیب، خیال، سروپ رانی نگار، اندرجیت شرما، امرچند قیس، رام پرشاد ناشاد، علی منظور۔

بشیر احمد

جہاں نما

اگر ۱۹۳۵ء پر ہم ایک طائرانہ نگاہ ڈالیں تو اُس کا نقشہ واقعات ہمیں یوں نظر آئے گا :-

جنوری فرانس اور اطالیہ کی مفاہمت
سار جرمنی کو واپس مل گیا

اپریل جرمن اسلحہ افزائی کا اعلان
انگلستان فرانس اور اطالیہ سٹریزا کانفرنس میں مشورہ کرتے ہیں۔

مئی فرانس اور رُوس کا عہد نامہ
حبشہ کے خلاف مسولینی کی فوجی تیاری

جُون انگلستان اور جرمنی کی بحری مفاہمت

جولائی اطالوی فوجیں حبشہ کو روانہ ہوتی ہیں
اگست انگلستان مجلسِ اقوام کے معاہدے کی حمایت کرتا ہے

اکتوبر اطالیہ حبشہ پر حملہ کرتا ہے
نومبر مجلسِ اقوام اطالیہ کے خلاف معاشی اقدامات نافذ کرتی ہے

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ۱۹۳۵ء کے اہم ترین واقعات دو ہیں :

۱۔ جرمن اسلحہ افزائی کا اعلان

۲۔ حبشہ پر اطالیہ کا حملہ

سال کے نصفِ اوّل میں ہم جرمنی کا شور و غل سُنتے رہے، سال کے نصفِ آخر میں اطالیہ کا یعنی پہلے ہٹلر! ہٹلر! ہٹلر! ہوتا رہا پھر مسولینی! مسولینی! مسولینی! دوسرے لفظوں میں یُوں کہئے کہ ۱۹۳۵ء پر فقط دو شخص قابض رہے :

ہٹلر اور مسولینی!!

سال کے شروع میں علاقہ سار کے متعلق مسئلہ درپیش ہُوا۔ ورسائی کے معاہدے کے مطابق سار کے علاقے پر جس میں کوئلے کی بہت سی کانیں تھیں کم از کم پندرہ سال کے لئے فرانسیسی قابض رہے۔ اب وہاں کے باشندوں کو اختیار دیا گیا کہ وہ چاہیں فرانس میں شامل ہو جائیں چاہیں جرمنی میں یا دونوں سے الگ رہیں۔ مدت سے ہٹلریوں کی کوشش تھی کہ یہ جرمن لوگ پھر جرمنی میں آکر شامل ہوں۔ اس سلسلے میں دو تین ماہ بہت بے چینی رہی یہاں تک کہ اہلِ سار نے فیصلہ کیا کہ وہ جرمنی کا جزو بنیں گے۔ یہ ہٹلر کی پہلی خارجی فتح تھی۔

اس کے تین ماہ بعد ہٹلر نے جرمنی کی اسلحہ افزائی کا اعلان کر دیا کہ اب جرمنی ایک کمزور ملک بن کر دُنیا میں رہنے پر تیار نہیں، وہ مساوات کا دعوے دار ہے۔ ورسائی کے معاہدے میں وعدہ کیا گیا تھا کہ تمام قومیں اپنی فوجی قوت کو کم کریں گی۔ جرمنی کے ہتھیار چھین لئے گئے لیکن دوسری قومیں جوں کی توں ہتھیار باندھے رہیں، اس پر کب تک عمل درآمد رہے گا؟ یہ ناممکن ہے کہ جرمنی دوسری آزاد قوموں کے درمیان گویا غلام بن کر زندگی گذارے۔ جرمنی کسی سے کچھ لینا نہیں چاہتا لیکن وہ مساوات اور اطمینانِ قلب ضرور چاہتا ہے اور عہدِ حاضر میں یہ چیزیں اُسی قوم کو میسّر آسکتی ہیں جو دوسروں کے برابر فوجی طاقت رکھتی ہو۔

فرانس اس دلیرانہ اعلان پر چیں بہ جبیں ہُوا۔ وہ مُدت سے جرمنی سے خائف تھا، جنگِ عظیم میں جرمنی کو شکست دے کر بھی وہ اُس سے ڈرتا رہا، اسی ڈر کی وجہ تھی کہ اُس نے جرمنی پر ایسی کڑوی صلح کی شرائط کا بار ڈالا مبادا جرمنی پھر جلد اپنا سر اُٹھائے اور اُس پر حملہ کر دے۔ جنوری میں فرانس نے اطالیہ کے ساتھ ایک سمجھوتا کیا۔ چند سال پہلے فرانس اطالیہ کو کبھی خاطر میں نہ

لاتا تھا، اطالیہ ایک معمولی سی طاقت تھی، لیکن اب مسولینی کی برانگیختگی اور ریشہ دوانیوں سے اُدھر اطالوی زیادہ دلیر اور ادھر یورپ کی مجلس میں اطالیہ کی سیاسی حیثیت زیادہ زبردست ہو چکی تھی۔ اب اُس کا ہمسایہ فرانس بھی اُسے عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگا اور جب جرمنی حد سے بڑھ کر قدم مارنے لگا اور فرانس کے دل میں خوف پیدا ہوا تو اس نے اطالیہ سے ہر طرح راہ و رسم بڑھانا شروع کیا۔ مسولینی نے کہا ہاں ہم جرمنی کی گستاخی کا سدِ باب کریں گے لیکن لاؤ ہمیں کیا دیتے ہو؟ جنگ عظیم کے خاتمے پر تم لوگ لوٹ مار کا سب مال سنبھال بیٹھے ہمیں کچھ بھی نہ دیا، اب ہماری حبشہ پر نظر ہے کہو کیا کہتے ہو؟ فرانس یہ سن کر پہلے خاموش رہا پھر مسکرا دیا۔ دونوں نے مصافحہ کیا اور یوں یہ مفاہمت ہو گئی + اپریل میں جرمن اعلان کے بعد انگلستان فرانس اور اطالیہ نے سٹریزا کے مقام پر ایک کانفرنس منعقد کی۔ مغرب کے متعلق تو جرمنی نے لوکارنو کے عہد نامے میں (۱۹۲۴ء میں) کہہ دیا تھا کہ مجھے نئی سرحد منظور ہے میں فرانس سے آلساس لورین واپس لینے پر مُصر نہیں لیکن اپنی مشرقی حدود کے متعلق اُس نے سمجھوتا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ دراصل جرمنی یہ چاہتا تھا کہ اب جب کہ فرانس مجھ سے آلساس لورین کے علاقے لے چکا ہے تو اُسے معترض نہ ہونا چاہیے اگر میں وسطی و مشرقی یورپ میں اپنے غصب شدہ علاقوں کو پھر اپنا بنا لوں۔ لیکن فرانس، مغرور فرانس، خائف فرانس ہر طرح ہر طرف جرمنی کی طاقت کا سدِ باب کرنا چاہتا تھا چنانچہ سٹریزا کانفرنس میں اُس نے دوسری دونوں دول کو اس بات پر متفق کر لیا کہ جس طرح لوکارنو کے عہد نامے سے ورسائی کے عہد نامے والی مغربی حدود محفوظ ہو گئیں اُسی طرح ایک مشرقی عہد نامہ مرتب کیا جائے جس کے ذریعے سے ورسائی والی مشرقی حدود بھی محفوظ کر دی جائیں، نیز یہ دیکھ کر کہ نازی جرمنی آسٹریا کو اپنی سلطنت میں شامل کرنا چاہتا ہے یہ قرار پایا کہ تینوں دول آسٹریا کی خود مختاری کے قیام و استحکام کی ہر طرح ذمہ دار ہیں + فرانس کی تجویز پر جنیوا میں مجلس اقوام نے جرمنی کے اعلان پر احتجاج کیا۔ ہٹلر نے جواب میں جرمنی میں ایک عظیم الشان جلسہ کر کے اس احتجاج کو بے معنی قرار دیا۔ فرانس کا جواب الجواب یہ تھا کہ اُس نے رُوس کے ساتھ باہمی امداد کا ایک معاہدہ کر لیا، وہی رُوس جسے اب تک مکروہ و ملعون سمجھا جاتا تھا اب سب سے "مہذب" قوم کا حلیف بن گیا، سیاست میں شرم کو دخل نہیں وہاں تو وقت وقت کی پہچان ہے کہاں اعلیٰ سیاست کہاں نام نہاد اخلاق؛ اُدھر جرمنی کی چالاکی بھی کسی سے کم نہ تھی اُس نے انگلستان سے ساز باز شروع کیا اور بحری طاقت کے متعلق دونوں پرانے رقیبوں میں ایک مفاہمت ہو گئی۔ فرانس نے اسے ناپسند کیا مگر اپنا اپنا مطلب اپنی اپنی پسند، کوئی کسی کو کیا کہہ سکتا ہے، انگلستان کو رُوس سے اجتناب ہے مگر فرانس اُس سے اتحاد کرتا ہے کیونکہ اس سے فرانس کے دل کو ڈھارس بندھتی ہے، فرانس کو جرمنی سے نفرت ہے مگر انگلستان اُس سے مفاہمت کر رہا ہے کیونکہ اس سے انگلستان کی مشکل حل ہوتی ہے یعنی پرانے اتحادی ذرا ایک دوسرے سے دُور دُور ہوتے جاتے ہیں!

اِدھر ابھی یہ چالیں چلی جا رہی ہیں اُدھر مسولینی کی حکمتِ عملی ان اُلجھنوں کا فائدہ اُٹھا کر اپنی گتھی کو سلجھا رہی ہے، فرانس

اور جرمنی کی رقابت اطالیہ کی طاقت میں اضافہ کر رہی ہے۔ فرانس اور اطالیہ دونوں چاہتے ہیں کہ آسٹریا کا وجود معرضِ خطر میں نہ پڑے اس لئے نہیں کہ انہیں اس غریب سے محبت ہے بلکہ اس لئے کہ مبادا آسٹریا کی شمولیت سے جرمنی طاقتور ہو جائے۔ دونوں اس پر متفق ہیں کہ یورپ میں آسٹریا کو بچاؤ اور افریقہ میں حبشہ کو ہڑپ کر جاؤ۔ حبشہ کی گزشتہ نصف صدی کی تاریخ یورپی قوموں کی ریشہ دوانیوں کا ایک سبق آموز باب ہے۔

۱۸۸۹ء۔ حبشہ نے ایک معاہدے کے مطابق اطالیہ کو کچھ مراعات دیں۔ اطالیہ نے دخل در معقولات دینا شروع کیا۔

۱۸۹۳ء۔ اطالیہ کا یہ رویہ دیکھ کر حبشہ نے معاہدے کو منسوخ کر دیا۔

۱۸۹۶ء۔ اطالیہ نے حبشہ پر حملہ کیا لیکن شکست کھائی۔

۱۹۰۶ء۔ انگلستان، فرانس اور اطالیہ نے معاہدہ کر کے سمجھوتا کیا کہ حبشہ کے متعلق "صورتِ موجودہ" قائم رہے۔ درپردہ یہ حبشہ کی تقسیم کا آغاز تھا۔

۱۹۱۵ء۔ اطالیہ کو جنگِ عظیم میں اپنے ساتھ شامل کرنے کے لئے انگلستان اور فرانس نے حبشہ کے متعلق اطالیہ سے "کچھ وعدے" کئے۔

۱۹۱۹ء۔ اطالیہ نے انگلستان سے کہا میں حبشہ میں تمہارے "حقوق" کے تحفظ کے لئے تمہاری مدد کو تیار ہوں۔ انگلستان نے کہا شکریہ، تمہاری مدد کی مجھے ضرورت نہیں۔

۱۹۲۳ء۔ حبشہ مجلسِ اقوام کا رکن بنا۔ اس میں اطالیہ نے اُس کی مدد کی اور انگلستان نے مخالفت۔

۱۹۲۵ء۔ اطالیہ اور انگلستان کے درمیان حبشہ کے متعلق سمجھوتا ہو گیا۔ دونوں نے حبشہ کے مختلف حصوں پر ایک دوسرے کے "حقوق" تسلیم کئے۔ اس کا حبشہ کو علم ہوا تو اُس نے ناخوشی اور اختلاف ظاہر کیا۔

۱۹۲۶ء۔ انگلستان نے حبشہ کو زیلا کی بندرگاہ تحفۃً پیش کی۔ حبشہ نے شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا۔

۱۹۲۸ء۔ اطالیہ اور حبشہ کے درمیان معاہدہ ہوا کہ وہ ایک دوسرے کی خودمختاری کا لحاظ رکھیں گے۔

(حبشہ یورپیوں کے ذریعے اپنے ملک کو فروغ دیتا ہے لیکن اطالویوں سے روگردانی کرتا ہے)

۱۹۳۴ء۔ حبشہ میں انگریزی "اثر" بڑھتا ہے اطالوی "اثر" گھٹتا ہے۔ یہ افواہ پھیلتی ہے کہ انگلستان اور حبشہ کے درمیان کوئی مخفی عہدنامہ ہوا ہے سو اطالیہ فرانس سے گفت و شنید کر کے اپنے "حقوق" کے "تحفظ" کا انتظام کرتا ہے۔

۱۹۳۵ء۔ اطالیہ اپنے حقوق کے "تحفظ" کے لئے پہلے حبشہ سے چھیڑ چھاڑ کرتا ہے اور پھر اُس پر حملہ کر دیتا ہے تاکہ یوں اُسے "مہذب بنائے"۔ مجلسِ اقوام حبشہ کی حمایت میں اطالیہ پر "معاشی اقدامات" عائد کرتی ہے۔ انگلستان جو کمزور قوموں

کی حمایت" کا بیڑا اُٹھاتا ہے۔
جس طرح مغرب میں جرمنی اپنی فوجی قوت کے بڑھانے کے درپے ہے اور اطالیہ اپنی سلطنت کو وسعت دینا چاہتا ہے
اُسی طرح مشرق میں جاپان اپنی تجارت کو پھیلانے اپنی بحری طاقت کو بڑھانے اور اپنی سلطنت کو وسعت دینے کا متمنی ہے۔ اور
کیوں نہ ہو؟ وہ یورپ کا شاگرد ہے جواب اپنے، اُستاد سے بھی بڑھ گیا ہے۔ وہ بھی پہلے تجارت سے شروع کرتا ہے پھر کہتا ہے
اب میرے حقوق کا تحفظ لازم ہے اِس حقوق کے تحفظ کے لئے بڑی اور بحری طاقت کی ضرورت ہے، اُس کی آبادی بڑھ رہی
ہے جس کے لئے نوآبادیات کی ضرورت ہے۔ جنوبی امریکہ میں، افغانستان میں، حبشہ میں، بلکہ انگلستان اور شمالی امریکہ تک میں
اُس کی مصنوعات سے منڈیاں بھری پڑی ہیں مال سستا بناتا ہے اور سستا ہی بیچتا ہے بڑے بڑے صنعت گر ملک اُس
کے مقابل میں مات پڑ رہے ہیں۔ افغانستان میں جاپانیوں نے ملک کی صنعتی ترقی کے لئے اپنی تجویزیں پیش کی ہیں حبشہ میں
اُس کے روئی کے کھیت سینکڑوں میل تک پھیلے ہوئے ہیں۔ سو جس طرح انگلستان کی تجارت اُس کے سیاسی اقتدار کا پیش خیمہ
بنی اُسی طرح اب جاپان کی تجارت ہر جگہ اُس کے اثر کا جھنڈا اُڑائے پھرتی ہے۔ یورپ کو خانہ جنگی میں مصروف دیکھ کر جاپان نے
اعلان کر دیا کہ خبردار چین کو مت چھوؤ یہ میرا مال ہے۔ جنگِ عظیم کے بعد جو جاپان کو بحرالکاہل کے وسط میں چند جزائر کی حکم برداری
ملی اب وہ اُس کا پورا فائدہ اُٹھا رہا ہے اور اُنہیں اپنے بحری زور و قوت کا ایک مرکز بنا رہا ہے۔ اِس سے امریکا ناراض ہے
بارہ چودہ سال ہوئے جو واشنگٹن کا بحری معاہدہ انگلستان، امریکہ اور جاپان کے درمیان ہوا تھا جس کی رُو سے بحری طاقت کا
تناسب ۵، ۵، ۳ قرار پایا تھا جاپان نے دسمبر ۱۹۳۴ء میں اُس معاہدے سے دست برداری کی اطلاع دے دی تھی اور اب
وہ ۴، ۴، ۴ کا تناسب چاہتا ہے یعنی وہ امریکہ اور انگلستان کی برابری کا دعویدار ہے۔ امریکہ اس پر چیں بہ جبیں ہو رہا ہے
لیکن انگلستان نے خاموشی سے جاپان کے ساتھ ایک سمجھوتا سا کر لیا ہے۔ جاپان چین میں روز بروز اپنی طاقت اور سلطنت کو بڑھا
رہا ہے مانچوریا، مانچوکو اور منگولیا یہ ہیں جاپان کی منزلیں چین کے اندر۔ آئے دن جاپان کوئی نہ کوئی حکم چین کے نام صادر
کرتا ہے فلاں شہر میں تمہارے آدمیوں نے میری توہین کی فلاں جگہ ایک جاپانی زخمی ہوا، پیکن گویا اُس کے قبضے میں ہے۔
اُدھر سوویٹ رُوس ڈرتا ہے کہ سائبیریا پر اس زرد قوم کی نگاہیں ہیں اِدھر ڈچ لوگ خائف ہیں کہ جاوا سماٹرا اس کی دست بُرد
سے بچے رہیں۔ چالاک دُور اندیش انگلستان اشارۃً سمجھاتا ہے کہ زرد میاں! بے شک تمہارے خیالات حق بجانب ہیں تمہاری
ضروریات قابلِ فہم ہیں، تم میرے آسٹریلیا اور میرے ہندوستان کو میرا ہی بنا رہنے دو اور باقی شمالی چین میں وسط بحر الکاہل
میں اِدھر اُدھر جو چاہو کرو، ہم دونوں تاجر بھائی ہیں!
سوویٹ رُوس وہ مُلک جو چند ہی سال ہوئے دُنیا بھر میں ایک اشتمالی انقلاب برپا کرنا اپنا انسانی فرض سمجھتا تھا خود ہی

مدت سے خارجی معاملات میں نہایت صلح مندانہ رویہ اختیار کئے ہوئے ہے۔ اُس کی وجہ ظاہر ہے۔ اشتمالیوں نے جانچ لیا ہے
کہ اگر ہم بیرونی ملکوں میں اپنی انقلابی کارروائیوں پر زور دیں گے تو سرمایہ دار ملک متحد ہو کر ہماری مخالفت کریں گے اور ہماری
اپنی جان کے لالے پڑ جائیں گے۔ پہلے بہتر ہے کہ ہم اپنے گھر کی خبر لیں اپنا کیل کانٹا درست کریں جب مضبوط ہو جائیں گے
تو پھر کہیں عالمگیر انقلاب کے خواب دیکھنے کی تجویز سوچیں گے۔ سو کچھ مدت سے سوویٹ والے انگلستان اور فرانس اور کئی دوسرے ملکوں
سے راہ و رسم بڑھا رہے ہیں۔ کون گمان کر سکتا تھا کہ فرانس سوویٹ کا جانی دشمن اُس سے اتحاد کا خواہش مند ہو جائے گا مگر حق یہ ہے
کہ سیاسی دنیا میں تعجب کسی قسم کی تبدیلی پر بھی نہ کرنا چاہیئے یہاں کل کے جانی دشمن آج ایک دوسرے کے عاشق زار بن جاتے ہیں موقع
ضرورت، نفع یہ ہے سیاست کا مذہب اور یہی اُس کا قانون۔ اصول، وفاداری، ایمان، اِن سے کیا مطلب! رُوس اب مجلسِ اقوام
کا ایک سرگرم رُکن ہے وہ جنیوا میں بین الاقوامی مصالحت پر تقریریں کرتا ہے اور اپنے گھر میں بدستور اشتمالی اصولوں کا پیرو ہے۔
روس میں بچوں کی تعلیم کی نئی راہیں کھل رہی ہیں بچے ابھی چھ برس کے نہیں ہو چکتے کہ انہیں بین الاقوامی اور اشتمالی اصولوں سے
آگاہی ہو جاتی ہے۔ خواندہ لوگوں کی تعداد پانچ سال ہوئے ۷۰ فی صدی تھی اب ۹۰ فی صدی سے بھی زائد ہے۔ صفائی اور حفظِ
صحت نے شہروں کو آئینہ سا بنا دیا ہے۔ مزدوروں کے لئے نئی وضع کے مکان بن رہے ہیں، عورتوں کے لئے بچوں کی تربیت گاہیں
ہیں، بیویوں کے لئے آزادی ہے، صنعت و حرفت دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے لیکن سٹیلن ابھی ہل من مزید کا نعرہ لگا
رہا ہے۔ جرمنی اور جاپان رُوس کے دشمن ہیں لیکن اور سرمایہ دار ملکوں سے اُس کے دوستانہ تعلقات بڑھ رہے ہیں اور اس لئے
رُوس کی اشتمالیت اب خاموشی کے ساتھ دنیا پر اپنا اثر پیدا کر رہی ہے۔

اس سارے بیان سے واضح ہے کہ اِس وقت دولِ عظمےٰ میں تین طاقتیں جنگی تیاریاں کر رہی ہیں جرمنی اطالیہ اور جاپان!
یہ اپنے مقبوضات میں وسعت اور اپنی خوشحالی میں فروغ چاہتی ہیں۔ اِس کے برعکس تین طاقتیں ہیں جو صُلح کی خواہش مند ہیں،
انگلستان فرانس اور روس! یہ اپنے موجودہ مقبوضات کو بحال اور اپنی خوشحالی کو فقط برقرار رکھنے کی آرزومند ہیں۔ امریکہ دُور ہے
وہ الگ تھلگ رہنا چاہتا ہے لیکن اگر عالمگیر جنگ چھڑ جائے تو ایک ایسی طاقت کا الگ تھلگ بیٹھے رہنا ناممکن ہے۔
صلح جو "طاقتیں جنگ جُو" طاقتوں کو صلح پسندی کا اُصول سمجھاتی ہیں، جنگ جُو طاقتیں جواب دیتی ہیں کہ ہاں جب ہم بھی دُنیا کے اتنے
طویل و عریض حصّے پر قابض ہو جائیں گے تو ہم بھی صُلح پر لکچر دینے لگیں گے "موجودہ حالت" پر اطمینان صرف انہیں کے شایانِ شان
ہے جو مدتوں سے اشیاء و اراضی پر اپنے حصّے سے بڑھ کر قبضہ کئے ہوئے ہیں۔ اور یوں یہ لفظی لڑائیاں جاری رہتی ہیں یہاں
تک کہ ایک وہی باوا آدم کے زمانے کی جسمانی لڑائی اپنی بھیانک شکل دکھاتی ہے اور لوگ جوش میں آکر ایک دوسرے سے
دست و گریباں ہو جاتے ہیں! بڑی طاقتوں کے جوش و خروش کا گرداب چھوٹی طاقتوں کو اپنی طرف کھینچ لاتا ہے اور اِس

اپنچا تانی میں وہ بھی اپنی ہستی کا ثبوت دیتی ہیں۔ یورپ اس وقت لڑنے جھگڑنے والے قومی فرقوں کا ایک مجمع ہے جنہیں خود ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں کہ ہم کیا چاہتے ہیں اور ہمیں کیا کرنا چاہیئے؛ لاوال ہور مسولینی تینوں ایک خطرناک چٹان کے کونے پر اپنا سیاسی کھیل کھیل رہے ہیں اُن کے قریب ہی ہٹلر اور سٹیلن بھی بھاگ دوڑ میں مصروف ہیں۔ کیا یہ سب قسمت کے مُہرے ہیں جن کے ذریعے سے وہ اپنا شطرنج کھیلتی ہے اور انہیں معلوم نہیں کہ یہ کدھر کو چلنے والے اور کسے مات کرنے اور خود کس سے مات ہو جانے والے ہیں؛

دولِ عظمےٰ کے بعد دولِ صغریٰ کا درجہ ہے۔ اِن میں غالباً ترکی سب سے بڑا ہے۔ ترکی کمال" اتاترک" کے سائے میں نئی اصلاحات اور معاشی ترقیوں میں مصروف ہے اگرچہ بین الاقوامی فضا کے تکدر کے باعث اُسے بار بار اپنی فوجی قوت کی طرف متوجہ ہونا پڑتا ہے + آسٹریا ہنگری اور بلغاریہ بھی اپنے سابق حلیف جرمنی کی طرح اپنی فوجی قوت میں اضافہ کرنے کے خواہشمند ہیں مگر چیکوسلووکیا یگوسلاویا اور رومانیا کا اتحادِ صغیر اس خواہش کو ناجائز سمجھتا ہے + یونان نے اپنی جمہوریہ کو منسوخ کر کے اپنے بادشاہ کو واپس بُلا لیا ہے + چین کی بابت یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ وہ ایک خودمختار ملک ہے بھی یا نہیں ؛

اس کے بعد محکوم قومیں صف باندھے کھڑی نظر آتی ہیں۔ ان میں یقیناً سب سے بڑی "قوم" ہندوستان ہے۔ اُسے اس سال کے اندر "حکومتِ ہند کا قانون" عطا ہوا۔ اس حقیقت کو جان کر کہ آزادی کبھی دی نہیں جاتی لی جاتی ہے اس قانون کی بندش کا اندازہ ہو سکتا ہے پھر جس ملک میں جپہ جپہ زمین پر مذہبی خون کی ندیاں بہ جاتی ہیں اُس کے مستقبل کا کیا کہنا؛ مصر میں اہلِ وفد ہزار قُل مچائیں کہ ہمارا "دستور" ہمیں واپس دے دو برطانیہ مزے سے "تمدن" کی "حفاظت" میں مگن ہے + فلسطین میں حکم بردار حکومت مقامی عربوں اور اپنے چہیتے اجنبی یہودیوں کے مناقشات میں اپنے غیر جانب دارانہ فیصلے سناتی اور اپنی معاشی ترقی کے جال پھیلاتی رہتی ہے + جزائر فلیپائن پر امریکہ نے ایک نئی "دولتِ عامہ" کی مُہر لگا کر دس سال میں اُسے مکمل طور پر آزاد کر دینے کا اعلان کر دیا ہے +

قصہ کوتاہ دُنیا کی حالت اس وقت یوں بیان کی جا سکتی ہے :-

جرمنی روز و شب اپنی برّی بحری اور ہوائی طاقت کے بڑھانے میں مصروف ہے۔

فرانس خائف ہے اس لئے وہ کسی سے اتحاد اور کسی سے مفاہمت کرنے میں مصروف ہے۔

اطالیہ مسولینیئت کے نشے میں چُور ہو کر روما کی کھوئی ہوئی سلطنت کے خواب دیکھ رہا ہے۔

انگلستان کا مزاج اِن بے چینیوں کو دیکھ کر مضطرب ہے سو وہ موجودہ حالت کو برقرار رکھنے کا راگ الاپ رہا ہے۔

رُوس سرمایہ دار حکومتوں کے ساتھ ساز باز کر رہا ہے تاکہ اُس کا اشتمالی لائحۂ عمل اطمینان کے ساتھ تکمیل کو پہنچ جائے۔

جاپان اور روس کو بغض و حسد کے جھگڑوں میں مصروف دیکھ کر اور اپنے آپ کو طاقتور اور مضبوط پا کر چین اور بحر الکاہل کے طویل و عریض اکھاڑوں میں پہلوان بن کر اُتر آیا ہے اور سب کو دعوتِ جنگ دیتا ہے کہ آؤ طاقت آزمائی کر لو!

امریکہ ہنوز اپنے صدر کی نئی معاشی اصلاحات کے تجربے میں منہمک ہے۔

چھوٹی قومیں اپنا اپنا سر چھپائے بیٹھی ہیں کہ کسی طرح بڑی قوموں کے جھگڑوں کا یہ طوفان اُوپر ہی اُوپر سے گزر جائے۔

محکوم قومیں اس وقت زور و قوت کا زور اور زیادہ پا کر دبی بیٹھی ہیں لیکن عجب کیا ہے کہ زبردست قوموں کی رقابت کے اندر سے قدرت اِن کے لئے بہتری کی کوئی سبیل پیدا کر دے!

اکثر ملکوں میں خود سر آمر برسرِ اقتدار ہیں۔ خود اختیاری اور جمہوری آزادی کا حال پتلا ہو رہا ہے۔

حیاتِ اجتماعی کی جنبش کھاتی ہوئی ترازو کے ایک پلڑے میں صلح بیٹھی ہے دوسرے میں جنگ، دیکھئے کون زیادہ وزن دار ثابت ہو؛

اور سیاست و معاشرت کے حلقوں میں کمزور و پُرزور دست و گریباں ہیں۔ مزدور سرمایہ داروں کے خلاف ہیں عورتیں مردوں کے نوجوان بزرگوں کے۔ قابض کہتے ہیں ہم مالک ہیں بے نوا کہتے ہیں قدرت کے کارخانے میں سب کا حصّہ ہے۔ ہر پُرانی شئے بھدی معلوم ہو رہی ہے اور ہر جدت کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے!

معاشری زندگی کی رام کہانی اِس وقت کس قدر دلفریب ہے!

بشیر احمد

صدائے روح

چھوڑ اے دنیا چھوڑ مجھے باطل تیری جلوہ گری
چھوڑ بھی دے جا چھوڑ مجھے! آہ تری شوریدہ سری
[چھوڑ اے دنیا چھوڑ مجھے]

باطل ہے، باطل ہے سبھی نکتہ وروں کی نکتہ وری
باخبروں کی باخبری دیدہ وروں کی دیدہ وری
[چھوڑ اے دنیا چھوڑ مجھے]

دیکھا تو دیکھا ہے یہی دیدہ وری کی بے بصری
پایا تو پایا ہے یہی باخبری کی بے خبری
[چھوڑ اے دنیا چھوڑ مجھے]

صنعت کے آئینوں میں اہل ہنر کی بے ہنری
اور فطرت کے دفینوں میں لعل و گہر کی بے گہری
[چھوڑ اے دنیا چھوڑ مجھے]

عجزِ کلاہِ درویشی اہلِ ریا کی کم نظری
اور غرورِ تاجِ شہی اہلِ ہوس کی خیرہ سری
[چھوڑ اے دنیا چھوڑ مجھے]

موت سے کس کی جان چھٹی لاکھ ہو دانا، لاکھ جری
ایک دفعہ جو سوکھ گئی پھر نہ ہوئی وہ شاخ ہری
[چھوڑ اے دنیا چھوڑ مجھے]

میکدہ تیرا بے مے ہے آہ دکانِ شیشہ گری!
تجھ میں بھی کیف نہیں ہے آہ خمارِ چشمِ پری!
[چھوڑ اے دنیا چھوڑ مجھے]

کام کوئی بھی کر نہ سکی چارہ گروں کی چارہ گری
یوں ہی رہی عاجز تو بھی بدنظروں کی بدنظری
[چھوڑ اے دنیا چھوڑ مجھے]

تو تو سرے سے ناقص تھی ناقص عقل کی بخیہ گری
تو بھی یونہی بیکار گئی خام جنوں کی جامہ دری
[چھوڑ اے دنیا چھوڑ مجھے]

آہ بلندی ہمت کی! آہ مری بے بال و پری!
آہ تمنا رفعت کی! آہ مری افتادہ سری!
[چھوڑ اے دنیا چھوڑ مجھے]

حامد علی خاں



روح اور بدن

عہدِ حاضر کے چار آمر[1]

جنگِ عظیم کے خاتمے پر اگر کوئی ہمیں بتاتا کہ آٹھ دس برس کے اندر اندر دُنیا کے بہت سے ملکوں میں بالخصوص یورپ میں بعض آمرین کے ہاتھوں آزادی اور جمہوریت کا جنازہ نکلے گا تو ہم اِس پیشین گوئی کو لغو اور ناممکن سمجھ کر محض ہنس دیتے۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ قومی آزادی اور خود اختیاری کے لئے لڑی گئی، اُس کے خاتمے پر حضرتِ وِلسن نے اپنے چودہ اصُولوں کو بہانگِ دُہل دُنیا کے سامنے دہرایا اور فاتح و مفتوح دونوں کو یقین دلا دیا کہ اب دُنیا بندش اور غلامی کی بیڑیوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہا ہو چکی ہے۔ کِسے معلوم تھا کہ اِس خود پسند غیرت مند بیسویں صدی میں متمدّن دُنیا کے بہت سے مُلک پھر چند دُور اندیش خود سر افراد کے پاؤں تلے دب جائیں گے اور اکثر لوگ اِس بندش کو انفرادی آزادی پر ترجیح دیں گے اور جو اس سے گریز کریں گے، بھی اس کے بعض شاندار نتائج پر ششدر و مبہوت ہو جائیں گے!

اس تعجب انگیز سیاسی انقلاب کے کیا وجوہ ہیں؛ مہذب دنیا جو تقریباً ڈیڑھ سو سال سے رائے عامہ اور صدائے عام کے نعرے بلند کرتی رہی آخر کیا وجہ ہوئی کہ اُس نے تعلیم و ترقی کے اس عظیم الشان زمانے میں محض چند شخصوں کے جبر و استبداد کے آگے یوں ہتھیار ڈال دیئے؛ ہتھیار ڈال دیئے کیونکہ وہ تھک گئی اکتا گئی تنگ آگئی اُسے فرار کی کوئی راہ نہ سُوجھی اُس نے سوچ یا شاید بے سوچے سمجھ لیا کہ اپنی عقل نے اور اپنے اختیار نے مجھے جس تحت الثریٰ بلکہ جس جہنم میں پہنچا دیا ہے اُس سے اور زیادہ بُری جگہ کونسی ہو گی جہاں کسی اور کی فہم و فراست یا اختیار مجھے جھونک دے گا؛ میں ایک تاریک غار میں مقید ہوں جو مجھے اس میں سے نکالے میں کیوں اس کے پیچھے نہ ہو لُوں! اور پھر ہر نئی بات میں اک مزا ہے چلیئے کوئی نئی بات آزما دیکھئے!

---

[1] آمر = Dictator

۱۱۔

نوٹ:۔ اس مضمون کی تیاری میں مفصلہ ذیل کتب و رسائل سے استفادہ کیا گیا ہے:۔ "The Post-war World" (1918 - 1934) (دنیا جنگ کے بعد) (By Hampden Jackson)

"European Journey" (سفرنامۂ یورپ) (By Philip Gibbs) "Great Contemporaries" (ہم عصر اکابر) (Cassell and Co)

"An Atlas of Current Affairs" (حالاتِ حاضرہ کی اٹلس):۔ (By J. F. Horrabin)

انڈین ریویو (۱۹۳۵ء) - ماڈرن ریویو (۱۹۳۵ء)۔

"Grey Wolf" (By Armstrong) "بھورا بھیڑیا" (یعنی سیرت کمال پاشا)۔ وغیرہ وغیرہ

جمہوریت جس کا بار بار ۱۷۸۹ء سے لے کر آج تک دُنیا میں بول بالا رہا کچھ عرصے سے اُس کی کمیاں اُس کی خوبیوں پر چھائی رہی ہیں۔ یہ دیکھا گیا کہ جمہوری حکومت کا نظام بہت پیچ در پیچ ہے، یہ بھی ظاہر ہُوا کہ انتخابِ عامہ جس کو بہت سراہا جاتا ہے وہ کئی حالتوں میں محض برائے نام انتخاب ہوتا ہے اور پھر انتخاب اکثر صحیح یا پسندیدہ بھی نہیں ہوتا، لوگ جوش میں آ کر یا غلط فہمی میں پڑ کر کسی کو منتخب کر لیتے ہیں اور بعد میں خود ہی اُس انتخاب پر حیران اور ناخوش ہوتے ہیں، اُن کا نمائندہ بارہا اُن کی مرضی کے خلاف کارروائی کرتا ہے، نمائندوں کی مجلس عموماً طول طویل بحثوں کا اکھاڑا بنی رہتی ہے، اس کے برعکس مجلسِ عاملہ یا وزرا عموماً جو چاہتے ہیں کرتے ہیں اُن کی قوت روز بروز بڑھتی ہے وہ اور اُن کے احباب بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہو جاتے ہیں اور حکومت میں اپنی ذاتی اغراض کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اُس سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ عوام خوش ہوتے ہیں کہ ہم اپنے نمائندوں کے ذریعے سے جو چاہتے ہیں کرتے ہیں اور نمائندے خوش ہوتے ہیں کہ ہم جو چاہیں گے حکومت سے کرا لیں گے لیکن فی الحقیقت نہ عوام اور نہ اُن کے نمائندے ہی جو چاہیں کر سکتے ہیں بلکہ صرف اربابِ حکومت حکومت کرتے ہیں صرف وہی ہیں جو اپنے خیالات اور خواہشات کے ماتحت جو مناسب اور پسندیدہ سمجھتے ہیں کر گزرتے ہیں اور عموماً اُن کو روکنے والا صرف اِک یہی خیال ہوتا ہے کہ ہم عوام یا کسی خاص جماعت کی رائے سے اس حد تک بے نیاز نہ ہو جائیں کہ وہ ناراض یا باغی ہو کر ہمیں حکومت سے برطرف کرنے میں کامیاب ہو جائے صحیح جمہوریت کا معیار کچھ ہو یہ واقعہ ہے کہ دُنیا کے اکثر ملکوں میں جس قسم کی جمہوریت پر عمل درآمد رہا ہے وہ ایسی ہی ہے بلکہ جمہوری حکومت کے خاص قدیمی ماویٰ و ملجا انگلستان میں بھی اب جمہوریت ویسی جمہوری نہیں رہی جیسی ہُوا کرتی تھی، اب وہاں بھی ایک متحدہ "قومی حکومت" کا قیام و استحکام مُلک کے مفاد کے لئے ضروری سمجھا جانے لگا ہے۔

جمہوریت کے اِس انحطاط کے اور بھی اسباب ہیں؛ جنگِ عظیم کے بعد کچھ عرصہ تو خلافِ توقع تجارت کو فروغ ہُوا، جرمنی اور آسٹریا مجبوراً اپنی بُری حالت میں بھی خاموش رہے دوسری شکست خوردہ قومیں بھی جُوں تُوں کر کے وقت کاٹتی رہیں لیکن باقی ماندہ تمام ممالک بالعموم معاشی حیثیت سے خوش حال رہے یہاں تک کہ ڈوز کمیٹی کی تجویز اور لوکارنو کے معاہدے کے بعد جرمنی اور آسٹریا بھی چار پانچ سال تک بہت اچھی حالت میں رہے، اتحادیوں نے اُن کو قرضہ دیا کہ وہ اپنی بُری حالت کو کچھ سنواریں، وہ بھی اپنے ملکی نقصانات کو بھول کر اپنی موجودہ سیاسی حالت پر قانع ہو گئے لیکن ۱۹۲۹ء میں کساد بازاری کا ایک طوفانِ عظیم سرمایہ داروں کی متمدن دُنیا پر ٹوٹ پڑا، ہزاروں بنک بند ہو گئے، شرحِ مبادلہ تہ و بالا ہو گئی، کاروباری اِعتبار جاتا رہا اور یہ ساری کساد بازاری اُس وقت اپنی بھیانک صُورت دِکھانے لگی جب کہ بازار اجناس سے لبالب بھرا ہُوا تھا اشیا کی کمی نہ تھی بلکہ بیشی تھی لیکن اس پر بھی امیر دُنیا بھُوکی مر رہی تھی۔ کاروبار والوں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے، حکومتوں نے

طرح طرح کے جتن کئے، بے روزگاروں کے روزینے مقرر کئے، درآمد کے مال پر جہاں ضروری سمجھا محصول لگا دیئے، شرح زر کے لئے قانون وضع کئے کیا کیا نہ کیا لیکن معاشری سرد بازاری بد سے بتر ہی ہوتی گئی۔ ہزاروں کاروباری اُمراء دیوالیہ ہوئے لاکھوں مزدور بے روزگار ہو گئے امیر غریب ہو گئے غریب بھوکوں مرنے لگے" روٹی نہ پیٹ میں ہو تو پھر کچھ جتن نہ ہو" مرتے کیا نہ کرتے یہی خیال آیا کہ ہو نہ ہو یہ سارا موجودہ سیاسی و معاشی نظام ہی لغو ہے جس کا نتیجہ یہ ابتری ہے۔ اشتمالیوں نے کہا ہم نہ کہتے تھے ایک دن سرمایہ داری سب کو لے کر ڈوبے گی بس وہ دن آج آ گیا ہے اب اس طوفان میں یا جان سے جاؤ یا آؤ ہم تم کو اپنی نئی کشتی میں جگہ دیں کہ تم اطمینان کی زندگی گزار سکو۔ بعض اور چالاک آدمی تھے وہ بولے یہ جو پرانے جمہوری رہنما دُنیا کو" جو ہوتا ہے ہونے دو" کے اصول پر چلا رہے تھے اس بے راہ روی کا لازم نتیجہ تھا کہ تمدن زندگی کی صحیح راہ سے بھٹک کر اپنی جان تک کھو بیٹھے، زندگی کے لئے تمدن کے لئے ترقی کے لئے ایک خاص مقررہ شاہراہ کی ضرورت ہے اور اُس شاہراہ کا بنانا اُسے ہر وقت دیکھنا اُس کا ہر گھڑی سمجھنا یہ عوام بلکہ خواص کے بس کی بات بھی نہیں بلکہ یہ قوت خواص میں بھی قدرت محض کسی کسی کو ودیعت کرتی ہے وہ خاص الخاص آدمی ہم ہیں۔ لوگ جو کمزوری و مایوسی سے نیم پاگل سے ہو رہے تھے یہ آوازہ سُن کر فوراً آمنّا وصدّقنا کہنے لگے۔

اس پر مستزاد فاتح قوموں کا غرور و تکبر اور خود غرضانہ کم اندیشی تھی۔ ۱۹۱۸ء میں باوجود ولسن کی مساعی کے درمیانی کے معاہدے کے مطابق اتحادیوں نے جس طرح چاہا یورپ کے حصے بخرے کر دیئے۔ کہنے کو یہ طریقہ تقسیم قومیت کے زریں اصول پر مبنی تھا مگر در اصل اس کی تہ میں بہت سے اور جذبات کام کر رہے تھے۔ پولینڈ لتھوینیا چیکوسلوویکیا کو جرمنی کے جو حصے دیئے گئے اُن میں علاوہ اُن قوموں کے جرمن لوگ بھی آباد تھے، اطالیہ نے جس حصے پر قبضہ کیا اُس میں آسٹروی بھی تھے، رومانیہ نے جو علاقہ سنبھالا اُس میں یوکرینی ہنگری اور دیگر قومیں بھی تھیں۔ جرمنی کے مغرب میں تو فرانس اُس کا آلسس لورین دبائے ہوئے تھا جرمنی کے مشرق میں تین نئے ملک قائم کئے گئے تاکہ وہ اُس کا زور کم کئے رکھیں اور اتحادیوں کے جانب دار بنے رہیں۔ چیکوسلوویکیا، یگوسلاویا اور رُومانیا کے درمیان ایک" اتحادِ صغیر" کی بنا پڑی۔ یہ اتحاد اتحادیوں کے اتحادِ کبیر کا گویا بچہ اور پروردہ تھا اس کا کام تھا کہ وہ وسطی و مشرقی یورپ میں اپنے اور اتحادیوں کے مفاد کا نگہبان بنا رہے۔ پولینڈ اور لتھوینیا کو اتحادی شہ ملی تو اُس نے رُوس کا بہت سا اور علاقہ اور اس نے جرمن شہر میمل پر قبضہ کر لیا۔ غرض اس طرح اتحادیوں کے دشمنوں جرمنی آسٹریا ہنگری اور بالشویک رُوس کو ایک دوسرے سے علیحدہ اور دُور کر کے کمزور کیا گیا اور ہر ایک کی پشت پر بہت سے گستاخ نوعمروں کو سوار کر دیا گیا تاکہ اُن کو ان نئی مصیبتوں سے مدت العمر تک ہی نہ ملے۔ بیچارا دُور افتادہ ٹرکی بے بس ہو چکا تھا یونان کو اشارہ ملا کہ جا کر اپنے سمرنا کے پسندیدہ شہر اور ایشیائے کوچک کی سرزمین پر اپنا جھنڈا گاڑ دو۔ آسٹریا اور ہنگری تو غریب زار و نزار تھے

لمبی سانسیں بھریں اور پڑ رہے لیکن جرمنی کا دل خون خون ہوگیا اور تُرکی کے کٹے ہوئے اعضا بھی تڑپنے لگے۔ یہ درد و اضطراب کچھ عرصہ جاری رہا لیکن انتقام کا دن دُور نہ تھا، جوش بھرے جذبات اندر ہی اندر اپنا کام کرتے رہے۔ اطالیہ کو بھی جنگِ عظیم سے جو اُمیدیں تھیں وہ اِتحادیوں کے ہاتھوں پوری نہ ہوئیں سو اُس نے خود ہی اِدھر اُدھر چھاپے مارنے شروع کئے۔ روس میں اتحادیوں نے سفید رُوسیوں کی مدد کر کے بالشویکوں کو خانہ جنگی میں مصروف کر دیا لیکن وہاں بھی جلد ہی مُنہ کی کھانی پڑی۔ جرمنی اطالیہ تُرکی رُوس! باوجود اتحادی رُکاوٹوں کے اِن قوموں نے طاقت پکڑی اور زور دکھایا کیونکہ ان چاروں ملکوں میں چار ایسے زبردست افراد برسرِ اقتدار ہو گئے کہ اُن کا شمار اگر اکابرِ عالم میں کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

آج متمدن ممالک میں جمہوریت کا سر نگوں ہے، قانون ساز مجلسیں صرف نام کو باقی ہیں، پارلیمنٹیں پارہ پارہ ہو رہی ہیں، اطالیہ میں بادشاہ برائے نام موجود ہے فاشی مجلس یعنی اُس کا کرتا دھرتا مسولینی مختارِ مطلق ہے، جرمنی میں ہٹلر ہی ریشتاغ ہے اور وہی قیصرِ اعظم، رُوس میں سٹیلن اور اُس کے حواریوں کا سکہ جاری ہے، یونان اپنی جمہوریہ سے اُکتا کر اپنے بادشاہ کو واپس بُلا رہا ہے، ہسپانیہ اپنی نئی جمہوریہ میں روز و شب بے تاب ہے، آسٹریا نے اپنے پُرانے بادشاہوں کے خلاف جو قانون نافذ کیا تھا اب منسوخ کر دیا ہے، رُومانیا کا پُر رُومان بادشاہ خود مختاری کے مزے لے رہا ہے، تُرکی اپنے کمال پاشا کے پہلو میں مگن ہے، ایران اپنی مشروطہ پر لات مار کر ایک خودمند استبداد کے سائے میں راضی بہ رضا ہے، بلکہ جمہوری امریکہ بھی اپنے صدر رُوزولٹ کے مطلق العنانی احکام پر گوش بر آواز رہتا ہے اُدھر فرانس اور انگلستان تک میں "قومی" حکومتوں کی نیم جمہوری جماعتیں برسرِ اقتدار ہیں۔ حق یہ ہے کہ دنیا کے وہ ملک جو اس وقت مطلق العنان حکمرانوں کے زیرِ پا نہیں ہیں وہ بھی جی ہی جی میں اُن ملکوں پر رشک کھاتے ہیں جو اپنے آمرین کی قیادت میں دن دونی رات چوگنی "ترقی" کر رہے ہیں۔ یہ آمر چند گھنٹوں میں وہ احکام و قوانین نافذ کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں جو جمہوری اور پارلیمنٹی ملک مہینوں اور بعض اوقات سالوں میں نہیں کر سکتے۔ آمر ایک تجویز سوچتا ہے جھٹ اُس کا خاکا بناتا ہے پھر فوراً اُس پر عمل کرنا اور کرانا شروع کر دیتا ہے، لوگ بغور اُس کا حکم سنتے ہیں اُسے سچا سمجھتے ہیں اور پھر بغیر سوچے سمجھے اُس کی تعمیل کرتے ہیں۔

اِس وقت دُنیا میں زیادہ تر چار آمروں کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے ہٹلر، مسولینی، مصطفےٰ کمال، سٹیلن! اور اُن کی شخصیتیں اپنے ملکوں پر اس قدر چھائی ہوئی ہیں کہ اس وقت بلا مبالغہ ہٹلر کے معنی جرمنی، مسولینی کے معنی اطالیہ، مصطفےٰ کمال کے معنی تُرکی اور سٹیلن کے معنی رُوس ہیں!

آؤ دیکھیں کہ یہ شخص کون تھے کیا بن گئے اور اپنے ملکوں پر اور دُنیا پر اُنہوں نے کیا کیا اثرات پیدا کئے؟

ہٹلر

۲۰ / اپریل ۱۸۸۹ء کو آسٹریا میں برونائو کے چھوٹے سے سرحدی گاؤں میں محکمہ محصولات کے ایک چھوٹے سے افسر کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ یہ ہٹلر تھا جسے ایک روز جرمنی کا مختارِ مطلق بننا تھا!

اُس کا باپ چاہتا تھا کہ وہ اُس کی طرح ایک سرکاری ملازم ہو لیکن ہٹلر نے جب کہ وہ ابھی صرف گیارہ سال کا تھا صاف جواب دے دیا۔ "یہ خیال کہ میں ایک دفتر میں بند رہوں ناقابلِ برداشت ہے"۔ جب وہ بارہ سال کا ہوا تو اُس نے اپنے باپ سے کہہ دیا کہ میں تو ایک نقاش بننا چاہتا ہوں۔ باپ نے کہا جب تک میں زندہ ہوں یہ ہرگز نہ ہوگا۔ لڑکے نے جواب دیا "اچھا آپ دیکھیں گے!" وہ تیرہ سال کا تھا کہ اُس کا باپ مر گیا۔ تین سال بعد اُس کی ماں بھی مر گئی۔ اس کے بعد نوجوان ہٹلر نے پانچ سال نہایت تنگی میں گزارے لیکن اس سے اُس کی قوتِ ارادی اور مضبوط ہوئی۔ "اُس زمانے کے لئے میں شکرگزار ہوں کہ میں نے سختی جھیلنی سیکھی اور میں سختی جھیل سکتا ہوں"۔ وہ سترہ سال کا تھا اور کُل دو پونڈ اُس کی جیب میں تھے جب وہ ویئنا کے بازاروں میں ایک مزدور بن کر اپنی روزی کمانے کے لئے آیا۔ پھر کیا عجب تھا کہ وہ بدمزاج ہو گیا اور اپنے ہم پیشہ لوگوں سے میل جول نہ رکھ سکا۔ وہ چاہتے تھے کہ ہٹلر اشتراکی اصولوں کا پیرو بنے لیکن ہٹلر کا قومی غرور اُن سے برگشتہ تھا۔ وہ بعض اوقات آسٹروی پارلیمنٹ کے مباحثے سننے کے لئے جایا کرتا تھا لیکن اس سے بھی وہ جمہوریت سے روز بروز متنفر ہوتا گیا اور اُسے یقین ہو گیا کہ "اکثریتیں کبھی صحیح انسانوں کا سا کام نہیں کر سکتیں"، "سو احمق بھی مل جائیں تو ایک عقلمند آدمی نہیں بنتا"۔ اُس نے اِن دلائل سے یہ نتیجہ نکالا کہ صحیح جمہوریت کا کام محض ایک رہنما کا آزاد انتخاب ہے جو خود مکمل ذمہ داری کا فرض نبھائے اور یہودی اور مارکسی نظریہ اس کے خلاف ہے کیونکہ وہ بجائے قدرت کے "اشرافی" اصول کے جو زور و قوت کا مؤید ہے محض عوام کی بھاری بھرکم تعداد کی حمایت کرتا ہے۔ وہ اپنی سوانح عمری "Mein Kampf" (میری جدوجہد) میں لکھتا ہے "اسی لئے میں سمجھتا ہوں کہ آج کل میں خدائے قدیر کے منشا کے مطابق کام کر رہا ہوں"۔

۱۹۱۴ء میں وہ میونخ میں تھا جب اُس نے سُنا کہ جنگِ عظیم چھڑ گئی ہے۔ وہ کہتا ہے یہ سُن کر میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اُس نے مجھے ایسے پُرجوش زمانے میں پیدا کیا۔ وہ ہمیشہ جرمن قومیت کا دلدادہ تھا۔ اِس ڈر سے کہ کہیں اُسے آسٹروی فوج میں جبراً بھرتی نہ کر دیا جائے وہ فوراً جرمن فوج میں ایک رضاکار بن کر شریک ہو گیا۔ چار سال وہ مغربی محاذ پر لڑتا رہا اور اُس نے ۴۸ بار لڑائی میں حصہ لیا۔ اکتوبر ۱۹۱۶ء میں وہ زخمی ہو گیا، مارچ ۱۹۱۷ء میں جب وہ تندرست ہو کر دوبارہ محاذ پر گیا تو اُس نے دیکھا کہ جرمن فوج میں وہ پہلے سا جنگی جوش و خروش باقی نہیں رہا۔ اکتوبر ۱۹۱۸ء میں وہ برطانوی گیس کے گولوں سے تقریباً اندھا ہو

کر جرمنی کو لوٹا جہاں ایک ماہ بعد اُس نے ہنگامی صلح کی خبر سنی۔ وہ کہتا ہے کہ "اپنی ماں کی قبر پر کھڑا ہونے کے بعد یہ پہلی بار تھی کہ میں رویا"۔

جب وہ دوبارہ اپنی رجمنٹ میں میونکھ میں شریک ہوا تو اُس نے دیکھا کہ جرمنی اب کچھ اور کا اور ہو گیا ہے۔ وہ جنگجویانہ رویّہ وہ جوش و خروش اب کہاں؛ بس ہر طرف سیاست ہے اور اُس کی چالیں۔ ایک شام وہ جرمن مزدوروں کی جماعت کے ایک جلسے میں شریک تھا کہ ایک نامعلوم سے پروفیسر نے اُٹھ کر بزور تقریر کی کہ بویریا کو چاہیئے کہ جرمنی سے علیحدہ ہو کر آسٹریا کے ساتھ مل جائے۔ یہ سُننا تھا کہ ہٹلر آگ بگولا ہو گیا اور اُس نے جواب میں ایسی دھؤاں دھار تقریر کی کہ پروفیسر صاحب کو دُم دبا کر بھاگتے بنی۔ اُس رات ہٹلر کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا کہ اُسے کیا کرنا اور کیا بننا ہے؛

چند روز بعد جب وہ اس جماعت کے جلسے میں گیا تو اُسے معلوم ہُوا کہ جماعت کے کُل رُکن سات ہیں اور اُس کا مجموعی سرمایہ صرف ساڑھے سات مارک ہے۔ ہٹلر نے ارادہ کر لیا کہ اس ذرا سی جماعت کے ذریعے سے وہ جرمنی میں اُن پرجوش اصُولوں کی اشاعت کرے گا جو اُس کے سینے میں موجزن تھے۔ اُنہوں نے ایک عام اجلاس کا انتظام کیا۔ اس میں حاضرین کی تعداد ۱۱۱ تک پہنچی ہٹلر نے وہاں اس زور سے تقریر کی کہ کھڑے کھڑے تین سو مارک چندہ جمع کر لیا۔ لیکن اس اجلاس کا ایک اور نہایت اہم اور زبردست نتیجہ نکلا، ہٹلر کو معلوم ہو گیا کہ میں واقعی ایک مُقرر ہوں۔ فروری ۱۹۲۰ء میں اُس نے ایک بڑے اجلاس کی تیاری کی۔ اس میں دو ہزار آدمی شریک ہوئے ہٹلر نے جب اپنی تقریر شروع کی تو اکثر لوگ اُس کے مخالف تھے، تقریر کے خاتمے تک اکثر اُس کے مدّاح بن گئے۔ اُس نے اپنے "پچیس" "نقطے" اُن کے سامنے بیان کئے، تمام جرمنوں کو متحد ہو جانا چاہیئے جرمنی کو قومی حقوق میں برابری حاصل ہونی چاہیئے ورسائی کا معاہدہ منسوخ ہونا چاہیئے، اس کے علاوہ اشتراکی تجاویز تھیں جواب اس کے "نازی" لائحۂ عمل سے خارج ہو چکی ہیں۔ آئندہ تین سال میں یہ جماعت بڑھی۔ ۱۹۲۲ء میں اُس نے اشتراکی حملوں سے بچنے کے لئے اپنے اولیں "طوفانی جنگجو" مرتب کئے۔ بویریا کا سب سے بڑا سیاسی رہنما بن گیا اور جنوبی جرمن سرمایہ داروں اور سوداگروں نے اُس کی جماعت کو جی کھول کر چندہ دیا۔ ۱۹۲۳ء میں اُس نے برلن کی حکومت سے بیزار ہو کر اُس کے خلاف علانیہ طور پر بغاوت کا جھنڈا بلند کیا۔ ۱۹۲۴ء میں اُسے قید کر دیا گیا۔ قید خانے میں اُس نے اپنی مشہور سوانحعمری "میری جدوجہد" لکھی جو اب گویا نازیوں کی انجیل سمجھی جاتی ہے۔

۱۹۲۴ء کے اخیر میں جب وہ رہا ہو گیا تو اُس نے اپنی "نازی" جماعت کو ایک قومی پیمانے پر بڑھانا شروع کیا۔ اُس نے اُوپر کے امیر طبقے اور درمیانے طبقے کو اپنے ساتھ ملانے کی پوری کوشش کی یہاں تک کہ ۱۹۲۶ء کے اخیر تک جماعت کے ارکان ایک لاکھ تک پہنچ گئے۔ جرمن اشتمالی جماعت نے جان لیا کہ ہمیں اپنے سب سے بڑے دشمن سے واسطہ پڑا ہے یہ دونوں طرفین

لڑائی پر تل گئیں، پانچ سال تک لڑائی اور قتل وخون جاری رہا جس میں نازیوں کے چار سو آدمی کام آئے اور ... ۸۰ ہم زخمی ہوئے۔
اِس عرصے میں ہٹلر کی حیرت انگیز خطابت نے لاکھوں کروڑوں جرمنوں کا دِل موہ لیا۔ باہر کھُلی ہوا میں جلسے ہوتے تھے ہٹلر ایک برساتی کوٹ کے ساتھ اپنے معمولی پیروؤں کی طرح ایک معمولی سی بادامی قمیص پہنے آتا، سارے نازی اپنی وردی پہنے سپاہیانہ انداز میں شریک ہوتے" ہٹلر کی جے" کی فلک شگاف صدائیں سینوں میں دِل ہلا دیتیں۔ ہٹلر کی اِن زبردست تقریروں سے جرمنی اُس کا حلقہ بگوش ہوگیا۔ اس کی کیا وجہ تھی؛ اس کی محض یہ وجہ تھی کہ ہٹلر نے جرمن قوم کی خودداری کو پھر بیدار کر دیا۔ اُس نے کہا کہ جرمن اب بھی نسلی طور پر تمدّن کا بہترین نمونہ ہیں، وہ برابر چار سال تک ساری دُنیا کے خلاف اکیلے لڑے اور کامیابی سے لڑے اور اُن کی شکست محض اُن کے اپنے ہم وطن اشتمالیوں اور یہودیوں کی سازشوں کا نتیجہ تھی۔ وہ بولا" تم جرمن ہو، دُنیا کے بہترین انسان تم ہو آؤ سب ایک ہو جاؤ اور میرے پیچھے ہو لو۔ تمہاری شاندار قسمت تمہارا انتظار کر رہی ہے"۔ ۱۹۳۰ء میں جب ریشتاغ کا انتخاب ہُوا تو ۶۵ لاکھ جرمنوں نے ہٹلر کے پیروؤں کے حق میں رائے دی۔

علاوہ زورِ خطابت کے ہٹلر کی اِس ترقی کے اور بھی اہم اسباب تھے۔ جرمنی کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ جون ۱۹۱۹ء میں ورسائی کے معاہدے کے مطابق اتحادیوں نے جرمنی کے سب کپڑے لتے اُتار لئے اور دو سال بعد اُس پر ایک اتنا بھاری تاوان لگایا جس کا نصف صدی میں ادا ہونا بھی ممکن نہ تھا جن جرمن علاقوں کو خود اختیاری کے اصُول پر دوسروں کے حوالہ کیا گیا اُن میں رائے لینے کا طریقہ یقیناً فریب کاری پر مبنی تھا یعنی جرمنی کو دھوکا دے کر اُس کے بعض اعضا رکاٹ لئے گئے اور اُسے بتایا گیا کہ یہی عدل و انصاف کا تقاضا ہے۔ اگست ۱۹۱۹ء میں جرمن جمہوریہ کا" ویمر دستور" قائم ہُوا۔ اگست ۱۹۲۱ء میں تاوان مقرر ہونیکے تین ماہ بعد جرمن حکومت نے دیانتداری کے ساتھ پہلی قسط ادا کی باوجودیکہ جرمنی کی مالی حالت نہایت مخدوش تھی۔ جنوری ۲۳ء میں فرانسیسیوں نے جرمن تساہل کا عذر رکھ کر رُور پر حملہ کر دیا، جرمن حکومت کی بنیادیں متزلزل ہونے لگیں۔ یہ دیکھ کر اتحادیوں نے ۱۹۲۴ء میں ایک ڈوز کمیٹی بٹھائی تاکہ جرمنی کو اپنی حالت درست کرنے میں مدد دی جائے۔ مدعا اس کا محض یہ تھا کہ مقروض جرمنی کہیں دیوالیہ نہ ہو جائے مبادا اُس کے قرضخواہ لوٹ مار سے محروم رہ جائیں۔ اس کمیٹی کی تجاویز کے مطابق جرمنی کو کچھ قرضہ دیا گیا تاکہ وہ اپنے گھر بھر کی کچھ درستی کر سکے۔ ۱۹۲۵ء میں لوکارنو کے معاہدے کے مطابق جرمنی نے بخوشی دریائے رائن کی سرحد کو قبول کر لیا۔ ان سمجھوتوں کے باعث جرمنی کی حالت سُدھرنی شروع ہوئی لیکن حق یہ ہے کہ یہ فلاح و بہبود محض ظاہری تھی بلکہ ویمر کے دستور کے مطابق حکومت نے جو آزاد خیالی کا رویہ اختیار کیا اُس کا نتیجہ بھی محض قومی تفریق اور مایوسی ہُوا۔ اس کے بعد جب ۱۹۲۹ء میں ساری متمدن دُنیا پر کساد بازاری کا طُوفان ٹُوٹا تو ڈوبتے جرمنی کو جو تنکے کا سہارا تھا وہ بھی جاتا رہا۔ ۱۹۳۰ء میں جمہوریہ کی مخالفت بڑھتی گئی۔ نازیوں کو فروغ ہُوا اور جب ۱۹۳۱ء میں جرمن بنک یکے بعد دیگرے ٹوٹنے شروع ہوئے تو اس

کس مپرسی کے عالم میں ہٹلر آدھمکا۔ قدرتی بات تھی کہ ایک ایسے وقت میں ایک ایسا رہنما لوگوں کی آنکھوں کا تارا بن جائے!

ہٹلر کی اپنے پیروؤں کو ہمیشہ یہ ہدایت تھی کہ "تمہیں بازاروں کو فتح کرنا ہے"۔ اُس کے منظم طوفانی جنگجوؤں" کا مقابلہ ناممکن تھا، ہٹلر نے یہ بات تاڑ لی سو اُس نے ارادہ کر لیا کہ بجائے تشدد کے وہ رضامندی کے ساتھ حکومت پر قابو پائے گا۔

۱۹۳۲ء میں اُسے ہردلعزیز صدر جمہوریہ ہنڈن برگ کے مقابل میں تیس چالیس فی صدی ووٹ ملے۔ جرمن چانسلر نے اُسے اپنا نائب چانسلر بننے کی دعوت دی ہٹلر نے انکار کر دیا۔

جنوری ۱۹۳۳ء میں ہٹلر جرمن چانسلر بن گیا۔ نازیوں کے ہزاروں جلوس بڑے تزک و احتشام سے نکلے اور اکثر لوگ ہنڈن برگ اور ہٹلر کے لئے تحسین و آفرین کے نعرے بلند کرنے لگے۔

اس کے بعد دو واقعات ہوئے جن سے ہٹلر جرمنی کا مختار مطلق بن گیا۔ ۳۰ر جون ۱۹۳۴ء کو اُس نے اپنے بعض رفقا اور "طوفانی فوج" کے بعض رہنماؤں کو قتل کرا دیا۔ جرمنی میں ایک سنسنی پھیل گئی مگر کسی نے ایک لفظ ہٹلر کے خلاف نہ کہا بلکہ عام خیال بھی یہی تھا کہ یہ "جبر شدید تھا لیکن ضروری"۔ اگست میں ہنڈن برگ مر گیا اور ہٹلر نے بیک وقت اپنے چانسلر اور صدر جمہوریہ ہونے کا حکم سُنایا اور جرمن قوم نے اُس کے اس مستبدانہ فعل پر سمعنا و اطعنا کہہ دیا۔

۱۹۳۴ء میں جرمنی کا حکمران بن کر ۱۹۳۵ء میں ہٹلر نے علاقۂ سار حاصل کرنے کے بعد دُنیا کے سامنے اعلان کر دیا کہ جرمنی دوسری قوموں کے ساتھ برابری کا دعویٰ دار ہے اس لئے تا وقتیکہ دوسری قومیں اپنی فوجی طاقت کو کم نہ کریں جرمنی از سرِ نو اپنی فوجی طاقت کو بڑھاتا چلا جائے گا تاکہ وہ کسی سے پیچھے نہ رہے۔ انجمنِ اقوام نے اس کے خلاف احتجاج کیا لیکن جرمنی انجمنِ اقوام کو چھوڑ چکا تھا، اُس نے اس کی ذرا پروا نہ کی۔

اِس وقت ہٹلر کی قوت حیرت انگیز حد تک بڑھ گئی ہے کیونکہ اُس نے جرمنی کو یورپ میں بدرجہا زیادہ طاقتور بنا دیا ہے فرانس اُس سے خائف ہے۔ انگلستان کے ساتھ اُس نے بحری طاقت کے متعلق سمجھوتا کر لیا ہے۔ اطالیہ کے متعلق اُس نے اعلان کر دیا ہے کہ جرمنی حبشہ کے معاملے میں دخل نہ دے گا جس سے شبہ پڑتا ہے کہ اطالیہ کے ساتھ اُس کی کوئی خفیہ مفاہمت ہو چکی ہے۔ جرمنی کی بری طاقت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے، اُس کی ہوائی طاقت انگلستان سے زیادہ ہے۔ شہروں سے دُور جرمن دیہات میں جا بجا یہ اشتہار لگے ہوئے نظر آتے ہیں:-

"جو جرمنی کی ہوائی طاقت کی مدد کرتا ہے وہ جرمنی کی مدد کرتا ہے"۔

"جرمن قوم کو ہوا باز بننے کی اُمنگ پیدا کرنی چاہیئے"۔

ہٹلر کے نشر و اشاعت کا یہ عالم ہے کہ دن رات بازاروں میں قہوہ خانوں میں تفریح گاہوں میں پبلک باغات میں "آواز رسانوں"

ے ذریعے سے بار بار یہ الفاظ لوگوں کے کانوں میں پہنچائے جاتے ہیں:۔ "جرمن لوگ"... "ہمارا رہنما"... "جرمن نصیبہ" ... "رفاقت"... "اتحاد"... "خدمت"... "ہٹلر!... ہٹلر!... ہٹلر" —— فلپ گبز کہتا ہے میں ب دن میں یہ الفاظ سنتے سنتے تھک گیا۔ کیا جرمن قوم ایک سال کے بعد بھی ابھی اِن سے اُکتا نہیں گئی۔ مگر جرمن قوم کے دِل حالت کچھ اور ہے۔ اُن کا ملک عملی طور پر اتحادیوں کا غلام ہو چکا تھا اور اِس غلامی سے رہائی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی، ہ اپنی خودداری کھو چکے تھے، مایوسی کے بادل اُفق پر چھائے رہتے تھے کہ ہٹلر رعد کی کڑک بن کر اُن کی آبادی میں آیا، اُمید نے نہیں پھر زندہ کر دیا!

ہٹلر کہتا ہے "ہم دُنیا کو فتح کرنا نہیں چاہتے، ہم تو صرف اپنے وطن کو فتح کرنا چاہتے ہیں۔ ہم امن پکارتے ہیں اور ہمارا مدعا بھی ن ہی ہے لیکن اصلی امن محض مساوی حقوق اور تحفظ کے ذریعے سے قائم ہو سکتا ہے"۔

اُس نے لیگ کو چھوڑا کہ وہاں برابری نہیں اور محض بک بک جھک جھک ہوتی ہے۔ وہ یہودیوں کا جانی دشمن ہے، بیسویں صدی میں نازی جرمنی نے ان کے ساتھ وہ شرمناک ناروا داری دکھائی ہے جس سے پندرھویں سولھویں صدی کے بھیانک واقعات پھر تازہ ہو گئے ہیں۔ بدقسمتی سے ہٹلر ان سے دشمنی کرنا جرمن نسل کے فروغ کے لئے ضروری سمجھتا ہے۔

ہٹلر جرمنی کے نوجوانوں کا بُت ہے جس کی وہ اندھا دُھند پرستش کرتے ہیں۔ وہ زور و قوت پر زور دیتا ہے، وہ شور مچاتا ہے، جلسوں جلوسوں میں شریک ہونے کیلئے انتہائی سُرعت کے ساتھ جرمنی کے ایک شہر سے دوسرے شہر کو اُڑتا چلا جاتا ہے ، وہ داری اور اُمید اور اعتمادِ نفس کا ڈنکا بجاتا ہے پھر شباب جو زور و قوت، شورش و سرعت اور خودداری اور اعتمادِ نفس اور اُمید کا سرچشمہ ہے کیونکر اُس کی طرف کھچا نہ چلا جائے۔ بڈھے اور ادھیڑ عمر کے لوگ جو امن و امان کے خواہشمند ہیں طوعاً و کرہاً خاموش ہیں اور کاروباری دمی ملک کی معاشی تنگ حالی سے نالاں ہیں لیکن جوان صرف مطمئن نہیں بلکہ خوش ہیں اور پُرجوش اور مصروفِ عمل۔ اُن میں خدمت کا ذبہ پیدا ہو گیا ہے، شبابی تحریک جرمنی میں اپنے زوروں پر ہے، طلبہ مزدوروں اور کسانوں کے ساتھ مِل جُل کر کام کرتے ہیں، "مشترک زم مشترک حفاظت" یہ الفاظ اُن کے کانوں میں گونجتے ہیں اور اُن کے دِل اُمید سے لبریز ہیں کیونکہ اُن کی آنکھیں دُور جرمنی کے ناندار مستقبل پر لگی ہیں جس کی تصویر ہٹلر نے اُن کے سامنے جھلکائی ہے!

ہٹلر جرمنی کو دُنیا کی سب سے بڑی قوم بنانے کا خواہاں ہے اور اُسے یقین ہے کہ قدرت نے اُسے محض اسی مطلب کے لئے پیدا کیا ہے۔ اُس کی زندگی نہایت خشک اور سادہ ہے۔ وہ ترکاری نوش ہے، وہ نہ سگریٹ پیتا ہے نہ شراب۔ وہ کسی قسم کی ورزش بھی نہیں کرتا صرف وہ موسیقی سے اپنی تفریح حاصل کرتا ہے۔ وہ دِن بھر مصروف رہتا ہے اور کھانے اور چائے پارٹیوں میں شریک نہیں ہوتا۔ وہ عموماً اپنے طوفانی جنگجوؤں کی سی وردی پہنے رہتا ہے اور اس کے سینے پر ایک آہنی صلیب لٹکتی ہے۔ وہ شان و شوکت

سے گریز کرتا ہے اور اپنے آپ کو صرف "طوفانی جنگجو" ۱ے پکارتا ہے۔ وہ بہت متین ہے۔ بے تامل گفتگو کرتا ہے وہ کبھی مسکراتا نہیں سوائے اُس وقت کے جب کوئی بچہ اُسے پھولوں کا ہدیہ دے!

کون کہہ سکتا ہے کہ اگر ساڑھے چھ کروڑ آدمیوں کا یہ مطلق العنان حاکم آج مرجائے یا رُوپوش ہو جائے تو اُن کے مستقبل پر اس کا کیا اثر پڑے؟

مسولینی

اگرچہ اطالیہ جنگِ عظیم میں فاتح اتحادیوں کے ساتھ ہو کر لڑا مگر لڑائی کے انجام پر وہ فی الحقیقت ایک شکست زدہ ممالک تھا۔ میدانِ جنگ میں اطالوی عموماً پسپا ہوتے رہے یوں بھی مدتوں سے اُن کی بزدلی ضرب المثل تھی، اسی لئے صلح ہونے پر اتحادیوں نے اُن سے اپنے وعدے پورے کرنا ضروری نہ سمجھا۔ جنگ کے بعد اطالیہ کی معاشی حالت روز بروز اور بھی خراب ہوتی گئی۔ ہڑتالیں پہلے سے بھی زیادہ عام ہوگئیں اور اشتراکی جماعت حکومت کو تہ وبالا کرنے لگی۔ پارلیمنٹی نظام جو انگلستان کے نمونے پر قائم کیا گیا تھا ملک کی فضا کے لئے ناموزوں تھا، دارالنائبین میں عموماً تنازعات پاتے تھے صنعتی ترقی سے ملک میں بے چینی بڑھ گئی تھی، نچلے طبقے اپنی حالت سے خوش نہ تھے اور اشتراکیوں نے ملک کے طول وعرض میں ایک اُودھم مچا رکھا تھا۔ یہ حالت تھی جب مسولینی نے ۲۳ مارچ ۱۹۱۹ء میں اپنے اخبار کے دفتر میں پہلی فاشی جماعت کی بنا ڈالی۔

یہ مسولینی جس کا خاندان کسی زمانے میں متوسط درجے کا تھا ایک دیہاتی لوہار کا بیٹا تھا۔ وہ ۱۸۸۳ء میں پیدا ہوا۔ اُس کی تعلیم وتربیت ایسی تھی کہ ملک اور خاندان کے قواعد کی پابندی کی اہمیت گویا اُس کی گھٹی میں تھی اور یہی چیزیں بعد میں اُس کے فلسفۂ فاشیت کی بنیاد قرار پائیں۔ اوّل اوّل وہ ایک نائب معلم بنا لیکن ایک سال کے بعد وہ کسی اور بہتر کام کی تلاش میں سوئٹسان کو چلا گیا، اس وقت اُس کی جیب میں تقریباً دو لیرے تھے اور کچھ دیر وہ معمار کا کام کرتا رہا۔ لیکن ابھی اُس کا دل کسی خاص ٹھکانے نہ لگتا تھا اور وہ عموماً اشتراکی کتابیں پڑھتا اور انقلابی تحریکوں میں حصہ لیتا چنانچہ اسی سلسلے میں آئندہ چند سال میں وہ پہلے سوئٹسان سے پھر فرانس سے اور پھر آسٹریا سے ملک بدر کیا گیا۔ مسولینی کے لئے یہ سارا وقت ضائع نہ ہوا بلکہ اس زمانے میں دُنیا اور دُنیا والوں سے اُس کی مڈبھیڑ ہوئی۔ وہ فرانسیسی اور جرمن زبانوں کا ماہر بن گیا اور سیاسی حالات سے بخوبی واقف ہو گیا۔ اسی لئے جب وہ اطالیہ میں واپس پہنچا تو اُسے بغیر وقت کے ایک اشتراکی اخبار کی ادارت کا کام مل گیا۔ اس کام کو اُس نے ایسی خوش اسلوبی سے نبھایا کہ ۱۹۱۲ء میں وہ اطالیہ کے سب سے مشہور اشتراکی اخبار "اوانتی" کا مدیر منتخب ہوا۔ وہ اشتراکیوں کو اُکساتا رہا کہ وہ کچھ کر دکھائیں لیکن یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ اشتراکیت اُس کی نظروں میں بجائے خود کوئی اعلےٰ شے نہ تھی بلکہ وہ تھی محض ایک



مسولینی



رلیہ اُس کے وطن کے فروغ و کمال کا۔

جنگِ عظیم چھڑنے پر سولینی کے خیالات میں ایک عظیم الشان تبدیلی واقع ہوگئی۔ اُس نے سمجھ لیا کہ اگر اطالیہ غیر جانب دار بنا رہا ؛اُس کی رُوح گویا کھو جائے گی۔ اُس نے اشتراکی اخبار کی ادارت چھوڑ کر خود اپنا ایک اخبار" اِل پوپولو ڈیطالیہ" (اہلِ اطالیہ) جاری کیا۔ شتراکی جماعت نے اُسے اپنے دائرے سے خارج کر دیا، اُس نے ان قابلِ یادگار الفاظ میں اُن کا جواب دیا" آج رات تم مجھے اپنے ائرے سے اور اطالیہ کے چوکوں اور بازاروں سے خارج کرنے لگے ہو۔ بہت خوب، میں دعوے سے کہتا ہوں کہ میں بولنا بند نہیں کروں گا اور چند سالوں میں اطالیہ کے تمام لوگ میرے پیچھے ہو لیں گے اور مجھ پر تحسین و آفرین کہیں گے اور تمہیں کوئی پوچھے گا بھی نہیں"۔

۱۹۱۵ء میں اطالیہ جنگ میں شریک ہوا۔ سولینی کو بھی بھرتی کا حکم ملا۔ فروری ۱۹۱۷ء میں وہ زخمی ہو کر واپس آیا اور پھر اپنے خبار کا کام کرنے لگا۔ صلح ہوگئی لیکن جب اطالیہ کو غنیم کے اموال و ممالک میں سے بہت کم حصہ ملا تو اہلِ اطالیہ صلح کے نتائج سے سخت بیزار ہو گئے۔ ملک میں بے چینی پھیلی اور اشتراکی جماعت نے ایک طوفان برپا کر دیا۔ سولینی نے تاڑ لیا کہ ان "سرخ" لوگوں کا زور صرف زور و قوت سے ہی ٹوٹ سکتا ہے، چنانچہ اُس نے ۲۳ مارچ ۱۹۱۹ء کو ملان میں اپنے اخبار کے دفتر میں پہلی فاشیو یعنی فاشی جماعت کی بنا ڈالی اور اُس دن سے اشتراکیوں کے خلاف روز و شب ایک بے پناہ جنگ شروع کر دی۔ پہلے اس کام میں دقتیں پیش آئیں لیکن فاشی جنگ قائم رہی اور بتدریج عوام الناس اشتراکیت سے بیزار اور فاشیت کے دلدادہ ہونے لگے۔ حکومت بھی اشتراکیت سے خائف تھی سو اُس نے بھی دخل نہ دیا۔ یہاں تک کہ آخر کار ۱۹۲۲ء میں فاشیوں نے فیصلہ کیا کہ وہ عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ چنانچہ ۳۰ اکتوبر کو سولینی کی قیادت میں ۵۰،۰۰۰ فاشی روما کے شہر میں داخل ہوئے اور بغیر خون کا ایک قطرہ بہائے اُس پر قابض ہو گئے۔ حکومت پسپا ہوگئی۔ بادشاہ نے مارشل لا جاری کرنے سے انکار کیا اور دار النائبین نے سولینی کی کارروائی کو جائز قرار دیا۔ اُس دن سے آج تک اطالیہ کا اصلی حاکم صرف سولینی رہا ہے!

تین سال تک سولینی کا کام ہر ممکن ذریعے سے اپنے مخالفین کی سرکوبی کرنا رہا۔ ۱۹۲۳ء میں فاشی جبر و ظلم یعنی مار پیٹ، لڑائی بھڑائی کیسٹر آئل (جلاب) کی زبردستی خوراکیں یہ سب کچھ جاری رہا۔ ۱۹۲۴ء میں ملکی مجلس کے ایک ہر دلعزیز اشتراکی رُکن کے قتل سے ناراض ہو کر جمہوری جماعتیں سولینی کے خلاف متحد ہو گئیں۔ یہ کشمکش تھوڑی دیر جاری رہی لیکن سال کے اخیر تک جب ڈوز کمیٹی کی تجاویز کے بعد وسطی یورپ میں امن و امان قائم ہو گیا تو سولینی کے مخالفین کا بھی قلع قمع ہو گیا۔

اب اطالیہ کی فاشی تعمیر و تنظیم شروع ہوئی۔ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۷ء تک اور بعد میں ملکی مجلس کے ذریعے سے وہ قوانین نافذ ہوئے جن کے طفیل آج سولینی وزیرِ داخلہ وزیرِ خارجہ وزیرِ ہوا وزیرِ بحر وزیرِ تجارت وزیرِ صنعت وزیرِ نوآبادیات وزیرِ جنگ اور وزیرِ اعظم سب کچھ ہے۔ ملکی مجلس ہیچ ہو گئی کیونکہ قانون سازی کا اختیار فاشی مجلسِ عظمٰے کے سپرد کر دیا گیا جو ۱۹۲۹ء میں باقاعدہ طور پر ملکی دستور کا جزو قرار

دی گئی۔ انتخاب کا طریقہ یک قلم تبدیل کر دیا گیا، تجارتی شخصیے فاشی مجلس کے سامنے کچھ نام پیش کرتے ہیں مجلس اس فہرست میں کچھ اور نام داخل کر کے پھر ان ہزار بارہ سو ناموں میں سے چار سو اشخاص چُن لیتی ہے۔ پھر قوم کی طرف سے ایک نام نہاد انتخاب ہوتا ہے جس میں ساری قوم انہیں چار سو اشخاص کو اپنے نمائندے قرار دیتی ہے، یوں منتخب ہوتا ہے اور یوں وجود میں آتا ہے اطالیہ کا دار العوام۔

اطالیہ ایک مفلس ملک تھا۔ مسولینی نے اس کے افلاس کو دُور کرنے اور اُسے دوسروں کی امداد سے آزاد کرنے کا تہیّہ کر لیا۔ اُس نے ارادہ کیا کہ گیہوں کی پیداوار بڑھائی جائے، برقی قوت میں اضافہ کیا جائے، ہڑتالوں کے مرض کا سدِّباب کیا جائے۔ اِس کا ایک ہی حل تھا اور وہ یہ کہ زراعت، صنعت، مالیات، محنت غرض کہ قوم کی ساری معاشی زندگی میں ایک مرکزی انضباط قائم کیا جائے مشین کے سارے پرزے ایک ہستی کے اشارے پر کام کریں اور وہ ہستی مسولینی کے ہاتھ میں ہو۔ مزدوروں کی انجمنیں منسوخ کر دی گئیں اور ہر مقامی صنعت کے لئے ایک آجروں کی اور ایک مزدوروں کی مجلس تجویز کی گئی لیکن ان میں صرف انہیں مجلسوں کو منظور شدہ قرار دیا گیا جو فاشی عقیدہ رکھتی ہوں۔ اِن مقامی مجلسوں کے اُوپر صُوبجاتی اور اُن کے اُوپر قومی مجلسیں اور پھر سب کے اوپر شخصیات کی ایک بڑی قومی مجلس قائم کی گئی۔ اس فوجی سے نظام کا قائدِ اعظم مسولینی تھا۔ یہ تھی ۱۹۲۷ء کی مشہور "سندِ محنت"۔ یہ واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ فاشی مجلسِ عظمٰے مسولینی کا جانشین بھی منتخب کر چکی ہے اور وہ اس طرح کہ اُس نے تین شخص منتخب کئے جن میں سے بادشاہ مسولینی کی موت یا علیحدگی پر ایک شخص کو چُن لے گا۔

یہ تھا فاشیت کا ڈھانچا اور اس کی رُوح تھی فاشیت کا عقیدہ۔ اِس عقیدے پر کامل طور پر اعتقاد کرنا اور کرانا یہ رہا ہے گذشتہ دس سال میں مسولینی اور اُس کے فاشیوں کا کام اور اس کے سرانجام دینے میں اُنھوں نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا کوئی اچھا بُرا ذریعہ نہیں جو انھوں نے استعمال نہ کیا ہو۔ بچے انہیں سکولوں میں جاتے ہیں جہاں فاشیوں کے مدّاح معلم ہوتے ہیں وہ ایسی ہی کتابیں پڑھتے ہیں جو فاشی عقیدے کے مطابق لکھی گئی ہیں۔ اُن کے پیشِ نظر ہر وقت حضرتِ مسولینی کی تصویر رہتی ہے اور انہیں دیواروں پر بار بار یہی فقرہ لکھنا سکھایا جاتا ہے کہ "مسولینی ہمیشہ راستی پر ہے"۔ سب سے تعجب انگیز بات یہ ہے کہ انہیں گیت گانا سکھایا جاتا ہے کہ اطالیہ ہی تھا جس کے ہاتھوں وتوریو وِنیتو کے میدان میں جنگِ عظیم میں فتح حاصل ہوئی اور سکول کے باہر لڑکے لڑکیوں کو فوج کی صُورت میں قواعد سکھائی جاتی ہے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں وہ فاشی جماعت کے رُکن بن سکتے ہیں۔ اسی طرح تمام اخبارات فاشی جماعت کے اختیار میں ہیں۔ ہر ایک کے پہلے صفحے پر ایک ہی طرح کے فاشی اعلانات، فاشی جلسوں جلوسوں کا ہو بہو ایک ہی طرح کا بیان شائع ہوتا ہے۔ فاشی عقیدہ مختصراً یہ ہے "میں مملکت کا معتقد ہوں جس کے باہر میں کبھی پوری مردانگی حاصل نہیں کر سکتا۔ مجھے اطالیہ کے اس مقدس نصیبے پر اعتقاد ہے کہ وہ دُنیا میں سب سے زیادہ رُوحانی اثر پیدا کر سکتا ہے میں ال دوچے مسولینی

شخصیے۔ Corporations +   سندِ محنت۔ Labour Charter +

کا تابع رہوں گا کیونکہ بغیر متابعت کے صحت ممکن نہیں"۔ یہ ہے اطالوی فاشیت۔ مسولینی کے خیال کے مطابق فاشیت بین الاقوامیت نہیں ہے خواہ بین الاقوامیت اچھی ہو یا بری اور وہ اشتراکیت نہیں ہے بلکہ وہ اشتراکیت یا "مارکسیت" کے عین منافی ہے جو ہمیں انسانی معاشرہ کے طبقات میں ایک لازمی جنگ اور بے پناہ کشمکش کا یقین دلاتی ہے۔ اور نہ فاشیت ہے جمہوریت جس کے مطابق ارکان فقط ارکان ہونے کے باعث انسانی معاشرہ کے رہنما بن جاتے ہیں اور گاہے گاہے کسی مشورت کے ذریعے حکومت کرتے ہیں، بلکہ فاشیت نوعِ انسان کی مفید اور دائمی عدم مساوات کی حامی ہے جو محض اک عالمگیر رائے دہندگی سے دُور ہو سکنے والی شئے نہیں۔ اور نہ فاشیت ہے "امن پسندی"، اور فاشیت کو عالمگیر صلح میں یقین نہیں کہ یہ نہ ممکن ہے اور نہ مفید۔ اسی لئے فاشیت "امن پسندی" کو جس کے معنی فقط مغلوبیت اور بزدلی ہیں لغو سمجھتی ہے۔ صرف جنگ ہی ہے جس سے انسان کی تمام توانائی اپنی قوی ترین حالت میں آتی ہے اور ان لوگوں پر شرافت کی ایک مُہر لگا دیتی ہے جن میں اتنی ہمّت و شجاعت ہو کہ وہ اُس سے دلیرانہ دوچار ہو سکیں"۔ "مجھے دائمی صلح میں ذرّہ برابر یقین نہیں، وہ انسان کے بہترین اوصاف کے منافی ہے کہ ان اوصاف میں اگر آب و تاب پیدا ہوتی ہے تو صرف جدوجہد سے۔ چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو اطالوی قوم اپنے مستقبل کا مکمل پابندیٔ قواعد کے ساتھ سامنا کرے گی"۔

پاپائے روما کے ساتھ جو اطالوی حکومت کا برسوں سے تنازعہ تھا وہ مسولینی کی کوشش سے ۱۹۲۹ء میں خوش اُسلوبی کے ساتھ طے ہو گیا۔ کیتھلیت کو یہ اختیار نہ رہا کہ وہ جس طرح چاہے اطالویوں کی تعلیم میں دخل دے۔ اخلاقی و مذہبی تعلیم کے ساتھ حکومت نے طلبہ میں قومیت و ہمت کے جذبات پیدا کرنے کا حق حاصل کیا۔ پاپا کو اُس کے مختصر سے شہر کی چاردیواری میں خود مختار تسلیم کر لیا گیا۔ یوں مسولینی نے پاپا سے صلح کر لی اور اُس کے مدّاح کہتے ہیں کہ وہ بادشاہ سے بھی اہم معاملات میں عموماً "مشورہ" لیتا ہے۔

مسولینی نے معاملاتِ خارجہ کی طرف خاص طور پر توجہ کی ہے اور اپنی قوت کے مظاہروں اور سیاسی جوڑ توڑ سے اطالیہ کو یورپ میں پہلے سے بدرجہا زیادہ طاقتور بنا دیا ہے۔ اختیار حاصل کرتے ہی مسولینی نے یونان سے ایک تنازعہ کے سلسلے میں یونانی جزیرے کورفو پر گولہ باری کی، بغیر اتحادیوں کی اجازت کے یوگوسلاویا سے سمجھوتا کر کے فیوم کے شہر پر قبضہ کر لیا اور البانیا کے آزاد ملک کو مالی مدد دے کر اُس کو اطالیہ کے سایۂ غلامی میں لے لیا۔ اس کے بعد اُس نے فرانس سے چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ فرانس میں دس لاکھ کے قریب اطالوی مزدور کام کرتے تھے اور فرانس کی نو آبادی طونس میں اطالوی زیادہ تھے فرانسیسی کم۔ ان کی موجودگی تشویش کن تھی۔ نیز اطالیہ اپنے طرابلس کے علاقے کو وسیع کرنا چاہتا تھا۔ فرانس اِن باتوں سے ناراض تھا۔ اُدھر مرکزی یورپ میں فرانس "اتحادِ صغیر" کی پشت پناہ بنا ہوا تھا اور اطالیہ کو یہ بات ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ اس کے مقابل میں اطالیہ نے بتدریج آسٹریا اور ہنگری سے جو اب کمزور ہو چکے تھے رسم و راہ بڑھائی

مارکسیت۔ Marxism ۔ اشتمالیت۔ Communism ۔

اشتراکیت۔ Socialism ۔ (اشتمالی مارکس کے نظریے کے معتقد ہیں)

اور جرمنی کے مقابل میں ہوکر آسٹریا کی آزادی پر اصرار کیا ۔ یورپ کی قومیں اطالیہ کی بے نقاب کھُلی عسکریت سے خوف کھانے لگیں ۔ مسولینی نے بہت سے حربی کارخانے قائم کئے فوج کو بڑھایا اور ۵۰۰ جنگی طیارے تیار کئے گو ساتھ ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا رہا کہ اطالیہ تخفیف اسلحہ کا حامی ہے ۔

مسولینی لیگِ اقوام کا مؤید نہیں ۔ وہ کہتا ہے کہ لیگ فقط تدبیر کا ایک معمولی سا آلۂ کار ہے وہ دوَلِ عظمٰے کے اوپر کوئی عظیم ترین دولت بن کر قائم نہیں ہوسکتی ۔ اور وہ معاہدوں کی دائمی بندش سے آزاد رہنا چاہتا ہے چنانچہ اُس نے ایک دفعہ ملکی مجلس میں بہ حیثیت وزیرِ اعظم کے کہا کہ "معاہدے ازلی نہیں ہوتے کہ تبدیل نہ کئے جاسکیں ۔ وہ فقط تاریخ کی کتاب کے ابواب ہیں وہ اُس کا خاتمہ نہیں" ۔ "دوَلِ اربعہ کا معاہدہ" جس کے مطابق برطانیہ فرانس جرمنی اور اطالیہ نے یورپ کے مسائل پر غور و پرداخت کا تہیہ کیا خاص مسولینی کا منصوبہ ہے ۔ مختصر یہ کہ مسولینی نے اطالیہ کو دوَلِ عظمٰے کے دائرے میں ایک زبردست دولت بنا دیا ہے بلکہ حال میں (اکتوبر ۱۹۳۵ء میں) ساری دُنیا کی متفقہ آواز کے خلاف معصوم کمزور حبشہ پر چڑھائی کر کے اُس نے اپنی قوت تکبر اور خودسری کا پورا پورا ثبوت دے دیا ہے ۔ بلاشبہ اس ظالمانہ جنگ کے نتیجے ہولناک ہوں گے لیکن مسولینی کا خیال ہے کہ انگلستان اور فرانس کو جو خود گزشتہ سو سال میں دُنیا کے اکثر حصوں پر بزور قابض ہو چکے ہیں زیبا نہیں کہ وہ اطالیہ کے اس جبر و تشدد پر چیں بہ جبیں ہوں ۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم فرانس اور جرمنی کے ساتھ اطالیہ کا کوئی خفیہ سمجھوتا اس بارے میں ہو چکا ہے ۔ یہ سب حضرت مسولینی کی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ ہے ۔ اِس میں شُبہ نہیں کہ مسولینی بڑا ہوشیار اور چالاک اور زبردست مدبّر ہے اور اُس نے کامیابی کے ساتھ زور و جبر کے مظاہروں سے اپنی اور اطالیہ کی قوت کا بُت عین متمدن دُنیا کے چوک میں جا کر نصب کر دیا ہے لیکن عموماً بالآخر ایسے جابروں کے غرور کا سر نیچا ہو کے رہتا ہے ۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے ؛

مسولینی نے اطالیہ کو قوی بنا دیا ہے ۔ اطالوی قوم میں پہلے کی نسبت تنظیم، محنت، خودداری اور ہمت کی خوبیاں پیدا ہوگئی ہیں ۔ اُس میں جوش زور آزمائی اور تُند خوئی کے اوصاف رُونما ہیں ۔ یہ اوصاف کچھ اچھے ہیں کچھ بُرے ۔ دیکھنا یہ ہے کہ اِس حیرت انگیز انقلاب کا نتیجہ کیا ہوگا ؛

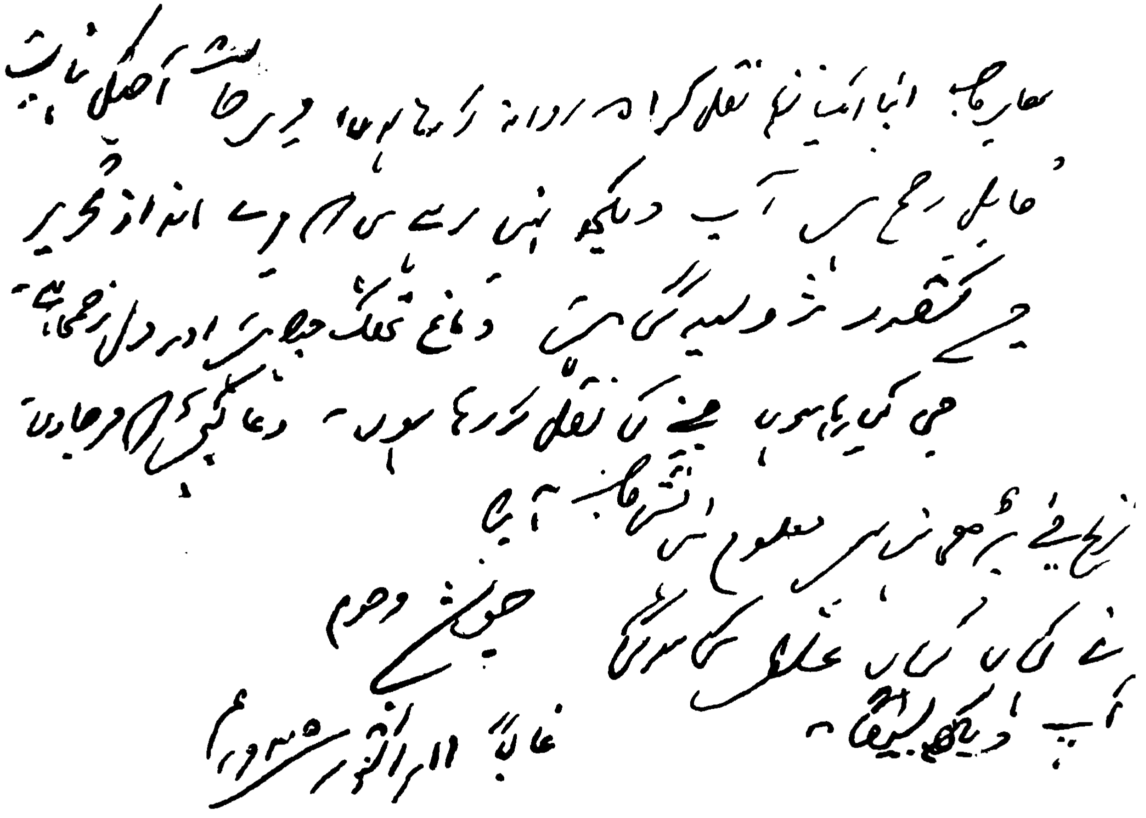
(باقی)

بشیر احمد

چھوڑ سب کچھ بھُول جا آرام لے
آدمی بن اور خُدا کا نام لے

ب

شام کی بزم آرائیاں



جھٹپٹا ہونے لگا تاریکیاں چھانے لگیں
بدلیاں جنگل میں اک وحشت سی برسانے لگیں

صبح کی رنگینیاں خواب پریشاں ہو گئیں
ظلمتیں غمگیں فضا میں بال بکھرانے لگیں

پھول کملائے چراگاہوں کا رنگ اڑنے لگا
ساحل خاموش پر مایوسیاں چھانے لگیں

تیرگی پھیلی، درخت اک دوسرے سے مل گئے — دہشتیں صحرا کے دل میں پیچ و خم کھانے لگیں
کروٹیں لیں یوں شفق نے آسماں پر جلد جلد — ناگنیں سی سبزۂ خودرو پہ لہرانے لگیں
طائروں نے پر سمیٹے جھک گئیں شاخیں تمام — سو گئے ذرّے ہوائیں آنکھ جھپکانے لگیں
رُک کے دریا روح سے سرگوشیاں کرنے لگا — تھم کے موجیں چرخ کو آئینہ دکھلانے لگیں

پھر گھنے جنگل میں چھیڑا غم کی دیوی نے ستار
پھر خنک تاروں کی آنکھیں اشک برسانے لگیں

پھر خموشی کی حدیثِ غم نے بسمل کر دیا — پھر شفق کی داستانیں خون رُلوانے لگیں
جتنی چوٹیں دل پہ کھائی تھیں اُبھر آئیں تمام — جتنی شکلیں دل میں پنہاں تھیں نظر آنے لگیں
پھر کسی عشوے کا پرتو، روح میں غلطاں ہوا — پھر کسی محفل کی شمعیں دل میں تھرّانے لگیں
پھر تخیل کو اندھیرے نے سجھایا راستہ — پھر تصور میں گھٹائیں برق چمکانے لگیں
تیرگی نے پھر منوّر کر دیا قصرِ دماغ — ظلمتیں پھر حافظے میں نور دوڑانے لگیں
میٹھا میٹھا درد پھر سینے میں پیدا ہو گیا — صحبتیں بچھڑی ہوئی پھر ہائے یاد آنے لگیں

تا کُجا تاریک جنگل میں یہ بزم آرائیاں
جوشؔ اب گھر چل، کہ گہری بدلیاں چھانے لگیں

جوشؔ ملیح آبادی

جَو کی روٹی، مٹی کا پیالہ

(۱)

تاریخی واقعہ صرف اس قدر ہے کہ جب ایران سے شہنشاہ ہمایوں از سرِ نو قسمت آزمائی کے خیال سے روانہ ہونے کو تھے تو کسی غیر معمولی قلبی کشش سے متاثر ہو کر انہوں نے اپنی پھوپھی زاد بہن کو فرمانہ خط لکھا کہ آپ میرے ہمراہ ہندوستان چلیں۔ خانم جہاں اس خط کے پہنچتے ہی مع اپنی کمسن لڑکی کے ایران کی سرحد پر آپہنچی۔ تیموری آداب کا تقاضا یہ تھا کہ ہمایوں خود مشیرہ کی خدمت میں حاضر ہو۔ ایرانی جاہ پرستوں کا مشورہ یہ تھا کہ خانم جہاں محل میں حاضر ہو کر دربار داری کریں مگر تیموری غیرت غالب آئی اور ہمایوں ایک سعادت مند چغتائی کی حیثیت سے خانم جہاں کے خیمہ میں حاضر ہوا۔ ترکی بھولی تو نہ تھی مگر ایران میں دس سال کی آرام طلبی نے کچھ کچھ ترکی طرزِ تکلم سے ناآشنا سا کر دیا تھا۔ خانم جہاں مسکرائی اور بھائی کی پیشانی پر خواہرانہ اظہارِ الفت کر کے بولی:-

خانم جہاں - مرزا! زبان گئی تو کہیں چغتائی تلوار نہ لڑکھڑائے!

ہمایوں - اکا - آپ ہمراہ ہونگی تو بجلی کی طرح چمکے گی۔ افغان کھوپری کو کدو کی طرح کاٹے گی۔

خانم جہاں - انشاء اللہ، مرزا! میرے پاس یہ مٹی کا پیالہ ہے، جَو کی روٹی ہے۔ چنگیز اور تیمور کے گھرانے کی لڑکیاں بھائی کی اس سے بڑھ کر خدمت نہیں کر سکتیں کہ سمرقند کا پانی سمرقند کی مٹی میں پیش کریں۔ پانی پیو، جَو کی سوکھی روٹی کھاؤ اور یہاں سے کم از کم دس کوس پر جا کر دم لو۔ اگر ہندوستان فتح کرنا ہے تو رات کو دن کر دو۔

خانم جہاں کے الفاظ ہمایوں کی تیموری رگوں میں برقی اثر پیدا کر گئے۔ یا تو کچھ دن آرام کا خیال تھا یا فوراً حکم دیا:-

"دم نہ لو - بڑھو - اُڑو"

یہ حکم ترکی میں تھا۔

(۲)

ہندوستان فتح ہو گیا۔ ہمایوں جمنا کے کنارے ہند کی گود میں جا لیٹا۔ خانم جہاں خواب و خیال ہو گئی۔ اس کی کمسن لڑکی جس کی شادی خالص چغتائی خاندان میں ہوئی تھی کافی عمر پا کر سمرقند کی مٹی میں مٹی ہو گئی۔

(۳)

شاہنشاہ جہانگیر ایک دن نورجہاں سے کچھ ناراض سے تھے۔ اس خفگی میں تیموری خون کا جو نصف حصہ باقی تھا وہ کچھ کھولا۔ دادا کی پھوپھی زاد بہن کا مٹی کا پیالہ، جو کی روٹی یاد آئی۔ ترکی ابھی بھولی نہ تھی۔ ترکی میں مراسلہ لکھا اور حکم دیا کہ مع تحائف خانم جہاں کی نواسی کی خدمت میں سمرقند جا کر پیش کرو۔

مُراسلہ نہ تھا روحانی تڑپ کا مرقع تھا۔ یعنی جہانگیر کا رُواں رُواں دُہائی دے رہا تھا کہ "اے میرے آبائی وطن میری فریاد سُن۔ سپاہی زادہ ہو کر قفسِ عیش میں بند ہوں مجھے رہا کر دے۔ راحت پسند کو پھر شمشیر زن کر دے۔ میں تجھ تک پہنچ نہیں سکتا تُو مجھ تک کسی صُورت میں آ جا۔ اے کاش کہ کوئی تو میرا اپنا ہو"۔ گویا خط نہ تھا قلبی کشمکش کی بولتی ہوئی تصویر تھی اور کیوں نہ ہوتی؛ خون کو خون پکار رہا تھا۔

(۴)

خانم جہاں کی نواسی رشید جہاں خط دیکھ کر حیران ہوئی مگر تیموری فہم، تیموری عزم دونوں برقرار تھے۔ سمجھ گئی اور جہانگیر کے تحائف سمرقند میں تقسیم کر کے ایک گھوڑے پر آپ، دوسرے پر ایک چنگیزی جاں نثار سمرقند سے چل پڑی۔ لاہور عین اُس وقت پہنچی جب شاہنشاہ جہانگیر کشمیر کے سفر کی تیاری میں تھے۔ شاہنشاہ کو بھول بھی چکا تھا کہ کسی کو بلوایا ہے۔ نورجہاں سے جو عارضی ملال ہُوا تھا مدت سے مٹ چکا تھا۔ اطلاع ہوئی کہ رشید جہاں سمرقند سے آ پہنچی۔ نورجہاں کو اشارہ کیا کہ ہماری آپا ہے تم جا کر لوا لاؤ۔ وزیر بولا:-

وزیر۔ جہاں پناہ! جان بخشی ہو تو عرض کروں۔

شاہنشاہ۔ ہاں۔ کیا ہے۔

وزیر۔ شاہزادی رشید جہاں کا پیغام ہے کہ تیموری آداب کے مطابق مرزا خود ہماری خدمت میں حاضر ہو۔

شاہنشاہ۔ وہ ٹھیک فرماتی ہیں۔ شاہنشاہ اگر میں ہوں تو ہندوستان کے لئے ہوں۔ اُن کے لئے تو واقعی صرف مرزا ہوں۔ کہلا بھیجو کہ میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔

ادا شناسِ ایران بھلا کب چوکتا تھا۔ بادشاہ سلامت کا رُجحان دیکھتے ہی نورجہاں نے اشارہ کیا۔ سونے چاندی کے ظروف، اطلس کمخواب کے تھان، اشرفیوں کی تھیلیاں۔ پالکیاں۔ فرش فروش، خیمے، غلام، لونڈیاں، خواجہ سرا۔ داروغہ۔ بڑ[ا] قافلہ رشید جہاں کے مختصر خیمہ کے سامنے آن کی آن میں موجود ہو گئے۔ ملکہ نورجہاں کی اس شاندار پیش کش نے شاہزادی رشید جہاں کے دل پر خاص اثر کیا، مگر ابھی کچھ کہنے نہ پائی تھی کہ بادشاہ سلامت تشریف لائے۔

شید جہاں ۔ مرزا! نانی مرحومہ کی وصیت تھی کہ وہ مٹی کا پیالہ جس میں ہمایوں نے پانی پیا محفوظ رہے۔ وہی لائی ہوں۔ تو سمرقند کا پانی پیو۔ سمرقند کے جو کھاؤ اور دس کوس پر جا کر دم لو۔

انگیر۔ زہے قسمت کہ دادا جان کے استعمال شدہ پیالہ میں سمرقند کا پانی نصیب ہو۔ لائیے۔

شید جہاں ۔ بسم اللہ۔ مگر یہ نہ بھولے کہ دس کوس پر دم لینا ہوگا۔

انگیر۔ نہیں ہرگز نہیں۔

پانی پیتے ہی پھر ترکی میں حکم ہوا:۔

"دم نہ لو۔ بڑھو۔ اُڑو"

(۵)

رشید جہاں نے چار مہینے درباداری میں کشمیر میں کاٹے۔ شاہنشاہی جشن شبانہ عیش جاودانہ سے خوگر نہ ہوئی موقع ...تی تو اپنے چنگیزی جان نثار کو ہمراہ لے کر کشمیر کے کوہستانی علاقوں میں کبھی سوار کبھی پیادہ خنجر آزمائی کرتی رہتی۔ تیندوا ...یچھ، شیر جو مل جائے مُنہ نہ موڑتی۔ ایک شیر نے زخمی بھی کیا۔ مگر تیموری رگ و ریشہ زخم کی کیا پروا کرتا؛ بنا ہی زخموں سے ...چھا ہونے کے لئے تھا۔ جہاں پناہ نے دو ایک دفعہ دبی زبان میں جرأت کی داد بھی دی مگر ڈرتے ڈرتے اس لئے کہ تیمور کی اولاد کے لئے مرد ہو یا عورت جرأت کوئی فخر نہ تھا۔ اشارۃً یہ بھی کہا کہ تنہا شیر کا مقابلہ ہو جائے تو مضائقہ بھی نہیں ...مگر ہر دفعہ نہیں۔ اس پر رشید جہاں نے یہ کہہ کر ٹال دیا "کیا کروں کہ ان جنگلوں میں ہاتھی نہیں"۔

(۶)

دربار ابھی کشمیر ہی میں تھا کہ افواہ پھیلی کہ شاہزادی رشید جہاں شاید جلدی سمرقند واپس جانا چاہتی ہیں۔ افواہ پھیلانے والوں کا خیال یہ تھا کہ شاید ملکہ عالم ملکہ نور جہاں یہ خبر سن کر خوش ہوں۔ بلکہ دراصل چند رموز شناس درباداروں نے سازش کر کے یہ افواہ پھیلائی تھی۔ یہ منصوبہ بازی دربار کے لئے معمولی شغل تھا۔ نور جہاں سُن کر مسکرائی، پھر ہنسی اور یہ کہہ کر کہ "خوب می شناسم" سیدھا جہاں پناہ کے حضور میں دست بستہ آکھڑی ہوئی۔ تخلیہ ہو گیا۔

نور جہاں ۔ جہاں پناہ خطا معاف ہو تو کچھ عرض کروں۔

جہانگیر۔ جانِ من! کیسی خطا کیسی معافی تم حکم کرو۔

نور جہاں ۔ جہاں پناہ یہ معاملہ حکم کا نہیں محض ایک التجا ہے۔

جہانگیر۔ آخر کچھ کہو تو سمجھ میں آئے۔

نورجہاں۔ کیا جہاں پناہ کا خیال ہے کہ چغتائی شہزادی رشید جہاں سے مجھے کچھ کد ہے ؛

جہانگیر۔ ہرگز نہیں بلکہ میرا خیال ہے کہ سارے ہندوستان میں تم ایک اس کی سچی قدر دان ہو۔

نورجہاں۔ ظلِ الٰہی کا یہ ارشاد القا ربانی سے کم نہیں۔ میں دل سے چاہتی ہوں کہ جہاں پناہ اُسے محلسرا میں داخل کریں میں آپ کی اور اُس کی کنیز بن کر رہوں گی۔

جہانگیر۔ تم بہت دانا ہو مگر اس معاملہ میں تم قطعی بے خبر ہو۔ آنجہانی داداجان کی وصیت تھی کہ میری اولاد کو جب کوئی مصیبت ہو تو خانم جہاں کی اولاد سے مشورہ لیا جائے۔ خانم جہاں کی اولاد چغتائیوں کی محافظ ہے۔ ان کو بھی خانم جہاں کی پشت در پشت وصیت ہے کہ ظہیر الدین بابر کی اولاد کے کام آسکو تو دریغ نہ کرنا۔

نورجہاں۔ اس سے بہتر وہ کیا مدد کرسکتی ہیں کہ محل میں داخل ہوں۔

جہانگیر۔ اصل چغتائی کے لئے محل قید ہے مگر چونکہ تم آغا کی قدر دان ہو تم خود اُن سے مِل کر گفتگو کرلو۔ تمہارا اطمینان ہو جائے گا کہ میری رائے صحیح ہے۔

(۷)

نورجہاں جب آغا کے خیمہ کی طرف بے تکلف بلا اطلاع کرائے اور بلا کسی شاہانہ جاہ وحشم کے روانہ ہوئیں تو دربار انگشت بدنداں تھا کہ ملکۂ عالم اور اس سادگی سے ایک سمرقندی اجنبی کی طرف جا رہی ہیں۔ دونوں بیگمات ملیں۔ قہوہ اور میوہ پیش ہُوا۔ پھر تخلیہ۔

نورجہاں۔ آغا میں آپ کی خدمت میں ایک خاص التجا لے کر آئی تھی لیکن مجھے پہلے یہ کہنا ہے کہ گو میں بھی حسین ہوں مگر آپ کے قد کی رعنائی غضب ہے۔ اور آنکھوں والے تو تمہیں بے انتہا حسین تصوّر کرتے ہوں گے۔

رشید جہاں۔ بیگم خفا نہ ہوں تو عرض کروں کہ خدا نہ کرے کہ میں حسین ہوں۔

نورجہاں۔ ایں۔ یہ کیا کہا ؛

رشید جہاں۔ حسین ہو تو تم سا ہو ورنہ سادہ رو ہونا ہی اچھا ہے۔ اور قدرت کے کھیلوں میں یہ سب سے عجیب کھیل ہے کہ حسین عورت آج تک جب سے آسمان نے زمین کو ڈھانکا ہے کبھی اولاد کی طرف سے مطمئن نہیں ہوتی۔ میں سمرقند واپس جانا چاہتی ہوں وہاں جس میرے دل کے سردار کو میرا انتظار ہے اس کے بے رونق خیمہ میں اس کے بہادر بچوں کو پالوں گی۔ بیس تیس پشت کے بعد پھر شاید ہم سے کوئی تیمور اور بابر پیدا ہو۔ فی الحال تو ہندوستان نے ہماری ایک شاخ کو چٹ کرلیا ہے۔ بیگم تم اندازہ نہیں کرسکتی ہو کہ میں تمہارے شاندار دربار کو کس نظر سے دیکھتی ہوں۔ بابر تعجب

ہُوا تو یہی ہُوا کہ تیموری گھرانے کے دربار میں شاعر اور شُہدے بہت اور سپاہی اور سرفروش کم۔ حیران ہوتی رہتی ہوں کہ یاالٰہی یہ کیا ماجرا ہے کہ جس مرد کو دیکھو کمر میں تلوار ندارد مگر گلے میں موتیوں کا کنٹھا۔ جہاں مرد زیور پہنتے ہیں وہاں عورتیں تو ضرور ننگی رہتی ہوں گی۔ کیا ان عیش کے پُتلوں کو اتنا بھی علم نہیں کہ مرد کا زیور زخم ہیں نہ کہ موتی۔ بیسیوں دفعہ دربار میں غور سے دیکھا۔ اُمرا نے تحالف میں سونے اور موتیوں کے ڈھیر پیش کئے مگر ان نکموں میں سے سوائے چند راجپوت امرا کے کبھی کسی نے مرزا کو مفتوح دشمنوں کی تلواریں اور ڈھالیں نذر نہ کیں۔ آخر یہ سب کے سب نام کے مرد روز و شب، ماہ و سال دربار میں کرتے کیا ہیں؟ ہمارے ہاں تو فتح کے بعد جشن ہوتے ہیں۔ کامیاب شکار کے بعد جام چلتا ہے اور یہاں روز جشن اور صبح و شام دمبدم کے جام۔ میں تو ہندوستان کی فضولیات سے اُکتا گئی۔ اتنا البتہ ضرور کہوں گی کہ چغتائیوں کا اگر کوئی سچا رفیق ہے تو چند بڑے گھرانوں کے راجپوت۔ وہی لوگ کچھ تلوار کے دھنی بھی ہیں۔ شاید جَو کی روٹی کھاتے ہوں گے!

نور جہاں۔ آکا آپ ٹھیک فرماتی ہیں اس ملک کے مسلمانوں میں بے انتہا آرام طلبی ہے۔ خود تو ایران دیکھا نہیں مگر سُنتی ہوں کہ وہاں سے بھی یہاں کہیں زیادہ عیش پرستی ہے۔ یہاں تاتاری جرأت کی، تیموری تُرکتازی کی تلاش عبث ہے۔

رشید جہاں۔ بیگم مجھے انتظار رہتا کہ کبھی آپ بے تکلف تشریف لائیں تو آپ سے درخواست کروں کہ آپ میرے ناچیز تحفہ کو قبول فرمائیں۔ یہ لیجئے ایک سادہ دست بند۔ آپ کے لئے سمرقند سے لائی تھی۔ (نور جہاں بیگم اس دست بند کو آنکھوں سے لگاتی ہے) یہ ہے بھی اس قابل۔ شاہنشاہ بابر نے اپنی ہمشیرہ کو دیا تھا۔ حق بحقدار رسید۔

نور جہاں۔ میں آپ کی دریا دلی دیکھ کر تعجب کرتی ہوں۔ جہاں پناہ نے آپ کو تحائف دیئے وہ آپ نے سب بانٹ دیئے اپنے لئے کچھ نہ رکھا۔

رشید جہاں۔ سنو بیگم۔ تیمور کی اولاد دنیا میں اپنے آپ کو لٹوانے آتی ہے۔ جب ہم میں سے کوئی حساب کر کر کے جمع کرنے والا پیدا ہوگا تو یقیناً تیموری عزم مِٹ جائے گا۔ ہم لوگوں کی سب سے بڑی دولت ہمارا خالص خُون ہے۔ ہم اس کے بہانے اور لٹوانے میں دریغ نہیں کرتے تو اور کسی چیز کو کیا رکھیں گے؛

نور جہاں۔ خدا کے لئے آپ مجھے اپنا سچا قدردان سمجھیں اور کوئی ارشاد کریں جو میں پورا کر سکوں۔

رشید جہاں۔ مرزا سے مجھے سمرقند واپس جانے کی اجازت لے دیجئے۔ میں نانی مرحومہ کی وصیت کی پابندی میں چلی آئی۔ جَو اور پانی لائی تھی۔ وہ دے چلی۔ مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ خانم جہاں کی اولاد کے ذمہ آئندہ اب شاید ہی کوئی خدمت ان ہندی مرزاؤں کی طرف سے تفویض ہو۔

(۸)

جہانگیر۔ کہو جانِ من! تم کچھ متفکر سی ہو! خیر تو ہے؟
نورجہاں۔ جہاں پناہ! دیکھئے یہ دست بند مجھے اکّا نے دیا۔ فرماتی تھیں کہ شاہنشاہ بابر نے اپنی ہمشیرہ کو دیا تھا اور مجھے رشید جہاں نے یہ کہہ کر دیا "حق بحقدار رسید"۔
جہانگیر۔ اور کیا باتیں ہوئیں؟
نورجہاں۔ جہاں پناہ وہ بات تو میں زبان پر بھی نہ لا سکی۔ رشید جہاں کو ہمارے دربار سے اپنے جنگلی خیمہ و خرگاہ زیادہ مرغوب ہیں۔ کس قدر اس چغتائی شہزادی کو اپنے صحیح النسب چغتائی ہونے پر فخر ہے میں تو اُس کے سامنے جھینپ گئی۔
جہانگیر۔ وہ سچ ہے مگر ہند کا بھی ہم پر حق ہے۔ محمود غزنوی یہاں کی دولت لے گیا مگر اپنا ایاز یہاں چھوڑ گیا۔ موت کے اس ایک حملہ نے محمود کے سترہ حملوں کا کافی جواب دے دیا۔ ہم لوگ اب یہاں کے ہو چکے۔ سمرقند کا پانی یہاں خون بن کر بہا۔ تب جا کر یہ سلطنت نصیب ہوئی مگر یہ بھی چند پُشت کی بات ہے۔ تم کچھ خیال نہ کرو۔ قبلہ مرحوم کا شاعر کہہ گیا ہے ؎

جام مے در دست گیر و پا بہ گلشن نہ کہ باز
بادست افشاں درآمد آب پا کوباں رسید

لاؤ تم مجھے ایک جام مے دو۔ پہلو میں بیٹھو اور سمرقند کو بھول جاؤ۔
جہاں پناہ جب ایک آدھ جام پی کر افکارِ سلطنت سے اِک گونہ آزاد ہوئے تو نہایت لطف سے اپنی محبوبۂ دلنواز سے فرمانے لگے۔
جہانگیر۔ کہو جانِ من میں اس تمہارے کھیل کو کہ تم مجھے مشورہ دو کہ رشید جہاں کو محلسرا میں لاؤں کیا سمجھوں؟ کیا تم میری وفا کا امتحان لے رہی تھیں یا کچھ اور مدِ نظر تھا؟
نورجہاں۔ جہاں پناہ۔ عورت یعنی کوئی معمولی عورت کبھی اپنے شوہر سے اس قسم کی التجا نہ کرتی۔ مگر میں معمولی عورت نہیں۔ میں ملکہ ہوں اور آپ کے دل کی ملکہ ہوں مگر اس سے بھی بڑھ کر مجھے فخر یہ ہے کہ آپ کی جان نثار ہوں۔ آپ میرے ہیں میں آپ کی ہوں مگر سلطنت چغتائی ہے اور میں باوجود ایرانی ہونے کے دل سے چاہتی ہوں کہ چغتائی باغ ہرا بھرا رہے۔ آپ کی سلطنت کے استحکام کے لئے میری خوشی، میری شان، میری آرزوئیں سب قربان ہو جائیں تو بھی کچھ پروا نہیں۔ جو تجویز پیش کی تھی وہ محض اس نیت سے تھی ورنہ کون عورت ہے جو تاج و تخت میں کسی دوسرے کو شریک ہوتے دیکھ سکے۔ اگر اس شاہزادی کو آپ محل میں داخل کر لیتے تو ممکن تھا کہ سمرقند و بخارا سے بنگالہ اور لنکا تک صرف آپ

کا سکہ چلتا۔

جہانگیر۔ خدا جانے تم باور کرو یا نہ کرو مگر جو بادشاہ ہوتے ہیں چاہے وہ مجھ جیسے گناہگار ہی کیوں نہ ہوں کسی حد تک غیب دان ہوتے ہیں۔ مجھے ایک صدی کے بعد چغتائی چراغ گل ہوتا نظر آتا ہے۔

نورجہاں۔ قربانت شوم ایسی بات زبان سے نہ نکالئے۔

جہانگیر۔ اب تو نکل گئی۔ لاؤ ایک پیالہ اور۔

نورجہاں۔ میری نہیں تو میں تو یہی کہوں کہ شیرازی انگور سے سمرقند کے جَو اچھے۔

(۹)

کہتے ہیں کہ شاہنشاہ فرخ سیر نے پنجاب کی ایک کٹھن مہم کے وقت ترکی میں خط لکھوا کر سمرقند قاصد روانہ کیا تو قاصد یہ جواب لایا۔

"مرزا!

وہ جَو سوکھ گئے۔ وہ پانی بہہ گیا۔ وہ پیالہ ٹوٹ گیا۔"

عبدالعزیز

انجمن سے وہ پرانے شعلہ آشام اٹھ گئے

ساقیا، محفل میں تو آتش بجام آیا تو کیا

نہ کھچنے والی تصویر

(۱)

اے کاش ترے باجے پر
رکھا ہو ترا البم
وہ، جس میں کہ چاہنے والے،
کانپتے ہاتھوں سے
لکھ دیتے ہیں افسانے
بیتاب دلوں کے
بے طور مچلنے کے

(۲)

تو راگ کی دُھن میں
سُن پائے نہ آہٹ
اُس میرے سکوں کی
جو دیکھ کے تجھ کو
آلیتا ہے مجھ کو
ایسے، کہ مرے پاؤں
گو لاکھ جتن کرلوں
بڑھنا تو بھلا کیا
ہل بھی نہیں سکتے

(۳)

بُت بن کے،
میں
بُت کے پیچھے
کچھ دیر تو ٹھیروں، پھر
پُرشوق نگاہیں
لپٹیں ترے البم سے
اور سحرِ تخیّل سے
لکھ ڈالیں یہ سطریں

(۴)

اک عکس ہے دل میں،
پیارا بھی ہے بھولا بھی

اور حد سے زیادہ ضدی:
آتا ہے، چلا آتا ہے
بنتا ہے، بگڑتا ہے
ٹالے سے نہیں ٹلتا ہے
پریشان ہے اس میں
حسن کی رعنائی کی۔

(۵)

اس عکسِ دلآرا کے
روزانہ کے پھیروں کا
راز میں کیونکر کھولوں
کوئی بلائے تو میں بولوں
فی الحال تو قصّہ یہ ہے
اک عکس ہے
لاکھ اس کی جھلک ہے
تصویروں کا یہ تختِ رواں
مرکز ہے مری قسمت کا

(۶)

تنہائی کی تاریکی سے
ڈھانکے ہوئے رکھتا ہوں
اس عکسِ منوّر کو
گویا کہ یہ کعبہ ہے
کالا ہے غلاف اس کا

(۷)

میں یونہی اگر
پاس کبھی اس کے
جس کا یہ کرشمہ ہے
مجلس میں کسی گھڑی
آنکلوں کہ گذر جاؤں
ہرگز نہیں وہ تکتی
کون آیا؛ گیا کیسے؛

(۸)

پہلو میں بھی اس کے
بیٹھا ہوں کئی بار
دھک دھک سے مگر دل کی
ہو کر کے میں ناچار
اُٹھ بیٹھا ہوں پر اس نے

ہرگز نہیں پوچھا
جاتے ہو کہاں ؟ بلبیٹھو

(۹)

ہوتا ہی نہیں اس کو
بھولے سے بھی ہرگز
اتنا سا گماں بھی
چھو جائے تلطف سے
گر ہاتھ مجھے اس کا
اس سادہ سے منتر سے
پھر جائیں مرے دن

(۱۰)

سحرِ تخیل سے
یہ نقش بندھے جب
اس شوخ کے البم پر
اور تو کھینچ کے اس کو
پڑھ ڈالے یہ سطریں
اور پھر پھینک کے اس کو
حیران سی ہو کر
ہلکے سے سروں میں
بیساختہ یوں گائے
یہ کس لڑکی کا قصہ ہے؟
نہیں سمجھی میں کچھ بھی
بہت انجان ہو گی
نہ سمجھی ہو گی کچھ بھی

(۱۱)

گاتے ہوئے یونہی
مڑ کر مجھے دیکھے
اور بھولی سی ادا سے
ہنستے ہوئے کہہ دے۔
"تم آئے کب سے؟ بلبیٹھو"۔
"سمجھ کر بھی
نہیں سمجھی میں کچھ بھی"۔

فلک پیما
۱۴ اکتوبر ۱۹۳۵ء

ترجمۂ رباعیات عمر خیام

حکیم عمر خیام

غم چند خوری بکار نا آمد و پیش ۔۔۔ رنج ست نصیبِ مردم دُور اندیش
خوش باش و جہاں تنگ مکن بر دلِ خویش ۔۔۔ کز خوردنِ غم قضا نہ گردد کم و بیش

ترجمہ

ناداں! غمِ انجام سے کیوں ہے دِلریش ۔۔۔ ہے رنج نصیبِ مردمِ دُور اندیش
خوش رہ کہ کسی کے رنج و غم کھانے سے ۔۔۔ احکامِ قضا ہو نہیں سکتے کم و بیش

ترجمۂ دیگر

تقدیر کا حکم ٹل سکے ، ناممکن ۔۔۔ تدبیر کا زور چل سکے ، ناممکن
ناداں! غمِ این و آں سے کچھ حاصل بھی؟ ۔۔۔ قانونِ قضا بدل سکے ، ناممکن

حکیم عمر خیام

گویند کہ مرد را ہنر می باید ۔۔۔ یا نسبتِ عالیٔ پدر می باید
امروز چناں شدہ ست در نوبتِ ما ۔۔۔ اینہا ہمہ ہیچ ہست، زر می باید

ترجمہ

گو قول ہے ، مرد کچھ ہُنر رکھتا ہو ۔۔۔ یا نسبتِ عالیٔ پدر رکھتا ہو
لیکن عملِ اہلِ جہاں کہتا ہے ۔۔۔ یہ سب ہے فضول ، صرف زر رکھتا ہو

حکیم آزاد انصاری

غزل

وہ عربدہ جُو، معصوم ادا، قاتل بھی ہے اور قاتل بھی نہیں
دل اُس کی سادہ اداؤں کا، بسمل بھی ہے اور بسمل بھی نہیں

وعدے پہ نہیں آتا سچ ہے، پر یاد تو اُس کی آتی ہے
اُس جانِ محبت کا وعدہ، باطل بھی ہے اور باطل بھی نہیں

دیکھو تو ہر اک سے بیگانہ، سمجھو تو کسی کا دیوانہ
دِل یار کی بزمِ عشرت میں، شامل بھی ہے اور شامل بھی نہیں

ظاہر میں ہر اک شئے پر قبضہ، باطن میں نہ ذرّہ بھی بس کا
دُنیا میں ہماری ہستی کا حاصل بھی ہے اور حاصل بھی نہیں

ہرجا ہے نشیمن، کاشانہ، اس پر بھی تباہ و ویرانہ
اُس جانِ جہاں کے جلووں کی منزل بھی ہے اور منزل بھی نہیں

دیوانہ مرا اہلِ عرفاں، تاریک مگر مہرِ تاباں
دل تیری نگاہِ اُلفت کے قابل بھی ہے اور قابل بھی نہیں

ایقان تذبذب کا زخمی، عرفاں کی شعاعیں دُھندلی سی
دُنیا تری روشن ہستی کی قائل بھی ہے اور قائل بھی نہیں

ہے جذبۂ کامل کے دم تک، نظارہ کی یہ فردوس گری
اے قیس! بگولا صحرا کا محمل بھی ہے اور محمل بھی نہیں

عرفانِ خودی ہے عینِ بقا، احساسِ خودی پیغامِ قضا
ہستی مری راہِ اُلفت میں حائل بھی ہے اور حائل بھی نہیں

جو ڈوب گیا وہ پار اُترا، جو سطح پہ تھا وہ تر نہ سکا
دریائے محبت کا ماہر ساحل بھی ہے اور ساحل بھی نہیں

ماہر القادری

رباعیات

۱

اے قطرۂ آب، پھیل، دریا ہو جا
اے طائرِ روح، اپنی مرغِ سدرہ ہو جا
ہر خانہ خراب، قصرِ تن کو ڈھا دے
اے تودۂ خاک، اُٹھ، بگولا ہو جا

۲

اسباب و علل کا دور کرتے رہیے
نی فطرت یہ جو کرتے رہیے
جو کچھ ہونا تھا، ہو چکا ازل سے
اب کیوں ہوا، اس پہ غور کرتے رہیے

۳

بے چہرۂ خورشید سیاہی تا چند
سلطانِ حقیقت یہ تباہی تا چند
عاجز ہمہ تن، ترقیٔ تن اتنا، اللہ
اے مردۂ بدو، بیش من الٰہی تا چند

۴

تھا ابر سے کیا گلا، خدا کی مرضی
جو کچھ بھی ہوا، ہوا خدا کی مرضی
وہ ابرِ بہار ایسا پیاسا کیوں ہیں
کیوں پیاس کی ہے انتہا، خدا کی مرضی

امجد

بے فکر امجد!

امجد ایک بے فکر، خوش لباس اور باتمیز نوجوان تھا جس کی زندگی کے اصول تین تھے۔ اچھے کپڑے، شائستگی اور افکار و آلام سے آزادگی۔ اچھے کپڑے پہننا اس کے نزدیک متمدّن ہونے کی ظاہری علامت تھی اور شائستہ ہونا اس کا عملی پہلو تھا۔ اور یونہی کسی وجہ سے دل ہی دل میں کڑھتے رہنا اور جو معاملہ حتی الوسع انسان نہ حل کر سکے، جو اس کے احاطۂ تدبیر سے باہر ہو، یا جس پر اس کا اختیار نہ ہو، یا جس کو سلجھانے کی اس میں قدرت نہ ہو، یا جو باوجود اس کی کوششوں کے ٹھیک نہ ہو سکے، اس پر بے سُود تأسف یا ملال یا رنج یا فکر محسوس کرنا، وہ ایک عقلمند اور بالغ نظر آدمی کے لئے جسے اپنے دماغ کے توازن اور دل کے چین کی تمنا ہو، مضر ہی نہیں بلکہ واہیات اور لغو خیال کیا کرتا تھا۔ چنانچہ وہ ہر ایک کو یہی تلقین کیا کرتا تھا کہ اوّل تو آدمی خوشی کو اپنا مطمحِ نظر بنائے اور اگر ہر وقت آدمی ہنس نہیں سکتا تو کم از کم ملول و محزون تو نہ رہے۔ عام طور پر ان خیالات کو وہ اپنے دوستوں یا بھائی بہنوں کے سامنے پیش کیا کرتا تھا۔

لباس کے معاملے میں اس کا رکھ رکھاؤ اتنا مؤثر ثابت ہُوا کہ اکثر جان پہچان والے کپڑوں کے معاملے میں اسے بطور سند پیش کرنے لگے مگر اس میں امجد کا کوئی قصور نہ تھا۔ اس کا ہرگز یہ منشا نہ تھا کہ لوگ یا دوست یا گھر والے ہی اس کے کہنے کے مطابق کپڑے پہنیں یا بنوائیں۔ کیونکہ اس کا نظریہ تو یہ تھا کہ ہر آدمی کی شخصیت کا کم و بیش اس کے لباس سے پتہ چل جاتا ہے۔ اس لئے ہر ایک کو چاہئے کہ اپنی شخصیت کا اظہار اپنے لباس کے ذریعہ سے کرے اور یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے جب ہم کسی دوست کی رائے یا پسند یا مشورہ کے مطابق کپڑے بنوائیں یا پہنیں۔ اسے خود اس بات پر اتنا اعتقاد تھا کہ جب کسی کے متعلق کوئی رائے قائم کرتا تو وہ اس کے لباس کو کبھی نظر انداز نہ کرتا علیٰ ہذا القیاس شائستگی کے متعلق۔ اِس سے اس کی مراد اخلاق نہیں تھے۔ وہ شائستگی کو خوش اخلاقی کا خارجی پہلو سمجھا کرتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ تہذیب کا سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ خواہ ہم باطن میں کچھ ہوں، ظاہری طور پر ہمارا فرض ہے کہ ہم تمام آداب کو ملحوظ رکھیں اور جہاں تک ہو سکے تمیز اور آداب اور شائستگی کو ایک اہم اور لازمی اور بنیادی اصولِ زندگی تصوّر کریں۔ بہرحال یہ چیزیں اس کی دماغی ساخت کا ایک مظہر تھیں۔

لباس کے متعلق اس کی گفتگو اس کے گھر والوں کے لئے اچھا خاصا مذاق تھی۔ اس کے بھائی اور بہنیں، اس کی والدہ اور بعض دفعہ اس کے والد بھی اس تفریح میں شامل ہو جایا کرتے تھے اور بارہا ایسا ہوتا کہ امجد بیچارہ ان کی باتوں کو نہایت سنجیدگی سے قبول کر لیتا اور اسے خیال تک نہ ہوتا کہ اس سے مذاق ہو رہا ہے مثلاً یوں ہوتا کہ کوئی کپڑا بیچنے والا ڈیوڑھی میں بیٹھا اپنے لڑکے کے

ہاتھ اندر تھان پر تھان بھیج رہا ہے کہ شوخ رشیدہ اُٹھتی اور ایک دو تھان بازو پر ڈال اندر اس کے کمرے میں جا دھمکتی کہ امجد یہ کپڑا مجھے بھیگا یا یہ! اسے آنکھ کا نشہ کہتے ہیں اور اسے "دل کی پیاس"۔ کبھی تو وہ یہ سمجھ کر کہ یہ مشورہ محض از راہِ تفنن ہے ہنس کر ٹال دیتا اور کبھی وہ اس موضوع پر لکچر ہی دینے لگ جاتا کہ لڑکیوں کو کپڑے پہننے کی تمیز ہی نہیں۔ چاہئے تو یہ کہ جیسے رسم و رواج نے انہیں دوپٹہ اور قمیص اور شلوار تین چیزیں دی ہیں ان میں ایسے جوڑا اور تنا سب پیدا کئے جائیں جو واقعی دلچسپ اور دلفریب ہوں مگر رواج ہے تو سوتوں کا کہ ایک کپڑے کی قمیص اور اسی کپڑے کی شلوار۔ معلوم نہیں دوپٹہ بھی اسی کپڑے کا کیوں نہیں پہن لیتیں۔ غرض یہ کہ عام طور پر جس دن کپڑا خریدنا ہوتا اس دن کچھ نہ کچھ دلچسپی کا سامان ضرور ہو جاتا۔

چونکہ امجد کا اصرار تمیز اور لباس پر کئی دفعہ باقی لوگوں کے لئے دو بھر ہو جاتا اس لئے یہ بھی ہوتا تھا کہ محض اسے چڑانے کی خاطر کوئی نہ کوئی شخص اگر بدتمیزی نہیں تو خوش طبعی کی خاطر ایسی حرکات کر دیتا کہ امجد نفرت سے پھنکارتا ہوا اُٹھ جاتا اور اپنے کمرے میں جا بیٹھتا۔ یا اگر مذاق کرنے والا اس سے عمر میں چھوٹا ہوتا تو اس کی باتوں باتوں میں وہ مرمت کرتا کہ سب ہنس پڑتے یا کم از کم مسکرانے لگتے یا اُٹھ کے کہیں اور کسی کمرے میں چلے جاتے اور وہاں جا کے ہنس لیتے۔ ایک اور بات جس پر امجد کا مذاق اُڑا کرتا تھا اس کا تایا جان کے گھر آنا جانا تھا۔ اس کے والد کے بڑے بھائی اسی شہر میں تاجری کرتے تھے، ہزاروں کا کاروبار تھا۔ سو چیزوں میں ان کے ہاتھ تھے کہیں کسی کو مشین کا آرا لگوا کے دے رکھا ہے اور کہیں ساتھ ہی چکی لگ رہی ہے، گرمیوں میں کسی برف کے کارخانے میں حصہ داری کیا کرتے تھے، سردیوں میں کمبل لوئیاں اور دُھسے باہر سے منگوا کے ان کا بیوپار کر لیا کرتے تھے غرض سو کام انہوں نے شروع کر رکھے تھے۔ ان میں دو ایک اُن کے لڑکے بھی شامل تھے، جنہیں بی اے پاس کر کے تجارت میں ہی لگا دیا تھا۔ لڑکیوں کے بہت خلاف تھے۔ بلکہ نئی وضع ہی کے دشمن تھے۔ فارغ البالی تھی اس لئے لڑکیوں کو گھر ہی پر تعلیم دلوائی تھی مگر سکول بھیجنا گوارا نہیں کیا۔ اُن کو انگریزی پڑھانے کے بہت خلاف تھے اگرچہ انہوں نے خفیہ خفیہ اپنے بھائیوں سے کچھ نہ کچھ استعداد پیدا کر ہی لی تھی۔ ان میں سے بڑی کی عمر اُنیس سال کی تھی اور اس کا نام تسنیم تھا۔ گورا رنگ تھا اور میانہ قد۔ لمبی لمبی خمدار سیاہ پلکیں اور چمکدار بھوری آنکھیں، اور صاف اور فراخ اور روشن پیشانی، اس کے چہرے کو دلکش بنانے کے لئے کافی تھیں اور قدرت نے اسے وہ ایسے ہونٹ دیئے تھے جن کی ہلکی سے ہلکی جنبش میں کچھ نہ کچھ معنی پنہاں ہوتے تھے اور جو اکثر ایک طرف کو نامعلوم طور پر جھکے رہتے تھے گویا وہ ابھی ابھی کوئی پُرلطف لطیفہ سُن چکی ہے اور اس سے حظ اُٹھا رہی ہے چنانچہ امجد کا آنا جانا اپنے تایا کے گھر عام تھا۔

اس لئے جب بھی امجد شام کے قریب خوش قطع اور خوش وضع کپڑے پہن کر باہر جاتا تو کسی نہ کسی چہرہ پر مسکراہٹ ضرور آجاتی۔ اور کوئی نہ کوئی اونچی آواز سے نہیں تو ہلکے سے ضرور کہہ دیتا "ارے بانکے میاں تم کہاں چلے" یہ اس لئے بھی کہ دو بہنیں اس سے بڑی تھیں اور ایک بھائی۔ اگرچہ بھائی ملازم تھے مگر کبھی نہ کبھی وہ بھی گھر پر ہوتے ہی۔ سب ملا کے تین بھائی اور تین بہنیں تھیں۔ ایک بھائی اور

ایک بہن امجد سے چھوٹی تھی۔ بڑی بہنوں میں ایک بیاہی ہوئی تھی۔ مگر چونکہ اس کا خاوند بھی اپنے ہی شہر کی میونسپل کمیٹی کا سکتر تھا وہ دونوں اور ان کا ننھا بچہ اسی بڑے مکان کے ایک حصے میں رہتے تھے۔ دوسری بہن کی فقط منگنی ہوئی تھی۔ گویا امجد کی حرکات وسکنات میں دلچسپی لینے والے گھر میں کئی شخص تھے۔ اس لئے یہ آواز اکثر اسی سے مخاطب ہُوا کرتی۔ جواب ہمیشہ یہی ہوتا "یونہی باہر جارہا ہوں، سیر کا ارادہ ہے"۔ سب جانتے تھے کہ ہفتہ میں کم ازکم تین مرتبہ یہ سیر اسے کہاں لے جاتی ہے۔ شاید امجد کو بھی اس بات کا احساس تھا۔ اس لئے کئی دفعہ جب ان کی مسکراہٹ اور استہزا کو پہچان لیتا تو کچھ جھینپ ضرور جاتا۔ اور شاید اس شام کو شرم کے مارے اپنے تایا کے ہاں نہ جاتا۔

مگر خم دار سیاہ پلکیں جب چمکدار بھوری آنکھوں پر جھکی رہیں تو ان سے بہت دُور رہنا مشکل سا ہوجاتا ہے اور جب کسی کے آنے سے ہونٹوں پر ایک تازگی اور ان کے ایک کونے میں مسکراہٹ جھانکنے لگے اور جب کسی مشکل لفظ یا شعر کے معنی نہ آتے ہوں اور بھائی امجد سے سمجھنے پڑجائیں، یا کام کچھ ہو مگر ایک آدھ نگاہ ہر منٹ میں آڑی، ترچھی یا سیدھی کسی تک پہنچ جائے تو اس مقام پر موجود نہ ہونا اگر تکلیف دہ نہیں تو مروت اور اخلاق کے منافی ضرور ہے۔ اور مروت جب انسان کا جوہر ہو تو پھر ایسی بدخلقی اور بے اعتنائی گناہِ کبیرہ نہیں ہے تو کیا ہے؟ اگرچہ گھر کی مالکہ خاص گرمجوش واقع نہ ہوئی ہو پھر بھی جب گھر اپنے تایا کا ہو تو نہ جانا محض کمزوری نہیں تو اور کیا چیز ہوسکتی ہے؟ اگر تائی صاحبہ کی نظر ایک سیکنڈ سبزی یا کپڑے یا جو کچھ ان کے ہاتھ میں ہو، اس پر ہو اور دوسری نظر کسی کی برق پاش نگاہوں کو راستہ ہی میں روک لینے کی خواہشمند ہو، تو بھی کیا مضائقہ ہے۔ کہیں بجلیاں بھی روکنے سے رُکی ہیں! یہ بھی مان لیا کہ اُس جگہ کبھی کبھی تایا زاد بھائی کو سوال ہی سمجھانا پڑجاتا ہے یا کبھی کوئی "جواب مضمون" ہی دیکھنا پڑجاتا ہے، مگر یہ بھی تو ہوجاتا ہے کہ کوئی بہن یہ بھی پوچھ لیتی ہے، "کیوں آپا بھائی امجد چائے پئیں گے نا؟" اور پھر جب بھائی امجد کی پیالی کوئی خود ہی بناتا ہو اور خود ہی اُٹھ کے اور قریب آکے اور ہاتھ بڑھا کے اِک خاص نیم ادا اور نیم مسکراہٹ کے ساتھ پیش کرتا ہو تو بیچارہ امجد کسی اور جگہ کیسے سیر کرتا پھرے۔ مگر گھر والے ان باتوں کو کیا جانتے!

کسی دن جب امجد کا اتفاقیہ گزر ادھر ہوجاتا، تایا جان بھی گھر پر ہی ہوتے۔ وہ امجد کے بہت مداح تھے۔ کہا کرتے تھے کہ خاندان کے سب لڑکوں میں امجد سب سے باتمیز اور مؤدب ہے۔ اور پھر امجد کی پوشش تو تعریف سے مستغنی تھی۔ اس بات کو تو غیر لوگ بھی مانتے تھے کہ لباس سجتا ہے تو میاں امجد کے بدن پر۔ اس لئے امجد جب بھی اپنے تایا جان کی موجودگی میں آجاتا تو وہ اس کی خوب آؤبھگت کرتے۔ شاید اس لئے بھی کہ ان کے چھوٹے صاحبزادوں کو جن میں سے ایک انٹرنس اور ایک ایف۔ اے میں پڑھتا تھا، کچھ نہ کچھ ایک مضمون میں نہیں، تو دوسرے مضمون میں بھائی امجد سے مدد لے لینے کو وہ بُرا نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ بہت پرشفقت لہجہ میں کہا کرتے تھے، "بیٹا تمہارا بھائی آیا ہے، اس سے اپنی مشکلات حل کرالو۔ ماشاءاللہ لائق ہے۔

ایم اے میں پڑھتا ہے۔ اس جیسا لائق تو سارے خاندان میں کوئی نہیں ہے۔ اسے تو ڈپٹی کمشنر ہونا چاہئے۔ بیٹا امجد تم اس ریاض کی انگریزی تو دیکھو کیسی ہے۔ مجھے تو یہ کبھی پڑھتا دکھائی نہیں دیتا۔ ایف اے میں ہے۔ اسے کوئی سوال تو پوچھو ہم بھی تو دیکھیں کیا جواب دیتا ہے"۔ یہ علیحدہ بات تھی کہ تایا جان خود انگریزی نہیں جانتے تھے مگر اس سے یہ مطلب نہیں کہ وہ ریاض کی لیاقت کا اندازہ نہیں کر سکتے تھے اور پھر امجد پر ان کی خاص نظرِ نوازش تھی۔ یہ کام تو ازرہِ عنایت اس سے کرایا کرتے تھے۔

ایک دفعہ شبِ برات کے موقع پر امجد اور اس کے چھوٹے بھائی انور کی دعوت تایا جان کے ہاں تھی۔ اس میں امجد کا کوئی ہاتھ نہ تھا۔ اگرچہ گھر میں انور کو ہر شخص مبارک باد دیتا تھا کہ بھائی تیری قسمت بھی جاگ اُٹھی ہے۔ بہرحال وہ دونوں گئے۔ وہاں جس وقت پہنچے تو اتفاق سے صحن میں کوئی نہ تھا، وہ اِدھر اُدھر دیکھتے جس کمرے میں پہلے جا کھڑے ہوئے وہ تسنیم اور اُس کی چھوٹی بہن نسیمہ کا تھا۔ تسنیم اس وقت اپنے بال بنا رہی تھی۔ امجد تو سلام کر کے اور ایک نظر دیکھ کر باہر نکل آیا مگر انور نسیمہ کا ہم عمر تھا۔ وہ دونوں چھٹپنے میں اکٹھے کھیلا کرتے تھے۔ اس لئے وہ نہایت بے تکلفی سے کچھ عرصہ وہیں رہا۔ گھر واپس آنے پر انور نے آپا رشیدہ سے کہہ دیا کہ جب بھائی امجد آپا تسنیم کے کمرہ سے نکل گئے تو نسیمہ نے آہستہ سے آپا تسنیم سے کہا تھا " لو آپا تمہارے بھائی امجد تو آ گئے"۔ اس 'تمہارے' کے لفظ کا بہت دن چرچا رہا۔ دو ایک دن بعد چھوٹی آپا نے برسبیلِ تذکرہ امجد سے پوچھا کہ بھئی تمہاری تسنیم کا کیا حال ہے؟ اس پر امجد نے کچھ گھبراہٹ، کچھ شرم، کچھ غصے سے کہا، "'تمہاری' سے آپ کی کیا مُراد ہے؟" جواب میں چاہئے تھا کہ چھوٹی آپا سنجیدگی اور متانت سے امجد کو سمجھاتیں، مگر انہوں نے کچھ ذومعنی اور چڑانے والی مسکراہٹ کے ساتھ کہا کہ بھئی میرا اس میں کوئی قصور نہیں، یہ انور ہی کہتا پھرتا ہے، ہم تو تم جانتے ہی ہو، تمہاری باتوں میں دخل نہیں دیتے۔ یہ بات امجد کے لئے اور بھی غصہ دلانے والی تھی۔ آپ اسی وقت انور کی طرف گئے کہ جا کے پوچھتا ہوں کہ وہ خبیث کیا بکواس کرتا پھرتا ہے۔ چھوٹی آپا نے بڑی آپا کی طرف دیکھا اور جب امجد وہاں سے دور ہٹا تو دونوں کھل کھلا کے ہنس پڑیں۔

امجد نے انور کی خوب گت بنائی کہ تو بہت شیطان ہے اور جو جی میں آئے بکتا رہتا ہے، نہ عقل ہے نہ تمیز۔ گھر میں ہر ایک سے میری باتیں کرتا رہتا ہے۔ آپا بڑی ہیں اور انہیں تو بھونڈے مذاق کرنے کی عادت ہے مگر تو کیوں انہیں ایسی بیہودہ باتیں سکھاتا رہتا ہے۔ انور بیچارہ کہتا رہا کہ میں نے انہیں کچھ نہیں سکھایا۔ وہ تو خود ہی آپ کے آنے جانے میں دلچسپی لیتی رہتی ہیں اور پھر بات کیا ہے بات تو بتایئے۔ امجد نے بات تو کچھ نہ بتائی۔ البتہ دیر تک انور کی شرارت اور بدتمیزی اور خباثت کے متعلق گفتگو کرتا رہا۔ انور نے بارہا پوچھنے کی کوشش کی کہ اس غصے کا راز کیا ہے مگر امجد نے اس امر کے متعلق

کچھ کہنا پسند نہ کیا مگر یہ تنبیہ اس کو کر دی کہ اگر تجھ میں ایک رتی برابر بھی شرافت موجود ہے تو میری بابت کوئی بات ہرگز نہ کرنا۔ ورنہ میں بُری طرح پیش آؤں گا۔ اب مان لیا کہ انور بھائی امجد سے دو درجے چھوٹا تھا مگر پھر بھی انٹرنس میں پڑھتا تھا۔ اس کو یہ ڈانٹ پسند نہ آئی۔ وہ شکایتہً چھوٹی آپا کے پاس پہنچا اور بہت خفا ہو کر ان سے کہا کہ آپا مجھے آپ کے مذاق اچھے نہیں لگتے۔ بھائی امجد سے کہتی کچھ آپ ہیں اور ان کا بس آپ پر تو نہیں چلتا، مجھ پر آ کے غصہ نکالتے ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ بات آپ کریں اور پکڑوا مجھے دیں۔ چھوٹی آپا نے کہا "تم تو یونہی ناراض ہوتے ہو۔ امجد کی تو عادت ہی ہے اور پھر میں نے اسے کچھ کہا بھی نہیں۔ فقط یہ پوچھا تھا کہ تمہاری تسنیم کا کیا حال ہے۔ اس میں غصے کی کیا بات ہے اور پھر تم نے خود ہی تو ہم سے کہا کہ نسیمہ نے اسی طرح تسنیم سے کہا تھا۔ یا تو تم نے بات اپنے دل سے بنائی ہے یا پھر امجد کو اتنا غصہ نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ انور کو اس پر اور بھی غصہ آیا کہ یا تو میں آئندہ آپ کو کوئی بات نہیں بتاؤں گا یا آپ مجھے پکڑوا نہ دیا کریں۔ اور مجھے دل سے گھڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے تو اپنے کانوں سے سُنا ہے۔ مجھے پتا نہیں وہ اسے چھیڑ رہی تھی کہ کوئی اور بات تھی، مگر مجھے آپ پر بہت رنج ہے۔ وہ روز وہاں جائیں گے اور آپ انہیں بنائیں گی، وہ میرے پیچھے دوڑیں گے۔ میری جان تو عذاب میں پڑ جائے گی۔ مگر چھوٹی آپا نے اس کا غصہ ٹھنڈا کیا اور کچھ دیر کے بعد وہ دونوں ہنسنے لگے۔ اور انور نے انہیں امجد اور تسنیم کی اور باتیں بھی بتائیں کہ میں نے دیکھا کہ جانے کے وقت اور تو اپنی اپنی پیالی آپ اُٹھائیں مگر بھائی امجد کو آپا تسنیم خود اُٹھا کے دیں اور بھائی امجد تو وہاں جاتے ہیں تو کسی اور چیز کو دیکھتے ہی نہیں۔ باتیں ان سے کریں یا نہ کریں مگر جب کبھی بھی ان کی طرف دیکھتا۔ ان کی نگاہیں اکثر آپا تسنیم کے چہرہ پر ہی ہوتیں۔ رشیدہ نے بڑی آپا کو بھی بُلا لیا اور وہ دونوں خوب مزے سے انور کی باتیں سنتی رہیں۔

نگاہوں کا اثر الفاظ سے شاید زیادہ ہوتا ہے۔ بہر حال یہ یقینی امر ہے کہ امجد کو ایسی باتوں نے کبھی دو دن سے زیادہ اُس طرف، جانے سے نہ روکا۔ کسی کے آنے پر سانس کا قدرے تیز تیز آ جانا، ایسی بات نہیں جو ہر ایک محسوس کر سکے اور فوراً ہی کسی کام میں منہمک ہو جانا بھی غالباً کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ اس کی والدہ کی توجہ خاص طور پر تسنیم کی طرف مبذول ہو۔ کیا امجد آتے ہی پہلے اپنی تائی جان کی خیر و عافیت نہ پوچھتا تھا۔ کیا وہ سوائے تسنیم کے باقی سب سے نہایت تپاک اور خندہ پیشانی سے نہ پیش آتا تھا۔ کیا وہ جتنا عرصہ وہاں بیٹھتا بچوں کو کچھ نہ کچھ نہ پڑھاتا یا سمجھاتا تھا۔ واقعی ایسا شریف اور سعادتمند لڑکا کہاں مل سکتا ہے۔ مگر یہ خیال بھی آنے سے نہ رُکتا کہ یہ روز روز کا آنا کیا کوئی خاص معنی رکھتا ہے؟ خیر تو ایسا کیا ہوتا ہے مگر پھر بھی۔ ساتھ یہ بات بھی نہ بھولتی کہ اُسے دیر سے ہی تو اس گھر سے محبت ہے۔ بعض بندے ہوتے ہی حسب والے ہیں۔ پھر بھی لڑکیاں جوان ہیں۔ مگر امجد ہے بھی تو اپنا لڑکا کوئی غیر تو نہیں۔ باقی رہا امجد سو اس کے لئے اس گھر

ں ایسی جاذبیت تھی کہ اگرچہ اس نے اپنے آپ سے یہ سوال بلند آواز میں نہیں کیا تھا کہ وہاں اسے کونسی چیز لے جاتی ہے ر یہ ضرور تھا کہ جب کبھی وہ لمبی سیاہ پلکوں والی آنکھیں اس کی طرف پانچ سیکنڈ سے زیادہ دیکھ لیتیں تو وہ یہ بھول جاتا کہ کہاں یٹھا ہے اور اس پاس کون موجود ہے اور اس نظر کے کیا معنی ہیں، وہ آنکھیں کیا کہنا چاہتی ہیں، اس کی اپنی آنکھوں میں کیا یز جھلک رہی ہے؛ اور اس کا اپنا دل کیوں زور زور سے دھڑکنے کے بعد فوراً بند ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی خوش قسمتی ی تھی چاہئے کہ وہ نظر اتنے عرصہ سے زیادہ اس کی آنکھوں میں نہ دیکھتی۔

ایسے لمحات میں دونوں یہ بھول جایا کرتے تھے کہ ان کے خاندانی تعلقات آپس میں کیسے ہیں۔ کیونکہ دونوں کنبوں کے علقات بظاہر بہت خوشگوار تھے۔ جیٹھانی اور دیورانی برادری کی تقاریب کے علاوہ ہفتے عشرے نہیں تو مہینے میں ایک دو بار تو ضرور ی ایک دوسرے سے مل لیتی تھیں اور امجد کی بہنوں اور تسنیم اور نسیمہ میں اگرچہ ہم عمری نہ ہونے کی وجہ سے بہت بے تکلفی تھی پھر بھی سگے تائے چچا کی اولاد سے اور کونسا رشتہ قریب تر ہوتا ہے۔ دوسرے اگرچہ فریقین میں سے کوئی بھی یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ ہوتا، یہ بھی صحیح تھا کہ ان کی باہمی دلچسپی کی وجہ ایک اور بھی تھی۔ اگر آپا مجیدہ اور آپا رشیدہ امجد کی بہنیں تھیں تو تسنیم کو اس کی بہن نسیمہ یہ کہہ کے بھی تو چھیڑا کرتی تھی کہ "تمہارے بھائی امجد آگئے"۔ چنانچہ جب کبھی میل جول کا موقع ملتا، دونوں یک دوسرے کی حرکات و سکنات کو نہایت توجہ اور دلچسپی سے دیکھتیں اور اپنے اپنے گھر جا کر دونوں گھنٹوں ایک دوسرے کے لباس، طبیعت، انداز، سلیقے، گفتگو وغیرہ غرض ہر ایک چیز کے متعلق طویل اور مفصل تبصرہ کرتیں۔

ایک دن آپا رشیدہ کی سالگرہ کے موقع پر تسنیم اور نسیمہ دونوں کو دعوت دے کر بلایا گیا۔ دعوت بہت کامیاب رہی۔ دو یک اور سہیلیاں بھی آئی ہوئی تھیں۔ برسات کے دن تھے، پُوڑے پکے، صحن میں ایک طرف جھُولا پڑا تھا۔ دو تین گھنٹے بہت چہل پہل رہی۔ ہنسی مذاق، لطیفوں، قصّوں اور باتوں میں وقت ایسا جلد گزر گیا کہ محسوس تک نہ ہُوا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ سہیلیوں کو کیوں بلایا گیا تھا۔ امجد کا خیال تھا کہ آپا رشیدہ نے ضد سے انہیں بلایا تھا کہ میں اندر نہ آسکوں۔ رشیدہ کا خیال تھا کہ تسنیم کا کسی ایک شخص نے ٹھیکہ نہیں لے رکھا۔ انور کا خیال تھا کہ شاید آپا رشیدہ بھائی امجد کو مذاق کرتے کرتے تھک گئی ہیں! آپا تسنیم کو فقط مشق کے لئے بلایا ہے ورنہ بُلانا ہی تھا تو نسیمہ کو بُلا لیتیں۔ نسیمہ کا خیال تھا کہ اس بلاوے سے چچی جان کا کوئی خاص مطلب تھا۔ چچی جان کو گھر میں رونق اچھی لگتی تھی، مجیدہ نے رشیدہ سے خاص طور پر کہہ کے تسنیم کو بلوایا تھا، کیونکہ انہیں اپنی نئی بوسکی کی قمیص کی بیڈنگ کرانی تھی اور تسنیم سے اچھی بیڈنگ کوئی نہ کرتا تھا۔ سہیلیوں کو تسنیم اور نسیمہ یُونہی بھلی اور خوبصورت لگتی تھیں اور تسنیم کے لئے یہ گھر خاص اہمیت رکھتا تھا۔ گویا کسی کے لئے بھی یہ موقع دلچسپی سے خالی نہ تھا۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں کہ دن بہت خوشی اور لُطف سے گذرا۔ شام سے ذرا پہلے ہی سب رُخصت ہو گئیں۔

رات کو کھانے کے بعد آپا رشیدہ نے امجد سے پوچھا "امجد آج تم اندر نہیں آئے؟" اب یہ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ اس سوال سے ان کا کیا مطلب تھا۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ امجد اندر نہیں آسکتا تھا۔ اس لئے کہ ایک چھوڑ دو دو سہیلیاں اندر جمی بیٹھی تھیں، مگر آپا رشیدہ ایسی بات نہ کریں تو کون کرے۔ چنانچہ امجد نے فقط ایک غصے سے بھری ہوئی نظر ان کے مسکراتے ہوئے خوش شکل چہرے پر ڈالی اور کوئی جواب نہ دیا۔ اس پر انہوں نے بڑی آپا کی طرف متوجہ ہو کر ان سے پوچھا "آپا تمہیں معلوم ہے یہ امجد کیوں بسورے بیٹھا ہے؟" مگر جواب کا انتظار کرنے کے بغیر ہی یہ بھی کہا کہ "تسنیم کی آپ نے ناک دیکھی ہے، پتہ نہیں کس پر ہے؟" اس بات پر امجد کا منہ سرخ ہو گیا کیونکہ جس موضوع پر اس کا اور گھر والوں کا اتفاق کبھی نہ ہوا تھا وہ تسنیم کی ناک تھی۔ گھر والے اونچی ستواں ناک پسند کرتے تھے، وہ خود تیکھی ناک 'نکیلی' کہہ کے ہمیشہ ایک بالغانہ انداز سے ہنس دیا کرتا تھا۔ اسے پتلی ناک بہت بری لگتی تھی، اس کے خیال میں ناک کی سب سے خوبصورت چیز نتھنوں کی نزاکت تھی، اگر وہ ایسے نازک اور حساس ہوں کہ معمولی سے جذبہ سے متأثر ہو جائیں تو خواہ ناک بہت اونچی نہ ہو اسے پسند آتی تھی۔ تسنیم کی ناک ستواں نہ تھی۔ مگر تھی خوش وضع اور اسے تو بہت ہی دلفریب معلوم ہوتی تھی، مگر دوسروں کے لئے ایک دائمی مذاق کا موضوع تھی۔ اس لئے اس نے فقط یہی کہا "اپنی طرف تو دیکھئے"۔ اس پر مجیدہ نے کہا "امجد تم یونہی خفا ہو جاتے ہو، رشیدؔ تو ہے ہی پاگل، اس کی باتوں پر برا نہ مانا کرو۔ میں نے تم سے کئی دفعہ کہا ہے کہ تم ایک دوسرے سے ناراض نہ ہوا کرو اور پھر تسنیم کی ناک کے علاوہ باقی کسی نقش کو تو کوئی برا نہیں کہتا۔ دوسرے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں غصہ آئے ہی کیوں کیا تمہارا اس سے بیاہ کا ارادہ ہے؟"۔ اس سوال سے امجد بہت گھبرایا اور شرمایا بھی۔ چنانچہ اس نے ارادہ کیا کہ اٹھ جائے مگر شاید رشیدہ کا جی ابھی اور باتیں کرنے کو چاہتا تھا اس نے قمیص سے پکڑ کر بٹھا لیا کہ کیوں بھاگے جاتے ہو، اس سوال میں کیا گناہ ہے۔ مگر میں تمہیں مشورہ دوں، اس خیال کو چھوڑ دو۔ اس پر وہ بہت جھنجھلایا "کونسا خیال؟ آپ سب کا دماغ تو نہیں پھر گیا؟ میرا کوئی اِرادہ وِرادہ نہیں"۔ اس نے جلدی سے کہا اور پھر کوشش کی کہ اٹھ جائے۔ مگر اس دفعہ مجیدہؔ نے بھی کہا کہ کیوں تمہیں اتنی جلدی ہے، کبھی تو ہمارے پاس بھی بیٹھ جایا کرو۔ یہ الفاظ شاید انہوں نے سادگی سے کہے ہوں مگر رشیدہ اور انور نے ان کے کوئی اور معنی لئے اور دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور امجد نے محسوس کیا دونوں مسکرا رہے ہیں۔

اس سے دو یا تین دن بعد جب امجد ادھر گیا تو اندر داخل ہوتے ہی صحن اسے کچھ بے رونق سا معلوم ہوا۔ تائی جان وہیں موجود تھیں، افضل ان کا سب سے چھوٹا لڑکا بھی وہیں تھا، نسیمہ بھی بیٹھی کچھ لکھ رہی تھی۔ مگر تسنیم [illegible] آگے کی جگہ خالی تھی، تسنیم اکثر وہاں بیٹھی ہوتی تھی۔ امجد سلام کر کے بیٹھ گیا مگر [illegible] نہ رہا۔ جہاں پہلے آتے

راق اور چہل پہل ہو جایا کرتی تھی، آج گھر کی فضا کچھ ساکن اور خاموش سی تھی۔ امجد نے حسب معمول تائی صاحبہ سے باتیں شروع کر دیں کہ آپ جب دیکھو کوئی نہ کوئی کام ہی کر رہی ہوتی ہیں، کبھی تو بے کار بھی بیٹھا کیجئے۔ بیکاری اچھا شغل ہے، بیکاری سے آدمی کے خیالات میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ زندگی کے متعلق اسے سوچنے کا موقع ملتا ہے۔ اور پھر دوسروں کو کام کرتے دیکھ کر یک بے لوث خوشی محسوس ہوتی ہے جس سے طبیعت میں ایک سرور پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ روح کے لئے بہت فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً میری طرف دیکھئے۔ آپ کو کام میں مشغول دیکھتا ہوں، نسیمہ بھی کچھ نہ کچھ کیا ہی کرتی ہے، تسنیم بھی ضرور رہی کسی نہ کسی شغل میں لگی رہتی ہے۔ یہ لڑکے بھی محنت کرتے رہتے ہیں۔ آپ سب کو مصروف دیکھ کر مجھے خوشی ہوتی ہے" وغیرہ وغیرہ۔ مگر اسے اپنی باتوں میں آج کچھ لطف نہ آیا، اگرچہ تائی جان نہایت متانت اور بردباری سے سب باتیں سنا کیں اور جیسا کہ ان کی عادت تھی کبھی ہنس کے، کبھی مسکرا کے کبھی ایک آدھ لفظ سے گفتگو میں شریک رہیں۔ لڑکے بھی حسب دستور کوئی نہ کوئی حل طلب چیز لے آئے، وقت گزرتا گیا مگر تسنیم نہ آئی۔ آخر کار امجد کو پوچھنا ہی پڑا۔ مگر اسے تائی صاحبہ سے پوچھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ یونہی سرسری طور پر نسیمہ سے پوچھا کہ تمہاری آپا کسی سہیلی کے ہاں گئی ہیں؛ اس نے سر ہلا دیا اور پھر یہ کہا کہ نہیں وہ تو شاید اپنے کمرے میں ہیں۔

اسی طرح ایک گھنٹہ گذر گیا۔ سب کرنے والی باتیں ختم ہو گئیں۔ نئی بات نکالنے کے لئے دماغ نہیں تھا۔ در و دیوار کی طرف زیادہ دیکھنا بھی شاید دوسروں کو اپنی بے دلی کی طرف متوجہ کرنا تھا۔ اس لئے امجد کے لئے زیادہ بیٹھنا مشکل ہو گیا جہاں روز طبیعت اتنی حاضر ہوتی تھی اور شگفتہ خاطری کا یہ عالم ہوتا تھا کہ سب کے سب اس کی باتوں پر ہنستے، خوش ہوتے اور ان میں دلچسپی لیتے تھے، آج طبیعت پر زور دینے سے ہی لمبی چوڑی گفت گو کی طرف اپنے آپ کو راغب کرنا پڑتا تھا۔ اور پھر اپنی باتیں ہی اپنے آپ کو غیر دلچسپ اور پھیکی سی معلوم ہوتی تھیں۔ یونہی خفیف سی بے چینی بھی دل میں اضطراب پیدا کر رہی تھی کہ اگر خیریت ہے اور خیریت ہی ہو گی ورنہ ضرور کسی نہ کسی سے باتوں باتوں میں سن ہی لیتا کہ آپا کے سر میں درد ہے یا کچھ اور بات ہے۔ پھر اس خاموشی کے کیا معنی؛ بلکہ ایک دفعہ جب وہ سب تین چار منٹ تک چپ رہے، تو امجد کو خیال ہونے لگا کہ شاید یہ لوگ آج میری موجودگی یہاں نہیں چاہتے اس لئے اسے اپنا بیٹھا رہنا نامناسب سا معلوم ہونے لگا۔ مگر اس نے جی کڑا کر کے پوچھ ہی لیا کہ تسنیم کی طبیعت تو ٹھیک ہے؛ اس پر تائی صاحبہ نے ایک ایسی آواز میں جواب دیا جو اسے کچھ روکھی معلوم ہوئی" نہیں تو، شاید کوئی کام کر رہی ہو گی۔ مگر اس جواب سے اس کی تسلی نہیں ہوئی، لہذا اس نے نسیمہ کی طرف دیکھا۔ وہ اس وقت کاپی میں پنسل سے کچھ لکھ رہی تھی۔ اس نے سر اٹھایا تو امجد کو اپنی طرف مستفسرانہ اور متجسسانہ انداز سے تکتے ہوئے پایا۔ شاید اس نے امجد کے چہرے پر ہی کچھ پریشانی کے آثار دیکھے ہوں، یا اس نے قیاساً اس کی بے چینی

اور اُداسی کو بھانپ لیا ہو۔ بہر حال وہ اُٹھی اور یہ کہہ کر "بھائی جان یہ عبارت میری دیکھئے ٹھیک ہے ؟" اپنی کاپی امجد کے ہاتھ میں دے دی۔ امجد نے جو اس صفحہ کو دیکھا تو اس پر سب سے اوپر یہ حروف لکھے تھے "آج آپا تسنیم کی اباجی اور اماں جی نے کہیں منگنی کردینے کا فیصلہ کرلیا ہے، آپا اندر بیٹھی رو رہی ہیں"۔

اس کے بعد اسے خود معلوم نہیں کہ وہ کس طرح یا کس راستہ سے گھر واپس آیا۔ یا اگر وہ روز والی سڑک سے آیا تھا تو اس پر دکانیں کھلی تھیں یا نہیں، تانگے، موٹریں یا سائیکل اسے راستے میں ملے یا نہیں، یا اسے آنے میں کتنا عرصہ لگا۔ تمام راستہ یہی اپنے آپ سے کہتا آیا کہ آخر کیا ہوگیا، ان کی لڑکی تھی، انہوں نے منگنی کردی، یا کردیں گے، فیصلہ تو کرہی لیا ہوگا کرلیں۔ ہمیں اطلاع ہوتی، جب ہوتی۔ مگر یہ ضروری تو نہیں کہ سب کو فوراً ہی خبر کردی جائے۔ خواہ وہ کتنے ہی عزیز ہوں ایسی باتوں میں مشورہ کی ضرورت تو ہوتی ہی نہیں، اور پھر مشورہ کس سے کرتے؟ اباجان اپنے دوروں پر ہی رہتے ہیں اور امی جان سے شاید تائی جی مشورہ ہی نہ کرنا چاہتی تھیں۔ ان کا آپس میں سلوک تو ہے مگر اتنا نہ ہوگا! یا شاید اس بات میں انہیں صلاح مشورہ کی ضرورت ہی نہ ہوگی۔ مگر تسنیم اور منگنی! اور فوراً اور یوں چپ چاپ! مگر پھر دل کہتا کہ آخر انہیں کیا خبر ہے کہ کسی اور جگہ بھی اس کا رشتہ ہوسکتا تھا۔ پھر خیال آتا کہ اتنے سال، خیر بہت سال نہیں، ایک دو سال سے تو ان کے ہاں دوسرے تیسرے چلا ہی جاتا تھا۔ اس سے کسی کو کوئی اندازہ نہ ہوسکتا تھا؟ آخر تایا جان تو خاص طور پر مہربان تھے۔ گھر والے بھی مجھ سے مذاق کیا کرتے تھے!

گھر آیا تو سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا، مگر گم سُم اکپڑے اُتارے، عادتاً ہر چیز، پتلون، ہیٹ، ٹائی وغیرہ قرینے سے اپنی اپنی جگہ رکھ دی۔ پھر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ پاس ایک کتاب پڑی تھی، یونہی بے توجہی میں اُٹھالی۔ پڑھنے کے لئے آنکھیں صفحات پر سے سطر در سطر گذرنے لگیں، مگر الفاظ کے لغوی معنی اگر دماغ میں آجاتے تھے تو جملوں کا مطلب فوت ہوجاتا تھا یونہی اندھا دھند دو تین صفحات پڑھ ڈالے مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ نظر الفاظ پر ہی تھی مگر یہ خیال بار بار آرہا تھا کہ یہ کیسے ہوگیا؟ یہ کیسے ہوگیا؟ تسنیم کی منگنی انہوں نے کیسے کردی۔ تسنیم کیسے کسی اور کی ہوجائے گی! تسنیم کی آنکھیں! تسنیم کی پلکیں! تسنیم کے ہونٹ!

کھانے کا وقت آیا تو امجد ابھی کمرے ہی میں تھا۔ بستر پر لیٹا ہوا چھت پر نظر گاڑے اسی بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ انہوں نے کیوں منگنی کردی؟ اور ایسے چپ چپ کیوں کردی؟ اب کیا ہوسکتا ہے! اب تو شاید کچھ نہیں ہوسکتا مگر شاید ہوسکتا ہو، کیا خبر اُنہوں نے آپس میں فیصلہ کیا ہے یا لکھ کے بھیج دیا ہے؟ مگر بات ضرور پکی ہوگئی ہوگی ورنہ نسیمہ کو کیسے پتہ لگتا اور پھر تسنیم کیوں سامنے نہ ہوئی، اسے دیکھ تو لیتا!

مگر کون اُن سے کہے؛ کسی کو ضرورت ہی کیا ہے، گھر میں کسی کو کیا پروا ہے؛ میں خود بھی کچھ نہیں کر سکتا! تایا جان سے میں نہیں کہہ سکتا، تائی جی سے کہنا تو بالکل ہی ناممکن ہے، اپنی اُمی جان سے اور بھی مشکل ہے اور ابا جان سے جا کر کہنا ہی فضول اور عجیب دکھائی دیتا ہے! کیا کیا جائے؛ آخر کس طرح کچھ کیا جائے! دماغ سُن معلوم ہوتا تھا، خیالات بے ربط ہوتے جاتے تھے، مگر جو سوال بار بار آ کر سب احساسات پر چھا جاتا تھا وہ یہ تھا کہ یہ کیسے ہو گیا؛ اتنی جلدی کیونکر ہو گیا؛ دو تین دن ہوئے وہ ہمارے ہاں دعوت پر آئی ہوئی تھی اور اب یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ہم سے چھوٹ کر کہیں اور جا بسی ہے اور دِل کی کیفیت عجیب تھی، یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس میں سے کوئی چیز کسی نے چھین لی ہے!

شام ہو گئی تھی مگر کمرے میں ابھی اندھیرا تھا۔ اس لئے کچھ عرصے تک تو کوئی ادھر نہ آیا مگر پھر تشویش ہوئی تو رشیدہ نے آ کے آواز دی۔ پہلی آواز پر تو اس کا جواب دینے کو جی نہ چاہا مگر دوسری پر اسے جواب دینا ہی پڑا۔ ساتھ ہی اس نے جلدی سے بٹن بھی دبا دیا روشنی ہو گئی تو رشیدہ اندر آ گئی اور اس نے پوچھا "خیر تو ہے اندھیرے میں پڑے ہو" امجد نے کہا "نہیں تو، یونہی آرام کر رہا تھا۔ کھانا تو تیار ہو گا؛ چلو کھانا کھائیں" مگر ہر وقت ساتھ رہنے والوں اور پھر بڑی بہنوں جیسی تیز نظر والیوں کو پژمردگی خواہ وہ آواز میں ہی چھپی ہوئی ہو محسوس ہو ہی جاتی ہے۔ رشیدہ نے غور سے امجد کے چہرے کی طرف دیکھا مگر اس وقت زیادہ استفسار شاید قرینِ مصلحت نہ سمجھا۔ بہر حال وہ دونوں باورچی خانہ کے ملحقہ کمرے میں چلے گئے، جہاں عام طور پر کھانا ہی کھایا جاتا تھا۔ بڑی آپا بھی وہیں موجود تھیں اور چھوٹی سعیدہ اور انور بھی۔ کھانے کے دوران میں تقریباً ہر ایک نے کم و بیش محسوس کیا کہ اس کی طبیعت کسی وجہ سے پریشان ضرور ہے کیونکہ اس میں روز کی سی بشاشت نہ تھی اور نہ وہ کھانے ہی میں دلچسپی لے رہا تھا۔ یہ سب کو معلوم تھا کہ آج شام امجد اُدھر گیا تھا، کیونکہ جاتے وقت حسب معمول پھر آپس میں مذاق ہوئے تھے اور رشیدہ نے گانا شروع کر دیا تھا "گجرا بیچن والی تو کہاں چلی" مگر اس وقت کسی کو مذاق کی نہ سُوجھی کیونکہ امجد کا چہرہ کچھ اُترا ہوا اور قدرے افسردہ معلوم ہوتا تھا۔ اس لئے کھانے کے بعد جب انور اور سعیدہ چلے گئے تو مجیدہ نے جس سے رشیدہ نے اشاروں اشاروں میں کچھ کہا تھا، امجد سے پوچھ ہی لیا کہ خیر تو ہے تم کچھ اُداس اُداس سے لگتے ہو۔ مگر امجد نے کچھ جواب نہ دیا اور دوبارہ پوچھنے پر بھی کہا کہ کچھ نہیں اور پھر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

بعد میں دونوں بہنوں میں کچھ گفتگو اسی بارے میں ہوئی کہ کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہے، ورنہ جس وقت گھر سے روانہ ہوا تھا بات بات کا جواب دیتا تھا۔ بلکہ رشیدہ نے کہا کہ جب میں وہ گیت "گجرا بیچن والی تو کہاں چلی" گاتی تھی تو ہنس ہنس کے میری آواز کی نقل اُتارتا تھا اور اب غیر معمولی طور پر چپ چاپ اور خموش ہے، کوئی بات ایسی ہو گئی ہے، ورنہ امجد کی تو عادت ہی تھہرنے کے بیٹھے رہنے کی نہیں۔ جب تک کسی سے ہنسی، کسی سے ٹھٹھا نہ کر رہا ہو، یا اپنی کوئی رام کہانی نہ سنا

رہا ہو، اسے آرام نہیں آتا۔ مگر چونکہ اس سے دوبارہ پوچھنے پر بھی امجد نے انہیں عمداً ٹال دیا تھا، اس لئے انہوں نے اُس رات اس سے مزید استفسار مناسب نہ سمجھا اور پھر انہیں یہ خیال تھا کہ اگر کوئی ایسی ہی بات ہوئی تو خود ہی پتہ لگ جائے گا، ورنہ دن تو چڑھنے دو، ممکن ہے واقعی کوئی بات نہ ہو۔ مگر دل نہ مانتا تھا کہ امجد کی چپ بے وجہ ہے۔

دوسرے دن بھی جب انہیں امجد کو دیکھنے یا اس سے بات کرنے کا موقع ملا، تو انہوں نے دیکھا کہ امجد کی افسردگی عارضی نہ تھی۔ انہیں یقین ہوگیا کہ اس کی تہ میں ضرور ہی کوئی پریشانی والی بات ہے۔ کیونکہ امجد یا تو کالج سے آنے کے بعد کم ازکم آدھا گھنٹہ ان کے ساتھ، اِدھر اُدھر کی باتوں میں صرف کیا کرتا تھا یا اس دن کالج سے آکے کھانا کھایا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ مگر وہ دونوں پھر چپ رہیں اور انہوں نے اس سے کوئی سوال نہ کیا۔ مگر جب دو ایک روز ہی اسی طرح گزر گئے اور یہ صاف ظاہر ہونے لگا کہ امجد نہ تو ویسا بشاش ہی تھا جیسے اس کی طبیعت تھی اور نہ وہ اپنے مرغوب اصُولوں پر ہی اب کوئی گفتگو کرتا تھا۔ اور نہ ان کے پاس اب وہ بیٹھتا ہی تھا تو انہیں اور بھی تشویش اور تجسس ہُوا۔ اور اس وجہ سے اور بھی زیادہ کہ اتنے دنوں میں وہ ایک دفعہ بھی سہ پہر کے وقت کپڑے پہن کر باہر نہ گیا۔

ادھر امجد کا اضطراب اور بھی بڑھنے لگا کیونکہ اب اسے یہ احساس ہونے لگا کہ اگر کچھ ہونا چاہیئے تو جلدی ورنہ جتنی دیر ہوتی جائے گی اتنی ہی ادھر منگنی پختہ ہوتی جائے گی۔ کچھ اسے خیال سا ہوگیا کہ جوں جوں دن گزرتے جاتے ہیں، وہ عہد وپیمان یا جو کچھ فیصلہ یا اقرار تایا جان نے کسی کے ساتھ تسنیم کے بارے میں کیا ہوگا، وہ اور بھی مضبوط اور اٹل ہوتا جا رہا ہے۔ مگر وہ خود بے بس تھا۔ وہ خود کر ہی کیا سکتا تھا، وہ خود تو کسی سے بھی کچھ کہہ نہ سکتا تھا۔ اگر تایا جان سے، فرض ہی کرلو، وہ کچھ کہہ ہی دے اگرچہ یہ بات کتنی ہی ناممکن، مگر بالفرض کر ہی لے تو سوائے اس کے کہ تایا جان اسے پاگل سمجھیں اور کیا فائدہ حاصل ہوگا، اور تائی جان سے تو کچھ کہنا ہی اس کی قدرت سے باہر تھا اپنی والدہ سے بھی تو وہ خود نہیں کہہ سکتا تھا۔ اپنی طرف سے وہ کیا خود ایسی بات تجویز کرسکتا تھا؟ توبہ! توبہ!! اگر کہہ ہی دے تو امی جان، نہ معلوم کس حیرت اور شاید صدمہ اور شاید غصّہ سے کیا کہہ ڈالیں!

اس لئے امجد دل ہی دل میں تلملاتا تھا اور اپنی بے بسی اور بے چارگی پر دانت پیستا تھا۔ مگر سب سے زیادہ جو بات اسے تکلیف دیتی تھی وہ یہ تھی کہ اسے یہ محسوس ہونے لگا گویا کوئی چیز جس سے اس کی زندگی وابستہ تھی لحظہ بہ لحظہ اس سے دُور ہٹتی چلی جاتی ہے۔ جیسے اس کے پاؤں کے نیچے ریت ہو اور وہ پہلے آہستہ آہستہ پھر بتدریج تیزی سے پاؤں تلے سے سرکتی جائے اور معلوم نہ ہو کہ اب کیا ہو جائے گا۔ اور دل تھا کہ ڈوبا جارہا تھا۔

مجیدہ اور رشیدہ نے جب یہ پریشانی بڑھتی دیکھی تو چوتھے دن انہوں نے امجد کو مجبور کرکے اس سے پوچھ ہی لیا۔ ان کے

ابھی بہت پریشان ہوئیں۔ رشیدہ جیسی شوخ طبع بھی چپ کی چپ ہی رہ گئی۔ مجیدہ نے امجد سے پوچھا "کیا کرنا چاہتے ہو؟"
چپ تھا۔ کیا جواب دیتا، تنہائی میں اپنے آپ سے کسی قسم کی جھجک کے بغیر تسنیم جیسی چیز کا مطالبہ کر سکتا تھا، دو بڑی بہنوں
ے سامنے وہ کیا کہتا۔ مگر چونکہ انہیں خود احساس تھا، اس لئے انہوں نے پھر پوچھا کہ کیا کرنا چاہئے؟ مگر امجد نے کہا "میں آپ
کیا بتاؤں۔ مجھے تو کچھ نہیں سوجھتا۔ میں اماں سے نہیں کہہ سکتا، میں تایا جان سے کیا کہہ سکتا ہوں اور جب کہ وہ کہیں
لے ہی منگنی کر دینے کا فیصلہ اگر نہیں چکے تو کر رہے ہیں" رشیدہ نے کہا "آپا اگر اماں سے آپ کہیں تو کیا حرج ہے۔ آپ بڑی
ب اور بیاہی ہوئی ہیں، اماں آپ کی عزت بھی کرتی ہیں، اگر آپ اماں سے کہیں کہ امجد کے لئے وہ تایا جان سے تسنیم کا رشتہ مانگ
ں تو وہ کیوں نہ آپ کی بات مان لیں۔ اور اگر اماں نے مانگ لیا تو یہ نہیں ہو سکتا کہ تایا جان انکار کر دیں۔ میں بھی آپ کے
ں ہی ہوں گی، میں بھی ہاں میں ہاں ملا دوں گی، اور مجھے تو یقین ہے اگر آپ اصرار سے کہیں تو اماں ضرور ہی آپ کا کہا
ن لیں گی۔ تسنیم تو بہت پیاری سی لڑکی ہے، اس سے اچھی ہمیں کہاں ملے گی"۔

دوسرے دن جب کالج سے آ کر امجد نے رشیدہ سے علیحدگی میں پوچھا تو اس نے کہا "امجد مجھے بہت افسوس ہے بے حد
ں، اور آپا کے تو آنکھوں میں آنسو ہی آ گئے تھے مگر اماں کہتی ہیں کہ اگر تمہارے تایا جان نے ہم سے مشورہ کئے بغیر ہی تسنیم کی
منگنی کہیں اور کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو ہم کس منہ سے ان سے رشتہ مانگ سکتے ہیں۔ کم از کم ہمیں تو رشتہ تمہاری تائی سے
نگنے سے رہی۔ اور جب ہم نے یہ کہا کہ امجد کو تسنیم بہت پسند ہے تو انہوں نے کہا، "وہ ابھی بچہ ہے، اس کا کیا ہے، جس کے
اتھ اس کی شادی کر دیں گے، اسے وہی پسند آ جائے گی"۔

سیّد فیاض محمود

ہونا تھا اگر ایسا پیمانِ شناسائی
کیوں مجھ کو دو عالم سے بیگانہ بنایا تھا

خوشی کا راگ

مست رہ ــــــ خوشی منا ــــــ عیش کر

تُو دُکھ بھی سہہ ــ تو مست رہ
خطر بھی ہو ــ تو عیش کر
مزے اُڑا ــ خوشی منا

مست رہ ــــــ خوشی منا ــــــ عیش کر

ترا جہاں ــ ہے اک سماں
ابھی ہے کچھ ــ ابھی ہے کچھ
تری یہ جاں ــ ہے اک دیا
ابھی جلا ــ ابھی بجھا
سو بے خبر! ــ تُو ہو نڈر
کہ بے سبب ــ ہی روز و شب

مست رہ ــــــ خوشی منا ــــــ عیش کر

ہے سب کا تُو ــ برنگِ بُو
مگر یہ سب ــ ہیں اپنے کب
گُل و ثمر ــ بہم دگر
کوئی ہے یُوں ــ کوئی ہے وُوں
بھلا کوئی ــ بُرا کوئی

مگر ہے کیا　　بھلا بُرا ؟
بھلائیاں　　بُرائیاں
ہیں سب فقط　　ہوائیاں
یہ جان کر　　یہ مان کر
مست رہ ——— خوشی منا ——— عیش کر

خوشی بھلی　　مگر کبھی
یہ غم نہ کر　　کہ خوش ہو تُو
ہو رات دِن　　یہ جستجُو
خوشی ملے　　مِلے خوشی
گدا نہ بن　　بن آدمی
ہے آدمی　　وہ آدمی
جو دُکھ سے بھی　　جو سُکھ سے بھی
نہ زیر ہو　　دلیر ہو
ہو جس کا دل　　نہ مضمحِل
جو آپ سے　　یہی کہے
کہ جانِ من　　تو مرد بن
جو ہو سو ہو　　جو ہو سو ہو
تُو مرد بن　　کے جانِ من
مست رہ ——— خوشی منا ——— عیش کر

پنغمے

(۱)

اُٹھی حورِ سحر انگڑائی لے کر خوابِ نوشیں سے
چمک اُٹھا جہاں اُس کے تبسم ہائے رنگیں سے
ہر اک ذرّے میں خورشیدِ تجلّی جلوہ آرا تھا
ہر اک قطرے میں بحرِ حُسن کا طوفاں برپا تھا
ہر اک گُل میں تھی جنّت کی بہارِ رنگ و بُو گویا
فضائے دہر پر چھایا ہوا تھا تُو ہی تُو گویا
مرے لب پر تھا تیرے حُسن کا کیف آفریں نغمہ!

(۲)

عجب انداز سے بامِ فلک پر آفتاب آیا
شبابِ حسنِ عالم سوز لے کر بے نقاب آیا
لہو دوڑا رگِ ہستی میں سیلِ آتشیں ہو کر
گرے کونین پائے حُسن ہیں لوحِ جبیں ہو کر
ہر اک ذرّے کا سینہ ایک بحرِ بیقراری تھا
دلِ کون و مکاں پر اضطرابِ شوق طاری تھا
مرے لب پر تھا سوزِ عشق کا اِک آتشیں نغمہ!

(۳)

شب تاریک آخر چھا گئی پہنائے عالم پر
لگائی یاس نے اک چوٹ تارِ بربطِ غم پر
جہانِ رنگ و بُو اک درد کی تصویر تھا گویا
سرودِ آبادِ ہستی نغمۂ دلگیر تھا گویا
فضائیں تیرہ و تاریک تھیں مغموم آہوں سے
ٹپکتی تھیں ہزاروں حسرتیں غمگیں نگاہوں سے
مرے لب پر تھا انجامِ محبت کا حزیں نغمہ!

(۴)

بہت گائے ترے حُسنِ جنوں انگیز کے نغمے
بہت گائے جنونِ عشقِ محشر خیز کے نغمے
مری رنگیں نوائی سے جہاں مسرور رہتا تھا
مرے آشفتہ نغموں سے جہاں رنجور رہتا تھا
ترے جلوے بھی بے پایاں، مری اُلفت بھی بے پایاں
مرا اظہارِ حُسن و عشق تھا مجذوب کا ہذیاں
مری خاموشیوں میں موجزن ہے بہتریں نغمہ!

اثر صہبائی

برسات کی شام

خواب گاہِ روح پر چھایا ہے ابرِ سرخوشی
سحر کے عالم میں بیٹھا ہوں کنارِ گومتی

لائی ہے محبوبۂ فطرت کی جانب سے پیام
ایک رومان آفریں برسات کی رنگین شام

ہیں خمار آگیں دھندلکے ہر طرف چھائے ہوئے
شام کے بھیگے ہوئے گیسو میں لہرائے ہوئے

نم ہوا میں کھل گیا ہے طرۂ موجِ شمیم،
بادلوں کے سائے میں تھم تھم کے چلتی ہے نسیم

رُوح پر طاری ہے عنابی فضاؤں کا خُمار
آسماں ہے کس مصوّر کا اچھوتا شاہکار؟

کچھ طلسمی وادیاں ہیں کچھ جزیرے خوابناک
کچھ پہاڑی سلسلے ہیں دُور تک ہمرنگِ خاک

پھر طلسمی وادیوں میں لہلہاتے سبزہ زار
نقرئی لہروں کی جھیلیں، جگمگاتے آبشار

اور کچھ ہٹ کر وہ اِک ندی ہے بل کھاتی ہوئی
رقص کرتی سانپ کے مانند لہراتی ہوئی

شامِ رنگیں کے گلابی سیل میں ڈوبے ہوئے
تیرتے ہیں آتشیں موجوں پہ ٹکڑے برف کے

کچھ زمرد کے سمندر، کچھ سنہری کشتیاں
پھر سنہری کشتیوں کے ارغوانی بادباں

دامنِ کہسار میں پگھلے ہوئے ہیروں کی جھیل
اور فرازِ کوہ پر ابرِ رواں کے مست فیل

مست فیلوں کے جلو میں شوخ سبزوں پر سوار
بانکے ترچھے سورماؤں کی قطار اندر قطار

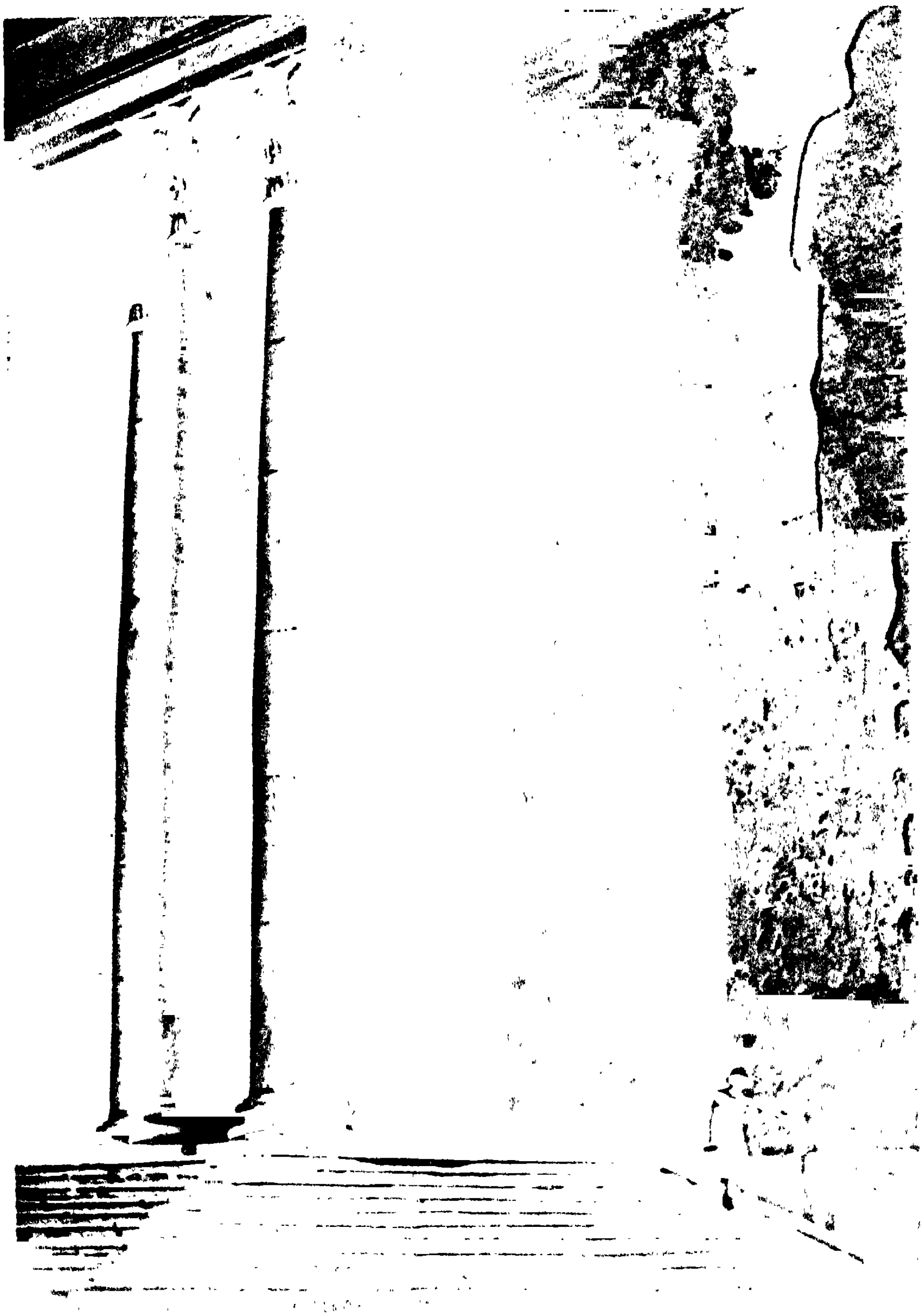
وہ اُفق پر دُور کچھ ایواں کھڑے ہیں بے سُتوں
جن کے اوپر اُڑ رہے ہیں کچھ پھریرے نیلگوں

بجلیوں کی لہر کے مانند بل کھاتے ہوئے
کچھ سُنہرے راستے ہیں دُور تک جاتے ہوئے

سُرمئی، نیلے، گلابی بادلوں کے درمیاں
رقص کرتی پھر رہی ہیں رنگ کی شہزادیاں

پھُوٹ نکلے ہیں شفق سے نغمہائے سرمدی
بن گیا ہے آسماں ایمن کی دلکش راگنی

ذوقی



مصنوعی لباس

عورت کے تصوّرات

(ڈراما)

منظر: نیوم اکسپرس کے اُس حصے کا ایک کمرہ جس کا ایبیریّا کے جہاز سے میل ہوتا ہے۔ بہار کی ایک خنک اور خوشگوار صبح ہے۔ ایک درمیانی سٹیشن سے گاڑی روانہ ہو رہی ہے کہ ایک شخص کمرے میں داخل ہوتا ہے اُور اس کی تنہا نشیں کو جو پینتیس سال کی ایک خوبصورت عورت ہے سر کے خفیف خم سے آداب بجا لاتا ہے۔

عورت — کیسا اچھا اتفاق ہوا کہ آپ سے یہاں ملاقات ہوگئی۔ کیا آپ بھی ایبیریّا جا رہے ہیں؟

مرد — جی ہاں۔

عورت — خوب! تو گویا ایک طویل گفتگو سے لطف اندوز ہونے کے لئے ہمارے پاس کافی وقت ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں آپ سے باتیں کرنا چاہتی بھی تھی۔ اگرچہ میرے شوہر کو ہمیں متعارف کرائے دو ہفتے بھی نہیں گزرے مگر یوں معلوم ہوتا ہے ہم صدیوں سے واقف ہیں۔ یہ فقرہ بہت پامال ہوچکا ہے۔ کیوں ہے یا نہیں؛ مگر میں فی الواقع دلی جذبہ کا اظہار کر رہی ہوں۔

مرد [مسکرا کر سر کو ذرا جھکاتا ہے]

عورت — ہاں دیکھئے نا، میں آپ کا ناول پڑھ رہی تھی۔ میں بیان نہیں کرسکتی کہ میں اس کی گہری نفسیاتی نازک خیالیوں سے کس قدر محظوظ ہوئی ہوں۔ اس ناول نے تو میرے خیالات میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ آپ کی گزشتہ سال کی عالمانہ اور نفیس داستان ——

مرد — (منکسرانہ) اجی!

عورت — نہیں نہیں، میں سچ کہتی ہوں۔ میں نے اسے پڑھ کر فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر کبھی آپ سے دوبارہ ملاقات ہوئی تو بطورِ معاوضہ آپ کو اپنی ایک چھوٹی سی کہانی سُناؤں گی۔

مرد — ضرور۔

عورت — اس واقعہ کو پیش آئے ایک زمانہ گزر چکا ہے۔ شاید دس سال، لیکن میرے حافظے پر اب تک اس کے نہایت شوخ نقوش ثبت ہیں —— غیر معمولی طور پر شوخ۔

[گاڑی پوری رفتار سے چلنے لگتی ہے]

مرد — ہاں مجھے ضرور سنائیے۔

عورت — جیسا کہ میں نے ابھی بتایا ہے، دس سال کی بات ہے کہ میں فیوم میں اپنے شوہر کا انتظار کر رہی تھی۔ جہاں سے ہم دونوں نے مل کر گھر جانے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ لیکن آخر مجھے اُن کا تار ملا۔ انہیں کسی وجہ سے اپنی روانگی ملتوی کرنی پڑی تھی چنانچہ مجھے تنہا واپس جانا پڑا۔ میں نے فوراً فسٹ کلاس کا ایک ڈبا ریزرو کرایا اور بڈاپسٹ روانہ ہوگئی۔

[وقفہ]

عورت — فیوم سے کچھ سٹیشن دُور پہنچنے پر میرے کمرے میں ایک لفٹننٹ داخل ہُوا۔ میں نہیں کہہ سکتی بلاز کا سٹیشن تھا یا لورغ کا، مگر تھا کوئی ایسا ہی چھوٹا سٹیشن۔

مرد — کہانی پر یہ بات اثر انداز ہوتی ہے؟

عورت — جی نہیں، اس سے کوئی بحث نہیں۔ بہرحال لفٹننٹ داخل ہُوا اور اب اس کمرے میں ہم دو ہو گئے: چھوٹی چھوٹی موچھوں والا ایک نوجوان فوجی افسر اور ایک نوجوان خوبصورت عورت۔ یہ میں تھی۔ لیکن یہ واقعہ اتنی مدت کا ہے کہ میں اب خوبصورت عورت کہہ کر اُس کا ذکر کرنے میں مضائقہ نہیں سمجھتی۔

مرد [ایک پُرمعنی انداز میں "اجی!" کہہ کر اظہارِ تحسین کرتا ہے]

عورت — پہلے پہلے لفٹننٹ فقط باہر میدان کی طرف دیکھتا رہا لیکن رفتہ رفتہ اس نے میری طرف توجہ کی اور فی الحقیقت میں تھی بھی توجہ کے قابل۔ میں گہرے نیلے رنگ کا ایک دلفریب فراک پہنے ہوئے تھی — مگر خیر اس ذکر کی ضرورت نہیں بہرحال اُس نے مجھے دزدیدہ لیکن نہایت باریک بین نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا۔ میں بظاہر اخبار پڑھنے کے دھیان میں لگی تھی لیکن درپردہ اس کی حرکات و سکنات کا معاینہ کر رہی تھی۔ دیکھئے نا! مجھے ایک طویل سفر درپیش تھا اور اس چھوٹے سے ڈبے میں ایک پُورا دن مجھ کو اس اجنبی سپاہی کے ساتھ بسر کرنا تھا۔ یہ صُورتِ حالات بڑی بے ڈھب تھی۔ ایسی حالت میں آپ یقیناً مجھے قابلِ الزام نہیں ٹھہرا سکتے۔

مرد — ہرگز نہیں۔

عورت — تھوڑی ہی دیر کے بعد واقعات پیش آنے شروع ہو گئے۔ گاڑی ایک طرف کو مڑی اور دھوپ سیدھی لفٹننٹ کی آنکھوں پر پڑنے لگی۔ چنانچہ وہاں سے اُٹھ کر وہ میرے مقابل کی نشست پر آبیٹھا جہاں سے وہ میرا اور بھی اچھی طرح مطالعہ کر سکتا تھا۔ اس کی آنکھیں بڑی پُرگو تھیں۔ چنانچہ جب میں نے پہلے پہل اُن میں نظر ڈالی تو وہ میری طرف استفہام کے

انداز میں اٹھی ہوئی گویا یہ پوچھ رہی تھیں "پیاری خاتون مجھے اجازت ہے کہ میں تمہیں دیکھ سکوں؟" میں نے آج تک ایسی فصیح البیان آنکھیں نہیں دیکھیں جو اس خوش اسلوبی سے اپنا مدعا بیان کر سکیں۔ "دیکھو میں کس احترام آمیز فریفتگی سے تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ تم نے میرے اثر پزیر سپاہیانہ دل کو ایک بھڑکتا ہوا شعلہ بنا دیا ہے؛ مجھ پر رحم کھاؤ"

مرد —— اور آپ نے کیا کیا؟

عورت —— میں نے اخبار ایک طرف رکھ دیا - یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ میں تمہاری توجہات کو قبول کرنے پر آمادہ ہوں۔ گویا میں نے کہا "لو ہمارے درمیان جو پردہ حائل تھا اٹھ گیا اور اب . . . . رُو در رُو"۔ اُس نے مجھ پر ایک احسانمندانہ نظر ڈالی اور آنکھوں کے ایک خاموش وعدے سے مجھے اطمینان دلایا کہ میں یہ بات نہ بھولوں گا کہ ایسے موقع پر ایک خاتون کے متعلق کسی شریف آدمی کا طرزِ عمل کیا ہونا چاہئے۔ میں نے ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ سے اس کا شکریہ ادا کیا۔

مرد —— پھر وہ اپنے وعدے پر قائم رہا؟

عورت —— ذرا صبر کیجئے۔ میں ابھی بیان کرتی ہوں۔ وہ دیر تک مجھ کو خوابناک شرمیلی اور ادب آمیز نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ وہ نہایت پُراثر انداز میں پرستارانہ احترام کے ساتھ مجھے دیکھنے میں محو معلوم ہوتا تھا۔ پھر اُس نے میرے ہاتھوں کی طرف دیکھا اور دیکھ کر مسکرایا۔ گویا وہ یہ کہہ رہا تھا "کیسے نازک نازک سفید ہاتھ ہیں"۔ اس کے بعد اُس نے میرے قدموں پر اس طرح ایک سکون آمیز اور بے تعلقانہ نظر ڈالی جس طرح شریف لوگ عموماً ایسی چیزوں کی طرف دیکھتے ہیں جو اُن کی ملکیت نہیں ہوتیں۔ ایک عرصے تک وہ یوں ہی سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیتا رہا اور میری آنکھوں نے جواب میں کہا "آہ"

مرد —— آپ کی آنکھوں نے کیا جواب دیا؟

عورت —— انہوں نے کہا آہ! ایک کسل آمیز پُرمسرت "آہ" جس میں نخوت کی خفیف سی جھلک بھی تھی۔ لیکن یہ آہ میرے لبوں سے نہ نکلی تھی بلکہ میں یوں نظر آئی تھی۔

مرد —— اور سپاہی؟

عورت —— سپاہی نے میرا مفہوم قابلِ تعریف طور پر درست سمجھ لیا۔ وہ غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوا۔ صرف اس کی حکایت طراز آنکھوں میں افسوس جھلکنے لگا۔ گویا وہ کہہ رہا تھا "کیا یہ تقدیر کا ظلم نہیں؛ ہم دونوں کو ایک دوسرے کی طبیعت سے مثالی مناسبت ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی چھلکتی ہوئی نظروں کا مفہوم تک سمجھتے ہیں۔ لیکن پھر بھی ہم ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لئے اجنبی رہنے پر مجبور ہیں"۔ اُس نے ایک آہِ سرد بھری اور پھر کہا! "الوداع!"

مرد ـــــ کس طرح ؟

عورت ـــــ اپنی آنکھوں سے ۔ اپنی آنکھوں سے اس نے میرے ہاتھوں پر ایک پاکیزہ اور محبت آمیز وداعی بوسہ دیا پھر اس نے تاسف سے اپنا سر ہلایا اور اُس کی آنکھوں نے کہا "بس اب کبھی نہیں۔"

مرد ـــــ کبھی نہیں ؟

عورت ـــــ جی ہاں ! "کبھی نہیں . . . کبھی نہیں . . . " اس اثنا میں ہماری گاڑی ایگرام پہنچ چکی تھی جہاں وہ اُتر گیا اور میری نگاہوں نے سیچے افسوس کے ساتھ دُور تک اس کا تعاقب کیا ۔ وہ ایک شریف اور مہذب نوجوان تھا ۔ اس نے ایک دفعہ بھی مڑ کر پیچھے نہ دیکھا ۔ وہ چپ چاپ اپنی جگہ سے اُٹھا اور باہر نکل گیا . . . اس کے بعد میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا ۔ لیکن میں اُسے کبھی نہ بھولوں گی ۔ مجھے خلوت کی اس سے زیادہ دلاویز اور شاعرانہ گفتگو کا موقع کبھی نہیں ملا ۔ اس کے بعد جب کبھی مجھے مردوں کا اُجڈپن ناگوار گزرا ہے میں نے ہمیشہ اُس سپاہی کو محبت اور احترام سے یاد کیا ہے ۔ ایسا نیک طینت آدمی میں نے کبھی نہیں دیکھا اور میرا دل یہ گواہی دیتا ہے کہ مجھ سے کبھی کسی نے اُس کی طرح محبت نہیں کی ـــــ پُرخلوص ، بےغرض اور مایوس ! جب میں ان واقعات پر ایک نگاہِ بازپسیں ڈالتی ہوں تو مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ میں خود بھی اس کی والہانہ محبت میں مبتلا ہو سکتی تھی ۔ مگر خیر گزرا ہُوا وقت کبھی ہاتھ نہیں آتا ۔

مرد ـــــ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں ۔

[طویل خاموشی]

عورت ـــــ معاف فرمائیے آپ نے کچھ کہا تھا ؟

مرد ـــــ میں نے کہا تھا میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں ۔

عورت ـــــ کس بات کے لئے ؟

مرد ـــــ اُن اچھی اچھی باتوں کے لئے جو آپ نے ابھی میرے متعلق کہی ہیں ۔

عورت ـــــ آپ کے متعلق کہی ہیں ؟

مرد ـــــ جی ہاں میرے متعلق ۔ وہ لفٹننٹ میں ہی تھا ۔

[وہ پھر خاموش ہو جاتے ہیں ۔ عورت گھور گھور کر اُس کے چہرے کا معائنہ کرتی ہے ۔ مرد اپنی جیب سے ایک نیلا کاغذ نکال لیتا ہے اور ذیل کی گفتگو کے دوران میں اُسے اپنے ہاتھ میں لئے رہتا ہے]

عورت ـــــ یہ کاغذ کیسا ہے ؟

مرد ـــــ کچھ نہیں، شاید بعد میں آپ کو میں یہ دکھا دوں۔

عورت ـــــ اچھا . . . . تو آپ وہ لفٹننٹ ہیں ؟

مرد ـــــ جی ہاں۔ میں چار سال سے ملازمت چھوڑ چکا ہوں۔ میں ہی وہ لفٹننٹ تھا۔ میں پلاز کے سٹیشن سے سوار ہُوا تھا اور اگرام کے سٹیشن پر اُترا تھا۔ میری وردی پر نارنجی زرد گوٹ لگی تھی۔

عورت [حیران و ششدر] ـــــ ہاں ہاں!

مرد ـــــ دیکھئے آپ کو یاد آگیا نا ؟

[بہت طویل خاموشی]

عورت ـــــ اچھا ـــــ تو یہ آپ تھے۔ حیرت ہے!

مرد ـــــ حیرت کیسی ؟ مجھے تو اس میں کوئی غیر معمولی بات معلوم نہیں ہوتی۔

عورت ـــــ بات یہ ہے کہ جب میرے شوہر نے ہمیں متعارف کرایا تو مجھے آپ کی آنکھیں عجیب آشنا سی معلوم ہوئی تھیں۔ اس میں سمجھی اس کی وجہ کیا تھی۔

مرد ـــــ اچھا۔ آپ کو واقعی یہ احساس ہُوا تھا۔ کاش میں بھی آپ کی آنکھوں کے متعلق یہی کہہ سکتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں آپ کو قطعاً بھول چکا تھا۔ میں تو اس تمام واقعے کو فراموش کر چکا تھا لیکن اب آپ کے یاد دلانے پر ایک ایک بات میرے حافظے پر روشن ہو گئی ہے۔

عورت [دلگیر ہو جاتی ہے]

مرد ـــــ دیکھئے بات یہ ہے کہ کوئی وجہ بھی نہ تھی کہ مجھے یہ واقعہ یاد رہتا۔ دس سال قبل اُس دن جب آپ نے مجھے گاڑی میں دیکھا میں اپنی منگیتر سے ملنے کے لئے اگرام جا رہا تھا۔

عورت ـــــ الٰہی توبہ!

مرد ـــــ چنانچہ میری نگاہوں کا قطعاً وہ مطلب نہ تھا جو آپ نے سمجھا۔ مثلاً جب میں نے آپ کے ہاتھوں کی طرف دیکھا اُس وقت میرے دل میں یہ خیال تھا کہ میرا خُسر بھی کیسا تنگ دل، خسیس، سٹھیایا ہُوا کھوسٹ ہے۔ وہ دلہن کو جہیز کا نہ دینے کے لئے طرح طرح کے حیلے تراش رہا تھا۔ یہ سوچ کر میں تلخی سے مسکرایا لیکن آپ نے یہ خیال کیا کہ میں آپ کے گورے اور نازک ہاتھوں کو دیکھ کر مسکرایا ہوں۔

عورت ـــــ جی ہاں۔

مرد ـــــ رہا یہ سوال کہ میں نے آپ کے ہاتھوں اور پاؤں کی طرف دیکھا ہی کیوں! سو جب کوئی آدمی کسی گہرے خیال میں غرق ہوتا ہے تو وہ عموماً کسی نہ کسی چیز پر ایک مجہولانہ سی ٹکٹکی باندھ لیتا ہے۔ اس وقت مثلاً اگر میں لیمپ کی طرف دیکھنے لگتا تو بھی میرے لئے کوئی فرق نہ پڑتا۔ اور جب میں آپ کے قدموں کی طرف دیکھ رہا تھا اگر اس وقت میرے بشرے سے سکون آمیز بے تعلقی ظاہر ہو رہی تھی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے اُس وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر میرا خسر اپنی بخیلانہ ہٹ پر قائم رہا تو پھر ہماری شادی کا سوال ہی خارج از بحث ہو جائے گا۔ میں نے اپنے دل سے سوال کیا کہ بھلا موجودہ حالت میں ہم شادی کر ہی کس طرح سکتے ہیں۔ اس الجھیڑے سے گھبرا کر میں نے بے خیالی میں آپ پر سر سے پیر تک نظر دوڑائی ہوگی۔ اسی وقت کے قریب آپ کے قول کے مطابق آپ کی نگاہوں نے "آہ!" کہا تھا۔ لیکن آپ کی "آہ" سے بالکل بے خبر میں اپنے دل میں اپنی منگیتر کے باپ کے پاس جا کر صاف صاف الفاظ میں جہیز کا مطالبہ پیش کرنے کے امکان پر غور کر رہا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں پورے زور اور وضاحت کے ساتھ اپنا اور اپنی مجوزہ رفیقۂ حیات کا معاملہ اس کے سامنے پیش کروں گا۔ مگر یہ فرض مجھے بہت ناگوار معلوم ہوا۔ اس پر میں نے ایک سرد آہ بھری لیکن پھر سینہ تان کر کہا جو ہو سو ہو یہ ناگوار فرض ادا کرنا ہی پڑے گا۔ یہی موقع ہے جب آپ نے سمجھا کہ میری آنکھیں کہہ رہی ہیں "یہ کیسا ظلم ہے کہ ہم دونوں ہمیشہ ایک دوسرے سے اجنبی رہیں گے۔"

عورت ـــــ میرے اللہ!

مرد ـــــ گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی جا رہی تھی اور میں اپنے گہرے سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ پھر میں نے خیال کیا کہ اس کے باپ سے کہہ کر بات بھی کھوؤں گا اور نتیجہ بھی کچھ نہ نکلے گا۔ اگر اس کی نیت ہوتی تو وہ کہے بغیر ہمیں روپیہ دے دیتا۔ چونکہ اس نے از خود ایسا نہیں کیا، اس سے کچھ کہنا بھی لاحاصل ہے۔ اس وقت میری دکھ بھری نگاہیں آپ پر جمی ہوئی تھیں لیکن میں آپ کو دیکھ نہیں رہا تھا۔ یہی وہ نگاہ تھی جس کا مفہوم آپ نے "کبھی نہیں کبھی نہیں" سمجھا تھا۔ ایک طرح آپ درست بھی سمجھی تھیں مگر یہ "کبھی نہیں" جہیز سے تعلق رکھتا تھا۔

عورت ـــــ اُف! غضب!

مرد ـــــ اور جب ہم ایگرام پہنچے اور میں آہ بھر کر پیچھے دیکھے بغیر گاڑی سے اُتر گیا اس وقت میں اس کشمکش و پیچ میں پڑا ہوا تھا کہ میں ایک ایسی لڑکی سے جسے روپیہ نہ ملے گا کیونکر شادی کرنے کے قابل ہو سکوں گا۔ آپ نے میری اس آہ کو اپنے سے جدا ہونے کے غم و حرماں کا نتیجہ قرار دیا اور پلٹ کر نہ دیکھنے کو میری احترام آمیز پرستش پر محمول کیا۔

عورت ـــــ میرا دل بالکل ٹوٹ گیا ہے۔

مرد ——— شاید مجھے آپ پر یہ باتیں ظاہر نہ کرنی چاہئے تھیں ۔ دوسروں کے دل خوش کن تخیلات کا طلسم توڑ دینا اچھا نہیں لیکن مجھے یہ بھی جائز معلوم نہ ہُوا کہ آپ کی طرف سے ایسی محبوب یادداشتوں اور محبت آمیز جذبات کو قبول کرتا چلا جاؤں جن کا دراصل میں کسی طرح حقدار نہیں ۔ [یہ کہہ کر وہ اپنی نشست پر پیچھے کی طرف ٹیک لگا کر خاطر جمعی کے ساتھ نیم دراز ہوجاتا ہے

عورت ——— تو یہ کتنی درد انگیز حقیقت ہے ! تو میرے سپاہی آپ تھے ؛

مرد ——— جی ہاں ! نارنجی زرد کوٹ اور سنہرا پرتلا ۔ پلاز سے چڑھا اور اگرام اُترا ۔

عورت ——— مجھے بہت افسوس ہے ۔ میرے سپاہی کی ویسی ہی یاد اچھی تھی جیسی میرے دل میں تھی مگر اب آپ نے اسے تہ کر دیا ہے ۔

مرد ——— مجھے خود اس کا افسوس ہے [گاڑی فیوم کے مضافات میں داخل ہو چکی ہے ۔ اور غرفے سے وسیع بندرگاہ کا منظر دکھائی دے سکتا ہے]

عورت ——— یہ انکشاف بہت یاس انگیز ہے ۔ مگر ہم عورتوں کو اس کا عادی ہونا پڑتا ہے ۔ ہم پر یہ حقیقت زندگی میں بار روشن ہوتی ہے کہ مرد صرف اُسی وقت محبت کے قابل ہوتا ہے جب ہم اُسے اپنے خوش آئند تصورات کے آئینہ میں دیکھتے ہیں ۔ ہم مرد کے نقوش کو خود آب و رنگ دیتے ہیں اور اُس کے بعد اپنے ہاتھوں کی اس صنعت گری سے والہانہ محبت کرنے لگتے ہیں ۔ لیکن آخر ایک دن واقعیت کا دردناک چہرہ ہمیں نظر آجاتا ہے ۔ جس حقیقت کا آج آپ نے مجھ پر انکشاف کیا ہے واقعی بہت مایوس کن ہے لیکن میرے دل کو ایک تسلی ضرور ہے ۔

مرد ——— کیا ؛

عورت [دلجمعی سے] ——— کہ میری کہانی کا ایک لفظ بھی سچا نہیں ۔

مرد ——— آپ کیا کہہ رہی ہیں ؛

عورت ——— جی ہاں ! ایک لفظ بھی درست نہیں ۔ یہ تمام قصہ میں نے خود تراشا ہے ۔ پرسوں میں ایبیریا میں اپنے شوہر سے جا ملوں گی ۔ اگر آپ وہاں ہوئے تو اُن سے مل کر اس بات کے متعلق اپنا اطمینان کر سکتے ہیں کہ میں نے اس سے پہلے عمر بھر کبھی فیوم اور بڈاپسٹ کے درمیان سفر نہیں کیا ۔

مرد ——— اچھا . . . کیا ———

عورت ——— آج میں پہلی مرتبہ فیوم میں داخل ہو رہی ہوں اور میرے لفٹننٹ کا افسانہ اوّل سے آخر تک سفید جھوٹ ہے اس سے آپ کو یہ سبق سیکھنا چاہئے اور کہ لوگوں کے خوشگوار خوابوں کو پریشان کرنے کی کوشش سے پہلے ذرا زیادہ

احتیاط ضروری ہوتی ہے ۔

مرد [کمنکار کر] ـــــ لیکن میں نے احتیاط ہی سے کام لیا تھا آپ کا خیال ہے آپ نے میرا جھوٹ پکڑ لیا ہے لیکن حسنِ اتفاق سے آپ کا یہ خیال درست نہیں نکلا [اس نیلے کاغذ کو کھولتا ہے جو اب تک اس کے ہاتھ میں تھا] اثنائے گفتگو میں برابر یہ کاغذ میرے ہاتھ میں رہا ہے

عورت ـــــ کاغذ کا اس بات سے کیا تعلق ؟

مرد ـــــ یہ کاغذ اس بات کا ثبوت ہے کہ میں شروع ہی میں بھانپ گیا تھا کہ آپ کی داستان کو صداقت سے دُور کا واسطہ بھی نہیں کل بڈاپسٹ سے روانہ ہوتے وقت میں نے اپنے بہت سے ضروری فرائض انجام دیئے تھے ۔ میں نے اسی سلسلے میں اپنا فوجی ٹیکس بھی ادا کیا اور یہ اس کی رسید ہے ۔

عورت ـــــ اچھا تو اس رسید سے مطلب ؟

مرد ـــــ یہ میرے نام پندرہ کرون فوجی ٹیکس کی رسید ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ میرا کبھی فوج سے تعلق نہیں رہا ۔ نہ میں کبھی سپاہی بنا ہوں نہ لفٹننٹ اور نہ میں نے کبھی نارنجی حاشیے کی یا کسی اور قسم کی وردی پہنی ہے ۔

عورت [اچپلاہٹ سے] ـــــ تو گویا آپ میرے سامنے جھوٹ کے پُل باندھتے رہے ؟

مرد [زندہ دلی سے] ـــــ جی ہاں یقیناً اور جھوٹ بنانا شروع کرنے سے پہلے میں نے یہ کاغذ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا تاکہ بوقتِ ضرورت یہ ثابت ہو سکے کہ میں محض اپنی شخصیت کو دلچسپ بنانے کے لئے جھوٹ نہیں بول رہا تھا بلکہ میرا مقصد آپ سے اس بات کا اقبال کرانا تھا کہ آپ کے لفٹننٹ کا قصہ بالکل بے سروپا ہے ۔ اور یہ تو آپ جانتی ہیں کہ میں اپنے اس مقصد میں کس طرح کامیاب ہو چکا ہوں ۔

عورت ـــــ تو یہ کاغذ اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ آپ کبھی فوج میں نہیں رہے ؟

مرد [فتحمندانہ انداز سے] ـــــ قطعی !

عورت ـــــ یہ خوشی کی بات ہے کہ اس وقت ہر چیز ہمارے پاس ہی ہے ۔ آپ کو تکلیف تو ہوگی ، میرا بیگ وہ رکھا ہے یہ ذرا مجھے دے دیجئے ۔

مرد [بیگ عورت کو دیتے ہوئے] ـــــ یہ بیگ ؟

عورت ـــــ جی ہاں [بیگ کھولتی ہے اور اس میں سے ایک ضخیم کتاب نکال کر اُسے دکھاتی ہے]

عورت ـــــ اس کتاب کا نام تو پڑھیئے ۔ کیا ہے ؟

مرد [پڑھتا ہے] ـــــ "میرا روزنامچہ"

عورت ـــــ میں ہمیشہ اپنا روزنامچہ اس خیال سے اپنے ساتھ رکھتی ہوں کہ کہیں نامطبوع ہاتھوں میں نہ جا پڑے [صفحات پلٹتی

ہے] ۱۸۹۶ . . . یہ ہے . . . ہاں . . . آپ ذرا اس صفحے کی عبارت پڑھیئے۔ اس پر آپ کو لفٹننٹ کی پوری کہانی جیسی میں نے ابھی سنائی ہے لفظ بہ لفظ ملے گی۔

مرد [حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر] —— تو پھر درحقیقت یہ کہانی سچی ہے ؛

عورت —— ثبوت آپ کے سامنے موجود ہے۔

مرد [کچھ دیر تک پڑھتا ہے] —— اچھا تو یوں ہے۔ آخر آپ نے مجھے پکڑ لیا کیوں ہے نا؛ لیکن تھوڑی دیر قبل آپ اس کی صحت سے انکار کیوں کر رہی تھیں ؛

عورت —— بجز اس کے آپ سے اس بات کا اقرار کرانے کی صورت ہی کیا تھی کہ آپ میرے لفٹننٹ نہیں ہیں ؛

مرد —— درست !

عورت —— اب دیکھا آپ نے میرے دلکش تصورات کا طلسم اُسی طرح قائم ہے ؛ لیکن ہاں یہ تو بتایئے آپ نے نارنجی گوٹ کا کیونکر سُراغ لگایا ؛ میرے روزنامچہ میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ میرے لفٹننٹ کی وردی واقعی ایسی ہی تھی۔

مرد —— اتفاق سے مجھے یہ معلوم تھا کہ دس سال قبل فیوم میں ایک ایسی پلٹن ٹھہری ہوئی تھی جس کی وردی اس قسم کی تھی۔

عورت —— اوہو! کیسی سیدھی سی بات ہے تیسکریہ ! [گاڑی آہستہ آہستہ سٹیشن میں داخل ہو کر کھڑی ہو جاتی ہے]

مرد [جاتے ہوئے کھڑا ہو کر] —— اچھا خدا حافظ !

عورت —— رخصت سے پہلے میں آپ کو ایک نصیحت کرنا چاہتی ہوں کہ آئندہ کبھی عورت کے تصورات سے کھیلنے کی کوشش نہ کیجئے گا۔ وہ اُن کو قائم رکھنے کے لئے جان لڑا دیتی ہے۔ عورت اپنے دل میں جانتی ہے کہ اس کے تصورات محض خوبصورت جھوٹ ہیں لیکن وہ ایک خوبصورت جھوٹ کی حفاظت کے لئے ہزار بھونڈے جھوٹ بولنے کو بھی تیار ہو سکتی ہے۔ لیجئے خدا حافظ ! یہ سفر بہت مزے سے کٹا۔ ورنہ آپ کے بغیر بہت بے لطفی رہتی [سر کے ایک زندہ دلانہ اشارے سے اُسے سلام کرتی ہے اور اپنے اسباب کی دیکھ بھال میں مصروف ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی ٹوپی اٹھاتے ہوئے باہر نکل جاتا ہے]

ترجمہ
از
حامد علی خاں

غزل

محشر پہ آسرا مجھے دیدار کا مِلا — خوش ہوں کہ یہ عذاب مسرت نُما مِلا

لطفِ نیاز جھک کے سرِ نقشِ پا مِلا — سجدہ خود اپنے مرکزِ اصلی سے جا مِلا

سودائے عشق وحشتِ دل سوزشِ فراق — جو درد بھی مِلا وہ مجھے لادوا مِلا

میں نے تو پا لیا تجھے اُن کے جمال میں — میرا بھی بیخودی کہیں تجھ کو پتا مِلا

ہر جزو اپنے کُل کا نمائندہ بن گیا — یعنی خدا نُما مجھے ہر خود نُما مِلا

سجدہ جو غیرِ ذاتِ خدا عین کفر تھا — وہ مذہبِ جنونِ طلب میں روا مِلا

نکلی بھی میری جان تو قدموں سے تیرے دُور — یہ تیرِ بے خطا بھی مجھے نارسا مِلا

شاید تمہاری پہلی نظر سے مراد ہو — وہ ابتدا کہ جس میں غمِ انتہا مِلا

ہر یاس کی نظر پہ تڑپتے رہے وہ ابرؔ
ہر نالۂ خموش ہمارا رسا مِلا

ابرؔ احسنی

اظہار

کبھی اپنی محبت کا ذکر کرنے کی خواہش نہ کر
کہ محبت کا تو کبھی ذکر ہو ہی نہیں سکتا
دیکھ نسیم سحر کس قدر خاموشی سے
کس طرح نظروں سے اوجھل ہو کر چلتی ہے۔

میں نے اپنی محبت کا ذکر کر دیا، ذکر کر دیا
میں نے اپنی محبوبہ کو اپنے دل کی سبھی باتیں بتا دیں
کانپتے ہوئے سخت ڈرتے ہوئے
آہ وہ چل دی!

وہ مجھے چھوڑ کے گئی تھی
کہ ایک مسافر پاس سے گزرا
خاموشی سے سب کی نظروں سے اوجھل،
اُس نے ایک آہ بھری اور وہ اُسے لے کر روانہ ہو گیا۔

گلچیں

آنکھیں روشن ہونے لگیں

کوئی جسے کوئی انسان نہیں دیکھ سکتا
درختوں میں شمعیں روشن کر رہا ہے۔

جیسے تارے ایک ایک کر کے نکلیں بس اُسی طرح
ہر شاخ پر یہ شمعیں ایک ایک کر کے جلنے لگیں۔

چُپ چاپ سارے کے سارے جنگل میں
دو دو آنکھیں روشن ہونے لگیں باری باری۔

ریشمی چھچھوندریں اور مخملیں چُوہے
ایسی تیز آنکھیں رکھتے ہیں جیسے برف کے شگاف۔

اُلوؤں کی سیاہ سی لالٹینیں
تاباں ہوئیں زمرّدیں گناہ کی طرح۔

چیتا زرق برق چیتا
اپنی آتش دماغ کی چمک کے ساتھ دبے پاؤں چلتا ہے۔

بگلے زمانے کی طرح خاموش کھڑے ہیں
اور اپنے آنسوؤں کے اندر سے دیکھتے ہیں مچھلیوں کو تیرتے ہوئے۔

رات کی تمام مخلوق
آپ اپنی روشنی بن رہی ہے!

گلیچیں

رادھا کا ایک گیت

سکھی
میں صبح باغ میں گئی
پریتم کو ڈھونڈنے
پھولوں کی گمبھیر گپھا میں

رس کی بھیگی ہوئی بوندوں نے مجھ سے صرف اتنا ہی کہا
"پریم رات کے سپنوں کے ساتھ ہی چلا جایا کرتا ہے!"
آخری ستاروں کی بجھی ہوئی کرنوں نے مجھ سے صرف اتنا ہی کہا
"پریم صبح کے اُجالے میں دکھائی نہیں دیتا!"
سکھی
میں صبح باغ میں گئی
پریتم کو ڈھونڈنے
پھولوں کی گمبھیر گپھا میں

عظیم قریشی لدھیانوی

قطرۂ شبنم

(شاعر)

گلشن میں ایک قطرۂ شبنم سے صبحدم — میں نے کہا تو آئینۂ نوبہار ہے
پڑتا ہے تجھ میں عکس حسینانِ باغ کا — دامن ترا بہشت صفت پُرنگار ہے
چہرے میں تیرے اشک محبت کی دلبری — جلوے میں آب و تابِ دُرِ شاہوار ہے
مستی تری ہے غیرتِ پیمانۂ شراب — ہشیار مثلِ اخترِ شب زندہ دار ہے
موتی ہے یا ستارہ ہے یا اشک جانفروز — پیکر سے تیرا گوہرِ پاک آشکار ہے
دامن چھڑا رہا ہے جوانانِ باغ سے — کن گلرخوں کے شوق میں یوں بیقرار ہے؟
یہ مہرِ آفتاب ہے یا جورِ آفتاب — تیغِ شعاعِ نور سے تو دل فگار ہے!
ہے نورِ آفتابِ سحر تجھ کو پیکِ موت — تو نورِ آفتابِ سحر کا شکار ہے

کھوتا ہے تیغِ نور سے ہستی کی آب تو
کرتا ہے شکوۂ ستمِ آفتاب تو

(شبنم)

ظاہر مرا ہے قطرۂ ناچیز شبنمی — باطن نیامِ خنجرِ آئینہ فام ہے
خنجر مرا ہے جذبۂ شوقِ وصالِ دوست — وہ دوست جس کا عرش بریں پر مقام ہے
روشن ہے اس کے حسن سے یہ بزمِ کائنات — ان ظلمتوں کی شمع وہ ماہِ تمام ہے
رہتی ہے میری روح کو رفعت کی آرزو — روحِ حیات آہوئے گردوں خرام ہے
عشاق کی نگہ ہے فلک پر لگی ہوئی — عشاق پر محبتِ دنیا حرام ہے
سمجھا ہے آفتابِ سحر کو تو پیکِ موت — یہ آفتاب دوست کا زریں پیام ہے

ہوں دوشِ آفتابِ سحر پر سوار میں
جاتا ہوں بزمِ دوست میں دیوانہ وار میں

محمد اکبر منیر

مصیبت کی گھڑیاں

(۱)

شاید یہ تو میں نہ بتا سکوں کہ وحشت کی کتنی قسمیں ہیں، ہاں! اتنا ضرور کہوں گا، کہ میری وحشتوں کا بھی شمار نہیں، ابتک کس کس طرح کی وحشتیں مجھے اُٹھیں اور آئندہ کیسی کیسی اُٹھنے والی ہیں، خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

اگر میں اپنی گزشتہ وحشتوں کے بیان پر آؤں تو سُننے والے کانوں پر ہاتھ دھریں، اور نہ جانے کہاں تک نوبت پہنچے، لہٰ فی الحال فقط ایک ادنیٰ سی وحشت کا ذکر کئے دیتا ہوں۔

اٹھائیسویں جنوری ۱۹۳۵ء بروز دوشنبہ بمقام مگرورہ[1] فورٹ راو لوک پال سنگھ صاحب چتر کار (آرٹسٹ) میرے ایک قصیدہ رنگین حاشیہ کھینچ رہے تھے، وہ جو کچھ دیر مصروفِ گلکاری رہے، تو یہاں بے ارادہ کسی قدر دَم سا گھٹنے لگا، آہستہ آہستہ اندرونا نے رنگ بدلنے شروع کئے، ـــ

جس طرح اسٹارٹ ہوتے وقت، پہلے مشین کے کل پُرزے گڑبڑ مچاتے ہیں، پھر بھڑبھڑ کر کے سارا کارخانہ تھرتھراتا ہے اور دس بیس قدم جھپٹا سا مار کر، ہوائی جہاز زمین چھوڑ فضائے آسمانی میں فراٹے بھرنے لگتا ہے۔

کچھ نامعلوم سی حالت سے ایک سلسلہ جنبانی ہوئی، جو ہر سانس پر ترقی کرتی گئی، رنگارنگ مناظر ذہن میں پھرے، مختلف النوع جذبات کے ناقابلِ بیان اثر سے وحشت نے کروٹ بدلی، حتیٰ کہ مجھ پر بدحواسی چھا گئی۔

اب کہ اس ہیجانی نشیب سے چھٹکارے کی صورت نظر نہ آتی تھی، یکایک ڈبرا[2] جانے کی سُوجھی، بس جناب! پھر کیا تھا وہ طوفان پوری قوت سے اسی نقطہ پر آٹھہرا۔

اچانک جال میں پھنس جانے والے پرند کی مانند میرا دل پھڑکنے لگا، یہ کیفیت ہوئی کہ پر لگا کر اُڑ جاؤں ڈبرا کو۔

چُپکے سے اُٹھ کر میں نے کوٹ پہنا، اور ڈنڈا سنبھالا، اِدھر پائی جو آہٹ راو صاحب نے، فوراً نظر اُٹھائی، اور گلا

---

[1] ریاست گوالیار کی ایک جاگیر۔ [2] گوالیار سے جھانسی کے رُخ جی۔آئی۔پی۔آر کا چوتھا اسٹیشن۔

بش ڈال کر تعجب سے پُوچھا:۔

کیوں ؟

۔ ڈبرا ہو آؤں ذرا !

۔ ایسا کیا کام ہے ؟

۔ یوں ہی، ایک آدھ بنڈل لینے بیڑی کا۔

۔ نہیں رہیں کیا ؟

۔ جی . . . . . ہیں تو . . . . مگر . . . کل تک ختم ہو جائینگی۔

(مسکرا کر) خیر کل کا اللہ مالک ہے، ہم منگا دیں گے صبح ہی صبح۔

۔ (قدرے تامل کر کے) بیشک منگا دیں گے آپ . . . لیکن ذرا ہو ہی آؤں تو اچھا ہے۔

۔ خواہ مخواہ . . . . . پریشان ہونے کی کیا ضرورت . . . . . اب ڈبرا اوبرا جانے کا وقت نہیں، گھنٹہ سوا گھنٹہ دن رہ گیا ہے، اندھیری راتیں، موسم خراب، راستہ بے ڈھنگا . . . کہیں بھول بھال گئے تو دِقت ہوگی۔

۔ خوب ! راستہ بھولنے کی بھی ایک ہی رہی، اجی جناب ! بارہا آیا گیا ہوں، چھ میل ہوتے ہی کیا ہیں، گیا کہ آیا چٹکی بجاتے ہیں دیکھ لیجئے۔

۔ اچھا ! ہم اسی وقت آدمی بھیجے دیتے ہیں، کیوں صاحب !! اب تو ہے ؟

۔ جناب من ! تکلف کی کیا ضرورت ہیں خود ہی جو لئے آتا ہوں۔

۔ اُوہ ! آپ تو ہوا کے گھوڑے پر سوار ہیں، اجی صاحب ذرا دم تو لیجئے . . . ٹھہریئے . . . . . یہی مرضی ہے تو خیر کسی آدمی کو ساتھ لیتے جائیے !!

جوں جوں وہ اصرار کرتے تھے میرا حال غیر ہوا جاتا تھا، جب اُنھوں نے کسی کی بیخ لگائی، تو مجھے سخت صدمہ ہوا، یہ سمجھ میں میں ایک ایسا نظر بند قیدی ہو گیا ہوں، جو مقررہ حدود سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا، اور اس شبانہ روز کی نگرانی سے بیچارہ رہ بہ اُلجھن میں گرفتار ہے۔

دِق آکر بولا:۔

معاف کیجئے گا ! آپ ناحق دیر میں دیر لگا رہے ہیں، اب تک تو میں کہیں کا کہیں پہنچ جاتا۔"

دو ایک بار اُنھوں نے مجھے سر سے پیر تک دیکھا، دیرینہ کرم فرما ہونے کی وجہ سے وہ میری طینت جانتے ہیں، صاف تاڑ

گئے۔ کیا؟

یہ خبطی اس حرکت سے باز آنے والا نہیں، اگر صرف بیڑیاں ہی چاہئیں تو اتنے آدمی موجود ہیں، ابھی منگا دی جائیں، مگر نہیں صاحب یہ تو ایک بہانہ ہے، در اصل اسے اُٹھ رہی ہے "وحشت" اب یہ ماننے کا تھوڑا ہی، ایسے کو سمجھانا فضول ہے، ہٹاؤ جھگڑا، یہ جانے اس کا کام جانے۔

مکرم راؤ صاحب نے آخر عاجز آ کر خاموشی اختیار کر لی، اور بدستور گل بوٹوں میں رنگ بھرنے لگے۔

(۲)

راؤ صاحب کا سکوت فرمانا، اور میری چھٹی ہونا، اُدھر اُنھوں نے سر جھکایا اِدھر میں کھسکا، جلد جلد کمرے کی سیڑھیاں اُتر، قلعہ کے پھاٹک باہر، جھٹ پٹ پہاڑی اُتار ختم کیا اور بستی کے سرے کی ڈبرا کا کچا راستہ[1] کاٹنے والی گڑواٹ[1] طے کر کے، نون ندی[2] کے بھرٹ[3] کے الانگتا پھلانگتا کھیتوں، مینڈوں، ڈانڈوں اور راستے میں ملنے والی گڑواٹوں پگڈنڈیوں سے گذرتا، وہاں جا پہنچا، جہاں سے جی۔ آئی۔ پی۔ آر کا سگنل دکھائی دیتا ہے، کچھ دُور اور چلا ہوں گا، اونچے اونچے درختوں میں ڈبرا کی علامتیں جھلکنے لگیں، اس طرح کوئی پون ایک گھنٹے میں وہ آبادی آ گئی۔

گوشہ گر[4] باشی مہاراجہ عالیجاہ بہادر سر مادھو راؤ صاحب سیندھیا کے عہد میں منڈی قائم ہو جانے کی وجہ سے یہاں ایک چھوٹا سا بازار بن گیا ہے، پچھور[5] اور ہرسی[6] جانے والی لاریاں صبح و شام گزرتی ہیں، ریلوے اسٹیشن پر بھی آمد و رفت رہتی ہے، تاہم اس مختصر آبادی میں بڑے بڑے قصبوں یا شہروں کی سی چہل پہل کہاں۔

علاوہ ازیں نہ تو اس جگہ میرا کوئی دوست آشنا جس سے جی بہلتا، اور نہ اِن گنتی کی دکانوں وغیرہ کے سامنے خواہ مخواہ چکر کاٹتے پھرنا ہی کچھ دلچسپی کا باعث ہو سکتا تھا، طرّہ یہ کہ رات سر پر آ گئی۔ بادل لدا کھڑا، برساتی یا چھتری وتری بھی پاس نہیں، جنگل کا راستہ، دُور جانا، ان قباحتوں کے لحاظ سے وقت ضائع کرنا بے فائدہ معلوم ہوا، گاجر کا حلوا بنانے کی صلاح تھی، چلتے وقت ایک تھیلی لیتا آیا تھا، روپیہ کی کانپوری شکر کے دو پڑے بنا کر تھیلی میں ڈالے، تنبولی سے تین بکس دیا سلائی کے، اور پان بیڑی لے کر اُلٹے پیروں پھرنے کی ٹھہرائی۔

---

[1] گاڑی چھکڑوں کا کچا راستہ۔ [2] اسی علاقہ کے پہاڑوں سے نکل کر سندھ ندی میں جا گرتی ہے۔ [3] کھاڑیں۔ دریاؤں کے قریب کی ٹیلوں کراڑوں سے معمور زمین جو معاون نالیوں نالوں کے بہاؤ سے کٹ کٹ کر سخت ناہموار ہو جاتی ہے۔ [4] ضلع گرد گوالیار کی ایک تحصیل۔ [5] راجہ نل والی اہد جانی سے سات آٹھ میل تحصیل آرون ریاست گوالیار کا ایک موضع، جہاں ہاتی ندی پر مٹی کا اتنا بڑا بند باندھا گیا ہے جس سے تخمیناً سات سَو

ایک تو آج ویسے ہی صبح سے مطلع ابر آلود تھا، اس پر اب اور بھی زور شور سے کالے کالے بادل اُمنڈنے شروع ہوئے، وہ
بائی، معلوم ہُوا کوئی دم میں موسلا دھار برستا ہے، اور ندی نالے ایک ہوتے ہیں۔

قصہ کوتاہ میں گھبرا کر ریلوے کے پھاٹک باہر ہُوا، ہرسی اور اسٹیشن کی سڑکوں کے جوڑ پر آ کر مگرورہ فورٹ کے پہاڑ کی سمت
اور اُس سمت بے راستہ دھاوا بول دیا۔
جس وقت تیز ہوا کے جھونکوں میں اُڑا جا رہا تھا، تو میں نے جا بجا ٹھوکریں کھائیں، جھاڑ جھنکاڑوں میں اُلجھا، مگر کچھ پروا نہ
ں ڈلکی ہُوا، کبھی دوڑ لگائی، یہ کھائی پھاندا، وہ باڑ کُودا، واللہ اعلم کتنے بنجر، اوندھیں، کگر، مینڈیں، سر پتے، جھوکڑے پس پشت
ے، پھر جو نظر اُٹھائی تو ہنوز مگرورہ فورٹ دُور است، والا مضمون ہے، دم بدم تاریکی بڑھتی جاتی تھی، حتّے کہ نون ندی کے
ں تک پہنچتے پہنچتے بینائی عاجز رہ گئی، اور مجھ بے یار و مددگار کو مہیب اندھیرے نے گھیر لیا۔

(۳)

اب سوائے بھرٹکوں کے کوئی پگڈنڈی تھی نہ گرڈواٹ، اندھیرے میں ٹامک ٹوئیے مارنے پر بمشکل ایک مٹی مٹی سی لیکھ ملی،
۔جان کر میں نے وہی اختیار کی۔
خیال فرمائیے! بھرٹکوں کی لیکھیں کیسی بھول بھلیاں ہوتی ہیں، جن کے اعتبار پر انسان دن میں کہیں کا کہیں جا پڑتا
یہ جائیکہ ایسی رات جو تاریکیٔ تربت کو شرمندہ کر رہی تھی، کیا نتیجہ نکلتا؟
وہی، جس کے خوف سے راوصاحب مجھے روک رہے تھے، آہ! گمراہ کُن لیکھ نے ایک ایسی جگہ جا نکالا، جہاں گھنی جھاڑی
ہ تھی۔
ڈنڈا ٹیک ٹیک کر راستہ ڈھونڈتا پھرتا تھا، یکایک اس زور سے بادل گرجا، وہ بجلی کڑکی، گویا صور پھُنکا، زمین آسمان اُڑ
ور میری روح قالب سے پرواز کر کے کسی اور ہی عالم میں منتقل ہو گئی۔
یہ اضطراری حالت چند سیکنڈ سے زیادہ قائم نہ رہی، دم زدن میں بجز ہیبت ناک سکوت اور ڈراؤنی تاریکی کے کچھ نہ تھا
کسی قدر سکون ہونے پر میرے پیروں کو جنبش ہوئی، اور میں نے مضبوط عزم سے جستجو شروع کر دی

بہت سے اُتار چڑھاؤ طے کر کے ایک بلند کراڑے پر پہنچا، اور اِدھر اُدھر بھٹکنے لگا، اس تنگ وادی میں کتنی ہی لیکھیں
جو زیادہ تر مویشیوں کے کھروں سے بن گئی تھیں، ان میں کوئی ایسی نہ تھی جو مجھے رستے لگا دیتی۔

ابھی ویسی ہی سرگرمی جاری تھی کہ پھُٹیوں پھُٹیوں مہاوٹ پڑنے لگی، سخت گھبراہٹ اُٹھی، آہ! کیسا کیسا پچھتا رہا ہوں، کوئی جائے پناہ نظر نہ آئی، جب یقین ہو گیا کہ یہ بادل بغیر برسے اوپر ہی اوپر نکل جانے والا نہیں، تو ہارے درجے میں نے ایک چھدرے چھدرے سے تھپنیکر کی آڑ پکڑی، اس وہم میں کہ ذرا تھمے تو آگے بڑھوں۔

کافی دیر ہو گئی، بار بار ہاتھ پھیلا پھیلا کر دیکھا، ترشح میں فرق نہ آیا، دس پانچ منٹ اور وقت کاٹا، جب بالکل ہی جی نہ لگا، تو سوچا:—

بھئی! اب سُوکھے تو جا نہیں سکتے، پھر یوں آہستہ آہستہ بھیگنے سے کیا حاصل، ہم تو جانے..... اب ..... چلنا ہی چاہیے۔
اس وقت جلد جلد بجلی چمکنے سے کبھی زمین جھلکتی تھی، کبھی اندھیرا گھُپ ہو کر کچھ نہ سوجھتا تھا، اور میں اندھا دھند چلا جا رہا تھا۔

ایک دفعہ بادل گڑگڑا کر جو بجلی کوندی، تو کوئی دو تین کڑاڑوں کے اُس پار ویسا چوڑا چوڑا گہرا راستہ نظر آیا، جیسا مگر ورہ سے نکل کر ڈبرا جاتے وقت ملا کرتا تھا، جی خوش ہو گیا، کہ چلو شکر ہے، اب منزلِ مقصود کچھ دُور نہیں۔

اوّل تو اتنی بوندا باندی سے زمین گیلی ہو چکی تھی، کہ پیر نہ جمتا تھا، دوسرے بھرٹ کے کچھ ایسے اُوٹ پٹانگ، جن کی نہ کوئی خاص سمت تھی، اور ایک سا اُتار چڑھاؤ، بالشت بالشت پر ٹھوکریں کھاتا، جا بجا رُکتا تھمتا، ڈنڈے کی مدد سے بدقت تمام اُن چوڑے راستے کے اوپر تک جا سکا۔

یہاں آ کر جو دیکھتا ہوں، تو کڑاڑا بالکل سیدھا ..... یا اللہ اب کیا کروں، کیسے اُتروں ..... مارے اندھیرے کے ہاتھ کو ہاتھ نہیں سُوجھتا، ایسے میں کہیں پھسلا پاؤں تو کہاں کا گور و کفن، نہ جانے کب تک کسی کو خبر بھی نہ ہو گی ..... مگر یوں ہی کھڑے کھڑے کیا بنے گا، پلکوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں، یہاں سے ہو گا مگر ورہ شاید کوئی ڈھائی تین فرلانگ، بہر حال کوشش فرض ہے۔

سوچ رہا تھا، کون سا رُخ اختیار کیا جائے، کوندی جو بجلی فوراً سر گھمایا، لیکن افسوس! کچھ سمجھ میں آنے سے پہلے اندھیرا تھا، اور گویا آسمان کی بیٹری ختم ہو گئی، مارے گرج کے آپس میں پہاڑ سے ٹکراتے معلوم ہوتے ہیں، مگر صاحب بجلی ہے کو ندنے ہی میں نہیں آتی، بس لمحہ لمحہ پانی زور پکڑتا جاتا ہے۔

کچھ دیر کشمکش و پیچ میں رہ کر میں نے رساں رساں چلنا شروع کیا، یوں ہی اٹکل پچّو جا رہا تھا کہ ہُوا جو پیر پھسلنے کو، اور جوں ہی

۱؎ سردیوں کی بارش

۲؎ ببول کی سی تپیوں والا خاردار درخت، جس کی دسہرے میں پُوجا کی جاتی ہے۔

ں نے ڈنڈا ٹکایا، اندازہ غلط ہونے کی وجہ سے وہ سرکا، پھر جناب! سیدھا گھٹنا نشیب میں، اُلٹے پاؤں کا زاویہ قائمہ بنا ہُوا، شکر کی
لی پیٹ کے نیچے، اور مُنہ میرا ایک ٹھُنٹھ پر۔
اُٹھتے اُٹھتے چمکتی ہے جو بجلی، تو ارے غضب! خیر گذری، جو کہیں ذرا سا وزن جھک جائے، تو ڈنڈے کے ہاتھ کسی درندے
پُرانا بھٹا تھا، بزرگوں کا لیا دیا آڑے آگیا، ورنہ پوری پوری گت بنتی۔
سانس روک، بدن سادھ، ساتھ ترکیب کے اُٹھا، اور ہوش حواس درست کر کے وہاں سے روانہ ہُوا، شکر ہے کوئی دس بارہ قدم پر
ئے راستہ کا اُتار آیا، لیکن نہایت ڈھال، بلا کی پھسلن، تاہم ڈھارس بندھی کہ مار لیا ہے میدان، خدا نے چاہا یہ مشکل بھی آسان ہوئی جاتی ہے۔

ایسے میں ٹھیلی نہ ہوتی تو مزا رہتا، اب اسے سنبھالوں یا اپنی جان، پھر بھی ہمت کر کے آگے بڑھا، مارے بیتابی کے دل نکلا سا پڑتا
تا کہ ہائے کب راستہ تک پہنچوں، اور کب پاپ کٹے۔
آخر ڈنڈا ٹیک ٹیک کر جھاڑیوں کے سہارے اُترنے لگا، ابھی آدھی دُور بھی نہ گیا تھا، کہ صاحب پاؤں پھسلا، پھر بدحواسانہ کوشش
کے باوجود وہ دھڑام سے گرا، کل کل درست ہوگئی۔
اَوسان ٹھکانے نہ آئے تھے، ٹھیلی جو ہاتھ سے چھوٹ پڑی تھی، جھاڑیوں میں اُلجھتی، میرے مُنہ کے پاس ہوتی ہوئی، بھد سے کیچڑ میں گری۔
پچھاڑ تو ایسی کھائی تھی کہ ایک دفعہ کو تاڑی کھُل گئی، مگر راستہ پا جانے کی خوشی میں یہ مزہ آیا گویا کوئی ناقابلِ تسخیر قلعہ فتح کیا،
بٹ پٹ ٹھیلی اُٹھا، میں نے طرارہ بھرا، بلا پس و پیش اُڑا چلا گیا، اور نہ جانے کہاں جا کر دم لیتا، واللہ اعلم کیوں خیال آیا، کہ ہائیں! یہ تو
ھئی نئی سی جگہ معلوم ہوتی ہے، یا تو میں دوسرے رستہ پر ہوں، یا شاید رُخ بدل گیا، ورنہ اب تک ضرور بستی کے آثار ظاہر ہونے چاہیے تھے۔
اب وہ برق رفتاری کہاں، صاحب! پیروں کی رگیں ڈھیلی پڑ گئیں، فکر دامنگیر ہوئی، کسی اونچے کراڑے پر چڑھ کر
بانچنا چاہیے، کہ آخر ہوں کہاں؟

وہاں تو خیر پاؤں پھسل کر ایک پچھاڑ میں کام چل گیا تھا، لیکن جناب! چڑھائی کا معاملہ ٹھہرا اور یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے،
بعض مقامات ایسے ملے جن سے اُوپر جا سکتا تھا، مگر کب؟ دن میں!
کیوں؟
اُن کے اِدھر اُدھر جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں، صاف بات ہے اندھیرے میں جرأت نہ ہوئی، دو ایک بار جی کڑا کر کے چاہا بھی
پھر ہچکچا ہچکچا کر رہ گیا۔

خیر، لڑھکتا لڑھکاتا کچھ اور چلا، جیسی چاہیئے ویسی صاف جگہ کہیں نہ ملی، اب کہاں تک احتیاط برتتا، آخر توکل بخدا ایک طرف رجوع ہُوا اور اوپر چڑھنے لگا۔

مارے پھسلن کے دُھکر پُھکر ہو رہی تھی، اب قلابازی کھائی، اب قلابازی کھائی، خدا خدا کر کے اس کٹان کی چوٹی آئی جو کچھ ایسی زیادہ بلند نہ تھی، آگے بڑھا تو پھر ڈھال، اُسے طے کر کے ہنیسٹوں کے بازو سے نکل کر دوسرے کراڑے پر گیا، اس کا اُتار ختم ہُوا تو وہ بے ڈھنگا قطعہ آیا جہاں جھاڑی بوٹیوں نے بے حد دِق کیا، کہیں تِل دھرنے کو جگہ نہ تھی، ہر قدم پر سے

"کہتے تھے خار تھام کے دامن کہاں چلے"!

اسی طرح سلسلہ وار کتنی ہی مصیبتیں جھیلنے کے بعد ایک اونچے کراڑے تک رسائی ہوئی۔

اب آنکھیں مل مل کر ہر طرف دیکھتا ہوں، اور کچھ نہیں سُوجھتا جب عقل کام نہ دے تو کیونکر قدم اُٹھے۔

کھڑے کھڑے دم گھٹنے لگا، جی اُکتا گیا، بڑی دیر بعد بجلی کوندی، مگر کوئی اندازہ لگانے کی مُہلت نہ ملی، پھر کوندی پہاڑ دہاڑ مطلق نظر نہ آیا، بار بار کوشش کی کچھ حصول نہ ہُوا۔

ہمہ تن چشم انتظار تھا، ناگہاں جیسے بڑے بڑے پہاڑ پر چھوٹا پہاڑ لُڑھکے، یا شورِ قیامت اُٹھے، فلک الافلاک میں ہلچل پڑی، اکدم پلٹ کر میں نے اس طور بر داماں سمت پر آنکھیں لگا دیں، اب جو بجلی کڑکی تو پُرجلال گرج میں کروٹیں سی بدلتی ہوئی، اُفق میں رُوپوش ہونے سے پہلے سمجھا تی گئی:- نادان! مارے جلدبازی کے تُو نے مخالف سمت دوڑ لگا کر خود کو مگر وہ سے دُور پھینک دیا!!

(۴)

کاش! راستہ مِل جانے کی خوشی میں بھُول نہ جاتا، ذرا سمجھ بوجھ کر چلتا تو یہ اُفتاد کاہے کو پڑتی۔

آہ! اس قدر نزدیک پہنچ کر بھٹک جانا اکھرا تو بہت لیکن اب چارہ بھی کیا تھا، ٹوٹتے دِل کو سنبھالا اور مستقل مزاجی سے مگر وہ کا عزم کیا۔ یہاں بھی بھُولا یعنی میں نے وہ راستہ چھوڑ دیا جس پر اُلٹا چل کر ابھی پلٹا تھا، اس خیال سے کہ کون بار بار جھاڑیوں میں اُلجھے یا پھسل پھسل کر پچھاڑیں کھائے بجائے نیچے اُتر کر سیدھے رستے جانے کے لگا اوپر ہی اوپر چلنے، اس طرح اصل راستے سے دُور جا پڑا اور کوئی نئی راہ بھی نہ ملی، گویا میں نے ایک مصیبت سے رہائی پا کر خود کو دُوسری اُلجھنوں میں گرفتار کر لیا۔

اس اثنا میں پانی کا زور دھیما پڑ گیا تھا، یوں ہی کچھ بوندا باندی سی ہو رہی تھی، اور اتنی دوڑ جھپٹ سے میرا بگڑتا بھی کیا، ان ناکامیوں نے مجھے کچھ ایسا دِل شکستہ نہ کیا، کہ سکت نہ رہتی، لہٰذا نہایت تن دہی سے تگ و دو میں لگا رہا۔

کبھی چڑھاؤ آیا کبھی اُتار، کسی جگہ گھنی جھاڑیاں ملیں، کہیں گہرا غار کہ سرک پڑوں تو تلے تک پہنچتے پہنچتے خاردار جھاڑیاں

ں سمیت جسم کو چھلنی کر دیں، ناقابل گذر مقامات آ جانے کی وجہ سے اکثر پلٹنا بھی پڑا، لیکن نامرادی تھی کہ دُور نہ ہوئی اور آئندہ کی اُمید بھی نہ
، تو سخت تاؤ آیا، بڑی جھنجھلاہٹ اُٹھی کہ توبہ! کیا آفت ہے، مگر قہر درویش بجان درویش، امر مجبوری اکر تا بھی تو کیا کرتا، ہار جھک مار کر وہی جدوجہد
ی رکھنی پڑی۔

اچھی طرح نڈھال ہو جانے کے بعد ایک میدان سا آیا، یہاں سُوجھی کہ بھڑکوں کی سرگردانی فضول ہے، ان کا اور نہ جھور! اب ذرا
ٹہل کر جستجو کریں۔

میدان میں آنا اور جیسے یہی انتظار تھا، تڑاتڑ تڑاتڑ یہ بڑی بڑی بوندیں پڑنی شروع ہوئیں، اور لگی جلد جلد بجلی کوندنے، گویا فرشتے
ش بازی سے کھیل رہے ہیں، یہ سماں تھا کہ آسمان میں آگ لگی اور زمین پر طوفانِ نوح آ گیا۔

اِدھر بھاگا، اُدھر دوڑا، کہ بھئی! ذرا کوئی درخت ورخت ملے تو اس موسلادھار سے کچھ بچاؤ ہو، مگر توبہ صاحب! کہیں ایسے
بقعوں پر دُعا قبول ہوتی ہے۔

جس طرح کوئی تھکا ماندہ ملاح جوار بھاٹے سے لڑتا، تہ و بالا کر دینے والی موجوں کا تاب ساحل آ پہنچے، کہ اچانک بندرگاہ کے
پشتے سے ٹکرا کر اس کی کشتی دوبارہ طوفان میں جا پڑے، اس پر بروقت چپّو کا ڈانڈ ٹوٹ جانے کے باعث وہ برگشتہ نصیب مایوسی
ں لمبی سانس کھینچ کر سُن ہو جائے، جب میں نے کہیں ٹھکانا نہ پایا تو ایک کریل کے نیچے بیٹھ کر رہ گیا۔

اس مصیبت میں چاہیئے تو یہ تھا، کہ میرے حالِ زار پر رحم کیا جاتا، لیکن ایک خطاکار بندے کی حمایت میں مشیت نے وہ بے شمار
مصلحتیں نظرانداز نہ کیں، جن سے نہ معلوم کون کون سے ناقابلِ فہم اسرار وابستہ ہوں گے۔

آہ! میری آرزو کے خلاف بادل چھٹ کر تارے نکل آنے کے بجائے جھڑی بندھ گئی۔

ٹوپی تو میں نے پناہ لینے سے پہلے ہی بغل میں مار لی تھی، اب جو بارش میں زیادتی دیکھی، اور بظاہر اسباب کھلنے کے آثار نہ پائے، تو
راضی برضا ہو کر بیٹھے بیٹھے آستینوں میں سے ہاتھ نکال روئی بھرا کوٹ سر پر ڈال لیا، کہ کچھ نہ کچھ تو حفاظت ہوگی۔

جیسا اُمنڈ گھمنڈ کر آیا تھا، ویسا ہی ڈٹ ڈٹ کر برسا، دم بھر میں میرے سامنے تقریباً کوئی تین ساڑھے تین ہاتھ چوڑائی
میں تیزی سے ایک نالہ سا بہنے لگا۔

اُلٹے ہاتھ میں شکر کی تھیلی لٹکائے سیدھے سے ڈنڈا تھامے، گاڑی کے ترپال کی طرح لحافی کوٹ اوپر ڈالے یہی بنا سکڑا سمٹا
بیٹھا تھا، بجلی جو کوندی تو پیروں کے بیچوں بیچ میں، نالے کے رُخ سانپ سا لہراتا دکھائی دیا۔

قریب تھا کہ قلانچ بھر کے کیچڑ میں لت پت ہو جاؤں، معاً تین چار جگہ بجلیاں کوند گئیں اور روشن ہوا:۔

اُفوہ! سانپ وانپ نہیں، نشیب کی وجہ سے پانی کا ریلا چلا آ رہا ہے!

(باقی)

مرزا فہیم بیگ چغتائی

دخترِ مشرق

افقِ صبح ہے ہمرنگِ سیاہی شاید!
کہیں نزدیک ہے طوفانِ تباہی شاید!

شمعِ احساس سیہ پوش ہوئی جاتی ہے
تپشِ زیست بھی خاموش ہوئی جاتی ہے
زندگی، درد فراموش ہوئی جاتی ہے
کچھ نہیں ـــ چارۂ افسردہ نگاہی شاید!

کر دیا دفن کہاں ذوقِ حیاداری کو!
زندہ رکھتی ہے جو قوموں کو وہ غیرت ہی نہیں
وہ حمیت، وہ شجاعت، وہ جلالت ہی نہیں
آہ! خونِ رگِ مشرق میں حرارت ہی نہیں
خود فروشی نے مٹایا غمِ ناداری کو
بے وفا بیچتے پھرتے ہیں وفاداری کو

ہو اگر عصمتِ جذبات کا خوں ہوتا ہے
اب تو نیکی کے تصوّر سے جنوں ہوتا ہے
نہ مصائب سے غرض ہے نہ کچھ آلام سے کام
میکشِ ہند کو ہے دورِ مے و جام سے کام
سچ تو ہے، بندۂ آرام کو آرام سے کام
فکر سے حالِ دلِ زار زبوں ہوتا ہے

اب تو دیکھی نہیں جاتی ہے یہ حالت افسوس!
کچھ نہیں منزل مقصود غلامی کے سوا
پاس کچھ بھی نہیں موجود غلامی کے سوا
جیسے کوئی نہیں معبود غلامی کے سوا
یوں کوئی قوم ہو، آسودۂ ذلت، افسوس!
یوں لُٹے، دولتِ آزادیٔ ملت، افسوس!

پاسِ غیرت ہے نہ احساسِ وفا باقی ہے!
ارضِ مشرق! تری تخریب میں کیا باقی ہے!
زیست تو زیست ہے مرنے کا سہارا نہ رہا
رہِ عظمت سے گذرنے کا سہارا نہ رہا
آہ! کوئی بھی اُبھرنے کا سہارا نہ رہا
دُختِ مشرق! مگر اک تیری دُعا باقی ہے

تیرا ایثار، یہ اعجاز دکھا دے اے کاش!
اور ـــــ تجھکو ہی یہ توفیق خدا دے اے کاش!
دلِ نازک کو ترے درد بھرا پاتا ہوں
تجھ میں اِک غیرتِ ملّی کی ادا پاتا ہوں
تیرے احساس کو بیدارِ وفا پاتا ہوں
تُو ہی اِس ملتِ خفتہ کو جگا دے اے کاش!

روشن صدیقی

عناصرِ شعر

قافیہ اندیشم و دلدارِ من
گویدم مندیش جز دیدارِ من (رومیؒ)

"سخن" اور "سخنور" کے لئے غالباً دنیا کی کسی زبان میں عربی سے زیادہ موزوں اور بہتر الفاظ نہیں پائے جاتے، اِن معنوں میں کہ اگر ان الفاظ کے مفہوم پر کافی غور و تدبّر کیا جائے تو سخن اور سخنور کی حقیقت اور ان کے متعلق تمام ضروری مباحث پوری صحت اور درستی کے ساتھ واضح ہو جائیں۔ ہاں شعر اور شاعر فی الواقع ایسے لفظ ہیں جو خود اپنی حقیقت کا اعلان کر رہے ہیں: ضرورت فقط اس امر کی ہے کہ ہم سُن سکیں اور سمجھ سکیں۔ شعر کا مفہوم ہے احساس اور شاعر کا مفہوم حسّاس یعنی زبردست احساس کا مالک۔ احساس ہی شعر کی اساس ہے، یہی وہ سرچشمہ ہے جہاں سے شعر کی تمام کائنات پھوٹ نکلتی ہے۔ احساس شعر کا بنیادی عنصر ہے، اس کے وجود سے دوسرے عناصر جنم لیتے ہیں اور اسی کی گود میں پل کر جوان ہوتے ہیں۔ زبردست احساس یا جذبہ کی مثال ایک پانی کے پہاڑ یا آگ کے سمندر کی ہے جو قلبِ انسانی کو اپنی آغوش میں لے کر اس میں ایسا زبردست انقلاب پیدا کر دیتا ہے کہ انسان پر ایک خود فراموشی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اس کیفیت سے دو باطنی قوتیں وجود میں آتی ہیں یا بیدار ہوتی ہیں: ایک کا تعلق بصارت سے ہے دوسری کا سماعت سے؛ ایک دیکھتی ہے دوسری سنتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دل کو ایک چشمِ بینا عطا ہوئی ہے جس کی گرمیٔ نگاہ کے سامنے زمین و آسمان کی پہنائیوں کے مادّی پردے پگھل پگھل کر گرے جاتے ہیں، ٹھیک اسی طرح جیسے تابستان کے آفتاب کی کرنوں سے برف کے تودے پانی ہو کر بہ جاتے ہیں۔ یہ چشم فضائے مادّی کے پردوں کو چیرتی ہوئی ضمیرِ کائنات کی گہرائیوں میں اُتر جاتی ہے اور ایک نئے جہان کے مشاہدے میں محو ہو جاتی ہے، نہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ خود ایک نیا جہان پیدا کر لیتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دل کو ایک گوشِ شنوا عطا ہوا ہے جو کائنات کے ذرّے ذرّے کو نغموں سے لبریز پاتا ہے، گویا نغموں کی ایک دنیا ہے جو خود بخود وجود میں آگئی ہے۔ عام طور پر چشم و گوش کا کام بالترتیب دیکھنا اور سُننا ہے لیکن احساس کی اس نئی دنیا میں آنکھیں دیکھنے کے علاوہ سنتی بھی ہیں اور کان سننے کے علاوہ دیکھتے بھی ہیں! یعنی دید و شنید کی قوتوں میں کچھ ایسی وابستگی پیدا ہو جاتی ہے کہ باہمی امتیاز اُٹھ جاتا ہے یا کم از کم مشکل نظر آتا ہے۔ بہرحال ہم اس قوتِ دید کو تخیّل اور قوتِ شنید کو موسیقی سے تعبیر کریں گے۔ پس شعر کے حقیقی عناصر یہی تین ہیں: احساس، تخیّل اور موسیقی۔ اس اجمال کی

تفصیل کے لئے ہم چند مثالوں پر غور کرتے ہیں:۔

ایک عورت کا جوان بیٹا مر جاتا ہے۔ یہ عورت روزمرّہ کی معمولی بات چیت سے ہی واقف ہے لیکن اس صدمے سے اس کی حالت دگرگوں ہو جاتی ہے، اور خود فراموشی کے عالم میں وہ اپنے جواں مرگ بیٹے کا ماتم کچھ ایسے انداز سے کرتی ہے جو الفاظ و معانی کی رُو سے بالکل غیر معمولی ہے اور جس کی عام حالات میں اس سے کبھی توقع نہیں کی جا سکتی۔ مثلاً اس کے نوحے کچھ ایسی صورت اختیار کرتے ہیں: "ہائے یہ کیا اندھیر ہو گیا! روزِ روشن میں میری دولت لُٹ گئی! میں برباد ہو گئی! میرے بیٹے کو کیوں لے گئے! کہاں لے گئے! میں اب زندہ رہ کر کیا کروں گی! اے خدا! آسمان کیوں گر نہیں پڑتا! زمین کیوں پھٹ نہیں جاتی! زلزلہ کیوں دنیا کو تہ و بالا نہیں کر دیتا! ہائے، سینے میں آگ سی دہک رہی ہے! میں جلی جا رہی ہوں ..... وغیرہ وغیرہ"۔ ایسے مواقع پر حالات کے اختلاف کے باعث الفاظ و عبارات مختلف ہوتے ہیں لیکن دو چیزیں بالکل واضح ہیں: ایک تو خیال کی پرواز سے معنی آفرینی کی غیر معمولی قوت ظہور پذیر ہوتی ہے، دوسرے الفاظ و عبارات کا اُتار چڑھاؤ نغمہ کی سی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔

فرض کرو کہ غنیم زبردست لشکر لے کر ملک کی سرحد پر آ گیا ہے اور باشندگانِ ملک کی جان، مال، عزت، ناموس، آزادی، دین غرض سبھی کچھ خطرے میں ہے۔ ملکی فوجیں مقابلے کے لئے سرحد کی طرف کوچ کر رہی ہیں، اور ان فوجوں میں شامل ہونے کے لئے ایک نوجوان اسپ سوار شمشیر بکف اپنے گھر سے نکلا ہے۔ اس کا دل حبِ وطن و دین کے پاک جذبات سے لبریز ہے اور اپنے ملک کے خوبصورت پہاڑوں اور دریاؤں اور وادیوں اور میدانوں کو ایک نظر سے دیکھتا ہے تو یہ جذبات کچھ اس طرح لہریں لیتے ہیں کہ وہ یکایک پکار اُٹھتا ہے: "اے سرسبز و شاداب سرزمین! تو ہمارے پاس خدا کی امانت ہے اور اس امانت کو ہم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ اے برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑوں کی دلفریب چوٹیو! ہم غیور اور بہادر ہیں اور کبھی برداشت نہیں کر سکتے کہ تمہاری پاکیزگی کو دشمن کی نگاہ تک آلودہ کر سکے۔ اے خوبصورت دریاؤ! پیشتر اس کے کہ دشمن کی کشتیاں تمہارے مقدس پانیوں میں تیریں انہیں ہمارے خون کے دریا میں تیرنا ہوگا۔ اے دلکشا وادیو! ہم اپنی آزادی و ناموس کی خاطر جانیں لڑا دیں گے اور خون کی ندیاں بہا کر تمہیں لالہ زار بنا دینگے۔ ہاں اے میری شمشیر آبدار! آ کہ میں ملک و قوم کی سپر بن کر میدانِ جنگ میں جا رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ تو اپنی پرورش کا حق ادا کرے ..... وغیرہ وغیرہ"۔ صاف ظاہر ہے کہ الفاظ کا زیر و بم اور خیالات کی بلندی زبردست جذبہ کے رہینِ منت ہیں۔

چاندنی رات ہے، ایک سبز و شاداب گل و لالہ سے پُر وادی ہے، اور پہاڑ کے دامن سے آبشار کے نغمے بلند ہو ہو کر تمام فضا کو ترنم سے لبریز کر رہے ہیں۔ ایک نوجوان اس منظر کو دیکھتا ہے اور اس پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ منظر کی پاکیزگی کو ہانی پاکیزگی کے جذبہ کو اُبھارتی ہے اور وہ کچھ اس انداز سے گویا ہوتا ہے:

"کیا دلفریب منظر ہے! کیا دلربا منظر ہے! کتنا پاکیزہ سماں ہے! چاند کا نُور میرے دل میں نشاط و سرور کی کیفیت پیدا کر رہا

ہے اور آبشار کے نغمے میری روح کی گہرائیوں میں اُترے چلے جا رہے ہیں۔ اے خدا! جس طرح اس چاندنی نے اس فضا کو نورانی بنا رکھا ہے اسی طرح مجھے اپنے نور کی چادر سے ڈھانپ دے، میرے سینے کو اپنی تجلّیوں سے اس وادی کے مانند شگفتہ بنا دے، اور میرے دلِ خوابیدہ میں روحانی زندگی کی لہر دوڑا دے تاکہ اس آبشار کی طرح ہمیشہ تیری حمد کے گیت گاتا رہوں"! اس مثال سے بھی واضح ہے کہ معانی کی دلفریبی اور الفاظ کا ترنّم ایک زبردست جذبہ کے ماتحت ظہور پذیر ہوئے ہیں۔

ان مثالوں پر غور کرنے سے یہ بات قطعی طور پر واضح ہوجاتی ہے کہ زبردست احساس کے ماتحت جب انسان گویا ہوتا ہے تو معانی و الفاظ کی ایک نئی دنیا خود بخود وجود میں آنے لگ جاتی ہے جس کے پیدا ہونے کا عام حالات میں کبھی امکان نہیں ہوتا یعنی دو باطنی قوتیں پیدا ہوتی ہیں: ایک سے معانی کی آفرینش ہوتی ہے دوسری سے الفاظ کی پیدائش، ایک کو ہم تخیّل کا نام دیتے ہیں اور دوسری کو موسیقی کا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تخیل اور موسیقی جنہیں ہم احساس کی پیداوار قرار دیتے ہیں اور "عناصر شعر" کے نام سے موسوم کرتے ہیں، کیا ہیں اور شعر میں ان کے منصب کی کیا حقیقت ہے؟

تخیّل

علم النفس کی کتابوں میں تخیل کی جو تعریف کی جاتی ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ تخیّل ایک ذہنی قوت ہے جو ہمارے تجربہ اور مشاہدہ سے جمع شدہ معلومات میں تصرّف کر کے نئے نئے تصورات یا تصورات کے مجموعے پیدا کرتی ہے۔ یہ ذہن کی ایک تخلیقی اور تعمیری قوت ہے جو انسان کو دیگر حیوانات سے ممتاز کرتی ہے، اور جب کسی انسان میں اس قوت کا درجہ بہت بلند ہوجاتا ہے تو ہم اُسے شاعر کہتے ہیں۔

پس شاعر اور عام انسانوں کے درمیان یہی قوت مابہ الامتیاز کا کام دیتی ہے اور خود شعرا کا فرق مراتب بھی اسی کے مدارج بلندی و پستی سے پیدا ہوتا ہے۔ شاعر میں اس قوت کی رفعت کا باعث اس کا زبردست اور فوق العادۃ شعور ہے۔ ہم پیشتر ذکر کر چکے ہیں کہ اس کا تعلق باطن کی بصارت سے ہے۔ یہ عجیب و غریب قوت ایک ہی وقت میں ماضی، حال اور مستقبل کا مشاہدہ کر سکتی ہے، اور زمین و آسمان کی وسعتوں کا ذرہ ذرہ اس کی خواہش کے مطابق آنِ واحد میں اس کے سامنے صف آرا ہو جاتا ہے۔ زمان و مکان کی پہنائیوں میں مرئی و غیر مرئی ذوی العقول و غیر ذوی العقول، صوری و معنوی، ظاہری و باطنی، غرض کوئی چیز، کوئی حالت اور کوئی کیفیت نہیں جس کا یہ احاطہ نہ کر سکتی ہو۔ یہ قوت فی الحقیقت ایک آتشین نگاہ ہے جو موجودات کے ظاہری اور سطحی پردوں کو چیر کر تہ تک پہنچنا اور ان کی حقیقت کو معلوم کرنا چاہتی ہے۔ یہ سراپا جستجو ہے اور اپنے عجیب و غریب تصرفات کی بنا پر نئے جہانوں کی تلاش اور تعمیر و تخلیق کے لئے بیتاب رہتی ہے۔ یہی وہ نگاہ ہے جس کے باعث شاعر ماضی کی تاریکیوں میں راہ پیدا کر کے اُن واقعات کی حقیقت کو دیکھتا ہے جس سے اُس کی ظاہری آنکھیں ناآشنا ہیں، اور اسی کی بدولت وہ مستقبل کے چہرے کو بے نقاب کر کے طائر شعر میں نبوت کی سرحد پر پرواز کرنے کی طاقت پیدا کر دینے پر قادر ہو سکتا ہے۔

تخیل کا سرچشمہ احساس ہے، چونکہ احساس کی گوناگونیوں کی کوئی انتہا نہیں اسلئے تخیّل کے تصرفات کی تمام جزئیات پر حاوی

ہونا محال ہے۔ اصولاً شعر میں تخیل کے تصرفات کی تین صورتیں قرار دی جاسکتی ہیں۔ اوّلاً تخیل مختلف اشیاء کو مجتمع کرتا ہے، اور اس اجتماع سے نئی شکلیں وجود میں لاتا ہے۔ مثلاً شاعر قدرت کے کسی دلربا منظر پر نظر دوڑاتا ہے، اس کو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کرتا ہے بعض کو منتخب کر لیتا ہے اور بعض کو چھوڑ دیتا ہے، اور بالآخر ان منتخب ٹکڑوں کو باہم جمع کر کے ان سے ایک نیا منظر پیدا کرتا ہے اس طرح کہ وہ ٹکڑے ایک کُل کے اجزا غیر منفک معلوم ہوں لیکن جس طرح قدرت کا منظر ایک زندہ حقیقت ہے اسی طرح ضروری ہے کہ شاعر کی یہ مخلوق بھی زندگی سے لبریز نظر آئے ایسا نہ ہو کہ ایک مردہ ڈھانچ ہو جو جسم کی حیثیت تو رکھتا ہو لیکن رُوح مفقود ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ زندگی کی رُوح اس وقت تک نہیں پھونکی جاسکتی جب تک شاعر کا کارنامہ شدید احساس اور زبردست جذبے پر مبنی نہ ہو، گویا منظر قدرت کی دلربائی کا احساس تخیل میں وہ طاقت پیدا کر سکتا ہے جو شعر کو رُوحِ حیات سے لبریز کر دے۔

ثانیاً شاعر ایک غم آمیز یا نشاط انگیز وجدانی کیفیت کے ماتحت ایک منظر قدرت کو دیکھتا ہے، اور پھر اس کیفیت کو منظر کے اندر منتقل کر دیتا ہے یا منظر کو اس کا ماخذ قرار دیتا ہے۔ فطرت انسانی کا خاصہ ہے کہ کسی خاص جذبے کے زیر اثر خارجی اشیا میں بھی اسی جذبے کو منعکس دیکھتی ہے نیز خارجی اشیا سے متاثر ہو کر خود اس میں کوئی خاص جذبہ پیدا ہو سکتا ہے: یعنی ہماری داخلی کیفیت خارجی ماحول کو اپنے رنگ میں رنگا ہوا دیکھتی ہے یا خارجی ماحول کا اثر اس کو خاص رنگ میں رنگ دیتا ہے علم النفس کے اس قاعدے کی رُو سے شاعرانہ تخیل وہ خاص وجدانی کیفیت منظر قدرت کو منتقل کر دیتا ہے یا اس سے اخذ کرتا ہے حقیقت یہ ہے کہ شاعر جو کچھ بھی اخذ کرتا ہے زندگی کی حقیقت سے اخذ کرتا ہے اور اپنی زندگی سے اس کی وحدت اور یگانگت کو ثابت کرتا ہے، اور پھر اپنے شاعرانہ کارنامے کو جاندار بنانے کیلئے اپنی رُوح کو اس کے مرکز میں رکھ دیتا ہے۔

ثالثاً تخیل ظاہری پردوں کو پھاڑ کر اشیاء کے اندر داخل ہوتا ہے اور ان کا تجزیہ کر کے حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے وہ ہمیشہ داخلی نقطہ کو لیتا ہے سطحی پردوں کو دُور پھینک دیتا ہے، اور اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتا جب تک اشیاء کے ضمیر تک اپنی راہ پیدا نہ کر لے۔ اس صورت میں تخیل اپنی بصیرت کی حدت اور تیزی کے باعث سطحیت سے تجاوز کر کے اشیاء کی اندرونی صداقت تک پہنچ جاتا ہے بلکہ اس بصیرت کی حدت اور تیزی کا سرچشمہ وہ زبردست جذبہ ہے جو انسان میں گہرائیوں تک اُترنے اور حقیقت تک پہنچنے کی قوت پیدا کرتا ہے۔

تصرفاتِ تخیل کے سلسلے میں ایک اور امر کا ذکر بھی ضروری ہے علم النفس کی کتابوں میں حافظۂ انسانی کی تین صورتیں بیان کی جاتی ہیں جن کا تعلق قوت باصرہ، قوت سامعہ اور قوت لامسہ سے ہے لیکن ان کے علاوہ ایک اور صورت بھی ہے جس کی رُو سے ہم ان احساسات و جذبات کو بھی محفوظ رکھ سکتے ہیں جو کسی واقعہ یا حادثہ، یا منظر کی وجہ سے ہمارے قلب میں پیدا ہوئے ہوں۔ اس صورت میں حافظہ کی وہ شکل جو قوتِ باصرہ سے تعلق رکھتی ہے اس خاص واقعہ یا حادثہ، یا منظر کو رُونما کرتی ہے اور ہمارے اندر وہی احساسات لہریں لینے لگ جاتے ہیں جو اس خاص لمحہ میں پیدا ہوئے تھے لیکن بعض اوقات ان احساسات کے علاوہ نئے جذبات بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ تخیل کا کرشمہ ہے جو

تازہ احساسات وجذبات کو پیدا کر لیتا ہے اور پھر خود اس سرچشمہ سے تازہ زندگی حاصل کرتا ہے تخیل کا یہی تصرف ہے جس کے باعث نہ فقط قلب شاعر میں گذشتہ مشاہدات وتجارب کے سلسلے میں اس کے ذاتی احساسات وجذبات عود کر آتے ہیں، بلکہ جس کی وجہ سے وہ دوسروں کے احساسات وجذبات کا اندازہ بھی کر سکتا ہے اور ان میں خاص احساسات وجذبات پیدا بھی کر سکتا ہے۔ بظاہر اس تقریر سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ کلیۃً تخیل بھی احساس کو پیدا کر سکتا ہے لیکن زیادہ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ شاعرانہ تخیل میں جذبات واحساسات پیدا کرنے کی قوت اسی وقت ظاہر ہوتی ہے جب وہ احساس کی آغوش میں پل کر جوان ہوتا ہے، اور یہی وہ حقیقت ہے جو شاعر اور غیر شاعر میں مابہ الامتیاز کا کام دیتی ہے۔ شاعرانہ احساس ہی وہ آگ ہے جو شاعرانہ تخیل کی گرمی وقوت کا منبع ومخزن ہے۔ ہاں البتہ اس علمی نکتہ سے ہم یہ نتیجہ ضرور اخذ کر سکتے ہیں کہ شعر میں احساس و تخیل لازم وملزوم ہیں اور ان میں تفریق وتقسیم نہیں کی جا سکتی۔

ان بیانات سے یہ امر واضح ہوگیا کہ شاعرانہ تخیل کے تصرفات زبردست احساس کے رہین منت ہیں حقیقت یہ ہے کہ کوئی مخلوق زندگی کی دولت سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتی جب تک اس کا خالق اس میں اپنی روح نہ پھونک دے۔ یہ کائنات زندگی سے مالامال ہے کیونکہ اس میں خالق کائنات نے اپنی روح پھونک رکھی ہے۔ شاعر اپنے کارنامہ میں اپنی روح پھونک کر ہی زندگی پیدا کر سکتا ہے اور اسی روح کو ہم شدید احساس اور زبردست جذبے سے تعبیر کرتے ہیں، ہمارا نظریہ یہ ہے کہ احساس ہی وہ سرچشمہ ہے جہاں سے شعر کے دوسرے عناصر پھوٹ نکلتے ہیں اور اس کے بغیر شعر ایک زندہ مخلوق نہیں بلکہ ایک بے جان لاش کی حیثیت رکھتا ہے۔

تخیل کی بحث میں یہ نہایت ضروری نکتہ ہے کہ اس کی حیثیت تخلیقی اور تعمیری ہے، اور اسے ہرگز نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ اس لئے بھی کہ خیال اور تخیل میں التباس کا اندیشہ ہے۔ یہ دو بکلی مختلف ذہنی قوتیں ہیں: تخیل شعر کی عظمت کا سرچشمہ ہے، خیال فقط آرائش وزیبائش کا کام دیتا ہے۔ تخیل کی طرح خیال کے بھی تصرفات ہیں۔ اولاً خیال بھی مختلف اشیاء میں تصرف کر کے نئی شکلیں بناتا ہے لیکن ان شکلوں سے ایک کل وجود میں نہیں آتا، بلکہ مختلف اجزاء بغیر کسی اتحاد اور یگانگت کے ایک بے جان اور بے ترتیب ڈھانچ کا نقشہ پیدا کرتے ہیں۔ ثانیاً شاعر اپنے کارنامۂ خیالی میں اپنی روح کو داخل نہیں کرتا۔ ثالثاً خیال فقط ظاہر کو دیکھتا ہے اور گو اشیاء کا خارجی نقشہ نہایت صاف طور پر پیش کر سکتا ہے لیکن اس میں احساس مفقود اور وہ جذبے سے کلیۃً عاری ہوتا ہے۔ خیال کی حقیقت سمجھ لینے سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ احساس تخیل کا ضروری جزو ہے، نہیں بلکہ یہی احساس ہے جس کے باعث تخیل کی ممتاز تخلیقی وتعمیری حیثیت وجود میں آتی ہے۔

موسیقی

ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ احساس سے دو باطنی قوتیں بیدار ہوتی ہیں، ایک معنی آفرین ہے دوسری خالق الفاظ، پہلی کو ہم تخیل کہتے ہیں دوسری کو موسیقی۔ تخیل شعر کے باطن سے تعلق رکھتا ہے اور موسیقی ظاہر سے۔ تخیل چشم احساس ہے اور موسیقی گوش احساس۔ جب زبردست احساس دل پر ایک خاص کیفیت طاری ہوتی ہے تو دل ایک ساز کی طرح نغموں سے لبریز ہو جاتا ہے اور اس سے دلاویز نوائیں بلند ہونا شروع ہو جاتی ہیں

ان نواؤں کی نوعیت خود احساس کی نوعیت پر مبنی ہے : اگر احساس نرم اور لطیف ہے تو نوائیں بھی نرم اور لطیف ہونگی، اور اگر احساس خشن اور درشت ہے تو نواؤں میں بھی خشونت اور درشتی ہوگی۔ اس نرمی و لطافت اور خشونت و درشتی کے نقوش جب ہماری لوحِ حافظہ پر مرتسم ہوتے ہیں اور ہم ان کی ترجمانی کے لئے اپنی زبان میں خاص آوازیں اور آہنگ وضع کرتے ہیں جو اسی توازن و تناسب، اسی ترتیب و تنظیم اور اسی دلاویزی و دلربائی کو اپنی حقیقی صورت میں قائم رکھ سکیں، تو ہمارے نزدیک شعر میں موسیقی کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو "وزنِ شعر" اور "انتخابِ الفاظ" کے مباحث کو پیدا کرتی ہے۔ کیونکہ ہم کہتے ہیں شعر میں وزن ہونا چاہیئے جو اسے نثر سے ممتاز کر سکے، اور شعر میں مناسب الفاظ کا استعمال ہونا چاہیئے جو خیال کی مخصوص نوعیت سے مطابقت رکھتا ہو۔ یہ بالکل صحیح اور درست مباحث ہیں جن کا قدرتی طور پر ہر زبان کی تاریخِ شعر میں پیدا ہونا ضروریات سے ہے، اور عام لوگ جب تک ان مباحث سے خوب واقف نہ ہو جائیں شعر کے محاسن سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتے لیکن اگر ہم تھوڑا سا غور کریں تو ہمیں نظر آئے گا کہ شعر کی وسیع اور ہمہ گیر حقیقت کے پیشِ نظر یہی مباحث بعض پیچیدگیوں کا بھی باعث ہو سکتے ہیں : مثلاً وزنِ شعر سے ہماری مراد یہی ہے نا کہ جو اوزان اور بحور علمِ عروض کے مصنفوں نے کتابوں میں درج کر دیئے ہیں ان کے علاوہ کوئی اور وزن اختیار نہیں کیا جا سکتا اور جو عبارت اِن اوزان کی کسوٹی پر پوری نہیں اُترتی وہ شعر نہیں کہلا سکتی؛ نیز کسی خاص خیال کے اظہار کے لئے "انتخابِ الفاظ" کے مسئلہ میں انہی اسالیب و معاییر کو مدِ نظر رکھنا ہوگا جنکی پہلوں نے تعیین کر دی ہے؛ علاوہ بریں ممکن ہے الفاظ و عبارات کا ایک مجموعہ وزنِ عروضی کے مطابق ہو لیکن اس میں احساس کا فقدان ہو، لہذا اس پر شعر کا اطلاق نہ ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے "عناصرِ شعر" کی حقیقت کے سلسلے میں ان عنوانوں کی بجائے "موسیقی" کا جامع لفظ اختیار کیا ہے، جو وزن اور الفاظ کے تمام مباحث پر بھی حاوی ہے اور شعر کی حقیقت سے بھی ہمیں دُور نہیں ہونے دیتا۔ شاعر جو کہ شعر کے سرچشمے سے براہِ راست سیراب ہوتا ہے ان مباحث سے سروکار نہیں رکھتا، بلکہ اس کے لئے شعر کے ظاہر اور باطن کا مسئلہ ایک ہی ہے۔ ہمارے نظریہ کو سمجھنے کے لئے یہ بات واضح رہنی چاہیئے کہ موسیقی کی تکمیل ناممکن ہے جب تک وہ تخیل سے ہم آہنگ نہ ہو۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ شعر میں احساس و تخیل لازم و ملزوم ہیں، لہذا احساس و تخیل شعر کا باطن ہیں، اور موسیقی ظاہر، پس جب تک موسیقی کا ملاً احساس و تخیل کی آئینہ داری کا حق ادا نہ کرے شعر کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے احساس، تخیل اور موسیقی لازم و ملزوم ہیں، اور شعر کے اجزاءِ غیر منفک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مشہور انگریز مصنف کارلائل نے جو شعر کو "خیال لبریزِ موسیقی" سے تعبیر کیا ہے اس کے یہی معنی ہیں۔

بہرحال شعر احساس کی پیداوار ہے اور خود احساس ہی موسیقی کے مسئلے کو بہترین طریق سے حل کر سکتا ہے۔ احساس کا تنوع زندگی اور اس کے مشاغل کے تنوع پر منحصر ہے، اس لئے اوزان و الفاظ کی گوناگونی کی تحدید نہیں کی جا سکتی۔ پس جب ہم عنصرِ شعر کی حیثیت سے موسیقی کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو ہماری مراد یہ ہے کہ شعر کے الفاظ میں نہ فقط بحیثیت مجموعی وہ ترنم پایا جائے جو عین احساس کے ترنم کی صدائے بازگشت ہو بلکہ ان کا انتخاب ہر طرح سے ایسا جامع و حاوی ہو کہ چشمِ احساس یعنی تخیل نے جس چیز کا مشاہدہ کیا تھا اس کی تصویر پڑھنے اور سننے والوں کے دلوں پر نقش ہو جائے۔

(باقی)

محمد اکبر منیر

قہقہہ مار قہقہہ!

زندگی کیا، فنا ہے کیا؟ کس کو خبر خدا ہے کیا؟
قہقہہ مار قہقہہ!
دل سے یہ پوچھتا ہے کیا؟ دُکھ کی ترے دوا ہے کیا؟
قہقہہ مار قہقہہ!
غم ہے بہت بُری بلا ہنس نہ کبھی نہ مُسکرا!
قہقہہ مار قہقہہ!
عشق خرد وفا بقا! رکھتا ہے اِن پہ آسرا؟
قہقہہ مار قہقہہ!
جو کہے کوئی دوسرا کہنے دے تجھ کو اِس سے کیا؟
جو کرے کوئی دوسرا کرنے دے تجھ کو اِس سے کیا؟
قہقہہ مار قہقہہ
قہقہہ مار قہقہہ!
قہقہے کا ہے یہ مزا جس نے سُنا وہ ہنس پڑا
ہنس پڑا لوٹ ہوگیا ہی ہی ہی ہہ ہا ہہ ہا!
قہقہہ مار قہقہہ!
قہقہہ مار قہقہہ!!

ب





بچپن



بڑھاپا

بھکشا پریم کی

بھکشا پریم کی
پریتم میں تو آئی لینے بھکشا پریم کی

داسی کی سُدھ لیجو پریتم
کھڑی ہوں کرپا کیجو پریتم
واری جاؤں دیجو پریتم
بھکشا پریم کی
پریتم میں تو آئی لینے بھکشا پریم کی

میرے سوامی میرے پیارے
ناتھ مرے جیون کے سہارے
مانگنے آئی تیرے دوارے
بھکشا پریم کی
پریتم میں تو آئی لینے بھکشا پریم کی

دُور سے چل کر آئی بھکارن
کردو مکت مرا یہ جیون
دیدو دیدو لے کر جوبن
بھکشا پریم کی
پریتم میں تو آئی لینے بھکشا پریم کی

اندرجیت شرما

باغی

چیری کوف کو موجودہ روسی ادب میں ایک امتیازی درجہ حاصل ہے۔ اس کا ایک ڈراما "The Jews" بین الاقوامی شہرت حاصل کرچکا ہے۔ چیری کوف اوائل عمر میں طبابت کا پیشہ کرتا تھا لیکن ادبیات سے شغف پیدا ہوجانے کے بعد اس نے طبابت ترک کردی۔ طبابت کے پیشے کی وجہ سے اسے فطرت انسانی کے مختلف پہلوؤں پر نظر کرنے کا کافی موقع ملا اور اس نے ان تجربات کو اپنی تصنیفات میں واضح طور سے بیان کیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس کی تصنیفات میں ایک خاص اثر پایا جاتا ہے۔ مندرجہ ذیل فسانہ چیری کوف کے ایک مشہور افسانے "Strained Relations" کا ترجمہ ہے جس میں اس نے ایک خردسال لڑکے کے جذبات کو نہایت مؤثر انداز سے پیش کیا ہے۔

(۱)

مشا خاموش تھا۔ اس کا دل ہی نہیں چاہتا تھا کہ کسی سے بات کرے۔ کھانا کھانے کے لئے اسے لاکھ لاکھ بلایا گیا مگر وہ یہ کہہ کر خاموش ہوگیا کہ میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ سہ پہر کو مشا کی بہن بلانے آئی لیکن مشا کو نہ جانا تھا نہ گیا۔ جب بہن نے زیادہ اصرار کیا تو مشا منہ پھلا کر کہنے لگا "تمہارا جو دل چاہے کرو لیکن مجھے نہ ستاؤ میں ہزار دفعہ کہہ چکا کہ میں کچھ نہیں کھاؤں گا" مشا کی بہن قہقہہ مار کر بولی "تمہارے نہ کھانے کی پروا کسے ہے ایک دن کیا دس دن کھانا نہ کھاؤ جب بھی کسی کو خبر نہ ہوگی" بہن تو زخم پر نمک چھڑک کر ہنستی ہوئی چلی گئی اور مشا سنجیدگی سے اپنی حالت پر غور کرنے لگا۔ "کیا واقعی اماں ابا مجھے منانے نہیں آئیں گے؟ نہیں یہ ناممکن ہے! نتاشا جھوٹی ہے اماں میرے کھانا نہ کھانے سے ضرور پریشان ہوں گی۔ پھر میں کیا کروں؟ پریشان ہیں تو ہوں۔ قصور سراسر اماں اور ابا کا ہے۔ انہوں نے اتنی سی بات پر کہ لاطینی میں میرا ایک نمبر آیا سب لوگوں کے سامنے خدا جانے کیا کیا کہہ ڈالا اور یہاں آخر میں یہ بھی تو کہا تھا کہ مشا موچی بننے کے لائق ہے۔ خیر موچی بننا منظور مگر ان کے یہاں کا کھانا تو نہیں کھاؤں گا" مشا ایک کتاب دیکھ رہا تھا نظر کتاب پر تھی دل کھانے کے خیال میں تھا اور کان ماں باپ کی آواز کے منتظر تھے کہ اتنے میں پاس والے کمرے سے ماں کی آواز سنائی دی "نتا کیا مشا اب تک کمرے سے باہر نہیں نکلا؟" نتا نے ہنس کر کہا "جی ہاں اب تک روٹھے ہوئے ہیں"۔ "بہرحال" باپ نے سنجیدہ لہجے میں کہا "باغی کے لئے کوئی کھانے کی چیز بھجوا دینا چاہئے" کمرے کے باہر سے مشا کے باپ نے اس کو پکارا لیکن اس نے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ دوبارہ مشا کے باپ نے ڈانٹ کر کہا "مشا باہر کیوں نہیں آتے ہو"۔ "کیوں کیا کام ہے؟" مشا جھلا کر بولا۔

"کام! کام کیا؛ بس یہی کام ہے کہ باہر آجاؤ"۔

"میں کیوں آؤں باہر؛ ایک موچی کا بھلے مانسوں میں کیا کام؟"

باہر سے قہقہوں کی آوازیں آنے لگیں اور ان آوازوں کو سن کر مشا کے دل میں اُمید کی جھلک بھی پیدا ہوئی کیونکہ بالعموم قہقہے شکر رنجی کا خاتمہ کر دیتے تھے اور اماں ابا جی کھول کر ہنسنے کے بعد مشا کو منانے آجاتے تھے مگر بُرا ہو اس فتنی ننا کا جس نے عین کریال میں غلہ لگایا۔ کہنے لگی "چلئے بھی ابا مشا ابھی منیں گے تھوڑی" ماں باپ کو پلٹتے دیکھ کر مشا کے غصے کی کوئی حد نہیں رہی۔ چپکے چپکے بدبدانے لگا "مرے اللہ کرے ننا اور اس کا منگیتر —— وہ بھی ڈوب جائے خدا کرے۔ آخر اس فتنی سے پوچھا کس نے تھا کہ مشا کب تک من جائے گا؛ یہ لولی کیوں؛" جب بدبدانے سے بھی دل کی بھڑاس نہیں نکلی تو ننا کے رسالے کی تصویریں پھاڑنا شروع کر دیں اور جب اس طرح بھی اضطراب دل میں کمی نہیں ہوئی تو جیب سے پنسل نکال کر رسالے کی ایک تصویر (جس میں ایک نوجوان مرد ایک لڑکی کے گلے میں بانہیں ڈالے کھڑا تھا) کے نیچے بڑے بڑے حروف میں لکھ دیا یہ تصویر ننا اور اس کے منگیتر کی ہے اور یہ دونوں بڑے اُلو ہیں۔

(۲)

سُورج غروب ہونے کے قریب تھا کہ ماما نے کنڈی کھڑکھڑائی۔

"مشا میاں!"

"جاؤ جاؤ"

"اچھا تم کمرے کے باہر نکلو تو"

"جاؤ بھئی جاؤ ہم کہہ چکے کہ ہم اس گھر میں کھانا نہیں کھائیں گے جہاں ہمیں موچی کہا جائے"۔

ماما چپ چاپ واپس چلی گئی۔ میاں مشا دل ہی دل میں سوچنے لگے "ماما کو اماں ہی نے بھیجا ہوگا۔ پھر کیا چلا جاؤں؛ بھوک بھی زور کی لگی ہے۔ مگر نہیں اس طرح جانا ٹھیک نہیں۔ دب کر گئے تو اب کی دفعہ بھنگی بننے کے لائق سمجھے جاؤ گے۔ ماما کے بُلانے پر ہرگز نہیں جانا چاہئے۔ ہاں اگر ابا یا اماں منانے آئیں اور آئندہ موچی نہ کہنے کا وعدہ کریں تو اور بات ہے۔ خیر ابا تو آنے سے رہے مگر اماں گھنٹے دو گھنٹے میں ضرور آئیں گی، لیکن دو کیا تین گھنٹے گزر گئے اور اماں منانے نہیں آئیں۔ شدت یاس نے دماغ کو معطل کر دیا تھا مگر پیٹ کی آگ نے ایک بات سمجھا ہی دی۔ ابھی دو مہینے ہوئے مشا کے ایک ہم جماعت لڑکے ایوناف نے ایک کتاب بیچ کر بڑا عمدہ چاقو خریدا تھا پھر مشا اس ترکیب پر کیوں نہ عمل کرے؛ اس وقت کوئی کتاب فروخت کر دی جائے پھر جب ماں باپ سے میل ہو جائے تو وہی کتاب خرید لی جائے۔ مشا کو جغرافیہ سے نفرت تھی اس لئے نظرِ انتخاب سمرناف کی کتاب "ایشیا۔ افریقہ۔ امریکا" پر پڑی۔ کتاب جیب میں رکھی اور عقبی راستے سے بازار کی راہ لی۔ بازار میں خوانچے والے صدا لگا رہے تھے "سموسے گرما گرم"، "ٹھنڈی لسی"۔ مشا

کے توسنِ ہمت پر ان صداؤں نے تازیانے کا اثر کیا اور وہ دوڑتا ہؤا کتابوں کی ایک دکان میں گھس گیا۔

"کیوں؟ کیا ہے؟" دکاندار نے سوال کیا۔

"کیا آپ کتابیں خریدتے ہیں؟" مشا نے ڈرتے ڈرتے پُوچھا۔

"کون سی کتاب بیچنا چاہتے ہو؟"

"ایشیا - افریقہ - امریکا - بالکل نئی ہے"۔

"سمرنافٹ کی لکھی ہوئی"۔

"جی ہاں"۔

"اوہو! یہ تو پرانا ایڈیشن ہے - خیر میں دس کوپک میں خرید لوں گا"۔

"مجھ سے تو ایک صاحب نے کہا تھا کہ بیس کوپک سے کم میں نہ بیچنا"۔

دکاندار نے جمائی لے کر کتاب واپس کردی۔

"خیر تو پندرہ کوپک میں مول لے لیجیے"۔

دکاندار نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"لائیے پھر دس کوپک ہی دے دیجیے"۔

دکان دار نے دس کوپک مشا کے حوالے کئے اور کتاب کو بے پروائی سے ایک کونے میں ڈال دیا۔ "میاں صاحبزادے" دکاندار نے جمائی لے کر کہا "سودا تو اچھا ہوگیا۔ کوئی اور دکاندار نہیں پرانے ایڈیشن کے دس کوپک کبھی نہ دیتا اور ——— چلے کہاں؛ ایک بات سنتے جاؤ۔ اب اگر تم کو یا تمہارے کسی دوست کو کوئی کتاب بیچنا ہو تو پہلے میری دکان پر آنا" مشا نے ہاں ہوں کرکے اپنا پیچھا چھڑایا اور خوانچے والوں کے پاس آگیا۔

(۳)

جب تک جیب میں پیسہ نہیں تھا مشا کی نظریں خوانچوں پر مایوسانہ انداز سے پڑتی تھیں مگر اب دس کوپک پاس ہونے کی وجہ مشا کی نگاہ سے اعتمادِ نفس کا اظہار ہوتا تھا۔ دل تو چاہتا تھا کہ بیک وقت سب چیزیں خرید لی جائیں لیکن اس دنیا میں سب ار کیونکر نکل سکتے ہیں؛ پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے پہلے تو تین کوپک کا بہت سا حلوا مول لیا جب حلوا کھا چکے تو منہ اور جبڑ یاد آئیں۔ پیٹ پر ہاتھ پھیر کر ذرا شان سے پوچھا "اے میاں دکان والے یہ سموسے کتنے کتنے ہیں"۔ دکاندار نے مسکرا کر جوا دیا "سرکار بہت سستے ہیں۔ پانچ کوپک کے دو" سرکار کا لفظ سُن کر مشا بہت خوش ہؤا اور بلا تامل پانچ کوپک دوکان د ا

حوالے کر دیئے۔ پیٹ بھر گیا تو پیاس معلوم ہوئی۔ لے دے کے دو کوپک رہ گئے تھے۔ دل نے کہا کہ میاں مشا یہ دو کوپک بھی خرچ کر ڈالے کل کیا کھاؤ گے؟ مگر مشا کو اطمینان تھا کہ کل تک ماں باپ سے میل ملاپ ہو جائے گا اس لئے دونوں کوپک دے کر دو بڑے بڑے گلاس ٹھنڈے کے پیئے۔ مٹھا پیا تو سر کچھ چکرانے سا لگا اور میاں مشا چپ چاپ گھر روانہ ہو گئے۔ سمجھتے تھے کہ تھوڑی دیر تک لیٹنے سے طبیعت ٹھیک ہو جائے گی مگر چکر بڑھتا ہی گیا بلکہ چکر کے ساتھ ساتھ متلی بھی شروع ہو گئی۔ مشا نے جوں توں کر کے کمرے کی کنڈی کھولی اور پھر لیٹ کر بڑے زور سے کراہنا شروع کیا۔ دشمنوں پر باغی کے غصے کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا مگر کراہنے کی آواز سن کر مخالف کیمپ میں ہلچل مچ گئی۔ ننا اور اماں نے دروازے کو بند سمجھ کر اس پر اتنے زور سے ہاتھ مارا کہ گرتے گرتے بچیں۔ مشا کو قے کرتے دیکھ کر اماں کے آنسو نکل آئے اور انہوں نے رو رو کر پوچھا "بچے سچ سچ بتا دے تُو نے کوئی زہر تو نہیں کھا لیا؟"

مشا ابکائیوں کو روک کر بولا "اماں ——— عوعو ——— میں نے ایشیا ——— عوعو ——— افریقہ امریکا بیچ کر ——— عوعو ——— مٹھا پیا تھا ——— اور سموسے کھائے تھے ——— عوعو"

"ہائے نہ جانے میرے بچے کو کیا ہو گیا ہے؟" ماں نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا "ننا سنا تم نے مشا کیا کہتا ہے کہ اس نے افریقہ امریکا کو فروخت کر دیا۔ ارے کوئی ڈاکٹر کو اور مشا کے باپ کو تو بلا دے"۔ باپ ڈاکٹر کے ساتھ گھبرایا ہوا آیا اور پوچھنے لگا "بتاؤ تو بات کیا ہے؟" ماں نے سسکیاں بھر کر جواب دیا "لڑکے کا دماغ پھر گیا ہے کہتا ہے میں نے ایشیا۔ افریقہ اور امریکا کو بیچ کر سموسے کھائے"۔ ڈاکٹر مسکرا کر بولا "مادام پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں لڑکا سچ کہتا ہے قے میں غذا نکلی ہے یہ سب فتور اسی ثقیل غذا کا ہے"۔

ڈاکٹر کی دوا سے تھوڑی دیر کے بعد مشا کو نیند آ گئی۔ باغی آرام سے سو رہا تھا اور تینوں دشمن خاموشی کے ساتھ باغی کی نگرانی کر رہے تھے!

(چیری کوف)

طالب صفوی

اے یاد اے فراموشی!

اچھی اچھی پیاری پیاری باتوں کو اے یاد! تُو یاد کیا کر اور جب وہ سب بھول جائیں اور مصیبتیں ٹوٹ پڑیں تو اے فراموشی! تو بھلا دیا کر۔

گلچیں

چراغِ تہِ داماں

(۱)

خامشی پرور فضا کی تیرگی ہنگامِ شام!
ساحلِ دریا پہ اک دوشیزہ تھی محوِ خرام

سبزۂ پامال تھا اُس کے قدم سے کہکشاں
اور تہِ دامن نہاں تھا اک چراغِ ضَوفشاں

از رہِ اُلفت کہا میں نے کہ "اے جانِ شباب!
اے کہ تیرا حُسن ہے شمعِ شبستانِ شباب!

روشنی سے ہے مرا تاریک گھر نا آشنا
میرے ویرانے سے ہیں شمس و قمر نا آشنا

رات ہو یا دن مرے ہاں ایک حالت ہے مدام
مٹ چکا ہی میرے دل سے امتیازِ صبح و شام

اس چراغِ زیرِ داماں کی تمنّا ہے مجھے
بے سر و ساماں ہوں ساماں کی تمنّا ہی مجھے"

میری عرضِ شوق پر وہ مُسکرا کر رہ گئی
مُسکرائی اور جاتے جاتے اتنا کہہ گئی

"میں اسے فرطِ محبّت سے جلا کر لائی ہوں
سطحِ دریا پر عقیدت سے بہانے آئی ہوں"

دُور جا کر پھر سپردِ آب کر ڈالا اُسے
میں کنارے پر تھا تنہا دیکھنے والا اُسے

اب وہ پہلی سی نہیں باقی تھی اُس میں آب و تاب
بہ رہا تھا سینۂ دریا پہ مانندِ حباب!

(۲)

شام کی ظلمت پہ تھی دوشیزگی چھائی ہوئی
محفلِ فطرت میں تھی ہر چیز سنولائی ہوئی

جل رہے تھے دھیمے دھیمے ایک بستی میں چراغ
لالہ خود رو سے روشن تھی فضائے دشت و راغ

پھر نظر آئی وہی دوشیزۂ رنگیں ادا
اپنے دامن میں چھپائے ایک ننھا سا دیا

التجائے شوق پر کہنے لگی وہ ناز سے
"پیش کرنا ہے اسے تاروں کی محفل میں مجھے"

(۳)

جل رہے تھے ساحلِ دریا پہ مٹی کے دیئے
آ رہے تھے لوگ دیوالی منانے کے لئے

یوں نظر افروز تھی روشن چراغوں کی بہار
جس طرح جگنو چمکتے ہوں قطار اندر قطار

چار سُو میری نگاہِ شوق پھر آوارہ تھی
صورتِ زیبا کسی کی جنّتِ نظارہ تھی

شمعِ جاں افروز تھا خود جس کا حُسنِ دلنواز
جس کے جلوے تھے فروغِ مہر و مہ سے بے نیاز

جا رہی تھی لے کے دامن میں چراغِ نیم جاں
اُن چراغوں کی طرف وہ صُورتِ ابرِ رواں

میرے جذباتِ عقیدت کی اُسے پروا نہ تھی
یا وہ میری تیرہ بختی سے ابھی بیگانہ تھی

اُن چراغوں میں دیا اُس نے وہ شامل کر دیا
پاس سے تاریک میرا خانۂ دل کر دیا

رہ گیا جل بجھ کے ساتھ اوروں کے وہ روشن چراغ
آ گیا لے کر دلِ مایوس پر میں ایک داغ

روشن اب اِس داغ سے ہے خانۂ ویراں مرا
اب یہی لے دے کے اس دنیا میں ہے ساماں مرا

(مخمس ماخوذ از گیتان جلی) حفیظ ہوشیارپوری

آزادی

مشرق کے زندہ جاوید شاعر "خلیل" کا جب آج سے پانچ برس پہلے انتقال ہوا تو کون کہہ سکتا تھا کہ دنیا اس کی اتنی قدر کرے گی لیکن اب اس کی نظموں کا ترجمہ تقریباً بیس مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے اور دنیا کے ہر حصہ میں اس کے مداح پیدا ہو گئے ہیں۔ افسوس ہوگا اگر اردو دان طبقہ اور خصوصاً قارئین "ہمایوں" کو خلیل کی ولولہ خیز شاعری اور اس کے ہنگامہ خیز فلسفہ سے روشناس کیا جائے۔ ذیل میں اس کی ایک نظم کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے جس سے اس کے اعلیٰ تخیل اور عمیق مشاہدہ کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

میں نے تمہیں گھروں میں اور شہر کے دروازے پر "آزادی"
کو سجدہ کرتے دیکھا ہے
اسی طرح جس طرح ایک غلام اپنے آپ کو ظالم آقا کے
قدموں پر گرا دیتا ہے
اور اس کی جھوٹی تعریف کرتا ہے چاہے وہ اسے قتل
ہی کیوں نہ کر دے
میں نے معبد اور فصیلِ شہر کے سایہ میں کتنے ہی آزادی
کا دم بھرنے والوں کو دیکھا ہے
ان کی گردن میں طوق تھا اور ان کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے
یہ منظر دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے
کیا یہ لوگ آزاد ہیں ؛
نہیں !
تم اُسی وقت آزاد ہو سکتے ہو جب آزادی کی خواہش
بھی تمہیں غلام نہ بنا سکے
اور جب کسی خاص قسم کی آزادی تمہارا مطمح نظر نہ ہو
آزاد وہ نہیں جو غم، فکر اور احتیاج سے فارغ ہو

آزاد وہ ہے جو ان کے ہوتے ہوئے بھی آزاد ہے
تم قیودِ لیل و نہار سے نکلنا چاہتے ہو تو ان زن
کو توڑ دو۔
جو تم نے صبحِ شعور کو قبول کی تھیں
ان میں سے مضبوط ترین زنجیر وہ ہے جسے تم
کہتے ہو
اسے زیور نہ سمجھو
یہ انسان کی گردن کا گراں ترین بار ہے
اسے اُتار کر پھینک دو اگرچہ اس کی چمک تم
نظر کو خیرہ کرتی ہے
تم نے خود اس کی غلامی قبول کی تھی
اپنی خطاؤں سے توبہ کرو
اپنے دل کے ان ٹکڑوں کو پھینک دو جن پر
کا نام رقم ہے
اپنے عملوں کا کفارہ دو
اگر تم آئینِ غلامی کو مٹا دینا چاہتے ہو تو یہ سن لو

یہ قانون تمہارے ہاتھ سے تمہاری پیشانی پر لکھا
گیا تھا
تم قانون کی کتابیں جلا کر اسے نہیں مٹا سکتے
تم سمندر کے پانی سے بھی اسے نہیں دھو سکتے
جب تک تم اپنے دل سے اس کا نشان نہ مٹا سکو
اور اگر تم ایک ظالم بادشاہ کو تخت سے اُتارنا
چاہتے ہو
تو پہلے اپنے دل کو طلسم شہریاری سے آزاد کرا لو
ایک ظالم بادشاہ آزاد اور غیور لوگوں پر حکومت
نہیں کر سکتا
مگر ان کی "آزادی" انہیں غلام بناتی ہے اور ان
کی "عزت" انہیں رسوا کرتی ہے
اسی طرح غم تمہارے دلوں پر حکومت نہیں کر سکتا جب
تم خود یہ بات نہ چاہو۔
تم غم سے آزاد ہونا چاہتے ہو مگر اسی "غم" کی تم
نے آرزو کی تھی
تم دشمن سے ڈرتے ہو مگر تیغ دشمن کے ہاتھ میں
نہیں تمہارے دل میں ہے۔ اپنے دل پر نظر ڈالو
تمہارا دل کائنات کی نیرنگیوں کی تماشاگاہ ہے
جہاں غم اور خوشی ہم آغوش ہیں
جہاں مرغوب و نامرغوب پہلو بہ پہلو رہتے ہیں
جہاں آزادی اور غلامی بہنوں کی طرح رہتی ہیں
وہاں ہر چیز ہے
وہ جس کی تم آرزو کرتے ہو
اور وہ جس سے تم ڈرتے ہو
وہ جس کی تم جستجو کرتے ہو
اور وہ جس سے تم پناہ مانگتے ہو
یہ چیزیں تمہاری ہستی میں روشنی اور سایہ کی طرح
باہم موجود ہیں
جب سایہ غائب ہو جاتا ہے
تو روشنی ایک اور روشنی کا سایہ بن جاتی ہے۔
اور جب آزادی کی کڑیاں ٹوٹ جاتی ہیں
تو وہ ایک عظیم تر آزادی کے لئے زنجیر بن
جاتی ہے۔

عطاء اللہ کلیم

جن چیزوں میں سچائی ہے، جن چیزوں میں دیانت داری ہے، جن چیزوں میں پاکیزگی ہے، جن چیزوں میں خوبصورتی ہے، جن چیزوں میں نیک نامی ہے، اگر نیکی کوئی شے ہے اور اگر تعریف بھی کوئی شے ہے تو تو اِن چیزوں کی تعریف کیا کر اور انہیں اپنے دل میں جگہ دے۔

گلچیں

موت کا رقص

موت کا رقص فرانسیسی حقیقیئین کے امام گستاو فلابیئر کا رقم کردہ ہے۔ اسے نثر میں ایک نظم کہا جا سکتا ہے۔ اس میں "رُومانیت" کا رنگ بدرجۂ اتم موجود ہے۔ دراصل اس کے لکھتے وقت فلابیئر کے دل و دماغ پر رُومانیت کا عارضی مگر مضبوط قبضہ ہو چکا تھا۔

موت

رات کے وقت کڑکڑاتے جاڑے میں جب برف بڑے بڑے سفید آنسوؤں کی طرح آسمان سے آہستہ آہستہ گرتی ہے میں اپنی آواز بلند کرتی ہوں، جس کی صدائے بازگشت سرو کے درختوں میں سنسنی دوڑا دیتی ہے۔

میں اپنے سریع السیر اور دائمی سفر میں تھوڑی دیر کے لئے ٹھیرتی ہوں اور سرد اور تاریک قبروں میں اُتر جاتی ہوں، سیاہ پروں والے پرندے ڈر ڈر کر میرے دائیں بائیں پھڑپھڑاتے ہیں، مُردے قبروں میں آرام سے لیٹے ہوتے ہیں، بید مجنوں کی شاخیں میرے سر پر متحرک ہوتی ہیں۔ میرے چاروں طرف آہ و بکا ہوتی ہے یا کامل سکوت، میری شعلہ آفریں آنکھیں بڑے بڑے سفید بادلوں کی تہوں پر جم جاتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت بڑے بڑے کپڑے کے تھان کھولے اور لپیٹے جا رہے ہیں،

لاتعداد سال گذر گئے۔ بے شمار عمریں ختم ہو گئیں۔ زمانہ اپنی گردشِ پیہم میں صدیوں آگے نکل گیا، مگر میرا سفر برابر جاری ہے، میری منزلِ مقصود دُور سے دُور تر معلوم ہوتی ہے۔ میں دُنیا کے آغاز کی شاہد ہوں، معلوم ہوتا ہے، اس کے انجام کی شہادت بھی میری ہی تقدیر میں لکھی گئی ہے۔ میری درانتی بے اندازہ نسلوں کو موت کی تاریکیوں میں دھکیل چکی ہے۔ میں خدا کی طرح ازلی ہوں، میں نے دنیا کو اپنی آغوش میں پالا ہے۔

آہ، میرا کام کبھی ختم نہ ہوگا۔ مسلسل جگر کاوی، متواتر جانکاہی، نہ آغاز نہ انجام، ہر صبح میں اپنے خونی کام پر روانہ ہو جاتی ہوں اور ہر شام اپنے چوغے کی بڑی بڑی شکنوں میں لاتعداد روحوں کو چھپائے ہوئے واپس لوٹتی ہوں اور پھر اُن کو آسمانی ہواؤں کے حوالے کر دیتی ہوں۔

جب سمندر میں طوفان کی بلاخیزیاں خوفناک صُورت اختیار کر لیتی ہیں، جب آسمان آنسو بہاتا ہے اور جھنگھاڑتی ہوئی ہوائیں کوڑے مار مار کر سمندر کو دیوانہ بنائے دیتی ہیں، میں اس شور و غل میں سرکش موجوں پر بیٹھ جاتی ہوں۔ طوفان خیز موجیں مجھے اس ملکہ کی طرح جھولا جھلاتی ہیں جو اپنے "متحرک پلنگ" پر محوِ آرام ہو۔ پانی سرد اور ٹھنڈے جھاگ سے میرے پاؤں کی جلن کو دُور کرتا ہے جن کو

لاتعداد نسلوں کے آنسوؤں نے ایک دائمی سوزش میں مبتلا کر رکھا ہے۔

جب تلاطم خیز سمندر اپنی لوریاں ختم کر چکتا ہے تو میں اپنا سر جھکا دیتی ہوں، دفعتہً سمندر کی خشم انگیز باہیں آغوشِ سکون میں سو جاتی ہیں۔ اور اُس پر سکوتِ موت طاری ہو جاتا ہے۔ نہ وہ ہوائیں رہتی ہیں، نہ آدمی اور نہ جہاز، ہر شے سکون پذیر ہو جاتی ہے۔

اس متواتر سفر میں میں نے بہت سے بادشاہوں کو دیکھا ہے، ان کے شاہی رُعب و جلال سے متاثر ہوتی ہوں، خیر و شر کے مجادلے میری آنکھوں نے دیکھے ہیں، دنیا کے آلام اور مصائب کی بھی میں گواہ ہوں مگر مجھے کیا، مجھے کسی چیز سے محبت ہے؟ نہیں ہرگز نہیں مجھے صرف اپنے سیاہ فرغل سے محبت ہے، جو میرے جسم کو چھپائے رہتا ہے۔

اے میرے گھوڑے، میرے پُرجلال گھوڑے، میں تجھ سے بھی محبت کرتی ہوں۔ اور تیری تگ و دَو سے بھی۔ تیرے فولادی سموں کے نیچے زخمی تڑپ تڑپ کر جاں بحق ہوتے ہیں، تیری دُم سیدھی اور موزون ہے، تیری آنکھیں شعلۂ جوالہ کی طرح متحرک ہیں تیری ایال ہوا میں لہراتی ہے، جب ہم اپنے دوامی سفر میں گامزن ہوتے ہیں تو نہ آرام کرتے ہیں، نہ سوتے ہیں، بے خواب و خور چلے جاتے ہیں۔ تیرا ہنہنانا جنگ کی علامت ہے، تیرے نتھنے ہوا کو ناگوار بدبُو سے معمور کر دیتے ہیں جو کُہرے کی طرح زمین پر منڈلاتی رہتی ہے۔ جس طرف میرا تیر جاتا ہے، تو سلطنتوں اور بادشاہتوں کو کچلتا ہُوا اُس کا تعاقب کرتا ہے۔ سب لوگ تیرا احترام کرتے ہیں نہیں بلکہ تیری پُوجا کرتے ہیں، تیری خوشنودی حاصل کرنے کیلئے پاپائے اعظم اپنا "سہ گوشہ تاج" نذر کرتا ہے اور سلاطین اپنے شاہی عصا۔ لوگ اپنے پوشیدہ راز تیری خدمت میں پیش کرتے ہیں، اور شاعر اپنی شہرت و ناموری، سب تیری تعظیم و تکریم کرتے ہیں مگر تُو ــــ تُو اُن کے جسموں کو روندتا ہُوا چلا جاتا ہے۔

اے اصیل گھوڑے! بلاشبہ تو بے مثل آسمانی عطیہ ہے۔ تیرے اعصاب فولاد کے ہیں اور تیرا سر کانسے کا، تُو بے اندازہ زمانے تک اپنے ختم نہ ہونے والے راستے پر عقاب کی سی سُرعت پرواز جاری رکھے گا؛ جب کبھی بھوک غلبہ کرتی ہے تو تُو انسانی گوشت کھاتا اور انسانی لہُو پیتا ہے۔ اے میرے بے مثل گوہر میں تجھ سے ایسی محبت کرتی ہوں جیسی ایک نرد چہرہ موت کر سکتی ہے۔

آہ۔ بے شمار زمانوں سے میں اسی طرح زندہ ہوں، لاتعداد چہروں کو دیکھ اور سمجھ چکی ہوں، خلقِ خدا کے بے شمار سربستہ راز میرے سینے میں محفوظ ہیں،

کبھی کبھی جب میں اپنے لاتعداد تیر چلا چکتی ہوں اور گھوڑے کی پیٹھ پر تمام دُنیا کی سیر کر چکتی ہوں تو ایک خستگی سی مجھ پر طاری ہو جاتی ہے اور میں آرام کی ضرورت محسوس کرتی ہوں۔

مگر ــــ مگر میرا کام ضرور جاری رہنا چاہئے، میرے لئے مقررہ راہ پر چلتے رہنا بہت ضروری ہے کہ میرا راستہ تمام دُنیا اور فضا پر حاوی ہے میں لوگوں کے منصوبوں اور تدبیروں کو مع اُن کے امیال و عواطف اور ہر شے کے بہالے جاتی ہوں۔

کبھی اپنے فرغل کو تار تار کر دینا چاہتی ہوں، ایک خوفناک اندرونی خواہش میرے لئے مسلسل اضطراب کا باعث بنی ہوئی ہے جیسے اندر ہی اندر کوئی سانپ ڈس رہا ہو۔

جب میں اپنے ماضی پر نگاہ ڈالتی ہوں تو سوائے برباد کھنڈروں اور گرد و غبار میں اٹے ہوئے ویرانوں کے کچھ نظر نہیں آتا حدِ نگاہ تک تاریکی ہی تاریکی ہے۔ لوگوں کے عذاب کے دردناک نظارے شکستہ گورستانوں کے تباہ شدہ ویرانے، یہ تمام چیزیں میں نے ہی کھودی ہیں، میرا ماضی تمام ہیچ اور لایعنی ہے میرا سر چکرا رہا ہے جسم ٹوٹ رہا ہے۔ میرے تھکے ہوئے پاؤں آرام کے طلبگار ہیں۔ میری آنکھیں خونیں شفق پر پڑتی ہیں، وسیع و عریض شفق پر جس کی گہرائی اور بلندی لحظہ بہ لحظہ بڑھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، میں اس کو بھی کھا جاؤں گی جس طرح دوسری تمام چیزوں کو کھا چکی ہوں،

اے خدا! میرے آرام و راحت کی ساعت کب آئے گی، یہ سلسلۂ توالد و تناسل کبھی بند بھی ہو گا یا نہیں؛ وہ دن کب آئے گا۔ جب میں اپنی قبر میں آسودہ ہونگی، اور دنیا کے جھولے میں جھولتی ہوئی دم توڑ دوں گی؟

جب وہ وقت آئے گا میں اپنا ترکش اور فرغل پھینک دوں گی اور گھوڑے کو آزادی دے دوں گی، وہ اہرام کی بلندیوں سے گھاس چریگا۔ اور بادشاہوں کے محلوں میں سوئے گا۔ سمندر سے پانی کا آخری قطرہ تک پی لے گا۔ اور آہستہ آہستہ گرنے والے خون کی آخری بوند کی بو سونگھے گا۔ وہ دن رات بے شمار زمانوں تک جنت میں حسب مرضی سیر کرتا رہے گا۔ سوکھے ہوئے سمندروں اور اُجڑے ہوئے شہروں کو پلک جھپکنے میں پھاند جائے گا، وہ فضا کی وسعتوں میں سینہ پھلا کر سانس لیگا اور جس طرح چاہیگا لطف اندوز ہوگا پھر، ممکن ہے، اے میرے وفادار گھوڑے جس طرح میں خستہ و ماندہ ہوں اسی طرح تھک ہار کر تو کوئی ایسی چٹان پالے جہاں سے خود کو گرا کر دائمی ظلمتوں میں نہاں ہو جائے، بے پایاں سمندر تیرے سامنے ہو گا۔ تو منہ سے جھاگ چھوڑتے ہوئے نتھنوں کو پھلا کر اُس کی اتھاہ گہرائیوں میں کود جائے گا، پھر تجھے سرمدی راحت نصیب ہو گی اور تیرے آتشیں سموں کو ٹھنڈک پہنچے گی، سبز پتوں کا نرم نرم بچھونا ہو گا، مگر اُس پر بھی تو برسوں راحت کی نیند نہ سو سکے گا، وہاں عین کنارے پر تو اِس بات کا منتظر رہیگا کہ کوئی طاقتور ہستی ایک ہی ضرب میں تیرا کام تمام کر دے تو مرگِ انبوہ کو جشن خیال کرے گا، مُردہ جسموں اور مُرجھائے ہوئے پھولوں میں تیرے لئے کشش ہو گی، تجھے خوابِ راحت کی تلاش ہو گی، کیونکہ ابدی زندگی ابدی اذیت ہے اور کُنجِ مرقد گوشۂ راحت،

ہم یہاں کیوں آئے؛ کونسی آندھی نے ہمیں اس گردابِ بلا میں لا ڈالا؛ وہ کون سا طوفان ہو گا، جو ہم کو انہی پر اسرار تاریکیوں میں اُڑا لے جائے گا جہاں سے ہم نے اپنا سفر شروع کیا تھا؛

اُس وقت تک اے میرے پرشکوہ گھوڑے تو اپنے راستے پر چلتا رہ، کھوپریوں کے ٹوٹنے کے تڑاخوں اور ہڈیوں کی چرک چرک کو فردوسِ گوش بنائے رکھ، تیرا سفر بہت طویل ہے، مگر اطمینان رکھ، تو نے مجھے بہت عرصہ سواری دی ہے، اس سے

زیادہ عرصہ ابھی ہمارے بوڑھے ہونے میں باقی ہے۔
ستاروں کی قندیلیں بجھ جائیں، پہاڑ ریزہ ریزہ ہوجائیں، زمین اپنے محور کو فرسودہ کر دے، مگر ہم —— ہم دونوں غیر فانی
ں۔ لاتعداد زمانوں تک ہم کو بقا حاصل ہے۔
آج تو میرے قدموں میں آرام کرسکتا ہے۔ تو مزاروں کی گھاس سے اپنے دانت صاف کرتا رہ، شیطان نے مجھے خیرباد
دی ہے مگر ایک نامعلوم قوت مجھے اُس کی مرضی کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے کو مجبور کر رہی ہے، دیکھو، مردے قبروں سے اُٹھنے
رشش کر رہے ہیں۔ اے شیطان مجھے تجھ سے محبت ہے، میرے جنون اور میری مسرت کو صرف تو ہی جان سکتا ہے، لیکن تو مجھ
، زیادہ خوش نصیب ہے کیونکہ ایک دن جب دنیا کالعدم ہو جائے گی تُو قبر میں چین سے سو جائے گا،
مگر میں —— میں جو اتنے عرصے سے زندہ ہوں، اور متواتر کام میں مصروف ہوں، میرے خیالات ہمیشہ پاکیزہ اور میری
ت ہمیشہ خالص رہی ہے۔ میں ہی بقا کا عذاب بھی برداشت کر رہی ہوں، آدمی کو قبر میسّر ہے اور اپنی تاریکی میں محوِ خواب
ہ دن رات میں گُم ہو جاتا ہے، مگر میں —— میں ——
میں اپنے دوامی راستے پر تنہا گامزن ہوں، جو انسانی کھوپریوں اور ہڈیوں سے پٹا پڑا ہے، اور جہاں حسرت و عبرت
ں ہے۔ فرشتے اپنے ہمراہی فرشتے رکھتے ہیں، شیطانوں کو تاریکی کے دوست میسّر ہیں مگر میں —— میں تنہا ہوں اپنی
انتی کی آواز، تیروں کی سائیں سائیں اور گھوڑے کے سموں کی ٹاپ کے سوا مجھے کچھ نہیں سنائی دیتا۔

شیطان

اے خوش نصیب ہستی، کیا تجھے بھی شکایت ہے؛ تُو ہی ایک ایسی ہستی ہے جو خدا کی طرح قائم و دائم ہے۔ کوئی دوسری ہستی
ی برابری نہیں کرسکتی۔ کیا تجھے اس کا افسوس نہیں ہے کہ ایک دن دُنیا کو اپنے پاؤں کے نیچے کچل ڈالنے کے بعد تُو بھی روند ڈالی جائیگی؟
جب خدا کا تخلیق کا کام بند ہو جائے گا، جب آسمان معدوم ہو جائیں گے اور ستاروں کی شمعیں گُل ہو جائیں گی، جب
وحیں اپنے اپنے مسکنوں سے باہر آکر گریہ وزاری کرتی پھریں گی، اس وقت تیرے لئے کس قدر مقامِ مسرت ہوگا۔ پھر تُو
وزخ اور بہشت کے دائمی تخت پر متمکن ہوگی، سیارے، ستارے اور دنیائیں تہ و بالا ہو جائیں گی۔ تیرا آزاد گھوڑا زمرد اور
ہیرے کے کھیتوں میں محوِ خرام ہوگا، اُس کی جھول فرشتوں کے پروں کی ہوگی اور اُس کا ساز آتشیں ستاروں سے مرصع ہوگا۔
در پھر تُو اس کو فنا کر دیگی، جب تُو ہر چیز کو تباہ کر چکے گی اور صرف خالی فضا رہ جائے گی۔ تیرا فرغل تار تار ہو جائے گا، تیرے تیر
ٹ جائیں گے، پھر تُو آسمان کے بلند ترین پہاڑ کے پتھروں سے تاج بنائے گی اور غیر محدود تاریکیوں میں کود پڑے گی، تیری یہ حسرت
صدیوں طویل ہو سکتی ہے، مگر آخر کار تُو جاں بحق ہو جائے گی، کیونکہ دنیا کا انجام ضروری ہے، سب کے لئے موت لازمی ہے،

سوائے شیطان کے جو خدا سے بھی زیادہ ابدی ہے۔ میں دنیا میں نیستی اور فنا پھیلانے والا ہوں۔

موت۔ لیکن تیرے سامنے، میری طرح ایک ابدی اور لا انتہا منظر نہیں ہے، تجھے میری طرح تباہ کار برودت اور یخ بستہ فضا سے دوچار ہونا نہیں پڑتا۔

شیطان۔ مگر میں تو پگھلے ہوئے لاوے کی دائمی اور جانسوز تپش کے نیچے کانپ رہا ہوں، یہ میری تقدیر ہی میں اسکے سامنے بے بس ہوں۔ تیرا کام لوگوں کو نیستی کے سپرد کرنا ہے، اور میرا فرض اُن کو زندگی عطا کرنا ہے۔ میں سلطنتوں کا مشیر ہوں، سیاسیات ملکی میں میری تدبیروں پر عمل ہوتا ہے۔ میں دلوں کا نگہبان ہوں۔

میرا ہر جگہ موجود ہونا ضروری ہے، میرے اشاروں پر قیمتی معدنیات کے دریا بہ نکلتے ہیں۔ جواہرات کی آب وتاب دوچند ہو جاتی ہے اور لوگوں کے دل میری صدا پر لبیک کہتے ہیں، میں عورتوں، شاعروں اور ملکی مدبروں کے کانوں میں محبت، تعریف اور کشور کشائی کے لفظ کہتا ہوں۔ مسالینی اور نیرو کے ساتھ میں پیرس اور بابل میں بیک وقت موجود ہوتا ہوں۔ جو نیا جزیرہ دریافت ہوتا ہے، چاہے وہ پانی میں محصور چند چٹانیں ہی کیوں نہ ہوں، میرا قدم انسان کے پاؤں سے پہلے وہاں پہنچ جاتا ہے۔ میں بادشاہوں کے عطر میں بسے ہوئے بستروں اور عمائد سلطنت کے نرم اور گرم گدیلوں میں محو استراحت ہوتا ہوں۔ میرے مُنہ سے غم وغصہ، حسد ورقابت، نفرت اور دشمنی کے الفاظ نکلتے رہتے ہیں۔ میرا کام کبھی ختم نہ ہوگا۔ جب عیسائیوں کو آگ میں ڈالتے ہیں میں معطر حماموں میں دادِ عیش دیتا ہوں اور رتھوں پر سوار ہوتا ہوں۔ کبھی مایوسی مجھ پر طاری ہو جاتی ہے کبھی تکبر سے میں اکڑ اکڑ چلتا ہوں۔

کبھی کبھی میں محسوس کرتا ہوں کہ تمام دنیا میرے اندر آباد ہے اور وہ تمام واقعات جن کا میں گواہ رہ چکا ہوں دوبارہ میری ہستی میں واقع ہو رہے ہیں۔

کبھی کبھی میں تھک ہار کر عقل وخرد کو خیرباد کہہ دیتا ہوں، اور ایسی ایسی مجنونانہ غلطیوں کا ارتکاب کرتا ہوں کہ میرا کمینے سے کمینہ نوکر بھی میرا مذاق اُڑانے لگتا ہے۔ اگرچہ اُن کو میری حالت پر رحم بھی آتا ہے۔

کسی ذی حیات ہستی کو میری پروا نہیں، نہ کوئی مجھ سے محبت کرتا ہے۔ نہ آسمانوں میں جو میری جنم بھومی ہیں، نہ جہنم میں جس جگہ میری سرداری مسلّم ہے، نہ زمین پر، جہاں لوگ مجھے دیوتا خیال کرتے ہیں۔ مجھے سوائے بربادیوں، تباہ کاریوں، خون کی ندیوں اور جوشِ دیوانگی کے کچھ نہیں سُوجھتا، میری پلکوں کو کبھی نیند نصیب نہ ہوگی، میری رُوح کو کبھی راحت میسر نہ ہوگی مگر تُو ٹھنڈی اور راحت بخش قبر میں سو جائے گی۔ میں ابدالآباد تک محلات کی شان وشوکت سے آنکھیں سینکنے، بھوکوں کی بد دعائیں سننے اور جرائم کی عفونت سُونگھنے کو زندہ رہوں گا۔

خدا نے جس سے میں بجا طور پر نفرت کرتا ہوں، مجھے کافی سزا دی ہے، مگر میری روح اُس کے خشم سے بھی بڑی ہے، ایک طویل اور گہری سانس میں مَیں تمام دُنیا کو اپنے سینے کے اندر کھینچ سکتا ہوں جہاں وہ میری طرح ہمیشہ ہمیشہ تک جلتی رہے۔
اے میرے آقا، تیرا صُورِ قیامت کب پھُنکے گا؛ پھر سمندروں اور پہاڑوں پر کیسی مُنڈلائے گی، آہ، کیا مجھے بھی انسانوں کے ساتھ عذاب برداشت کرنا پڑے گا؛ کیا اُن کے آہ و بُکا کے شور میں میری آواز ڈوب جائے گی!

[لاتعداد انسانی ڈھانچ رتھوں پر سوار تیزی سے دوڑتے نظر آتے ہیں، فتح اور مسرت کے نعرے بلند ہوتے ہیں، وہ ٹوٹی ہوئی شاخوں اور شکستہ تاجوں کو کھینچتے آ رہے ہیں، زرد اور مُرجھائے ہوئے پتے راستے کی گرد اور ہوا میں اُڑ رہے ہیں۔]

دیکھو، شہرِ جاوداں یعنی رومہ کے فاتح گروہ کی طرف دیکھو، اُس کا کیپیٹول[1] اور کولثیریم[2] اس دریائے مواج کے سامنے محض ریت کے ذرّے معلوم ہوتے ہیں، لیکن موت نے اپنی درانتی کو حرکت دینا شروع کر دیا ہے، قبروں کے کتبے اور تعویذ گرے پڑتے ہیں، اُن کا کمان افسر نیرو ہے۔ میرے دِل کا فخر نیرو، سب سے بڑا شاعر نیرو۔

[نیرو رتھ پر سوار ہے، بارہ گھوڑوں کے ڈھانچ اُس میں جُتے ہوئے ہیں۔ اپنے عصائے شاہی سے وہ گھوڑوں کو مارتا ہے، وہ سیدھا کھڑا ہے، اُس کا لباس اُس کے پیچھے اُڑ رہا ہے، وہ مڑتا ہے، اُس کی آنکھوں سے شعلے برستے ہیں اور پُوری طاقت سے چلاتا ہے۔]

نیرو

جلدی، جلدی، اور تیز، اور تیز، حتیٰ کہ تمہارے پاؤں سے پتھروں کے ساتھ ٹکرا کر چنگاریاں نکلنے لگیں اور تمہارے نتھنے تمہاری چھاتیوں کو جھاگ سے آلودہ کرنے لگیں، کیا ابھی تک پہیّوں سے دُھواں نہیں اُٹھنے لگا؛ اے شہنائی اور نفیری والو، تمہاری آوازیں اوسٹیا[3] تک پہنچ رہی ہیں، مسرت کے نعرے اور تالیوں کا غل غپاڑا آسمان تک جاتا ہے۔ دیکھو دنیا کس طرح مجھ پر زعفران نچھاور کر رہی ہے، میرے راستے میں عطر اور گلاب لنڈھائے گئے ہیں۔ میرا رتھ ہوا کے کندھوں پر سوار اُڑا چلا جا رہا ہے، تیز — اور تیز — گرد و غبار کے بادل اُٹھ رہے ہیں، میرا ملبوسِ شاہی ہوا کی موجوں

---

[1] روما کا ایک مندر جو کیپی ٹولین چٹان پر بنا ہوا ہے۔ یہ جوپیٹر کے نام سے منسوب ہے۔

[2] روما کا ایک بہت بڑا اکھاڑہ اور تماشا گاہ۔

[3] دریائے طیبر کی ایک مشہور بندرگاہ۔

پر لہرا رہا ہے، اُس سے فتح و نصرت کی صدائیں نکلتی معلوم ہوتی ہیں، تیز اور تیز ـــــــ نعرہ ہائے مسرت کی گونج کو سنو
کے پاؤں کی ٹاپ اور لوگوں کی تحسین و آفریں کے غل غپاڑے پر کان دھرو، جو پیٹر دیوتا خود آسمانی کھڑکیوں سے
طرف دیکھ رہا ہے، تیز اور تیز ـــــــ

نیرو کا رتھ اب جنات کے کندھوں پر معلوم ہوتا ہے، دھوئیں اور گرد کے تاریک پردے اُسے اپنی آغوش میں لے لیتے ہیں، وہ اپنے ٹیڑھے راستے پر قبرستانوں کو روندتا چلا جاتا ہے۔ جاگے ہوئے مردے دوبارہ پتھروں کے نیچے کچلے جا رہے ہیں، وہ آگے آتا ہے اور ٹھیر جاتا ہے۔

نیرو

اب چھ سو کنیزوں کو میرے سامنے "خاموش یونانی رقص" کرنے دو، میں سنگِ سماق کے خوبصورت حوض میں
کروں گا، وہ میرے گرد کھڑی ہو کر حلقہ باندھ لیں، ایک دوسری کے ہاتھ میں ہاتھ دے دے تاکہ میں خود کو سفید سنگ
کی سی رعنائیوں میں محصور محسوس کروں۔ میں اپنی سلطنت، اپنا تاج و تخت اُس عورت کے حوالے کر دوں گا جو شوق
سے مجھ سے ہم آغوش ہو، جس کا دل میرے دل کے نیچے دھڑکتا رہے، جو مجھے اپنے گیسوؤں کے عنبریں دام کے اُلجھ
گرفتار کر لے، جو محبت کے گیت سنائے، جس کے تبسم میں بجلیاں آسودہ ہوں، میں مسرت کے بحرِ ناپیدا کنار میں تیرنا چا
آج کی رات روما پر سکوت طاری رہے گا۔ کوئی کشتی طیبر کے کناروں کے ساتھ لگی نہ رہے گی، کیونکہ میں اِس
سطح پر چاند کی روپہری کرنوں کو دیکھنا اور حُسن کی ضیا باریوں سے محظوظ ہونا چاہتا ہوں۔ خوشبوؤں میں لدی ہوئی ہوا
میرے پاس سے گزرنے دو، آہ! کیا میں نشہ میں سرشار، موت کا شکار بن جاؤں گا؟

پھر جب میں کھانے کے دسترخوان پر بیٹھوں، تو اُن میں سے ایک کو گانے دو، دوسری کنیزوں کو میرے
کی طشتریوں میں کھانا لانے دو۔ وہ مجھے محوِ آرام دیکھتی رہیں، ایک کنیز دفعتہً دوسری کا گلا کاٹ دے، کیونکہ یہ میری
میری مسرت ـــــــ میں جو دیوتاؤں کا منظورِ نظر ہوں، مظلوموں کی آہ و بکا میں ہے۔ یہ مجھے راحت بخش
میں خوراک کے ساتھ لہو ملانا پسند کرتا ہوں،

آج میں روما کو نذرِ آتش کر دوں گا، شعلے آسمان کو منور کر دیں گے اور دریائے طیبر آتشیں موجوں میں کروٹیں
پھر میں اعلےٰ قسم کی لکڑی کا "تختِ رواں" تیار کراؤں گا، جو رومن سمندر پر تیرے گا اور رومن آبادی میری مدح
گیت گانے کے لئے جمع ہو جائے گی۔ میرے تخت کے پردے سنہرے ہوں گے، اور اس پر میں عقاب کے پر
بچھا کر بیٹھوں گا، میرے پہلو میں حسین ترین عورت ہو گی، دنیا اس دیوتا کی ظفر مندیوں پر خوشی کے پھول برسا

میرے ارد گرد شور و غل کا سمندر موجزن ہوگا، مگر میرے پاؤں کے نیچے اُس کا تمام جوش و خروش ٹھنڈا پڑ جائے گا اور
ں اور شہنائیوں کی صدائیں موجوں کے شورِ بے ہنگام پر غالب آ جائیں گی،
تم نے کیا کہا؛ وِنڈیکس باغی ہوگیا؛ عمائدِ سلطنت بھاگ گئے؛ میری کنیزیں خوف سے چھپتی پھر رہی ہیں؛
صرف خاموشی اور آنسو باقی ہیں۔ سوائے بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک کے کچھ سُنائی نہیں دیتا۔ کیا میری موت
بت قریب آ پہنچا ہے؛
ت۔ ہاں۔ فوراً مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ،
رو۔ کیا میں مسرّت و ابتہاج کی محفلوں کو خیرباد کہہ دوں؛ کیا میرے رتھ، لوگوں کی تحسین و آفریں اور تمام عیش و نشاط
مجھ سے چھن جائے گا؛
ت۔ ہاں۔ سب کچھ، سب کچھ،
طان۔ جلدی کرو، دنیا کے آقا، وہ ہستی آ رہی ہے جو ایک ہی ضرب میں آپ کا کام تمام کر دے گی، شاہنشاہ مرنے
سے واقف ہوتا ہے!
رو۔ کیا میں جان دے دوں؛ ابھی تو میں نے زندگی شروع ہی کی ہے، ابھی کتنے ہی بڑے بڑے کام تشنۂ تکمیل ہیں
وہ کام جو اولمپس کو لرزنے میں ڈال دیں۔
مَیں سمندر کو بھر کر اُس پر اپنی گاڑی چلاؤں گا، میں ابھی زندہ رہنا چاہتا ہوں ہیں طیبر کی سنہری ریت اور شاندار
عمارات کی دید سے ابھی سیر نہیں ہُوا،
رت۔ مَیں تیرے مقبرے کے لئے غلاف دوں گی، اور ایک ایسا بستر جو بادشاہی بچھونوں اور گدیلوں سے بھی پُر لطف
اور راحت بخش ہوگا۔
برو۔ مَیں اس پر بھی جان دینے کو تیار نہیں ہوں،
وت۔ اگر ایسا ہے تو لے، تُو گیا۔

[وہ فرغل اُٹھاتی ہے، جو پاس ہی زمین پر پڑا ہے۔ اور اُس میں لپیٹ کر نیرو کو لے جاتی ہے۔]

سالک صہبائی

نواہائے راز

کبھی جنت میں بہلایا گیا ہوں
کبھی دوزخ میں جلوایا گیا ہوں

کہاں میں اور کہاں آدابِ محفل
جہاں پہنچا، نکلوایا گیا ہوں

مری طفلی ہے اور یہ دست خوش ہے
دو عالم دے کے بہلایا گیا ہوں

یہ کیسا امتیازِ کفر و دیں ہے
عبث جھگڑوں میں اُلجھایا گیا ہوں

غلط ہے مجھ پہ تہمت زندگی کی
میں خود آیا نہیں، لایا گیا ہوں

میں ہوں وہ قطرۂ باراں کہ تنہا
جلی مٹی پہ برسایا گیا ہوں

مرا قصہ بھلا دے زندگی کاش
پُرانی بات ہوں آیا گیا ہوں

حامد علی خاں

محفلِ ادب

خُسر اور داماد

(مصری افسانہ)

دوشیزہ۔ آبا سے ملو اور مجھ سے شادی کی باضابطہ درخواست اُن کے سامنے پیش کرو۔

جوان۔ باضابطہ! لیکن پیاری تم جانتی ہو کہ میں بہت شرمیلا ہوں اور ذرا میں ہاتھ پاؤں پھُول جاتے ہیں۔ تمہارے والد سے ملاقات کا خیال ہی میرے حواس گُم کر دیتا ہے۔ میں اُن سے کیا کہوں گا؟ کس طرح بات شروع کروں گا؟

دوشیزہ۔ گھبراتے کیوں ہو؟ میرے آبا بہت ہی اچھے آدمی ہیں۔ . . . جب اُنہیں تمہاری غرض معلوم ہو گی تو بہت خوش ہونگے۔

جوان۔ لیکن میں اُن سے کیا کہوں گا؟

دوشیزہ۔ تم اُن سے کہنا کہ میں اس لئے حاضر ہُوا ہوں کہ آپ سے . . . . .

جوان۔ یعنی پہلے السلام علیکم نہ کہوں؟

دوشیزہ۔ ظاہر ہے پہلے سلام ہی کرنا ہو گا وہ تمہارے خیر مقدم کے لئے اُٹھ کھڑے ہوں گے تب تم . . . .

جوان۔ کیا مجھے اُن کے قریب بیٹھ جانا چاہئے۔ لیکن میرے ہاتھ پاؤں پھُول جائیں گے۔ بہتر یہ ہے کہ اس مہم کو تم ہی سر کر دو۔

دوشیزہ۔ نہیں، یہ بھلا کیونکر ہو سکتا ہے لیکن میں تمہیں وہ سب باتیں یاد کرائے دیتی ہوں جو آبا سے کہنا ہوں گی۔

جوان۔ اگر وہ مجھے نکال دیں؟

دوشیزہ۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ وہ تو بے حد خوش ہوں گے۔ اچھا تم اُن سے پہلے کہنا السلام وعلیکم۔

جوان۔ السلام علیکم! السلام علیکم!

دوشیزہ۔ جب وہ سلام کا جواب دیں تو تم کسی کرسی پر بیٹھ جانا۔ اگر شرم غالب آ جائے تو سر جھکا لینا۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ آبا بھی سر جھکا کر بیٹھیں گے۔

جوان۔ السلام علیکم! السلام علیکم!

دوشیزہ ۔ جب بیٹھ چکنا تو کہنا، میں اس لئے حاضر ہُوا ہوں کہ آپ سے ۔ ۔ ۔ ۔
نوجوان ۔ میں اس لئے حاضر ہُوا ہوں کہ آپ سے ۔ ۔ ۔ ۔
دوشیزہ ۔ یہ عرض کروں کہ مجھے اپنی دامادی سے مشرف کریں ۔
نوجوان ۔ یہ عرض کروں کہ مجھے اپنی دامادی سے مشرف کریں ۔
دوشیزہ ۔ دیکھو! جب یہ کہنا تو دل مضبوط رکھنا، پیشانی پر پسینہ نہ آنے پائے ۔ بہادر بنو ۔ پانچ منٹ میں سب کچھ طے ہو جائیگا ۔ پھر میرے ابا بہت ہی اچھے آدمی ہیں ۔ تم خود ہی دیکھ لوگے ۔
نوجوان ۔ اور کیا کہوں گا ؛
دوشیزہ ۔ وہ تمہیں جواب دیں گے کہ تم کو داماد بنانا میرے لئے عزت کی بات ہے ۔
نوجوان ۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ یہی کہیں گے ؛
دوشیزہ ۔ ہاں حق الیقین ہے ۔
نوجوان ۔ پھر ؛
دوشیزہ ۔ وہ تم سے تمہارا اور تمہارے والد کا نام پوچھیں گے ۔ تمہارے باپ مشہور آدمی ہیں ۔ اُن کا نام سُن کر خوش ہو جائیں گے پھر وہ تمہارے سامنے سگریٹ پیش کریں گے اور چائے منگائیں گے ۔
نوجوان ۔ لیکن میں نہ سگریٹ پیتا ہوں نہ چائے ۔
دوشیزہ ۔ یہ تم اُن سے کہہ دینا ۔ وہ تمہاری اور زیادہ قدر کریں گے ۔
نوجوان ۔ اچھا تو میں یاد کرتا ہوں ۔ السلام علیکم، میں اس لئے حاضر ہُوا ہوں کہ ۔ ۔ ۔ ۔ یعنی ۔ ۔ ۔ ۔ کہ ۔ ۔ ۔ ۔ یعنی ۔ ۔ ۔ ۔
دوشیزہ ۔ تم بھُول گئے ۔ خیر میں پوری بات لکھے دیتی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس وقت سے شام تک یاد کر لینا ۔

(۲)

شام کو جب حسن آفندی کپڑے اُتارنے لگے تو اُن کی بیوی نے کہا :۔
بیوی ۔ ذرا ٹھہرو ۔ ابھی کپڑے نہ اُتارو ۔
شوہر ۔ کیوں ؛
بیوی ۔ ابھی ایک نوجوان آئے گا جو ہماری لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے ۔
شوہر ۔ پانچوں میں سے کس لڑکی سے ؛

بیوی۔ فاطمہ سے۔

شوہر۔ خود میں بھی یہی سمجھتا تھا کیونکہ فاطمہ اپنی سب بہنوں سے زیادہ چنچل ہے۔ لیکن نوجوان مجھ سے کیوں ملے۔ تم کہہ دینا کہ رشتہ مجھے منظور ہے۔

بیوی۔ یہ تم کیا کہتے ہو۔ تم سے اُس کا ملنا ضروری ہے۔ میں تمہیں بتائے دیتی ہوں کہ لڑکا بہت شرمیلا ہے۔ تمہاری ملاقات سے ڈرتا ہے۔ اسی لئے فاطمہ نے اس کاغذ پر وہ سب باتیں لکھ دی ہیں جو تمہیں اُس سے کہنا چاہئیں۔

حسن آفندی نے کاغذ اپنی بیوی کے ہاتھ سے لے لیا۔ اُس میں حسب ذیل سطریں لکھی تھیں :۔

"وعلیکم السلام"۔

"تم کو داماد بنانا میرے لئے عزت کی بات ہے"۔

"براہ مہربانی اپنے اور اپنے والد کے نام سے مجھے آگاہ کرو"۔

"تمہارے والد کا میں نے نام سنا ہے اور میں نہایت خوش ہوں کہ تمہارے خاندان سے رشتہ جوڑوں"۔

"سگریٹ حاضر ہے۔ چائے منگاتا ہوں"۔

"یہ تو بہت ہی خوب ہے کہ تم نہ سگریٹ پیتے ہو نہ چائے"۔

"مجھے یقین ہے کہ میری بیٹی تمہارے گھر میں خوشی کی زندگی بسر کرے گی"۔

"ہاں میرا دل کہتا ہے کہ تمہارے جیسے لائق نوجوان کو داماد بنا کر میں کبھی نادم نہیں ہوں گا"۔

(۳)

دوشیزہ۔ پیارے تم آ گئے۔ ابا تمہارے منتظر ہیں ..... کیا تم نے وہ باتیں یاد کر لیں ؟

نوجوان۔ ہاں سنو —— السلام علیکم۔ میں اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ آپ سے ..... یعنی کہ آپ سے ...... یعنی کہ آپ سے ..... —— لاحول ولاقوۃ کچھ یاد نہیں رہا۔ دیکھوں وہ کاغذ کہاں ہے ؟

دوشیزہ۔ خیر کوئی ہرج نہیں۔ ابا سے ملاقات کے وقت تم کاغذ ہاتھ میں لے لینا اور وہ سب باتیں کہہ دینا۔ ابا تمہیں دیکھیں گے نہیں کیونکہ سر جھکائے بیٹھے ہوں گے۔

نوجوان۔ کیا تمہیں اس کا یقین ہے ؟

دوشیزہ۔ ہاں، اماں نے مجھ سے اس کا وعدہ کر لیا ہے۔

(۴)



نوجوان۔ السلام علیکم۔

حسن آفندی۔ وعلیکم السلام

نوجوان۔ میں اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ آپ سے ....

حسن آفندی نے جیب سے کاغذ نکال کر جواب تلاش کرنا شروع کیا۔ نوجوان نے بھی اپنی جیب سے کاغذ نکال لیا اور اس طرح پڑھنے لگا:۔

"میرا نام ابراہیم ہے میرے والد کا نام نورالدین ہے۔ شکریہ۔ میں نہ سگریٹ پیتا ہوں نہ چائے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کی لڑکی میرے ساتھ نہایت مسرت کی زندگی بسر کرے گی۔ آپ مجھے داماد بنا کر ہرگز نادم نہیں ہونگے!"

نوجوان کے چُپ ہوتے ہی حسن آفندی نے اپنا کاغذ بھی اس طرح پڑھ دیا:۔

"تم کو داماد بنانا میرے لئے عزت کی بات ہے۔ براہِ مہربانی اپنے اور اپنے والد کے نام سے مجھے آگاہ کرو۔ تمہارے والد کا نام میں نے سُنا ہے اور میں نہایت خوش ہوں کہ تمہارے معزز خاندان سے رشتہ جوڑوں۔ سگریٹ حاضر ہے، چائے منگاتا ہوں، یہ تو بہت ہی خوب ہے کہ تم نہ سگریٹ پیتے ہو نہ چائے۔ مجھے یقین ہے کہ میری بیٹی تمہارے گھر میں خوشی کی زندگی بسر کرے گی۔ ہاں میرا دل کہتا ہے کہ تمہارے جیسے لایق نوجوان کو داماد بنا کر میں کبھی نادم نہیں ہوں گا!"۔

(رہند)

رُباعیات

گُل پر ہیں نقوشِ دستِ باری اب تک | جُنباں ہے دلِ بادِ بہاری اب تک
انساں کی پیمبری کا در ہے مسدود | قُدرت کی پیمبری ہے جاری اب تک

کیا شیخ، بلے گا گُل فشانی کر کے
تشریحِ مآلِ شادمانی کر کے
تو آتشِ دوزخ سے ڈراتا ہے انہیں؛
جو آگ کو پی جاتے ہیں پانی کر کے

وہ رات گئے شراب ڈھلنا، ہے ہے
وہ پچھلے پہر صبا کا چلنا، ہے ہے
معشوقۂ نوخیز کا وہ رہ رہ کر
آنکھوں کو ہتیلیوں سے ملنا، ہے ہے

(جوش)

ہے کفر گناہ، اور اسلام گناہ
یہ کام گناہ، اور وہ کام گناہ
القصہ ہر اک چیز کا اس دنیا میں
اک نام کچھ اور ہے اور اک نام گناہ

(سیماب)

"کلیم"

اردو ادبیات میں انقلاب کی ضرورت

ہمارے ادبیات میں ہے کیا؛ وہی روایتی، مصنوعی، اور بے سمجھے بوجھے حسن و عشق کے چٹخارے۔ وہی ناروا قناعت اور ترکِ دنیا کے چبائے ہوئے نوالے۔ وہی "اگر شہ روز را گوید شب است ایں" کی غلامانہ تعلیم۔ وہی "ما مقیمانِ کوئے دلداریم" کی بوریا دہی "گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے" کی بزدلی۔ وہی "رات بھر لاشہ پڑا رکھا مسیحا نے مرا" کی کفن فروشیاں۔ وہی "یار کا سر چڑھ کے بوسہ لے لیا" کی لوبلی ٹھٹولی۔ وہی "ہو رہیگا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا" کی کاہلانہ بے پروائیاں۔ وہی "ہے شبِ وصل غیر بھی کاٹی" کی بے غیرتیاں۔ وہی "ایسے میں کوئی چھم سے جو آ جائے تو کیا ہو" کی سوقیانہ بول چال۔ وہی "اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائینگے" کی زبوں ہمتی۔ وہی "کارسازِ ما بفکرِ کارِ ما" کی نوم آور دوائیں۔ اور وہی "بہت سعی کیجے تو مر رہیے میر، بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے" کی نسائی ناچاریاں۔

میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیجئے کیا ہم اس انڈوں کی طرح بین کرتی اور سوگوار بوڑھیوں کی طرح چھاتی پیٹتی ہوئی، جھوٹے آنسوؤں کی شاعری سے طوفانی سمندروں کے تڑپتے ہوئے سینوں پر جہاز چلا سکتے ہیں؛

جس شاعری کی ہڈیاں، زنداں کی زنجیروں سے کھرچ کھرچ کر نکالی جاتی ہوں، جس کی سفید آنکھیں ہمیشہ چھت سے لگی رہتی ہوں، جو حقیقی حسن و عشق کی چاشنی سے بیگانہ ہو، جو اس زندگی اور اس کے تمام بے شمار پہلوؤں کے مطالعے اور اس عظیم الشان کرۂ ارض کے مشاہدے سے قاصر ہو، جس کے آشیاں پر آئے دن بجلیاں گرا کرتی ہوں، جسے ہر بازاری آدمی، اگر وہ رقیب کی صورت سے نمودار ہوا ہے، دھکے دے کر بزم سے نکال سکتا ہو، جو دل کا جنازہ ہتیلی پر لئے پھرتی ہو، جس کی سانس سے شگفتگی کا چہرہ اُتر جاتا

ہو، جس کا ہر روز "عشرۂ محرم" اور جس کی ہر شب "شب شہادت" کے مانند ہو، اور جس کی تھرتھراتی ہوئی آواز ایسی ہو گویا آندھی کے وقت ٹوٹی ہوئی قبروں کے روزنوں سے ہوا گزر رہی ہے، کیا ایسی فاقوں کی ماری، اونگھتی، بلبلاتی، تھرتھراتی، گڑگڑاتی، کانپتی، روتی، پیٹتی، چیختی، چلاتی، سسکتی، بسورتی، بلکتی اور لنگڑاتی ہوئی شاعری کے کاندھے پر ہات رکھ کر ہم زندگی کے پُرہول و ناہموار میدانوں کو طے کرنے کا تصور بھی کر سکتے ہیں؛ ایک بار نہیں، ہزاروں مرتبہ، طویل راتوں کے سکون اور سناٹوں میں میں نے اُردو شاعری کا مطالعہ کیا۔ میں نے نہایت احتیاط کے ساتھ اپنے اساتذہ کے سینے کھول کر دیکھے، میں نے پوری دیانت کے ساتھ اپنے شعراء کی نبضوں پر ہات رکھ کر ان کے ضربات کا شمار کیا، لیکن افسوس کہ مجھے ان کے اندر زندگی، شعلہ فشاں زندگی، آگ اور بجلی سے کھیلنے والی زندگی، گرجتی گونجتی ہر قدم پر مچلتی، اور اُبھرتی ہوئی سُرخ خون والی زندگی کا کہیں نام و نشان تک نہ ملا۔

ہمارے کلیات، دواوین، ناول، اور افسانے، زہر کے کُرے ہیں، جہاں حیات کا خون جم جاتا ہے اور ولولوں کی نبضیں چھوٹ جاتی ہیں۔

کہاں تک روؤں، کس کس بات کا ماتم کروں؛ ذرا اپنے "شعرائے کرام" کے تخلص ہی ملاحظہ فرمالیجیے اور کسی ماہر نفسیات سے دریافت فرمائیے کہ یہ تخلص کس نوع کی ذہنیت پیش کرتے ہیں، آپ جانتے ہیں اس کا جواب کیا ہوگا؛

وہ غیر مشتبہ الفاظ میں بتا دے گا کہ اس نوع کے تخلص صرف وہی لوگ پسند اور اختیار کر سکتے ہیں جن کے ولولوں کی کمریں ٹوٹ چکی اور جن کی ہمتوں کے منکے ڈھل چکے ہیں۔

سُنئیے اور عبرت کے کانوں سے سُنئیے:-

مجروح، تفتہ، ملول، مسکین، درد، سوز، ذرہ، نخچیر، داغ، افسوس، حزیں، بیدم، بیدل، بسمل، کشتہ، الم، اشک، آہ، قلق وغیرہ! اور لگے ہاتھوں ان شعراء کے کلام سے متاثر ہونے والے ادیبوں کے اُن سابقوں کو بھی ملاحظہ فرمائیے جو وہ بالعموم خطوں میں اپنے ناموں کے ساتھ لکھتے ہیں۔

ناچیز، ذلیل، حقیر، فقیر، احقر، رسوا، کمترین، فدوی، عبد ذلیل، ہیچ میرز، بندۂ بے نوا، کمترین خلائق، ارذل مخلوق، احقر العباد، عاجز، ہیچمداں، گنہگار، عاصی، پُرمعاصی اور روسیاہ وغیرہ!

کیا آپ اپنے شاعروں اور ادیبوں کی پست ذہنیت کے سمجھنے کے لئے اس سے زیادہ کسی ثبوت یا شہادت کے طلبگار ہیں؟

آخر صاف کیوں نہ کہہ دیا جائے کہ ہمارا ادب کمزور ہے، علیل ہے، خوابیدہ ہے، مُقلد ہے، نقال ہے، غیر فطری ہے، بے روح ہے، مدقوق کی طرح زرد، مبروص کی طرح داغدار، مفلوج کی طرح اپاہج اور سڑی ہوئی لاش کی طرح متعفن ہے؛

ہاں میں آپ کے سامنے شاعری ہی کے کیمپ سے آیا ہوں، نہ میں غدار ہوں، نہ خدانخواستہ مغرب زدہ ——— ایسا معلوم

ضرور ہوتا ہے کہ کچھ شعر کہنا اور سمجھنا جانتا بھی ہوں۔ میری طرف سے اس وہم میں نہ پڑیئے کہ میری نظریں اپنی شاعری کے اُن نغز آفریں نازک پہلوؤں پر نہیں ہیں جو دلوں میں اُتر جاتے ہیں لیکن آپ کو غالباً ایک شاعر کی زبان سے یہ سن کر بہت استعجاب ہوگا میں سر دست اپنی قوم میں یہ دیکھنا نہیں چاہتا کہ "دل" دماغ پر غلبہ حاصل کئے رہے۔

"دل" ایشیا کا بہت پرانا اور ہر دلعزیز فرمانروا ہے لیکن حالاتِ موجودہ کی عمرانی اور سیاسی پیچیدگیوں اور عصرِ حاضر کے مقتضیات پر نگاہ کرتے ہوئے میں ایشیا کے اس شریف اور بوڑھے تاجدار کی خدمت میں عرض کروں گا کہ بمراحمِ خسروانہ تھوڑے دن کے لئے، تاج و تخت سے اپنی دست برداری کا اعلان کر دے۔

ہر چند یہ مشورہ دیتے ہوئے "دل را بدل رہیست" کے مطابق خود میرا دل بھی درد محسوس کرتا ہے، لیکن زندگی کی ضرورتیں جب ہٹ پر آجاتی ہیں، تو ان کے قدموں پر دل و جان دونوں کو نچھاور کر دینا پڑتا ہے۔ اور اس وقت ہندوستانی زندگی کی ضرورتیں جان و دل ہی کی قربانی کیلئے مچلی ہوئی ہیں۔

میں حیران ہوں کیا واقعی آپ نہیں دیکھتے کہ ہندوستان ننگا اور بھوکا ہے، دانے دانے کو ترس رہا ہے؛

کیا آپ کے علم میں یہ اب تک نہیں آیا ہے کہ اکثر و بیشتر ہندوستانی مائیں، بھوک سے تنگ آکر اپنے کلیجے کے ٹکڑوں کو خود اپنے ہی ہاتوں سے ذبح کر ڈالتی ہیں؛

کیا آپ کو نہیں معلوم ہے کہ ہر سال آپ کے کتنے گریجویٹ بے روزگاری سے گھبرا کر زہر کھا لیتے ہیں؛

کیا آپ نہیں دیکھتے، آپ کی عورتیں مدقوق، جاہل اور فنِ تربیتِ اولاد سے قطعی بیگانہ ہیں۔

کیا آپ کو نظر نہیں آتا ہے کہ آپ کے نوجوانوں کے چہرے اُترے ہوئے ہیں، جن پر خون کی ایک چھینٹ بھی نہیں؛

اور کیا واقعی آپ کو اس حقیقتِ کبریٰ کی اس لمحے تک خبر نہیں ہے کہ دوسری قومیں تو اجنبی اور غیر ممالک میں بھی عزت و احترام کی نظروں سے دیکھی جاتی ہیں، اور آپ ہیں کہ خود اپنے وطن، بلکہ گھر کے اندر اور اپنے بال بچوں کے سامنے جانوروں سے زیادہ حقیر و ذلیل ہیں؛

کیا یہ سچ ہے کہ آپ کو شرم نہیں آتی؛ کیا یہ واقعہ ہے کہ آپ کی خودداری کا معیار عبرتناک حد تک پست ہے؛

اور کیا یہ خبر صحیح دی گئی ہے کہ آپ ع "با درد بساز دہیچ درماں مطلب" پر عمل پیرا ہو کر، ان تمام ذلتوں اور توہینوں سے مصالحت فرما چکے ہیں؛ خیر، یہ صحیح ہو، یا غلط ——— میں ایک مدت سے سنتا چلا آ رہا ہوں کہ ہر قوم کے ادیب اور شاعر انتہا درجے کے حساس، خوددار اور غیور ہوا کرتے ہیں، اگر میرے ہندوستان میں بھی یہی ہے تو میں اپنے شاعروں اور ادیبوں کے سامنے دو زانو ہو کر گڑ گڑاؤں گا کہ خدارا اپنے ادب میں عظیم انقلاب پیدا کر کے ہند کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو خونی گرداب کے خون آشام دانتوں

سے چھڑا لیجئے، جلد چھڑا لیجئے ورنہ کشتی ڈوب جائے گی۔ اور شباب و محبت کا واسطہ اپنے ادبیات میں حیات و بیداری کا خون دوڑا دیجئے، اور وطن عزیز کے لئے دلوں کی طرح دھڑکتے ہوئے زندہ الفاظ کو جوڑ کر ایک نیا باب الہند تیار کیجئے، جس کی سنہری اور بلند محراب کے نیچے سے زندہ کر دینے والے انقلابات کے نُقرئی جلوس، فوج در فوج، اور قطار اندر قطار ہندوستان میں داخل ہونا شروع ہو جائیں۔

یاد رکھئے ایک صحیح جُنبشِ قلم، ستر ہزار برہنہ تلواروں کے مقابلے میں زیادہ کارآمد آلۂ جنگ ہے۔

میں آخری بار پھر یہی کہوں گا کہ جو کچھ کہنا ہے جلدی کہئے، جو کچھ کرنا ہے جلدی کیجئے ورنہ :—

کی گئی ناوقت قربانی تو پھر کیا فائدہ؛ سر سے اُونچا ہو گیا پانی تو پھر کیا فائدہ؛

(جوش)

"کلیم"

دادی پوتی

"ڈاڈی اماں ڈاڈی اماں تم کدھر ہے"۔

دادی۔ (غور سے دیکھ کر) "آؤ بیٹی فریدہ"

پوتی۔ "ڈاڈی اماں! فریڈہ مت بولو مس فریڈہ ریاض علی بولو"

دادی۔ "بیٹی ریاض علی تو تیرے باپ کا نام ہے۔ تو کب سے ریاض علی ہو گئی"؛

پوتی۔ "تم پرانا ہو گیا تمہاری اکل بھی کھراب ہو گئی تم یہ نہیں سمجھ سکتا"۔

دادی۔ "سچ کہتی ہے بیٹی میری عقل خراب ہو گئی ہے (متعجب ہو کر) یہ کیا میری بیٹی تیرے ہونٹ اور گلے اس قدر سرخ کیوں ہو رہے ہیں؟ کیا کہیں چوٹ لگ گئی؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کسی چیز کی رگڑ لگی ہے"۔

پوتی۔ "تم نہیں جانتا ڈاڈی اماں! اس کو لپسٹک اور سرخی بولتے ہیں۔ تم پان کھاتا ہے۔ ہم پان کھا کر ڈانٹ کھراب نہیں کرتا یہ کمسوبصورتی کے لئے لگایا جاتا ہے"۔

دادی۔ (کچھ پریشان سی ہو کر) "لے ہے فریدہ۔ تیرے بالوں کو کیا ہو گیا! کیا میری بچی کچھ بیمار ہو گئی تھی"؟

پوتی۔ "ڈاڈی اماں تم کو کیا ہو گیا ہے، جانوروں کے دُم ہوتی ہے انڈین عورتوں نے بھی کتے بلی کے موافق (موافق) اپنی دُم بنالی ہے۔ ہم جانور تھوڑی ہے جو دُم لگائے"۔

دادی۔ "ہاں بیٹی تو جو کہے وہ ٹھیک ہے۔ عورتوں کی خوبصورتی ہی بالوں سے ہے لیکن تو چوٹی کو دُم کہتی ہے (پوتی کو سردی سے کانپتا دیکھ کر) اچھی میری بچی! یہ تو نے کیسا ننگا لباس پہنا ہے۔ اونی بغلیں تک کھلی ہیں۔ سردی کا یہ عالم ہے کہ خون جما جا رہا ہے اور تو یہ باریک کرتی ہی پہنے ہے!!"

بڑی بی لپک کر جاتی ہیں اور صندوق میں سے اپنی روئی کی صدری لاتی ہیں۔ "لے بیٹی یہ پہن لے ابھی گرم ہو جائے گی"۔

پوتی۔ (غصہ سے دیکھ کر) "ڈاڈی اماں تم نے ہمارا ناک میں دم کر دیا اسی لئے تو ہم تم لوگوں سے ملنے میں گھبراتا ہے۔ بس اب ہم جاتا ہے اور آئندہ کبھی تمہارے پاس نہیں آئے گا"۔

دادی۔ (پوتی کو جاتا دیکھ کر) "ارے میری بچی یہ ہیلی جوتی کس نے تجھے لادی۔ لے میری جوتی پہن جا۔ چاہے واپس مت کریو۔ اری دیوانی گر جائے گی"۔

دادی ایک ہاتھ میں جوتی اور دوسرے ہاتھ میں صدری لئے ہوئے پوتی کے ہر ہر قدم پر الٰہی خیر الٰہی خیر کی صدا میں لگاتی ہوئی دوڑتی ہیں۔ پوتی بسم اللہ اور الٰہی خیر کی آوازیں سن کر اپنی جوتی کی طرف دیکھتی ہوئی کھٹ کھٹ کرتی ہوئی کار میں بیٹھ چلی جاتی ہے۔

"عصمت"

مطبوعات

مرحوم دہلی کالج - یہ جناب مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اُردو کا وہ طویل اور دلچسپ مضمون ہے جو اردو کی کئی اشاعتوں میں شایع ہوا اور اب کتاب کی صورت میں مرتب ہو چکا ہے - یہ دہلی کالج کا تذکرہ ہی نہیں بلکہ غدر کے بعد ہماری ادبیات کی جامع اور پُر از معلومات تاریخ بھی ہے ، اس کے علاوہ اردو کی ترقی اور نشو ونما کے متعلق اس میں بہت سی بیش قیمت معلومات درج ہیں - آپ کتاب میں ان ہندو اور مسلمان ادبا کے متعلق بھی مختصر اشارات ہیں جن میں سے اکثر نے غدر کے بعد ہماری زبان کو بچایا اور جنہوں نے دہلی کالج میں تعلیم پائی - قیمت عمر ، پتا :- انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن -

اُردو کا پہلا ناول نگار - مصنفہ اویس احمد صاحب ادیب بی اے آنرز - یہ کتاب ۱۹۳۲ء میں ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد سے انعام کی مستحق قرار دی گئی تھی - مصنف کے نزدیک اُردو کے پہلے ناول نگار مولانا نذیر احمد مرحوم ہیں اور یہ حقیقت بھی ہے - موجودہ کتاب میں مولانا کے حالاتِ زندگی ، اُنکے ناولوں کا تذکرہ اور اُن پر تنقید درج کی گئی ہے کتاب قابلِ قدر ہے - قیمت عہ ، پتا :- مسٹر اویس احمد ادیب ، مادھو گنج ، کٹرہ روڈ - الہ آباد -

بہاء اللہ اور عصرِ جدید - مصنفہ جے - ای - اسلمنٹ مترجمہ جناب عباس علی صاحب بی اے - یہ بابی تحریک اور اس کی ابتدا و ارتقا کے متعلق ایک جامع کتاب ہے - اس میں بہاء اللہ کی پیدائش زندگی اور تعلیم سے بہت سیر حاصل بحث کی گئی ہے قیمت عمر پتا :- دفتر بہائی میگزین کشمیر بلڈنگ لاہور -

چند تنقیدی مضامین - مصنفہ سید حامد حسن صاحب بلگرامی ریسرچ سکالر الہ آباد یونیورسٹی - جناب حامد حسن صاحب اردو ادب کے نوجوان نقادوں کی صفِ اولیں میں جگہ رکھتے ہیں اُن کا ایک مضمون "منظر نگاری کی ابتدائی ترقی مصحفی و قدرت سے میر حسن تک" ہمایوں میں بھی چھپ چکا ہے - موجودہ کتاب میں اس مضمون کے علاوہ حسبِ ذیل مضامین درج ہیں :- رہنمایانِ اسالیب ، نواب محسن الملک کا اندازِ بیان ناول کیا ہے ، رسوا کا ایک ناول امراؤ جان ادا ، سب مضامین پڑھنے کے قابل ہیں مصنف سے نمبر ۱۲ بیلی روڈ الہ آباد کے پتے سے منگائیے قیمت درج نہیں -

آیاتِ وجدانی - یہ جناب مرزا یگانہ چنگیزی صاحب کے مجموعۂ کلام کا دوسرا ایڈیشن ہے جو بہت اچھی کتابت و طباعت کے ساتھ دوسری مرتبہ شائع ہوا ہے مرزا یاس مشہور قادر الکلام شاعر ہیں اور فنِ عروض میں بھی دستگاہ رکھتے ہیں - انکے کلام سے اردو رسائل کے پڑھنے والے بخوبی واقف ہیں اسلئے موجودہ کتاب ہر قسم کے اظہار رائے سے بے نیاز ہے قیمت مجلد عہ ، اُردو بک سٹال لوہاری دروازہ لاہور سے طلب کیجئے -

حقیقتِ جاپان - یہ شیخ بدر الاسلام صاحب فضلی بی اے علیگ کی دلچسپ اور مفید کتاب ہے جو انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن نے شائع کی ہے کتاب دو حصوں میں منقسم ہے پہلا حصہ سیاحت سے متعلق ہے جس میں جاپان کے قابلِ دید مقامات اور شہروں کا ذکر ہے دوسرے حصے میں جاپان کے تمدن اور معاشرت سے مفید بحث کی گئی ہے - جگہ جگہ تصویریں بھی ہیں جنہوں نے کتاب کو اور دلچسپ بنا دیا ہے قیمت مجلد عہ -

ہندو اخلاقیات ۔ مصنفہ جی لے چنداورکر بی اے مترجمہ جناب مولوی غلام جیلانی صاحب ۔ اس کتاب میں ہندوؤں کی قدیم تاریخی و مذہبی کتابوں کے حوالے سے اُن کی اخلاقیات پر بالغ نظرانہ روشنی ڈالی گئی ہے ۔ کتاب بہت پُر از معلومات ہے اور مطالعہ کے قابل ہے۔ قیمت عہ
پتا :۔ پرفیکٹ اینڈ کو کتب فروش ریزیڈنسی بازار حیدرآباد دکن ۔

تنقیداتِ عبدالحق ۔ یہ اردو زبان کے محسن مولوی عبدالحق صاحب معتمدِ انجمن ترقی اردو کی اُن چھپی ناقدانہ تحریروں کا مجموعہ ہے جو مختلف کتب کے متعلق صاحبِ موصوف کے قلم سے اُن کے مقدمے کے سلسلہ میں شائع ہوتی رہیں ۔ گویا اس طرح یہ کتاب صرف اردو کی بہت قابلِ ذکر کتابوں سے تعارف ہے بلکہ ایک مستقل انتقاد و ادب کی بیش بہا معلومات آراء اور طریقۂ اظہار سے بھی روشناس کرتی ہے۔ قیمت عہ ۔ پتا :۔ کاشانہ بازار سلطان بازار گھانسی حیدرآباد دکن ۔

رسائل

"کلیم" ۔ حضرت جوش ملیح آبادی کا ماہوار رسالہ "کلیم" جس کا اہلِ ادب کو بیتابی سے انتظار تھا آخر شائع ہوگیا ۔ پہلا پرچہ جنوری ۱۹۳۶ء کا ہے جو بڑی تقطیع کے ۲۰ صفحات پر دلکش طرز سے بطور مقدمہ کاغذ پر بہ حسن اہتمام طبع ہوا ہے ۔ مضمون نگاروں میں علامہ کیفی دہلوی ، منشی پریم چند اور حضرت سیماب اکبرآبادی کے علاوہ بہت سے دیگر بلند پایہ ادیبوں کے نام شامل ہیں ۔ خود حضرت جوش نے "روداد بیات میں انقلاب کی ضرورت" کے عنوان سے ایک ہنگامہ خیز مضمون لکھا ہے جس کا کچھ اقتباس ہمایوں کی موجودہ اشاعت کے بزمِ محفلِ ادب میں درج ہے ۔ یہ مضمون دراصل رسالے کے مقاصدِ اجرا کی کلید ہے ۔ ہمیں یقین ہے کہ حضرت جوش کا ہمہ گیر اثر اور ان کی انقلاب انگیز تحریریں اردو ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کریں گی جس سے ہماری سیاست ، معاشرت یکساں متاثر ہوگی ۔ موجودہ پرچے میں "اردو کی تنظیم" ، "قومی اتحاد کیونکر ہوسکتا ہے" ، غزل گوئی وغیرہ پر ایک نظر وغیرہ قابلِ قدر مضامین ہیں ۔ نظم کا معیار کبھی قدرتاً بلند ہے ۔ ہمیں اُمید ہے کہ اہلِ ذوق اس پرچے کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے ۔
چندہ سالانہ دس روپے ۔ پتا :۔ مینیجر "کلیم" دہلی ۔

فاران ۔ یہ پرچہ مولوی محمد مجید حسن صاحب مالک مدینہ بجنور نے جاری کیا ہے اور اپنے مخصوص مباحث کے اعتبار سے دوسرے رسائل سے الگ روش پر چلتا ہے ۔ عام موضوعات ، مذہبی و تاریخی مباحث اور اُن کے ساتھ سیاست کی کچھ چاشنی بھی ہے ۔ یہ رسالہ ماہانہ ہے ۔ پتا :۔ مینیجر فاران بجنور ۔

عربک کالج میگزین ۔ دہلی ۔ مرتبہ جناب صادق الخیری صاحب دہلوی ۔ یہ کالج کا رسالہ ہے لیکن حسن ترتیب اور دلچسپی کے اعتبار سے اچھے ادبی رسائل کا ہم پایہ ہے ۔ اس کامیابی کے لیے صادق الخیری صاحب مستحق مبارکباد ہیں ۔

تصاویر

روح اور بدی

یہ تصویر جیمز کلارک کی صناعی کا نمونہ ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ انسانی روح جو الوہیت کے خواب دیکھتی ہے اور پستی سے بہت بلندی کی طرف جانا چاہتی ہے دنیا کی آلودگیوں کے نرغے میں پھنسی ہوئی ہے اور رفعت کی ان چوٹیوں پر نہیں پہنچ سکتی جن پر اس کی نظر ہے۔ وہ زندگی اور امن کی تلاش میں ہے لیکن بدی اُسے اپنے زبردست ہاتھوں سے پستی موت اور بےاطمینانی کی طرف کھینچ رہی ہے۔

ہٹلر اور مسولینی

موجودہ تصویر میں جرمنی کا مختارِ مطلق ہٹلر اپنے نازی گروہ میں کھڑا ہوا زندہ دل نظر آرہا ہے لیکن یہ زندہ دلی صرف اپنوں کیلئے ہے ورنہ دل شخص دوسروں اور بالخصوص یہودیوں کے لئے قہرِ الٰہی سے کم ثابت نہیں ہوا۔ اس کے مقابلہ میں اطالوی آمر مسولینی کی تصویر میں متانت نظر آتی ہے لیکن جب یہ متین شخص بھی اپنے فاشی گروہوں میں کھڑا ہو کر نتھنے پھُلاتا اور گلا پھاڑتا ہے تو ہلاکت و بربادی کا باب حضرت بن جاتا ہے۔

بچپن اور بڑھاپا

یہ آرٹ کی تصویریں نہیں بلکہ کیمرے کی تصاویر ہیں۔ بچے کے چہرے کی تازگی اور بوڑھے کے چہرے کی یبوست اور جھُرّیوں کے علاوہ ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے۔ بچہ کی نظر بلندی کی طرف ہے۔ گویا زندگی اپنے مستقبل کی طرف دیکھ رہی ہے لیکن بوڑھے کا جھُکا ہوا چہرہ اور نگاہیں سفر کے خاتمے کی خبر دے رہی ہیں۔

فطری اور مصنوعی تناسب

قدرت اور انسان کے بنائے ہوئے ان ستونوں کے عمودی خطوط میں یکساں عظمت اور اسرار کی شان نمایاں نظر آتی ہے۔ کیا انسان کی صنعت قدرت کی کسی نہ کسی صنّاعی کی نقل نہیں؟

جھُولا

یہ تصویر بھی فوٹوگرافی کے کمالات کا ایک نمونہ ہے۔ جھُولا ہر ملک میں مقبول ہے اور قدیم ہندوستان میں تو اسے خاص اہمیت حاصل تھی۔ پُراسرار جھولا ہمیں کسی نامعلوم دنیا میں لے جاتا ہے ——— شاید کسی خواب کی وادی میں۔ اور جب ہم نیچے اترتے ہیں تو ہماری آنکھ کھل جاتی ہے۔

"ح"

ہمایوں کی سالگرہ کی خوشی میں کتابوں کا رعایتی

اعلان

اس اعلان کے بعد ۳۱ جنوری ۱۹۳۶ء تک "ہمایوں" کے موجودہ اور نئے سال کے خریداروں کو میاں بشیر احمد صاحب مدیر "ہمایوں" کی مشہور کتاب "طلسم زندگی" پانچ روپے کے بجائے صرف تین روپے (علاوہ محصول) میں ملے گی۔

جرائد و اکابر کی آرا

"زمیندار" لاہور۔ اردو زبان میں اس اہتمام سے شاید ہی کوئی ادبی کتاب شائع ہوئی ہو۔

"ریئیہ" بجنور۔ اس کتاب کو یورپ کی حسین ترین کتاب کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

خان بہادر میاں عبدالعزیز صاحب کمشنر انبالہ۔ کتابوں کتابوں میں اگر عشق ہوتا تو میری الماری کی تمام کتابیں اس کتاب کی پیاری سی صورت پر جان دے دیتیں۔

افسانہائے عشق (مجلد ۲ مصور)

موجودہ اعلان کے بعد ۳۱ جنوری ۱۹۳۶ء تک خریداران "ہمایوں" کو افسانہائے عشق مجلد سنہری ۱۲ کے بجائے ۸ مع محصول میں اور غیر مجلد ایک روپیہ مع محصول میں ملے گی۔

زمیندار۔ ان میں سے بعض افسانے دنیا کے بہترین افسانوں میں شامل ہونے کے قابل ہیں الفاظ میں رس اور لوچ ہے اور بعض مقامات پر طبیعت ایک کیفیت اہتزاز محسوس کرتی ہے۔ **معارف**۔ ان افسانوں کے تراجم میں جو لطافت شیرینی اور شعریت کے ساتھ جو سلاست سادگی روانی اور دلکشی دیکھنے میں آئی وہ اردو کے مترجم افسانوں میں کم دیکھنے میں آتی ہے۔

ساقی دہلی۔ اتنے برجستہ اور مترنم الفاظ استعمال کئے ہیں کہ انگریزی بھی اردو کا منہ تکتی رہ جاتی ہے۔

ادبی دنیا۔ اپنے دلکش طرز ادا سے اصل مصنفین کی مقبولیت میں اضافہ کر دیا ہے۔

ہندوستانی الہ آباد۔ اگر پہلے سے معلوم نہ ہو تو مشکل سے اسے ترجمہ کہا جا سکتا ہے۔

علی گڈھ میگزین۔ تحریر میں وہی سوز و گداز اور الفاظ کا وہی استعمال ہے۔ جو ٹیگور کو ممتاز بناتا ہے۔ **اردو** ترجمہ بہت ستھرا اور پاک صاف ہے۔

نگار۔ ترجمہ میں جتنی کامیابی حامد علی خان صاحب کو ہوئی ہے۔ اردو مشکل ہی سے کسی دوسری جگہ نظر آ سکتی ہے۔

حامد کے سو شعر

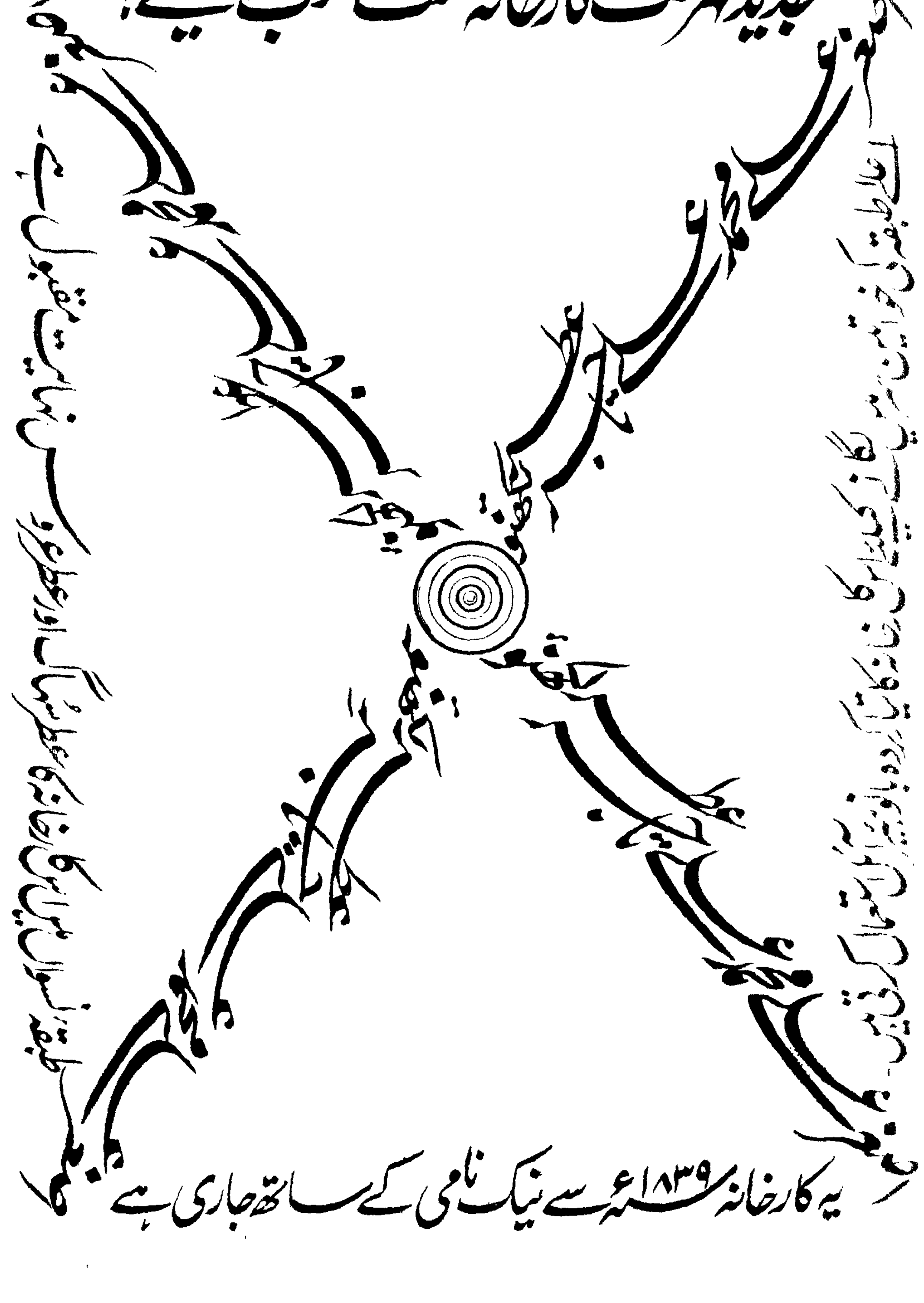
۳۱ جنوری ۱۹۳۶ء تک قیمت ۶ر کے بجائے چار آنے (علاوہ محصول) چکنے کاغذ پر نفیس سرورق کے ساتھ رنگین چھپی ہے۔

حضرت عدم حامد کے سو شعر آپ کے بلند اور غیر فانی نظریہ ذہنیت کی وضاحت کرنے والی ہے۔ یہ ننھی منھی حسین و جمیل کتاب بڑے بڑے مبسوط دیوانوں پر ایک طنز کامیاب ہے۔

حضرت ریاض عباسی۔ اساتذہ متقدمین کے نزدیک شعر کا معیار کمال ندرت معانی اور متاخرین کے نزدیک سحر کاری الفاظ ہے۔ حامد کے سو شعر میں یہ دونوں خوبیاں جمع ہو گئی ہیں۔

مینجر "ہمایوں" ۲۳ لارنس روڈ لاہور

جدید فہرست کارخانہ مفت طلب فرمائیے!



یہ کارخانہ ۱۸۳۹ء سے نیک نامی کے ساتھ جاری ہے

قواعد

۱۔ "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲۔ علمی وادبی، تمدنی واخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اُتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ۱/ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم ازکم بہتر صفحے ماہوار اور سوا نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہئے
اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

۸۔ جواب طلب امور کے لئے ۱/ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہئے۔

۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے چھ آنے ششماہی تین روپے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۸/

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتا تحریر کیجئے۔

۱۱۔ خط وکتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافے پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھئے۔

مینیجر رسالہ ہمایوں
۲۳۔ لارنس روڈ لاہور

10766/3

Title and Picture Printed at the Halftone Press, Ram Nagar, Lahore.

جنوری ۱۹۴۳ اپریل

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگارِ علامہ فضیلت آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہُمایُوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔ اے

جلد ۲۹

فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہ اپریل سنہ ۱۹۳۶ء

نمبر ۴

تصاویر: (۱) احاطۂ اُستاد ذوق (۲) ذوق کی قبر (۳) مدفن مرزا غالب (۴) غالب کی قبر

چندہ سالانہ [illegible] ششماہی [illegible] مع محصول — قیمت فی پرچہ ۸ [illegible]

"بزمِ ہمایوں"

"ہمایوں" کا انعامی مضمون

گذشتہ مہینے ہم نے اعلان کیا تھا کہ جو صاحب "اردو کا بہترین شاعر" کے موضوع پر بہترین مضمون لکھ کر ہمیں بھیجیں گے ان کی خدمت میں بیگم محمد رفیع صاحبہ کی طرف سے پچاس روپے کی رقم بطورِ انعام پیش کی جائے گی۔ مضمون نگار کے لئے مارچ کے اعلان میں درج شدہ قواعد کی پابندی لازم ہوگی۔ ہمیں توقع ہے کہ اہلِ قلم حضرات اس دلچسپ انعامی مقابلے میں دل کھول کر حصہ لیں گے۔ مضامین ۲۵ اپریل تک دفتر "ہمایوں" میں پہنچ جانے چاہئیں۔

"ہمایوں" کو جاری ہوئے پندرھواں سال گزر رہا ہے۔ پندرہ سال کی اس مدت میں ہم نے "ہمایوں" کو مفید، دلچسپ، پاکیزہ اور پُر از معلومات بنانے کے لئے اپنی ناچیز مساعی متواتر جاری رکھی ہیں۔ اب کچھ عرصہ سے "ہمایوں" کو اور زیادہ مقبولِ عام بنانے کے لئے ہم نے دلچسپ مضامین کا عنصر اور بڑھا دیا ہے تاکہ "ہمایوں" کی آواز زیادہ سے زیادہ کانوں تک پہنچ سکے۔ ہماری کوشش یہ ہے کہ علمی، تاریخی، تمدنی اور سیاسی مضامین بھی حتی الامکان دلچسپ ترین انداز میں پیش کئے جائیں۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ ان سے ہر شخص فائدہ اُٹھا سکے۔ معیار کی بلندی کو قائم رکھتے ہوئے رسالہ کو دلچسپ اور عام فہم بنانا ایک مشکل کام ہے جو اگر سرانجام پا جائے تو اُردو کی بہت بڑی خدمت ہو سکتی ہے۔ یہ امر آسان نہیں۔ اس لئے ہم اپنے اہلِ قلم سے اعانت کی التجا کرتے ہیں۔

خواجہ حسن نظامی صاحب نے اپنے روزنامچہ میں **ہمایوں کا کمال** کے عنوان سے ذیل کی سطور لکھی ہیں جنہیں ہم شکریہ کے ساتھ منادی سے نقل کرتے ہیں:-

"آج میں نے سر یعقوب کی پارٹی میں بیگم میاں محمد رفیع سے کہا کہ آپ کے بھائی میاں بشیر احمد صاحب ایڈیٹر ہمایوں نے میرا مضمون آسمان کی آواز ایسی قابلیت سے شائع کیا کہ میرا دل باغ باغ ہو گیا۔ انہوں نے ایک صفحہ پر تین تصویریں شائع کی ہیں۔ اوپر راجہ بیربل اور شہنشاہ اکبر کی تصویر ہے اور وسط میں ٹیگور کی تصویر ہے اور نیچے میری تصویر ہے۔ میرا مضمون اس طریقے سے باتصویر بن گیا۔ میاں بشیر احمد کی ذہانت اور ادبی لیاقت تو شہرہ آفاق ہے۔ ان کا رسالہ ہمایوں اردو ادب کے رسالوں میں سب سے زیادہ اچھے مضامین شائع کرتا ہے۔ اور اس کی ترتیب بے مثل ہوتی ہے۔"

جہاں نما

جمہوریت، "آمریت" اور انگلستان

یورپ کی بعض بڑی بڑی جابر یا حکومتیں جن کی بنیاد کسی نہ کسی قسم کے جمہوری طرز پر تھی دیکھتے دیکھتے خودمختار آمروں کے ہاتھ میں چلی گئی ہیں۔ اس سے متاثر ہو کر بعض لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ آہستہ آہستہ جمہوریت کی ہر شکل "آمریت" کا چولا پہن لے گی۔ آمریت کے حامیوں کا خیال ہے کہ جمہوری طرز حکومت کی عملی حیثیت بہت کمزور ہے۔ اس کی مثال یہ دی جاتی ہے کہ کسی بالائی حکم کی تعمیل آسان لیکن ضبط النفس کا کام بہت مشکل ہوتا ہے کسی شخص کو بحث مباحثہ اور دلیلوں کے ساتھ کسی کام پر آمادہ کرنا آسان نہیں لیکن وہی کام حکم دے کر اس سے بآسانی لیا جاسکتا ہے اور اس طرح بہت سا وقت بھی فضول بحث میں ضائع ہونے نہیں پاتا۔ کہتے ہیں کہ اس انقلابی زمانے میں جب دنیا سالوں کا راستہ دنوں میں طے کر رہی ہے کسی ملک کے لئے ترقی کے میدان میں اپنے ہمسایوں کے ساتھ قدم بہ قدم چلنے کے لئے ضروری ہے کہ بحث مباحثہ میں زیادہ وقت نہ لگے اچنانچہ دلیل کے بجائے طاقت کی حکومت بہت سا وقت بچا دیتی ہے۔

مشکل یہ ہے کہ "آمریت" کے حامی اس کی خرابیوں کی طرف نہیں دیکھتے۔ انتخاب میں غلطی کا امکان بھی ہوتا ہے۔ اگر کوئی غلط قسم کا آمر ایک دفعہ طاقت پکڑ لے تو پھر انقلاب کے سوا کسی اور طریقے سے اس سے نجات حاصل نہیں کی جاسکتی۔ خواہ وہ دیوانوں کی سی حرکتیں ہی کیوں نہ کرنے لگے۔ آمر اور اس کی حکومت جمہور کی طرف سے اپنی کارروائیوں پر کسی قسم کی نکتہ چینی گوارا نہیں کرتے۔ اخباروں اور جلسوں کے ذریعہ سے آمر کی حکومت کے کسی رکن کے کسی کام کے متعلق آزادی سے رائے کا اظہار ہی نہیں ہوسکتا بلکہ اخبارات کو اس کی مرضی کا تابع ہونا پڑتا ہے۔ گویا آمر کے ساتھ اس کی حکومت کے دوسرے رکن بھی سخت گیر دفتری حکومت کا بدترین نمونہ بن جاتے ہیں اور اخبارات اور رائے عامہ کی آواز سخت گیری کے اس طوفان میں دب جاتی ہے۔

جن ملکوں میں جمہوریت کی جگہ آمریت کا دور دورہ ہوگیا ہے ان کے جمہوری نظام حکومت کے قیام کو دو بڑی مشکلوں کا سامنا تھا پہلی یہ کہ نظام حکومت تحریری ضابطوں کا پابند تھا اور وقت کی ضرورت کے لحاظ سے اس میں تبدیلی نہیں کی جاسکتی تھی۔ یوں کہئے کہ نظام حکومت "لچکیلا" نہ تھا کہ حسب ضرورت موڑا توڑا جاسکتا بلکہ جامد تھا۔ دوسری مشکل یہ تھی کہ ارباب حکومت کو رائے عامہ کی کوئی مستقل اکثریت حاصل نہ ہوتی تھی۔ اکثریت بنتی بھی تھی تو پھر جلد ٹوٹ جاتی تھی کیونکہ رائے عامہ کو جمہوری حکومت کا پختہ کارانہ تجربہ نہ تھا۔ مثال کے طور پر جرمنی کے جمہوری نظام حکومت کو لیجئے۔ یہ بجائے خود قابل تعریف تھا لیکن ناتجربہ کاری کی وجہ سے جرمن اس سے کام نہ لے سکے۔ وہی مثل

نئے کوئی موٹر کار خواہ کتنی ہی نفیس کیوں نہ ہو لیکن جب تک چلانے والا ماہر نہ ہو اس سے کام نہیں لے سکتا۔

یہ خیال کہ جمہوری حکومت میں کام کی رفتار ضرور ہی سُست ہوتی ہے ٹھیک نہیں۔ اگر کسی ملک کی رائے عامہ پختہ ہو چکی ہو تو ایسی دشواری پیش نہیں آتی۔ مثلاً انگلستان میں "آمریت" قائم ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔

جس زمانے میں پارلیمنٹ نے طاقت حاصل کی تھی لوگ بادشاہ کی خود مختاری کے سخت مخالف تھے۔ چنانچہ انہوں نے حکومت کے کام پر آزادی سے بحث کرنے کے لئے پورے پورے اختیارات حاصل کر لئے لیکن یہ اختیارات کام کے راستے میں کوئی روڑا نہیں اٹکاتے اور اگر دارالعوام میں قابلِ ذکر اکثریت ایک طرف ہو جائے اور دارالامراء کوئی رُکاوٹ نہ ڈالے تو معاملہ بہت جلدی طے ہو جاتا ہے۔ انگلستان میں کسی ایک جماعت کے مستقلاً حکومت پر قابض ہو جانے کے خطرے کا حل میعادی طریق انتخابات سے کر لیا گیا ہے۔

انگلستان کے نظامِ حکومت کا "نانوشتہ" اور "لچکیلا" ہونا اس کی کامیابی کا ضامن ہے کیونکہ یہ حالات کے تقاضے کے مطابق موڑا توڑا جا سکتا ہے۔ مثلاً جنگ کے زمانے میں بہت سے وقتی ضابطے رائج کر لئے گئے تھے اور بہت سے نئے عہدے بھی قائم ہوئے تھے۔ ان باتوں کے لئے انگلستان کو کوئی غیر آئینی کارروائی نہ کرنی پڑی تھی بلکہ حکومت کی پرانی ہی کل میں حسبِ ضرورت نئے پرزے ڈال لئے گئے تھے جو خود بخود اچھی طرح کام کرنے لگے۔ دراصل دوسرے ملکوں کو جمہوری نظام کے ماتحت کام کرنے کا تجربہ ہی نہ تھا۔ انگلستان کی تجربہ کاری کی ایک دلیل یہ ہے کہ وہاں اقلیت میں اکثریت کے فیصلے کو بہت جلد مان لینے کی صلاحیت موجود ہے۔ دوسرے ملکوں میں یہ بات نہ تھی۔

پارلیمنٹ کے ایک رُکن نے خوب کہا ہے کہ انگلستان کو کسی آمر کے سپرد کرنا ایسا ہی ہے جیسا کسی کھائے کھیلے بوڑھے کو پالنے میں ڈال کر دایہ کے سپرد کر دینا۔

طیاروں کی بعض یادگار پروازیں

تاریخ	ہوا باز	فاصلہ	وقت	طیارہ
۱۷ دسمبر ۱۹۰۳ء	آرول رائٹ	۸۵۰ فٹ دنیا میں طیارے کی اوّلیں پرواز	۵۹ سیکنڈ	۱۲ گھوڑوں کی طاقت کا رائٹ بائی پلین
۲۵ جولائی ۱۹۰۹ء	لوئی بلیرائے	۲۶ میل پہلا ہوائی جہاز جس نے رود بار انگلستان کو عبور کیا۔	۳۷ منٹ	۲۵ گھوڑوں کی طاقت کا بلیرائے مانوپلین
اپریل ۱۹۲۹ء	جے ہنری ولیمز اور این ایچ جنکنز	۴۱۳۰ میل انگلستان سے ہندوستان مسلسل پرواز	½۵۰ گھنٹے	فیرے نیپیر مانوپلین

مئی ۱۹۳۰ء	مس ایمی جانسن	۹۹۰۰ میل انگلستان سے آسٹریلیا تک غیر مسلسل پرواز۔ آسٹریلیا تک ایک نسوانی ہواباز کی پہلی پرواز۔	۱۹ دن	موتھ لائٹ ایروپلین
اپریل ۱۹۳۵ء	مس جین بیٹن	۱۰،۰۰۰ میل آسٹریلیا ـــ انگلستان ۔غیر مسلسل پرواز۔ (مس بیٹن ۱۹۳۴ء میں ۱۴ دن کی پرواز سے آسٹریلیا پہنچیں اور ۱۹۳۵ء میں آسٹریلیا سے بذریعۂ پرواز تنہا انگلستان واپس آکر نسوانی ہوابازوں کی تاریخ میں ایک نیا کارنامہ دکھایا)	۱۷ دن ۱۵ گھنٹے ۱۵ منٹ	ڈی ایچ موتھ جپسی انجن

خواتین کی بین الاقوامی کانفرنس

خواتین کی بین الاقوامی کانفرنس اس سال کلکتہ میں ہوئی ۔ اس کانفرنس میں مختلف ملکوں کی انجمنوں کی طرف سے نمائندہ خواتین شامل ہوئیں۔ کانفرنس کی صدارت مہارانی صاحبہ بڑودہ نے کی ۔ لیڈی عذرا نے نمائندہ خواتین کا خیرمقدم کیا اور کہا کہ ہمارے نظام عمل سے ہمارے کام اور ہمارے مقاصد کی وسعت ظاہر ہوگی۔

لیڈی ولنگڈن کی طرف سے کانفرنس کو یہ پیغام پہنچا کہ بین الاقوامی غلط فہمیوں اور بے اعتمادیوں کے رفع کرنے کا سب سے اچھا ذریعہ باہمی مفاہمت ہے جس سے ہماری بہت سی مشکلیں حل ہو جائیں گی اور اس مفاہمت کا بہترین ذریعہ ایسی کانفرنسیں ہیں ۔

مہارانی بڑودہ نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا :۔

"یہ بات کہ آج ہم دنیا کی مختلف قوموں کی نمائندہ خواتین کا خیرمقدم کر رہے ہیں ہمیں اس فرض کا احساس کرانے کے لئے کافی ہے کہ ہمیں اپنی لڑکیوں کو ایسی تعلیم دینی چاہئے جس سے ان کا شمار ہندوستان ہی کے نہیں بلکہ دنیا کے بہترین شہریوں میں ہونے لگے ہمیں اپنے قومی مقاصد کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی مقاصد کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے"

کانفرنس نے جو قراردادیں منظور کیں ان میں سے بعض یہ ہیں :۔

خواتین کی یہ بین الاقوامی کانفرنس ان فلموں کی سختی سے مذمت کرتی ہے جو کسی ملک اور اس کے رسم و رواج کی طرف سے دوسرے ملکوں کی نظر میں نفرت پھیلانے کا باعث ہوتی ہیں ۔ یہ فلمیں ملکوں کے درمیان مفاہمت اور رفاقت کے کام میں سخت رکاوٹ ڈالتی ہیں۔

اس کانفرنس کی رائے میں عورتوں پر سے تمام انفرادی اور اجتماعی جابرانہ قانونی پابندیاں اُٹھ جانی چاہئیں۔ بعض مغربی ممالک میں عورتوں کو حاصل کردہ قانونی حقوق سے محروم کرنے کا جو خیال پیدا ہو رہا ہے اس کانفرنس کی نظر میں نہایت افسوسناک ہے۔

اس کانفرنس کو ہندستانی عورتوں کی اُن کوششوں سے دلی ہمدردی ہے جو انہوں نے جائداد، وراثت، شادی وغیرہ کے قوانین میں اپنے حقوق منوانے کے لئے جاری کر رکھی ہیں۔ جدید اصلاحات کے ماتحت ہندوستانی عورتوں کو جو حقوق حاصل ہوئے ہیں یہ کانفرنس ان کے لئے شکرگزار ہے اور اسے توقع ہے کہ ہندوستانی عورتیں اِن حقوق کا پورا پورا استعمال کریں گی۔

سینما کا فروغ

سینما کی ایجاد آج سے تقریباً چالیس سال قبل ہوئی تھی۔ اس قلیل مدت میں اس فن نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ خاموش متحرک تصاویر جب کمال حاصل کر چکیں تو بولتی چالتی تصاویر (ٹاکی) کی ایجاد ہوئی اور ٹاکی کو وہ قبولِ عام حاصل ہوا کہ خاموش تصاویر کا بازار سرد پڑ گیا۔ گذشتہ دس پندرہ سال سے یورپ میں خاموش سینما ٹاکی میں تبدیل کئے جا رہے تھے۔ یہ کام اب تکمیل کو پہنچ چکا ہے اور اب یورپ کے تمام خاموش سینما ٹاکی میں تبدیل ہو چکے ہیں۔

روس اور انگلستان کو چھوڑ کر یورپ میں اس وقت ۱۶۲۰۷ ٹاکی تھیئٹر ہیں۔ اولیت جرمنی کو حاصل ہے جہاں اُن کی تعداد ۴۶۷۴ ہے۔ اس کے بعد فرانس کا درجہ ہے جہاں اُن کی تعداد ۲۷۱۴ ہے۔ پھر سپین کی باری ہے جہاں ۱۵۲۸ ٹاکی تھیئٹر ہیں۔ چیکوسلوویکیا کو اپنے ۱۱۵۰ ٹاکی تھیئٹروں کے ساتھ چوتھی جگہ حاصل ہے۔ گویا آبادی کے تناسب کے لحاظ سے یہ ملک اس معاملہ میں جرمنی کا ہم رتبہ ہے۔ ایک ہزار سے زاید ٹاکی تھیئٹر رکھنے والوں میں آخری ملک اٹلی ہے جہاں ۱۰۵۹ ٹاکی تھیئٹر ہیں۔

جن ملکوں میں ۵۰۰ سے زاید ٹاکی تھیئٹر ہیں ان میں اولیت آسٹریا کو حاصل ہے جہاں ان کی تعداد ۸۰۳ ہے۔ سویڈن میں ...۰۰ اور بلجیم میں ۵۳۹ ٹاکی تھیئٹر ہیں۔ جن ملکوں میں ۵۰۰ سے کم ٹاکی تھیئٹر ہیں ان میں پہلا درجہ پولینڈ کا ہے جہاں ان کی تعداد ۴۴۰ ہے۔ ہنگری اور ڈنمارک میں تین تین سو ٹاکی تھیئٹر ہیں۔

سینما کا موجد۔ سینما کے موجد کا نام لوئی لومیر ہے۔ حال ہی میں سینما کی ایجاد کے چہل سالہ جشن کے موقع پر پیرس کی میونسپل کونسل نے موسیو لومیر کو سپاسنامہ پیش کیا۔ صدر بلدیہ کے اظہارِ تحسین کے بعد سینما کے موجد کو "سٹی آف پیرس" کا طلائی تمغہ دیا گیا۔

سینما کا پہلا تماشا۔ ۱۸۹۵ء میں سینما کے تماشائیوں نے سینما کا پہلا تماشا ایک حجرے میں دیکھا جہاں ۲۰ منٹ تک وہ متحرک تصاویر کے مختلف تماشے دیکھتے رہے۔ ان تماشوں کے موضوع بہت سادہ تھے۔ مثلاً دو بچوں کی لڑائی، لوہار کا دُکان پر کام کرنا، ریل

گاڑی کا چلنا، تاش کی بازی، لائنز میں یوبیز فیکٹری سے مزدوروں کا باہر نکلنا وغیرہ۔ اس پہلے تماشے کی آمدنی ۳۵ فرانک تھی۔ جس کا مقابلہ اگر موجودہ تھیٹروں کے "ستاروں" کی آمد سے کیا جائے تو انسان حیران رہ جاتا ہے۔ رونلڈ کولمین فی فلم ۳۰۰۰۰ پاؤنڈ معاوضہ لیتا ہے اور اس کے علاوہ فلم کے منافع میں بھی اس کا حصہ ہوتا ہے۔

بعض دلچسپ اعداد و شمار

اندھوں کی تعداد: دنیا میں تقریباً پچاس لاکھ نابینا انسان ہیں۔

دُنیا بھر کے چوہے: اندازہ کیا گیا ہے کہ دُنیا میں مردم شماری اور "موش شماری" کے نتائج بلحاظ اعداد یکساں ہیں۔ یعنی چوہوں اور انسانوں کی آبادی برابر برابر ہے۔

امریکا کے کروڑپتی: ۱۸۶۰ء میں امریکا کے کروڑپتیوں کی تعداد ۲۷ تھی۔ یہ تعداد ۱۹۱۴ء میں ۴۸ ۲۳ ، ۱۹۱۹ء میں ۵۵۲۶، ۱۹۲۹ء میں ۱۴۸۱۶، ۱۹۳۳ء میں ۵۰ اور ۱۹۳۴ء میں صرف ۳۲ تھی۔ ان اعداد میں وہ لوگ شامل کئے گئے ہیں جن کی آمدنی دس لاکھ پاؤنڈ سالانہ یا اس سے زیادہ ہے۔

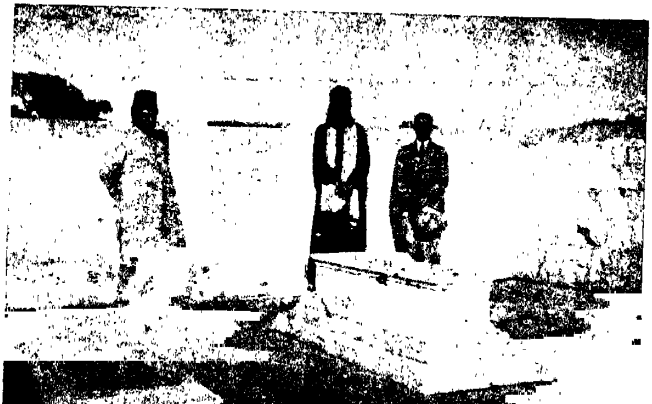
نپولین کے خطوں کی قیمت

زندہ ملکوں کے دل میں اپنے اکابر کی یادگاروں کی جو قدر ہے اس کا کچھ اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ حکومت فرانس نے نپولین کے تین سو خط جو ملکہ ماری لوسی کے نام لکھے گئے تھے پندرہ ہزار پاؤنڈ کو خریدے ہیں۔ اس کے بعد صرف ایک اہم خط تین سو پاؤنڈ کو خریدا گیا۔

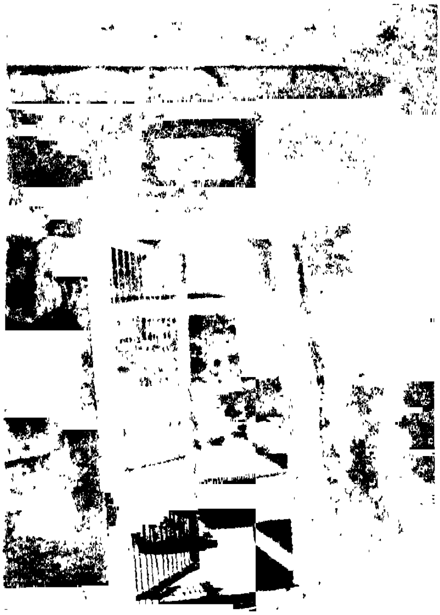
حامد علی خاں



احاطہ استاد ذوق



ذوق کی قبر



مدفن مزار غالب



غالب کی قبر

غالب اور ذوق کی قبریں

دلی کے ان دو مشہور شاعروں کو تمام ہندوستان جانتا ہے۔ ذوق مغل سلطنت کے آخری بادشاہ بہادر شاہ کے اُستاد تھے مگر تیموری شمع کے گُل ہونے سے پہلے ہی قبر میں چلے گئے تھے۔ غالب نے مسلمانوں کی تاریخ اور مسلمانوں کی حکومت اور مسلمانوں کی تہذیب کا آخری چراغ اپنی آنکھوں سے بجھتے ہوئے دیکھا۔ اور غدر ۱۸۵۷ء کی سب مصیبتیں سہنے کے بعد دنیا سے رخصت ہوئے۔

ذوق کا مزار شاہجہانی دہلی کے غرب میں فصیل کے باہر درگاہ قدم شریف کے قریب کلو بخشو کے تکیہ میں تھا۔ سرہانے ایک لوح لگی ہوئی تھی جس کا کتبہ بہادر شاہ نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔ ۱۹۰۳ء تک یہ لوح موجود تھی۔ کیسرا سنگھ صاحب جہانگیر ساکن امرتسر اس زمانہ میں دلی میں تھے انہوں نے اس مزار کی مرمت کرائی اور مزار پر ایک مجلس غزل خوانی بھی کی۔ میں اس میں شریک ہوا تھا۔ قوال نے جب ذوق کی یہ غزل گائی

آنکھیں دیدار طلب گور سے آئی ہیں نکل　　　تختہ نرگس کا نہیں میرے سرہانے رکھا

حاضرین پر بہت اثر ہوا تھا۔ اس مجلس کے بعد بھی کئی دفعہ میرا یہاں جانا ہوا تھا مگر چند سال کے بعد سنا کہ قبر بھی ٹوٹ گئی چار دیواری بھی شکستہ ہوگئی۔ اور لوح مزار بھی کوئی لے گیا اس کے بعد سنا کہ حکیم حاجی عبدالحمید صاحب مالک دواخانہ ہمدرد دہلی نے قبر بھی بنوادی اور چار دیواری بھی درست کرادی اور ایک نئی لوح بھی لگادی اور حفاظت کے لئے ایک آدمی بھی مقرر کر دیا۔ گذشتہ مہینہ میاں بشیر احمد صاحب ایڈیٹر "ہمایوں" لاہور تشریف لائے اور انہوں نے مرقد ذوق کی زیارت کا شوق ظاہر کیا تو میں حکیم ہمدرد صاحب کے ساتھ میاں صاحب کو وہاں لے گیا۔ اور میاں صاحب نے مزار کی تصویر بھی اُتاری۔

مرقد غالب:۔ نواب اسد اللہ خاں غالب کا مزار میری درگاہ کے قریب لب سڑک واقع ہے۔ مزار کے پائیں یعنی جنوب میں شہنشاہ اکبر کے کوکا خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش کا مقبرہ ہے جس کو چونسٹھ کھمبہ کہتے ہیں۔ مزار کے غرب میں قبر سے ملی ہوئی بیگم صاحبہ حکیم واصل خاں مرحوم کے مکان کی دیوار ہے اور شرق میں نواب لوہارو کے خاندان کی کچھ قبریں ہیں، پھر ایک دیوار ہے۔ پھر تین سو گز کا ایک قطعہ زمین ہے جس کو حکیم ہمدرد صاحب نے غالب ہال بنانے کے لئے خریدا ہے اور شمال میں ایک دیوار ہے اور اس کے باہر شکستہ قبرستان ہے جس کے وارث اب موجود نہیں ہیں۔

غالب سوسائٹی کا ارادہ ہے کہ شمالی دیوار کو ہٹا کر شکستہ قبرستان درست کر دیا جائے اور شمال کی طرف سڑک کے پاس ایک شاندار دروازہ بنا دیا جائے اور جتنی زمین مرحومہ بیگم صاحبہ حکیم واصل خاں صاحب نے مزار کے غرب میں عطا فرمائی تھی اس کو شامل کر کے غالب کا مزار اتنا اونچا بنا دیا جائے جو سڑک سے نظر آنے لگے اور شرق میں غالب ہال بنایا جائے تاکہ آئندہ جلسے اور مشاعرے مزار کے قریب ہی ہو سکیں۔

مزاحمت:۔ غالب کا مزار نواب صاحب لوہارو کے قبرستان میں ہے۔ اس لئے قبرستان کے وارث غالب کا مزار بنانے میں مزاحمت کرتے ہیں لہذا تجویز کی گئی ہے کہ نواب لوہارو کے قبرستان کو اسی حال پر چھوڑ دیا جائے۔ صرف غالب کی قبر کو بنا دیا جائے۔ لوہارو والوں کو اگر اپنے بزرگوں کی قبروں کا خیال ہوگا تو وہ خود بنوا لیں گے مگر ان کو غالب کے مزار کی تعمیر میں مزاحمت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ کیونکہ غالب ہندوستان کے مشترکہ شاعر تھے اور ان کے کوئی اولاد نہ تھی اور ادبی ذوق رکھنے والے سب ہندو مسلمان ان کی اولاد ہیں۔

حسن نظامی

ذوق کا حلیہ

شیخ مرحوم کے والد شیخ محمد رمضان ایک غریب سپاہی تھے۔ وہ دلی میں کابلی دروازہ کے پاس رہتے تھے۔ ۱۱ ذیحجہ ۱۲۰۴ھ میں شیخ محمد رمضان کے گھر میں یہ مبارک چاند نکلا جو آسمانِ سخن پر چاند ہو کر چمکا۔

شیخ مرحوم قد و قامت میں متوسط اندام تھے چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

آدمیت سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ　　پست ہمت یہ نہ ہووے پست قامت ہو تو ہو

رنگ سانولا۔ چیچک کے داغ بہت تھے۔ کہتے تھے کہ ۹ دفعہ چیچک نکلی تھی۔ مگر رنگت اور داغ کچھ ایسے مناسب و موزوں واقع ہوئے تھے کہ چمکتے تھے اور بھلے معلوم ہوتے تھے۔ آنکھیں روشن اور نگاہیں تیز تھیں۔ چہرے کا نقشہ کھڑا کھڑا تھا۔ اور بدن میں پھرتی پائی جاتی تھی۔ بہت جلد چلتے تھے۔ اکثر سفید کپڑے پہنتے تھے اور وہ ان کو نہایت زیب دیتے تھے۔ آواز بلند اور خوش آیند جب مشاعرہ میں پڑھتے تھے تو محفل گونج اٹھتی تھی۔ ان کے پڑھنے کا انداز اُن کے کلام کی تاثیر کو زیادہ زور دے دیتا تھا۔ اپنی غزل آپ ہی پڑھتے تھے۔ کسی اور سے ہرگز نہیں پڑھواتے تھے۔

صانعِ قدرت جنہیں صاحبِ کمال کرتا ہے انہیں اکثر ایسی صفتیں دے دیتا ہے جن میں وہ ابنائے جنس سے صاف الگ نظر آتے ہیں: تیزیٔ ذہن اور براقیٔ طبع کا حال تو اب بھی اُن کے کلام سے ثابت ہوتا ہے مگر قوتِ حافظہ کے باب میں ایک ماجرا عالمِ شیرخواری کا اُنہوں نے بیان کیا جسے سُن کر سب تعجب کریں گے۔ کہتے تھے مجھے اب تک یاد ہے کہ اُس عالم میں ایک دن مجھے بخار تھا۔ والدہ نے پلنگ پر لٹا کر لحاف اُڑھا دیا اور آپ کسی کام کو چلی گئیں۔ ایک بلی لحاف میں گھس آئی۔ مجھے اُس سے اور خرخر کی آواز سے نہایت تکلیف ہونے لگی۔ لیکن نہ ہاتھ سے ہٹا سکتا تھا نہ زبان سے پکار سکتا تھا۔ گھبراتا تھا اور رہ جاتا تھا۔ تھوڑی دیر میں والدہ آگئیں۔ انہوں نے اُسے ہٹایا تو مجھے غنیمت معلوم ہوا۔ اور دونوں کیفیتیں اب تک یاد ہیں۔ چنانچہ جب بڑا ہوا تو میں نے والدہ سے پوچھا اُنہوں نے یاد کر کے اس واقعہ کی تصدیق کی اور کہا کہ فی الحقیقت اُس وقت تیری عمر برس دن سے کچھ کم تھی۔

ہمیشہ فکرِ سخن میں غرق رہتے تھے اور اپنے کلام کو آپ اُلٹ پلٹ کرتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ بعض اشعار دو دو تین تین چار چار طرح سنے اور لکھے نظر آتے ہیں۔ ان کے دیوان کو جب نظرِ غور سے دیکھا جاتا ہے تو اس سے رنگا رنگ کے زمزمے اور بوقلموں آوازیں آتی ہیں۔ ہر رنگ کے انداز موجود ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کے دیکھنے سے دل اُکتا نہیں جاتا۔ وہ لفظ لفظ کی نبض پہچانتے تھے اور مضامین کے طبیب تھے۔ جس طرح برجستہ بیٹھا دیکھتے اسی طرح باندھ دیتے تھے۔ صبح ہوتے کہ ۲۴ صفر ۱۲۷۱ھ جمعرات کا دن تھا ۱۷ دن بیمار رہ کر وفات پائی مرنے سے ۳ گھنٹے پہلے یہ شعر کہا تھا ؎

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا　　کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

شعرائے ہند نے جس قدر تاریخیں ان کی کہیں آج تک کسی بادشاہ یا صاحبِ کمال کو نصیب نہیں ہوئیں۔

(اقتباس از آزاد)

غالب کا حلیہ

غالب کا حلیہ لکھنا چاہا تو سورج نکلنے سے ایک گھنٹہ پہلے مرزا غالب پر گیا۔ یکایک تصور کے کان میں ایسی آواز آئی کہ کوئی مجھے پکارتا ہے۔ "یہ بس نے کہا تھا غالب مر گیا۔ قبر میں گڑ گیا۔ بھائی میں تو زندہ ہوں اور ہندوستان کے ہر گھر میں موجود ہوں۔ میرا حلیہ تم کیا لکھو گے میرے ہی لکھے ہوئے الفاظ لکھ دو۔ سُنو! میں قوم کا سلجوقی ہوں۔ دادا میرا ماوراء النہر سے شاہ عالم کے وقت میں ہندوستان آیا۔ پانچ برس کا تھا جب باپ مر گیا۔ آٹھ برس کا تھا جب چچا مر گیا۔ بعد غدر بجرم مصاحبت بہادر شاہ دربار و خلعت دونوں بند ہو گئے۔ تین برس بعد پنڈ چھٹا۔

غالب کا حلیہ ۔ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھ کو اپنا وہ رنگ یاد آجاتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے۔

جب ڈاڑھی مونچھ میں بال سفید آگئے تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مسّی بھی چھوڑ دی۔ اور ڈاڑھی بھی کیونکہ اس بھونڈے شہر دلی میں ایک وردی ہے، عام ملّا۔ حافظ۔ بساطی۔ نیچہ بند۔ دھوبی سقے، بھٹیارے، جلاہے، کنجڑے۔ منہ پر داڑھی سر پر بال۔ فقیر نے جس دن داڑھی رکھی اسی دن سر منڈایا۔

اب تم میرے بیان کی جو میرے وجود کا مجمل خاکا ہے تفسیر لکھنی چاہو تو لکھ دو کہ میں خوب گورا سرخ سفید جوانی میں تھا۔ قمری کے محبوب سروِ قد ملتا جلتا تھا۔ چہرہ ترکانہ۔ پیشانی چوڑی اور بلند۔ آنکھیں بڑی بھی طرحدار بھی چمکیلی بھی اور مخمور بھی۔ ناک اونچی سیدھی۔ رخسار بچپن میں اور جوانی میں دانۂ انار۔ بڑھاپا آیا تو سفید اور زار و نزار۔ سینہ چوڑا جس کے بائیں پہلو میں درد سے بھرپور دل۔ بڑا بھی، سوز و گداز سے لبریز بھی۔ اور سلطنت اُجڑ جانے، بڑوں کا نام نشان مٹ جانے اور نشانہ بازوں کی نشانہ بازی سے پاش پاش۔ زخمی اور نڈھال بھی۔ سر میں ایک دماغ، دماغ میں ایک چراغ، رات دن روشن رہتا تھا۔ ہزاروں دماغوں کے چراغ اس ٹمٹماتے چراغ سے روشن ہوتے تھے۔ دانت موتی تھے۔ وقت کے رواج سے ان پر مسّی ملتا تھا کہ اُجالے میں ہلکا سا ابر بھی رہے اور مسّی کے سہارے دانتوں کی چمک اچھی معلوم ہو۔

مذہب ۔ نہ ہندو نہ مسلمان، عیسائی نہ موسائی، شیعہ نہ سُنّی۔ بڑے تلوار کو پوجتے تھے۔ میں نے قلم کو بھی بُت خانہ میں بٹھایا۔ ایک کو مانتا ہوں۔ ایک کو دیکھتا ہوں۔ ایک کو پاتا ہوں۔ اور ایک ہی سے دل لگانے میں مزا آتا ہے۔ میرا دین و ایمان تو انسان کی ذات اور اس کی خدمت و محبت ہے۔ آدمی ہوں تو آدمی کو چاہوں گا۔ اور آدمیت سے باہر جو کچھ ہو اس سے سو سو کوس دور رہوں گا۔

طبیعت ۔ علم و ہنر سے عاری ہوں لیکن پچپن برس سے محوِ سخن گزاری ہوں۔ مبدءِ فیاض کا مجھ پر احسانِ عظیم ہے۔ ماخذ میرا صحیح اور

طبع میری سلیم ہے ۔ فارسی کے ساتھ ایک مناسبت ازلی اور سرمدی لایا ہوں ۔ مطابق اہلِ پارس کے منطق کا مزا بھی ابدی لایا ہوں ۔ مناسبت خدا داد تربیت استاد حسن و قبح ترکیب پہچاننے ، فارسی کے غوامض جاننے لگا ۔

کلام ۔ میرا کلام کیا نظم کیا نثر ، کیا اُردو کیا فارسی کبھی کسی عہد میں میرے پاس فراہم نہیں ہُوا ۔ دو چار دوستوں کو اس کا التزام تھا کہ وہ مسودات مجھ سے لے کر جمع کر لیا کرتے تھے سو ان کے لاکھوں روپیہ کے گھر لُٹ گئے جن میں ہزاروں روپیہ کے کتب خانے بھی گئے ۔ اس میں وہ مجموعہ ہائے پریشاں بھی غارت ہوئے ۔

غالب کی کتابیں ۔ میری کتابوں کا حال کیا پوچھتے ہو ۔ پنج آہنگ کے دو چھاپے ہیں ۔ ایک بادشاہی چھاپہ خانہ کا ۔ اور ایک منشی نورالدین کے چھاپہ خانہ کا ۔ پہلا ناقص ہے ۔ دوسرا سراسر غلط ہے ۔

ضیاء الدین خاں جاگیر دار لوہارو میرے بھائی اور میرے شاگرد رشید ہیں ۔ جو نظم و نثر میں نے لکھا وہ انہوں نے لیا اور جمع کیا چنانچہ نسخہ کلیات نظم فارسی چوّن پچپن جز اور پنج آہنگ اور مہر نیم روز اور دیوان ریختہ سب مل کر سوا سو جز مطلّا و مذہب ۔ اور انگریزی ابری کی جلدیں الگ الگ کوئی ڈیڑھ دو سو روپیہ کے صرف میں بنوائیں ۔ میری خاطر جمع کہ کلام میرا سب ایک جا ہے ۔ پھر ایک شاہزادہ نے اس مجموعۂ نظم و نثر کی نقل لی ۔ اب دو جگہ میرا کلام اکٹھا ہُوا ۔ کہاں سے یہ فتنہ برپا ہوا اور شہر لُٹے ۔ وہ دونوں جگہ کا کتب خانہ خوانِ یغما ہو گیا ہر چند میں نے آدمی دوڑائے کہیں سے ان میں سے کوئی کتاب ہاتھ نہ آئی ۔ وہ سب قلمی ہیں ۔

دن بھر لفافے بناتا ہوں ۔ اللہ اللہ یہ دن بھی یاد رہیں گے کہ مجھ کو اکثر اوقات لفافے بنانے میں گزرتے ہیں ۔ اگر خط نہ لکھوں گا کہ جن کو لکھتا تھا وہ پھانسی پر لٹک گئے تو لفافے بنا بنا کر جی بہلاؤں گا ۔ اس پر اُن کا پتہ لکھتا جن کے گولی لگی ۔ یہ اُن کے نام بھیجتا جن کو پھانسی ہوئی ۔ اس لفافہ پر اُن کا نام لکھ دیتا اگر جانتا کہ وہ کہاں ہیں اور ہیں بھی یا مر گئے ۔ جنگل میں کسی درندے نے ختم کر دیا ۔ مرنے والوں کا بھی تو ٹھکانا معلوم نہیں کہاں ڈال دیا ۔ کہاں داب دیا ۔ ورنہ انہیں کو لکھتا ۔ یہاں کا حال ۔ زمین سخت ہے ۔ آسمان دُور ہے ۔ جاڑا خوب پڑ رہا ہے ۔ تونگر غرور سے ، مفلس سردی سے اکڑ رہا ہے ۔ مجھے آب کاری کے بندوبست جدید نے مارا ۔ عرق کے نہ کھینچنے کی قید شدید نے مارا ۔ ادھر انسداد دروازہ آب کاری ہے ۔ اُدھر ولایتی عرق کی قیمت بھاری ہے ۔"

(منادی) (اقتباس از حسن نظامی)

نوٹ ۔ مرزا غالب بلیماراں کے محلے میں رہتے تھے ۔ اُن کا مکان موجودہ ہندوستانی دواخانہ کے سامنے سڑک کے جنوب میں تھا ۔

ذوق اور غالب

اب سے تیس سال پہلے جب ہم سکول میں پڑھتے تھے تو ہمیں یہی معلوم ہوتا تھا کہ ذوق اور غالب اُردو کے دو سب سے بڑے شاعر گزرے ہیں، یہ ابوظفر آخری شاہِ دہلی کے زمانے میں تھے۔ ذوق بادشاہ کا اُستاد تھا، غالب نے اُس کا مقابلہ کیا سہرے کے مقطع میں ڈینگ ماری جس پر ملک الشعراء نے ایسا جواب دیا کہ غالب کو معذرت کرتے ہی بنی۔ آزاد کی نیرنگِ خیال اور آبِ حیات اور اُردو کورس یہ ہماری کائناتِ ادب تھی۔ آزاد کا ہر قول سر آنکھوں پر، جو وہ کہتا اُسے قطعی بات سمجھتے۔ چون وچرا کی مجال نہ تھی۔ اُنہیں دنوں میں مسدس حالی والے حالی کی زیارت بھی نصیب ہوئی اقبال کو بھی ہر سال انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسوں میں دیکھتے سنتے تھے۔ اِس سلف میں ذوق غالب اور خلف میں حالی اور اقبال یہی کام کے چار شاعر تھے اِن میں ذوق بہترین شاعر تھا اور غالب اُس کا ناکام رقیب۔ لیکن چند ہی سال بعد معلوم ہوا کہ اب حالات کچھ اور ہیں، اب غالب نے ذوق کو پچھاڑ دیا ہے اور غالب روز بروز بہتر بلکہ اُردو کا بہترین شاعر بن رہا ہے یہاں تک کہ اقبال بھی گویا غالب کی شاگردی کے اثر سے اس قسم کے شعر لکھ رہا ہے: "نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری" اور "اے جواں بخت مبارک تجھے سر پہ سہرا" سے "خوش ہوا ے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا" کسی طرح کم نہیں اور بہتر نہ بھی ہو تو بلند تر ضرور ہے۔ آج اتنا زمانہ گزرنے کے بعد غالب کے اتنے ایڈیشن اور شرحیں اور تنقیدیں نکل چکی ہیں کہ ذوق غالب کے مقابلے کا سوال ہی پرانا ہو چکا ہے۔ غالب اب سب پر غالب ہے ہاں یہ جی نہیں چاہتا نہ ضرورت ہے کہ ذوق کو آزاد کی دی ہوئی کرسی سے نیچے اُتارا جائے۔

ذوق کو بُرا کون کہہ سکتا ہے؛ بے تکلف پنجابیوں کی زبان پر اکثر "اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر" والا شعر رہتا ہے ہمارے دیہاتی مکان کے معلقہ قطعوں میں ایک قطعہ یہ بھی تھا "بڑے موذی کو مارا نفسِ امّارہ کو گر مارا" الخ۔ ایسے ہی اُس کے سعدیانہ شعر اَور بھی ہیں: ؎

آدمیت سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ　　　　پست ہمت یہ نہ ہووے پست قامت ہو تو ہو

مجھ سا پست قامت کیسے اُستاد ذوق کا فی البدیہہ شاگرد نہ بن جاتا۔

طفلی کے دنوں ہی سے باغوں میں دوڑتے کودتے ہم مزے لے لے کر پڑھا کرتے تھے: ؎

عہدِ پیری نے بھلایا دوڑ چلنا کودنا　　　　ہائے طفلی کھیلنا کھانا اچھلنا کودنا

یعنی اس بدبخت ملک کی مکدر فضا میں طفلی ہی سے سرورِ جہان آبادی کی ہائے ہمارے دل و جان پر مسلط تھی۔

ابھی خود سنِ قبلِ اولاد ہی تھے لیکن بڑے ناصحانہ انداز میں پڑھتے تھے: ؎

توڑا کمرِ شاخ کو کثرت نے ثمر کی　　　　دُنیا میں گراں باری اولاد غضب ہے

ابھی اپنے علم کا سلسلہ ختم [illegible] خوب جا... گئے تھے کہ: ؎

ہم جانتے تھے علم سے کچھ جانیں گے — جانا تو یہ جانا کہ نہ جانا کچھ بھی

ابھی اِک دانہ ، اِک قطرہ ، محض اِک جزو تھے مگر کہتے تھے : ؎

دانہ خرمن ہے ہمیں قطرہ ہے دریا ہم کو — آئے ہے جزو میں نظر کُل کا تماشا ہم کو

"بٹوے میں بادام" "بھیجنے والا اور "مسجد میں آنکھیں" دکھا کر مارنے والا یہ دونوں شعر دل کو خوش کر دیتے تھے ۔ ذوق کے مرصع شعروں کے مقابل میں غالب کے "کوئی دن گر زندگانی" ، "کوئی اُمید بر نہیں" ، "دلِ ناداں تجھے ہوا" والے شعر محض سیدھے سادے فقرے معلوم ہوتے تھے گو خود نماز روزہ کے پابند نہ تھے تاہم ان شعروں کے لکھنے والے کی قدر کرنا اپنا مذہبی فرض جانتے تھے : ؎

ہوا احمدِ خدا میں دل جو مصروفِ رقم میرا — الف الحمد کا سا بن گیا گویا قلم میرا

پاک رکھ اپنا دہاں ذکرِ خدائے پاک سے — کم نہیں ہرگز زباں مُنہ میں ترے مسواک سے

مگر بدقسمتی سے اُس ستم ظریف کے پہلے ہی حملے کی ہم تاب نہ لاسکے جس نے آ کے بتایا : ؎

ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن — دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

کچھ دیر تک اپنی علمی بے بضاعتی اور کاغذی نفاست پسندی کی بنا پر یہ تو ہوا کہ پڑیا باندھنے والے کاغذوں پر چھپے ہوئے دیوانِ غالب کو اُس دیوانِ غالب کو جس میں پہلے ہی صفحوں پر ایسے ایسے پتھریلے اشعار درج تھے : ؎

شمارِ سبحہ مرغوبِ بُتِ مشکل پسند آیا — تماشائے بیک کف بُردنِ صد دل پسند آیا

بے پروائی کی نگاہ سے دیکھتے رہے لیکن جونہی الفاظ کے معنی سمجھ میں آنے لگے اور عمر میں بڑھے اور غالب کے دیدہ زیب ایڈیشن نکلے اور اُس کا نام ہر قابل ادیب کی زبان پر آنے لگا تو اپنی توجہ بھی اس طرف ہوئی اور "کچھ سمجھ میں آیا کچھ نہ آیا" ، پر ہم نے بھی ہتھیار ڈال دیئے ۔ جب یہ سُنا کہ "نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا" اور "کاوکاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ" تو فوراً ہی مان گئے کہ :

"شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے" — اور — "تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا"

ہاں شروع شروع میں بعض غلط فہمیاں ضرور رہیں مثلاً "بخشے ہے جلوۂ گُل ذوقِ تماشا غالب" کے شعر کی ایک خوبی مدت تک یہ سمجھی کہ اس میں ذوق اور غالب دونوں کے نام آ گئے ہیں اور اُس کا رُعب اب تک یوں مسلط رہا کہ "مراہر داغِ دل اک تخم ہے" پڑھا کئے اور لُطف اُٹھایا کئے یعنی بجائے تخم کے نجم برسوں تک پڑھا اور اسی کو درست اور معنی خیز سمجھا اور اپنے آپ سے کہا کہ : ؎

محرم نہیں ہے تُو ہی نواہائے راز کا — یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا (؟)

حقیقت یہ ہے کہ جب سے الفاظ کی بندش کی بجائے معانی کی وقعت کا اعتراف کیا جانے لگا ہے ذوق نظروں سے گرے گئے غالب سب کی نظر میں روز بروز بلند تر ہو رہا ہے !

ذوق (مرحوم) کی قبر پر ایک مضمون گزشتہ سال ہمایوں میں شائع ہوا تھا۔ اُس سے متاثر ہو کر اب کی جب دہلی گیا تو خواجہ حسن نظامی صاحب سے پوچھا کہ غالب کی قبر کی تو ہر سال جب آپ سے ملنے آتا ہوں زیارت ہو جاتی ہے لیکن ذوق کی قبر جس کے متعلق کسی نے یوں اور یوں کچھ لکھا ہے دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ اُنہوں نے کہا ذوق کی قبر تو اب غالب کی قبر سے بہتر حالت میں ہے چلئے آپ کو دکھائیں۔ غالب کی قبر کی تصویر میں اُتار چکا تھا اب یہ شوق تھا کہ ذوق کی قبر کا فوٹو بھی خود اُتاروں۔ چنانچہ خواجہ صاحب کے ہمراہ گیا اور ایک وسیع ویران سے قبرستان میں جہاں دُور "قدم شریف" نظر آتا ہے ایک نیا بنا ہُوا احاطہ نظر پڑا جس کے بیرونی دروازے پر لکھا ہے " احاطہ اُستاد ذوق"۔ اس کی تصویر اُتاری جو پیش کی جاتی ہے۔ غالب کی قبر پر یہ اشعار کندہ ہیں:۔

یا حی یا قیوم

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مُرد ۔۔۔ اسداللہ خان غالب مُرد

کل میں غم و اندوہ میں با خاطرِ محزون
تھا تربتِ اُستاد پہ بیٹھا ہُوا غمناک
دیکھا جو مجھے فکر میں تاریخ کی مجروح
ہاتف نے کہا گنجِ معانی ہے تہِ خاک
۱۲۸۵ھ

ذوق کی قبر پر یہ عبارت مرقوم ہے :۔

۷۸۶
مرقد
خاقانیٔ ہند ملک الشعراء شیخ ابراہیم ذوقؔ

قطعۂ تاریخ قدیم

شبِ چارشنبہ بماہِ صفر ۔۔۔ بحکمِ خداوند جاں داد ذوق
ظفر روی اُردو بہ ناخن زغم ۔۔۔ خراشید و فرمود اُستاد ذوق
۱۲۷۱ھ

قطعۂ تاریخِ جدید

کیا اس کو ہمدرد نے آشکارا ۔۔۔ یہ شہرِ خموشاں سے آئیں صدائیں
سِنِ حالِ تعمیرِ مرقد پہ سائل ۔۔۔ لحد ذوق اُستاد کی آپ کہہ دیں
۱۳۵۳ھ

آزاد نے ذوق کی تاریخِ پیدائش ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۰۴ھ اور تاریخ وفات ۲۴ صفر ۱۲۷۱ھ لکھی ہے، سرسری طور پر حساب لگانے سے یہ ۱۷۹۰ء اور ۱۸۵۴ء کے برابر ہے۔ غالب کی تاریخِ پیدائش ۸ رجب ۱۲۱۲ھ (مطابق ۱۷۹۷ء) ہے۔ اُس کی وفات المجروح کی تاریخ کے مطابق ۱۲۸۵ھ میں) بتاریخ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء بعمر "۷۳ سال ۴ ماہ" ہوئی۔

بشیر احمد

ذوق کا ایک صفحہ

بڑے موذی کو مارا نفسِ امارہ کو گر مارا — نہنگ و اژدہا و شیرِ نر مارا تو کیا مارا
نہ مارا آپ کو جو خاک ہو اکسیر بن جاتا — اگر پارے کو اے اکسیر گر مارا تو کیا مارا
گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے میں — اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

آدمیت اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے — کتنا طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا

دکھا نہ جوش و خروش اتنا زور پر چڑھ کر — گئے جہان میں دریا بہت اتر چڑھ کر
جو مارے نفس کو اور کرلے اپنے غصے کو زیر — بنائے سانپ کا کوڑا وہ شیر پر چڑھ کر

دیکھے آئینے بہت بن خاک ہیں ناصاف سب — ہیں کہاں اہلِ صفا اہلِ صفا کہنے کو ہیں
دم بدم رک رک کے ہے منہ سے نکل پڑتی زباں — وصف اس کا کہہ چکے فوارے یا کہنے کو ہیں

بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو — زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

زمیں پہ نورِ قمر کے گرنے سے صاف اظہارِ روشنی ہے — کہ ہیں جو روشن ضمیر ان کا فروغ ان کی فروتنی ہے
بشر جو اس تیرہ خاکداں میں پڑا یہ اس کی فروتنی ہے — وگرنہ قندیلِ عرش میں بھی اسی کے جلوے کی روشنی ہے

بے محبت نہیں لے ذوق شکایت کے مزے — بے شکایت نہیں لے ذوق محبت کے مزے

نہ دینا ہاتھ سے تم راستی کہ عالم میں — عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جواں کے لئے

اے شمع تیری عمرِ طبیعی ہے ایک رات — ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے — مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے — اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

بد نہ بولے زیرِ گردوں گر کوئی میری سنے — ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سنے

(ب ح)

غالب کا ایک صفحہ

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا	یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا
عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا	درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا	ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے	آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا
دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک	میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا
رات دن گردش میں ہیں سات آسماں	ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا
دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ	دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک
سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں	خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں
رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج	مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں
تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے	تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں؛
ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال	ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو
وفاداری بشرطِ اُستواری اصلِ ایماں ہے	مرے بُت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو
دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا	میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
نہیں نگار کو اُلفت نہ ہو نگار تو ہے	روانیٔ روشِ و مستیٔ ادا کہیے
نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے	طراوتِ چمن و خوبیٔ ہوا کہیے
بس ہجومِ ناامیدی خاک میں مل جائے گی	یہ جو اک لذت ہماری سعیٔ بے حاصل میں ہے
بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے	ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی	مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی
نہ سنو گر بُرا کہے کوئی	نہ کہو گر بُرا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی	بخش دو گر خطا کرے کوئی

(ب ح ا)

دوزخ کی سیر

ڈینٹے کی ڈیوائن کامیڈی کا ایک منظر

ڈینٹے اٹلی کا شاعر، عالم، اور سپاہی جو ۱۲۶۵ء میں پیدا ہوا "ڈیوائن کامیڈی" کی تصنیف کے باعث اپنے ملک کا سب سے بڑا شاعر سمجھا جاتا ہے۔ بیٹرس سے ڈینٹے کی روحانی محبت کا افسانہ بار بار دُہرایا جا چکا ہے۔ ڈینٹے نے پہلے بچپن میں بیٹرس کو دیکھا تھا اور اس کے بعد جوانی میں۔ وہ بیٹرس کی محبت کو اس قدر مقدس سمجھتا تھا کہ اس کے رو برو اس کے اظہار کی جرأت نہ کرتا تھا بلکہ اس نے اپنی محبت کے اظہار کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ دوسری عورتوں سے ملتا اور اُن کے سامنے بیٹرس کی خوبیوں کے راگ گاتا۔ بیٹرس کو اس سے بدگمانی پیدا ہوگئی اور اس نے ایک دوسرے شخص سے شادی کرلی ڈینٹے نے بھی دو سال بعد شادی کرلی لیکن بیٹرس کی پُر اسرار محبت عمر بھر اُس کی زندگی کی رہنما بنی رہی۔ شادی کے بعد ڈینٹے کو ایک نئے عذاب کا سامنا ہوا یعنی اسے ہر وقت بیٹرس کے مرنے کا دھڑکا لگا رہتا تھا چنانچہ ۲۴ برس کی عمر میں بیٹرس واقعی مرگئی۔ اس کے بعد ڈینٹے کا اپنی ہستئ مستعار کے متعلق یہ خیال ہوگیا کہ وہ ایک بھٹکی ہوئی روح ہے جس کو بیٹرس کا روحانی تصرف اپنی رہنمائی سے سر منزلِ نجات تک پہنچائے گا۔ اسی خیال پر اسکی سب سے بڑی نظم "ڈیوائن کامیڈی" کی بنیاد ہے۔ ڈینٹے کی کوئی نظم بیٹرس کے بالواسطہ یا بلاواسطہ ذکر سے خالی نہیں۔

حامد علی خاں

(۱)

نہ معلوم میں کیونکر اُس پُر اسرار ویرانے میں راستہ بھول گیا جہاں کی خار دار جھاڑیاں، ہولناک تاریکی اور گھناؤنے مناظر موت سے بھی زیادہ روح فرسا تھے۔ اسی حیرانی و سرگردانی میں ایک پہاڑ کے دامن تک جا پہنچا۔ اِس مقام پر اُس قبر کی طرح تاریک طلسم خانہ کی سرحد ختم ہوتی تھی۔ یہاں بھولے بھٹکوں کو ڈھارس بندھانے والا، غریب الوطنوں کا رہنما یعنی آفتابِ عالم تاب پورے جاہ و جلال سے ہر طرف نور برسا رہا تھا۔

گو اس وقت میرے تن بدن میں رعشہ تھا، مارے خوف کے روح لرز رہی تھی۔ تاہم اس وحشت ناک ویرانے پر ایک نظر ڈالی جہاں سے آج تک کوئی بچ کر نہ نکل سکا تھا، اس تیراک کی طرح جو سمندر کی ہلاکت آفریں موجوں سے لڑتا بھڑتا جیسے تیسے کنارِ عافیت تک پہنچے اور ان طوفانی موجوں سے نجات پاکر جو اُسے مہیب قضا کے مُنہ میں دھکیلے دیتی تھیں رہ رہ کر پیچھے دیکھے۔

چونکہ میں تکان سے چُور چُور ہو رہا تھا اس لئے تھوڑی دیر دم لیا اور پھر آگے کو جھکے ہوئے بدن کا بوجھ پچھلے پاؤں پر سنبھالے، یکہ و تنہا، پہاڑ پر چڑھنے لگا۔ ابھی چند ہی قدم آگے بڑھا ہوں گا کہ بھوکے درندوں کی ہولناک آوازیں سنائی دیں ملے ڈر کے میری روح لرز گئی اور قدم آگے کی بجائے پیچھے پڑنے لگا۔ اچانک مجھے ایک دُھندلی سی شکل دکھائی دی۔ میں نے چلا

"اے انسان! اے فرشتے! مجھے بچانا!"

ایک نحیف اور دھیمی آواز سنائی دی "کسی وقت میں بھی انسان تھا اور روم میرا وطن عزیز تھا۔ لیکن..... اب سے بہت
۔جب قیصر اعظم نے اپنی قیادت کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بٹھایا تھا..... اس سے بھی پہلے۔ آہ اس زمانے میں کج فہم لوگ
تاؤں اور مورتیوں کی پوجا کرتے تھے۔ میں نے بھی انہی دیوتاؤں کے فسانے لکھے —— اس عہد کے قصے جب کہ ٹرائے (Troy)
فلک بوس گنبد جلا کر خاک سیاہ کر دیئے گئے تھے ——"

میں چلا اٹھا "تو یوں کہئے کہ فصاحت و بلاغت کا سرچشمہ، شہرۂ آفاق اور بے باک شاعر ورجل (Virgil) آپ ہی ہیں!
آپ ہی کے غائبانہ تلمذ نے مجھ میں شوقِ شعر گوئی پیدا کیا اور آپ ہی کی رہبری سے میں نے دُنیائے شاعری میں نام پایا۔ بس تو اب
آپ ہی مجھے ان آفات سے بچایئے جو مجھے آگے بڑھنے سے روکے ہوئے ہیں۔

تھوڑی دیر سوچنے کے بعد وہ بولا "میرے پیچھے ہو لو میں تمہیں لامحدود وسعتوں کی سیر کراؤں گا اور ایسی جگہ لے جاؤں گا جہاں
مرتوں کی بستی ہے جہاں راندی ہوئی روحیں ابدی عذاب میں مبتلا دوبارہ موت اور نیستی کی خواہش کرتی ہیں پر اسے نہیں
ہیں۔ جہاں فقط چلانا ہے اور دانتوں کا پیسنا۔ اس کے بعد تمہیں اعراف میں لے جاؤں گا جہاں کی بسنے والی روحیں اس اُمید
سارے عذاب جھیل رہی ہیں کہ ایک دن وہ ان تمام مصائب سے چھٹکارا پا کر خدا کے برگزیدہ لوگوں میں داخل ہوں گی ——
بن ان برگزیدہ لوگوں میں میرا گزر نہیں کیونکہ میں نافرمانوں میں شمار کیا گیا ہوں۔ یہاں کے حاکم کا یہی فیصلہ اور یہی حکم ہے۔
ں اگر تمہاری قسمت میں وہاں جانا ہوا تو تمہاری رہنمائی ایک اور روح کرے گی جو ان مقامات پر پہنچنے کی اہل ہے اور اسی کے حکم
ے اس وقت میں تمہاری خدمت پر مامور ہوا ہوں۔"

(۲)

پہلے تو میں آگے بڑھتے ہوئے کچھ ہچکچایا لیکن اپنے پیشرو کے تسلی دینے پر اُس کے پیچھے ہو لیا۔ سامنے ایک بلند محراب دکھائی
دی جس پر کچھ مدھم سے حروف میں یہ عبارت لکھی تھی:۔

یہی راہ ہے مصائب و ابتلا کی بستی کی، دردناک تکالیف۔ لامتناہی عذاب اور راندی ہوئی روحوں کی رفاقت چاہتے
ہو تو اس دروازے سے داخل ہو۔ انصاف اس جگہ کا سنگ بنیاد ہے۔ قدرتِ کاملہ، عقلِ کل اور اوّلیں محبت
اس کے معمار ہیں، مخلوقات میں سب سے پہلے اسی کی تعمیر ہوئی اور اسے ابدی قیام بخشا گیا۔ پہلے ہر تمنا اور اُمید،
ہر خواہش و آرزو کو خیر باد کہہ لو تب یہاں داخل ہو۔"

میری روح ان الفاظ کو پڑھ کر لرز گئی۔ میں نہ سمجھ سکا کہ محبت جب کامل ہو تو کیونکر عذاب کی طرف مائل ہوتی ہے لیکن میں اپنے

رفیق کے ساتھ دروازے سے داخل ہو کر آگے بڑھا تو آہ و بکا اور چیخ پکار کا ایک طوفان اُٹھتا ہُوا سنائی دیا۔ سارے کرے میں کسی چھوٹے سے ستارے کی بھی روشنی نہ تھی فقط ایک ہنگامہ بپا تھا جس میں خلط ملط الفاظ، غم و غصّہ کی آوازیں، دردناک چیخیں۔ معافی و ترحم کی التجائیں اور سینہ کوبی کا شور مختلف زبانوں کی آمیزش سے ایک روح فرسا منظر پیش کرتا تھا۔

یہاں ایسے لوگوں کی روحیں مقید تھیں جو اپنی دنیاوی زندگی میں نہ بدی سے ملوث ہوئے تھے اور نہ نیکی سے بہرہ ور۔ اسی طرح جس وقت شیطان نے خدا کے احکام کی نافرمانی کی اور سرکشی کر کے اپنے ساتھیوں کی مدد سے اس مالکِ کُل کا حریف بننا چاہا تو فرشتوں کی ایک جماعت نے ہر دو فریق سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کیا اور غیر جانبدار رہے اُن کو بھی اسی جگہ بند رہنے کی سزا ملی۔

جب ہم آگے بڑھے تو میں نے دیکھا کہ ایک دریا بہ رہا ہے اور اس کے کنارے لوگوں کا ایک ہجوم کھڑا ہے۔ نزدیک جانے پر معلوم ہُوا کہ یہ دریائے ایکیران (Acheron) ہے، اس میں ایک کشتی ساحل کی طرف آرہی ہے اور یہ ہجوم اسی کا منتظر ہے۔ کشتی میں ایک سفید ریش برف پوش ملاح بیٹھا آواز دے رہا ہے: "او گنہگار روحو! آؤ کہ میں تمہیں ایسی جگہ لے چلوں جہاں تم اس دُنیا کے آسمان کی جھلک بھی نہ پا سکو، جہاں ابدی تیرگی ہے اور بس۔ آؤ کہ تمہیں خوفناک شعلوں کی نذر کروں یا اس سے بھی زیادہ خوفناک چیز یعنی برف کے تودوں میں دھکیل دوں"۔ مجھے دیکھ کر اس نے کہا۔ "اے زندہ انسان تو ان سے الگ ہو جا کیونکہ تو ان میں سے نہیں ہے اور نہ میری کشتی تیرے ایسوں کے لئے بنی ہی ہے"۔

میرے ہمراہی نے کہا "چرن (Charan) تو اسے ساتھ لے جانے پر اعتراض نہ کر کیونکہ خدا کی مرضی یہی ہے"۔

اس پر چرن (Charan) خاموش ہو گیا لیکن اس کے الفاظ سے ارواح پر حد درجے کا خوف طاری ہو گیا۔ ان کے چہروں کی رنگت یک دم زرد پڑ گئی، اور پھر غصّے اور مایوسی سے دانت پیستے ہوئے وہ اپنے پیدا کرنے والے خدا، اپنے ماں باپ، اور کل نسلِ انسانی پر لعنت بھیجنے لگے اور کوسنے لگے یہاں تک کہ چرن نے سب کو بھیڑوں کی طرح ہانک کر گھاٹ پر جمع کیا اور کشتی پر سوار کر لیا۔ ہر ایک مغضوب اور راندی ہوئی روح کو ایک بار اس گھاٹ سے گزرنا پڑتا ہے تاکہ وہ اس مقام پر پہنچائی جائے جہاں اس کو سزا بھگتنا ہے۔ جونہی کہ کشتی روانہ ہوئی ایک خوفناک دھماکا ہُوا جس کے صدمے سے میں بیہوش ہو کر گر پڑا۔

(۳)

جب مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو دوزخ کے پہلے طبقے میں پایا۔ یہاں گریہ و زاری اور چیخ پکار تو نہ تھی، البتہ آہیں تھیں، درد بھری آہیں! جو دل و جگر کے پار ہوئی جاتی تھیں۔ میں نے یہاں کسی قسم کا عذاب نہ دیکھا تاہم یہاں کے مکینوں پر جو اثر طاری تھا ایک ایسا ہجوم رنج و یاس تھا کہ بدترین عذاب بھگتنے والی ارواح کے چہروں پر بھی مجھے نظر نہ آیا۔ اب جو میری نگاہ اپنے رہنما کے چہرے پر پڑی تو میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی جب میں نے وہی ہجوم حزن و ملال اس کے چہرے پر بھی پایا۔ مجھے اس قدر

ر اُس نے کہا " یہ تمام ارواح، بچے، عورتیں، مرد، گناہ سے قطعی طور پر مبرا ہیں بلکہ تمام عمر نیکی کرتے رہے لیکن ان کی نیکی کچھ کام نہ آئی کیونکہ انہیں مسیح پر ایمان لانے اور اس کے نام پر بپتسمہ لینے کا موقع حاصل نہ ہوا تھا۔ جو قومیں خدا کی مقدس یں کے اُترنے سے پہلے پیدا ہوئیں ان کی نیکیاں خدا کو پسند نہیں اور انہیں میں سے ایک میں بھی ہوں۔ نوعِ انسان ین آدم و حوّا، ان کا بیٹا ہابیل، حضرت نوح، ابراہیم، موسے اور بنی اسرائیل کے تمام پیغمبر بھی یہیں تھے لیکن کچھ عرصہ شفاعت سے انہیں نجات مل گئی ہے۔

سامنے ایک بلند اور ممتاز جگہ پر ہومر (Homer) اور اس کے ساتھ مشہور یونانی اور لاطینی اہلِ قلم حضرات تشریف فرما تھے ے مشفق و رہنما ورجل کا قیام تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ اُٹھے اور ہماری پیشوائی کو بڑھے۔ ہومر سب سے آگے تھا۔ اس کے ے افسردگی مترشح تھی لیکن اس نے ضبط کرتے ہوئے خندہ پیشانی سے ہمارا خیر مقدم کیا اور مجھے مشاہیر کے زمرے میں شامل کر لیا۔ یہاں سے آگے بڑھے تو ایک قلعہ نظر پڑا جس کے گرد یکے بعد دیگرے سات فصیلیں تھیں اور سب کے باہر ایک ندی کا کام دیتی تھی۔ ہم خندق کے پانی پر خشکی کی طرح چلتے ہوئے سات دروازوں سے گزر کر قلعہ کے اندر ایک خوشگوار داخل ہوئے۔ یہاں کے لوگوں کے چہروں سے وجاہت اور رُعب ٹپکتا تھا۔ یہیں اٹلس (Atlas) کی لڑکی الکٹرا ج بھی تھی۔ جس کے لڑکے نے ٹرائے (Troy) کا مشہور شہر تعمیر کیا تھا۔

یہیں قیصر اعظم زرہ بکتر لگائے کھڑا تھا اور اس کے پاس اس کی لڑکی جولیا (Julia) تھی جس نے پمپی اعظم (POMPEY-
HT-) سے شادی کی تھی۔

یہیں ایک طرف فلاسفہ کا گروہ بیٹھا تھا۔ ان میں ارسطو، افلاطون اور سقراط تھے ان ہی میں دیمقراطیس بھی تھا جس کا اصول نیا ذرات کے اتفاقی اتصال سے معرضِ وجود میں آگئی ہے۔

(۴)

ان سب کو ان کے حال پر چھوڑ کر ہم آگے بڑھے اور دوزخ کے دوسرے طبقے میں پہنچے یہاں مائی نس (Minos) ایک تعین تھا جو ہر نئے داخل ہونے والے سے اس کے جرائم کے متعلق پوچھتا اور ان کی نوعیت کے مطابق سزا تجویز کرتا۔ کسی ہتی کہ اس کے آگے جھوٹ بول سکے۔ اس جگہ حد درجہ کی تاریکی چھائی ہوئی تھی، تند و تیز آندھیاں چلتی تھیں۔ جو کوئی اس کی لپیٹ میں آجاتا ہوا اُسے چٹانوں پر ٹپکتی جس سے اس کا دماغ پاش پاش ہو جاتا۔ معلوم ہوا کہ یہ نفسانی خواہشات کے ہیں جنہیں طوفانِ نفس پرستی آندھی بن بن کر عذاب دے رہا تھا۔ یہیں مصر کی ملکہ کلوپیٹرا تھی جس نے قیامِ روم کو اپنے فریفتہ کر کے گناہ میں مبتلا کیا۔ یہیں یونانی شہزادی ہیلن بھی تھی جس کے لئے نہ صرف انسانوں میں بلکہ کوہ ایلس کے

دیوتاؤں میں بھی ایک مدت تک خونریز جنگ جاری رہی تھی۔ یہیں اس کا شوہر اور خوبصورتی کا دیوتا پیرس (PARIS) بھی موجود تھا۔

ان انتخابِ روزگار ہستیوں کو جن کی شمعِ حسن پر ہزاروں پروانے نثار ہوتے تھے اس طرح مبتلائے عذاب دیکھ کر میرا دل چھلنی ہو رہا تھا کہ میں نے ایک عورت اور مرد کو ہاتھ میں ہاتھ دیئے دیکھا۔ معلوم ہوا کہ یہ فرانسسکا اور اس کا عاشق نزار پولو ہیں جو جرمِ الفت میں ایک وقت قتل کردیئے گئے تھے۔ میں نے فرانسسکا سے دریافت کیا کہ کن حالات میں اور کیسے نشۂ محبت سے مخمور ہو کر وہ اپنی پاکیزہ محبت سے ڈگمگائے اور بہک کر گناہ سے آلودہ ہو گئے۔

فرانسسکا نے جواب میں کہا " ایامِ مصیبت میں خوشی کے اوقات کی یاد سوہانِ روح ہوتی ہے لیکن اگر تمہیں اصرار ہے تو سنو ایک دن ہم شاہ آرتھر کے نائٹ اور اس کی ملکہ کے عاشق لینسی لاٹ (Lancelot) کا افسانہ پڑھ رہے تھے نہ وہاں کوئی اور تھا اور نہ ہمارے دل میں کوئی بُرا ارادہ تھا تاہم پڑھتے پڑھتے جب ہماری نگاہیں چار ہوتیں تو کسی فوری احساس سے ہمارے چہروں کا رنگ متغیر ہو جاتا یہاں تک کہ ایک بار ہم سے صبر نہ ہو سکا۔ جب ہم نے ملکہ کے اس تبسم کا حال پڑھا جسے اس کے عاشق نے جوشِ مسرت سے چوم لیا تھا تو بس ہمارے لب بھی ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے۔ کتاب اور اس کا مصنف دونوں عشق کے قاصد و پیامبر نکلے۔ پھر ہمیں پڑھنے کی فرصت کہاں!" اس دن ہم اس سے آگے نہ بڑھ سکے ——————

(۵)

اب ہم دوزخ کے تیسرے طبقے میں پہنچے۔ یہاں شکم پرور اور پیٹو لوگ رکھے گئے تھے۔ یہاں کے عذاب کی نوعیت جدا تھی۔ لگاتار اور موسلا دھار بارش ہو رہی تھی جس میں اولوں کی مصیبت بھی شامل تھی۔ پانی بدبودار اور بدرنگ تھا جو تاریک فضا میں ایک بحرِ متلاطم کی طرح لہریں مار رہا تھا۔ ہزاروں روحیں اس میں غوطے کھاتی تھیں۔ پانی کی سطح پر ایک خوفناک بلا جس کا نام سربرس ہے ہر وقت کتے کی طرح بھونکتی تھی اور اس کی آواز اس قدر مہیب تھی کہ تمام روحیں بہرا ہو جانے کی دعائیں مانگتیں جو قبول نہ ہوتیں۔ اس کے گرد کتوں کا ایک گروہ تھا جو ہر وقت بھونکتے رہتے اور جسے پاتے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے۔

میرا دل بھر آیا اور میں نے اپنے محسن سے پوچھا کہ آیا کچھ عرصہ بعد عادی ہو جانے کی وجہ سے عذاب کے احساس میں کمی ہو جاتی ہے اس نے سر ہلایا " یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جوں جوں انسان پختہ تر اور کامل ہو جاتا ہے رنج و راحت کا احساس اس میں بڑھتا جاتا ہے۔ مشفقِ حقیقی نے عذاب دینے میں بھی اپنے بندوں کی بہتری ملحوظ رکھی ہے کیونکہ یہ عذاب انہیں ہر گھڑی پہلے سے کامل تر اور پختہ تر بنائے جا رہا ہے اور ہرچند کہ راندی ہوئی روحیں حقیقی کمال تو حاصل نہیں کر سکتیں تاہم یہ امر ان کے لئے عذاب کے احساس میں کمی بھی ہونے نہیں دیتا "

جو کمال کہ فقط عذاب کی زیادتی کا ہی موجب ہو اس کے حاصل کرنے کے لئے میں نے اپنے دل میں کوئی [illegible] نہ پائی۔

پھر ایک پیچ در پیچ راہ سے ہوتے ہوئے ہم دوزخ کے چوتھے طبقے میں پہنچے۔ یہاں میدان کی مخالف سمتوں سے لوگ بڑے بڑے پتھروں کو زور سے دھکیلتے ہوئے لاتے حتیٰ کہ وہ درمیان آکر ٹکراتے اور پھر دونوں فریق اپنے اپنے پتھروں کو دھکیل کر پیچھے لے جاتے اور پھر اسی طرح آگے بڑھتے اور ایک فریق دوسرے سے کہتا "تم کیوں پیچھے نہیں ہٹتے" اور دوسرا یہ کہ "تم کیوں مجھے دھکیلتے ہو" اور اسی طرح ہمیشہ آپس میں لڑتے اور ٹکراتے۔

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ فضول خرچ اور حریص لوگوں کا گروہ ہے جنہوں نے جس طرح دُنیا میں اپنی دولت کا صحیح مصرف نہ جانا اب آخرت میں بھی اپنی طاقت کا غلط استعمال کر کے مبتلائے عذاب ہیں۔ اُن کی دولت یا اُن کے خزانے انہیں ایک لمحہ کے لئے بھی سستانے کی مہلت نہیں دے سکتے۔

(۶)

یہاں سے آگے بڑھے تو سامنے ایک چھوٹی سی کشتی نظر پڑی۔ ہمیں دیکھتے ہی اس کا ملّاح خوشی سے چلّا اُٹھا "آ! اے ظالم روح! کہ تجھے تیرے اعمال کا مزا چکھاؤں"

ورجل نے کہا "اتنی عجلت نہ کر۔ ہم تیرے قبضۂ اختیار سے باہر ہیں"

اس جواب سے ملاح مایوس ہوگیا اور کشتی تیر کے مانند دوسرے کنارے کی طرف روانہ ہوئی لہروں کے درمیان غوطے کھاتا ہوا ایک شخص ہماری طرف آیا اور کشتی پر سوار ہونے کی کوشش کرنے لگا لیکن ملّاح نے چپو کی ضرب سے اُسے پیچھے دھکیل دیا۔

دریا کے اس پار پہنچے تو ہمیں ایک شہر کے مینار نظر پڑے یہ آگ کی تپش سے انگارے کی طرح سرخ ہو رہے تھے اس شہر کو ڈِس (D i s) کہتے تھے۔ شہر کے دروازے پر شیطانوں کا ایک لشکر نگہبانی کرتا تھا جب مجھ پر ان کی نظر پڑی تو چیخے "کون ہے جو مرنے سے پہلے مُردوں کی بستی میں جانا چاہتا ہے؟" میرے ہمراہی نے علیحدگی میں اُن سے کچھ بات چیت کی لیکن اُنہوں نے ہمیں اندر داخل ہونے کی اجازت نہ دی بلکہ دروازہ بند کر دیا۔ اس پر ایک پُرزور دھما کا ہوا اور سامنے سے ایک پُرجلال فرشتہ نمودار ہوا اور وہ شیطانوں کے گروہ سے مخاطب ہو کر بولا "اے آسمان سے راندے ہوئے گروہ! تم کیوں بار بار مشیت الٰہی سے جنگ کرتے ہو اور کیوں بار بار سزا و سختی کے مستوجب ہو کر ذلیل و خوار ہوتے ہو؟"

اس کے عصا کی ضرب سے دروازہ فی الفور کُھل گیا اور ہم شہر میں داخل ہوئے۔ سامنے ایک وسیع قبرستان نظر آیا جو قبروں سے پٹا پڑا تھا۔ اور چاروں طرف سے انگاروں کی مانند دہک رہا تھا۔ ہزاروں انسانوں کے تابوت شعلوں میں لپٹے جل رہے تھے۔ اور اہل گور کی جگر دوز چیخ پکار سے ایک کہرام مچ رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہاں کفر کے پیشوا اور ان کے پیرو دفن ہیں۔

آخر الامر ہم ساتویں طبقے کے پہلے حصے میں پہنچے تو ایک دیو ہماری خدمت کے لئے مقرر ہوا۔ اس نے ہمیں اپنی پیٹھ پر سوار

کرلیا۔ اور کھولتے ہوئے خون کے ایک موّاج دریا میں کود پڑا۔ ہم نے دیکھا کہ بیشمار انسان اس میں ڈالے گئے ہیں بعض تو فقط گھٹنوں تک خون میں دھنسے ہوئے ہیں مگر بعض گردن تک ڈوبے ہیں۔ یہ قاتل، خونی، ظالم اور سفّاک لوگ تھے کہ اپنے اپنے جرائم کی نوعیت کے مطابق عذاب بھگت رہے تھے۔ خون کا کھولنا اس آگ کی وجہ سے تھا جس نے ان کے جذبات کو مشتعل کرکے انہیں قتل و غارت گری پر آمادہ کیا تھا۔ یہیں مشرق کا فاتح سکندرِ اعظم تھا جس نے مصر کی قدیمی تعلیم کو مٹا کر ایران کے شہنشاہ دارا کو خاک و خون میں لٹانے کے بعد ہندوستان میں خون کی ندیاں بہادی تھیں۔ یہیں گاتھ قوم کا سپہ سالار اٹیلا (Attila) بھی تھا جس نے وسطِ یورپ کو تہ و بالا کرکے تلوار کے گھاٹ اُتارا اور رومہ کے تاریخی شہر کو جلا کر خاک سیاہ کردیا۔

اسی طبقے کے دوسرے حصہ میں ہمیں ایک گھنا جنگل نظر آیا جس میں کسی راستے کا پتا نہیں چلتا تھا۔ یہاں سبزی یا تروتازگی مفقود تھی۔ درختوں کے پتے جھلسے ہوئے سیاہ رنگ کے تھے، شاخیں لمبی اور لچکدار ہونے کے بجائے چھوٹی چھوٹی جھکی ہوئی اور گانٹھ گٹھیلی تھیں۔ پھل پھول کا نام تک نہ تھا البتہ کانٹے تھے جو زہر ہلاہل کی تاثیر رکھتے تھے۔ درختوں کے اوپر خوش رنگ گانے والے پرندوں کے بجائے خونخوار بلاؤں نے گھونسلے بنائے تھے۔ ان کے پر جہاز کے بادبانوں کی طرح بڑے اور چمگادڑ کے پروں کی طرح جھلی دار تھے۔ ان کا چہرہ اور گردن انسانی شکل کا تھا لیکن پیٹ کافی پھولا اور بالوں اور پروں سے ڈھکا ہؤا تھا۔ ان کے پاؤں خونخوار درندوں کے پنجوں سے بھی زیادہ تیز تھے۔ میں نے ایک درخت سے ایک شاخ توڑی، ٹوٹنے سے خون کے قطرے ٹپکنے لگے اور درخت میں سے ایک غمناک آواز پیدا ہوئی" ہمارے اگلے عذابوں میں کیا کمی تھی کہ اس اضافے کی ضرورت پیش آئی" معلوم ہؤا کہ ان درختوں میں ایسے انسانوں کی روحیں گرفتار ہیں جنہوں نے دُنیا میں خودکشی سے اپنی جان لی تھی اور چونکہ ایسے لوگوں نے اپنے جسم سے بیزاری ظاہر کی تھی اس لئے انہیں یہ نئی قسم کا جسم دیا گیا جس سے انہیں رہائی نہ مِل سکے۔

اب ہم دوزخ کے ساتویں طبقے کے تیسرے حصّے میں تھے یہاں ایک لق ودق صحرا دکھائی دیا جس میں درخت کا نام تک نہ تھا البتہ روحیں غول در غول آوارہ تھیں جن کے لئے دم بھر بھی کہیں ایک جگہ ٹھہرنا محال تھا اس لئے کہ اوپر سے لگاتار آگ کے انگارے برس رہے تھے جن کی بے پناہ بوچھاڑ سے گھبرائے ہوئے وہ چاروں طرف بھاگتے اور کہیں آرام نہ پا سکتے۔ نیچے بھوبل کی طرح گرم ریت تھی جس پر پاؤں بھلبھلائے جارہے تھے اس لئے وہ مجبور ہو کر کبھی ایک پاؤں اُٹھاتے اور کبھی دوسرا اور اس طرح ناچتے پھرتے تھے۔ ان سب میں ہمیں صرف ایک آدمی نظر آیا جو اس دردناک عذاب کو خاطر میں نہ لاتا۔ اور سرکشی سے الگ بیٹھا غصّے اور نفرت سے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ ہم پاس سے گزرے تو بڑبڑایا "جیسا کہ زندگی میں نڈر تھا ویسا ہی اب مرنے کے بعد بے خوف ہوں لیکن خدا سے ہار ماننے کے لئے تیار نہیں۔ اے خدا تیرے کارندے مجھے عذاب دے دے کر اُکتا جائیں گے۔ تیرے مظالم اور تیری سختیوں کے ترکش میں کوئی تیر باقی نہ رہے گا، تیرے غصّے کی آگ سرد پڑجائے گی لیکن نہ تو میں مرعوب ہوسکوں گا اور نہ تجھے انتقام کی شیرینی ہی مِل سکے گی۔ ہرچند

ت والا، طاقت والامانا گیا ہے۔" یہ کاپینوس (Capaneus) تھا جس نے ہفت اقلیم کے بادشاہوں کی ہمراہی میں یونان کے شہر تھیبیز (Thebes) کا محاصرہ کیا اور خدا کے احکام سے بغاوت کرکے اُس کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہا اس کا غرور کسی عذاب سے نے والا نہ تھا۔

(۷)

اب ہم ساتویں طبقے کی آخری حدود تک پہنچ گئے تھے۔ سامنے ایک عمیق کھائی نظر پڑی، میرے ساتھی نے میری کمر کا پٹکا اُتارا اور کچھ زور سے خلا میں پھینک دیا۔ یکایک ایک شور پیدا ہوا اور کوئی چیز ہماری طرف آتی ہوئی دکھائی دی۔ میرے ہمراہی نے کہا لم دیو اپنے خوفناک زہر سے آہنی قلعوں کی دیواروں میں شگاف کر دیتا ہے، پہاڑوں کو تہ و بالا کر دیتا ہے اور تمام دُنیا کو غلاظت رگی سے بھر دیتا ہے۔ اس کا نام فریب ہے۔" فریب کا سر اور شانے تو ایک شریف اور نیک دل انسان کے ہم صورت تھے لیکن کے جسم کا باقی ماندہ پانی میں ڈوبا ہوا حصہ سانپ سے مشابہ تھا۔ اس کی دُم کے اخیر پر ایک خوفناک ڈنک تھا جس کے ڈسے کا کوئی نہ تھا۔ ہم دونوں اس کی پشت پر سوار ہو کر اور تیزی سے آٹھویں طبقے کی طرف روانہ ہوئے۔

یہ طبقہ دس خندقوں میں منقسم تھا جن میں سے ہر ایک فریب دہی اور مکاری کی مختلف اقسام کے لئے مخصوص تھی۔ ان میں سے پہلی میں ہم نے برہنہ روحیں دیکھیں جن کے پیچھے مہیب سینگوں والے شیطان چابک لئے دَوڑ رہے تھے اور بے دردی سے انہیں رہے تھے۔ یہ ایسے لوگ تھے جنہوں نے صنفِ نازک کو دھوکا دے کر بدراہ کر دیا تھا۔ خلیج کے ایک طرف اور سب سے الگ ہم ب آدمی کو دیکھا کہ انتہائے عقوبت سے آنسو بہانے کی حد سے گزر چکا تھا اور اس بے چارگی میں بھی ایک رعب اس کے چہرے سے نا۔ معلوم ہوا کہ یہ جیسن ہے جس کی بہادری اور اولوالعزمی نے سنہری پشم (Golden Fleece) فتح کی تھی لیکن اثنائے راہ میں اسے کے جزیرے میں ٹھہرنا پڑا جہاں کی عورتوں نے تمام مردوں کو قتل کر دیا تھا صرف ایک لڑکی ہیپسائل (Hypsipyle) نے اپنے لو چھپا کر بچا لیا تھا۔ جیسن نے خوش آیند الفاظ اور طرح طرح کے وعدوں سے اُس لڑکی کو پھسلا لیا اور جب وہ اس کے پھندے میں گئی اور حاملہ ہو گئی تو اُسے اکیلا اور بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔ اسی جُرم کی پاداش میں اب وہ سزا بھگت رہا تھا۔

آگے بڑھے تو ایسا معلوم ہوا کہ ایک جماعت آنسو بہاتی ہوئی باقاعدگی سے آگے بڑھ رہی ہے جیسے خاموشی سے لوگ قطار باندھ کر چلتے ہیں لیکن جب غور سے دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ ان سب کے سر پیچھے کی طرف لگے ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے پیشین گوئی اور دانی کا جھوٹا دعوےٰ کیا تھا اور اب بجائے آگے دیکھنے کے پیچھے کی طرف ان کے منہ موڑ دیئے گئے تھے اور وہ پیچھے کو چلتے تھے۔

آگے بڑھے تو ایک اور گڑھا نظر آیا جس میں کھولتی ہوئی پیپ تھی۔ اس کے اوپر ایک پُل بندھا تھا جس پر شیطانوں کا ایک گروہ تھا جو لوگوں کو گھیر کر لاتے اور گڑھے میں دھکیل دیتے۔ اگر کوئی پیر کر باہر نکلنے کی کوشش کرتا تو تیز اور خاردار نیزوں سے ان کے

جسم کو چھلنی کر دیتے اور اس کا گوشت پوست اُدھیڑ دیتے۔ یہ تجارت اور کاروبار میں فریب کرنے والے لوگ تھے۔ میرے ہمراہی نے احتیاطاً مجھے پیچھے چھوڑا اور خود آگے گیا۔ جونہی شیطانوں کی نظر اس پر پڑی وہ شکاری کتوں کی طرح لپکے مگر اُس نے انہیں روکا اور کہا "تم میری ایک بات سُن لو پھر جو چاہو سو کرنا۔" جب اس نے اپنے سفر کی نوعیت کی تشریح کی تو شیطانوں کے نمایندے نے ساتھیوں کو ہم پر ہاتھ اُٹھانے سے روکا لیکن جب ہم گزرنے لگے تو ان میں سے ایک اپنے ساتھی سے بولا "کہو تو اس کی کمر کا نشانہ بناؤں؟"

دوسرے نے کہا "ضرور لیکن خوب تاک کر۔"

پہلے نے اتنا مہیب نیزہ اُٹھایا کہ میں ڈر سے کانپنے لگا، لیکن جس سے ہماری گفت و شنید ہوئی تھی اُس نے اُنہیں ڈانٹا اور عہد کی پابندی پر مجبور کیا۔ شیطانوں کی معیت اور رہنمائی میں ہم آگے بڑھے، میری نظر گڑھے کی گہرائی پر جمی تھی۔ جیسے کہ مینڈک بارش کے موسم میں کسی تالاب یا حوض میں پانی سے فقط سر باہر نکالے پڑے رہتے ہیں تاکہ اگر ذرا بھی کوئی ناموافق واقعہ پیش آئے تو فوراً غڑاپ سے ڈبکی لگالیں اسی طرح ہزاروں انسان شیطانوں کے خاردار نیزوں کے ڈر سے فقط سر اور مُنہ باہر نکالے اس کھولتی ہوئی پیپ میں پڑے تھے۔ اپنے دشمنوں کو گرد جمع ہوتے دیکھ کر اُنھوں نے فوراً ڈبکی لگائی۔ لیکن جیسا کہ بعض دفعہ مینڈکوں سے بھرے تالاب میں پتھر پھینکو تو تمام مینڈک غائب ہو جاتے ہیں لیکن اِکّا دُکّا وہیں رہ جاتا ہے کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے اسی طرح جب باقی تمام ساتھی غوطہ لگا کر بچ گئے تو صرف ایک اوپر رہ گیا۔ ایک شیطان اُس کے بال پکڑ کر بُری طرح کھینچتا ہُوا باہر لے آیا باقی سب چیخے "خوب! اب اس کا گوشت ناخنوں سے نوچ ڈالو۔"

ایک شیطان کے منہ سے دو خوفناک دانت نکل رہے تھے اُس نے ایک کی ضرب سے اس کے جسم کو چھید ڈالا۔

دوسرا غصّے سے بولا "خبردار اسے ہاتھ نہ لگانا۔ یہ میرا شکار ہے۔" اور اس نے اپنا نیزہ تانا۔

وہ اپنے آپ کو دشمنوں میں گھرا ہُوا پا کر بولا "یہ بہادری نہیں، مزا تو جب ہے کہ مجھے ایک بار چھوڑ دیا جائے پھر دیکھیں کون پکڑتا ہے۔"

ان میں سے ایک بولا "اچھا یہ بھی کر دیکھو۔ تمہیں بھاگنے کا موقع دیا جائے گا اور ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تمہیں نیچے نہیں اُترنے دیں گے بلکہ راستے ہی میں دبوچ لیں گے۔"

سب ایک طرف ہٹ گئے اور وہ تیزی سے بھاگا۔ فوراً دو شیطان اس پر جھپٹے لیکن خوف سبک پرواز نکلا اور شکاریوں کو پیچھے چھوڑ گڑھے میں جا پھاندا اور غوطہ لگا سب کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ غصّے میں شکاری ایک دوسرے پر پل پڑے اور لڑتے ہوئے گتھم گتھا ہو کر اسی گڑھے میں جا گرے۔ پھر اپنی حماقت و ناکامی سے شرمندہ ہو کر باہر نکلنا چاہا لیکن پیپ ان کے پروں سے لپٹ گئی تھی جس سے پیچھا چھڑانا آسان کام نہ تھا۔ آخر باقی شیطانوں نے خاردار نیزوں سے چھید کر انہیں باہر نکالا۔

(۸)

آگے بڑھے تو ریاکاروں کا گروہ ملا جنہیں یہ سزا دی گئی تھی کہ ان کے سر پر بھاری بھاری خود پہنائے گئے تھے جو باہر سے تو بڑے منقش بصورت تھے لیکن اندر سیسہ بھرا ہوا تھا جو گھل گھل کر ان کے بھیجے پکا رہا تھا۔ یہ خندق کے گرد چکر کاٹتے رہتے۔ اس سے آگے رہزنوں اکوؤں کا گروہ تھا جن کا خون اژدہے چوس رہے تھے۔

ان سب کو چھوڑ کر ہم آگے بڑھے تو جھوٹے اور خود غرض مشیروں اور مصلاح کاروں کا گروہ پایا جو ہر ایک علیحدہ علیحدہ تند آگ کے وں میں پھنک رہا تھا۔ ایک طرف یولیسیز (Ulysses) اور ڈائمیڈ جنہوں نے ایگمینان کو ٹرائے کا محاصرہ جاری رکھنے کا مشورہ ر ہولناک خونریزی کرائی آگ میں جل رہے تھے۔ ہم نے یولیسیز سے پوچھا کہ تمہارے آخری سفر کا کیا انجام ہوا تھا۔ یولیسیز ورجل کا شکرگزار ا کہ اس نے اس کی سوانح عمری لکھ کر اسے حیاتِ جاوید بخشی تھی اس لئے وہ بولا:۔

"جب میں سرسی (Circe) کی ساحری اور جادوگری کے جال سے بچ نکلا تو سیاحت کا بھوت پھر میرے سر پر ایسا سوار ہوا کہ مجھے اپنے کی الفت، باپ کے بڑھاپے اور اپنی وفاشعار بیوی پینی لوپی (Penelope) کی مفارقت کا خیال تک نہ آیا۔ بس یہ دھن تھی کہ ممالک اور مقامات دریافت کروں اور زندگی اور انسان کی نیکی بدی کا مطالعہ کروں۔ پس ان چند وفادار ہمراہیوں کے ساتھ جو باقی رہ تھے میں ایک چھوٹے سے جہاز پر سوار ہوا اور امید کے سہارے لنگر اٹھا دیا۔ برسوں ہم چلا کئے اور کئی ممالک سے گزرے یہاں تک اس مقام پر پہنچے جسے ہرقلیز (Hercules) نے انسانی کوشش کی انتہا قرار دیا تھا۔ چلتے چلتے ہم بوڑھے ہو چکے تھے لیکن حیات وس پوری نہ ہوئی تھی۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا "رنج و خوشی کے رفیقو! اس قدر مصائب برداشت کرنے کے بعد اب ہم رب کے آخری مقام تک پہنچ چکے ہیں لیکن ابھی یہ دریافت کرنا باقی ہے کہ سورج ڈوبنے کے بعد کہاں جاتا ہے اور کس طرح دوسرے دن رق سے نمودار ہوتا ہے۔ تمہاری ہمت سے کوئی بات دور نہیں ہے۔ یاد کرو کہ تم کس ملک کے باشندے ہو یقیناً تم باقی ملکوں کے لوگوں کی طرح نیانہ اور جہالت کی زندگی بسر کرنے پر قناعت نہ کرو گے بلکہ اپنی عمر کو نیکی اور علم حاصل کرنے میں صرف کرو گے" میرے الفاظ نے کے دلوں میں روح پھونک دی اور نئی امیدوں کے ساتھ ہم نے ایک بار پھر لنگر اٹھا دیا اور اپنے بوڑھے ہاتھ پاؤں کو حرکت دی اور وؤں کی مدد سے آگے بڑھے۔ پانچ دفعہ چاند گھٹتے گھٹتے نظروں سے غائب ہو گیا اور اتنی ہی دفعہ آہستہ آہستہ پھر مکمل ہوا لیکن ہم چلتے رہے ر کوئی نیا نشان نہ ملا۔ ایک دن دور ہمیں ایک نہایت بلند پہاڑ نظر پڑا۔ میں نے اپنی سیاحت میں اس سے بلند پہاڑ کبھی نہ دیکھا تھا۔ ہم شی سے چلا اٹھے لیکن یہ خوشی جلد ہی جاتی رہی کیونکہ ہماری امیدوں کی اس بستی سے ایک آندھی اٹھی جس نے زور سے ہمارے جہاز کو ماری۔ تین دفعہ ہمارا جہاز گھوما اور بچ گیا لیکن چوتھی دفعہ ایک بڑی لہر نے اسے ایسا دبایا کہ پھر نہ ابھر سکا۔ ہم سب کا اور اسی طرح ہماری ں کا خاتمہ ہو گیا۔"

انہیں اپنی مہم کی ناکامی پر افسوس کرتے ہوئے وہیں چھوڑ ہم آگے بڑھے تو مجھے ایک اطالوی نظر پڑا جو شکل و شباہت سے میرا ہم وطن معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اس سے اُس کا حال پوچھا تو وہ بولا اگر مجھے خیال ہوتا کہ تو اس بھڑکتی ہوئی آگ سے بچ کر کبھی دنیا میں واپس جا سکیگا تو کوئی چیز مجھے جواب دینے پر مجبور نہ کر سکتی لیکن میں جانتا ہوں کہ یہاں سے کبھی کوئی بچ کر نہیں گیا۔ یہ جگہ ہر راز کی بہترین محافظ ہے اس لئے سُن کہ میں نے اپنی زندگی بطور ایک سپاہی کے شروع کی تھی لیکن میری طبیعت بہادری کی بہ نسبت بُزدلی کی طرف زیادہ مائل تھی اس پر قابو پانے کے لئے میں نے راہبانہ زندگی اختیار کی اور پاپائے اعظم کے قدموں میں حاضر ہُوا، ایک دن میرے نئے آقا نے علیحدگی میں مجھے کہا "تو جانتا ہے کہ بہشت کی کنجیاں مجھے دی گئی ہیں اور جسے چاہوں گناہ سے پاک کر دوں اور جسے چاہوں گناہگار شمار کر لوں پس تو گناہ کی ظاہری شکل کو خاطر میں نہ لا اور اپنی فریب کاری سے میری مدد کر۔"

اس کے بعد اُس نے مجھے اپنے دشمن کی تباہی کے لئے ایک نہایت ہی خوفناک سازش میں مشیر اور آلۂ کار بنایا، کام میری طبیعت کے موافق تھا۔ نجات کے وعدے سے خوش ہو کر میں نے نہایت چالاکی سے اُسے سرانجام دیا لیکن جب میری موت واقع ہوئی اور سینٹ فرانسس مجھے بہشت کو لے جانے کے لئے آیا تو اُسے ایک بدی کے فرشتے نے روکا اور کہا "یہ میرا مال ہے۔ تمہارا اس پر کوئی حق نہیں" اس پر سینٹ فرانسس نے کمزوری کا ثبوت دیا اور کوئی جھگڑا نہ کیا حالانکہ وہ کئی دلائل پیش کر سکتا تھا۔ مجھے دوزخ کے پاس لے گئے اور میں آٹھویں طبقہ میں شعلوں کی نذر کر دیا گیا"

باقی خندقوں میں سے گزرتے ہوئے جن میں مختلف اقسام کی فریب کاریوں کی سزا دی جاتی تھی ہم دوزخ کے نویں طبقہ میں پہنچے۔ یہاں میں نے دُور سے دیکھا کہ نہایت بلند اور مضبوط برج نصب ہیں لیکن نزدیک پہنچنے پر معلوم ہُوا کہ یہ برج نہیں بلکہ مہیب دیو ہیں جنہیں دستِ قدرت نے بنایا اور یہی زنداں ان کے لئے بہترین مسکن تجویز کیا۔ یہیں دیو قامت نمرود بھی تھا جس نے بابل کا برج تعمیر کیا تھا اور اپنی طاقت کے بل پر خدا سے مقابلہ کی طرح ڈالی تھی۔

(۹)

آگے بڑھے تو ایک یخ بستہ جھیل نظر آئی۔ ہم نے اس کی سطح پر قدم رکھا ہی تھا کہ ایک آواز آئی "ظالم آہستہ قدم رکھ۔ جانتا نہیں کہ تو اپنے قدموں سے لوگوں کے سر کچل رہا ہے"۔ میں ڈرا اور حیرانی سے اُچھل کر الگ ہو گیا کہ دوسری آواز آئی" ہائے کس نے میرا بازو توڑ ڈالا! کیا ہمارے لئے کوئی نئی سزا تجویز ہوئی ہے ؟"

میں نے جو غور کیا تو جھیل میں لاکھوں انسان غرق ہیں جن کے بدن اور تمام اعضا یخ بستہ ہو کر برف میں جکڑے پڑے ہیں۔ ایک نے میرے پوچھنے پر رو کر اپنا حال بیان کرنا چاہا۔ لیکن آنسو جو اس کی آنکھوں میں بھر آئے تھے یک لخت جم گئے اور سنگریزوں کی طرح آنکھوں میں کھٹکنے لگے اور وہ کھُلی کی کھُلی رہ گئیں۔

یہ دوزخ کا آخری طبقہ تھا اس لئے ہم نے اُسے اچھی طرح دیکھنا چاہا۔ ایک طرف دو انسان دکھائی دیئے ان میں سے ایک کا سر
ے کی گود میں پڑا تھا اور وہ اس کی کھوپڑی کو نوچ نوچ کر کھا رہا تھا۔ دوسرا برف میں جکڑا ہوا تھا اور ہل نہیں سکتا تھا۔ مجھے بڑا غصہ
یسی جگہ جہاں مصائب و عذاب ہر ایک کو گھیرے ہیں ایک انسان دوسرے سے ہمدردی کے بجائے اس قدر وحشیانہ مظالم روا رکھے
ت کرنے پر وہ آدم خور بولا :۔

" یہ شخص جو میرے سامنے پڑا ہے زندگی میں اسقفِ اعظم تھا، اس کی ظاہری پارسائی پر بھروسا کر کے میں نے سب راز
ے کہ دیئے جن سے فائدہ اُٹھا کر اُس نے مجھے اور میرے چار معصوم بچوں کو گرفتار کرا کے زندان میں ڈال دیا۔ رات کو ہم پڑے رہے
لحہ بھر کے لئے بھی نیند نہ آئی۔ صبح ہم منتظر تھے کہ کب زندان کا دروازہ کھلے اور کب ہمیں کھانا ملے کیونکہ بچے رات سے بھوکے تھے
دن بھر دروازہ نہ کھلا، شام کے وقت بچے رونے لگے اور میرے بھی آنسو آنکھوں سے بہ نکلے لیکن رات کی تاریکی نے انہیں چھپا لیے
صبح کی روشنی میں ہم نے ایک دوسرے کے چہرے پر یاس و حسرت کے بادل چھائے ہوئے دیکھے۔ غصے سے میں اپنے ہاتھ کاٹنے لگا
م بچوں نے سمجھا کہ بھوک سے اپنا گوشت کھانا چاہتا ہوں وہ بولے " اباجان! ہمارا گوشت پوست آپ کی دی ہوئی خوراک ہے جناب
پ بھوکے ہیں ہمارا گوشت خوراک بنائیے "!

بچوں کے ایثار نے مجھے بھی صبر کرنے پر مجبور کیا۔ سارا دن یہاں تک کہ تیسرے دن بھی ہم خاموش بیٹھے رہے لیکن آخر کب تک؟
دن میرے ننھے بچے نے رو کر کہا " اباجان! مجھ بے گناہ کی جان نکلی جاتی ہے " اور تڑپ تڑپ کر میرے قدموں میں جان دی۔
پانچویں اور چھٹے دن میرے باقی تین بچے بھی میری آنکھوں کے سامنے تڑپ تڑپ کر مر گئے۔ اب میری بینائی زائل ہو چکی تھی ٹٹول کر
دیکھتا اور تین دن تک انہیں پکارتا رہا یہاں تک کہ فاقہ کشی نے مجھے اس قابل بھی نہ رکھا اور دل و دماغ کی تمام طاقتیں سلب ہو
اور ساتھ ہی روح بھی پرواز کر گئی "۔ اتنا کہہ کر اُس نے شکاری کتے کی طرح اسقف کے مغز کو دانتوں سے نوچنا شروع کیا۔

میرا ہمراہی بولا" دوزخ کے سلطان کا دربار آتا ہے۔ ہوشیار!" میں آگے بڑھا ہی تھا کہ ایک تند و تیز آندھی سے مقابل
پڑا۔ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو بچا بچا کر چلے۔ سامنے مصائب کی بستی کا فرمانروا ابلیس کمر تک برف میں گڑا کھڑا تھا۔ قد میں
لانک سے جو اولیں طبقۂ دوزخ میں تھے یا ان دیووں سے جن کا ذکر پہلے آچکا ہے بہت بڑا تھا۔ کہتے ہیں کہ اپنی سرکشی سے قبل بہت
شکل تھا لیکن اب وہ پہلا سا نہیں رہا تھا۔ ایک کے بجائے تین سر تھے اور چمگادڑ کی طرح بڑے بڑے بادبانوں کی طرح ہل رہے تھے
کی حرکت سے وہ آندھی پیدا ہوتی تھی جو ہمیں راہ میں ملی تھی اور اس کرۂ زمہریر کو سرد تر بنا رہی تھی لیکن سب سے زیادہ کریہہ منظر
ستا ہم نے دیکھی یہ تھی کہ وہ ہر ایک منہ میں ایک ایک انسان کو لئے چبا رہا تھا۔ تینوں لٹکتے ہوئے انسان تڑپتے چلاتے اور
پاؤں مارتے لیکن شیطان کے خوفناک جبڑے سے الگ نہ ہو سکتے۔ وہ جو سامنے مُنہ میں تھا اور سب سے زیادہ عذاب پا رہا تھا

یہودہ تھا جس نے چند ٹکلیوں کے عوض اپنے آقا اور رہنما حضرت مسیح کو پکڑوا کر دشمنوں کے حوالے کر دیا تھا۔ دوسرے دونوں جبڑوں میں بروٹس (Brutus) اور کیسیس (Cassius) تھے جنہوں نے اپنے محسن بادشاہ قیصرِ اعظم کو نہایت بے دردی سے قتل کیا تھا۔

ابلیس کے چاروں طرف ایسے ہی اور لوگ جنہوں نے اپنے محسنوں سے غداری کی تھی پڑے ٹھٹھر رہے تھے بعض تو سر کے بل کھڑے تھے اور بعض گردن تک برف میں دبے ہوئے تھے۔

میری نظریں ان پر گڑی تھیں کہ میرا ہمراہی بولا "اب شام ہو چلی ہے تم صبح سے دوزخ کے مختلف طبقوں کی سیر کر رہے ہو۔ یہ آخری طبقہ بھی ختم ہوتا ہے۔ رات کی تاریکی کی آمد سے پہلے ہمیں اس جگہ سے نکل جانا چاہئے تاکہ کل صبح سے پیشتر ہم تمہاری دوسری سیرگاہ یعنی اعراف میں جا سکیں"۔

میں اپنے ہمراہی کے ساتھ ہو لیا اور ایک پیچیدہ راستے سے ہوتے ہوئے ہم زندوں کی دُنیا میں جا پہنچے۔ ستارے آسمان پر چمک رہے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں نے انہیں ایک عرصۂ دراز کے بعد دیکھا ہے ❊

محمد حسین غازی

ناکردہ گناہ در جہاں کیست بگو
آنکس کہ گنہ نکرد چوں زیست بگو
من بد کنم و تو بد مکافات دہی
پس فرق میان من و تو چیست بگو

خیّام

مونا لِسا

(اِس مرتبہ پیرس میں تصویر خانۂ لوُوَر (LOUVRE) میں لیونارڈو دا وِنچی کے شاہکار کو پہلی مرتبہ دیکھا۔ اصل پھر اصل ہے۔ یا ممکن ہے اس خیال کا اثر ہو کہ یہ اس عظیم الشان شخصیت کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ معلوم نہیں کتنے مہینوں تک، یا شاید کئی برس تک اس چھوٹے سے پردے پر اِس مصورِ اعظم کی انگلیاں، اُس کا مُوقلم کام کرتا رہا ہوگا۔ اُس کی حسن آفریں اور حسن شناس نگاہیں تصویر کے خطوط میں تبدیلیاں کرتی رہی ہوں گی۔

اِس نظم کو میں اپنے دوست ڈاکٹر شوکت اللہ شاہ کے نام معنون کرتا ہوں جو عنقریب پیرس میں اپنی تعلیم ختم کر کے ہندوستان واپس جائیں گے اور جن سے ہندوستان کے مستقبل کی بڑی بڑی اُمیدیں وابستہ ہیں۔

عزیز احمد

پیرس ۶ رجنوری ۱۹۳۶ء)

(۱)

(لیونارڈو دا وِنچی سے)

ے مصور کوئی جذبہ تجھ پہ ایسا چھا گیا
حُسن کا طوفاں سمٹ کر موُقلم میں آ گیا

ر کی حدت سے آنکھیں کیوں نہ پتھرائیں تری
حُسن کی شوکت سے دِل تیرا نہ کیوں تھرّا گیا

امۂ فطرت نے کھینچی تھی غلط تشبیہِ یار
دیدۂ عاشق، جمالِ دوست کی لم پا گیا

ارضِ گلگوں پہ جو طوفاں تھا موجِ رنگ کا
بن کے سیلابِ تخیّل تیرے دل پر چھا گیا

ۂ تناسب، شاہدِ فطرت کو جس پر رشک آئے
آنکھ نے دیکھا، قلم سے خود بخود کھنچتا گیا

وئے دِلکش رشکِ زہرہ۔ اُس پہ شانِ حُسن سے
وہ تبسم عصمتِ مریمؑ کو جو شرما گیا

فیں خطوطِ حُسن کی جو خم بہ خم رعنائیاں
پردہ داری ان کی احساسِ حیا کرتا گیا

رنگ کی مستی سما سکتی نہ تھی تصویر میں　　ساقی مخمور ساغر کو ذرا چھلکا گیا

(۲)

(مونا لسا کا تبسم)

ہیں تبسم میں سکوتِ سحر کی خاموشیاں　　حسن کی رعنائیوں میں قلب کی بیہوشیاں
رنگ و خم کی دلبری میں نغمۂ نسوانیت　　یا شفق سے آسماں کی شام کو سرگوشیاں
حسن بھی کیا لائے تابِ بادۂ سر جوشِ حسن　　اس تبسم سے چھلک جانے کو ہیں مدہوشیاں

(۳)

(تصویر کا اثر)

ہے مکمل کس قدر عکسِ لقائے زندگی　　زندگی سے ہے فروزاں ترضیائے زندگی
برقِ آشامی نظر کی دیکھ لیتی ہے کبھی　　عشوۂ خونریز میں پنہاں ادائے زندگی
ہے تخیل میں خدایا کس غضب کی دلبری　　بن گیا صحرا بہشتِ جانفزائے زندگی
خارزاروں میں گلوں کے جلوے آتے ہیں نظر　　مست کرتی ہے شمیمِ عطر سائے زندگی

شورشِ طوفاں میں جب موجیں تلاطم خیز ہوں
کوئی سن لیتا ہے سازِ دل ربائے زندگی

عزیز احمد بی اے (عثمانیہ)
یونیورسٹی کالج۔ لندن

آزادی کے دام

ناہید۔ میں کل ایک روسی ڈراما پڑھ رہی تھی۔ زمانۂ حال کا روسی ڈراما۔

علّو۔ پسند آیا؟

ناہید۔ سر میں درد تھا وہ جاتا رہا۔

علّو۔ ڈراما نہ ہُوا اسپرین ہوئی۔

ناہید۔ تم تو ہمیشہ بیہودہ گفتگو پر تلے رہتے ہو۔

علّو۔ اس اتہام کے لئے تمہیں معاف کرتا ہوں کیونکہ مجھ سا متین انسان چراغ لے کر ڈھونڈو تو نہ ملے گا۔ وہی چراغ جس میں ایک پیسہ کا تیل تین دن میں جلتا ہے اور جو اب پنجاب کے بعض افلاس زدہ گاؤں میں کبھی کبھی کام آتا ہے ورنہ سمجھدار گاؤں والے اب بجلی کی torch استعمال کرتے ہیں۔

ناہید۔ خدا کے لئے اس بھونڈی تقریر کو ختم کرو ورنہ میرے سر میں پھر درد شروع ہو گا۔

علّو۔ لاؤ وہی روسی ڈراما تمہارے سر سے باندھ دوں۔

ناہید۔ You fool of a darling ۔ کیا تم سوچ کر گفتگو کرنے کے قطعی نااہل ہو؟

علّو۔ (اپنے ہونٹوں کو اپنی اُنگلیوں سے بھینچ کر) اُوں اُوں۔

ناہید۔ واللہ کتنے اچھے معلوم ہوتے ہو مگر اب بات سنو اور اگر تمہاری سمجھ میں آئے تو سوچ کر جواب دو۔ سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں ہم لوگ یعنی ہندو، مسلمان، سکھ، یا یوں کہو کہ پنجابی، بنگالی، مرہٹے، مدراسی ہنستے کس بات پر ہیں؟

علّو۔ جھوٹ قطعی جھوٹ۔

ناہید۔ کیا جھوٹ؟

علّو۔ یہی کہ یہاں کوئی ہنستا ہے؛ روتے آئے اور ساری عمر رو کر روتے چل دیں گے۔ ہنسی گناہ ہے۔ رونا ثواب ہے۔ اگر خدا کو یہ منظور ہوتا کہ یہاں کے لوگ ہنسیں تو پھر اتنے صوفی، مہاتما اور سادھو یہاں پیدا ہی کیوں کرتا؟ ان کی بجائے اچھے Comic Actor نہ بنا دیتا۔

ہیلو۔ (جھنجھلا کر) تم ہمیشہ اعتراض کا پہلو لیتے ہو۔ کام کی بات نہیں کرتے۔

علو۔ اچھا لو کام کی بات کرتا ہوں۔ کیا تمہاری نانی نے کبھی کوئی اچھا ڈراما دیکھا ؛ یا اس تمام نانیوں، دادیوں، پھوپھیوں، خالاؤں کے مکمل سلسلے نے گذشتہ ہزار سال میں ایک بھی مزاحیہ ڈراما میں حصہ لیا ؛ یا ہمارے نانا جان اور دادا جان کے جد امجدگان کے مکمل رسٹ نے کبھی بھانڈوں کے تماشے کے سوا اور کسی ہنسی مذاق کے شغل سے دل بہلایا ؛ اب زمانہ بدل رہا ہے شاید دو چار سو سال میں ہنسی کا لطف آنے لگے ۔

ناہید۔ یہ تاریخ کا بھوت کیوں تمہارے سر پر سوار ہے ؛

علو۔ اس لئے کہ دیکھتا ہوں کہ بچے (یعنی تعلیم یافتہ گھروں کے بچے) اب مذاق کا لطف انگریزی چٹکلے بیان کر کے اٹھاتے ہیں۔ تم لوگوں میں اگر یہ زمانہ واقعات جو تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں دیکھنے کی قابلیت ہوتی تو تمہیں خیال گزرتا کہ ہندوستان کا افلاس یا ہندوستان کا ایک مفتوح ملک کی حالت میں زندگی بسر کرنا اس قدر حیرت خیز نہیں ہے جس قدر یہ کہ اب ہمارے بچے مذاق انگریزی میں کرتے ہیں۔ امریکا میں محنت سے فلم تیار ہوتی ہے اور پھر اس پر یہاں کے لوگ ہنس لیں تو ہنس لیں ورنہ دیسی ململ کی طرح دیسی ہنسی بھی اب مفقود ہے ۔

ناہید۔ لاحول ولا قوۃ۔ ہنسی کی بات پر بھی آپ نے وعظ شروع کر دیا۔ میری سہیلیاں سچ کے طعنے مجھے دیتی ہیں کہ شوہر کیا ہے دیہات سدھار کا لیکچر ہے۔

علو۔ (جھینپ کر) غنیمت سمجھو کہ اس سے بدتر نہیں ہوں۔

ناہید۔ اس سے بدتر تم کیا ہوتے ؛

علو۔ کسی وزارت کا امیدوار۔

ناہید۔ انگور کچے ہیں کون دانت کھٹے کرے والا معاملہ ہے مگر اس نوک جھوک کو بند کرو اور واقعی کوئی ہنسی کی بات سناؤ۔ کسی زمانے میں تو تمہاری خوش مزاجی کی دھوم تھی ۔

علو۔ جی ہاں۔ شادی سے پہلے ۔ زوجہ آمد تبسم برخاست والا معاملہ ہے ۔

ناہید۔ بالکل دقیانوسی۔ کوئی نئی بات کہو۔

علو۔ جانتی ہو کہ کشمیری ہوں ۔

ناہید۔ اس کے کیا معنی ؛

علو۔ ایک کشمیری کڑکتی دھوپ میں کھڑا تھا۔ کسی بھلے آدمی نے کہہ دیا کہ "میاں دھوپ میں کیوں کھڑے ہو چھاؤں میں ہو جاؤ" کشمیری

بولا ”کیا دو گے؟“

ہید۔ تم بات سناؤ ہم ہنس دیں گے۔

لو۔ سبحان اللہ گویا تم لنڈن کے بازاروں کی وہ شین ہو کہ پیسہ داخل چاکولیٹ برآمد۔

ہید۔ پھر وہی اعتراض کا پہلو! میں چاہے کچھ ہی ہوں تم کیوں دنیا کے لئے نمونہ نہیں بنتے؟

لو۔ سلو ڈارلنگ۔ انسانی دماغ کوئی بنئے کی دکان نہیں کہ پیسہ دے دیا گڑ لے لیا اور آخر میرے دوست کیا مر گئے ہیں کہ میں تمہیں عشق کی باتیں سناؤں۔ تمہاری کوئی سہیلی ہوتی تو شاید دماغ کچھ کام بھی کرتا۔

ناہید۔ کاش کہ اس وقت تم کچھ اور آرزو کرتے؛ لو وہ آگئیں۔

(مس دمتی داخل ہوتی ہیں۔)

(۲)

دمتی۔ تم دونوں کیا لڑ رہے تھے؟

علو۔ جی ہاں ہنسی کی باتوں پر لڑائی ہو چلی تھی۔

ناہید۔ کہو دمتی چار پر ٹھیرو گی؟

دمتی۔ نہ صرف چار پر بلکہ اگر تمہارا Tennis court ٹھیک ہے تو ٹینس بھی کھیلوں گی بشرطیکہ تم کپتان شرما کو بلوا لو۔

علو۔ بڑا خوش نصیب ہے کپتان شرما!

دمتی۔ جی ہاں۔ وہ ناہید سے باتیں ملائے گا آپ جلیں گے مجھے لطف آئے گا۔

ناہید۔ تمہیں گھر پہنچانے کے لئے تو اسی کی موٹر کام آئے گی۔

علو۔ ہرگز نہیں دمتی۔ میں خود تمہیں لے جاؤں گا۔

دمتی۔ بڑے شوق سے۔ میں خود یہی چاہتی ہوں۔

(علو اٹھ کر چلا جاتا ہے۔)

ناہید۔ برا نہ مانو تو کہوں کہ شرما کچھ ایسا خوش شکل تو ہے نہیں کہ میں باور کر لوں کہ تم اس پر جان دیتی ہو۔

دمتی۔ نیہ و ڈارلنگ! تم باوجود اس قدر سمجھدار ہونے کے ابھی تک بالکل دقیانوسی ہو۔ جان دینے کا یا مرنے کا کیا سوال ہے؟ عارضی طور پر یہاں بھی اور لنڈن میں بھی کئی اچھے سے لونڈوں کو شکل شباہت کے لحاظ سے پسند کر چکی ہوں یعنی بقول تمہارے کچھ ان پر فدا ہو چکی ہوں مگر سوال تو رفیقِ زندگی کا ہے شکل کو کیا کروں۔

ہید۔ تو تم گویا بغیر romance شادی کرنے کی قائل ہو۔

تی۔ قطعی۔ مجھے تو یہ دیکھنا ہے کہ وہ مجھے کچھ romance کرتا ہے کہ نہیں۔ سو شرما کرتا ہے۔ اگر مجھے اس سے زیادہ romance کی خواہش ہوئی تو اوّل تو کوشش کروں گی کہ وہی میرا hero بنے لیکن اگر اس میں کامیابی نہ ہوئی تو قسمت۔

ہید۔ کیا مطلب ؛

تی۔ مطلب یہ کہ میں اپنے آپ کو اتنا ذلیل نہیں سمجھتی کہ خواہ مخواہ کسی مرد کی پرستش کرنے لگ جاؤں اور اس انتظار میں بڑھیا بھی نہیں بننا چاہتی کہ جب تک کوئی لاثانی نوجوان نہ ملے تب تک شادی نہ کروں۔ میں تو second best کی بے انتہا قائل ہوں۔ بعض وقت اس قسم کا تنکا تیرنِ جاتا ہے۔

ناہید۔ غیر معمولی طور پر معاملہ فہمی کی باتیں کر رہی ہو۔ اچھی تو ہو ؛

دمتی۔ سچ پوچھو تو تھک گئی ہوں۔ ہم ہندوستانی لڑکیوں کو شوہر کی تلاش کچھ راس نہیں آئی۔ بے انتہا مصیبت ہے۔ یہ ان یورپین چھوکریوں کا ہی دل گردہ ہے کہ سالوں انتخاب میں گزار دیتی ہیں اور ذرا نہیں اُکتاتیں۔ شریفوں کا تو یہ کام ہے نہیں۔

ناہید۔ (ہنس کر) ولایت سے واپس آئے ابھی ایک سال پورا نہیں ہؤا اور وہ آزادی کے لمبے لمبے دعوے سب ختم!

دمتی۔ (آبدیدہ ہو کر) نید د تم بھی کوڑمغز ہو گئی ہو۔ یہاں کی آب و ہوا ہی ایسی ہے۔

(ناہید جلدی سے اُٹھ کر دمتی کو پیار کر لیتی ہے اور یہ کہہ کر کہ "چلو میرے کمرے میں چلو" ہاتھ پکڑ کر ساتھ لے جاتی ہے۔)

(۳)

ناہید۔ معاف کر دو ڈارلنگ۔

دمتی۔ (چند سکیوں کے بعد) سُنو آج کا قصہ۔ ابھی دو گھنٹے نہیں ہوئے کہ ہم سب اپنے گھر خوشی خوشی لنچ پر تھے۔ باآوجی (دمتی کے والد) غیر معمولی طور پر خوش مزاجی کا نمونہ تھے اور بجائے حسبِ معمول کھانا کھا کر اُٹھ جانے کے میز پر بیٹھے رہے اور جب میں اُٹھی تو مجھ سے کہنے لگے "دمتی میرے کمرے میں چلو"۔ وہاں پہنچی تو یہ گفتگو ہوئی :۔

بابوجی۔ دمتی! تم تو پوری آزادی کی قائل ہو نا ؛

میں۔ جی ہاں۔

بابوجی۔ صرف اپنے لئے یا سب کے لئے ؛

میں۔ وہ کیا خاک آزادی ہوئی جو صرف اپنے لئے ہوئی۔ آزادی تو وہی ہے جو سب کے لئے قطعی طور پر مساوی ہو۔

یعنی مجھے اور تمہاری والدہ کو بھی آزادی کا حق حاصل ہے ؛

آپ بابوجی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ ضرور آپ کو اور بھابی کو قطعی آزادی کا حق ہے ؛

۔ اگر ہے تو یہ لو دس ہزار کا چیک۔ یہ میرا ناچیز تحفہ ہے۔ اکیس سال کی عمر آج ہو گئی ہو۔ ہم تم سے آزاد ہونا چاہتے ہیں۔ گڈ بائی

ار لنگ "۔

یہ کہہ کر بابوجی چل دیئے۔ پہلے تو آدھ گھنٹہ میں مبہوت رہی اور پھر بغیر بھابی سے ذکر کرنے کے تمہارے یہاں چلی آئی۔ سنا

تم نے ! ماں باپ کو بھی آج کل پر لگ گئے ہیں۔ ہم سے آزاد ہونا چاہتے ہیں۔ ہم کہاں جائیں ؛

ید۔ تمہارے والد جتنی تم سے محبت کرتے ہیں وہ ساری دنیا کے لئے نمونہ ہے اور یہ بھی اُن کی محبت کا کرشمہ ہے کہ دل پر پتھر رکھ

کر تمہاری آزادی میں حارج نہیں ہوئے۔ مگر لاؤ مجھے وہ چیک دے دو۔ اور میرے آنے تک خبردار تم کہیں نہ جانا۔ اسی کمرے

میں رہنا۔

(دمتی چیک دینے لگتی ہے کہ باہر سے علو کواڑ کھٹکھٹاتا ہے)

ید۔ علو۔ ذرا ٹھیرو۔ ابھی آئی۔

(چیک لے کر ناہید باہر نکلتی ہے اور کواڑ باہر سے بند کرتے ہوئے کہتی ہے "دمتی
کو یہیں آرام کرنے دو۔ میں اس کے ہاں سے ہو کر ابھی آئی۔")

و۔ میں تو خود باہر جا رہا ہوں۔ صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ ٹینس کا انتظام ہو گیا۔

ہید۔ تو تم کب آؤ گے ؛

و۔ ٹینس کے وقت تک آجاؤں گا مگر میرا انتظار نہ کرنا۔

(دونوں الگ الگ موٹروں میں سوار ہو کر چل دیتے ہیں)

(۴)

(ناہید جب دمتی کے گھر پہنچتی ہے تو کیا دیکھتی ہے کہ بابوجی یعنی دمتی
کے والد موٹر میں سوار ہونے کو ہیں۔)

اہید۔ (ہنس کر مگر بہت خاموشی سے) واہ بابوجی ! میں آپ کے ہاں چار مہینے آئی اور آپ نے خاص طور پر خود ہی مجھ سے کہہ کر
تاریخ مقرر کی اور اب آپ چلے !۔

ابوجی۔ (حیران ہو کر) آپ سے میں نے تاریخ مقرر کی ؛

ناہید۔ (بابوجی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے نہایت چپکے سے) جی ہاں ضرور۔ آپ نے خود تاریخ مقرر کی۔ آیئے میں آپ کو بتاؤں۔

(یہ کہہ کر ناہید بابوجی کے کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ بابوجی پریشانی سے پیچھے پیچھے داخل ہوتے ہیں اور ناہید کمرہ بند کر دیتی ہے۔)

ناہید۔ آپ سے ضروری بات کرنی تھی اسی لئے چاء کا بہانہ کیا۔ یہ لیجئے اپنا دس ہزار کا چک۔ آزادی کی قیمت اس سے کہیں زیادہ ہے۔

بابوجی۔ (اصل مطلب سمجھ کر اور مسکرا کر) اچھا ڈارلنگ۔ جو قیمت میری حالت کو دیکھتے ہوئے تم مقرر کر دو وہی لے لو مگر میں واقعی آزادی چاہتا ہوں۔

ناہید۔ آپ اس اقرار پر قائم ہیں کہ میری مقررہ قیمت منظور کر لیں گے۔

بابوجی۔ مجھے تم پر اتنا اعتبار ہے، تم سے اس قدر پیار ہے کہ تمہاری مقرر کردہ قیمت فوراً قبول کر لوں گا۔

ناہید۔ پھر سوچ لیجئے۔ اپنے پیار کے چکے میں نہ آیئے۔ عورتیں بڑی چالاک ہوتی ہیں۔

بابوجی۔ تم چالاک ہونے کے دن پیدا ہی نہیں ہوئیں۔

ناہید۔ بابوجی یہ نہ کہئے۔ خوب غور کر لیجئے۔

بابوجی۔ جو تم کہو گی وہی ٹھیک ہوگا۔ اب بتاؤ آزادی کے دام؟

ناہید۔ دو سال۔

بابوجی۔ دو سال کیا؟

ناہید۔ دو سال کے معنے دو سال۔ یعنی دو سال دمتی آزاد اور آپ پابند۔

بابوجی۔ بڑی نٹ کھٹ ہو مگر تمہارا کہنا سر آنکھوں پر۔

(۵)

محض اتفاق سے اس شام چار پر نہ ٹینس پر نہ ناہید اور نہ علو دونوں میں سے کوئی بھی اپنے گھر نہ پہنچ سکا۔ نہ سوائے کپتان شرما کے کوئی اور مہمان آنکلا مگر ناہید کے ملازم کچھ ایسے سکھائے ہوئے تھے کہ ذرا بھی مہمانوں کو معلوم نہ ہوا کہ گھر والوں کے نہ ہونے سے کسی قسم کی کمی ہے۔ چار بھی ہوئی، ٹینس بھی ہوئی اور ٹینس کے بعد سوڈا وغیرہ بھی پیش کر دیا گیا اور پھر لڑکرا اس طرح غائب کہ کپتان شرما اور دمتی کو ذرا بھی تو خیال نہ گزرا کہ گھر ان کا اپنا نہیں۔

شرما۔ مسز علاؤالدین کیا کمال کی لیڈی ہیں۔ اگر مجھے یہ یقین ہو جائے کہ وہ اس قدر سمجھدار ہیں کہ ہمیں موقع دینے کے لئے وہ گھر چھوڑ گئی ہیں تو اُن کے پاؤں چوم لوں۔

تی۔ (چمک کر) اپنا ذکر فرمایئے۔ 'ہمیں' کہہ کر مجھے خواہ مخواہ بیچ میں نہ لپیٹئے۔ مجھے توکسی موقع کی ضرورت ہے نہیں۔

ترما۔ تمہیں ضرور لپیٹوں گا (اور یہ کہہ کر لپٹ جاتا ہے)

متی۔ (الگ کھسکنے کی کوشش کرکے) چھوڑو بھی یہ قصّہ۔

ترما۔ شادی کی تاریخ مقرر کرلو تب چھوڑوں گا۔

تی۔ بی اے گڈ بائے۔ وِسکی ختم کرو۔

ترما۔ نہیں تم پہلے تاریخ مقرر کرو۔

متی۔ جب تم کہو ڈارلنگ۔

(شرما خوشی کے مارے اُٹھ کر ناچتا اور گاتا ہے۔ اتنے میں ناہید، علّو اور دمتی کا باپ داخل ہوتے ہیں۔ شرما سچ مچ ناہید کے پاؤں چوم لیتا ہے۔)

فلک پیما

ہے پریشاں رنگِ تسکینِ نمائندہ تقلید سے

آہ داغِ انفعالِ چہرۂ زیبا ہے قوم

مجھے بھی شہر کا باسی نہ تم سمجھو!

(ایک پنجابی گیت :۔ "مینوں پنڈ دی کڑی نہ جانیں" سے متاثر ہو کر)

مجھے بھی شہر کا باسی نہ تم سمجھو!
کہ شہروں میں کوئی واقف نہیں ہوتا محبت سے
وہاں فرصت کسے ہنگامہ ہائے عیش و عشرت سے
کسے ملتا ہے وقت اتنا ہوس کاری کی وحشت سے
کہ اپنا دل لگائے عشق سے یا نورِ فطرت سے
مجھے دلدادۂ ذوقِ ہوس کاری نہ تم سمجھو!
مجھے بھی شہر کا باسی نہ تم سمجھو!

نہیں ہے شہر میں اُلفت نمائش کے سوا کچھ بھی
نہیں ہے شہر میں مفہومِ اندوہِ وفا کچھ بھی
وہاں عفریت سے کمتر نہیں ہر آشنا کچھ بھی
نہیں ہر بات کی تہ میں بجز مکر و ریا کچھ بھی

مجھے بھی اس فریب آباد کی ہستی نہ تم سمجھو!
مجھے بھی شہر کا باسی نہ تم سمجھو!

وہاں ممکن ہے محبوب و محبت کی تجارت بھی
وہاں بکتی ہے بازاروں میں آزادی کی دولت بھی
وہاں ہے "دوستوں" میں اجنبیت اور عداوت بھی
وہاں اِک حرفِ بےمعنی ہے اُلفت اور مروّت بھی
مگر میری محبّت حرفِ بےمعنی نہ تم سمجھو!
مجھے بھی شہر کا باسی نہ تم سمجھو!

وہاں ہر قصرِ رنگیں ذوقِ عصیاں کا بسیرا ہے
وہاں ہر شمعِ رخشاں کے تعاقب میں اندھیرا ہے
وہاں اہرمنوں نے نورِ یزدانی کو گھیرا ہے
وہاں ہر فردِ انسانی محبت کا لٹیرا ہے
مجھے بھی ایک ایسا فردِ انسانی نہ تم سمجھو!
مجھے بھی شہر کا باسی نہ تم سمجھو!

ن م راشد

دربارِ مغلیہ میں ایک راجپوت شہزادہ

شہنشاہِ جہانگیر کے روزنامچہ کا ایک ورق

تاریخ دان اصحاب سے پوشیدہ نہیں ہے کہ ہندوستان میں جب سلاطینِ اسلام نے قدم رکھا تو راجگان اودے پور کے سوا اور کسی راجہ مہاراجہ نے زیادہ عرصہ تک سرکشی جاری نہ رکھی۔

راناؤں کا دستور تھا کہ جب اُن پر فوج کشی ہوتی تو وہ رعایا کو خدا کے سپرد کر کے اپنے اہل وعیال خویش واقربا کو ساتھ لے کر پہاڑوں کے دروں اور دشوار گزار مقامات میں روپوش ہو جاتے۔ سلاطینِ اسلام کا مقصد زیادہ تر چونکہ ملک و مال حاصل کرنے کے بجائے اپنی شہنشاہی قبول کرانا ہوتا تھا اس لئے جب زیادہ مدت گزر جاتی تو شاہی فوجیں واپس بُلا لی جاتیں اور مفرور لوگ اپنی اپنی جگہ پھر واپس آ کر آباد ہو جاتے۔

تمام ہندوستان کے راجے مہاراجے جب جوق جوق اکبرِ اعظم کی اطاعت میں آ گئے اور رانا کی سرکشی بدستور رہی تو مجبوراً اُس نے اپنی توجہ میواڑ پر مبذول کی۔ چتوڑ کا نامی گرامی قلعہ چھین لیا اور رانا پرتاب حسبِ عادتِ قدیم پہاڑوں میں روپوش ہو گئے۔ اکبر نے آخری زمانہ میں اس مہم کو شہزادہ سلیم کے سپرد کیا مگر یہ شہزادہ جو ۱۸ سال کی عمر سے شراب وکباب اور اس کے بعد افیون کی عادت سے راحت طلب ہو چکا تھا اس سخت ترین مہم سے کیونکر عہدہ برآ ہو سکتا تھا۔ شہزادہ سلیم میں شجاعت حمیت اور غیرت کی کمی نہ تھی لیکن جب دشمن مقابلہ ہی نہ کرے اور پہاڑوں اور دروں میں چھپتا پھرے تو اُسے زیر کرنے کی سوائے اس تدبیر کے جو مابعد شہزادہ خرم نے کی کوئی دوسری تدبیر نہ تھی۔ مگر اس درجہ محنت و مشقت برداشت کرنا شہزادہ سلیم کی طاقت سے باہر تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شہزادہ اس مہم پر نہ گیا اور حیلوں سے وقت کو ٹال دیا۔

اسی زمانے کے قریب اکبر نے وفات پائی اور شہزادہ نے بحیثیت شہنشاہِ ہند ہندوستان کے تخت پر قدم رکھا۔ باپ سے اسے محبت تھی اور باپ کی ہر خواہش کو پورا کرنا بھی اپنا فرض سمجھتا تھا۔ تخت نشین ہوتے ہی پہلے سال اس نے یہ مہم بسرداری سلطان پرویز اپنے منجھلے بیٹے کے اودے پور کو روانہ کی مگر عین مہم پر جب پرویز کی فوجیں رانا امر سنگھ کا تعاقب کر رہی تھیں سلطان خسرو پسر کلاں نے بغاوت کی۔ اس بغاوت کے فرو کرنے میں خود شہنشاہِ جہانگیر کو حرکت کرنی پڑی اور پرویز واپس بُلا لیا گیا۔

سن جلوس میں دوسری مہم بہ سرداری مہابت خاں بھیجی گئی اور عین اُس وقت کہ رانا کا حال تنگ ہو رہا تھا دکن میں بغاوت ہوئی اور
م بھی ناکام واپس ہوئی۔ ۹ سنہ جلوسِ جہانگیری میں تیسری مہم زیرِ قیادت شہزادہ خرم (جو مابعد شاہجہاں مشہور ہوا) اودے پور روانہ کی
اس شہزادہ نے انتہائی قابلیت اور ایک بوڑھے سپہ سالار جیسی دانشمندی سے رانا کو مجبور کیا کہ وہ شہنشاہِ ہند کی اطاعت
ل کرے چنانچہ ہم اس موقع پر بجنسہ صرف شہنشاہ جہانگیر کا روزنامچہ درج کرتے ہیں۔ جس سے ظاہر ہوگا کہ رانا نے کس طریقے
عت قبول کی اور شہنشاہ نے رانا کی اطاعت پذیری کے بعد اُس سے کیا سلوک کیا۔

بہ ذیلِ واقعات ۹ سنہ جلوس شہنشاہ تحریر فرماتے ہیں کہ "ماہ بہمن میں پے در پے متواتر خوش خبریاں آئیں۔ پہلی خوش خبری
انا امر سنگھ کے اطاعت قبول کرنے کی تھی۔ حالات یوں ہیں کہ فرزند سعادت مند سلطان خرم نے ریاستِ رانا میں داخل ہو
کثرت کے ساتھ جابجا فوجوں کی چوکیاں بعد تھانے قائم کئے یہاں تک کہ اکثر ایسے مقامات پر تھانے قائم کئے گئے۔ جو بُری
ب وہوا کے لئے مشہور تھے اور فوجی تجربہ کاروں کا خیال تھا کہ ان مقامات پر چوکیاں قائم نہیں رہ سکتیں۔ اِن انتظامات کے بعد
پے درپے رانا کے تعاقب میں فوجیں روانہ ہوئیں۔ گرمی کی شدت برسات کی کثرت کو فوجیں خیال میں نہ لاکر جابجا رانا اور اس
کے سرداروں اور اہل وعیال کے گرفتار کرنے کو دوڑتی پھرتیں اور کسی مقام پر رانا کو ایک لحظہ کے لئے بھی چین نہ لینے دیتیں۔

اب رانا کو معلوم ہوگیا کہ زیادہ عرصہ تک وہ محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اس لئے چار و ناچار اضطرار کی حالت میں اُس نے اپنے ملوں
ھکرن اور اپنے وزیر ناہر داس کو جو بڑا سنجیدہ وفہمیدہ لائق امیر تھا شہزادہ خرم کی خدمت میں بھیجا اور قصوروں کی معافی چاہتے ہوئے
رار کیا کہ ہر ایک بادشاہی حکم کی وہ تعمیل کرے گا۔ مگر یہ خواہش کی کہ جاں بخشی کا فرمانِ بادشاہی جس پر پنجہ مبارک کا نشان ہو عطا کیا جائے۔
ہمیشہ سے میری دلی خواہش یہ رہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ہندوستان کے قدیم ومعزز خاندانوں کو بربادی سے بچایا جائے۔ رانا پر مہم بھیجنے
کی ضرورت صرف اس لئے پیش آئی کہ رانا اپنے مضبوط قلعوں اور پہاڑوں کی تنگناؤں کی مضبوطی کے بھروسے پر ہمیشہ مغرور رہے اور مجھ
سے پہلے نہ کسی بادشاہ کی اطاعت قبول کی نہ کسی بادشاہ کے سلام کے لئے حاضر ہوئے۔ اناچار تخت نشین ہوتے ہی میرے دل میں خواہش
تھی کہ اس کمی کو پورا کیا جائے۔ بہر حال فرزند اقبال مند نے حسب رانا کی اطاعت و دولت خواہی کی اطلاع دیتے ہوئے جاں بخشی کی
سفارش کی تو ایک قلم میں نے اُس کے قصوروں کو معاف کرکے فرمان جو عنایتوں سے بھرا ہوا اور جاں بخشی کے لئے جو نشان پنجہ مبارک
سے مزین تھا افضل خاں دیوان اور سندر داس میر سامان کے ہاتھ بھیجا اور فرزند اقبال مند کو لکھا کہ اس فرمان کو رانا کے پاس بھیجکر
س کو تسلی دو اور ہر طرح سے بادشاہی عنایتوں اور رعایتوں کا اُمیدوار کرو۔

۲۶ ماہ بہمن ۹ سنہ جلوس اتوار کے دن بہمراہ کنور کرن کے رانا اپنی سب اولاد اور رشتہ داروں کے ساتھ فرزند خرم کی خدمت
میں حاضر ہوا۔ اور اُس آداب وطریقہ کے مطابق جو تورہ چنگیز خانی میں قلمبند ہے کورنش کے مراسم بجالایا جس وقت رانا نے فرزند اقبال مند

کے پاؤں پر سر رکھ کر اپنے قصوروں کی معافی چاہی تو فرزند اقبال مند نے رانا کا سر اپنی بغل میں لے لیا اور انتہائی محبت وعزت کے ساتھ اپنی مسند پر بٹھایا۔ رانا نے ایک لعل گراں مایہ جو اُس کے خاندان میں سب سے بیش قیمت اور قدیم چلا آتا تھا اور جس کا وزن آٹھ ٹانک (۲۴ تولہ ۸ ماشہ) تھا اور دیگر قسم کے جواہرات ۹ گھوڑے ۵ ہاتھی نذر میں پیش کئے۔ فرزند اقبال مند نے بھی ایک نہایت بیش قیمت خلعت جڑاؤ تلوار اور ایک نفیس گھوڑا جس کا ساز وسامان جڑاؤ تھا اور خاصہ کا ہاتھی جس کا ہودہ چاندی کا تھا عطا کیا اور چونکہ رانا کے ساتھ صرف سَو آدمی تھے جن کو خلعت ملنا چاہیے تھا اس لئے سَو خلعت پچاس گھوڑے اور ۱۲ کھپوہ جڑاؤ ہمراہیوں کو عطا کئے گئے۔

اسی دن شام کو فرزند اقبال مند کے کوچ کی تاریخ تھی اور راجپوتوں کا قاعدہ ہے کہ کسی بادشاہ وسلطان کی خدمت میں ولی عہد کو ساتھ لے کر نہیں جاتے اس لئے رانا نے اپنے قیام گاہ پر پہنچ کر کنور کرن کو کورنش کے لئے بھیجا۔ کنور کرن کو بھی وہی اشیاء انعام میں عطا کی گئیں جو رانا کو بخشش کی گئی تھیں البتہ ایک خنجر مرصع قیمتی دو ہزار روپیہ مزید دیا گیا۔ اسی روز شام کو فرزند اقبال مند کنور کرن کو ہمراہ لے کر اودے پور سے اجمیر روانہ ہوا۔

۱۱ اسفندار کو شہزادہ بلند اقبال دولت خانہ خاص وعام (واقع اجمیر) میں داخل ہوا اور تصدق وپیشکش کے بعد عرض کیا کہ اگر حکم ہو تو کرن اپنی پیشانی کو سجدہ سے روشن کرے۔ حکم ہوا کہ کرن کو حاضر کیا جائے۔ حاجبانِ بارگاہ نے آدابِ مقررہ کے موافق کرن کو حاضر کیا اور جب کرن کورنش وسجدہ سے فارغ ہوا تو میں نے حکم دیا کہ سیدھے ہاتھ کی صف میں سب امیروں سے مقدم کرن کو کھڑا کیا جائے۔ اس کے بعد بیش قیمت خلعت اور جڑاؤ تلوار عنایت کی گئی۔ اور چونکہ کرن پہاڑوں میں پرورش پایا ہوا بادشاہ وسلاطین کی مجلسوں کو دیکھا ہوا نہ تھا اس لئے اُس کی طبیعت کو رام کرنا اور اُس کا دل ہاتھ میں لینا ضروری تھا۔ میں نے ارادہ کیا کہ ہر روز نو بہ نو اور تازہ بہ تازہ بخششوں اور عنایتوں کی اُس پر بھرمار کروں چنانچہ دوسری ملاقات میں جڑاؤ خنجر عراقی گھوڑا جس کا زین موتیوں اور جواہرات سے مرصع تھا عنایت کیا۔ اسی روز پچھلے وقت کرن نور جہاں کے سلام کو حاضر ہوا۔ بیگم نے بھی بیش قیمت خلعت اور جڑاؤ قبضہ کی تلوار اور ایک گھوڑا اور ہاتھی عنایت کیا۔ اسی وقت میں نے ایک بیش قیمت موتیوں کا مالا عنایت کیا۔

تیسرے روز پھر ایک فیل خاصہ مع ہودے اور جھول کے عنایت کیا۔ اس کے بعد میرا دل چاہا کہ کرن کو ہر ایک جنس دی جائے۔ اس لئے ۲ باز اور ۳ جرّہ اور ایک تلوار اپنی کمر خاص کی میں نے عنایت کی۔ پھر ایک بکتر اور ایک جوشن خاصہ جسے میں خود پہنتا تھا اور ایک انگوٹھی لعل کی اور ایک زمرد کی عنایت کی اور جب کرن کی رخصت کا زمانہ قریب ہوا تو میں نے حکم دیا کہ ہر قسم کی چیزوں سے یہاں تک کہ قالین، گدیلے، تکیے، مشک وعنبر اور ہر قسم کے عطر اور خالص سونے کے برتن اور گجراتی بہلیاں کرن کو دی جائیں۔ ایک دن صبح کو سَو خوان سجے ہوئے جنہیں ہر احدی یعنی اکے سوار دونوں ہاتھوں میں لئے ہوئے دیوان خانہ خاص وعام

ے صحن میں آئے اور جو ہر قسم کی مختلف چیزوں سے بھرے ہوئے تھے سب کے سب میں نے کرن کو عنایت کئے۔

کنور کرن کے رخصت ہونے کی تاریخ قریب تھی، میں نے چاہا کہ اپنی بندوق کی نشانہ بازی کرن کو دکھاؤں۔ قراول (افسر شکار) نے اطلاع دی کہ ایک شیرنی کو گھیر لیا گیا ہے، میری عادت ہے کہ نر کا شکار کرتا ہوں مادہ کا شکار نہیں کرتا مگر محض اس خیال سے کہ شاید شیر نر کی اطلاع کنور کرن کے جانے تک نہ ملے میں فوراً شکارگاہ کو روانہ ہوگیا اور کنور کرن سے جو ساتھ تھا کہا کہ جس جگہ تم کہو گولی لگاؤں۔

اتفاق کی بات ہے کہ اُس وقت ہوا نہایت تیز چل رہی تھی اور ہتھنی جس پر میں سوار تھا، شیر کی بُو اور ہوا کی تُندی سے ایک جگہ کھڑی نہیں ہوسکتی تھی۔ باوجود اِن دونوں کاوٹوں کے حسب قرارداد میں نے اُس کی آنکھ پر گولی چلائی خدائے تعالیٰ نے مہربانی کی کہ اِس راجہ کے بیٹے کے سامنے مجھے شرمندہ نہیں کیا ٹھیک آنکھ کے اندر گولی نے داخل ہوکر شیرنی کا کام تمام کردیا۔ کرن نے اُسی وقت مجھ سے ایک بندوق مانگی، اس لئے میں نے اعلیٰ قسم کی بندوق رومی جو خاص میرے شکار کی تھی اُسے عنایت کی۔

۲۹ تاریخ کو ۲۰ گھوڑے اور پرم نرم کی قبا اور ۱۲ اہرن اور دس کتے تازی کرن کو عنایت ہوئے تیسرے دن کہ یکم خورداد تھی ۱۰ گھوڑے اور پھر ۲ تاریخ کو ۴۱ راس گھوڑے اور پھر تیسری تاریخ کو ۲۰ گھوڑے یعنی تینوں دن میں ۱۰۱ گھوڑے کنور کرن کو عنایت کئے گئے۔ ۵ تاریخ کو دس رومال سر اور دس قبائیں (شیروانی) اور دس کمر کے پٹکے کنور کرن کو عنایت ہوئے۔

۲۰ خورداد کو ایک ہاتھی عنایت کیا۔ ۲۵ تاریخ خورداد کرن کو اپنی جاگیر پر رخصت کیا گیا۔ ایک گھوڑا اور فیل خاصہ اور خلعت موتیوں کا مالا جس کی قیمت پچاس ہزار روپیہ تھی اور جڑاؤ خنجر جس کی قیمت دس ہزار روپیہ تھی کنور کرن کو مرحمت کیا گیا۔ کنور کرن کو روزِ ملازمت سے رخصت کی تاریخ تک جواہر و مرصّع آلات جو کچھ کہ دیئے گئے دس لاکھ روپے قیمت کے تھے اور ایک سو دس گھوڑے ۵ زنجیر ہاتھی اِس کے علاوہ تھے اور جو کچھ کہ نورجہاں بیگم و فرزند خرم (شاہجہاں) نے عطا کیا وہ اس کے علاوہ تھا۔

ملاحظہ ہو تزکِ جہانگیری

صفحہ ۱۲۵	سطر ۱	صفحہ ۱۴۱	سطر ۱۹
" ۱۲۶	" ۶	" ۱۴۲	" ۱، ۹
" ۱۲۷	" ۱	" ۱۴۳	" ۱۱

صفحہ ۱۴۵ سطر ۱۰

محمد ابراہیم

(سکرٹری نواب عالیجاہ بہادر خلد آشیاں بھوپال)

اُردو کے بہترین سات شعر

ایک دن خیال آیا کہ اُردو کے بہترین سات شعر جمع کئے جائیں۔ غور کیا تو کام مشکل نظر آیا۔ اس پر یہ ٹھانی کہ زیادہ غور نہ کیا جائے تاکہ کام نہ صرف آسان ہو جائے بلکہ دلچسپ بھی رہے سو تھوڑی دیر میں سات شعر لکھ لئے۔ اب ارادہ ہؤا کہ انہیں ہمایوں میں شائع کیا جائے مگر پھر تامّل نے روک دیا کہ کوئی کچھ کہے گا کوئی کچھ۔ دل نے جواب دیا اچھا اس کارِخیر میں چند دوستوں کو بھی شریک کر لیا جائے جہاں اُن پر نکتہ چینی ہوگی ہم پر بھی سہی۔ چند روز گزر گئے۔ کل (۱۱ مارچ کو) صبح اُٹھا طبیعت کافی چُست نہ تھی اس کمبخت خیال نے اُس پر تازیانے کا کام دیا۔ سات شعر ہونے چاہئیں اور سات ہی دوستوں کو دعوت دی جائے ایک خود اور چھ اَور۔ ایسا ہی کیا لکھا کہ آج پچھلے پہر یہاں تشریف لائیے اور اپنے ہمراہ اُردو کے بہترین سات شعر لکھ لائیے۔ آئے "مسلیاتی" برساتی میں محفل گرم ہوئی۔ پوچھا کہ وہ شعر؟ کسی نے کچھ کہا کسی نے کچھ، کسی نے کہا ایک آدھ لکھا تو ہے باقی ابھی یاد کرتا ہوں، دوسرے نے کہا لایا ہوں مگر گھنٹے بھر میں کیا سوچ سکتا؛ تیسرے اور چوتھے نے کہا دن بھر دونوں لیکچر دیتے رہے، اب کچھ سوچتے ہیں شاید۔ پانچویں نے اعتراض کیا کہ بہترین کے کیا معنی ہیں۔ چھٹا میں خود تھا۔ ساتواں آیا ہی نہ تھا (چنانچہ اُس کی بجائے اپنے دور افتادہ قریبی دوست فلک پیما کو لکھا کہ آپ شرکت کیجئے) کسی کو ترغیب دی کہ دیوانِ غالب حاضر ہے، بالِ جبریل ہے یاد دہانی ہو جائے گی، "بہترین" اعتراض کا بھی کوئی فضول سا جواب دے کر راضی کر لیا۔ لگے اپنا اپنا سر کریدنے اور لکھنے کوشش یہ ہوئی کہ ایک دوسرے کی نقل یا مدد نہ کی جائے، چند منٹ میں جوابات کے پرچے تیار ہو گئے۔ نمبر ۲ نے تجویز کی کہ یہ آزمائشی امتحان ہے آخری امتحان کی یہ صورت قرار دی جائے کہ سات دن کے اندر دوبارہ سہ بارہ زیادہ سے زیادہ سات دن غور کر کے ہر شخص اپنے بہترین سات شعر چُنے اور بھیج دے لیکن کثرتِ رائے سے یہ تجویز مُسترد ہوئی اور قرار پایا کہ جو کچھ ابھی لکھا ہے جلدی میں شاید گھبراہٹ سے اُسی کو قطعی سمجھا جائے۔ چنانچہ پرچے نمبر ۶ کے حوالے کر دیئے گئے۔

بشیر احمد

محمد اسلم خاں

۱	پھول کی پتّی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر	مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر
۲	خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے	خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے
۳	لالہ رُو کہہ کر لگاتے ہیں گُل اندا موں کو داغ	روزِ محشر شاعروں کا پوست کھینچا جائے گا
۴	اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے	مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے
۵	گو حسینِ تازہ ہے ہر لحظہ مقصودِ نظر	حُسن سے مضبوط پیمانِ وفا رکھتا ہوں میں
۶	وہ اپنے حُسن کی مستی سے ہیں مجبورِ پیدائی	مری آنکھوں کی بینائی میں ہیں اسبابِ مستوری
۷	ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا	حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

حامد علی خاں

۱	کہتے ہو گر کہ ہے وہی ہادی وہی مضِلّ	تو راہ پر ہیں سب کوئی گمراہ ہی نہیں

۲ یادِ اُس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ — نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا
۳ آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو — ہے بوالہوسوں پر بھی ستم ناز تو دیکھو
۴ بیکاریٔ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل — جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی
۵ آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا — جو غم ہُوا اسے غمِ جاناں بنا دیا
۶ غمِ آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں — مری ہمتوں کی پستی مرے شوق کی بلندی
۷ غمِ حرماں اُٹھا لایا ہے مجھ کو اُس بلندی پر — جہاں سے حُسن کی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

حمید احمد خاں

۱ اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا — آخر اس بیماریٔ دِل نے اپنا کام تمام کیا
۲ آمدِ بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج — اُڑتی سی اِک خبر ہے زبانی طیور کی
۳ پھونک ڈالا ہے مری آتش نوائی نے مجھے — اور میری زندگانی کا یہی ساماں بھی ہے
۴ جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی — مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی
۵ ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی — جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں
۶ اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل — لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے
۷ جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں — مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

نیاض محمود

۱ ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا — نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا
۲ نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں — تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں
۳ نفسِ موجِ محیطِ بے خودی ہے — تغافل ہائے ساقی کا گلہ کیا
۴ زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی — کیوں ترا راہ گزر یاد آیا
۵ گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار — لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
۶ ترا جلوہ کچھ بھی تسلیٔ دلِ ناصبور کر نہ سکا — وہی گریۂ سحری رہا وہ آہِ نیم شبی رہی
۷ خاکبازیٔ امید کارخانۂ طفلی — یاس کو دو عالم سے لب بخندہ وا پایا

منظور قادر

۱ جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
۲ میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا — بلبلیں سُن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں
۳ قفس میں مجھ سے رُوداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم — گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو
۴ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
۵ میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے — شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر
۶ جو ہے بیدار انساں میں وہ گہری نیند سوتا ہے — شجر میں پھول میں پتھر میں حیواں میں ستارے میں
۷ (کھلتا کسی پہ کیوں کہ مذاقِ سخن نہیں) — شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

بشیر احمد

۱ عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا — درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
۲ دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ — دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک
۳ مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر — کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے
۴ گلشن میں ترے لبوں نے گویا — رس چوس لیا کلی کلی کا
۵ اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی — دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
۶ ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دُنیا نہ وہ دُنیا — یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی
۷ ضمیرِ پاک و نگاہِ بلند و مستیٔ شوق — نہ مال و دولتِ قاروں نہ فکرِ افلاطوں

فلک پیما

۱ شام سے کچھ بُجھا سا رہتا ہے — دل ہے گویا چراغ مفلس کا
۲ ہوں مثالِ آسیا کُنجِ قفس میں گوشہ گیر — رزق پہنچاتا ہے گھر بیٹھے خدا میرے لئے
۳ بُت سے نہیں ہے سوال کچھ اور — اپنے مُنہ سے جواب دے دے
۴ ذرہ کا بھی چمکے گا ستارہ — قائم جو زمین و آسماں ہیں
۵ آئینہ دیکھ اپنا سا مُنہ لے کے رہ گئے — صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا
۶ خدا شاہد، خدا شاہد ہے، کیوں کہتے ہو وعدوں پہ — خدا کو کیا غرض میرے تمہارے درمیاں کیوں ہو
۷ ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد — یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

آنکھیں

(نظم بے قافیہ ماخوذ از شیلے)

ہیں یہ آنکھیں کس قدر رنگیں بیاں !
رُوح میں ہوتی ہے جب کیفیتوں کی رستخیز
شاعرِ سرمست کا سحرِ حلال،
آرزو و سوز و ساز و درد کو
اِن کی صُورت کر نہیں سکتا ادا ــــ
ہیں یہ آنکھیں کس قدر رنگیں بیاں !
بربطِ جاں سوز کی شیریں تریں موجِ سرُود ،
تیرتا ہے جس پہ شب ہائے محبّت کا گداز
اِن کی صُورت کب طرب انگیز ہے !
جانِ من ! پھر دیکھ اُسی انداز سے ــــــــــــ
تاکہ میری سوختہ سامانیاں،
تیری تابِ چشم سے تابندہ ہوں مثلِ نجوم ۔
اِس طرف میرے سحابِ اشک سے ،
ڈال مجھ پر اُن نگاہوں کی شعاع
محو ہو جاتا ہے جن سے رنج شبنم کی طرح ۔
جانِ من ! پھر دیکھ اُسی انداز سے !

کیا کیا کچھ ؟!

چند لاجواب مصرعے

اچھے شعروں میں عموماً ایک مصرع دوسرے کو اُبھار دیتا ہے اگرچہ ناقص شعروں میں عموماً ایک مصرع دوسرے کو لے ڈوبتا ہے لیکن بعض اعلےٰ اشعار کے مصرع دیکھئے کہ اکیلے اور الگ تھلگ اس طرح چمکتے ہیں جیسے چودھویں کا چاند بلکہ سچ یہ ہے کہ وہ تنہا ہی زینت ہیں، لیجئے یہ مشہور قطعے اپنے نہاں خانۂ دل میں لٹکائیے :-

(غالب) جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے!

دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا!

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

(اقبال) سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہوگا

زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے

جہاں ہے تیرے لئے تُو نہیں جہاں کے لئے

حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

چیتے کا جگر چاہئے شاہیں کا تجسس

ہائے طفلی کھیلنا کھانا اُچھلنا کُودنا! (ذوق)

کہوں کیا رنگ اُس گُل کا اہاہاہا اوہوہوہو! (ظفر)

سارا سودا ہے جیتے جی کا (داغ)

ہمیں جانتے ہیں جو ہم دیکھتے ہیں

دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا! (ہمایوں)

پڑھنے والے اس پر ہنسیوں اور مصرع یاد کر اُٹھیں گے کہ یہ لیجئے یہ دیکھئے یہ سُنئے حقیقت یہ ہے کہ ہمارے بے کس ادب در میں ہزاروں لعل چھپے ہوئے ہیں مگر حیف کہ ہم نادار دل کوتاہ بیں دیکھتے ہی نہیں!

ریں اصول :۔

بکنگھم پیلس میں انگریزی بادشاہ جارج پنجم مرحوم کی ایک مطالعہ گاہ کی دیوار پر یہ چھ اصُول ایک قطعے کی صُورت میں چسپاں ہیں :۔

مجھے یہ سکھا کہ میں جو کھیل بھی کھیلوں اُس کے قواعد کا پابند رہوں۔

مجھے یہ سکھا کہ میں خیال کو بلند سمجھوں اور خیال پرستی کو پست۔

مجھے یہ سکھا کہ نہ میں کسی کی فضول تعریف کروں نہ کسی سے اپنی فضول تعریف سننا چاہوں۔

مجھے یہ سکھا کہ جب مجھ پر درد و مصیبت ٹوٹ پڑے تو میں ایک تربیت یافتہ حیوان کی طرح خاموشی سے اُسے برداشت کروں۔

مجھے یہ سکھا کہ میرا مقدور ہو تو میں بازی جیت لُوں اور اگر میں بازی ہار جاؤں تو مجھے سکھا کہ ہار کر میری طبیعت درہم برہم نہ ہو جائے

مجھے یہ سکھا کہ نہ میں بے معنی تمنّاؤں سے بے تاب رہوں اور نہ گزری باتوں پر بے فائدہ افسوس کیا کروں!

عُسلیات

"المنظر" میرا مکان پائین باغ میں ہے، لارنس گارڈن عین سامنے ہے جیسا بیان ہوئے جب میں اسے بنوانے میں مصروف تھا تو ایک دن اس باغ کی سیر کرتے ہوئے میں گنگنا رہا تھا ؎

گھر اِک بنا لیا ہے جو پائین باغ میں آتی ہے پھُول پھُول کی خوشبو دماغ میں

اُس وقت یہ معلوم نہ تھا کہ کسی دن اس خوشبو کا ٹیکس بھی ادا کرنا پڑے گا۔ اس کے پانچ سال بعد میں نے اُوپر کی تیسری منزل پر ایک چھوٹی سی دس فٹ سات فٹ کی برساتی بنائی (بنوائی"! لیکن اس کی ساخت و تعمیر میں مجھے اتنا دخل اور اتنی دلچسپی تھی کہ کہہ سکتا ہوں بنائی) اور صرف چھوٹی چھوٹی ننھی ننھی چیزوں سے سجائی۔ دس بارہ مہینے ہوئے کلکتے سے ایک چھوٹا سا زنگار رنگ کا پھول دار قالین لایا اُسے صوفے کے عین اوپر غربی دیوار پر سر بسر لٹکا دیا۔ یہاں خصوصاً سردیوں کی سہ پہر کو سماں پُر لطف تھا، تین طرف باہر کو کھُلنے والے دروازے کھڑکیاں تھیں، اُن سے سُورج کی کرنیں اور ہوا کے جھونکے آتے لیکن جہاں باغ سے ہوا اور خوشبوئیں آتیں وہاں بھنبھنانے والی شہد کی مکھیاں بھی کبھی کبھی آنکلتیں۔ بات یہ تھی کہ چھوٹا سا کمرہ تھا، دروازے باہر کو کھلتے تھے اس لئے کالی کلوٹی یا عام "اصلی" مکھیوں اور ان رنگ رنگ کی "عسلی" مکھیوں کے روکنے کے لئے چکیں بھی نہ تھیں۔ دو تین ماہ سے یہ دیکھتا کہ جب سہ پہر کو میں اپنی کتابوں رسالوں سمیت اوپر جاتا اور صوفے کے تکیوں پر ٹیک لگائے اونگھتا یا کچھ پڑھتا یا گنگناتا تو ایک "عسلی" مکھی کبھی کبھی چکر لگاتی ہوئی آتی، آتی اور نکل جاتی اور پھر آتی اور پھر نکل جاتی۔ یونہی کچھ دن بلکہ کچھ ہفتے گزر گئے۔ ایک روز میرے دو "ادبی" دوست بھی وہاں تھے اصلی مکھیوں میں یہ "عسلی" مکھی بھی جو آئی تو میں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ شاید میرے قالین کے پھولوں پر یہ مست ہے کہ اکثر روز ہی اِدھر آنکلتی ہے۔ بات گئی گزری ہوئی۔ پھر ایک دن جائنٹ ایڈیٹر بیٹھے دیکھ رہے تھے کہ میں اس سے تنگ ہو رہا ہوں کہنے لگے اسے مار دوں، میں نے سوچا میں نرا ایڈیٹر ہی تو نہیں آدمی بھی ہوں ضرورت ہو گی تو خود سنبھال لوں گا۔ مالی کو بلوایا اور کہا کہ اِدھر اُدھر دیکھو دیواروں پر درختوں میں کہیں کوئی چھتہ تو نہیں ہے؛ اُس نے دیکھا اور کہا کہیں کچھ نہیں ضرور باغ سے کوئی مکھی آنکلی ہو گی! غرض دوسرے دن جو پھر یہ اکیلی "عسلی" مکھی آئی تو میں بے باک بن کر اُٹھا اور اپنی کاپی کے زور سے اسے زمین پر پٹخ دیا اور کہا بس یہی کم بخت ہو گی مر گئی ہے قصّہ ختم ہُوا۔ لیکن ذرا اسی دیر میں

شاید اُس کی ایک "عسلی" سہیلی اِدھر کو آنکلی۔ ڈر کے مارے دلیر تو میں بن چکا تھا اُٹھا اور اسے بھی تہ تیغ کیا۔ لیکن اتنی ذرا سی دیر میں پھر ایک اور ان کی "عسلی" بہنیلی آگئیں اور اب کی ذرا غصے میں۔ میں نے دیکھا کہ ان دو کی لاشیں پڑی تھیں، عقلمند بن کر اسے بھی مارا اور جلد ان تینوں کو دری کے نیچے دبا چھپا دیا۔ لیکن پھر اُتنی ہی ذرا سی دیر میں ایک اور غصہ ور "عسلی" خاتون در آئیں اور لگیں زور زور سے چکّر لگانے۔ اب مجھے کھٹکا کہ یہ معاملہ تو کچھ بے ڈھب ہے، نہ جانے کم بختوں کو کیسے ایک دوسری کے آنے جانے کا پتہ چلتا ہے، سچ مچ میرے قالین کے نقلی پھولوں سے انہیں عسلی عشق ہو گیا ہے، اب ان کی ڈاک بندھی ہوئی ہے اور کوئی حساب لگا ہوا ہے، حاصل وصل انہیں کچھ نہیں مگر بس ایک نظر کا عشق ہے آنکھ کا چسکا ہے اِسے پورا کر رہی ہیں، میں احمق کیوں بیچ میں حائل ہو گیا، اب میری خیر نہیں۔ دوبارہ اُٹھا زور سے ہاتھ پاؤں مارے اور چوتھی کو بھی مار گیا۔ اب آئی پانچویں اور چھٹی اور ساتویں سب عسلی اور سب اکٹھی۔ میں نے گھمائے دونوں ہاتھ اور بازو اور ناچا اور کُودا ـــــ سُنا ہوا تھا کہ یہ شہد کی مکھیاں بڑی ظالم ہوتی ہیں آج اپنی آنکھوں ان کی طاقت دیکھ پائی۔ سب مضمون نظمیں بھول گیا، لگا بھاگنے دوڑنے چھوٹی سی برساتی میں۔ خدا خدا کر کے انہیں باہر نکالا، خود بھی باہر نکلا، دیکھتا کیا ہوں کہ وہاں تو عالم ہی اور ہے، برساتی کا انہوں نے محاصرہ کر رکھا ہے اُوپر دائیں بائیں غصہ ور گھومنے والی "عسلی" خواتین کا ایک لشکر ہے، بھاگا اندر کو، دروازے بند کئے کھڑکیاں بند کیں، آوازیں دیں پھر کتابیں رسالے سنبھالے اور دوڑا درمیانی منزل میں اپنے کمرے کی طرف۔ دو ایک مکھیوں نے بھی ایک دروازے سے پیچھا کیا، شکر ہے یہاں چلمنیں تھیں اِن کو چھوڑ دیا اور قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔ دوسرے روز سو کر اُٹھا تو اعصابی بے چینی سے طبیعت اس قدر متاثر ہو چکی تھی کہ اِدھر حکیم صاحب کو بُلا کر ایک اچھا خاصا نسخہ لیا اور اُدھر گھر والوں اور ہمسایوں والوں سے صلاح مشورہ کر کے بازار گیا اور ریشمی جالی کے پردے خریدے اور ڈالے اور ان کے پیچھے گویا پردہ پوش ہو کر چین سے ہو بیٹھا اور مسکرایا۔ دو سال کے تردّد کے بعد چند متحد و منظّم "عسلی" مکھیوں سے اک دو چار ہی منٹ میں مفصلہ ذیل باتیں سیکھ لیں:۔

۱۔ اگر انسان متواتر دو سال تک کوئی تکلیف سہتا رہے اور اُسے دُور کرنے کے لئے کافی سوچ بچار نہ کرے کافی ہاتھ پاؤں نہ مارے تو وہ تکلیف نہ صرف اُس کی قسمت میں لکھی ہوتی ہے بلکہ وہ اُس کا بلا شرکتِ غیرے مستحق ہوتا ہے۔

۲۔ اگر انسان متواتر دو سال تک کوئی تکلیف سہتا رہے تو غالباً وہ تکلیف زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہی نہیں۔

۳۔ اگر انسان وطن سے دُور جا کر اپنے مکان کی آرائش کے لئے کوئی قالین خریدے تو بعض حالات میں اس فعل سے بعض رنگین مزاج جانداروں کے پروں میں پھڑپھڑاہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔

۴۔ اگر کسی باہر کو کھلنے والے دروازے پر چلمن نہ پڑ سکے تو اُس کے اندر کی طرف عام دبیز پردوں کے ساتھ ہی ساتھ باریک جالی کے پردے بھی ڈالے جا سکتے ہیں!

فاعتبروا یا اولی الابصار

اور ہاں (۵) جب تک کسی بات کا نتیجہ کافی خراب نہ نکلے کوئی بہت اچھا نتیجہ مترتب ہو ہی نہیں سکتا!

بشیر احمد

پروانہ

جب روزِ ازل خالقِ انوار و ضیا نے
ہر شمع سے پوچھا کہ تمنا تری کیا ہے

اِک شمع بڑھی اور کہا مالکِ تقدیر
ہو زینتِ کاشانۂ ایماں مری تنویر
جب تک کہ گل افشاں کششِ لوح و قلم ہو
یارب یہ وفا کیش ہو اور طاقِ حرم ہو

یوں ملتمس اک اور ہوئی، اے مرے معبود
بُت خانۂ رنگیں ہے مری منزلِ مقصود
کثرت میں بھی یارب تری وحدت نظر آئے
ہر ذرہ اِک آئینۂ قدرت نظر آئے

اِک اور نے پھر یوں کیا اظہارِ تمنا
اے محرمِ خاموشیٔ اسرارِ تمنا
کعبہ کی ہوس ہے نہ کلیسا کی ہوس ہے!
مجھ کو تو بس اِک گوشۂ تنہا کی ہوس ہے

اِک شوخ ادا، صاحبِ تنویرِ دلآویز
بولی مرا کاشانہ ہو مے خانۂ گلریز
اِک لمحہ نہ میں عشرتِ ہستی سے جدا ہوں
تا حشر نہ رنگینی و مستی سے جدا ہوں

ـں اور نے کی عرض، کہ اے صاحبِ قدرت　　پوشیدہ کہاں تجھ سے، مرے قلب کی حسرت
ماں ہے کہ آغوشِ لطافت میں رہوں میں　　یارب! کسی دوشیزہ کی خلوت میں رہوں میں

ـں اور نے پھر خواہشِ دل کا کیا اظہار　　ہو زیست مری وقفِ ریاضت گہِ ابرار
ہوشِ نشاطِ مئے عرفاں رہوں یارب　　ذاکر تری ہم صورتِ انساں رہوں یارب

ـں درد شناسا نے بصد ذوق و عقیدت　　کی عرض، کہ اے خالقِ انوارِ محبت!
قصود یہی ہے مرے احساسِ وفا کا　　گوشہ نہ چھٹے مجھ سے مزارِ شہدا کا

ـں شمع تھی باقی، ابھی گھبرائی ہوئی سی　　افسردہ سی، خاموش سی، تھرّائی ہوئی سی
چھا یہ خداوند نے حسرت تری کیا ہے　　اس طرح تو کیوں قیدیٔ زنجیرِ حیا ہے

عرض کیا اس نے، کہ اے ربِ دو عالم　　ہو جائے مری روح، غمِ عشق سے محرم
دیوانوں کا اپنے مجھے دیوانہ بنا دے
یارب مجھے، سوزِ دلِ پروانہ بنا دے

روشؔ صدیقی

مصوّر کی محبت

دھرسال

۲۰ ستمبر

میری کملا

کتنی مختصر سی بات تھی جسے تم نے افسانہ بنا دیا۔ میری نگاہوں میں تم آج بھی وہی ہو جو سوشیلا کے آنے سے پہلے تھیں۔ میرے لئے پہلے کی طرح ہی دلکشی و جاذبیت کا کامل ترین حسین مجسمہ ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری محبت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ پہلے کی طرح ہی پُرجوش و ہیجان انگیز ہے اور اس میں تمہاری دُوری نے اور یاد نے کرب کا اضافہ کر دیا ہے۔ زندگی کے ان چند خوش آیند لمحات کو جو میں نے تمہارے قرب میں بسر کئے اپنا سرمایۂ حیات سمجھتا ہوں۔ انہیں بھلا کیسے بھُول سکتا ہوں؛ تمہیں بھلا دینا —— تم جو کہ اُن لمحات کا سرچشمہ و منبع ہو ایک ناممکن امر ہے۔

اور پھر —— سوشیلا! —— میں حیران ہوں۔ تم نے سوشیلا کا نام کیوں لیا! کیا یہ سچ ہے کہ عورت جوشِ رقابت میں عقل و حواس بھی کھو بیٹھتی ہے؛ اور پھر اس رقابت کا علاج کیا ہے؛ آخر تم نے میری محبت کو "بھابو" اہر بنس کورا سے کیوں نہیں منسوب کیا۔ وہ بھی تو سوشیلا کی طرح موٹی ہے اور اتنی ہی کند ذہن۔ اور تمہارے ہوسٹل میں وہ جو خوبصورت دھوبن آتی ہے کیا نام ہے اس کا؛ —— لورن؛ —— ہاں —— ہاں وہی لورن —— جسے دیکھ کر آدمی چغتائی کی پُرکیف تصویریں بھی بھُول جاتا ہے۔ تم نے اُس کا نام کیوں نہ لیا۔ تم جانتی ہو فنی نقطۂ نگاہ سے میں اس کا کتنا پرستار ہوں اور اس پر کتنا والہ و شیدا، اگر تم اس کا نام ہی لے بیٹھتیں تو مجھے رنج نہ ہوتا۔ بنگال کے سرتاج شاعر چنڈی داس کو ایک دھوبن سے عشق تھا میں تو خیر ایک معمولی مصوّر ہوں جس کا شاہکار یہ ہے کہ اس نے اپنے دل کے قرطاس پر تمہاری تصویر کھینچ لی ہے۔ اجنتا کے رنگین نقوش کچھ مٹ چکے ہیں کچھ مٹ جائیں گے مگر میری موت ہی شاید تمہاری صورت کو میرے دل سے مٹا سکے۔ "شاید" اس لئے کہ موت کے بعد کا مجھے علم نہیں!

اس اعترافِ محبت کے بعد میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں۔ کہ اگر میں نے سوشیلا کو خط لکھ دیا تو کیا بُرا کیا۔ کیا کسی کے خط کا جواب دینا گناہ ہے۔ ممکن ہے کہ تمہاری اصطلاح میں ایسا ہو۔ مگر میں حسین نہیں اور نہ تمہاری طرح تشکّر و ترحّم کے جذبات سے بے نیاز ہی۔ اور اگر سوشیلا نے اپنے خط کے ہمراہ اپنی تصویر بھی بھیج دی تو غالباً اُس کا یہ مدعا ہرگز نہ تھا کہ تمہارے سینہ میں حسد کی آگ مشتعل ہو جائے

باوصف اتنا چاہتی ہے کہ میں اسے یاد رکھوں۔ شاید اُسے مجھ سے محض افلاطونی محبت ہے۔ اور یہ کوئی اتنا بڑا جذبہ نہیں جتنا تم اسے سمجھتی
۔ شیلے کو غور سے پڑھو۔ اس کی شاعری "محبت میں افلاطونیت" کی بہترین مثال ہے۔ شیلے کی شاعری بھی اسی افلاطونی محبت کے طفیل زندہ
۔ شیلے کو غور سے پڑھو۔ ورنہ ایم۔ اے میں فیل ہو جاؤ گی۔ امتحانِ محبت تو الگ رہا۔

اور کیا لکھوں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ خط پڑھنے کے بعد تم مجھ سے رُوٹھ جاؤ گی۔ مگر مجھے تم سے وہ لازوال، بے پایاں محبت ہے کہ میں
اسے رُوٹھ جانے کی ذرہ بھر بھی پروا نہیں کرسکتا۔ عمر خیام کے بعد دُنیا میں اگر کوئی دوسرا قنوطی پیدا ہوا ہے تو وہ میں ہوں۔ بہتر ہوگا
مجھ سے روٹھنے کی صلاح نہ کرو۔ بہترین بات یہ ہوگی کہ رقابت کو دل میں جگہ نہ دو۔ میں تمہیں مناؤں گا بھی نہیں اور تم مفت میں اپنا
جلاؤ گی۔

میں یہاں جھیل پر مچھلی کا شکار کرکے اور لمبی لمبی سیریں کرکے اپنے دن گزار رہا ہوں۔ میری صحت پہلے سے بہت اچھی ہے۔
میں اس وقت تک تمہارے پاس مصوری آنے کا خیال بھی نہیں کرسکتا جب تک کامل طور پر صحت یاب نہ ہو جاؤں۔ کہتے ہیں کہ
مزاجِ قلب کے لئے قربِ محبوب موافق نہیں۔

وزن کی تصویر قریب قریب مکمل ہو چکی ہے۔ افسوس ہے کہ ڈاک میں یہ تصویر تمہیں نہیں بھیج سکتا۔ ورنہ تمہاری ناقدانہ رائے سے
بھی فائدہ اُٹھا لیتا۔ اس کے بعد میں بگّی کی تصویر کو شروع کروں گا۔ بگّی کون ہے میں اس دلچسپ ہستی کے متعلق اگلے خط میں لکھوں گا۔
فی الحال یہی لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ بگّی ایک عورت ہے۔

تمہارا

شیام سندر

دھرمسال

۱۸ اکتوبر

میری بیوقوف کملا

کہتے ہیں حسن کو عقل سے خدا واسطے کا بَیر ہے۔ اسی لئے میں نے تمہیں بیوقوف لکھا۔ یوں تو تم کہنے کو ایم۔ اے میں پڑھتی ہو مگر
اس امر سے تمہاری عقل کو کچھ سروکار نہیں۔ یہ سب ہمارے طریقۂ تعلیم و نصابِ تعلیم کی خام کاریاں ہیں۔ ورنہ یہ ممکن نہ تھا کہ تم جیسی سیمیں تن
دوشیزائیں کالجوں میں لڑکوں کے دوش بدوش پڑھتیں اور مارشل اور مارکس کے معاشی نظریوں کی اس جاہلانہ انداز میں تنقید و تنقیص کرتیں۔
چھوڑو خدارا ان نظریوں کو۔ ان میں کیا پڑا ہے؟ آج تک کوئی عورت اقتصادیات و معاشیات کی ماہر نہیں بن سکی۔ یہ کرخت مسائل
صنفِ کرخت ہی کے لئے رہنے دو۔ ان معاشی و اقتصادی فلسفوں میں اُلجھ کر تمہاری والہیت، رنگینی، معصومیت سب فنا ہو جائیں گی۔

اور اس وقت دنیا کو انہی چیزوں کی بڑی ضرورت ہے۔ یہ سب نظریے تمہارے لئے بنائے گئے ہیں نہ کہ تم اُن کے لئے۔ تم کو کم از کم میرے جذبات و حسیات کا احترام کرنا چاہئے۔ میں مصور ہوں، حسن سرکش حسن بے باک کو پسند کرسکتا ہوں مگر وہ حسن جو محتاج ہو عینک کا مجھے کسی حالت میں گوارا نہیں۔ شیلے کو پڑھو۔ شیلے اپنی شاعری کے بعض لمحات میں دُنیا کا سب سے بڑا شاعر نظر آتا ہے۔ آج بے وقوف گاڈون کو کون پوچھتا ہے اُس کا نام محض شیلے کے نام سے زندہ ہے کیونکہ وہ شیلے کا اُستاد تھا۔ یا یوں کہو کہ شیلے اُسے اپنا اُستاد سمجھتا تھا۔ گاڈون کے پاس دو چیزیں تھیں۔ ایک اُس کا اشتراکی مسئلہ دوسری اس کی لڑکی میری۔ شیلے نے میری کو پسند کرلیا۔ اسی میں اس کی عظمت پنہاں ہے۔ تمہارے سامنے بھی دو چیزیں ہیں۔ ایک تو ہیں رکارڈو کے نظریات اور دوسری طرف ہے محبّت، وہ والہانہ محبت جو قیود مذہب و ملّت سے بیگانہ ہے ان تمام نظریوں اور اُلجھنوں سے ناآشنا ہے۔ وہ محبّت جو ایک فرد کو دوسرے فرد واحد سے ہوسکتی ہے اور جس میں اشتراکیت کا شائبہ تک بھی نہیں۔ اپنی عظمت کو پہچان لو۔

میں نے بگّی کی تصویر بنانی شروع کردی ہے۔ بگّی ایک گوالن ہے نہایت خوبصورت اور نہایت ہی بیوقوف۔ کل میں نے جھیل کے کنارے بیٹھ کر اُسے تمہارا خط پڑھ کر سمجھایا اور میں یہ دیکھ کر بڑا حیران ہُوا کہ اُسے رکارڈو کے نظریہ کی مطلق پروا نہیں اور نہ وہ تمہاری طرح عورتوں کا سگنا کارٹا ہی تصوّر کرتی ہے۔ وہ مجھ سے شادی کی خواہاں ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اُس کے نو دس بچے ہوں۔ بیوقوف لڑکی، وہ جرمنی یا اٹلی میں پیدا ہوتی تو شاید اُس کے نصیب کھل جاتے۔ کیا عجب کہ ہر ہٹلر یا سینیر مسولینی اُس سے شادی کرلیتا۔ اور مجھے یہ لکھتے ہوئے بہت افسوس ہوتا ہے کہ اُسے اتنا بھی پتہ نہیں کہ بلجین کے نظریۂ محصولیات میں کیا کیا خامیاں ہیں اور منٹر صاحب نے انہیں کس خوبی سے رد کیا ہے۔ ہاں اُس کے بال بہت خوبصورت ہیں۔ سونے کے باریک تاروں کی طرح نرم و نازک اور آپس میں اس طرح اُلجھے ہوئے کہ گمان ہوتا ہے ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں اِن گیسوؤں میں آکر بند ہوگئی ہیں۔ شام کے وقت جب میں بنسی کی ڈور ہاتھ میں لئے جھیل کے کنارے بیٹھتا ہوں اور جب شفق کی ارغوانی روشنی جھیل کے نیلے پانی سے کھیلتی ہے اس وقت وہ خوبصورت گوالن ایک ننھا سا بھیڑ کا بچّہ گود میں لئے مدھم سروں میں گاتی ہے ؎

مینوں دس کھاں نی مائے

کدوں گھر آؤسی ماہیا — لیسی گلے نال لا ماہیا

مینوں دس کھاں نی مائے — مینوں دس کھاں نی مائے

بگّی کی آواز میں لوچ ہے، اور درد بھی، اور پھر بے انتہا شیرینی۔ میں نے اُس سے پوچھا "بگّی! تم نے کون سے میوزک اسکول میں تعلیم پائی ہے"۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ کہنے لگی میوزک اسکول کیا ہوتا ہے؟" میں نے کہا "جہاں یہ گیت سکھائے جاتے ہیں۔ گانا اللہ کا اُتار چڑھاؤ، ——"۔ وہ بولی۔ اور اب اس کی آنکھیں ایک لمحہ کے لئے خوابیدہ سی ہوگئیں "خبر نہیں تم کیا کہہ رہے ہو! لو آگے سنو

اسمانیں اُڈّی اِل ماہیا — میرا تیرے اُتے دل ماہیا
ہُن آ۔ ہُن آ۔ ماہیا — گل نال لا۔ نال لا۔ ماہیا
مینوں دس کھاں نی مائے

کتنا دلفریب نغمہ تھا، اور کتنا پُر اثر جادُو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پانی کا ہر قطرہ، اور پانی پر جھکی ہوئی ٹہنی کا ہر پتّہ ترنّم خیز ہے؛ یا کائنات گوالن بن گیا تھا اور میٹھے میٹھے سروں میں گا رہا تھا۔

مینوں دس کھاں نی مائے — مینوں دس کھاں نی مائے

کرشن جی کی بنسی شاید انہی گوالنوں میں گونجی تھی۔ اور رادھا جی بھی شاید ایسی ہی گوالن ہوں گی۔ اگر رادھا جی آج زندہ ہوتیں تو جانے بٹرف بورڈ کی موجودہ سفارشات کے متعلق ان کی کیا رائے ہوتی؛ دلچسپ سوال ہے اور تم جیسی ماہرِ اقتصادیات رسا کے لئے نہایت موزوں۔ مجھے اُمید ہے کہ میری محبوبہ اپنے خط میں ضرور اس دلچسپ سوال پر روشنی ڈالے گی۔
منجھلے بھائی اترسوں لاہور روانہ ہوگئے ہیں۔ انہیں ایف۔اے کے ضمنی امتحان میں بیٹھنا ہے۔ وہ مصوری میں ضرور تم سے گے۔ تُوران کی تصویر اُن کے حوالے کر دی گئی ہے، سنبھال کر رکھنا۔ فیروز بھائی ہنوز لاہور کی بستیوں میں گرمائی ٹینس ٹورنمنٹ رہے ہیں یا مصوری پہنچ گئے ہیں؛

تمہارا

شیام سندر

دھرمسال

۱۲ راکتوبر

کملا!

معلوم ہوتا ہے کہ بخت کی نامساعدت ابھی میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی، اختلاجِ قلب کا دورہ پچھلے چند دنوں سے پھر تیز ہوگیا ہے۔ سمجھتا تھا کہ بیمار کا حال اچھا ہے۔ چند دنوں میں صحت یاب ہو کر تمہارے پاس پہنچ جائے گا، مگر شاید قسمت کو کچھ اور ہی منظور ہے۔ اچھا، تو کالج کھل گئے ہیں، یہ تم نے نئی بات بتائی۔ ورنہ مجھ ایسے گنوار کو بھلا کب اس بات کا پتہ چلتا۔ میں نے مزید ایک ماہ کے لئے چھٹی کی درخواست کالج میں بھیج دی ہے۔ فیروز بھائی کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تمہاری اور سوشیلا کی آپس میں گہری چھنتی ہے۔ کلاس روم میں بھی دونوں سہیلیاں ہمیشہ اکٹھی بیٹھتی ہیں۔ اور ریفرشمنٹ روم میں بھی اکٹھے جانا ہوتا ہے۔ بازو میں بازو ڈال کر، میں نہ کہتا تھا کہ سوشیلا بہت اچھی لڑکی ہے۔ گو اس کی ناک بہت چھوٹی ہے مگر اس کا دل اتنا فراخ ہے کہ بیک

وقت اس میں چار عاشق اور تقریب قریب اتنی ہی سہیلیاں سما سکتی ہیں۔ میں اس بنا پہ پر بہت خوش ہوں۔ اور اس بات کی اُمید میں ہوں کہ تم بھی میرے اور بگّی کے رشتۂ محبت کو خلوص کی نظروں سے دیکھ سکو۔ "لوزن" تمہیں پسند آئی ہے۔ مگر "لوزن" کسے پسند نہیں۔ سید صاحب نے بھی اپنے خط میں شاباش کے لڈو بھیجے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ امسال کالجیٹ آرٹ سوسائٹی کی سالانہ نمائش پر تمہاری لوزن کی تصویر کی بھی نمائش کریں گے۔" ہزار ہزار شکریہ۔ مگر میں یہ جاننے کے لئے بے چین ہوں کہ خود لوزن کی اپنی تصویر کے متعلق کیا رائے ہے؛ تم نے اُسے یہ تصویر تو دکھائی ہوگی؛

میں نے شروع شروع میں بگّی کی تصویر کا ہلکا سا خاکا تیار کرنا چاہا تھا مگر مجھے اُس میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ اصل بات تو یہ ہے کہ میرے ہاتھ اس کی تصویر پہ جمتے ہی نہیں۔ پتہ نہیں کیوں؛ جوں جوں بگّی کو دیکھتا ہوں مجھے اُس کے متعلق نئی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں بظاہر نہایت خفیف لیکن باطن میں نہایت نمایاں، دل کی گہرائیوں تک پہنچتی ہوئیں۔ وہ ایک ایسا جواہر ریزہ ہے کہ جس کے ہر کونے سے اور ہر پہلو سے ایک نئی شعاع کا انعکاس ہوتا ہے۔ میں جب تک اس کے دل کی مختلف کیفیتوں اور نیرنگیوں کو نہ پالوں اس کی تصویر کو کیسے شروع کر سکتا ہوں، ممکن ہے کہ تمہیں مونالزا کی تصویر اس موقع پر یاد آجائے۔ مگر میرے خیال میں اطالوی مصوّر نے مونا کے دل کی گہرائیوں کو پا لیا تھا ورنہ ناممکن تھا کہ وہ ایسا بلند پایہ مصوری شاہکار، آرٹ کی دُنیا میں پیش کر سکتا۔ مصوّر اور معمول کے درمیان ایک نازک ترین رشتہ ہے اُسے سمجھے بغیر کوئی مصوّر حقیقی معنوں میں کامیاب نہیں کہلا سکتا۔ تم نے اپنی فطرت کو ہمیشہ مجھ سے چھپایا ہے میرے نزدیک تمہاری دلکشی کا غالباً یہی بڑا سبب ہے اور شاید اسی وجہ سے میں تمہاری تصویر اس وقت تک نہیں بنا سکا ہوں۔ تمہاری ہستی چھوئی موئی کی طرح ہے جو ہاتھ لگانے سے بند ہو جاتی ہو اس طرح کہ پھر کوئی تمہارے دل کے طوفانی جذبات کا اندازہ نہیں کر سکتا، اور ـــــ اور ـــــ بگّی ـــــ کوہستانی گلاب کی ایک کلی ہے، حیا سے سمٹی ہوئی، پتوں میں چھپی ہوئی، نرم و نازک مگر وہ کھل رہی ہے، آہستہ آہستہ، ہر روز ایک دو نئی پتیاں کھل جاتی ہیں اور اپنی رنگینی سے دل کو مسرور بناتی ہیں، ایک دن یہ کلی پھول کی طرح کھل جائے گی، شگفتہ اور ہنستا ہوا پھول، پھر میں شاید اُس کی تصویر بنا سکوں، ابھی نہیں۔

لاہور میں تو گرمی ہوگی، سکنجبین مفرّح اور لیمونیڈ کا استعمال ہوتا ہوگا۔ مگر یہاں اب سردی ہوگئی ہے۔ میں تو اُونی کپڑے پہنتا ہوں اور چائے پیتا ہوں۔ اگلے مہینے غالباً برف باری بھی شروع ہو جائے گی۔ جھیل کا پانی ٹھنڈا ہوگا اور کناروں پر یخ بستہ بھی شام کو مچھلیاں پکڑنے کی بجائے آگ تاپی جائے گی اور جنوں بھوتوں کی کہانیاں صاحبین چوکیدار سے سُنی جائیں گی۔

اگلی ڈاک میں مارس لیول کی ایک دو کتابیں بھیج دینا۔

شیام سندر

دھرمسال

۷؍ نومبر

فیروز بھائی

آج بگّی کی موت کو سات روز ہوگئے۔ میں سوچتا ہوں۔ میرا کیا بنے گا۔ اور یہ بے مصرف کائنات میرے کس کام آئے گی؛ میں جو رشتے کے صوری پہلوؤں پر نظر ڈالنے کا عادی ہوں آج اس کرب انگیز حقیقت کا احساس کر رہا ہوں کہ دنیا میں سچی خوشی کی بنیاد ظاہری نہیں بلکہ محض نفسیاتی اور جذباتی ہے۔ ورنہ ناممکن تھا کہ مجھ جیسی قنوطیت پسند طبیعت پر بگّی کی موت کا اتنا اثر ہوتا۔ اور وہی دلفریب قدرتی مناظر جو ایک ہفتہ پہلے میری روح کو بالیدگی بخشتے تھے اب یوں مجھ پر خندہ زن ہوتے۔ پرسوں سے پھر برف باری جاری ہے اور میں سامنے کے بند دریچے کے شیشوں میں سے ان برف کے گالوں کو دیکھ سکتا ہوں، جو چپ چاپ کسی بےکس کے آنسوؤں کی طرح زمین پر گر رہے ہیں۔ کل دنیا اس سپید خموشی کے لبادے میں لپٹی ہے۔ پرندے بھی خاموش ہیں۔ ہوا بھی ساکن ہے اور چاروں طرف موت کا سا سکوت چھایا ہوا ہے ـــــ مگر میرے دل میں اک قیامت خیز ہیجان بپا ہے۔

آج سے ٹھیک دس روز پیشتر بھی اسی طرح برف باری شروع ہوئی تھی لیکن آج اور اُس دن میں کتنا فرق ہے!

میں اس روز جھیل میں ایک ہلکی سی ناؤ کو کھے رہا تھا۔ آسمان بالکل صاف تھا۔ جھیل کے پانی کی طرح نیلا، اور مغربی شفق سے رنگین، میں ناؤ چلا رہا تھا اور ایک مبہم خوشی کے زیرِ اثر ایک بے معنی پہاڑی گیت گا رہا تھا۔ جھیل کے اُس پار بگّی ریوڑ چرا رہی تھی اور مجھے اُس کی کاندھے پر رکھی ہوئی لاٹھی، اور تارہائے عنکبوت کی طرح چمکتے ہوئے بال صاف نظر آ رہے تھے۔

اتنے میں زور کا جھکڑ چلنے لگا۔ آسمان پر کالے کالے بادل اُٹھے، ہوا میں تیزی اور خنکی آگئی اور جھیل کا پانی لہریں مارنے لگا۔ میں نے بھی زور زور سے کھینا شروع کر دیا اور ناؤ کو جلدی سے پار لگانے کی کوشش کی۔ بمشکل کنارے پر پہنچا تو بوندا باندی اور پھر ساتھ ہی تڑا تڑ اولے بھی برسنے شروع ہوگئے۔ بہرا رخرابی کشتی کو کنارے پر گھسیٹ کر ایک جھاڑی سے باندھا اور دُور پرے ایک درخت کو دیکھ کر اس کی طرف بھاگا۔

اولے پڑتے گئے اور میں بھاگتا گیا۔ اپنے سر کو بچانے کے لئے میں نے اپنا کوٹ اُتار کر دونوں بازوؤں سے سر کے اوپر چھاتے کی طرح پھیلا دیا اور بھاگتا گیا! بجلی کی چمک، بادل کی گرج، اور ہوا کے برفانی فراٹے ہوش و حواس گم کئے دیتے تھے۔ آخر وہ درخت قریب آگیا اور میں ایک جست لگا کر اس کے تنے سے پیٹھ لگا کر کھڑا ہوگیا، آنکھیں بند کرلیں اور دل پر ہاتھ رکھا، بچارا کتنے زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی پھوٹ جائے گا۔ ایک طویل عرصہ کے بعد جب سانس کی دھونکنی ڈھیلی پڑی، دل ٹھکانے آیا اور حواس بجا ہوئے۔ تب جا کر کہیں میری آنکھیں کھلیں اور میں نے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا۔

بخدا کتنا بڑا سرول کا درخت تھا ۔صرف تنے کا لپیٹ ہی ساٹھ ستر فٹ ہوگا ، اور کتنا اونچا درخت تھا ۔ وُور اوپر کہیں سے اولوں کی تڑاتڑ کی آواز آرہی تھی ۔ مگر اس گھنے چھتنار سے کے نیچے کوئی اولا نہیں گرتا تھا ۔ چاروں طرف قیامت کا منظر تھا ، لیکن یہ تین سو ، چار سو ، یا شاید پانچ سو سال کا پرانا سرول کا درخت ، ایک پُرشور مہیب بحری طوفان میں ساکن جزیرے کی طرح قائم تھا ، ایک بے آب وگیاہ ریگستان میں خوشنما لہلہاتے ہوئے نخلستان کی طرح تنہا ، قدرت نے ایک ہی جھلک میں کائنات کی تصویر کے دونوں پہلو دکھا دیئے +

میں یونہی سوچتا ہُوا اپنے بھیگے ہوئے کوٹ کو نچوڑ رہا تھا کہ اتنے میں کہیں پاس ہی سے بکری کے بچے کی "مَیں مَیں" سنائی دی ۔ میں گھوم کر اور درخت کے تنے کے دوسری طرف جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ تنے میں ایک بڑی سی کوکھ ہے جس میں بگی خاموش ، صم بکم ایک سونٹے کے سہارے کھڑی ہے اور بھیڑ بکریوں کا ایک ریوڑ اس کے پاس ہی قدموں میں بیٹھا ہُوا ہے ۔

مجھے دیکھ کر بگی ایک دم کانپ اُٹھی ، اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک نمودار ہوئی پھر آہستہ سے اُس نے اپنا سر نیچا کرلیا ۔ میں نے ایک بکری کے بچہ کو آہستہ سے گود میں اُٹھا لیا ، سردی میں مجھے اس کی نرم نرم ریشم کے گھنے بال نہایت بھلے معلوم ہوئے ۔ یونہی اس بکری کے معصوم بچے کے سر پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے میں نے بگی سے پوچھا "دو دن سے میں نے تمہیں نہیں دیکھا بگی !"

وہ خاموش رہی ، آنکھیں جُھکائے ہوئے

میں بکری کے بچے سے کھیلتا رہا ۔

اب چاروں طرف خاموشی چھا گئی تھی ۔ اولے برسنے بند ہوگئے تھے ۔

آخر ایک صدیوں کی طرح لمبے عرصے کے بعد میں نے آہستہ سے کہا "یہاں تو بہت سردی ہے کیا میں کوکھ کے اندر آسکتا ہوں ؟"

کوئی جواب نہ پا کر میں کوکھ کے اندر آگیا ۔

"ہونہہ ۔ اچھی خاصی کوکھ ہے" میں نے آپ ہی آپ بلند آواز میں کہنا شروع کیا ۔ "پتہ نہیں اس درخت کی عمر کیا ہوگی ، بگی ! ——— شاید دو تین سو سال ہوگی ۔ کیوں بگی ؟ ٹھیک ہے نا ؟ کتنی اچھی جگہ ہے ۔ طوفان اور برف و باراں میں غریب چرواہے اسی درخت کی کوکھ کا سہارا ڈھونڈتے ہوں گے ، ٹھیک ہے نا ! لیکن کیوں نہیں ؟"

بگی کھلکھلا کر ہنس پڑی ، آہ ، وہ دلکش ہنسی ، اس کے موتیوں کی طرح خوشنما دانت چمک رہے تھے اور اُس کا غنچہ سا دہن اس کوہستانی گلاب کے پھُول کی طرح روشن ہوگیا جس کے درمیان برف رکھ دی گئی ہو ۔

میں نے بکروٹے کو زمین پر چھوڑتے ہوئے پوچھا "کیوں ہنس رہی ہو بگی ؟"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا ، وہ ہنس رہی تھی اور کانپ رہی تھی ، اس کے بازو ننگے تھے اور اس کی قمیص جا بجا سے پھٹی ہوئی تھی ۔

"تمہیں سردی لگ جائے گی بگی ۔ لو یہ کوٹ پہن لو"

اس نے ہنسنا بند کر دیا اور چپ چاپ کھڑی ہوگئی۔ میں اُسے کوٹ پہنانے لگا۔

جب میں کوٹ پہنا چکا، تو اُس نے آہستہ سے اپنے بازو میری گردن میں ڈال دیئے اور اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا اور سسکیاں لے کر رونے لگی۔

میں اس کی ہنسی کو نہ سمجھا تھا لیکن اس کے رونے کو سمجھ گیا، محبت کے پُرسوز نغمے نے یکایک دل کے ویرانے کو روشن کر دیا، میں بگّی کے پریشاں بالوں سے کھیلنے لگا۔ وہ سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی اور اپنی پریشان لٹوں سے آنسوؤں کو پونچھتی جاتی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کی سسکیاں کم ہوتی گئیں۔

اولے بند ہو چکے تھے۔ اور اب برفباری شروع ہو گئی تھی۔ چاروں طرف دُھند اور تاریکی چھا رہی تھی۔ شاید اس اتنی بڑی دنیا میں اب وہی سرول کا گھنا چھتنار امحفوظ ترین جگہ تھا، اور اسی چھتنارے کے نیچے کھڑے۔ دو فرد، اور دو دھڑکتے ہوئے دل باہر کے طوفان سے پناہ مانگ رہے تھے۔

اور ——— اگر اسی کوکھ میں کھڑے کھڑے محبت کے ان دو تنگوں کی عمریں بیت جاتیں تو کیا ہی اچھا ہوتا!

سرول کا چھتنارا، بھیڑ بکریوں کا ریوڑ، بگّی اور میں، اور خوشی کے آنسو، یا شاید غم کے آنسو! کون کہہ سکتا ہے؛ فطرت کس قدر پُراسرار ہے!

——— اور اُس کے دو دن بعد بگّی مر گئی، نہیں، اس کے وحشی باپ نے اُسے مار ڈالا،

کیا وہ ایک رات بھر ایک سرول کے درخت کی کوکھ میں ایک اجنبی کے پاس نہ رہی تھی؛ اُس نے ٹھیک کیا اُسے مار ڈالا، یہ جنگل کا قانون تھا۔ اس نے اُس کی لاش کو گھسیٹ کر جھیل کے کنارے برف پر پھینک دیا، شاید میری اپنی آنکھوں نے اُسے جھیل کے کنارے برف کے سفید بستر پر سوئے ہوئے دیکھا، کتنی گہری نیند تھی، کبھی نہ ختم ہونے والی، اُس کے بازو کھلے تھے۔ اس کے سنہری بال اُلجھے ہوئے، چہرہ کنول کے نوزائیدہ پھول کی طرح سپید، اور اس کی کنول کی ڈنڈی کی طرح نازک گردن میں ایک گہرا نشان تھا، یاقوت کی طرح گہرا سُرخ۔ میں جانتا ہوں کہ میں اُسے اس طرح پڑے دیکھ کر پاگل ہو گیا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ میں نے اس وقت آگے بڑھ کر اور گھٹنے ٹیک کر اُس گہرے سُرخ یاقوتی گھاؤ کو چوم لیا تھا۔ آہ۔ مگر یہ تو ایک بیوقوف مصوّر کی فطری کمزوری تھی۔ وہ اس ایک بوسے سے اُس سونے کی مورت میں روح پھونکنا چاہتا تھا۔

بے سود۔ محض بے سود۔

تم کہتے ہو کہ میرا خط پڑھ کر کملا پہروں روتی رہی۔ تمہیں پتہ ہے فیروز، میں ان سات دنوں میں کس قدر رویا ہوں۔ کیا میرے آنسو کملا کے آنسوؤں کی سزا ہیں؛ جانے دو۔ فیروز بھائی! یہ آنسو کس کام کے ہیں۔ میرے اور کملا کے۔ بے سود۔ بالکل بے سود۔

پتہ نہیں یہ آنسو کب بند ہوں گے، پتہ نہیں یہ برف باری کب بند ہوگی، بہر صورت میں کل ضرور جھیل کے اُس پار جاؤں گا جہاں سرول کا ایک گھنا چھتنارا ہے۔ جس کے تنے میں ایک بڑی کھوہ ہے۔ جھیل کے کنارے میری کشتی انتظار کر رہی ہوگی اور جھیل کے اُس پار میری جگی!

یہ کون گا رہا ہے۔ سنتے ہو۔ کتنا میٹھا، پُر درد گیت ہے۔

ہُن آ۔ ہُن آ، ماہیا گلے نال لا۔ نال لا۔ ماہیا

مینوں

روزنامچہ پولیس۔ تھانہ دھرسال

۸ نومبر

آج ڈاک بنگلہ کے چوکیدار مسمّی صاحبدین کی رپورٹ پر کالارام خواندہ کنسٹبل کو جھیل پر بھیجا گیا، ایک ٹوٹی ہوئی کشتی ملی اور پانی میں تیرتی ہوئی ایک لاش۔ چوکیدار مذکور کا بیان ہے کہ اُس نے کل شام کو متوفی کو آخری مرتبہ دیکھا جب کہ وہ ننگے سر جھیل کی طرف بھاگتا ہوا جا رہا تھا، چوکیدار نے کئی بار آوازیں دیں مگر متوفی نے کوئی جواب نہ دیا۔ متوفی رات کو واپس بنگلہ پر نہیں آیا۔

متوفی کے جسم پر کوئی چوٹ یا خراش نہیں، موت غالباً خودکشی سے ہوئی یا اتفاقیہ ڈوب جانے سے، متوفی کا نام شیام سُندر تھا، وہ لاہور کا رہنے والا تھا اور یہاں بغرض سیر و سیاحت آیا تھا۔ لاش بغرض پوسٹ مارٹم سول سرجن صاحب بہادر کو بھیج دی گئی ہے۔ مزید تفتیش جاری ہے۔

بقلم خود حق نواز خاں صدر محرّر
تھانہ چوکی دھرسال"

(طبعزاد) کرشن چندر

بالی بی بی کی فریاد

بی بی

پڑتے ہی میں سو جاتی ہوں
بھاری سر تکیے پر رکھ کر
ندیا پور میں کھو جاتی ہوں
میرا خسر غصے میں بھر کر
پھرتا ہے اندر اور باہر

تال

دھب، دھب، دھب، دھب، گالی پہ گالی
سو نہیں سکتی میں بے چاری

خسر

اُٹھ ری اُٹھ ! او کاہل لڑکی
اُٹھ ری اُٹھ ! او نیند کی ماتی
پھوہڑ ! سست !
موئی حیوان !

بی بی

پڑتے ہی میں سو جاتی ہوں
بھاری سر تکیے پر رکھ کر
نندیا پور میں کھو جاتی ہوں
ساس مری تیہے میں جل کر
پھرتی ہے اندر اور باہر

تال

دھب، دھب، دھب، دھب، گالی پہ گالی
سو نہیں سکتی میں بے چاری

ساس

اُٹھ ری اُٹھ! او کاہل لڑکی
اُٹھ ری سٹّو! نیند کی ماتی
پھوہڑ! سست!
موئی حیوان!

بی بی

پڑتے ہی میں سو جاتی ہوں

بھاری سر تکیے پر رکھ کر
نندیا پور میں کھو جاتی ہوں

ہولے ہولے بالم میرا

چپکے چپکے ہمدم میرا
آتے جاتے اندر باہر
کہتا ہے مجھے سوتے پا کر

شوہر

[سو لے، سو لے، سو لے پیاری!
سو لے، سو لے او بے چاری!
یہ سن اور شادی کا پھندا!
یہ دن اور دنیا کا دھندا!
میری بنّو!
میری جان!]

(روس کا ایک دہاتی گیت)

حامد علی خاں

رادھا کے گیت

رادھا کے گیت اِس سے قبل بھی ہمایوں میں چھپ چکے ہیں اور اہلِ ذوق نے انہیں بہت پسند کیا ہے یہ گیت جو منثور نظموں کے بہترین مجموعوں میں شامل ہونے کے قابل ہیں حضرت عظیم قریشی نے خود لکھے ہیں - ترجمہ نہیں۔ "ح"

(۱)

سکھی میری پیت کی کہانی نہ سُن
آہ سکھی پیت کی کہانیاں کتنی پیاری ہوتی ہیں
دوسری سکھیوں نے نوجوانی میں اپنے اپنے پیتم ڈھونڈے اور نینوں میں بسائے
مگر سکھی میں نے اپنا پیتم بچپن ہی میں ڈھونڈا اور اُس سے پیت لگائی
اپنے بچپن کی بھولوں سے میں نے اُسے پالا
پریم کے پہلے پہلے پھولوں سے میں نے اُسے پالا
میں نے ناچ ناچ کر اُس کے پریم کو سجایا
میں نے رو رو کر اُس کے ہردے کو بہلایا
وہ ایک پھول تھا مُرجھائی ہوئی کونپلوں والا
وہ ایک چاند تھا ترسا ہُوا رویا ہُوا
جیسے آکاس کو اِک سپنا ملے
اور پھر تاروں کی گود میں کھو جائے
ایسے ہی وہ مجھے بھی ملا
اور ایک سپنے ہی کی طرح مٹ گیا

. . . .

سکھی میری پیت کی کہانی نہ سُن
آہ سکھی پیت کی کہانیاں کتنی پیاری ہوتی ہیں

(۲)

چندر دیوتا نے
اپنے آنسوؤں کی راگنی سُنا کر
کنول کے رُوپ کو
اپنے جیون کی خوشیوں کا تاج بنا لیا
رادھا پوچھتی ہے
"پیتم، تم میرے مُرجھائے ہوئے پریم کا گیت کب بنوگے؟"

(۳)

کیا سکھی پریم کا دیپک آنسوؤں سے نہیں جلتا؟
ہنستا ہُوا پریم رادھا کی نظر نے کبھی نہیں دیکھا
سکھی کیا پریم ہنسا بھی کرتا ہے؟
پریم کو یونہی اُداس دیکھتے دیکھتے نہ جانے کتنی برساتیں بیت گئیں۔
پریم کو یونہی اُداس دیکھتے دیکھتے نہ جانے کتنی راتیں بیت گئیں
ہردے کے سپنوں کی پیاس رو رو کے کُملا بھی گئی
جیون کے گیتوں کی مٹھاس رو رو کے مُرجھا بھی گئی
کیا سکھی پریم کا دیپک آنسوؤں سے نہیں جلتا؟

(۴)

سکھی، میں نے اپنی پریت کے دُکھ چھُپا لئے
اپنے ہنستے ہوئے ہردے میں!!
کوئل اپنے اُن گیتوں کو جن میں اُداسی کا رس ہو کبھی گاتی ہی نہیں
کلی اپنی پریت کی خوشیوں کے منوہر دُکھ کو کبھی بتاتی ہی نہیں
پریت کے دُکھ من میں بسے ہوئے ہی بھلے لگتے ہیں
پریت کے دُکھ من میں چھپے ہوئے ہی بھلے لگتے ہیں
سکھی میں نے اپنی پریت کے دُکھ چھُپا لئے ہیں
اپنے ہنستے ہوئے ہردے میں!!

عظیم قریشی لدھیانوی

غزل

اے کاش کبھی جانو ہے سوزِ محبت کیا
اے کاش کبھی سمجھو ہے عشق میں راحت کیا

ذرّے کو یہ سودا تھا خورشید سے مل جاؤں
ہے اِس کے سوا میرا افسانۂ اُلفت کیا

اِک نام کی نسبت سے رُسوا ہوں زمانے میں
ورنہ مری ہستی کیا اور میری محبت کیا

اُمید کی وادی میں تخئیل کے دھوکے تھے
آغازِ محبّت کیا، انجامِ محبت کیا

تقدیر و خدا کو میں اپنا ہی بنا لیتا
جب تم نہ ہوئے اپنے پھر اُن سے شکایت کیا

مجبوری و ناکامی، محرومی و رسوائی
جینا اِسے کہتے ہیں؛ اِس جینے میں راحت کیا

گر درد ہی دینا تھا ہمدم بھی دیا ہوتا
ہمدم جو نہیں حاصل، پھر درد میں لذت کیا

ع۔ا۔ سجاد

محفلِ ادب

میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں؟

بعض حضرات نے جنہیں میری افسانہ نگاری کے متعلق حُسنِ ظن ہے مجھ سے پوچھا ہے کہ تم "افسانہ کیونکر لکھتے ہو"۔ اور اس طرح بار بار پوچھا ہے مجھے خود بھی اپنی افسانہ نگاری سے ایک گونہ حُسنِ ظن ہوگیا ہے۔ چونکہ مجھے بتایا گیا ہے کہ "سدھ مکردھوج" کے مصنف "یا "موجد" نے اصلی "سدھ مکردھوج نسخہ" پریمی سجنوں کی کھاتر" اخباروں میں چھاپ دیا ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "برائے فائدۂ انام" و "نفعِ عوام" "اصلی افسانہ نگاری" نسخہ جو بصرفِ زرِ کثیر حاصل کیا گیا ہے اخباروں میں شائع کر دیا جائے۔ جن اصحاب کو "اس نسخہ" سے فائدہ ہو وہ اس ہیچ مدان، کج مج زبان، ب اسلاف و فخرِ اخلاف۔ فقیر حقیر سراپا تقصیر سند باد جہازی عفی عنہٗ کو دعائے خیر سے یاد کریں۔

جس کمرے میں بیٹھ کر میں افسانہ لکھتا ہوں۔ کبھی اُسے دیکھئے تو میری افسانہ نگاری کا طریقہ آپ کی سمجھ میں آسانی سے آجائے گا کمرے کے وسط میں ایک میز پڑی ہے جس پر کتابیں اور اخبار پڑے ہیں۔ ان پر سگرٹ کی راکھ۔ سگرٹ کے ٹکڑے۔ ایک کونے میں چارپائی ہے۔ اس کے ساتھ ایک طاقچہ میں پُرانے اخباروں کے تراشے۔ رسالے۔ فائل بے ترتیبی سے ٹھونس دیئے گئے ہیں۔ دوسرے طاقچہ میں دوائوں کی شیشیاں۔ ڈبے ڈبیاں اور پُڑیاں پڑی ہیں۔

جب مجھے افسانہ لکھنا ہوتا ہے تو پہلے سر میں روغنِ بادام ملا جاتا ہے۔ پھر تھوڑی سی دوا المسک جواہر والی کھا کر شفاء الملک حکیم فقیر محمد صاحب قبلہ کے دواخانہ کا ایک نسخہ جو "ہوالشافی"۔ کوفتہ بیختہ خیسانیدہ۔ مالیدہ۔ جوشانیدہ" قسم کا ہے استعمال کرتا ہوں۔ اس کے بعد دعائے کشائش ذہن" ایک سو ایک مرتبہ پڑھ کر اپنے سینہ اور ہاتھوں پر دم کرتا ہوں اور افسانہ لکھنا شروع کر دیتا ہوں۔

اب شاید آپ جاننا چاہیں گے کہ میرے ذہن میں پلاٹ کس طرح آتا ہے تو یہ سُن لیجئے کہ پلاٹ ذہن میں سرے سے آتا ہی نہیں۔ نہ اس کی کوئی ضرورت ہے۔ "دعائے کشائش ذہن" تو محض حفظِ ماتقدم کے طور پر پڑھ لی جاتی ہے تاکہ اگر بیچارا پلاٹ ذہن میں آتا ہے تو اُسے دقت نہ ہو۔

آپ میرا منشا نہیں سمجھے۔ میں اپنی افسانہ نگاری کا طریقہ تفصیل سے بیان کر دوں تو یہ سارے "اشارات" آپ کی سمجھ میں آ جائیں گے۔ دیکھئے یہ جو میز میرے کمرے میں پڑی ہے۔ اس میں کئی خانے ہیں۔ جن میں افسانوں کے اجزا بند ہیں۔ میرا کام صرف کوفتن، بیختن، خیسانیدن، مالیدن" ہے۔ ایک خانے میں فسانوں کے دو سو پلاٹ قید ہیں۔ ان میں ہر قسم کے پلاٹ ہیں۔ تاریخی، معاشرتی، ملکی، علمی اور سچ پوچھئے تو بڑی محنت سے اور بصرفِ زرِ کثیر جمع کئے گئے ہیں۔ کچھ "رُوڈ سٹوری میگزین" سے لئے ہیں۔ کچھ سٹرینڈ میگزین، نیشن انگلش وغیرہ سے۔ بچپن میں ہم نے اپنے ماموں سے جو کہانیاں سُنی تھیں ان کے پلاٹ بھی انہیں میں شامل ہیں۔ اس لئے اگر میں چاہوں تو افسانوں کے ایک صد دکھلیہ بنا ڈالوں لیکن میں ایسے کا خواہش ہوں کہ بچارا اور کچھ دنوں جی لے۔

دوسرے خانے میں ہر قسم کے "کردار" ہیں۔ ہر ملک، ہر جماعت، ہر طبقہ، ہر قوم، ہر مذہب کے کردار۔ تیسرے خانے میں مناظر اور ہر قسم کے مناظر۔ چوتھے خانے میں فارسی اور اُردو کی شگفتہ ترکیبیں۔ چھپے ہوئے جُملے۔ ظریفانہ فقرے۔ قمر چکاں اور ملال زا قہقہۂ منجمد تبسم سیال سی بھاری بھرکم ترکیبیں۔ ذرا غور تو کیجیے۔ اس چھوٹے سے خانے میں ایک ہزار اور پانچ سو ترکیبیں بند ہیں۔ ان کی فراہمی میں میں نے جو محنت کی ہے اُسے میرا ہی جی جانتا ہے۔ ہزاروں رسالے پڑھ ڈالے۔ سینکڑوں کتابوں کا مطالعہ کیا۔ جب یہ ترکیبیں اور جملے ہاتھ آئے ہیں۔ پانچویں خانے میں شہروں۔ پہاڑوں۔ دریاؤں۔ درختوں۔ پھولوں۔ مشہور عمارتوں کے نام۔ چھٹے میں مختلف لباسوں اور زیوروں کی تفصیل۔ یہ میز کاہے کو ہے۔ بھان متی کا پٹارہ ہے۔ اور میرا کام بھی صرف اس قدر ہے کہ ایک خانہ سے پلاٹ نکالا، دوسرے سے کردار، تیسرے سے مناظر وغیرہ اور انہیں جوڑ کر اچھا خاصہ افسانہ طیار کر دیا۔ اب فرمائیے پلاٹ کے ذہن میں آنے کی ضرورت کہاں باقی رہ گئی؟

لیکن اسے آسان کام نہ سمجھیے۔ کبھی پلاٹ اور کردار کی آمیزش میں بڑی بڑی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ فرض کیجیے کہ افسانے کے ہیرو کا نام تارا سنگھ ہے وہ پنجاب کے ایک معزز سکھ خاندان کا چشم و چراغ ہے۔ افسانہ اس طرح شروع ہوتا ہے کہ چاندنی رات میں تارا سنگھ دریا کے کنارے بیٹھا ہوا ہے۔ اس موقع پر آپ اس جملے کو ٹھونسنا چاہتے ہیں

"کائنات کا جسم ایک ردائے نور میں ملفوف تھا۔ وہ سگرٹ کے کش لگا کر دھوئیں کے حلقے بنا رہا تھا اور اس کی نگاہیں فضائے سیمیں میں ان حلقہ ہائے پرّاں کا تعاقب کر رہی تھیں۔"

تو بڑی بے جوڑ سی بات معلوم ہوگی۔ لیکن اگر جملہ اچھا ہے تو "ٹھونس دیجیے"۔ ابھی ہمارے ہاں لوگ ان باتوں کی پروا نہیں کرتے۔ ہاں البتہ اتنا خیال رہے کہ جملہ پھسپھسا نہ ہو۔ اور پھسپھسا ہو تو ایک آدھ "تقاطر لرزاں"، "فخافخ خنداں" جیسی ترکیب اور ٹھونس دیجیے۔ یہ "ٹھونس ٹھانس" کسی کو یہ سوچنے کی مہلت ہی نہیں دے گی کہ کمبخت افسانہ نگار نے تارا سنگھ کے منہ میں سگرٹ ٹھونس دیا؟

افسانہ ختم ہو جاتا ہے تو میں تھوڑا سا دودھ پی کر سر پر ہاتھ پھیرتا ہوں۔ پھر اپنے پڑوسی رام بھروسے دھوبی کو بلا کر اسے افسانہ سناتا ہوں۔ کیونکہ ہمارے محلے میں صرف وہی "اہل زبان" ہے۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا ہے کہ محلہ بھر کے لوگ مجھے افسانہ نگار سمجھتے ہیں۔ جب میں روغن بادام کی شیشی سر پر انڈیل کر کھڑکی سے جھانکتا ہوں تو رام بھروسے پکار کر کہتا ہے "کا کرت ہو بابو جی، پھسانہ لکھت ہو؟" لوگ اپنی اپنی کھڑکیوں سے سر نکال کر مجھے حیرت اور احترام کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھنے لگتے ہیں۔ اب تو ہماری افسانہ نگاری کی یہ دھوم ہے کہ مائیں اپنے بچوں کو یہ کہہ کر ڈراتی ہیں۔ "بلاؤں اس بابو کو جو سامنے والے مکان میں رہتا ہے۔ تیرا بھی پھسانہ لکھ دے گا" اور بچے دہشت زدہ ہو کر چپ ہو جاتے ہیں۔

چلتے چلتے آپ کو ایک راز کی بات بھی بتا دوں کہ میں نے آج تک کوئی افسانہ نہیں لکھا۔ لیکن آپ ہی کہیے کہ اگر میں نے افسانہ نگاری شروع کر دی تو . . . .

(چراغ حسن حسرت)

"احسان"

مطبوعات

کلام ٹیگور (حصہ اول) قیمت عہ۔ پتہ:۔ وشوا بھارتی بک شاپ ۱۰۔۲۱۰ کارنوالس سٹریٹ کلکتہ۔ اگرچہ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کی شاعری چھوٹے چھوٹے ترجموں کے طفیل اردو ادب سے روشناس ہو چکی ہے مگر ان کے پورے کلام کو اردو قالب میں ڈھالنے کی غالباً پہلی کوشش ہے جس کیلئے ہم ایم ضیاء الدین صاحب شانتی نکیتان بنگال کے ممنون ہیں۔ کلام ٹیگور کے اس پہلے حصے میں جس کا حجم ۱۰۲ صفحے ہے ٹیگور کی ۱۲۰ نظمیں شامل ہیں۔ مذہب، عشق اور روحانیت تین عناصر ہیں جن سے ٹیگور کا کلام مرکب ہے ان تینوں پر چھائی ہوئی دیہاتی سادگی کی فضا نے ٹیگور کے کلام کو سحر کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ ہم خوش ہیں کہ ٹیگور کو ایک اچھا مترجم ملا ضیاء الدین صاحب کی زبان صاف سلیس شستہ اور سادہ ہے اور انہوں نے ترجمے میں اصل کی خوبی قائم رکھنے کی کوشش کی ہے مگر نظم کا نثر میں منتقل ہونا اور وہ بھی ایک بالکل غیر زبان میں اصل کی محض خفیف سی جھلک ہی دکھا سکتا ہے اور بنگالی نہ جاننے والوں کیلئے اس کے سوا کوئی چارہ کار بھی نہیں۔ ضیاء الدین صاحب کا ترجمہ بجائے خود قابل تعریف ہے اور ایسے اچھے تراجم ہماری زبان میں کم ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔ بلا شبہ یہ کام ایک ایسا ہی ادیب کر سکتا تھا جو بنگالی اور اردو دونوں زبانوں سے ضیاء الدین صاحب کی طرح خوب واقف ہو۔ ابتدا میں بیس صفحے کا فاضلانہ دیباچہ اور ٹیگور کی تصویر بھی ہے۔ کتاب مجلد ہے۔

۱۔ افسانہ نگاری
۲۔ ہمارے افسانے
} مصنفہ سید وقار عظیم صاحب ایم اے۔ پتہ:۔ وشوا بھارتی پریس الہ آباد۔ حجم علی الترتیب ۱۰۶ اور ۲۴۷ صفحات قیمت درج نہیں۔ اردو کے قدیم ذخیرے میں تنقیدی تصانیف تقریباً معدوم ہیں اور جو ہیں بھی ان میں سے بیشتر بہت سطحی ہیں۔ صحیح تنقید کی نا موجودگی اچھے ادب کے نشوونما کے راستے میں بڑی حد تک حائل رہی ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ کچھ عرصے سے ہمارے نوجوان ادیبوں نے تنقید کی طرف توجہ کی ہے اور ہمارے رسالوں میں افسانوں، نظموں اور "لطیف ادب" کے ساتھ ساتھ اب تنقید کے "خشک" مضامین بھی نظر پڑتے ہیں۔ فی الواقع اردو ادب کو اس وقت اچھے نقادوں کی بڑی ضرورت ہے کیونکہ نظم ونثر کے نئے نئے تجربوں کے اس دور میں خطرہ ہے کہ رہنماؤں کی غیر موجودگی یا منزل ناشناس رہبروں کو بے راہروی کی وادی میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دے۔

سید وقار عظیم صاحب کا شمار ہمارے ان نوجوان نقادوں میں ہے جنہیں علم کے ساتھ مذاق سلیم سے بھی حصۂ وافی ملا ہے۔ ان کی یہ دونوں کتابیں اردو کے تنقیدی ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہیں کیونکہ حکایتی ادب کے موجودہ دور میں افسانہ نظم کو چھوڑ کر تنقید کا سب سے زیادہ متقاضی اور محتاج ہے۔ افسانہ نگاری میں ذیل کے موضوعوں پر بصیرت افروز بحث کی گئی ہے:۔ افسانے کی حقیقت، پلاٹ، عنوان، فنی ترتیب، ابتدا اور خاتمہ اور کردار نگاری وغیرہ۔ "ہمارے افسانے" میں اردو کے افسانوں اور بعض افسانہ نگاروں کے متعلق مصنف نے اپنے خیالات آزادانہ طور پر لکھے ہیں۔ افسانہ نگاروں میں نیاز فتح پوری، سالک، ظفر علی خاں اور حفیظ جالندھری وغیرہ کے نام نظر نہیں آئے۔ اس کے علاوہ بعض نام کم از کم فی الحال شاید غیر ضروری ہیں۔ ان فروگذاشتوں کی تلافی اگر حضرت مصنف کو اتفاق ہو تو آئندہ اشاعتوں میں کی جا سکتی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اہل نظر ان کتابوں کی پوری قدر کریں گے۔

اطلاع بنام قرضداران نسبت تعین تاریخ سماعت درخواست دیوالیہ بحت دفعہ ... ایکٹ سنہ ۱۹۲۰ء دیوالیہ

نمبر مقدمہ ۴۰ سنہ ۱۹۳۵ء

بعدالت جناب۔ ایس۔ ایم۔ احمد کریم صاحب بہادر بیرسٹر جج ادل تراہج۔

(۱) لالہ رادھے لال } پسران لالہ گندھی لال قوم اگروال ساکنان شہر ... (۲) لالہ رام لکھمن لال } محلہ میر الخیل پورہ۔ سائلان مہاجنان

بنام

(۱) پریم نرائن عرف پدھے لال } پسران موہن داس کھتری ساکنان محلہ (۲) رام موہن ...... } گوردی شہر ... فریق ثانی ...

درخواست حسب دفعہ ۹(۱) اور ۱۳(۲) ایکٹ ۵ سنہ ۱۹۲۰ء

ہرگاہ سمیان لالہ رادھے لال و لالہ رام لکھمن لال سائلان نے عدالت ہذا میں بذریعہ عرضی دعوے مورخہ ۱۳ ماہ دسمبر سنہ ۱۹۳۵ء درخواست کی ہے کہ حسب دفعہ ۹(۱) اور ۱۳(۲) ایکٹ ۵ سنہ ۱۹۲۰ء فریق ثانی دیوالیہ قرار دیئے جائیں اور ان کی جائداد کسی ریسور کے قبضہ کردی جائے اور تمہارا نام فہرست قرضداران میں جو مہاجنان مذکور نے داخل کی ہے پایا جاتا ہے۔ اور ان کو اطلاع دی جاتی ہے۔ کہ عدالت ہذا نے تاریخ ستائیس اپریل سنہ ۱۹۳۶ء واسطے سماعت درخواست مذکورالصدر اور لینے بیانات مہاجنان مقرر کی ہے۔ اگر تم اس معاملہ میں پیروی کرنا چاہتے ہو تو اصالتاً یا ذریعہ وکیل جو حال مقدمہ سے قرار واقعی واقف کیا گیا ہو حاضر ہو۔

آج بتاریخ ۲۷ جنوری سنہ ۱۹۳۶ء میرے دستخط اور مہر عدالت ہذا سے جاری کیا گیا۔

عدالت سب جج اول ... بشیشر دیال ... ۱۴ مارچ سنہ ۱۹۳۶ء

مہر عدالت

دستخط حاکم

قواعد

۱۔ "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲۔ علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ایک کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتر صفحے ماہوار اور سو آٹھ سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۲۰ سے پہلے پہنچ جانی چاہیے

اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

۸۔ جواب طلب امور کے لئے ایک کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیے۔

۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے چھ آنے ششماہی تین روپے (مع محصولڈاک) فی پرچہ ۸ آنے

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتا تحریر کیجئے۔

۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافے پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھئے

منیجر رسالہ ہمایوں

۲۳۔ لارنس روڈ۔ لاہور

Title and Picteur Printed at the Halftone Press, Ram Nagar, Lahore.

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

یادگار علامہ فضیلت مآب جناب جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔اے (آکسن)، بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔اے

اُردو نمبر

(۵)
نمبر

(۲۹)
جلد

فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہِ مئی ۱۹۳۶ء

سالانہ ۵؎ ششماہی ۳؎ مع محصول — قیمت فی پرچہ ۸؍

تصاویر

سامنے کی تصویریں اُس پارٹی کے موقع پر لی گئی تھیں جو مدیرِ ہمایوں کی طرف سے "المنظر" کے باغ میں مولانا عبدالحق صاحب کے اعزاز میں ۱۳ر اپریل ۱۹۳۷ء کو دی گئی اور جس میں لاہور کے بہت سے ادبا اور دیگر معززین شریک ہوئے۔

اُوپر کی تصویر میں مولانا عبدالحق صاحب کے دائیں طرف یہ اصحاب بیٹھے ہیں:۔ مولانا ظفر علی خاں، ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین سکرٹری انجمن حمایت اسلام، ڈاکٹر محمد شفیع پرنسپل اورینٹل کالج لاہور، ڈاکٹر ہادی حسن پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، میاں ریاض احمد، میاں بشیر احمد۔ ان کے پیچھے چند اور اصحاب بھی ہیں۔

درمیانی تصویر میں مولانا عبدالحق کے دائیں بائیں ہمایوں کے ایڈیٹر اور جائنٹ ایڈیٹر کھڑے ہیں۔

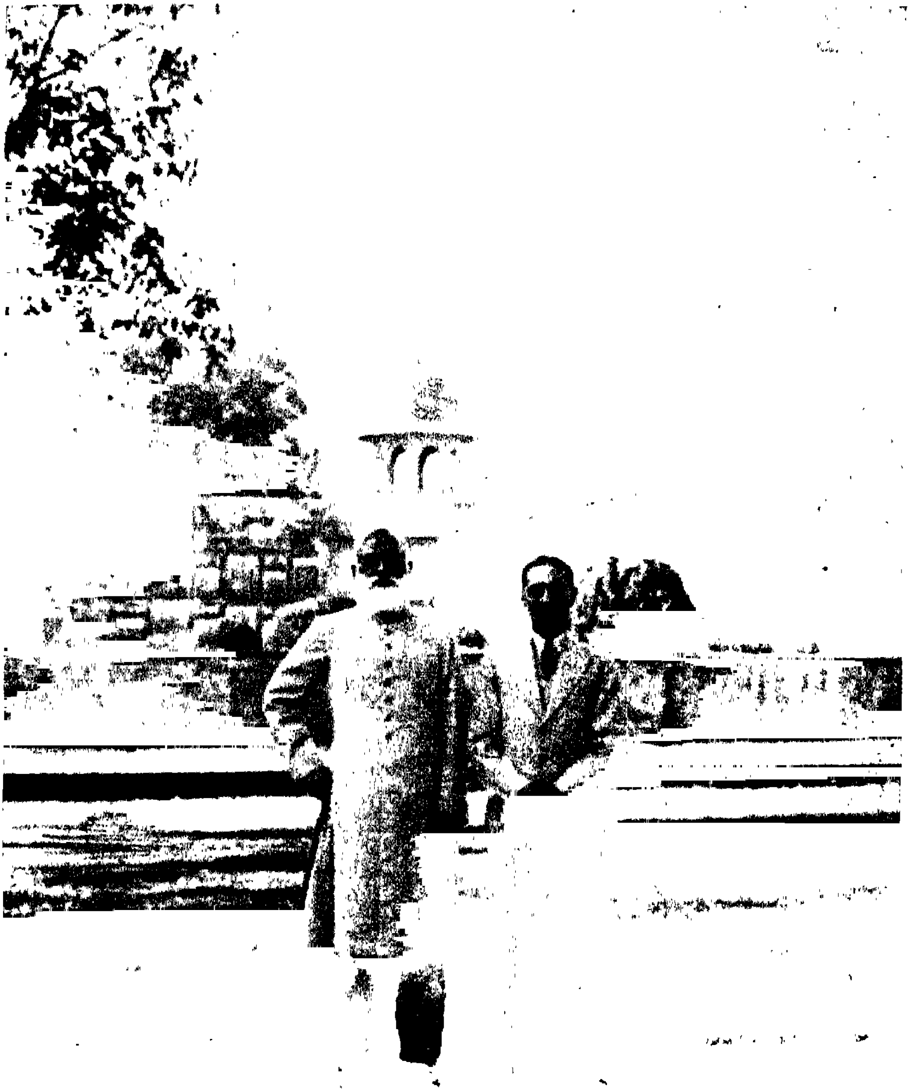
نیچے کی تصویر میں مولانا عبدالحق، علامہ یوسف علی پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور سے گفتگو کر رہے ہیں اور اُن دونوں کے سامنے جسٹس میاں عبدالرشید اور ڈاکٹر ایس ایس بھٹناگر صدر شعبۂ کیمیا پنجاب یونیورسٹی بیٹھے ہیں۔ مولانا کے پیچھے علامہ برج موہن دتاتریہ کیفی چند اور اصحاب سے باتیں کر رہے ہیں۔

دوسرے صفحے پر مولانا موصوف اور مدیرِ ہمایوں کی تصویر ہے جو شالامار باغ میں ایک صبح سیر کے موقع پر آخر الذکر کے "خود عمل" کیمرے نے خود بخود لے لی۔









مولانا عبدالحق

میاں بشیر احمد

بزمِ ہمایوں

۱۹۲۳ء میں ہمایوں کا ایک خاص نمبر شائع ہوا تھا جس میں اِس مضمون پر مختلف انشا پردازوں نے اپنے بیش بہا خیالات کا
اُردو ہندوستان کی مُلکی زبان کیونکر بن سکتی ہے" ؟ آج تقریباً تیرہ سال کے بعد ہم ایک اور اُردو نمبر شائع کر رہے ہیں ۱۹۲۳ء
مصنفِ "منشورات" اپنے قیمتی مضمون" اُردو اور پنجاب" میں لکھتے ہیں: اِس قبیل کے مضامین کو مارچ ۱۹۲۳ء کے ہمایوں میں
ھنا اور اُن پر غور و فکر کرنا اُردو کے ہر خیر خواہ کا فرض ہے "

دو نمبر میں ہم نے اِس مسئلے پر پھر چند مضامین کو یکجا کر دیا ہے اور اِس اہم امر پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے کہ اس وقت اُردو
ہے اور آئندہ اُس کی بہبُود کے لئے ہمیں کیا کچھ کرنا چاہئیے ؛

۱۹ء میں کہا گیا تھا کہ اُردو کی کوئی مرکزی انجمن ہونی چاہئیے۔ ۱۹۳۶ء کی بھی یہی پکار ہے کہ مرکزیت پیدا کرو، تنظیم کرو زبان کی نشر و
م ایک بڑے پیمانے پر جاری کرو کہ یہ سب سے بڑی ضرورتِ وقت ہے۔

تیرہ سالوں میں خاصا کام ہوا۔ اُردو کے بعض رسائل اور اخبارات استقلال کے ساتھ کام کرتے رہے، عثمانیہ یونیورسٹی اور انجمنِ ترقیٔ اُردو
ی و ادبی دولت میں قابلِ قدر اضافہ کیا، اور ادارے بھی بدستور مصروف رہے، بعض مصنفین کی انفرادی کوششیں اچھا پھل لائیں
چھ بڑھے پیچھے نہیں ہٹے لیکن اِس تیز رَو زمانے میں جب دُنیا کہیں سے کہیں جا پہنچی ہے، رُوس میں ایک قطعاً نیا تمدنی نظام قائم
بردست آمر ین نے اپنی گری ہوئی قوموں کو گویا اپنے جادُو کے زور سے منظّم کر کے اَور کا اَور بنا دیا ہے سینما اور ہوابازی اور ریڈیو نے
ں سے دُور کو نزدیک اور نزدیک کو نزدیک تر کر دیا ہے، خیالات میں بے انتہا وسعت پیدا ہو رہی ہے اور دل و دماغ میں آزادی
گئی ہے جس سے خدا جانے یہ دُنیا کیا سے کیا ہو جانے والی ہے ایک ایسے حیرت انگیز زمانے میں اپنے پرانے خیالات پر قائم رہنا"
پر کبھی نفرت اور کبھی حیرت کا اظہار کر دینا اور محض آہستہ آہستہ "ترقی" کئے جانا نہ صرف ناکافی ہے بلکہ غایت درجہ خطرناک۔ اب اُلگ
اور مٹکنے کا وقت نہیں رہا اب لکر سوچنے سمجھنے اور چل نکلنے اور دوڑنے اور پہنچ جانے کا زمانہ ہے!

پچھلے چند سالوں میں ہندوستان کی سیاسی زندگی کو بہت کم فروغ حاصل ہوا لیکن بعض نیم سیاسی تحریکات کو خاصی تقویت ملی جب
ملکی حکمرانوں سے کچھ حاصل نہ کر سکے تو ہم ایک دوسرے سے دست و گریباں ہونے لگے، یہاں تک کہ مہاتما گاندھی بھی سیاسیات
ں سے نکل کر بظاہر ادبیات کے اکھاڑے میں زور آزمائی کرنے لگے۔ سیاسی رہنماؤں نے غیر سیاسی مسائل کو اپنے رنگ
دیا ہے!

آج ہندی کے لئے جابجا کوششیں ہورہی ہیں۔ ہم ہندی کے مخالف نہیں، وہ بھی بنگالی اور گجراتی اور مرہٹی اور تامل تلیگو کی طرح ہی سرزمینِ ملک کی ایک میٹھی بولی ہے لیکن چند برسوں سے اور آج بھی یہی کوشش جاری ہے کہ جہاں جہاں اُردو کا عمل دخل ہے وہاں خاص طا ہندی کو رائج کیا جائے اور بتدریج اُردو کو ترک کر دیا جائے۔ اس صورت میں اُردو کا تحفظ لازم ہے، لازم ہے کہ ہم جلد سے جلد اُردو کی لسانی ادبی اور طباعتی اور اشاعتی ضروریات کو پورا کریں اور اُس کو اس قابل بنا دیں کہ وہ دُنیا کی بہترین بانوں کے پہلو بہ پہلو کھڑی ہو سکے۔

ہندی کا یہ مقابلہ و مجادلہ ملک کے لئے غیر مفید ہے لیکن شاید اُردو کے لئے مفید ثابت ہو بشرطیکہ ہم بجائے غفلت برتنے اور نفرت ک کے اپنی حالت کو سنواریں اور ہمیشہ ایک مناسب سمجھوتے کے لئے تیار رہوں۔ انجمن ترقی اُردو بعض اہم مسائل کے طے کرنے کے لئے عنقریب مرکزی مقام میں ایک اُردو کانفرنس منعقد کرنے والی ہے۔ انجمن حمایتِ اسلام لاہور نے اپنے سالانہ جلسے میں ایک خاص اجلاس اُردو کے لئے کیا جس میں وہ تقریریں پڑھی گئیں جو ہمارے اس موجودہ نمبر میں شائع ہو رہی ہیں۔

اس سلسلے میں اُردو کے محسن ہمارے محترم بزرگ مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اُردو لاہور تشریف لائے اور چند روز ہمایوں کے ہاں مقیم رہے۔ وہ صحبتیں مدت تک یاد رہیں گی جو اُن کے دم قدم سے "المنظر" میں قائم ہوئیں۔ بلاشبہ اُن کی دلکش زبردست شخصیت اُردو کے بہی خواہوں کی روشن اُمیدوں کا مرکز بن رہی ہے۔ موجودہ مشکلات ہم پر عیاں ہو رہی ہیں لیکن اُدھر یاس و حرماں کے بادل چھ گئے ہیں، ارادے اُبھر رہے ہیں اور تعاون و تنظیم کی صورتیں صاف نظر آ رہی ہیں، خدا کرے عمل ثابت کر دے کہ یہ محض کہنے سننے کی گرم بازار

ایسی حالت میں ملک و قوم کے ہر بہی خواہ کا فرض ہے کہ وہ اُردو کا ایک رضاکار بن جائے !

بشیر احمد

اُردو کا حال اور مستقبل

یعنی

ب مولوی عبدالحق صاحب بی، اے (علیگ) سکرٹری "انجمن ترقیٔ اُردو" اورنگ آباد (دکن) کا وہ خطبۂ صدارت جو اُنہوں نے انجمن حمایتِ اسلام"
ہور کے اکیاونویں سالانہ اجلاس میں بتاریخ ۱۲ اپریل ۱۹۳۶ء پڑھا۔

ے صاحبو!

ں نے لڑکپن میں انجمن حمایت اسلام کا بچپن دیکھا تھا اور اب بڑھاپے میں اُس کی جوانی کی بہار دیکھ رہا ہوں۔ میں جوں جوں گھٹتا
بڈھا ہوتا جاتا ہوں! یہ جوں جوں بڑھتی جاتی ہے جوان ہوتی جاتی ہے۔ اور اے اہلِ پنجاب! جب تک آپ کی ہمت جوان ہے
کبھی ڈھلنے نہ پائے گی۔ اس کی ابتدا کا خیال کیجے تو ایک نازک پودے سے زیادہ نہ تھی جس کی فنا کے لئے ہوا کا ایک جھونکا
آج یہ ہری بھری لہلہاتی کھیتی نظر آتی ہے۔ یہ آپ کے استقلال اور ایثار کی بے نظیر مثال ہے۔ یہ انجمن آپ کی سرزمین پر ابرِ رحمت
ئی ہوئی ہے۔ اس کے ادارے بڑھتے جاتے ہیں، اس کے کارخانے ترقی پر ہیں، اس کے مقاصد میں وسعت پیدا ہوتی جاتی
ں کا اثر اور اس کی وقعت مسلّم ہے۔ اس کی جواں ہمتی کا یہ تازہ ثبوت ہے کہ اس نے عین وقت پر اپنی زبان کی بقا اور فروغ کی
لی ہے جس پر میں آپ کو دل سے مبارک باد دیتا ہوں۔ لیکن یہ پہلی بار نہیں ہے جو پنجاب نے اُردو کی دستگیری کی۔ وہ ابتدا
حمایت کے لئے کمربستہ رہا ہے۔ اُردو کی اشاعت اور ترقی میں پنجاب برابر کا شریک ہے اور اب تو شریکِ غالب ہے۔ اور
ہے کہ پنجاب نے اسے اپنی زبان بنا لیا ہے بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ وہ اسے "اپنی زبان" سے بھی زیادہ عزیز سمجھتا اور عزیز رکھتا
لئے انجمن حمایتِ اسلام کا اس سال اپنے سالانہ جلسے میں اُردو کا اجلاس رکھنا سنّتِ قدیم کی پابندی اور موقع شناسی کی دلیل ہے۔

ضرات! زبان صرف اظہارِ خیال کا آلہ نہیں بلکہ ہماری زندگی کا جزو ہے۔ ہر شخص جو اسے بولتا یا کام میں لاتا ہے وہ اپنی بساط
اس میں اپنی زندگی کا کچھ نہ کچھ نشان ضرور چھوڑتا جاتا ہے۔ اس میں ہمارے تمدن و شائستگی، خیالات و جذبات، تجربات اور
کی تاریخ پنہاں ہے۔ ہر لفظ ایک زندہ شے ہے جو اپنے مُنہ سے اپنی حکایت بیان کر رہا ہے۔ ہمارے اسلاف نے کیسی کیسی
قت سے اسے پالا پوسا ہے اور اپنے خون سے سینچا ہے۔ یہ ایک مقدس میراث ہے جو نسلاً بعد نسلٍ ہم تک پہنچی ہے ہم ناخلف
اگر ہم نے اسے قائم نہ رکھا اور اس کی ترقی و فروغ میں پوری کوشش نہ کی۔

ں وقت اُردو زبان کی ترقی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ملک میں عام طور سے زبان کی اشاعت کے ذرائع اختیار کئے جائیں
مدارس اور کتب خانوں کا قیام، سرکاری اور غیر سرکاری مدارس میں اُردو کی شرکت، موجودہ نصابِ اُردو کی اصلاح، اُردو کی انجمنوں
اور ایسے اُردو اخباروں اور رسالوں کا اجرا، جو سلیس زبان میں زمانۂ حال کے حالات اور واقعات کو اس طرح سنجیدگی اور صفائی

سے پیش کریں کہ ہر پڑھا لکھا شخص سمجھ سکے اور مستفید ہو سکے۔ وہ اپنی رائے میں بے لاگ ہوں اور انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ ان جرائد کا تعلق زندگی کے ہر شعبے سے ہو لیکن مخصوص طور پر وہ اپنی زبان کے نگراں ہوں۔ یعنی وہ اپنی زبان کے متعلق ہر قسم کی خبریں مہیا کریں مختلف علاقوں میں زبان کی جو حالت ہے اُس سے آگاہ کریں اور اُن مقامات میں جن اصلاحوں اور کوششوں کی ضرورت ہے اُن پر بحث کریں۔ اُردو تالیفات کا جائزہ لیں، انصاف کے ساتھ تنقید و تبصرہ کر کے اُن کے حُسن و قبح کو ظاہر کریں۔ ان تمام تجویزوں سے بڑھ کر ایک ضرورت اس بات کی ہے کہ اُن مؤلفین و مترجمین کی قدر افزائی کی جائے جو اپنی زبان میں قابلِ قدر کام کر رہے ہیں۔

دوسری صُورت زبان کی ترقی کی یہ ہے کہ زبان کو مستحکم اور شائستہ بنایا جائے۔ استحکام سے میری مراد یہ ہے کہ مختلف قسم کی جامع لغات، مبسوط صرف و نحو، انسائیکلوپیڈیا کی تالیف اور ہر قسم کے علوم و فنون پر تالیفات مہیا کی جائیں۔ زبان کو شائستہ بنانے کے معنی یہ ہیں کہ زبان میں صفائی، شُستگی اور پُختگی پیدا ہو، وہ نازک سے نازک خیال ادا کرنے پر قادر ہو اور اس میں مختلف اسالیب بیان کے سانچے موجود ہوں۔ یہ اُسی وقت ممکن ہے جب کہ زبان میں اعلےٰ درجے کی تصانیف و تالیفات اور غیر زبانوں کی بہترین تصانیف کے ترجموں کا ذخیرہ فراہم ہو جو اہلِ قلم کی رہنمائی کر سکے۔

پہلی شق یعنی اشاعتِ زبان کے متعلق انجمن ترقیٔ اُردو نے ڈول ڈالا ہے۔ سب سے اوّل یہ تجویز کہ ہندوستان کے تمام علاقوں اور صوبوں میں اُردو زبان کا جائزہ لیا جائے۔ جس کا یہ مطلب ہے کہ جہاں تک ممکن ہو تحقیق طور سے یہ معلوم کیا جائے کہ اُن علاقوں میں اُردو سمجھنے بولنے والوں اور پڑھے لکھوں کی کیا تعداد ہے۔ کتنے سرکاری اور امدادی مدارس ہیں جن میں اُردو کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ تعلیم کس درجہ تک ہے اور طلبہ کی کیا تعداد ہے۔ اس کے درسی نصاب کی کیا حالت ہے۔ قدیم طرز مدارس کی تعداد جن میں اُردو پڑھائی جاتی یا ذریعۂ تعلیم ہے کتنے ہیں اور ان میں طلبہ کی تعداد کیا ہے۔ سرکاری اور نجی اُردو کتب خانوں کی تعداد۔ ایسی انجمنوں اور اداروں کی تعداد جو اُردو کی خدمت کرتے ہیں۔ اُردو مطابع اور جرائد کی تعداد اور حالت۔ سرکاری محکموں اور عدالتوں میں اُردو کی حیثیت۔ ان شمار و اعداد کے علاوہ یہ بھی دریافت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہاں اُردو زبان ترقی پر ہے یا انحطاط پر اور اس کے کیا اسباب ہیں لوگوں کو اُردو سیکھنے اور پڑھنے کا شوق ہے یا نہیں۔ وہاں کی زبان کی مقامی خصوصیات، اُردو کا اثر قرب و جوار کی زبانوں پر، وہاں کی قدیم تصانیف اور مصنّفین اور شعراء کے نام وغیرہ وغیرہ۔ نیز اس بات کے کھوج لگانے کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ ہر علاقے میں اس کے حالات کی رُو سے اُردو کی اشاعت و ترقی کے لئے کیا تدابیر عمل میں لائی جائیں۔ یہ تجویز جب میں نے شروع میں ایک منتخب کمیٹی کے سامنے پیش کی تھی تو اس کی مشکلات دیکھ کر ارکانِ مجلس کو اس کی کامیابی کے متعلق بہت کچھ شبہ تھا اور بعض دوستوں نے مجھے لکھا تھا کہ تم کس خبط میں گرفتار ہو، یہ بیل منڈھے چڑھنے والی نہیں ہے لیکن میں کسی قدر خوشی سے یہ اطلاع دیتا ہوں کہ بعض صوبوں اور علاقوں سے مکمل رپورٹیں وصول ہو گئی ہیں اور بعض میں کام جاری ہے۔ ہر علاقے سے رپورٹیں وصول ہونے پر ایک مکمل رپورٹ شائع کی جائے گی

ِ تمام ہندوستان میں اُردو زبان کی موجودہ حالت کا آئینہ ہوگا۔ یہ ایک نہایت ضروری اور بنیادی کام ہوگا۔ اس پر ہم اپنی عمارت کھڑی
ین گے۔ تمام حالات معلوم ہونے پر ہم ہر صوبے اور علاقے میں اُردو کی اشاعت و ترقی کا کام شروع کریں گے اور مجھے یقین ہے
پ کا صُوبہ اس معاملے میں سب سے پیش پیش ہوگا۔

دوسری شق زبان کے مستحکم اور شائستہ بنانے کی ہے۔ انجمن ترقیٔ اُردو اس کی طرف سے بھی غافل نہیں رہی۔ چنانچہ اس نے
نایاب تذکرے اور قدیم اُردو کی کتابیں جن پر اُردو ادب کی تاریخ کا بہت کچھ انحصار ہے ڈھونڈ کر طبع کرائیں اور ان کی وجہ سے
ی سی غلط فہمیاں جو اب تک ہمارے ادب کی تاریخوں میں چلی آ رہی تھیں رفع ہوگئیں اور اس وقت سے اُردو ادب کی تاریخ کا
ب ہی بدل گیا۔

اس کے علاوہ مختلف قسم کی لغات زیرِ ترتیب و زیرِ طبع ہیں۔ مثلاً انگریزی اُردو کی جامع لغات جو زیرِ طبع ہے اور چند ماہ میں چھپ
ائع ہوجائے گی، اصطلاحاتِ پیشہ وراں جو تقریباً مکمل اور زیرِ نظرِ ثانی ہے، اس کا پہلا حصّہ عنقریب مطبع میں پہنچ جائے گا۔ قدیم
و کی لُغات وغیرہ، اُردو زبان کی مبسُوط جامع لغات جو نظام گورنمنٹ کی سرپرستی میں مرتّب ہو رہی ہے وہ بھی انجمن ہی کی تحریک کا
ہے۔ ایک دوسری تجویز جو اس وقت انجمن کے زیرِ غور ہے وہ یہ ہے کہ دُنیا کی اعلےٰ زبانوں کی جس قدر بہترین تصانیف ہیں ان کا اُردوُ
ترجمہ کر دیا جائے۔ اس کی فہرست تیار ہو چکی ہے اور اب اسے عمل میں لانے کی تدبیر کی جا رہی ہے۔ یہ کام اگر سرانجام پا گیا
ظیم الشان کامیابی ہوگی۔

اس مختصر ذکر سے میرا مقصد اس بات کا جتانا ہے کہ ادبی اداروں کو وہ اہم کام کرنے چاہئیں جو افراد کے بس کے نہیں۔ اگر
ی ادارے بغیر کسی اُصُول کو مدِّ نظر رکھے ایسے ہی کام کرتے رہے جو قابل تعلیم یافتہ لوگ فرداً فرداً کر سکتے ہیں تو ایسے ادارے کچھ زیادہ
ید نہیں ہو سکتے، بلکہ بعض حالات میں مضر ہوں گے کیونکہ اس میں محنت، وقت، روپیہ زیادہ صرف ہوتا ہے اور کام اس کے مقابلے
ر ویسا نہیں ہوتا جس کی توقع کی جاتی ہے۔ ایک مدت کے تجربہ کے بعد اور کچھ کھو کر یہ اتنی سی بات معلوم ہوئی ہے لیکن اسے حقیر
ال نہ کیجئے یہ بہت بڑی بات ہے اور اس لئے میں نے اپنا فرض سمجھا کہ صاف صاف اس کا اظہار کر دوں۔ اس کے متعلق ایک
سری بات یہ ہے کہ اگر ہمیں اپنی زبان کی حفاظت اور ترقی منظور ہے تو ادبی اداروں کو متحد ہو کر کام کرنا چاہئے۔ اتحادِ عمل میں
ی برکت اور قوت ہوتی ہے۔ جو کام فرداً فرداً مشکل اور محال معلوم ہوتا ہے وہ باہمی مشورے اور اتحاد سے آسان ہو جاتا ہے ہمیں
ر پہلے سے اپنے "اعمالنامے" تیار کر لینے چاہئیں کہ کیا کیا کرنا ہے، کیونکر کرنا ہے اور کتنی مدت میں کرنا ہے۔ یہ موقع اس کی تفصیل
نہیں۔ اسے میں نے دوسرے وقت کے لئے اُٹھا رکھا ہے۔

حضرات! اُردو زبان میں ایسے ادیب، شاعر اور انشا پرداز گزر چکے ہیں اور بعض اب بھی ہیں جن پر ہم بجا طور سے فخر کر سکتے ہیں لیکن

جب ہم دوسری مہذب اور ادبی زبانوں سے مقابلہ کرتے ہیں تو اپنی زبان کی کم مائیگی پر افسوس ہوتا ہے۔ اس کمی کی تلافی ہمارا فرض ہے اس میں شک نہیں کہ کام کرنے والے کام کر رہے ہیں۔ ادبی اور علمی ادارے اپنی بساط کے موافق ہمارے ادب و علم کے ذخیرے میں اضافہ کر رہے ہیں۔ اخبار اور رسالے بھی پہلے سے بہت بڑی تعداد میں شائع ہوتے ہیں۔ شعر و شاعری کا بھی خوب چرچا ہے بلکہ بعض اوقات وبال جان ہوجاتا ہے۔ لیکن ایک بات جو مجھے کھٹکتی ہے اُسے کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سرسید احمد خاں کے زمانے میں اگر جدید ادب کے بانی نہیں تو فروغ دینے والے ضرور تھے۔ ہمارا ادب عروج پر تھا۔ اُس وقت ایسے ایسے ادیب پیدا ہوئے جن کا نام ہمارے ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ وہ زندگی کے صحیح معنی سمجھے تھے اور دوسروں کو سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ ہم بے خبری اور غفلت کے عالم میں تھے اُنہوں نے ہمیں جھنجھوڑا، چونکایا، خبردار کیا اور رستہ پر لگایا۔ وہ ادبی مجاہد تھے۔ وہ سربکف میدان عمل میں اُترے اور زندگی کی مشکلات سے مردانہ وار ٹکراتے اور مقابلہ کرتے رہے اور اکثر پر غالب آئے۔ انہوں نے اپنے زور بیان اور قوتِ تحریر سے ہل چل مچادی اور سب کو ایک مرکز پر لے آئے۔ ان میں خلوص، بے غرضی، درد اور ایثار تھا۔ انہوں نے اپنے درد سے دوسروں میں سوز، اپنے خلوص اور بے غرضی سے دلوں میں جلا اور اپنے ایثار سے حبِ قوم پیدا کی۔ اور ایک جماعت ایسی کھڑی کردی جو اپنی قوم کے لئے کام کرنا شرافت و انسانیت ہی نہیں بلکہ باعثِ نجات سمجھتی تھی۔ کیا اب بھی ہمارے ادب کی یہی حالت ہے؟ یہ دیکھ کر کس قدر افسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ادیب اور شاعر اُس راستے سے ہٹتے جاتے ہیں۔ وہ زندگی کی کشمکش سے جھینپتے اور مشکلات سے کنیاتے ہیں۔ اس لئے وہ عالم خیال کی سیر کرتے رہتے ہیں اور دلفریب خوابوں سے اپنا جی بہلاتے ہیں۔ ہمیں جہاد کی ضرورت ہے اور وہ سیر و تفریح کے سامان فراہم کر رہے ہیں۔ شعر و ادب صرف "حفظِ نفس" کے لئے ہی نہیں ہے اس سے اور بھی بڑے بڑے کام نکل سکتے ہیں تاکہ یہ حفظِ نفس کے ساتھ قوتِ روح بھی ہو جائے۔ ہمیں شعر و ادب کی اُن تعریفات سے فی الحال قطع نظر کرلینا چاہیئے جو فارغ البال اور عیش پرست قوموں نے کی ہیں۔ اس زمانے میں جب کہ ہم طرح طرح کی کشاکشوں میں گرفتار ہیں۔ اِن سے آلاتِ حرب کا کام لینا چاہیے۔ آلاتِ حرب سے خدانخواستہ میری یہ مراد نہیں کہ ہم ملک میں فتنہ و فساد پیدا کریں، نہیں بلکہ ان سے زندگی کی جنگ میں کام لینا چاہیے۔ اِن کے ذریعہ سے دلوں کے اُبھارنے، زندگی کے سنوارنے، شکوک کے مٹانے اور توہمات کی بیخ کنی میں مدد لیجئے۔ سید احمد خانی درد اور ایثار دکھائیے کہ بغیر اس کے کسی خیال میں گرمی اور اثر پیدا نہیں ہوسکتا جس دل میں آگ نہیں وہ دوسروں میں چنگاریاں کیونکر پیدا کرسکتا ہے۔ جس دل میں لگن نہیں وہ دوسروں کو کیسے اُبھار سکتا ہے۔ یہ لگن کہاں سے اور کیونکر آئے؛ یہ اُس وقت پیدا ہوگی جب آپ میدان میں آئیں گے، لوگوں کی بھیڑ میں گھُسیں گے، کھوے سے کھوا چھلے گا، ہر طرف سے ٹکریں لگیں گی، مشکلات کا سامنا ہوگا۔ اُس وقت آنکھیں کھُلیں گی، زندگی اصلی روپ میں نظر آئے گی۔ اُس وقت آپ کے دل پر چوٹ لگے گی اور درد اور خلوص پیدا ہوگا۔ اُس وقت آپ کی صریرِ قلم ہولناک توپوں کی آواز سے زیادہ کارگر اور آپ کی زبان کا ایک ایک لفظ شمشیر کے گھاؤ سے زیادہ کاری ہوگا۔

یہ سچ ہے کہ یہ زمانہ بہت نازک ہے۔ بیکاری روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ معاشیاتی پیچیدگیوں نے ملک کو خستہ کر رکھا ہے جس سے ادیب
اردوتوں جوکڑی بھول گئے ہیں۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ زمانہ امتحان کا ہے یہیں ادیب اور شاعر کے جوہر کھلتے ہیں اور یہی وقت
پنے خداداد جوہر سے کام لینے کا ہے۔ جو ادیب اور صناع الگ تھلگ رہنا چاہتا ہے اور کارزارِ زندگی میں شریک نہیں ہونا چاہتا
ں کے ساتھ اپنے فطری جوہر کو کام میں نہیں لانا چاہتا وہ مجرم ہے۔ اور اُس کی سزا وہی ہے جو ایک غدّار کی ہوتی ہے۔ زبان بنی
نسان کی عملی اور روحانی زندگی کے لئے نہایت درجہ ضروری ہے اس لئے زبان و ادب کی ترقی (جہاں تک ممکن ہو سکے) اُسے قوم
یات اور حالات کے مطابق بنانے میں ہے۔ یہ نکتہ ہمارے ادیبوں کو کبھی نہیں بھولنا چاہیئے۔
حضرات! زبان بلاشبہ ایک معاشرتی چیز ہے، انسان کی معاشرتی ضرورت اس کی تخلیق کا باعث ہوئی اور وہ اس کی زندگی کا
زو ہے جو اس سے کبھی جُدا نہیں ہو سکتا۔ وہ انسان سے الگ کوئی شئے نہیں ہے۔ وہ اُن لوگوں سے وابستہ ہے جو اسے
ور اس میں فکر کرتے ہیں۔ اس کی جڑیں ہمارے دل و دماغ اور جسم میں پھیلی ہوئی ہیں اور وہیں سے اس کی نشو و نما ہوتی ہے زبان
و انحطاط معاشرتی حالات کے تابع ہے یہی وجہ ہے کہ علمائے لسانیات تمدن و معاشرت کی تاریخ کو زبان کی تاریخ میں تلاش کرتے۔
اے وقتی سیاسیات کا رنگ دینا سوتے ہوئے فتنے کو جگانا ہے۔ کیا سیاسی کانگرسوں اور سبھاؤں کے لئے یہ مناسب نہ ہوگا کہ وہ اس
لک تہذیبی اور ذوقی معاملات پر ہاتھ نہ ڈالیں جب تک وہ قومیت کی کوئی صُورت قائم نہ کرلیں؛ اس سے زیادہ قابلِ الزام وہ سیاسی
ت ہیں جو زبان کے پردے میں جس کی تہ میں سیاست ہے اس مسئلہ کو چھیڑ کر طرح طرح سے پراپگنڈا کر رہے ہیں۔ انڈین نیشنل کانگرس
قرارداد منظور کی تھی کہ ہندوستان کی زبان ہندستانی ہوگی خواہ وہ ناگری حروف میں ہو یا فارسی حروف میں۔ یہ فیصلہ معقول تھا اور اُس
ریتی پر مبنی تھا جو اس قسم کی کانگرسیں ایسے موقعوں پر عمل میں لاتی ہیں۔ لیکن اُن صاحبوں کے اطمینان کے لئے کافی نہ تھا جن کا منشا
رتھا۔ انہوں نے اس رزولیوشن کو طفل تسلّی سے زیادہ وقعت نہ دی اور دوسری اُدھیڑ بُن میں لگ گئے۔ ان کی کوششوں کا نتیجہ اپریل ۱۹۳۵ء
لور میں آیا۔ یعنی ہندی سمیلن کا سالانہ جلسہ اندور میں منعقد ہُوا جس کی صدارت مہاتما گاندھی نے فرمائی۔ اس جلسے میں بالاتفاق یہ قرارداد
ر ہوئی "ہندوستان کے اُن ادیبوں میں جو اپنے اپنے صوبوں کی زبان میں کام کر رہے ہیں، ارتباط پیدا کرنے کی غرض سے نیز ہندی زبان
رتقا میں اُن کا اتحادِ عمل حاصل کرنے کی غرض سے یہ کانفرنس اصحابِ ذیل کی ایک کمیٹی قائم کرتی ہے . . . . . ."
چنانچہ اس کمیٹی نے فوراً کام شروع کر دیا اور ماہانہ ہندی رسالہ "ہنس" جو ہندی اُردو کے مشہور ادیب منشی پریم چند کئی سال سے نکال رہے
اس ادارے کے تحت میں آگیا۔ یہ ادارہ "بھارت ساہتیا پرشد" کے نام سے مشہور ہے (یعنی انجمن ادب ہند)۔ اور ہنس اب اس کا رسالہ
منشی پریم چند کے ساتھ گجراتی زبان کے مؤرخ اور ادیب مسٹر کنہیا لال منشی بھی اس کی اڈیٹری میں شریک ہو گئے۔ مہاتما گاندھی اس تحریک
دنی باپ اور مسٹر کنہیا لال اس کے روح رواں ہیں۔ چنانچہ ہنس کے فاضل اڈیٹر اکتوبر کے رسالے میں فرماتے ہیں "یہ میں اپنی زبان میں میلن

کرتا ہوں اگر اصل زبان سناؤں تو آپ کے سمجھانے کے لئے مترجم کی ضرورت ہوگی)۔

"اب ہندی ملکی زبان کی صورت اختیار کر کے خاص و عام کی زبان ہو چکی ہے۔ مہاتما گاندھی جیسے ملک کے سدھارنے والے اسے زندہ ملکی زبان بنانے کا عہد کر چکے ہیں"۔

خود مہاتما جی کا خط ملاحظہ فرمائیے جو انہوں نے ہنس کے متعلق تحریر فرمایا ہے :۔

"ہنس ہندوستان بھر میں الوکھا پریتن ہے۔ یدی ہندی اتھوا ہندستانی کو راشٹر بھاشا بنانا ہے تو ایسے ماسک کی آوشکتا ہے۔ پرنتیک پرانت کی بھاشا میں جو لکھا جاتا ہے اس کا پریچے راشٹر بھاشا دوارا سب کو ملنا چاہئے۔ بہت خوشی کی بات ہے کہ اب ایسا پریچے دل چاہے اُن کو ہنس دوارا پرت ماس آدھے روپے میں ملا کرے گا"۔

اس ہوشیاری کو آپ نے دیکھا۔ اب تک ملک کی زبان "ہندوستانی" تھی اور سب سے بڑی اور سب سے زیادہ منظم اور باوقعت کانگریس نے اُسے علی الاعلان تسلیم کر لیا تھا، لیکن اب ہندی یا ہندستانی ہو گئی۔ یا ہندستانی کے الفاظ خاص ہیئت کو ظاہر کر رہے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ لفظ حذف ہو جائیں گے بلکہ یہ سمجھئے کہ ہو گئے جیسا کہ ہنس کے اڈیٹروں کی تحریر سے صاف ظاہر ہے۔ اب اس تحریر کا جسے مہاتما جی ہندستانی کہتے ہیں مہاتما جی کے اس خط سے مقابلہ کیجئے جو انہوں نے حکیم اجمل خاں کو اُردو زبان اور اُردو رسم خط میں لکھا تھا اور جس کا عکس بعض رسالوں میں شائع ہو چکا ہے۔ ان دونوں میں سے ہم کس زبان کو ہندستانی کہیں۔ زبان کو سیاسیات کے خارزار میں گھسیٹنے اور سیاست والوں کے ہاتھوں میں کھلونا بنانے کا یہ نتیجہ ہے کہ دو طبقوں میں بجائے اتفاق کے نفاق اور بڑھتا جاتا ہے۔

اب مہاتما جی جس زبان کو ہندی یا ہندستانی کہتے ہیں اس کا ایک نمونہ تو آپ نے خود ان کے خط میں دیکھ لیا، دوسرا نمونہ ہنس کے فاضل اڈیٹر منشی پریم چند کی تحریر سے پیش کیا جاتا ہے :۔

"آپ نے بہت ٹھیک کہا کہ کوتا کیوں منورنجن کی وستو نہیں اور نہ گاگا کر سنانے کی چیز ہے۔ وہ تو ہمارے ہردے میں پریرنا کو ڈالنے والی، ہمارے اُوساد گرست من میں آنندے اِسپھورتی کا سنچار کرنے والی، ہم میں کومل بھاؤ ناؤں کو جگانے والی (استرین بھاؤ ناؤں کی نہیں) وستو ہے"۔

اسے مہاتما گاندھی ہی ہندستانی کہہ سکتے ہیں ورنہ کسی اور زبان داں کو یہ جرأت نہیں ہو سکتی۔ یہ میں نے آسان سا جملہ آپ کو سنایا ہے اگر میں اس رسالے کے کسی مضمون کا کوئی حصہ سناتا تو آپ کانوں میں اُنگلیاں دے لیتے اور کہہ اُٹھتے :۔

گر تو ہندی بدیں نمط خوانی ۔۔۔۔ ببری رونق زباں دانی

اور یہ بھی یاد رہے کہ جو جملے میں نے ابھی آپ کو سنائے ہیں یہ ایسے شخص کی تحریر ہے جو اُردو کا بھی ایسا ہی اچھا ادیب ہے جیسے ہندی کا اور جو ان لوگوں میں سے ہے جو ہندوستانی زبان کے فروغ کے حامی ہیں۔ مجھے اس کی زبان پر مطلق اعتراض نہیں یہ بہت صحیح اور فصیح ہندی ہے لیکن اسے

دستانی کہنا لوگوں کی آنکھوں میں خاک جھونکنا ہے۔ ممکن ہے کہ مہاتما گاندھی جو توجیہ و تاویل کے فن کے استاد کامل ہیں لفظ الفوا، یا کے کچھ اور معنی
رلیں ورنہ بحالتِ موجودہ "ہندی یا ہندوستانی" کا کوئی دوسرا مفہوم نہیں ہو سکتا۔ زبان کا آسان یا مشکل ہونا ایک دوسری بات ہے۔ ہر ایک کا ایک
پ بیان یا طرزِ تحریر ہوتا ہے اور خاصکر ادبی اور سائنٹیفک مضامین میں لامحالہ زبان مشکل ہو جاتی ہے لیکن جو تحریر جس زبان میں ہے اُسے اُسی
ن سے منسوب کرنا مناسب ہے۔ لفظوں کے داؤ پیچ سے غلط فہمیاں پیدا کرنا درست نہیں۔ میں یہ بھی عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جہاں تک
علم ہے ہنس کے قابل اڈیٹروں نے اپنے رسالے کی زبان کو کبھی ہندوستانی نہیں کہا۔ یہ مہاتما گاندھی ہیں جو ہنس کی زبان کو ہندستانی کہتے
ں اور ایسی بڑی جسارت ایسا ہی بڑا آدمی کرسکتا ہے۔ اگرچہ ہمیں ہنس کے اڈیٹروں کے اس قول کے تسلیم کرنے میں بہت تامل ہے کہ اب ہندی
ن تمام ہندوستان کی عام زبان ہوگئی ہے۔

اس رنگ کو (یعنی سیاسی رنگ کو) اور گہرا کرنے کے لئے اکثر اوقات اور عموماً مذہب کی پُٹ دی جاتی ہے جس زمانے میں شدھی اور
ٹھن کا زور تھا، اس بدعت نے بھی زور پکڑا۔ اگرچہ شدھی اور سنگھٹن کا مقصد ہندوؤں کی تنظیم اور تقویت اور ہندو مذہب کی تبلیغ تھا،
ین زبان بھی اس کی لپیٹ میں آگئی۔ اگر آپ شدھی اور سنگھٹن کے قبل کے ہندی ادب کا مقابلہ بعد کے ہندی ادب سے کریں گے تو معلوم
گا کہ ہندی کی اصل اشاعت و ترقی اِسی وقت سے شروع ہوئی ہے۔ جب کوئی وار کارگر نہیں ہوتا تو مذہب اور سیاسیات کی آڑ لی جاتی ہے۔
وں کو اکسانے اور اُن میں جوش پیدا کرنے کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی چلتا ہوا عمل نہیں ہے۔ زبان کو جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں انسانی
درت نے پیدا کیا اور زبان اور اس کے ادب کا ارتقا زمانے کی ضروریات اور حالات و افکار کے تابع رہا اور آئندہ بھی رہے گا۔ مذہب
ے نام سے یا سیاسیات کے پردے میں اس کی اشاعت کا پروپاگنڈا کرنا خصوصاً ایسے زمانے میں جب کہ نفاق کی آگ ملک میں بھڑک
ہی ہے دانشمندانہ فعل نہیں ہے۔ اس قسم کی تحریکوں سے نہ صرف اُردو دان طبقے کو صدمہ پہنچا بلکہ نیشنل کانگریس کی اس قرارداد کی بھی بے وقعتی ہوئی
ن کی رو سے "ہندوستانی" ملک کی عام زبان قرار پائی تھی اور ہندوستانی قومیت اور ہندوستانی زبان و ادب کے بنانے کے لئے دلیرانہ اور
انشمندانہ پیش قدمی کی گئی تھی۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ ہندوستانی کے معنی ہندی ہیں اور اس کی تائید میں مہاتما گاندھی کا بیان سب سے
ڑی شہادت ہے۔

ابھی حال میں آپ کے پڑوس کے صوبے میں اسی قسم کا ہنگامہ برپا ہوا تھا۔ اس میں بھی سیاسی رنگ کی جھلک پائی جاتی ہے۔ اگرچہ
وبہ سرحد کی مقامی زبان جسے وہاں کا تقریباً ہر باشندہ بولتا اور سمجھتا ہے پشتو ہے یا پنجابی۔ اب جو انہوں نے اپنی مقامی زبان ترک
رکے اُردو کو اپنے نصابِ تعلیم میں داخل کیا ہے تو ان کا یہ فعل قابلِ تعریف ہے نہ لائقِ مذمت۔ اُنہوں نے بڑی اخلاقی جرأت سے کام
یا ہے اور محض ہندوستانی قومیت اور ہندوستانی قومی زبان کی خاطر اتنی بڑی قربانی کی ہے۔ جو لوگ ہندوستانی قومیت کے خواب دیکھ
ہے ہیں انہیں خوش ہونا چاہیئے کہ صوبۂ سرحد نے اس طرف سب سے پہلے قدم بڑھایا ہے۔ اس معاملے کے متعلق میں کچھ زیادہ کہنا

نہیں چاہتا کیونکہ آپ مجھ سے بہتر ان باتوں کو جانتے اور سمجھتے ہیں۔

ایک اور تازہ واقعہ سُنئے کہ بعض مسلمانوں نے دہلی کے نشرگاہ (یعنی براڈکاسٹنگ سٹیشن) کی زبان کے متعلق ایک شاخسانہ نکالا ہے سننے والوں نے نہیں بلکہ اسمبلی کے بعض ممبروں نے ۔ وہی سیاسی رنگ! ۔ سنا جاتا ہے کہ اس زبان پر جسے کبھی ہندوستان کی عام زبان ب کا ارادہ تھا، نزلہ گرنے والا ہے اور اس کے پروگرام میں اس قسم کی تبدیلی ہونے والی ہے کہ اُردو یا ہندوستانی برائے نام ہے اور اس ک جگہ مہاتما گاندھی کی ہندی (یا ہندوستانی) کو دے دی جائے۔ اور اس میں انہیں کامیابی ہوجائے گی کیونکہ آج کل اخباروں کی چیخ پکا اور ارکانِ اسمبلی کے سوالات بڑی وقعت رکھتے ہیں۔ اُردو داں طبقہ کو اپنے اخباروں کی خبر لینی چاہئیے اور انہیں زیادہ بہتر اور باوقعت بنانے کی کوشش کرنی چاہئیے۔ اس زمانے میں یہ بہت بڑی قوت ہے۔

ہر شخص کو اور ہر قوم کو یہ حق ہے کہ وہ اپنی زبان کی اشاعت و ترقی کے لئے ہر جائز ذریعہ کو استعمال کرے اور جہاں تک اس ک قدرت میں ہو اس کی بہتری کے لئے کوشش کرے لیکن کسی فرد یا جماعت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی زبان کی محبت یا جنو میں دوسری زبانوں کی تخریب کے درپے ہو اور وفد لے لے کر والیانِ ریاست کی خدمت میں حاضر ہو اور اصرار کرے کہ وہ اپنے علاقوں س اُردو زبان کو خارج کر کے ہندی داخل کرلیں۔ اُردو داں طبقہ کبھی اس کا مرتکب نہیں ہوا۔ ہم کسی زبان کے مخالف نہیں، البتہ اپنی زبان ک ترقی کے خواہاں ہیں اور اس معاملے میں کامل رواداری اور آزادی کے قائل ہیں۔

اسی ضمن میں رسمِ خط کا مسئلہ بھی آجاتا ہے۔ آج کل اس پر بڑی پُرزور بحثیں ہورہی ہیں جن میں سے بعض دلچسپ اور کارآمد بھی لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کی تان اردو رسمِ خط ہی پر کیوں توڑی جاتی ہے۔ یہ مسئلہ ہندوستان کے تمام رسومِ خط سے متعلق ہے جہا متعدد اور مختلف تحریر کے طریقے رائج ہیں خصوصاً جنوبی ہند میں جس کا تعلق نہ اُردو رسمِ خط سے ہے نہ دیوناگری سے۔ ہندوستان کی تمام زبانو کے لئے کسی ایک رسمِ خط کا ہونا ممکن تو ہے لیکن اس کا عمل میں آنا بہت دشوار ہے۔ مثالاً میں آپ کو ایک پُرلطف لطیفہ سناتا ہوں ہری گوول ٹائپ حروف اور اس کی طباعت کے بڑے ماہر ہیں۔ انہوں نے حال میں بنگالی اور ہندی کا نیو ٹائپ تیار کیا ہے جو بہت قابلِ قدر ایجاد ہے۔ انہوں نے رسالہ وشال بھارت کلکتہ میں دیوناگری رسمِ خط کی تائید میں ایک مفصل مقالہ لکھا ہے جس ک ضمن میں انہوں نے یہ بحث کی ہے کہ مسلمان جو یہ کہتے ہیں کہ دیوناگری رسمِ خط اختیار کرنے سے ان کے کلچر کو صدمہ پہنچے گا، یہ بالکل غلط خیال ہے۔ رسمِ خط کو کلچر سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بحث کرتے کرتے وہ رومن رسمِ خط پر آتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ رومن رسمِ خط اختیار کرنے سے ہندو تہذیب اور کلچر کو سخت نقصان پہنچے گا۔ کیا عجیب بات اور کیسی عجیب منطق ہے۔ میں قابل مقالہ نویس کو "حافظہ نباشد" کا الزام نہیں دیتا لیکن اتنا ضرور عرض کرتا ہوں کہ دلوں کی تہوں میں جو بات چھپی ہوئی تھی اس کا راز کس سادہ لوحی سے طشت از بام ہوگیا جب تک اس خیال اور دماغ کے لوگ ہم میں موجود ہیں (خواہ وہ کسی طبقے یا فرقے کے ہوں) اس وقت تک ملک کی ساری زبانوں کے لئے کسی ایک

رسمِ خط کا ہونا محال ہے۔

رہا اُردو رسمِ خط تو یہ آج کا نہیں ہے جب سے یہ زبان پیدا ہوئی یہ اس کے ساتھ ہے اور یہ زبان جیسا کہ معلوم ہے اور ظاہر ہے ٹھیٹ مُلکی زبان ہے۔ ہندو مسلمانوں کی مشترکہ مِلک ہے، دونوں کو اُن کے بزرگوں سے میراث میں ملی ہے اور یہ رسمِ خط بھی اُسی کے ساتھ آیا ہے جسے دونوں یکساں طور پر استعمال کرتے رہے اور کرتے ہیں۔ اس میں ایک کو دوسرے سے شکایت کا موقع ہی نہیں۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ ایک وقت ایسا آئے کہ جب ہندوستان کی سب زبانوں کا رسمِ خط ایک ہو جائے لیکن اس وقت کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کب آئے گا اور اس کی کیا صورت ہوگی البتہ یہ میں مانتا ہوں کہ فی الحال اصلاحِ رسمِ خط کا مسئلہ قابلِ غور اور نہایت ضروری ہے۔

دنیا کا کوئی رسمِ خط کامل نہیں اور ہم بھی یہ دعوےٰ نہیں کر سکتے کہ ہمارا رسمِ خط بے عیب ہے۔ ہر زندہ زبان اور زندہ شے میں تغیّر و تبدّل اور اصلاح کا ہونا لازم ہے البتہ مُردے میں کسی تغیّر و تبدّل کی گنجائش نہیں ہوتی کیونکہ نمو کا اس میں امکان ہی نہیں۔ اگر ہم اپنے رسمِ خط کا سُراغ لگاتے لگاتے اُس ابتدائی صُورت تک پہنچیں جہاں سے اس نے آگے بڑھنا شروع کیا اور پھر اس طرف سے چلیں اور ہر قرن اور ہر عہد کے رسمِ خط کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ رفتہ رفتہ ہر عہد میں تغیّر ہوتا گیا ہے اور جب ہم موجودہ رسمِ خط تک پہنچیں گے اور اس کا مقابلہ ابتدائی صورت سے کریں گے تو زمین آسمان کا فرق معلوم ہوگا۔ آپ دُور کیوں جائیں۔ خود اُردو رسمِ خط کو دیکھئے۔ کیا یہ ابتدا سے اب تک اسی ایک حالت میں ہے۔ پُرانی تحریریں دیکھیئے، سَو ڈیڑھ سَو برس بلکہ تیس چالیس برس پہلے کی چھپی ہوئی کتابیں ملاحظہ فرمایئے۔ کیا اس وقت سے اب تک کسی قسم کا کوئی فرق نہیں ہُوا؟ یہ فرق کیوں ہُوا اور کِس نے پیدا کیا؟ زمانے کے حالات اور خود ہماری ضرورتوں نے۔ ہمیں اصلاح سے کبھی مُنہ موڑنا نہیں چاہیئے اور اس کے لئے ہر وقت تیار رہنا چاہیئے۔ چنانچہ ہندی والوں نے بھی جنہیں اپنے رسمِ خط کے کامل ہونے کا دعوےٰ تھا اس بات کو محسوس کیا اور ہندی سمیلن نے ایک خاص کمیٹی اس غرض سے مقرر کی ہے کہ وہ غور و فکر کے بعد مناسب اصلاحیں تجویز کر کے پیش کرے۔ اسی طرح ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کی تحریک پر کلکتہ یونیورسٹی نے ایک کمیٹی کا اسی مقصد سے تقرر کیا ہے کہ وہ بنگالی رسمِ خط پر غور کر کے ضروری اصلاحیں تجویز کرے۔ میں اس وقت اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث کرنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ قریب زمانے میں انجمن ترقی اُردو منتخب اصحاب کی ایک کانفرنس کرنے والی ہے جس میں اُردو زبان کی اصلاح اور ترقی و اشاعت کے متعلق متعدد تجاویز پیش کی جائیں گی۔ اسی میں یہ مسئلہ بھی زیرِ بحث آئے گا۔ بعض صاحبوں نے اس مسئلے پر بہت غور و خوض کیا ہے اور کافی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ انجمن حمایت اسلام بھی اپنے نمائندے بھیج کر اس کانفرنس میں شریک ہوگی۔ بہرحال ہمیں یہ کبھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ اگر ہمیں اپنی زبان کی اشاعت منظور ہے تو ہمیں ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ کوئی زبان ایک ہی حالت میں ایک جگہ کھڑی نہیں رہ سکتی۔ اُسے زمانے کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیئے۔ ورنہ اُس کی قسمت میں فنا ہونا لکھا ہے۔

اس وقت زبان کی اشاعت کے تین عام ذریعے ہو سکتے ہیں۔ ایک اخبارات کا جن کا پیام گھر گھر پہنچتا ہے۔ جن کے خیالات

ہے کہ ان کے الفاظ اور جملے چند ہی روز میں زبان زدِ خاص و عام ہو جاتے ہیں۔ دوسرا ذریعہ عام ابتدائی تعلیم ہے۔ یہ اُن تعلیمی کانفرنسوں کا کام ہے جو ہر صوبے میں قائم ہیں۔ بجائے فضول قصیدہ خوانی اور ٹھنک ٹھنک کر اشعار پڑھنے اور لہک لہک کر وعظ کہنے کے ان کانفرنسوں کا خاص کام یہ ہونا چاہئے کہ وہ قصبے قصبے اور گاؤں گاؤں میں ابتدائی مدارس کے سلسلے قائم کر دیں۔ انہیں چھوٹے چھوٹے مدارس میں ہماری قومی زبان کی نشوونما اور قومی بہبودی کی بنیاد پڑے گی۔ جب تک تعلیم عام نہ ہوگی اس وقت تک نہ آپ کے اخبار کام آئیں گے اور نہ آپ کی کتابیں زیادہ مقبول ہوں گی۔ تیسرا ذریعہ سینما ہے۔ لہو و لعب سمجھ کر اس سے بے التفاتی کرنا درست نہ ہوگا۔ ہمارے اخبار اور کتابیں وہیں کام آ سکتی ہیں جہاں پہلے سے تعلیم موجود ہے لیکن فلم وہاں بھی کارآمد ہو سکتا ہے جہاں تعلیم مفقود ہے۔ اوّل اوّل سینما کو رونق دینے والی ہماری ہی زبان تھی لیکن بعد میں بعض وجوہ کی بنا پر جن سے میں بحث نہیں کرنا چاہتا اور جس میں ہمارا بھی قصور ہے، اس کا رُخ دوسری طرف پھر گیا۔ اب بھی وقت ہے کہ ہم اس کی طرف توجہ کریں۔ ہمارا فرض ہے کہ زمانے کے حالات کو دیکھ کر ہر ایسے ذریعے سے کام لیں جو ہماری زبان کی اشاعت کے لئے مفید ہو۔

حضرات! یہ وقت ہماری زبان پر بہت نازک ہے۔ کچھ مشکلات اندرونی ہیں اور کچھ بیرونی۔ اس سے ہماری ذمہ داری بہت کٹھن ہو جاتی ہے۔ اس ذمہ داری کا حق ادا کرنے کے لئے ہمیں ہر قسم کی جوکھم جھیلنے اور ضرورت کے وقت ہر قسم کی قربانی کرنے کے لئے آمادہ رہنا چاہیے۔ اور کچھ نہیں تو ہر پڑھے لکھے کو یہ عہد کر لینا چاہئے کہ وہ ہر سال اور یہ نہ ہو سکے تو پانچ سال یا دس سال میں یا یہ بھی ممکن نہ ہو تو عمر بھر میں کم سے کم ایک شخص کو اُردو لکھنا پڑھنا سکھا دے گا۔ اگر ہم دل پر رکھ لیں تو یہ کوئی بڑی بات نہیں لیکن اس کے نتائج عظیم الشان ہوں گے۔

زبان کا کوئی رنگ روپ رورن نہیں، اس کی کوئی ذات نہیں، اس کی کوئی قومیت نہیں، اس کا کوئی مذہب اور وطن نہیں، جو اسے بولے، لکھے پڑھے اور استعمال کرے گا، اُسی کی وہ زبان ہوگی۔ اگر آپ کی زبان میں یہ خواص ہیں اور ساتھ ہی اس میں بڑھنے اور ترقی کرنے کی صلاحیت ہے تو یہی ہندوستان کی زبان ہے اور یہی ہندوستان کی زبان ہو کے رہے گی +

عبدالحق

اُردو اور ہندی

”اُردو بھی ہندی کی ایک شکل ہے اور سب سے آخری اور مکمل شکل ہے اور جس کو ہندی کہا جاتا ہے وہ محض اُردو کی ایک شکل ہے جس میں وضعی اور اختراعی طریقوں سے عربی فارسی الفاظ کی جگہ سنسکرت الفاظ داخل کر دیئے گئے ہیں۔“

محمد سعید

(از خطبہ استقبالیہ کمیٹی آل انڈیا اُردو کانفرنس ۱۹۳۶ء)

ہماری زبان

(۱)
(اُردو کی قدر و قیمت)

منہ موڑ کے سب نے منہ لگایا ہے تجھے
شہی عیب سے گھر اپنا بنایا ہے تجھے
اُردو ہے تجھے کیوں نہ رکھیں سو جاں سے عزیز
جب کھوئی ہے سلطنت تو پایا ہے تجھے

(۲)
(اُردو کا قوام)

اک کیف طراز آب پیہ ہے جام اُردو
ہے سب کے لئے صلائے عام اُردو
ہندی کی مٹھاس اور قند پارس
کیا دلکش و شیریں ہے قوام اُردو

(۳)
(غالب کی زبان)

اللہ اللہ عروسِ نوشانِ غالب
اُردوئے معلیٰ ہے بیانِ غالب
یاروں نے بہت زور لگایا لیکن
مغلوب نہ ہو سکی زبانِ غالب

(۴)
(سیر کی بے زبانی)

کی ہم نے نہ خوب قدردانی تیری
سب چھین لی تجھ سے کامرانی تیری
ملنے لگا اب تجھے زباں سے بھی جواب
کیا لائی ہے رنگ بے زبانی تیری

(۵)

(ایران اور ہند کا ملاپ)

سرمایۂ گنج خوش بیانی ہے یہ
کہنا اسے غیب کی ترجمانی ہے یہ
ایران کا ہند سے ہوا تھا جو ملاپ
اس دور میں محبت کی نشانی ہے یہ

(۶)

(اُردو کی اُستادی)

کیونکر نہ بنی ہے گی ایران اُردو
ہے راستی اُردو پہ اپنی نازاں اُردو
ہے راست اس کو ہندی نہ سیکھا
اٹھی چاہیں تو اس کو ہستی کا دامان اُردو
چھوڑے گی نہ

(۷)

(اُردو شعر زبانی)

رسم الخط میں ہیں تیرے اے اُردو سو حسن
قرباں دبیری و انیسی ہو جائے
ہیں تیرے شکستہ پن میں بھی لاکھ بناؤ
ملے بھی تو تخصص نویسی ہو جائے

دل محمد
پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور

ہماری قومی زبان

یعنی

دو تقریر جو میاں بشیر احمد صاحب بی اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا، مدیر "ہمایوں" نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے اکیاونویں اجلاس میں بتاریخ ۱۲ر اپریل ۱۹۳۶ء پڑھی۔

اُردو **ہندوستان کی قومی زبان** ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر ہمارے ملک کی کوئی قومی زبان ہے یا ہو سکتی ہے تو وہ اُردو ہے۔ مدتوں واقعات کا گویا فطری طور پر یہ میلان رہا کہ اُردو اس مُلک کی قومی زبان بنے، یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ کچھ مدت سے یہ بحث چھیڑ دی گئی ہے کہ ملک کی زبان کونسی ہو اور واقعات کو گویا مصنوعی طور پر اس طرح ڈھالا جا رہا ہے کہ اُردو سے اُس کا رُتبہ چھین کر کسی دوسری زبان کو دے دیا جائے بلکہ ہو تو بتدریج اُردو کو مٹانے اور ملیا میٹ کرنے کی تدبیریں عمل میں لائی جائیں۔ ہندوستان کی جماعتوں میں جو قسم قسم کے اختلافات ہیں معلوم ہوتا ہے انی نہ تھے کہ وہاں یہ ایک اور نیا شاخسانہ کھڑا کر دیا گیا ہے تاکہ قومی اتحاد اگر ممکن تھا بھی تو اُسے ناممکن بنانے کی ایک اور صُورت پیدا ہو جائے۔

جو ہندو اس ملک کو آریہ ورت بنانا چاہتے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ یہ مسلمانوں کی موجودگی نے "پوتر" نہیں رہا جو صرف بھیم اور ارجن اور کورو اور پانڈو کے ے سنسکرت اور سنسکرت نما ہندی بھاشا میں سُننا سنانا چاہتے ہیں اور جو مسلمان اس ملک کو عربستان کی محض ایک زرخیز وادی تصوّر کرتے ہیں جو ابن مُقبل اور ابو العتاہیہ اور نظامی اور نظیری کے عربی و فارسی اشعار ہی سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں وہ نہ صرف ہندوستان کا بھلا نہیں تے بلکہ وہ آپ اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار رہے ہیں۔ اُردو صحیح ہندو مُسلم مفاہمت کی ایک بولتی چالتی تصویر ہے جسے دونوں فریق اپنے دل میں سکتے ہیں کہ "جب ذرا گردن جُھکائی دیکھ لی"۔ اکبر مرحوم کی آواز ہر نیک نیت ہندو مسلمان کے کانوں میں آج تک گونج رہی ہے کہ

اُردو میں جو سب شریک ہونے کے نہیں	اِس مُلک کے کام ٹھیک ہونے کے نہیں
ممکن نہیں شیخ امرؤالقیس بنیں	پنڈت جی والمیک ہونے کے نہیں

اُردو کوئی مسلمانوں کی زبان نہ تھی۔ مسلمان جب پہلے پہل ہندوستان میں آئے تو اُن کی مذہبی زبان عربی اور تمدنی زبان فارسی تھی۔ رفتہ رفتہ جب ہندو مسلمانوں کا میل جول شروع ہُوا تو ملک کے مختلف حصّوں میں مختلف زبانوں میں، عربی فارسی کے الفاظ داخل ہونے شروع ہوئے اور اس سلسلے میں اُردو وجود میں آئی۔ جہاں جہاں مسلمان گئے اُنہوں نے بالعموم فارسی کو درباری اور دفتری زبان قرار دیا لیکن جوں جوں یہاں کے باشندوں سے اُن کے تعلقات بڑھے اُنہوں نے روزمرہ کے استعمال کے لئے ایک ایسی زبان اختیار کی جس کی بنیاد

ہندوانی اور جس کی باقی ساخت کچھ ہندوانی اور کچھ مسلمانی تھی، اس زبان کا رسم خط فارسی تھا لیکن اس کی قواعد اور اس کے لفظوں کا بیشتر ذخیرہ ہندوستان کی پیداوار تھی۔ سلیم مرحوم کے لفظوں میں گویا یہ نہ ہندو زبان تھی نہ مسلمان زبان بلکہ ایک ہندلمان یعنی ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان تھی اور ہندلمانیت کا سب سے بڑا مظاہرہ۔ اُردو مسلمان حکمرانوں کی رواداری کی ایک روشن مثال ہے اور اُردو ہی ہے جس کی فطری بُنیاد پر ہندو مسلم اتحاد کی شاندار عمارت کھڑی کی جاسکتی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ہمارے اکثر ملکی بھائی اِس حقیقت سے روز بروز دُور ہوتے جارہے ہیں اور اُس زبان سے جس سے اُنہیں اور ہمیں فطری طور پر لگاؤ ہونا چاہئے مصنوعی طور پر بیگانگی برت رہے ہیں ہر سچے محبِ وطن کے لئے یہ امر انتہائی تاسّف اور رنج کا باعث ہے۔

ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد اُردو کو چھوڑ کر جوق در جوق ہندی بھاشا کے حلقے میں داخل ہورہی ہے، مسلمان اس کے جواب میں یہ کر سکتے تھے کہ وہ پھر اپنی تمدنی زبان فارسی کی طرف مُنہ پھیر لیتے لیکن ایسا کرنا ایک خلافِ فطرت مصنوعی فعل ہوتا۔ وہ بدستور اُردو کے حامی رہے اور رہیں گے۔ اگر بعض ہندوؤں کو اس سے انکار ہے کہ اُردو ہندوستان کی قومی زبان ہے تو مسلمان ایک طرف اس بات پر اصرار کریں گے کہ اُردو کم از کم ہندوستان کے مسلمانوں کی قومی زبان ضرور ہے اور دوسری طرف اِس زبان کے دروازے ہمیشہ کھلے رکھیں گے تاکہ ہندو جب چاہیں بلا اجازت بخوشی پھر اس کے حلقے میں آ شامل ہوں اور مُدّت کے بچھڑے ہوئے پھر مل جائیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہندو مسلمانوں کے اتحاد سے ہندوستانیوں کی ایک مضبوط اور منظم قوم پیدا ہو۔ اِس قومیت میں ہندوؤں کی تہذیب اور مسلمانوں کی تہذیب کے اجزا شامل ہوں بلکہ حال کی مغربی تہذیب کا بھی ایک جزو ضروری حد تک اُس میں موجود ہو لیکن اگر ہمارے مُلکی بھائی ہمیں ہمارا مناسب حصّہ دینے پر راضی نہ ہوں یا اُن کی اکثریت ہماری تہذیب کی روایات کو محض اجنبی سمجھ کر ملک بدر کرنا چاہے تو بدقسمتی سے ہمیں اپنے آپ کو ایک جُداگانہ قوم تصوّر کرنا پڑے گا جس کا مذہب جُدا بعض روایات جُدا اور زبان بھی ایک حد تک جُدا ہوگی۔ خدا کرے یہ جُدائی تھوڑے سے کے لئے ہو۔ خُدا کرے جلد ہی ہم اور وہ سمجھ لیں کہ ہم اور وہ ایک دوسرے کے پڑوسی اور بھائی بھائی ہیں ہم ایک ہی سرزمین کے رہنے والے اور ایک ہی میٹھی سی بولی بولنے والے ہیں۔

اُردو کی ابتدا کیونکر ہوئی؟ اس کے متعلق مختلف نظریے ہیں۔ پہلے یہ خیال تھا کہ یہ زبان شاہجہان کے عہد میں پیدا ہوئی۔ شاہی لشکر میں جب مختلف قوموں کے ہندو مسلمان شریک ہوئے تو اُن کے روزمرہ کے تعلقات میں کسی مشترک زبان کی ضرورت پڑی۔ وہ زبان جس میں وہ بات چیت کرنے لگے اُردو تھی۔ اُردو کے معنی لشکر کے ہیں یہی وجہ ہے کہ اس زبان کا نام اُردو رکھا گیا۔ لیکن تھوڑے عرصے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اُردو اس طرح سے ایک بچّے کی مانند پیدا نہ ہوگئی تھی بلکہ جس طرح عموماً اور معاشری ادارے وجود میں آتے ہیں اسی طرح یہ بھی وجود میں آئی یعنی صدیوں میں، بتدریج مختلف مقامات میں اِس کا مواد جمع ہوکر مختلف حالات سے متاثر

ہوا اور کئی تبدیلیوں کے بعد اس نے یہ موجودہ صورت اختیار کی ۔ نہ یہ ہوا کہ چند ہزار یا چند لاکھ آدمیوں کے جمع ہونے سے یہ رونما ہو گئی اور نہ یہ ہوا کہ کسی خاص مروجہ زبان نے کسی خاص وقت میں اسے جنم دیا اور پروان چڑھایا۔

بعضوں کا خیال ہے کہ اس کی جائے ولادت دکن ہے ؛ بعضوں کا خیال ہے کہ اس کا پہلا مسکن پنجاب تھا بعض کہتے ہیں کہ یہ برج بھاشا سے نکلی اور بعض کہتے ہیں کہ یہ محض سراسینی پراکرت کی باندی ہے چنانچہ مسٹر سچدانند اسنہا نے ہندوستانی اکاڈیمی کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۲ جنوری ۱۹۳۶ء میں اپنے خطبۂ صدارت میں بڑے شد و مد سے کہا کہ "اس میں ذرہ برابر بھی شبہ نہیں کہ اردو کوئی خاص جداگانہ زبان ہے ہی نہیں بلکہ وہ تو محض مغربی ہندی کی ایک شاخ ہے"۔ جب ایسے سنجیدہ روشن دماغ اشخاص ایک علمی مسئلے کو ایسی تنگ نظری سے دیکھیں تو عوام سے کیا امید ہو سکتی ہے ؛ اس کے مقابل میں سر تیج بہادر سپرو جیسے اردو پسند محبِ وطن کے خیالات کو دیکھ کر دلی خوشی ہوتی ہے بعض ہندو مسلمانوں کا یہ بھی خیال ہے کہ اردو محض فارسی سے نکلی ہے اور یقیناً اسی غلط خیال کی وجہ سے بعض ہندو اسے غیر ملکی سمجھ کر اس سے پرے ہٹ گئے ہیں اور بعض مسلمانوں نے اس معصوم نیک نہاد کے گلے میں عربی فارسی کے بھاری بھرکم طوق ڈال کر اسے آزادی سے حرکت کرنے اور فطری زندگی بسر کرنے سے روک دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب نظریے اور خیال کم نظری اور کوتاہ خیالی کے نتیجے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو بلا شبہ تمام مذکورہ زبانوں کی پروردہ ہے بلکہ ان کے علاوہ اور بہت سی زبانوں سے بھی متاثر ہوئی سو یہ ان سب کے طبعی مرکب کی آخری ارتقائی شکل ہے۔ اسے صرف اس شہر اور اس شہر، اس علاقے اور اس صوبے سے وابستگی نہیں بلکہ ہندوستان کے اکثر حصوں اور اکثر لوگوں سے قریب یا دور کا تعلق رہا ہے اور اسی لئے اس میں قومی زبان بننے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔

ساتویں صدی عیسوی سے پہلے مدت تک ملیبار کے ساحل والوں سے مسلمانوں کے تجارتی تعلقات رہے۔ آٹھویں صدی میں اور اس کے بعد وہ سندھ اور ملتان میں پہنچے اور پھر دسویں سے بارھویں تیرھویں صدی تک وہ پنجاب اور سارے شمالی ہندوستان پر قابض ہو گئے۔ چودھویں صدی میں خلجی گجرات اور دکن پر حملہ آور ہوئے اور تغلقوں نے کچھ عرصے کے لئے دہلی کو چھوڑ کر جنوب کی طرف رخ کیا۔ جہاں جہاں یہ لوگ گئے اور ٹھہرے وہاں کی زبانوں اور فارسی کے ملاپ سے ایک نئی زبان جا بجا اور عہد بہ عہد پیدا ہوئی اور اس نے ہندو مسلمانوں کے میل جول کی گود میں پرورش پائی، یہاں تک کہ چودھویں پندرھویں صدی میں مغلوں کے ہند میں آنے سے ڈیڑھ دو صدیاں پہلے ہی یہ ملک کے بیشتر حصے میں رائج ہو چکی تھی۔ یہی تھی جسے کسی نے ہندی، کسی نے زبانِ ہندوستان اور کسی نے کچھ اور کہا یہی بعد میں اردو کہلائی۔ ان واقعات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ سمجھنا آسان ہے کہ ابتدائی اردو پر سب سے زیادہ اثر سندھ اور ملتان اور پنجاب کا پڑا، کیونکہ یہی وہ راستہ تھا جس سے مسلمان ہندوستان میں آئے اور یہی وہ علاقے تھے جہاں اپنے عہدِ حکومت کے پہلے دور میں مسلمان صدیاں تک بستے رہے۔ اس کے علاوہ مغلوں کے آنے سے بہت پہلے وہ وسطی اور جنوبی ہندوستان میں بھی پھیل گئے تھے اور ان کے ساتھ

ہی گجرات اور دکن میں اُن کی یہ عام فہم زبان بھی پہنچ گئی تھی۔ اِن اثرات کے ماتحت جو زبان خود بخود وضع ہوئی اُس کے دلچسپ نمونے پروفیسر محمود شیرانی نے اپنی مشہور کتاب "پنجاب میں اُردو" میں پیش کیے ہیں۔ دیکھئے شیخ فریدالدین گنج شکر (سنہ وفات ۶۶۴ھ) جو تیرھویں صدی میں پنجاب میں رہتے تھے فرماتے ہیں:

وقتِ سحر وقتِ مناجات ہے — خیز دراں وقت کہ برکات ہے
نفس مبادا کہ بگوید ترا — خسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے
پندِ شکر گنج بدل جاں شنو — ضائع مکن عمر کہ ہیہات ہے

امیر خسرو جن کی وفات ۱۳۲۵ء میں ہوئی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے چار پانچ لاکھ فارسی اور ہندی اشعار کہے جن میں زیادہ تر ہندی کے تھے۔ اُن کے ہاں فارسی ہندی کا ملاپ ملاحظہ ہو:

زحالِ مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں — کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روزِ وصلت چوں عمر کوتاہ — سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
چو شمع سوزاں چو ذرہ حیراں ز مہر آں مہ بگشتم آخر — نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آویں نہ بھیجیں بتیاں

کبیر داس اور گورونانک پندرھویں صدی میں اس زبان میں لکھتے تھے۔ گورونانک کا شعر ہے:

سوچ وچار کرے مت من میں — جس نے ڈھونڈا اُس نے پایا

کبیر کی صاف سلیس شیریں اُردو سنیئے۔ غزل کا مطلع ہے:

ہمن ہے عشق مستانہ ہمن کو ہوشیاری کیا — رہیں آزاد یا جگ میں ہمن دُنیا سے یاری کیا

محمود شاہ بیگڑہ شاہِ گجرات کا فقرہ مشہور ہے "پنچی بیری ہر کوئی چھوڑے"۔

سولھویں اور سترھویں صدی میں ملک محمد جائسی اور تُلسی داس جس نے رامائن کا ترجمہ بھاشا میں کیا اور اکبر بادشاہ جس نے مسلمانوں کو ہندی سیکھنے اور ہندوؤں کو فارسی سیکھنے کی تاکید کی اور قطب شاہ اور دکن کے دوسرے بادشاہ یہ سب عام فہم زبان میں شعر لکھتے تھے۔

قطب شاہ کے مشہور شعر ہیں:

پیا باج پیالہ پیا جائے ناں — پیا باج یکتل جیا جائے ناں
کہے تھے پیا بن صبوری کرو — کہا جائے اماکیا جائے ناں
قطب شاہ نہ دے مجھ دوانے کو پند — دوانے کو کچھ پند دیا جائے ناں

یہی زبان تھی جس نے شاہجہاں کے عہد میں اُردو نام پایا۔

اٹھارھویں صدی میں ولی دکنی (سنہ وفات ۱۷۴۴ء) نے جسے اُردو کا چوسر کہا جاتا ہے اپنی شاعری سے زبان کو فروغ دیا۔ دیکھئے ان کی زبان میں ہندی فارسی اور پنجابی کے نشانات : ؎

یہ تل تجھ مکھ کے کعبے میں مجھے اسود حجر دِستا   زنخداں میں ترے مجھ چاہِ زمزم کا اثر دِستا

پُرانی اُردو میں پنجابی کی شیرینیاں دیکھئے : ؎

خاک و خوں میں صُورتیں کیا کیا نہ رلیاں دیکھیاں   اے فلک باتیں تری کوئی نہ بھلیاں دیکھیاں

پندرھویں صدی میں اُردو میں اس قسم کے پنجابی لفظ رائج تھے :۔ کھنڈ، گڈّی، گنگلو، آکھنا، نسنا۔ اُردو میں پنجابی کا بہت حصہ ہے۔ اُردو قواعد پنجابی قواعد سے بہت ملتی ہے۔ اُردو کے نشوونما میں پنجاب نے خاصا حصّہ لیا۔ سترھویں صدی کی تصنیف "فقہ ہندی" کی زبان پنجابی نُما ہے۔ سترھویں صدی اور اٹھارھویں صدی میں پنجاب نے اُردو کے بہت سے مصنّف پیدا کئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ پنجاب کا تعلق اُردو سے صدیوں کا فطری تعلق ہے، یہ نہیں کہ صرف اُنیسویں صدی میں سیاسی اسباب کی بنا پر اہلِ پنجاب نے اُردو میں دلچسپی لینی شروع کی۔ اُردو کے پنجاب پر اور پنجاب کے اُردو پر جو حقوق ہیں وہ یاد رکھنے چاہئیں، یہ رشتہ کبھی چھوٹ نہیں سکتا۔ راقم کا تجربہ ہے کہ بارہا اُس نے برسوں تک ایک لفظ یا محاورہ اُردو میں استعمال نہ کیا یہ سمجھ کر کہ یہ پنجابی ہے یہاں تک کہ کسی اہلِ زبان سے اُسے سُن کر حیران ہُوا اور پوچھا کہ کیا یہ اُردو میں بھی استعمال ہوتا ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ فطری طور پر ہندوستان کی اکثر زبانوں میں ایک دوسری کے گہرے اثرات پائے جاتے ہیں اور وہ زبان جس میں مختلف زبانوں مختلف قوموں مختلف علاقوں مختلف مذہبوں اور مختلف تہذیبوں کے عناصر ٹھیک طرح سموئے ہوئے ہیں اور ٹھیک طرح سموئے جاسکتے ہیں اُردو اور فقط اُردو ہے! اس کے بعد کون شک کر سکتا ہے کہ اُردو ہی ہندوستان کی قومی زبان ہے اور اسی میں قومی زبان بننے کی پُوری صلاحیت ہے۔

اُردو ادب کی مختصر تاریخ سبق آموز، ہمت افزا اور روح پرور ہے۔ کیسے کیسے صاحبِ دل اور صاحبِ کمال ہو گزرے ہیں جنھوں نے اُردو ادب کے نشوونما میں حصّہ لیا۔ یہاں گنجائش نہیں نہ مدّعا ہے کہ اُن کا مختصر سا تذکرہ بھی ہو، صرف جی چاہتا ہے چند نام گنوائے جائیں۔ ایک شاندار جلوس ہمارے سامنے ہے، اتفاق سے نظر مختلف زمانوں کے چند نمائندوں پر پڑتی ہے، جن سے اور بیسیوں کی یاد بھی تازہ ہو جاتی ہے۔ پُرانے زمانے میں امیر خسرو (سنہ وفات ۱۳۲۵ء)، نانک (۱۵۳۹)، کبیر (۱۵۱۸)، تلسی داس (۱۵۲۴)، قطب شاہ (۱۶۱۱)، ولی دکنی (۱۷۴۴) وغیرہ ہیں۔ وسطی زمانے میں آبرو (۱۷۵۰)، حاتم (۱۷۹۱)، سودا (۱۷۸۱)، میر (۱۸۱۲)، میرحسن (۱۷۸۶)، انشا (۱۸۱۷) و مصحفی (۱۸۲۴)، نظیر (۱۸۳۰)، ناسخ (۱۸۳۸) و آتش (۱۸۴۷)، مومن (۱۸۵۱)، ذوق (۱۸۵۴) و غالب (۱۸۶۹)، دورِ آخر میں انیس (۱۸۷۴) و دبیر (۱۸۷۵) ہیں۔ زمانۂ حال میں امیر (۱۹۰۰)، داغ (۱۹۰۵)، حالی (۱۹۱۴)، سرور (۱۹۱۰)، اسمٰعیل (۱۹۱۷)، اکبر (۱۹۲۱)، چکبست (۱۹۲۶) اور کئی اور زندہ بزرگ اور نوجوان نئے شعراء تھے۔ نثر نگاروں میں میرامن اور سرور (۱۸۶۷) کے بعد غالب اور پھر سرسید احمد خاں (۱۸۹۸)، آزاد (۱۹۱۰)، ذکاء اللہ (۱۹۱۰)، نذیر احمد (۱۹۱۲)، شبلی (۱۹۱۴)، سرشار (۱۹۰۲)،

شرر ۱۹۲۶، سری رام، وحید الدین سلیم اور آج کل کی بیسیوں باہمت زندہ ہستیاں ہیں۔

اُردو ادب کے جدید دَور میں پہلے ہمیں اُنیسویں صدی میں چار بڑے ادارے کام کرتے نظر آتے ہیں۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ، دہلی کالج، سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ، اورینٹل کالج لاہور۔ ترجمہ و تالیف کا کام شروع ہُوا، علمی اصطلاحات وضع ہونی شروع ہوئیں، سنجیدہ مضامین لکھے جانے لگے۔ زبان میں سلاست اور روانی کے اوصاف پیدا ہوئے۔ سر سید احمد خاں کی علی گڑھ تحریک اور تعلیمی ادارے نے ادب میں عمل کی رُوح پیدا کی اور گو ان مختلف کام کرنے والے اداروں میں باہمی ربط نہ تھا ان کی مسلسل کوششوں سے اُردو میں مغرب کے علوم جدیدہ کی ترویج کے لئے رستہ صاف ہوگیا۔

اِس کے ساتھ ہی آزاد کی تحریک پر پنجاب میں ایک نئی ادبی زندگی کی بُنیاد پڑ چکی تھی۔ اُدھر انجمن ترقیٔ اُردو، جامعۂ عثمانیہ اور دار المصنفین کے سے شاندار ادارے رُونما ہوئے۔ اخبارات و رسائل کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا جس سے بہت سا مفید اور غیر مفید مواد جمع ہوگیا۔ اِس کے علاوہ جابجا مصنفوں، مترجموں اور شاعروں نے اپنی سرگرمی کے جوہر دکھائے۔ انجمنیں، مشاعرے، سبھائیں قائم ہوئیں بنیں بگڑیں ٹوٹیں، بہت سی کہنے کو زندہ کچھ واقعی سرگرم۔ مختلف اطراف میں مختلف قسم کے لوگوں نے کام کیا۔ دہلی، لکھنؤ، لاہور، حیدر آباد اور کئی اور مقامات میں بعض جگہ گرمجوشی اور بعض جگہ خاموشی سے کام ہُوا۔

غیر ملکی حکمرانوں نے اُردو کی عام سرپرستی کی۔ فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج، اورینٹل کالج اس طرح ظہور میں آئے۔ اُردو بہت سے صُوبوں کی عدالتی زبان قرار پائی، عیسائی پادریوں نے بھی اسی کے ذریعے سے اپنی مذہبی تعلیم کی اشاعت کی۔

ہندوؤں نے بھی اِسے اپنی زبان سمجھ کر اس کی نشر و اشاعت میں دریا دِلی سے حصّہ لیا۔ نول کشور پریس نے جو کام کیا وہ ظاہر ہے دیا شنکر نسیم، سرشار، پیارے لال، سرور، سری رام، چکبست، پریم چند وغیرہ اور ہم عصروں میں سر سپرو، دیا نرائن نگم، کیفی اور کئی اور قابل احترام بزرگ ہیں۔

اُردو نہ کسی خاص قوم کی میراث تھی نہ کسی خاص شہر کی پیداوار۔ مقابلہ فضول ہے، رقابت بے معنی ہے، دعوے لاحاصل ہیں اِسے کسی طرح سے بھی محدود کر دینا غلطی ہے اِس سے رُوگردانی کم فہمی اور ناعاقبت اندیشی ہے۔ ہندو مسلمان سکھ عیسائی پارسی قدامت پسند جدت طراز صوبے شہر یہ ہر قوم اور ہر سمت کی زبان ہے اور اگر نہیں ہے تو یہی ہے جو ہمہ گیر بنائی جاسکتی ہے۔

دو باتیں اُردو ادب کی تاریخ کے ضمن میں قابلِ غور ہیں۔ ایک یہ کہ یہ ہمارے ملک کے دَورِ انحطاط کی پیداوار ہے، اِسی۔ اس میں یاس و حرماں اور فرسودگی کے آثار جابجا پائے جاتے ہیں۔ تاہم کہا جاسکتا ہے کہ اُردو ادب ہماری پس ماندہ قوم کے زوال کا ایک شاندار کارنامہ ہے۔ شاید یہی اِک قوت تھی جس کے بل پر وہ زندہ رہی۔ اِک بیمار نادار ہستی اپنی فصاحت اور مبالغے اور حسن میں سرشار۔ غنیمت تھا جو کچھ کیا گیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اُردو ادب بغیر کسی منظم کوشش کے خود بخود ترقی پا گیا۔ جو کچھ بھی ہوا

ے بچے بغیر ہوا۔ زبان میں اک فطری حسن تھا، لوگوں میں ابھی سیاسی جوڑ توڑ کا مرض نہ تھا، یہ اُن کی طرف بڑھتی چلی آئی وہ اس کی طرف کھچتے چلے
، بری بھلی باتیں پیدا ہوئیں، کچھ باقی رہنے کے لئے کچھ جلد فنا ہو جانے کے لئے۔ کسی نے نہ دیکھا کہاں کیا ہو رہا ہے کسی نے نہ پوچھا کیوں
ا ہے؛

لیکن اب حالات اور ہیں، اب زمانے کا انداز کچھ اور ہے، اب اگر ہم اپنے خیالات میں انقلاب پیدا نہ کریں گے تو مٹ جائیں گے،
جائیں گے نیست و نابود ہو جائیں گے۔ اب ترتیب و تنظیم کا زمانہ ہے، معاشی دُنیا میں، سیاسی دُنیا میں، ہر طرف منصوبہ بندی ہو رہی ہے
ہر معاملہ) یعنی چیزوں کو اور واقعات کو اپنے حال پر چھوڑ دینا اور فطرت کو خود بخود کام کرنے دینا یہ خیال اب فرسودہ ہو چکا ہے۔ اب
ات کو کسی خاص تصور یا نصب العین کے ماتحت ڈھالا جاتا ہے اب واقعہ ہو نہیں جاتا اب اُسے "بنایا" جاتا ہے، وہ محض وقوع
نہیں آتا بلکہ اُسے وضع کیا جاتا ہے۔ یہ دوسرا سوال ہے کہ کہاں تک حقیقت میں ایسا ہوتا ہے یا کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ ظاہر ہے
آج کل کی دُنیا میں یہ خیال اکثر لوگوں کے نزدیک یقین کی حد تک پہنچ چکا ہے کہ منصوبے سے، ایک خاص نصب العین کے سامنے رکھنے
ایک خاص مقررہ پروگرام پر عمل کرنے سے جس طرح جو چاہیں ہم کر سکتے ہیں، ان تدبیروں سے ہم تقدیر کو پلٹ سکتے ہیں، ہمارے قومی
اعر نے کیا نہیں کہا؛

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں!

یہی عام حالت ہماری قوم کی ہے، یہی ہماری زبان کی، زندگی کے ہر شعبے میں ہمیں **تنظیم کی ضرورت** ہے، پہلے سے سوچنے کی
ایک مخصوص راہ عمل بنانے کی اور پھر مل کر اُس پر چلنے کی ضرورت ہے۔ برسوں سے ہمارے رہنما یہ آواز بلند کر رہے ہیں، اُدھر عوام ہیں
پہلے سے اب عمل پر زیادہ مستعد نظر آتے ہیں۔ ضرورت کسی ایسی زبردست شخصیت کی ہے جو اُدھر رہنماؤں کے حسد اور غرض مندی کو
اور اِدھر عوام کی قدامت پسندی اور سہل انگاری کو اپنی حیات انگیز تحریک سے تعاون اور سرگرمی میں تبدیل کر دے۔ کیا ایسا ہوگا؟
دوسروں کو دیکھو وہ کیا کر رہے ہیں؛ مقررہ طے شدہ باتوں کو وہ تہ و بالا کر رہے ہیں اور ایک نئی تعمیر کی داغ بیل ڈال رہے ہیں
زبان کے شعبے کو لو تیس چالیس سال ہوئے **اُردو کے مقابل میں ہندی** کا نام بہت کم سننے میں آتا تھا۔ بنگالی، گجراتی، سندھی کی
طرح ایک زبان یہ بھی تھی کہ ایک مخصوص گروہ کی زبان تھی۔ مالوی جی نے ایک منصوبہ تیار کیا جس کے ماتحت ان ہندوؤں کو جو اُردو
لکھتے پڑھتے تھے اُردو کو چھوڑ کر ہندی لکھنے پڑھنے کی ترغیب دی۔ اُنہیں بتایا کہ وہ ہندو ہیں تو اُنہیں صرف ہندوستان کی، اپنی
تہذیبوں کو اختیار کرنا چاہیئے، قدیم ہندوانی تہذیب ہندی زبان، ہندی رسم خط کہ یہی صحیح ہندویت اور یہی صحیح حب الوطنی ہے۔ یہ
بھول گئے کہ قدیم ہند کی طرف رجوع کرنے میں وہ پورے ایک ہزار سال اور کم از کم آٹھ دس کروڑ مسلمانوں، عیسائیوں، پارسیوں وغیرہ

پرسے گویا پھاند رہے ہیں، سمجھ رہے ہیں کہ یہ لوگ کبھی یہاں آئے ہی نہ تھے، صدیوں سے ہندوؤں کے ہم وطن اور ہمسائے نہیں ہے، یہ نہ تھے اور نہ ہیں۔ اگر یہ طرزِ خیال درست ہے تو پھر یہ طرزِ خیال بھی درست ہے کہ ہندو زیادہ تر وہ آریائی نسل والے لوگ ہیں جو باہر سے آکر ہندوستان پر قابض ہو گئے، ہندوستان ان کا ملک نہ تھا بلکہ اُن بھیلوں گونڈوں کا وطن تھا جن کو اُنہوں نے پہاڑوں اور جنگلوں کی طرف مار بھگایا یا اُن دراوڑی قوموں کا وطن تھا جن کو انہوں نے جنوب کی طرف دھکیل دیا جن کی زبانیں تامل، تلیگو، ملیالم آریائی سنسکرت سے اتنا واسطہ بھی نہیں رکھتیں جتنا فارسی بلکہ اُردو بھی۔ اس آریائی کوتاہ اندیشی کی کیا وجہ ہے؛ اس کی وجہ سیدھے سادھے لفظوں میں یہ ہے کہ ہندو قوم ایک اعلےٰ درجے کی قدیمی تہذیب کی مالک تھی۔ حالات ایسے ہوئے کہ مسلمان اس ملک پر حملہ آور ہوئے اور صدیوں تک یہاں حکومت کرتے رہے یہاں تک کہ اُن میں زوال کی علامتیں ظاہر ہوئیں اور ایک اور اجنبی قوم سات سمندر پار سے آکر ہندو مسلمانوں پر مسلط ہو گئی۔ ہندو کچھ دیر کے بعد اُبھرے مسلمانوں پر ابھی غفلت طاری تھی۔ خیالی جمہوریت کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ معلوم ہوا کہ اب کثرت کی حکومت آنے والی ہے۔ ہندوؤں کی کثرت تھی، اُن کے پاس روپیہ تھا، وہ نئی تعلیم پا رہے تھے، ایک مشترک قابلِ حصول نصب العین کا احساس کرتے ہوئے وہ منظم بھی ہو رہے تھے، اُس کے مقابل میں مسلمان ابھی خوابِ خرگوش میں تھے۔ اس حال میں قدرتی بات تھی کہ ہندوؤں کی اکثریت کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ یہ ہمارا ملک ہے، صدیوں ہم اجنبیوں کے زیر اثر رہے، اب ہم زیادہ قابل اور زیادہ ہوشیار ہیں اور اس لئے ہم ہی خوشحالی اور ترقی اور حکومت اور آزادی کا زیادہ استحقاق رکھتے ہیں۔ یہاں لیا کہ ایسا محسوس کرنا ایک قدرتی بات تھی لیکن غور کرو تو واضح ہو جائے گا کہ یہ عقلمندی نہ تھی، دور اندیشی نہ تھی، اس میں ہندوستان کی بلکہ بالآخر خود ہندوؤں کی بہتری نہ تھی۔ آٹھ کروڑ انسانوں کی طرف سے آنکھ کان بند نہیں کئے جا سکتے خواہ وہ کاہل یا نادار ہی کیوں نہ ہوں۔ دُنیا کا مستقبل قومیت کے ہاتھوں میں نہیں، بین الاقوامیت اور انسانیت کے ہاتھوں میں ہے۔ ہندوستان کو یہ زریں موقع حاصل ہے کہ یہاں ایک نہیں کئی قومیں پہلو بہ پہلو آباد ہیں، کئی تہذیبیں ہیں، کئی زبانیں ہیں۔ اِن حالات میں رواداری اور بلند نظری برتنی چاہئے تاکہ یہ ملک قومیت کی خطرناک منزل کو پھاند کر صحیح انسانیت کی راہ پر لگ جائے۔ یہاں کی تہذیب اور یہاں کی زندگی میں اسلامی اور ہندوانی اور مغربی تہذیب کا ایک شاندار مِلاپ ہو جسے دُنیا رشک کی نظروں سے دیکھے!

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ فی الحال (خدا کرے عارضی طور پر) صُورتِ حالات کچھ اَور ہے۔ فی الحال ہمارے ملکی بھائیوں کی اکثریت بلکہ سچ یہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک مخصوص جماعت بھی ایک ایسی مفاہمت کے لئے تیار نہیں ہے۔ ہندی والے اُردو کے دائرے میں برسوں سے اپنی نشر و اشاعت کے سلسلے میں چھاپے مار رہے ہیں اور اپنے حلقے کو وسیع کئے چلے جاتے ہیں۔ وہ ایک حد تک کامیاب ہو رہے ہیں کیونکہ وہ منظم ہیں اور ایک خاص جذبے کے ماتحت کام کر رہے ہیں۔ ہماری حالت بُری نہیں بعض باتوں میں ہم اُن سے آگے ہیں پیچھے نہیں لیکن صرف بعض میں، بعض اَور باتوں میں وہ ہم سے آگے ہیں اور آگے بڑھے چلے جاتے ہیں

اگر کچھ عرصہ ہم اسی طرح سوئے رہے، الگ الگ رہے، منظم نہ ہوئے تو ہم بلاشبہ سخت خطرے میں پڑ جائیں گے۔

آج کل سب سے دلخراش سوال رسمِ خط کا درپیش ہے۔ اُردو والے اپنے خط کی خوبیاں بیان کرتے ہیں ہندی والے اپنے خط کی۔ ردو والے اپنی زُود نویسی اور خوبصورتی پر زور دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھو سارے مغربی ایشیا اور شمالی و وسطی افریقہ کا رسمِ خط بھی یہی ہے اور ناگری حروف صرف ہندوستان تک محدود ہیں۔ اُدھر ہندی والے کہتے ہیں کہ ہمارا خط آسان ہے، زیادہ علمی شان لئے ہوئے ہے الص ہندوستان کی چیز ہے۔ ایک تیسرا گروہ اس لڑائی جھگڑے سے گھبرا کر یا اُکتا کر لاطینی حروف کا شیدائی ہو رہا ہے اور عقلی نقطۂ نظر سے ینی حروف کو ترجیح دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اِس طرح اِدھر ہماری رقابتیں ختم ہو جائیں گی اُدھر ساری دُنیا کے ساتھ ہمارا ایک نیا تعلق یدا ہو جائے گا۔ وہ ٹرکی کی مثال پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بس کل صبح اُٹھتے ہی بسم اللہ کر کے بسم اللہ اور اوم دونوں لاطینی حروف ں لکھنا شروع کر دو جھگڑا ختم ہو جانے اور ہم دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرنے لگیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان میں سے ہر فریق کی بعض دلائل پُر زور ہیں مگر افسوس کہ نری دلائل سے کم از کم زندگی کی بعض باتوں کا فیصلہ نہ ہو سکتا ہے نہ کبھی ہو گا۔ مجھے ایک شے زیادہ بصورت معلوم ہوتی ہے آپ اس پر زور دے رہے ہیں اور دلیلیں پیش کرتے ہیں کہ نہیں فلاں شے اُس سے بہتر ہے۔ مجھے اپنا بچہ پیارا معلوم ہوتا ہے، آپ کو اصرار ہے کہ آپ کا بچہ زیادہ محبت کے قابل ہے۔ اب فیصلہ ہو تو کس طرح سے اور کرے تو کون؟ یک تیسرا آدمی کہتا ہے کہ اِن دونوں بچوں کو گولی سے مار دو اور ایک زیادہ سمجھدار نوجوان کو مل کر متبنّیٰ بنا لو۔ ممکن ہے اس سے آئندہ سل کا فائدہ ہو لیکن اس سے ہم دونوں کی موجودہ زندگی رُوکھی پھیکی ہو جائے گی، اسلاف کا خون جو ہماری رگوں میں دوڑ رہا ہے منجمد ہو ائے گا، ہم بھول جائیں گے ہم کون تھے؛ ہم یہ بھی پُوری طرح نہ سمجھیں گے کہ ہم اب کون ہیں؛ دوسرے کا چہرہ لگا کر نہ ہم اپنے آپ کو ہچان سکیں گے نہ کوئی ہمیں پہچانے گا۔ مشہور انگریزی جملہ ہے:-

What is the good if a man gain the whole world and lose his own soul?

(کیا فائدہ اگر انسان ساری دُنیا کو بھی پا لے اور اپنی رُوح کو کھو دے؟)

یہی وجہ ہے کہ ہم اہلِ اُردو کبھی اپنا رسمِ خط نہیں چھوڑ سکتے۔ ہمارا رسمِ خط ہماری تہذیب کا علم بردار ہے، اُس کی ایک ایک نوک لک میں ہمارے لئے ہمارے تمدّن کے ہزاروں اشارے موجود ہیں۔ کوئی پوچھے گا کیسے؛ ہماری صرف یہ گزارش کافی ہو گی کہ حضرت مارا دل یہی گواہی دیتا ہے، آپ ہمارا دِل ہم سے چھینتے ہیں! یہ ہم دینے کو تیار نہیں۔ لیکن ہاں اب محض دل کی دلداریوں کا زمانہ نہیں رہا۔ اب دل کے ساتھ اگر دماغ بھی شریکِ کار نہ ہو تو دل بے کار ہے بلکہ ناہنجار اور مردُود۔ ٹرکی کی مثال غلط ہے وہاں یک آزاد متحد منظم قوم ہے جو ایک تجربہ کر رہی ہے، اُسے جب تک چاہے جاری رکھے جب چاہے چھوڑ دے۔ ہمارے حالات اور

ہیں، ہمارے پاس لے دے کے ہماری چند روایات ہیں۔ مانا کہ ہم میں توہمات بھی ہیں قدامت پسندی بھی ہے لیکن یہ کہاں کا ایسا گناہ ہے کہ ہم اپنے ادب کو اپنے قدیمی، خوبصورت، مختصر، ہمہ گیر رسمِ خط میں زندہ رکھنا چاہیں لیکن آپ کسی سیاسی دلیل کے ماتحت اُس کا گوشت پوست کھینچ دینا ضروری تصوّر فرمائیں اور سمجھائیں کہ اصلی چیز تو رُوح ہے، جسم کو مسخ کر دینے سے رُوح بدستور قائم رہے گی۔ آخر انگریزوں نے ابھی تک اپنے although میں سے ugh (اُگھ) کیوں خارج نہیں کر دیا، آخر اُنہوں نے ابھی تک اپنی Psychology کا سر کیوں نہیں کاٹ دیا؛ وہاں ہزاروں ایسی اصلاحات کی ضرورت ہے، اُنہیں کیوں دُور کی نہ سُوجھی؟ چند روز ہوئے کانگرس کے ایک ممتاز لیڈر نے رسمِ خط کی بحث کے سلسلے میں مجھ سے کہا کہ میں نے پیرس میں چند یورپینوں کو ثابت کر دکھایا کہ ہندی رسمِ خط دُنیا میں سب سے زیادہ سائنٹیفک ہے۔ یہ درست ہوگا لیکن صاحبو! ہمیں انتظار کرنا چاہئے یہاں تک کہ اس علمی ثبوت کا اثر یورپ کے رگ و پے میں سرایت کر جائے اور سب مغربی قومیں یہ علمی رسمِ خط اختیار کر لیں۔ سیدھی بات یہ ہے کہ ہم اُردو والوں کو ہندی والوں سے لڑنے جھگڑنے کی ضرورت نہیں، اگر وہ اُس پُرانے قومی سمجھوتے کو جس کا نام اُردو ہے برقرار رکھنے کے لئے تیار نہیں تو ہمیں بحث مباحثہ میں وقت ضائع نہ کرنا چاہئے، نہ اُن کے خلاف اظہارِ نفرت کرنا چاہئے۔ نفرت محض کمزوری کی دلیل ہے اور مزید کمزوری کا سبب بنتی ہے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم اطمینان اور دلجمعی کے ساتھ اپنے رسمِ خط کی اصلاح اور اپنی زبان کی عام ترقی کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو جائیں۔ ہم نہیں کہتے محض ہمارے ہندو بھائی ہی قصوروار ہیں، محض وہی متعصب اور تنگ خیال ہیں بدقسمتی سے وہ اسلام جو رواداری کا آئینہ دار تھا اُس کے بعض پیرو بھی آج تنگ نظری کا شکار نظر آتے ہیں لیکن ہم اپنے ہم وطنوں کو یقین دلاتے ہیں کہ مسلمان میں ہزار کمیاں ہوں اُس میں ایک صاف گوئی کی خوبی ضرور ہے، جاہل اور متعصب مسلمان کے بھی زبان و دل ایک ہیں اور ہمیں ادب کے ساتھ یہ عرض کرنا ہے کہ ہمارے ہم وطنوں میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جو مُنہ سے ہندوستانی ہندوستانی اور اُردو اُردو تک پکار ہے، اُس کی زبان پر غالب و اقبال کے شعر رواں رہتے ہیں لیکن درپردہ وہ ہر ممکن ذریعے سے اُردو کی بیخ کنی پر تُلی رہتی ہے۔ میں پنجاب کے ایک مشہور ہندو لیڈر کو جانتا ہوں جو کسی مسلمان کو دیکھتے ہی عموماً فارسی اور اُردو کے بیسیوں شعر ایک دلکش انداز میں پڑھنے لگ جاتے ہیں لیکن جنہوں نے اپنے قابل فرزند کو اُردو کی تعلیم سے عمداً قطعی طور پر بے بہرہ رکھا ہے، ایسی ہی سینکڑوں ہزاروں مثالیں اور بھی ہیں۔

مجھے رنج ہوتا ہے کہ ایک مجھ سے غیر سیاسی شخص کو اس قسم کی سیاسی باتیں کہنی پڑتی ہیں۔ بحیثیت ایک اُردو رسالے کے مدیر میں نے کبھی ملّی اختلافات سے کوئی واسطہ نہیں رکھا، کیونکہ اُردو کے بابِ عالی پر اُردو حروف میں صرف بسم اللہ اور اوم لکھا ہے لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ محمد رسول اللہ نہیں لکھا، یہ لفظ ہر ایک مسلمان کے دل میں منقوش ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ایک ادب سے تعلق رکھنے والے شخص کو اس طرح کی سیاسی گفتگو کرنی پڑی؛ اِس کی وجہ محض یہی ہے کہ یہ اُردو کی زندگی اور موت کا سوال ہے اور بحیثیت اُردو کے

ئیدائی کے میرا فرض ہے کہ میں تمام مسلمانوں سے اور اُن انصاف پسند اور محبِ وطن لاکھوں ہندوؤں سے بھی جو ابھی اُردو کے حلقے بس داخل ہیں درخواست کروں کہ اُردو ہندی کے اِس فتنے کو روکیے اور اِس کو ملکی سیاسیات کے میدان سے نکال کر پھر قومی ادبیات ی چوٹیوں پر پہنچا دیجیے۔ اِس ضمن میں رام نریش ترپاٹھی (ہندی مندر پریاگ ۱۹۲۶ء صفحہ ۱۵) کا یہ قول دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ "ہر ہندو کو اردو سیکھنی چاہیئے اور ہر مسلمان کو ہندی۔ میرا تو راسخ عقیدہ ہے کہ بغیر اُردو جانے کوئی شخص بھی ہندی کا اچھا انشا پرداز نہیں ہو سکتا۔" دیوی داس گاندھی نے ۱۹۳۴ء میں ہندی پرچار سبھا کے سالانہ جلسے میں کہا کہ "ہر ہندو کا فرض ہے کہ وہ اُردو سیکھے اور ہر مسلمان کا یہ فریضہ ہے کہ وہ ہندی کی استعداد بڑھائے" بلکہ سنسکرت اور فارسی کی طرف بھی دونوں قوموں کو توجہ کرنی چاہیے۔ شکر ہے کہ ہمارے بھائیوں میں ابھی ایسے آدمی موجود ہیں جو دل سے ایک پائدار مفاہمت کے خواہشمند ہیں۔ یہ مفاہمت اسی طرح ممکن ہے کہ ہم ایک دوسرے کی چیزوں کی قدر کریں تاکہ رواداری سے محبت اور محبت سے نہ حل ہونے والے سوالوں کا حل مِل جائے۔

اُردو کی ضروریات اس وقت چار عنوانوں میں تقسیم کی جا سکتی ہیں: لسانی، ادبی، طباعتی، اشاعتی۔

سب سے پہلے **لسانی ضروریات** کا درجہ ہے کیونکہ یہی ہیں جو اُردو کو اُردو بناتی ہیں۔ اِس سلسلے میں مَیں پنڈت برج موہن صاحب کیفی کی بیش بہا تصنیف "منشورات" کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ ہمارے سینکڑوں ملکی بھائی جو اُردو کو نقصان پہنچا رہے ہیں اُن کے مقابل میں ہمارے لئے ایک حضرتِ کیفی کے قیمتی مخلصانہ مشوروں کی سُودمندی کافی اور پوری طرح باعثِ اطمینان ہے۔ اِسی طرح اس باب میں مولانا سلیم مرحوم اور مولوی عبدالحق صاحب کی جدّت طرازی اور معاملہ فہمی ہمارے ہزاروں خیال پرست رُومانی انشا پردازوں کی مستانہ پروازسے زیادہ مفید اور زندگی بخش ہے۔

سب سے بڑی ضرورت **زبان کو عام فہم بنانے** کی ہے۔ اس کا یہ مدعا نہیں ہے کہ ہر قسم کے مطالب ایسی زبان میں ادا ہوں جسے ہر پرائمری کا طالب علم بآسانی سمجھ سکے۔ ایسی زبان بنانے کی کوشش نادانی بلکہ دیوانگی ہوگی۔ مختلف مطالب ادا کرنے کے لئے مختلف قسم کے الفاظ کی ضرورت پیدا ہوتی ہے۔ آج کل کے بہت سے انگریزی نواز مسلمان نوجوان بھی اُردو کتابوں اور رسالوں کی ستر پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اُن کے لئے *atmosphere* آسان لفظ ہے فضا مشکل، *environment* آسان ہے ماحول مشکل، *contradiction* آسان ہے تضاد مشکل بلکہ مہمل، *Mind* کا ترجمہ وہ بجائے نفس کے "دل" کرنا چاہتے ہیں، *construction* کی اُردو تعمیر کیوں ہو "عمارت" کیوں نہ ہو۔ اِس کی وجہ محض یہ ہے کہ وہ مسٹر جوزف کے دوست ہیں لیکن یوسف صاحب کی شکل دیکھتے ہی مُنہ پھیر لیتے ہیں۔ اُن کی تعلیم و تربیت ایک مغربی ماحول میں ہوئی ہے، اُن کا بھی قصور نہیں، آزادی چھن جانے اور خوددار

نہ رہنے کے یہی تو فوائد ہیں۔ اُدھر سنسکرت پسندوں اور عربی پسندوں کی علمیت غضب ڈھاتی ہے۔ سلیم مرحوم نے تینوں قسم کے اصحاب کی عبارتوں کے نمونے پیش کئے ہیں :۔

مسٹر فلاں فرماتے ہیں :۔

"جب ہم شام کو واک کر کے آئے تو بہت ٹائرڈ معلوم ہوئے فوراً ایک چیئر پر بیٹھ گئے۔ ہماری طبیعت کو سموک کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ میچ نہ تھی۔ سگار کو کینڈل سے لائٹ کر لیا۔ اُس نے مائنڈ پر سوذنگ ایفکٹ کیا۔"

ایک پنڈت جی لکھتے ہیں :۔

"ست سنگتی مُد اور منگل کا مُول ہے اور سنجم نیم جوگ بیراگ وغیرہ سب سادھن پھول ہیں اور سدھی پھل ہے وغیرہ وغیرہ۔"

ایک مولانا رقم طراز ہیں :۔

"تمام نام نہاد علوم و فنون جدل و خلاف و تعمقات وہمیہ و خیالیہ و صناعاتِ تشکیکیہ در مطالب شرعیہ وغیرہ وغیرہ"

سلیم مرحوم اس پر کہتے ہیں کہ "یہ اُردو کی توسیع نہیں تخریب ہے"۔

کیفی صاحب کا خیال ہے کہ اُردو جس خوبی اور عمدگی سے بنی اُسی خوبی اور عمدگی سے اُس کی ساخت کے مطابق اُس میں اب بھی تصرف کرنا اور اُسے ترقی دینا ضروری ہے۔ متقدمین نے تصرفِ لسانی سے کیسے کیسے الفاظ وضع کئے مثلاً بخش سے بخشنا، خرید سے خریدنا، آزمائش سے آزمانا، بدل سے بدلنا۔ اب بھی بے دھڑک لفظ نہ بنانے چاہئیں۔ مثلاً RIDE کے لئے گھوڑانا یا گھوڑاس ہو فضول ہوگا۔ اُدھر صحیح پسندوں کا استبداد ظلم ہے جو مثلاً خودرفتہ اور رہائش اور عرصہ کو غلط بتاتے ہیں۔ اگر سرگزشت درست ہے تو خودرفتہ کو کیوں غلط سمجھا جائے۔ اُردو وہ ہے جو مستعمل ہو خواہ اصل کے خلاف ہو۔ پھر کئی الفاظ جو کسی وہم میں آ کر متروک قرار دیئے گئے اُن کی نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ پر (بمعنی لیکن)، یاں واں (نظم میں)، لیجے دیجے سدا عادی مشکور وغیرہ ان کو خواہ مخواہ کیوں بارہ پتھر باہ[ر] کیا جائے؛

مولانا سلیم نے اپنی مشہور کتاب میں ثابت کر دیا ہے کہ اُردو میں الفاظ سازی کی حیرت انگیز صلاحیت موجود ہے۔ رسالہ ہمایوں کی طرف سے چودہ سال ہوئے اِس مضمون پر سو روپیہ انعام دیئے جانے کا اعلان کیا گیا تھا کہ اُردو ہندوستان کی ملکی زبان کیونکر بن سکتی ہے؛ مولانا مرحوم کا مضمون بہترین قرار پایا۔ اُس میں وہ لکھتے ہیں کہ جس طرح اُردو میں یہ لفظ بنے : باگ ڈور، شادی مرگ، وعدہ خلاف، گھڑچڑھا، گھر پھونک، پت جھڑ، خدا لگتی بات، بالشتیا، گاڑی بان وغیرہ اُسی طرح ہزاروں اور لفظ بھی بن سکتے ہیں زرپھینک، گھر اُجاڑ، تقدیر پلٹ، جی اُچاٹ، کاغذ لب، پگڑی بدل، برقانا (electrify) ابرقانسا (electrocute) سردانا، سرخانا، نکیلنا وغیرہ۔

لیکن اِس کے مقابل میں سینکڑوں بھاری بھرکم الفاظ اور فقرے اور فارسی عربی کی غیر ضروری ترکیبیں ترک کردینی چاہئیں مثلاً علی التواتر، بالالتزام، بہ اقتضائے زمانہ، ازراہِ تعلق، مابہ الامتیاز اور بہت سے اور الفاظ جو ان سے بھی زیادہ دماغ شکن اور خوفناک ہیں۔ یہ مانا کہ ایسی زبان کے استعمال سے تھوڑے لفظوں میں بہت سا مطلب ادا ہوجاتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ اکثر ایسا کیا جائے۔ اگر فقرہ ذرا لمبا ہوجائے تو کیا حرج ہے۔ پڑھنے والا آپ کا مطلب تو بہتر سمجھ لے گا وہ پھر ڈر ڈر کر آپ کو ترچھی نظروں سے دیکھنے پر مجبور نہ ہوگا۔ بعض زبانوں کی ساخت ایسی ہوتی ہے کہ اُن میں الفاظ زیادہ پھیلانے پڑتے ہیں اور اِسی طرح اُس زبان کا حُسن قائم رہتا ہے مثلاً فرانسیسی۔ اُردو کو اِس نقطۂ نظر سے اعتدال کی راہ پر چلنا چاہئے۔

کچھ عرصے سے **مشکل الفاظ لکھنے کا مرض** بعض ادیبوں کے ذریعے سے خوفناک طور پر اُردو کی دُنیا میں پھیل رہا ہے اور ہم میں سے اکثر اُس کا شکار ہو رہے ہیں۔ خود راقم کو اِس کا احساس ہے کہ کچھ عرصہ ہوا اُسے مشکل الفاظ سے پرہیز کرنے میں اتنی دقت نہ ہوتی ہوتی تھی۔ ہمارے اردگرد دن رات موٹے موٹے لفظوں کی بوچھاڑ ہوتی رہے تو قدرتاً ہم بھی گویا ترکی بہ ترکی جواب دینے لگتے ہیں۔ آسان لفظوں سے ناآشنا ہو کر ہم بآسانی انہیں استعمال نہیں کرسکتے۔ پھر آسان لفظوں کا استعمال مشکل اور مشکل لفظوں کا استعمال گویا آسان ہوجاتا ہے لیکن ایسا ہونا ایک غیر فطری امر ہے اور عوام کی عام تعلیم اور آگاہی کے خیال سے نقصان دہ ہے ہم سب کہتے ہیں لائحہ عمل لیکن انصاف سے کہو یہ لفظ تمہارے گلے میں اٹک نہیں جاتا؛ پروگرام اس سے بہتر ہے۔ غالب کے اس شعر کو پڑھ کر کوئی مسکرائے گا کوئی ڈر جائے گا: ؎

سرشکِ سر بصحرا دادہ نور العین دامن ہے
دلِ بے دست و پا اُفتادہ برخوردار بستر ہے

خدا ایسے برخوردار سے ہم سب کو محفوظ رکھے۔ اِسی غالب کے آسان شعروں کو لیجئے کہ سُنتے ہی دِلوں میں اُتر جاتے ہیں: ؎

رات دِن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

کوئی دِن گر زندگانی اَور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

اور سُنو پہلے ہمارے ہاں ایڈیٹر کا لفظ تھا پھر مدیر بنا پھر مدیرِ مسئول کا چرچا ہوا، پھر رئیس التحریر آدھمکے۔ اُردو میں اکثر آوازیں نمی بولی جاسکتی ہیں پھر کیا ضرورت ہے کہ ایکیڈیمی کو اکادمی لکھا جائے اور کلیوپیٹرا کو قلوبطرا۔

اصطلاحات کا سوال دوسرا ہے وہاں ہمیں بہت کچھ مدد عربی فارسی سے لینی چاہئے لیکن اُن کے علاوہ اُردو میں ایک طرف اس کی ضرورت ہے کہ جیسا ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے اُس میں دریا دلی سے دوسری زبانوں سے ضروری الفاظ بجنسہٖ لے لئے جائیں مثلاً اسٹیشن، تھرمامیٹر، ٹکٹ، واسکٹ، اسکیم، ریزولیوشن، کونسل، کیمرہ وغیرہ۔ اور دوسری طرف ایسے الفاظ کو رائج کیا جائے جو دیسی عام فہم ہوں یعنی جو نہ سنسکرت کے لفظ ہوں نہ عربی فارسی کے۔ مسٹر سنہا نے اپنے خطبۂ صدارت میں یہ مفید تجویز پیش کی ہے کہ ایسے الفاظ کا ایک

لغات تیار کیا جائے۔

اُردو کی صحت اور توسیع میں سب کو حصّہ لینا چاہئے۔ دہلی، لکھنؤ، لاہور، حیدرآباد وغیرہ ان سب کا اپنا اپنا مرتبہ اور اپنا اپنا دائرۂ عمل ہے مصنفِ "منشورات" نے اُردو کے لئے پنجاب کے عظیم الشان کام کی تعریف کرکے اُدھر اہلِ زبان کو مشورہ دیا ہے کہ پنجاب کی زبان میں بعض وہاں کی مقامی خصوصیات ہیں آپ اُن پر چیں بہ جبیں نہ ہوں اور اِدھر پنجاب والوں کو یہ زرّیں نصیحت کی ہے کہ یاد رکھو کہ اہلِ زبان ہی سے روزمرہ اور محاورہ سیکھنا اچھا ہے۔ ہاں فن اور قاعدے میں کسی کو کسی پر شرف نہیں۔ اخیر میں دلاسا دیا ہے کہ تنقید سے گھبرانا نہ چاہئے۔ راقم کی رائے میں دوسرے اُمور کی طرح یہاں بھی میانہ روی بہتر ہے اور سُود مند۔ اُردو کے محاورات کا غلط استعمال ہر حال میں غلط ہے لیکن اُدھر بعض عمدہ پنجابی الفاظ یا نئے محاورات کا استعمال ہر طرح نہ صرف جائز ہے بلکہ زبان کی ایک خدمت ہے۔ میرے ایک دہلوی دوست نے پچھلے روز مجھ سے کہا کہ آپ کا لفظ "لسّی" اب ہم بے تکلّف استعمال کرتے ہیں۔

اُردو ہندی کی لسانی توسیع اور مفاہمت کے لئے جیسا کہ مولوی عبدالحق صاحب نے ہندوستانی اکاڈمی کے جنوری ۳۶ء کے جلسے میں اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا "الہ آباد کی ہندوستانی اکاڈمی کو چاہئے کہ وہ "ہندوستانی" میں ایک ایسا رسالہ نکالے جو بغیر کسی تغیّر کے دونوں رسمِ خط میں لکھا جا سکے کہ یہ زبان کی بڑی خدمت ہوگی۔ اِسی طرح وہ اِس زبان میں ایسی ریڈریں تیار کرائے جو دونوں رسمِ خط میں لکھی جائیں اور مدارس میں رائج کی جائیں۔" ابھی زبان ہی ایک نہیں، رسمِ خط کی بحث کیسی؟

یہاں تک لسانی ضروریات کا تذکرہ تھا اس کے بعد اُردو کی **ادبی ضروریات** کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے لئے بزرگانِ سلف نے ادب کا ایک بہت بڑا ترکہ چھوڑا ہے، اُس میں خوبیاں بھی ہیں خرابیاں بھی ہیں۔ ہمارا کام اپنی ضروریات کے مطابق ان کمیوں کو پورا کرنا اور نئی نئی چیزوں کا پیدا کرنا ہے۔ ہماری اکثر پرانی قسم کی غزلوں میں ایک خیالی صنم کے عشق میں بے قرار رہنا، مصنوعی محبت کی نوک جھونک، سانس لینے میں زمین آسمان کے قلابے ملانا، سرد آہیں بھرتے رہنا، ہر گھڑی مقدر کا رونا رونا، کفن سر سے باندھے رکھنا، یہ ایک اُلٹی قسم کی ذہنیت اور ایک غیر فطری اور بیکار اور لغو زندگی کی علامات ہیں۔ "غنچہ چٹکا تو کہا سر میں دھمک ہوتی ہے" اب نہ ایسی خیال آرائی برداشت کی جا سکتی ہے نہ ایسی ناز برداریاں ہو سکتی ہیں۔ اِسی طرح اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ ہم اپنے ملک الشعراء کے اِس قول پر کان دھریں کہ

تدبیر نہ کر، فائدہ تدبیر میں کیا ہے؛ کچھ یہ بھی خبر ہے تری تقدیر میں کیا ہے؛

بلکہ اب ہمیں اپنے "ترجمانِ حقیقت" کی اس ہدایت پر عمل کر دکھانا ہے کہ

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؛

راقم نے سکول کے دنوں میں جب یہ شعر سُنا ؎

جو چمن سے گزرے تو اے صبا یہی کہنا بلبلِ زار سے   کہ خزاں کے دن بھی قریب ہیں نہ لگانا دل تو بہار سے

تو فوراً اپنی تنگ بندیوں کے لئے زارؔ تخلص اختیار کر لیا لیکن جب ذرا ہوش سنبھالا اور دُنیا کا نیا انداز دیکھا تو معلوم ہُوا کہ اب مشرق و مغرب میں بلبلِ زار اور زارِ روس دونوں کا زمانہ ہو چکا ہے۔ ہم ابھی یہی رونا رو رہے ہیں کہ" وہ کونسا غم ہے کہ جو دنیا میں نہیں ہے" اور آہستہ خرام بلکہ مخرام اور وہاں بیل گاڑی کی بجائے موٹر کار اور ہوائی جہاز اور ریڈیو اور کیا کیا کچھ، رگ رگ میں زندگی کا خون دَوڑ رہا ہے ——— دَوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا!

جناب جوش ملیح آبادی خوب لکھتے ہیں" شباب و محبت کا واسطہ اپنے ادبیات میں حیات و بیداری کا خون دَوڑائیے اور وطنِ عزیز کے لئے، دلوں کی طرح دھڑکتے ہوئے زندہ الفاظ کو جوڑ کر ایک نیا باب الہند تیار کیجئے جس کی سُنہری اور بلند محراب کے نیچے سے زندہ کر دینے والے انقلابات کے نقرئی جلوس فوج در فوج اور قطار اندر قطار ہندوستان میں داخل ہونا شروع ہو جائیں"۔

یہ درست ہے کہ" سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا"۔ ہمارے ادب کے چمن میں بجائے بلبل و قمری کے کوئل اور فاختہ کی ضرورت ہے۔ ہندوستانی فضا پیدا کرو، مقامی افسانے لکھو، ہندوستان کے مذاہب کا تذکرہ کرو۔ لیکن ساتھ ہی" گھر سے نکل کے دیکھ ہندوستان والو"۔ دیکھو کہ دُنیا میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ مغرب کی نئی زندگی کو دیکھو، وہاں کے تازہ ادب کو پڑھو، کیونکہ آزادی کی تنظیم کی، منصوبہ بندی کی، اشتراکیت اور عدل و مساوات کی موجیں اُس کے طوفانی سمندروں میں اُٹھ رہی ہیں۔ تم میں بھی نئی زندگی کا احساس پیدا ہوگا تو نئے سے نئے خیال پیدا ہوں گے اور وہ اپنے لئے خود بخود اظہار کے نئے طریقے ڈھونڈیں گے۔ اس طرح ایک نئی طرزِ تحریر، نئے الفاظ اور ایک نیا ادب پیدا ہوگا۔ اور جو خیال ایک صحیح قسم کی زندگی کے اندر سے پیدا ہوگا وہ اپنے لئے مشکل الفاظ نہ تلاش کرے گا بلکہ وہ دل سے نکل کر آسانی سے دِل میں جگہ پالے گا۔ ہمارا مقصد ہونا چاہئے عام لوگوں کی تعلیم و ترقی۔ اِس کے لئے ضرورت ہے اِصلاح شدہ مشاعروں کی، آسان فلمی ڈراموں کی اور رسالوں اور خصوصاً روزانہ اخباروں میں آسان عام فہم زبان میں نئے اصلاحی و انقلابی خیالات کی۔ المعات کیفیات اِن" مجہولات" کی جگہ اگر دل کی دل سے باتیں ہوں، سیدھے سادھے جذبات ہوں، دُنیا کی تازہ ترین تحریکوں کا نقشہ ہو، سائنس کی روز افزوں ترقی کا بیان ہو تو ہماری جاہل ناواقف قوم ادبیات سے کتنا کچھ فائدہ اُٹھائے، پھر ادبیات اُس کی بیداری کا ذریعہ بن جائے اور ایک نئی زندگی کی بنیاد پڑے۔ کہیں کہیں کوئی آواز بلند ہو رہی ہے۔ مغربی ادب کے مطالعے اور اقبال کی حیات انگیز شاعری نے ایک نئے دَور کا آغاز ضرور کیا جس سے بعض نوجوان مصنف اور شعراء متاثر ہوئے لیکن اس کے ساتھ ہی بدقسمتی سے نشاط پسندی اور ایک غلط قسم کی" ٹیگوریت" اور نام نہاد رومانیت نے پھر ہاتھ پاؤں شل کر دیئے۔" تُو دوپٹہ چُن رہی تھی اور میرا دِل دھڑک رہا تھا" یا " اے شاہدِ حقیقی! میں تیرے نورِ جمال سے بے بصر ہو کر افتاں و خیزاں آ رہا تھا" وغیرہ وغیرہ۔ اِس دِل کی دھڑکن اور اس اندھا دُھند

نام نہاد حقیقت پرستی کی روک تھام کی اشد ضرورت ہے۔ فطری خیالات کی اور آسان زبان کی حاجت محض اس لئے نہیں کہ ہماری زبان دوسری زبانوں کا کامیاب طور پر مقابلہ کر سکے بلکہ زیادہ تر اس لئے کہ وہ خود ہمارے لئے مفید ثابت ہو اور ہماری صحیح تعلیم و تربیت کی ضامن بنے۔ پھر کچھ شبہ نہیں کہ دوسرے لوگ اس سے ضرور متاثر ہوں اور دیکھیں کہ کیسے ہم نے اپنی زبان کو اور ہماری زبان نے ہمیں شاہراہِ زندگی پر سیدھے رستے ڈال دیا ہے!

زبان کو آسان بنانے کے سلسلے میں اُردو کی **خطی و طباعتی ضروریات** یعنی لکھائی چھپائی کا مسئلہ حل کرنا ضروری ہے ہمارے حروفِ تہجی وسیع ہیں لیکن اُن میں کئی نئی اصوات یا آوازوں کے اظہار کی دقت ہے مثلاً *small* کو ہم "سمال" یا "اسمال" کیوں پڑھیں؛ "پیاس، دصیان" کی یے پر ایسا نشان کیوں نہ لگایا جائے جس سے اُس کی مخصوص آواز کا اظہار ہو؛ اعراب کی عدم موجودگی اُردو تلفظ میں وہ گڑبڑ مچ رہی ہے کہ خدا کی پناہ۔ جب تک کوئی عربی فارسی ہندی کا عالم نہ ہو جائے ناممکن ہے کہ اُردو کی عبارت کو درست پڑھ سکے۔ کوئی طَلبا کہتا ہے کوئی طُلبا، کوئی نکہت کوئی نُکہت، کوئی مُتَرجِم کوئی مُتَرجَم، کوئی مُعَامِلہ کوئی مُعَابِلہ، کوئی مُسَرِّت کوئی مُسَرَّت اور پھر کسی ناواقف کے سامنے انسٹیٹیوٹ یا کانسٹیٹیوشن کے سے ریل نما الفاظ آجائیں تو اُس کی حالت نہ پوچھیے۔ ایسی ہی ہزاروں اور مثالیں ہیں۔ علاماتِ وقف کے لئے قامہ مفرزہ نقطہ یعنی کامے سیمی کولن فُل سٹاپ وغیرہ ایک مخصوص قاعدے کے مطابق رائج ہونے چاہئیں۔ اب یہ حالت ہے کہ سوائے بعض محتاط مصنفین یا بعض رحمدل کاتبوں کے کوئی نہیں سوچتا کہ الفاظ کے جمِ غفیر میں جو دھکم دھکا ہو کر ایک دوسرے پر گرے پڑتے ہیں بیچارے پڑھنے والے مسافر کا کیا حال ہوتا ہوگا؛ پھر حروف کی اصلاح یا اخراج اور رسمِ خط کی اصلاح کا کٹھن سوال ہے۔ کیا کوئی طریقہ ہے جس سے ہر حرف کی تین تین صورتیں کسی طرح کم کی جا سکیں یا صرف ایک صورت رہ جائے؟

لیکن سب سے اہم اور دشوار مسئلہ لتھو اور ٹائپ کا ہے۔ یہ امر اب مسلمہ ہو چکا ہے کہ اُردو کی طباعت کا طریقہ غایت درجہ ناقص اور نا تسلی بخش ہے۔ کاتب کی نازبرداری اور غلط نویسی پھر پتھر، روشنائی، کاغذ، سنگ سازی کی مشکلیں، بلاکوں کا نہ چھپ سکنا، لاگت زیادہ آنا؛ پوری صفائی نہ ہو سکنا، سرعت کے ساتھ کام کا نہ ہونا یہ اور ایسی ہی بہت سی اور دشواریاں ہیں جن کی وجہ سے اُردو کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے۔ ۱۸۵۰ء سے لے کر آج تک کئی بار ماہرینِ فن نے کوشش کی کہ نستعلیق ٹائپ تیار ہو جائے، بہت وقت صرف کیا، بہت سا روپیہ گنوایا، محنت مشقت کی لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ حال ہی میں حیدرآباد میں نستعلیق ٹائپ یعنی عام اُردو کا ایک خوشنما ٹائپ بن گیا ہے چنانچہ لاہور میں بھی اس کا ایک نمونہ "دورِ جدید" کے دفتر میں موجود ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابھی تک تجارتی طور پر کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس صورت میں فی الحال یا لتھو کا طریقہ باقی رہ جاتا ہے یا نسخ ٹائپ یعنی عربی نما ٹائپ جس میں ہمارے ہاں امتحانوں کے خوفناک پرچے چھپتے ہیں۔ خود نسخ ٹائپ کچھ اتنا ڈراؤنا نہیں جتنا کہا جاتا ہے کہ ہے۔ اس میں شبہ نہیں

نستعلیق خط زیادہ خوبصورت ہے لیکن کیا کیا جائے نری خوبصورتی کو عمر بھر کے لئے دل دینے سے دُنیا کے کام نہیں چلتے۔ اِس کے علاوہ
نئی بات سے ہمیشہ جی گھبراتا ہے اس لئے ہم نسخ کو پسند نہیں کرتے لیکن اگر ہم ترقی کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں قدامت پسند نہ بننا چاہئیے بلکہ ضرورت
وقت کے مطابق اپنے رویے کو تبدیل کرنے پر تیار ہو جانا چاہئیے۔ ذرا مسلمانوں کی خطاطی کی تاریخ پڑھیئے۔ پہلے کوفی خط رائج تھا لیکن عہد
عباسیہ میں جب توسیعِ علم ہوئی تو اصلاح کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اُس وقت کے مسلمان اتنے قدامت پسند نہ تھے جتنے ہم اِس جدت
طراز زمانے کے رہنے والے۔ چنانچہ خطِ نسخ ایجاد ہُوا، عرصے تک دونوں کوفی اور نسخ خط رائج رہے یہاں تک کہ بتدریج نسخ خط عام طور
پر اختیار کر لیا گیا۔ مسلمانوں میں خطاطی کو کیوں ترقی ہوئی یہ بھی دلچسپ بات ہے۔ موسیقی منع ہوئی تو اُنہوں نے قرآن کو خوش الحانی سے پڑھنا
شروع کیا، تصویر کشی منع ہوئی تو اُنہوں نے عربی نقش و نگار اور خوش نویسی کی طرف توجہ کی یہاں تک کہ خوش نویسی ایک اعلےٰ درجے کا فن بن
گیا۔ خطِ نستعلیق غالباً چودھویں صدی کے شروع میں ایجاد ہُوا اور مقبولِ عام ہُوا۔ لیکن نستعلیق میں گولائی بہت ہے اور جوڑ مختلف طریقوں
پر ملتے ہیں اور وہ محض ایک مخصوص قاعدے کے تابع نہیں اِس لئے اُس کا ٹائپ بننا بہت مشکل ہے۔ اِن حالات میں گو نستعلیق خط اور
نقوش بعض چیزوں کے لئے برقرار رکھنا نہ صرف جائز بلکہ خوبصورتی اور خوبی کا باعث ہوگا لیکن ابھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُردو میں طباعت کا
کام زیادہ تر نسخ ٹائپ کے ذریعے سے کرنا لتھو سے بہت زیادہ مفید رہے گا۔

اخیر میں ہمیں اُردو کی **اشاعتی ضروریات** کی طرف توجہ کرنی ہے۔ نشر و اشاعت کے بغیر آج کل دُنیا کا کوئی کام نہیں چلتا۔ مجھے
یاد ہے کہ چند سال ہوئے میں نے علامہ اقبال سے شکایت کے طور پر کہا کہ آج کل کی دُنیا میں بغیر پروپیگنڈا کے قدر نہیں ہوتی۔ اِس پر
اُنہوں نے مسکرا کر جواب دیا کہ "تم بیچارے انسانوں کی کیا شکایت کرتے ہو خود خالقِ اکبر سب سے بڑا پروپیگنڈا کرنے والا ہے، کائنات ساری
کی ساری محض اُس کے پروپیگنڈے کی ایک صورت ہے کہ ایک ایک چیز سے اُس کی جمالی و جلالی شان ظاہر ہوتی ہے"۔ آج کل اگر کوئی یہ
سمجھے کہ میں نیک ہوں اور قابل ہوں یا میری کوئی چیز نہایت قابلِ قدر ہے اور یہ سمجھ کر وہ گھر میں بند ہو کر بیٹھ رہے تو دُنیا ساری کی
ساری اُس کی یا اُس کے کام کی قدر کرنے کو اُس کے گھر میں آ حاضر نہ ہوگی۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہم دُنیا میں ترقی کریں اور زندگی کی
دوڑ میں دوسروں سے پیچھے نہ رہ جائیں تو لازم ہے کہ ہم مِل کر ترقی کی تجاویز سوچیں۔ مِل کر محنت اور توجہ سے مفید کام کریں اور پھر نشر و
اشاعت سے اپنے آپ کو اور دوسروں کو دکھائیں کہ ہم کیا کچھ کر رہے ہیں۔

ہمارے پاس ادب کا جو ذخیرہ موجود ہے سب سے پہلے اُسے بہترین شکل میں پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ اُردو کی بہترین تصنیفات
کو مختلف قسم کے سیریز یا سلسلوں میں خوبصورت اور ارزاں کر کے شائع کرنے کی ضرورت ہے۔ اِس کی بھی ضرورت ہے کہ اُردو کی تمام
مطبوعات کی ایک مکمل فہرست مضمون وار شائع کی جائے تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ ہمارے پاس کیا کچھ ہے اور کیا نہیں ہے؛ اِس کے

بعد یہ دیکھنا ہے کہ دُنیا کی بہترین مشہور کتابوں کو اُردو میں منتقل کر دیا جائے اور ہمارے انگریزی کے عاشق زار نوجوانوں کو ترغیب دی جائے کہ وہ اُردو پڑھیں اور اُردو ادب سے دلچسپی لیں - یہ ایک بڑی اہم ضرورت ہے جس کی طرف پوری توجہ کرنی چاہئے۔ ہمارے اکثر نوجوان اپنی بیشتر چیزوں سے یا ناواقف ہیں یا بلاوجہ اُنہیں حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ والدین کا فرض ہے کہ وہ بچپن ہی سے ان مغرب زدہ نوجوانوں کی گھٹی میں اُردو کا ایک جزو ڈال دیں تاکہ بڑے ہو کر وہ اپنی روایات سے اجنبی اور متنفر نہ رہیں۔

اِس بات کی پوری کوشش کی جائے کہ ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں میں اُردو کا شعبہ کھولا جائے اور اُسے کما حقہٗ فروغ دیا جائے ملک میں جابجا گشتی کتب خانے قائم ہوں تاکہ ایک طرف اگر اُردو زبان اور اُردو ادب ہردلعزیز ہو تو دوسری طرف ہر کہ وکہ کی شائستگی اور تعلیم و ترقی کا رستہ نکل آئے۔

مشاعرے اُردو زبان کا ایک خاص اِدارہ ہیں ہندی والے بھی اِس کی نقل اُتار رہے ہیں۔ مشاعروں کی اصلاح کی طرف خاص توجہ کرنی چاہئے، اُن کے ربط و ضبط سے ہم اُردو کو اور زیادہ ہردلعزیز بنا سکتے ہیں لیکن یہ لازم ہے کہ فرسودہ و پامال اور اخلاق سوز مضامین سے پرہیز کیا جائے اور امید افزا اور زندگی پرور خیالات کو رواج دیا جائے۔

مستند، عام فہم اُردو سیکھنے سکھانے والی کتابیں شائع ہونی چاہئیں نہ صرف ایسی جن کے ذریعے سے مبتدی زبان کو آسانی سے سیکھ سکیں بلکہ ایسی بھی جن کی مدد سے اخبار نویس اور انشا پرداز بلکہ انگریزی زدہ لوگ بھی اُردو میں آسانی سے اپنے اپنے مطالب ادا کر سکیں۔ مثلاً الفاظ اور محاورات اور اصطلاحات کو الگ الگ مضمون وار جمع کیا جائے تاکہ بوقت ضرورت اُنہیں استعمال کیا جا سکے۔ آج کل کی مصروف دُنیا میں اکثر لوگوں کو اتنی فرصت نہیں ہوتی کہ زبان پر پُورا عبور حاصل کرنے کے لئے وہ عمر کا ایک حصّہ وقف کر دیں۔ زبان میں نامانوس الفاظ کے رواج کا بھی ایک سبب یہ ہے کہ ہم میں سے اکثر اپنے محاوروں اور آسان لفظوں سے کافی واقفیت نہیں رکھتے۔

بہت سی باتیں رہ گئی ہیں لیکن یہاں گنجائش نہیں کہ سب کا ذکر کیا جائے۔ نشر و اشاعت کے ضمن میں ایک آخری بات قابلِ توجہ ہے اور وہ ہے اُردو زبان کی گذشتہ اور موجودہ حالت کے متعلق صحیح اور مکمل معلومات جن سے اُس کے مستقبل کا ایک مناسب پروگرام بنایا جا سکے۔ اُردو زبان کے بہت بڑے محسن مولوی عبدالحق صاحب ستائش اور شکریے کے مستحق ہیں کہ اُنھوں نے "جائزۂ زبانِ اُردو" کے نام سے اِس نہایت ضروری کام کو شروع کر دیا ہے۔

یہ ہے چند لفظوں میں اُردو زبان کی ابتدا اُس کی حالت اور اُس کی موجودہ ضروریات!

سو یہ ہے جو ہمیں کرنا ہے لیکن کرے کون اور کس طرح ؛ یہ نہیں کہ سمجھتا کوئی نہیں، یہ نہیں کہ کرتا کوئی نہیں۔ یہ نہیں کہ ہو کچھ نہیں

بعض شعبوں میں بہت اچھا کام ہو رہا ہے، بعض میں خاصا، بعض میں غیر تسلی بخش اور بعض میں صفر! بعض غیر ضروری کام ہو رہے ہیں اور بعض ضروری کام برسوں سے یا ادھورے پڑے ہیں یا کسی کا اُن کی طرف دھیان ہی نہیں۔ گذشتہ سالوں میں کئی بار تعاون کی کوششیں ہوئیں، آل انڈیا اُردو کانفرنسیں منعقد ہوئیں، ریزولیوشن منظور ہوئے۔ خواجہ حسن نظامی صاحب نے ایک شاندار جلسہ ۳۰ راپریل ۱۹۳۴ء کو دہلی میں کیا اور ملک میں جابجا اُردو مرکز قائم کرنے کی ٹھانی لیکن محض ایک باہمت انسان سے کتنا کچھ ہو سکتا ہے جب لاکھوں کان میں تیل ڈالے پڑے اُونگھ رہے ہوں اور جو چند کام کرتے ہوں اُنہیں دوسرے کام کرنے والوں سے بجز نکتہ چینی کے کچھ واسطہ نہ ہو! غرض کچھ نہ کچھ ہو رہا ہے لیکن جیسا کہ مولوی عبدالحق صاحب، اُس فاضلانہ خطبے میں جو انہوں نے ہندوستانی اکاڈمی کے سامنے پڑھا لکھتے ہیں "اِس زبان میں جو ادارے زبان وادب کی ترقی واشاعت کا کام کر رہے ہیں اُن کا کام کسی اُصول پر نہیں ہو رہا۔ گویا ہم اندھیرے میں چاند ماری کر رہے ہیں لگا تو تیر نہیں تُکّا" پھر فرماتے ہیں کہ "اِن اداروں میں باہمی کوئی اتحاد اور ارتباط نہیں ہے، ہر ایک نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنا رکھی ہے۔ جب مقصد ایک ہے اور کام ایک ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم کبھی کبھی سر جوڑ کر نہ بیٹھیں، اپنے کاموں پر نظر ڈالیں اور آئندہ کے لئے اپنے کام کا کوئی ایسا نقشہ تیار کریں جو حقیقی طور پر ہمارے ادب کے حق میں مفید ہو"

فرانس کی اکاڈمی جو فرانسیسی زبان کی توسیع وتصحیح کے لئے مدتوں سے بے حد مفید کام کر رہی ہے دُنیا بھر میں مشہور ہے۔ سر تیج بہادر سپرو نے اسی اجلاس میں حاضرین کو بتایا کہ جون ۱۹۳۵ء میں جب اُنہوں نے اکاڈمی کے تیسرے صد سالہ جلسے میں شرکت کی تو انہوں نے دیکھا کہ "اس اکاڈمی کے کتب خانے اور نمائش کے دیکھنے کے لئے ایک دِن میں ایک لاکھ سے زیادہ آدمیوں نے ٹکٹ خریدے تھے"۔ اور یہ کہ "فرانس کے ایک ایک مرد وزن کو اکاڈمی کے وجود و ہستی پر ناز تھا۔"

انجمن ترقیٔ اُردو، جامعۂ عثمانیہ، دارالمصنّفین، جامعۂ ملّیہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، انجمن حمایت اسلام لاہور، خواجہ حسن نظامی صاحب کا دفتر، اردو کے رسالے اور اخبارات، قسم قسم کی علمی انجمنیں اور ادبی سبھائیں اور ملک کے مختلف اطراف میں پھیلے ہوئے اُردو کے شیدائی! کیا یہ سب ایک عظیم الشان سلسلے میں منسلک نہیں ہو سکتے۔ بلکہ حیرت ہے کہ آج تک یہ کیوں منظم نہیں ہوئے؛ شاید اس کا یہ جواب ہے کہ اُردو سے زیادہ دلچسپی مسلمانوں کو رہی ہے اور یہ لوگ کچھ عرصے سے تنظیم اور باہمی اتحاد کے ناقابل ہو رہے ہیں۔

اُردو نری مُسلمانوں کی زبان نہیں لیکن مسلمانوں پر اس کی ضروریات کے پورا کرنے کی زیادہ ذمہ داری ہے۔ کیا ہم یہ الزام سُن کر خاموش رہیں گے کہ ہم تنظیم نہیں کر سکتے؛ کیوں نہ آج ہی اس کی ابتدا کردیں؛ اُردو کی انجمنوں اور دوسرے اداروں کا ایک دائرہ ہو جس کا مرکز انجمن ترقیٔ اُردو قرار دی جائے حقیقت یہ ہے کہ یہی اُردو کی صدر انجمن کہلانے کی مستحق ہے۔ ملک کے تمام دوسرے علمی وادبی وتعلیمی اداروں کو جہاں تک اُردو کی ترقی وتوسیع کا تعلق ہے اس مرکزی انجمن سے ملحق ہونا چاہئے۔ اِس انجمن کی خصوصی سب کمیٹیاں ہوں اور ہر صوبجاتی انجمن یا دوسرے اداروں میں بھی اسی نوع کی سب کمیٹیاں ہوں جن کے سپرد زبان و اشاعتِ زبان کے مختلف شعبے ہوں۔ یہ کمیٹیاں ہوں صحتِ زبان کی، اشاعتِ زبان کی، مشاعرہ کمیٹی، فلمی کمیٹی، ریڈیو کمیٹی، کمیٹیاں اخبارات کی، رسائل کی، اعداد وشمار کی، اصطلاحات کی وغیرہ وغیرہ۔ یوں تقسیم کار بھی ہوگی اور تعاون بھی اور بہت سے

قابل اشخاص ایک حد تک ایک دوسرے سے الگ الگ رہ کر بغیر رشک و حسد کے جو ہماری ایک قومی خصوصیت سی ہو گئی ہے ذمہ داری کے ساتھ کام کر سکیں گے بلکہ اگر کسی جگہ کسی ناگزیر وجہ سے مل کر کام نہ بھی ہو سکے تو ممکن ہے کہ کوئی ایک شخص مختلف اصحاب کو اس طرح علیحدہ علیحدہ کام کرنے کی ترغیب دے سکے کہ اس سے بغیر تعاون کے تقسیم کار کی صورت پیدا ہو جائے۔ سال میں ہو سکے تو دو بار ہر صوبے کا ایک سالانہ جلسہ ہو اور ایک سالانہ اُردو کانفرنس مرکزی انجمن کے ماتحت مختلف مقامات میں ہوا کرے جس میں ایک عام اجلاس ہو اور ایک مجلسِ شوریٰ کا خاص اجلاس۔ صدر انجمن کو اطلاعات ملتی رہیں اور صدر دفتر سے ہدایات و اشارات جاری ہوتے رہیں گو عموماً بہ حیثیتِ مجموعی ہر صوبہ یا علاقہ ایک حد تک خود اپنے کام کا ذمہ دار ہو۔

اِن تمام باتوں کا ماحصل یہ ہے کہ

اُردو اِس ملک کی عام زبان ہے اور اُسے ایسا ہی بننا چاہئے۔

اُردو نے گذشتہ صدی میں خاصی ترقی کی ہے جو قابلِ فخر ہے۔

لیکن ابھی ترقی کی بہت کچھ گنجائش ہے، ابھی ہمیں ایک حیات انگیز ادب پیدا کرنا ہے۔

اِس میں اور بہت سی کمیاں ہیں: قرأت کی، طباعت کی، انہیں پُورا کرنا ہے۔

اپنوں میں، غیروں میں، ہر کہیں اِس کی نشر و اشاعت کرنی ہے۔

اور اگرچہ الگ الگ بہت کچھ ہوتا رہا اور ہو رہا ہے لیکن اب اشد ضرورت کام میں تطابق اور تنظیم کی ہے۔

آج شمال جنوب سے ملتا ہے، پنجاب حیدرآباد سے، وہ پنجاب جہاں کے لوگوں میں صدیاں ہوئیں اُردو کا چرچا تھا، وہ حیدرآباد جہاں صدیاں ہوئیں بادشاہوں نے اُردو کی سرپرستی کی، پنجاب جہاں کے لوگوں کی زندگی کا تار و پود آج بھی اُردو ہے، حیدرآباد جہاں کے دُوراندیش حکمران نے آج اُسے ایک علمی مرتبہ عطا کر کے اِس قابل بنا دیا ہے کہ اگر اہلِ اُردو نے ہمت دکھائی تو ایک روز اُن کی زبان دنیا کی عظیم ترین زبانوں کے پہلو بہ پہلو بیٹھنے کا حق حاصل کر لے گی۔

ہماری حالت اُمید افزا ہے، صرف ہمیں تنظیم کی ضرورت ہے۔ اُردو جسے دس گیارہ کروڑ لوگ بولتے اور سولہ سترہ کروڑ سمجھتے ہیں، اُردو غالب اور انیس اور سرشار اور آزاد اور اقبال کی زبان، کیا ہم اُسے کمزور اور ملیامیٹ ہو جانے دیں گے؟ ہرگز نہیں بھائیو! اپنی روایات اور ایک باوقار زندگی کو قائم رکھنے کے لئے اپنی زبان کو پرانی بنیادوں پر قائم رکھ کر اُن پر ایک نئی سے نئی عمارت بناتے چلے جاؤ۔ ہندی والوں کا گھر نہ بگاڑو اپنا گھر سنوارو۔ کیا حرج ہے دو خوبصورت گھر پاس پاس ہوں اگر ایک نہیں ہو سکتا۔ محنت، تعاون، احتیاط، مدافعت، اُمید، ہمت اِن کو ساتھ رکھو ——— خود اپنے آپ کو عزت کے قابل بناؤ تو ہر ایک آپ سے آپ تمہاری عزت کرے گا!

بشیر احمد

ترقیٔ اُردو

نہیں احساس کیا احباب کو موجودہ حالت کا
ہے رفتارِ زمانہ میں چلن بجلی کی سُرعت کا

زمانہ جدّت آئیں ہے، زمانہ جدّت آگیں ہے
بنا ہے بانگِ بے ہنگام افسانہ قدامت کا

مناسب جو کبھی پوشاک تھی اب ہے وہ ناکارہ
یہی عالم مہذّب قوم کی ہے ہر اِدارت کا

جو قومیں زندہ ہیں پابندِ تغییر و تمدّن ہیں
رہے گا اُن کے سر پر بوجھ آئینی اطاعت کا

طبیعی زندگی جس طرح ہے تغییر کا معرض
ادب پر بھی ہے عاید حکم تغییر اور جدّت کا

جو کل تھا وہ نہیں ہے آج، پھر کیسی ہے یہ کل کل
کہ ہم اُس کو نہ مانیں گے ہو جس میں رنگ جدّت کا

جو ہونا تھا ہُوا - اچھا ہُوا - اب اُس کو جانے دو
جو آخر بیں ہے انساں اُس کے سر سہرا سعادت کا

کبھی اُردو زباں کی آپ نے تاریخ بھی دیکھی
کہ تھا معیار کیا پہلے، اور اب کیا ہے فصاحت کا

قدامت کے اگر ہو مدّعی تو شوق سے بولو :
تجگہ" کو "جاگہ" اس میں کیا" ہمن کوں محل" حجت کا

کرو" باتاں سجن سیں" جس طرح اسلاف کرتے تھے
کرو" انجواں" سے دریا برد سارا ملک بھارت کا

بہت اچھا ہُوا، جو کچھ ہُوا ہے اگلے وقتوں میں
سزاوارِ اہانت ہے نہ مستوجب شکایت کا

مگر دَوراں کا دردِ سر یہ کس کے ماتھے جائے گا
تغیّر ہو چکا ہے، ہو رہا ہے، کس قیامت کا

وہ احساسات کے بندے تھے، ہم کو کام کرنا ہے
یہی ہے امتیاز اُن کی، ہماری ذہنی حالت کا

وہ اپنے وقت میں جو کہہ گئے، ہم کو ہے فخر اس پر
سُخن تھا اُن کا عکس اُس وقت کی موجودہ حالت کا

کہیں یہ دُھن سمائی کشف اور قاموس لے بیٹھے
سبق رٹنے لگے اعراب کی تحقیق و صحت کا

سکون و کسر سے زیر و زبر عالم کو کر ڈالا
رہا مسلک یہی ہر اجتہاد آئیں کی اُمّت کا

نہ سمجھے لفظ جو اُردو میں آیا ہو گیا اُردو
جنچا اُن کو نہیں موتی یہ "دریائے لطافت" کا

کٹھالی میں ہے ملک اِس وقت، اُردو بھی اسی میں ہے
وہی ہو کر رہے گا حکم جو ہوگا مشیّت کا

بہت نازک ہُوا کرتا ہے ایسا وقت قوموں کو
نہیں باتوں سے چلتا کام ہے یہ موقع ہمّت کا

نظر اُس کی رہے اِس پر جو وقت اب آنے والا ہے
لیا ہے اپنے ذمے جس نے فرض اُردو کی خدمت کا

کریں کیا ہو گئی ہے کچھ سے کچھ صورت زمانے کی / نہ اطمینان اگلا سا، نہ ہے عالم فراغت کا

"یہ ہے نا اہل" اسے اُردو سے مطلب؟ کیوں سکھاتے ہو؟ / عمل اور قول ایسا تھا کبھی اہلِ قدامت کا

یہاں اب سارے ہندستان کو اُردو سکھانا ہے / نہیں یہ ایک دو کا کام، ہے ساری جماعت کا

کبھی دل کے پھپھولے پھوڑنے سے شغل رہتا تھا / ہمارے سر پہ بوجھ اب آ پڑا ہے کس قیامت کا

زباں کی وسعتیں پہنائے عالم سے فزوں تر ہیں / بنا پر اس کی قایم قصر ہو علم اور حکمت کا

زباں ہے ترجماں علم و تجارب اور تخیّل کی / ہے وسعت اُن کی معیارِ مسلّم اُس کی وسعت کا

زباں وہ کیا جو کر دے ذہنیت کو پست اور عاجز / شعور اور مدرکہ پر ڈال دے پردہ جہالت کا

اگر تبدیلیاں اُس میں ہوئی ہیں اور بھی ہوں گی / جب ایسا ہو چکا ہے تو یہ ماتم کیا ہے جدّت کا

وہی تھی کیا زبانِ ذوق و آتش، ناسخ و مومن / چمن جس میں کھلایا میر اور مرزا نے جودت کا

نہ وطواط اور سکّاکی کے وہ اندھے مقلد تھے / چلن "خذ ما صفا" کا رُکن تھا اُن کی عقیدت کا

سبق اصلاح کا ہم کو بزرگوں نے سکھایا ہے / جو کوئی معترض ہو اس پہ آئینہ ہے عبرت کا

جو وہ دو گز بڑھے، دس گز بڑھو یہ تم کو لازم ہے / سپوتوں کے کرو کام اور تمغا لو سعادت کا

عوارض نو بہ نو تجدید کا پیغام لائے ہیں / عبث جھگڑا اُٹھانا ہے قدامت اور جدّت کا

خدا نے اُس کی حالت کو نہ بدلا ہے نہ بدلے گا / نہیں جس قوم کو دھیان آپ ہی تغییرِ حالت کا

زباں ہیں جس کو وقعت کُلّیہ کی ہو گئی حاصل / وہی اِک قاعدہ موزوں ہے قانونِ قدرت کا

قواعد کون سے ہیں وہ؟ یہی تحقیق کرنا ہے / ہر اِک قانون بن سکتا نہیں قانونِ قدرت کا

ہے یہ بھی دیکھنا، کرنا ہے کیا آئندہ نسلوں کو / مشاغل اُن کے کیا ہوں گے؟ تقاضا کیا طبیعت کا

غرض جو کچھ بھی ہو گا، ہو، مگر یہ دھیان رکھنا ہے / کہ حلیہ ہی بگڑ جائے نہ اُردو کی لطافت کا

جو اُردو پن ہی زائل ہو گیا، کیسی وہ پھر اُردو / یہ سب کچھ سوچنا ہے فرضِ اربابِ لیاقت کا

رہے اُردو کی اُردو، کام بھی نکلیں سبھی اُس سے / نظر ہے ان اصولوں پر، نہ ہو اندیشہ بدعت کا

بزرگوں کے بنائے کو بڑھانا کام ہے اُن کا / یہی ہے فرضِ اُولیٰ اور تقاضا بھی ودیعت کا

مفصل عرض ہو گا اہلِ اُردو کو جو کرنا ہے / ذرا موقع ملے "کیفی" کو اطمینان و فرصت کا

(منقول از اُردو)

کیفی

عشق و محبّت کا مشرقی تصوّر

اُردو غزل کا تمدّنی پس منظر

ذیل کا مقالہ بزمِ فروغِ اُردو اسلامیہ کالج لاہور کے ایک جلسے میں جو ڈاکٹر سید اللہ صاحب ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی، ڈی۔ایس۔سی کی صدارت میں منعقد ہُوا، پڑھا گیا تھا۔ یہ ایک بالکل نئی چیز ہے جس میں پرانے غزل گو شعرا کے کلام کا تعلق ان کے معاشرتی ماحول کے ساتھ بہت وضاحت کے ساتھ دکھایا گیا ہے اور ساتھ ہی اس امر پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ جذبۂ عشق کے متعلق مشرقی احساس کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں۔

"ہمایوں"

آغازِ کلام میں تشریحِ مطالب کے لئے دو لفظ مجھے آپ کی خدمت میں عرض کرنے ہیں۔ بظاہر اس مقالے کا موضوع اتنا وسیع ہے کہ نہ تو محدود وقت اور نہ میری محدود استعداد صحیح معنوں میں اس سے عہدہ برآ ہو سکتی ہے۔ اس مضمون پر بحث کرنے کے لئے مشرق و مغرب کی بہت سی زبانوں کا علم ضروری ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہر قوم کی لطیف ترین عشقیہ حسیات کا سرمایہ دراصل اس کی شاعری میں محفوظ ہوتا ہے جس کے مطالعہ کے بغیر عشق و محبت کے متعلق اس قوم کا صحیح تصور معلوم نہیں ہو سکتا۔ میں السنۂ شرق و غرب سے کماحقہ واقف نہیں ہوں مشرقی زبانوں سے جو مثالیں میں لوں گا وہ بیشتر عربی فارسی اور اُردو سے ماخوذ ہوں گی۔ اسی طرح مغربی ادب سے میری واقفیت محض انگریزی زبان کے ذریعے سے ہے۔ بایں ہمہ میں سمجھتا ہوں کہ وہ چند عام اور اصولی نکات جو عشق و محبت کے مسئلے میں مشرق و مغرب کے درمیان ایک حدِ فاصل قائم کئے ہوئے ہیں اس محدود میدان میں بھی کافی وضاحت کے ساتھ نظر کے سامنے آجاتے ہیں۔ یوں تو خود ایشیا میں اور مغربی یورپ میں بھی ہر ملک جنسی معاملات کے متعلق ایک الگ رویّہ رکھتا ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو ہر فردِ بشر کے دِل میں محبت کا تصور جُدا ہے مگر ان شخصی اور ملکی اختلافات سے قطع نظر کر کے اگر ذرا غور کریں تو چند ایسے بنیادی حقایق نگاہِ تحقیق کو ملتے ہیں جو اس بارے میں مشرق و مغرب کو بحیثیتِ مجموعی ایک دوسرے سے قطعاً ممتاز کر دیتے ہیں۔

اسی سلسلے میں ایک اور بات بھی ملحوظِ خاطر رہے تو بہتر ہے۔ عمرانیات میں اور عمرانیات کے بھی ایک ایسے شعبے میں جس کا تعلق متعلق جذبات اور وارداتِ قلبی جیسی سیال چیز سے ہے تجربی علوم کے قوانین کی قطعیت اور ہمہ گیری ڈھونڈنا بے کار ہے۔ کسی عام طرزِ معاشرت کی تشریح و تعبیر کے لئے جو عام اصوُل وضع کئے جاتے ہیں۔ ان کی صحت کو اُسی معیار سے جانچنا جس سے سائنس

کے قوانین جانچے جاتے ہیں صحیح نہیں ہوتا۔ میں نے عشق و محبت کے مشرقی تصوّر کی شرح کرنے میں اقوامِ مشرق کے سوادِ اعظم کے جذبات کو ملحوظ رکھا ہے۔ کسی مجہول یا بے حد کمیاب نقطۂ نظر سے قدرۃً میں نے اعتنا نہیں کیا اس لئے کہ شاذ مستثنیات کی بنا پر نہ تو کوئی عام اصُول قائم ہو سکتا ہے اور نہ کسی کلیے کی صداقت ہی میں فرق آتا ہے۔ اس کے برعکس جن بنیادی حقائق سے میں نے یہاں بحث کی ہے ان کا اطلاق کم و بیش تمام مشرقی ممالک پر ہوتا ہے البتہ اس ضمن میں زمانے کی تخصیص اگر کردی جائے تو مفید ہوگا اس لئے کہ تاریخ انسانی کا ہر عہد مذہبی اور معاشرتی حقائق کے متعلق ایک نیا انقلاب ضرور اپنے ساتھ لاتا ہے چنانچہ مشرقی تہذیب کا جائزہ لیتے ہوئے یہ مقالہ گذشتہ دس بارہ صدیوں کی مدت تک محدود رہے گا اگرچہ اس سے پیشتر کی مشرقی تہذیب کی طرف اشارہ کرنا بھی بعض جگہ ضروری ہوگا۔ بخلاف اس کے یورپ کی تہذیب چونکہ ابھی نسبتہً نو عمر ہے اس لئے میں زیادہ تر گذشتہ دو تین صدیوں کی یورپین تحریکات کے ذکر پر اکتفا کروں گا۔

عشق اپنی اصل کے اعتبار سے خواہ کتنا ہی مفرد اور سیدھا سادھا جذبہ ہو اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام مہذب بلکہ نیم مہذب اقوام میں بھی یہ ایک مرکب جذبہ بن جاتا ہے اور اس کے ساتھ بہت سے معاشرتی، اخلاقی، مذہبی اور روحانی احساسات شامل ہو جاتے ہیں اسی وجہ سے اس کے مظاہر کی نوعیت، رسم و رواج، طرزِ معاشرت بلکہ بعض دفعہ آب و ہوا کے اختلافات سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ مشرق میں اپنے حالاتِ گرد و پیش کے باعث اس جذبے نے کیا صُورت اختیار کی اس کو واضح کرنے کے لئے مجھے نفسیات کی ایک اصطلاح سے مدد لینی پڑے گی۔

جدید نفسیات کا ایک اہم اور دلچسپ مسئلہ وہ ہے جو انسان کی جبلّت، جذبات اور اُس کے تمام ذاتی خصائص سے بحث کرتا اور ساتھ ہی اُن تغیّرات و تحوّلات پر روشنی ڈالتا ہے جو تجربے کی بنا پر ان ذاتی خصائص میں رونما ہوتے ہیں۔ ہماری تشکیل عادات، تعلیم و تعلّم، ترقی و تنزّل سب کا سُراغ یہیں پہنچتا ہے۔ کوئی جبلّت یا جذبہ خواہ وہ کتنا ہی اساسی ہو ان تغیّرات کے عمل سے محفوظ نہیں رہتا۔ ان تغیّرات کی ایک صُورت بہ اصطلاحِ نفسیات یہ ہے کہ ایک طبعی جواب ایک غیر طبعی مہیّج سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ یعنی کسی قدرتی عمل کو اپنے ظہور کے لئے طبعی تحریک نہ ملی تو اُس نے کوئی غیر طبعی تحریک پیدا کر لی۔ مثلاً عشق میں ناکامی ہوئی تو خدا سے لو لگا لی۔ سرفروشی و فداکاری کے وہی جذبات قائم رکھے مگر ان کا محرک اب خدا کو قرار دیا۔ اب خدا کو نفسیات کی اصطلاح میں ہم ایک "عوضی مہیّج" کہیں۔ ہمارے ذاتی حالات یا ہمارا معاشرتی ماحول واقعی مہیّج کو غائب بھی کر دے۔ تب بھی جذبے کا قائم رہنا ممکن ہے اس لئے کہ عوضی مہیّج واقعی مہیّج کے طور پر جذبے کا محرّک ہو سکتا ہے۔

اس تشریح کے بعد اس حقیقت کا مفہوم شاید کسی حد تک قابلِ فہم ہو کہ مشرق کی عشقیہ شاعری کا بیشتر حصہ یا تو عوضی مہیّجات کی تاثیر پر مشتمل ہے اور یا ان عوضی مہیّجات کی تحریک سے پیدا ہُوا ہے۔ مشرق و مغرب میں عشق کے تصوّر کا فرق بڑی حد تک اسی وجہ سے پیدا ہوا۔ خود یہ وجہِ امتیاز کیوں پیدا ہوئی، اس کے لئے ہمیں مشرقی اور مغربی انسان کی عمرانی زندگی پر ایک غائر نظر ڈالنی چاہئے۔

انسان کی زندگی کے دو رُخ ہیں شخصی اور جماعتی۔ جماعتی زندگی کے لئے انسان مختلف زمانوں اور مختلف ممالک میں مختلف عمرانی ادارے مرتا رہا ہے جن میں اس کی اجتماعی زندگی صورت پذیر ہوتی ہے۔ مغرب میں انسان کی اجتماعی زندگی کا ادارہ قوم ہے۔ قوم کی زندگی قائم رہتے س کی اجتماعی زندگی بھی قائم رہتی ہے۔ اس کے ہر ایسے فعل پر جو قومی مفاد کے خلاف ہو سختی سے باز پُرس کی جاتی ہے لیکن اس کے برعکس ی خانگی زندگی میں وہ بڑی حد تک آزاد ہے اس لئے کہ باز پُرس کرنا سوسائٹی کا کام ہے اور سوسائٹی صرف انہیں افعال پر حد لگاتی ہے جن ے جماعتی نظام میں انتشار پیدا ہونے کا احتمال ہو۔ مشرق میں جماعتی نظام کی بنیاد "قوم" کے تصور پر قائم نہیں۔ یہاں اجتماعی زندگی کا ادارہ ناندان ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ مغربی ممالک میں خاندان کو کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ مراد صرف یہ ہے کہ وہاں اجتماعی زندگی ے شیرازے کا قیام خاندان پر منحصر نہیں ہے۔ ایک شخص خاندان سے الگ ہو کر بھی جمہور کی نظروں میں معزز اور صاحب اقتدار رہ سکتا ہے ہو مشرق میں جو شخص خاندان سے گیا وہ جماعتی زندگی سے گیا۔ کیونکہ خاندان ہی جماعتی زندگی کی تنہا صورت ہے۔ یہاں خاندان بارہا کئی ی سو افراد پر مشتمل ہوتے ہیں۔ جن کا باہمی ربط قائم رکھنا ایک قسم کا اخلاقی فرض سمجھا جاتا ہے یا کم از کم سمجھا جاتا رہا ہے۔ خود کلام مجید میں ذی القربیٰ کے حقوق پر خاص زور دیا گیا ہے۔ ہمارے شعرا و حکما کے بے شمار اقوال خاندان کی افضلیت اقربا سے ہمدردی اور اعزہ کی مداد کے متعلق موجود ہیں۔ فارسی کے اکثر شعرا نے کنبہ پروری کے جذبے پر کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔ مثلاً ابن یمین کہتا ہے ؎

چوں جامۂ چرمیں شمرم صحبتِ ناداں — زیرا کہ گراں باشد و تن گرم نہ دارد

از صحبتِ ناداں بتر است نیز بگویم — خویشے کہ توانگر شد و آزرم نہ دارد

ہندوؤں کے مشترک خاندانی نظام کی بنیاد بھی یہی جذبہ ہے۔ کوشش یہ ہوتی ہے کہ وسیع ہوتے ہوئے خاندان کے افراد جب ک ممکن ہو ایک دوسرے سے مربوط رہیں جس سے غرض یہ ہے کہ ایک مرکز کے گرد افراد کی تنظیم ہوتی رہے۔ جماعتی زندگی کی یہی ایک شکل ب تک مشرق کی سمجھ میں آئی ہے۔

اب ہمیں ایک ایسے معاشرتی نظام کا تصور قائم کرنا ہے جس کی بنیاد خاندان کے قیام و استحکام پر رکھی گئی ہو۔ ایسے نظام میں فضائل خلاق کی فہرست عورت کی عصمت سے شروع ہو گی کیونکہ خود خاندان کا وجود ہی عورت کی عصمت سے وابستہ ہے۔ تمام خاندانی علائق باپ بھائی چچا کا رشتہ اسی وقت تک قائم ہے جب تک عورت ایک عفیف ماں ہے۔ اس کے بغیر خاندان قائم نہیں رہ سکتا۔ اس طرزِ معاشرت یں خاندان کے نظام کو توڑنا سب سے بڑا اخلاقی جرم ہے۔ اس سے دو نتیجے نکلے ایک تو یہ کہ شخصی آزادی پر سخت پابندیاں عائد کرنا لازم ٹھہرا اتنی ہی جتنی مغرب میں قومی قانون سے منحرف ہونے والے پر کی جاتی ہیں، دوسرے یہ کہ نسوانی عصمت کی بے حد حفاظت ناگزیر ہو گئی تمام شرقی اقوام نے اپنی اجتماعی زندگی کی تنظیم کے لئے ایک غیر مدوّن مگر ہمہ وقت نافذ اخلاقی قانون وضع کیا کہ عورتوں اور مردوں کا آزادانہ اختلاط نہ ہو بلکہ اس میں یہاں تک مبالغہ کیا گیا کہ مردوں کے مجمع میں عورت کا نام لینا بھی ممنوع قرار پایا۔ اسلامی ممالک میں پردے کی رسم جاری

ہوگئی۔ عورتوں کی اس درجہ حفاظت ضروری سمجھی گئی کہ کسی نامحرم کا ان کے مُنہ پر نظر ڈالنا بھی ناگوار ہونے لگا۔ "غیرت" کا خاص مشرقی مفہوم ع "اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا" اسی طرح پیدا ہُوا۔ شوہر پرستی کے جذبے کو عام طور پر بے حد سراہا گیا۔ یہاں تک کہ ہندوستان میں اس نے ستی کی شکل اختیار کرلی۔

بحیثیتِ مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ مردوں اور عورتوں کے میل جول کا صرف ایک ہی صحیح طریقہ مشرق نے قائم رکھا اور وہ شادی کا طریقہ تھا۔ شادی بلحاظ ایک معاشرتی فرض کے ہو تو جاتی تھی مگر اس میں ایک دقت یہ آپڑی کہ اس سے بالعموم جذبات کی تشفی نہیں ہوتی تھی۔ جیسے ہمارے مشرقی تہذیب کے دورِ آخر کے ترجمان نے کہا ہے ؎

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب — کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

اب یہ عشق کی آگ سینوں میں تو بھڑک رہی تھی مگر وہ مخلوق جو عاشق کو اذنِ تپش دے سکتی تھی بعض عظیم الشان عمرانی مصلحتوں کے ماتحت سراپردۂ حیا میں مستور تھی۔ اس موقع پر مشرق کو اُن عوضی ہیجات کی ضرورت پیش آئی جن کا ذکر اس مقالے کے آغاز میں ہو چکا ہے۔ ان عوضی ہیجات میں سے دو خاص طور پر اہم ہیں۔

اوّل شاہدانِ بازاری یعنی ایسی عورتوں کی ایک جماعت جنہیں نظامِ خاندانی سے کوئی واسطہ نہ تھا اور اس لئے اپنے تمام عمال میں بالکل آزاد تھیں۔ ان کی صحیح حقیقت کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم ان کی موجودہ بگڑی ہوئی حیثیت سے قطع نظر کریں اور اپنے اُن تعصبات کو بھی تھوڑی دیر کے لئے فراموش کردیں جو ان کی اس پست حالت اور تہذیب و اخلاق کے جدید تصور کی وجہ سے ہمارے دل میں جاگزیں ہیں۔ یہ عورتیں اپنے زمانے کی شریف خواتین سے بالعموم زیادہ تعلیم یافتہ، شائستہ اور ماہرِ فنون ہوتی تھیں۔

دوم۔ نوعمر اور بے ریش لڑکے۔ ان کا چرچا خاص طور پر اس وقت زیادہ ہو گیا جب سلاطینِ اسلام کے لشکروں میں ترکی عنصر داخل ہُوا اور ترک نوجوانوں کے حسن نے وسط ایشیا سے لے کر ایران تک آگ لگا دی۔

ہم جو تہذیبِ جدید کی طرزِ فکر و احساس کے خوگر ہو چکے ہیں شاید اس تذکرے پر حقارت سے مسکرائیں لیکن ہمیں ایک بار پھر ایک سوسائٹی کا تصور قائم کرنا چاہئے۔ جس میں عورتوں اور مردوں کی علیحدگی ازبس ضروری تھی۔ یہ تو ناممکن تھا کہ وہ لوگ اپنے جذباتِ عشق و محبت کو دبا ڈالتے۔ شریف عورتوں سے اظہارِ عشق کرنا خارج از بحث تھا بلکہ اظہارِ عشق تو درکنار اُن کا نام تک برسرِ عام زبان پر لانا ایک گناہِ عظیم سمجھا جاتا تھا۔ ایسے نظامِ معاشرت میں اُس صورتِ حال کا پیدا ہو جانا جس کی تفصیل ابھی کی گئی ہے نہ صرف قدرتی بلکہ بے حد ضروری تھا۔

ایک اور مشرقی ملک میں جو اب عرصے سے ایک مغربی ملک بن چکا ہے آج سے دو ڈھائی ہزار سال قبل بعینہٖ یہی صورت پیش آچکی ہے۔ عہدِ فارقلیس کا یونان اپنی تہذیب کے ماخذ اور اپنے اثراتِ ماحول کے اعتبار سے ایک خالص مشرقی ملک تھا۔ یونانی تہذیب کے اس عہدِ زرّیں میں مشرقی طرزِ معاشرت کی وہی شکل رائج تھی۔ جس میں تقسیمِ عمل سے عورت کو صرف خانگی معاملات کا انصرام سپرد ہوتا ہے

انچہ طوائفیں اور امارد یہاں بھی اسی طرح نمودار ہوتے ہیں جس طرح دوسری مشرقی تہذیبوں کے عہدِ کمال میں۔ یہ طوائفیں جنہیں یونانی Hetaerae
تے تھے دوسری عورتوں پر علمی فضیلت کے لحاظ سے بدرجہا فائق تھیں۔ موسیقی اور فنِ گفتگو میں مہارتِ تامہ رکھتی تھیں۔ یونانیوں کی فطری عقلیت
ان عورتوں کی محبت و رفاقت میں زیادہ تسکین ملتی تھی۔ مثلاً فارقلیس کی محبوبہ ایسپیزیا کا شہرہ اس کے علمی کمالات کی وجہ سے دور دور
پھیلا ہوا تھا۔ پلوٹارک کا بیان ہے کہ یونان کے بڑے بڑے مدبر اور فلاسفہ اس کے مدّاح تھے اور اس کے گوشۂ چشمِ التفات میں
بہ پانے کے متمنی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جب سقراط اپنے تلامذہ کو افلاطون کے مشہور مکالمے "جمہوریت" کا درس دے رہا تھا تو ایسپیزیا
ں کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ افلاطون اس کی انشا پردازانہ قابلیّت کا معترف ہے اور اس کا بیان ہے کہ فارقلیس کے شہرۂ آفاق ماتمی
طبے کی تصنیف کا سہرا در اصل ایسپیزیا کے سر ہے۔ یونان میں طوائفوں کی یہ عزت تھی کہ ان کے مجسّمے بادشاہوں کے مجسّموں کے پہلو بہ
پہلو کھڑے کر دیئے جاتے تھے۔ الغرض یہ فرقہ ایک ناقابلِ انکار اور ناگزیر ضرورت کے طور پر تسلیم کر لیا گیا تھا۔ مشہور خطیب ڈیماستھنیز بڑی
بے تکلفی سے کہتا ہے کہ ہر شخص کو اپنی بیوی کے علاوہ کم از کم دو شاہدانِ بازاری کا رکھنا لازم ہے۔

میں نے یونانی معاشرت کا نقشہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ دکھایا ہے۔ تاکہ بعد کی مشرقی تہذیب کے ساتھ اس کی مشابہت بالکل عیاں
ہو جائے۔ سب سے بڑی بات جو یونانی بلکہ تمام مشرقی طوائفوں کے متعلق ملحوظ رکھنی ضروری ہے وہ یہی ہے کہ ان کے تعلق کے ساتھ اخلاقی ذلت
کا احساس وابستہ نہ ہوتا تھا جو آج ہے بلکہ اس کے برعکس یونانی طوائفوں کو عبادت گاہوں کے ساتھ خاص علاقہ ہوتا تھا۔ ہندوستان میں
دیوداسی اور جاپان میں گیشا بھی اسی قبیل کی طوائفوں سے ہیں اور میں آگے چل کر عرض کروں گا کہ اسلامی ممالک میں طوائفوں کے وجود
نے تصوف کے بہترین خیالات میں کس طرح گہرائی وسعت اور بلندی پیدا کی۔

باقی رہی یونان کی امرد پرستی، سو یہ ایک ایسا پیش پا افتادہ موضوع ہے کہ اس پر کچھ زیادہ کہنا تحصیل حاصل ہے۔ آپ کو شاید
اعتراض ہو کہ ایک مرد سے دوسرے مرد کا عشق بے معنی اور غیر فطری ہے لیکن میں پہلے ہی اس نفسیاتی حقیقت کی طرف اشارہ کر چکا ہوں کہ
بڑے سے بڑے اساسی جذبے میں بھی کوئی عوضی مہیج واقعی مہیج کی جگہ لے کر جذبے کا محرّک ہو سکتا ہے اور اس عوضی مہیج کے طفیل بھی
جذبے کا اصل جوش و خروش اور ولولہ اور ہنگامہ قائم رہتا ہے۔ دوستی کے مضمون پر افلاطون کے پُرلطف مکالمے Lysis کا نام ایک
خوش رو لڑکے کے نام سے لیا گیا ہے۔ یونان میں مردوں کی باہمی دوستی بجائے خود ایک معاشرتی ادارہ تھی اور اس میں وہی وفورِ احساس
اور ہیجانِ جذبات موجود ہوتا تھا جو عام طور پر عشق و محبت کے لئے مخصوص سمجھا جاتا ہے۔ اقلیز (Achilles) اور پیٹروکلس
(Patroclus)، سولن (Solon) اور پائسسٹریٹس (Paisistratus)، سقراط (Socrates) اور ایلیبیڈیز
(Alcibiades) اس عشق کی بہترین مثالیں ہیں۔ اس قسم کی دوستیوں سے بعض مرتبہ بڑے بڑے عظیم الشان اخلاقی نتائج نکلتے
تھے جن میں سے بعض کی یاد تاریخ نے اب تک محفوظ رکھی ہے۔ عام طور پر دونوں دوستوں میں جو پختہ عمر ہوتا تھا وہ دوسرے کی تعلیم اور اخلاقی

تربیت میں بے حد کوشش کرتا تھا۔ یہاں میں اس عہد کے سب سے دانشمند اور سب سے پاک نفس یونانی سقراط کا ذکر کروں گا جس کے فیضِ صحبت نے ایلسیبیڈیز (Alcibiades) کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ پلوٹارک کا بیان ہے کہ ایلسیبیڈیز کی محبت میں سقراط کے بہت بڑے بڑے رقیب تھے لیکن ایلسیبیڈیز سقراط کی حقیقی منزلت پہچانتا تھا اور سقراط کے سوا سب کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ کبھی کبھی اغیار اپنی شیریں بیانی سے کام لے کر اسے پھسلاتے اسے سبز باغ دکھاتے اور وہ کچھ عرصے کے لئے سقراط سے بے وفائی کرتا۔ اُس وقت سقراط اُس طرح اُس کے پیچھے پیچھے پھرتا جیسے کوئی اپنی کھوئی ہوئی چیز تلاش کر رہا ہو۔

تقریباً ایک ہزار سال بعد اسلامی سلطنتوں کے قیام نے اقصائے مشرق میں جب ایک نئی تہذیب کو نافذ کیا تو قدرتاً یہاں بھی بعینہ یہی حالات رونما ہوئے۔ سب سے پہلے میں طوائفوں کا ذکر کروں گا۔ ان کے ظہور کے اسباب میں پہلے بحث کر چکا ہوں۔ طوائفوں کا زور اس دور میں کچھ اس وجہ سے بھی ہوا کہ مسلمان اقوام کی شدید جمالیاتی حس مذہبی ضرورتوں کے اقتضا سے بعض فنون مثلاً تصویر کشی اور بالخصوص مجسمہ سازی سے کوئی تسکین حاصل نہ کر سکی۔ اس وجہ سے حُسن پرست طبقے کی توجہ اور بھی زیادہ شدت کے ساتھ اِن زندہ انسانی پیکروں کے حسن و جمال اور رقص و سرود کی طرف مائل ہوئی۔ میرحسن کی کھینچی ہوئی یہ تصویر دیکھئے:۔

ستاروں کے پردے بنا کر درست   بجانے لگے سب وہ چالاک و چُست
گئی بائیں کی آسماں تک گمک   اُٹھا گنبدِ چرخ سارا دھمک
خوشی کی زبس ہر طرف تھی بساط   لگے ناچنے اُس پہ اہلِ نشاط
کناری کے جوڑے چمکتے ہوئے   وہ پاؤں کے گھنگرو جھنکتے ہوئے
وہ بالے چمکتے ہوئے کان میں   پھڑکنا وہ نتھنے کا ہر آن میں

× × × × × × × × × ×

کسی کے چمکتے ہوئے نو رتن   کسی کے وہ مکھڑے پہ نتھ کی پھبن
وہ دانتوں کی مسّی وہ گلبرگ تر   شفق میں عیاں جیسے شام و سحر

× × × × × × × × × ×

چمکنا گلوں کا صفا کے سبب   وہ گردن کے ڈورے قیامت غضب

ان عورتوں کی صحیح حیثیت معین کرنے میں عام طور پر اس لئے دقت ہوتی ہے کہ ہم اخلاقی گناہ کا وہ جدید تصور ان کے ساتھ شامل کر دیتے ہیں۔ جو خالص مشرقی نظامِ معاشرت میں ان کے ساتھ وابستہ نہ تھا۔ اُس نظام کو خاندان کا حفظ و بقا ہر حال میں ملحوظ تھا اور ان عورتوں کا وجود قدیم یونان کی طرح اس نے ایک معاشرتی ضرورت کے لحاظ سے رواجاً تسلیم کر رکھا تھا۔ غلط فہمی کی دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے

دل میں ان کا سب سے ممتاز وصف قحبگی کو قرار دیئے ہوئے ہیں۔ یہ بھی صحیح نہیں۔ اسی لئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کو یہاں ان کے زیادہ موزوں نام "اربابِ نشاط" سے یاد کیا جائے۔ یہ عورتیں خوش تقریر، خوش خلق، خوش گلو اور بالعموم خوش اندام ہوتی تھیں۔ ان کو فنونِ لطیفہ (شاعری، موسیقی، رقص) سے خاص لگاؤ تھا۔ نسل بانسل تک شعراء و حکما بلکہ بعض صورتوں میں مشائخ کی مصاحبت نے ان کے دل و دماغ کو خوب جلا دے دی تھی۔ شاعروں کو تو ان سے ہمیشہ ایک خاص مناسبت رہی بھلا جو عورتیں مشرق کے بہترین شعراء کی صحبت یافتہ ہوں ان میں ذوقِ شستگی اور ذکاوت کا پیدا ہو جانا کون سی عجیب بات تھی؟ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں پچھلی صدی تک اچھے اچھے خاندانی شرفا اپنے نونہالوں کو آدابِ شائستگی سکھانے کے لئے اربابِ نشاط کی محفلوں میں بھیجتے تھے۔ اور محض لطفِ گفتگو یا نغمہ سننے کی خاطر ان کے ہاں جانا معیوب نہ سمجھا جاتا تھا۔ ان کی زندگی کا معیار عام طور پر بہت بلند تھا۔ کیونکہ اُمراء کے خزانوں کے مُنہ ان کے لئے کھُلے رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہندوستان پر زوال آیا تو انگریزوں کی آمد آمد کے ساتھ ان کی شائستگی بھی غارت ہوگئی اور ساتھ ہی اُس ادبی طرز کا بھی خاتمہ ہوگیا جو ان کی ذات سے وابستہ تھا۔ بقول حالی کے ع

نہ رہی بات وہ مضمون سُجھانے والی

چنانچہ اٹھارھویں صدی کے آخر بلکہ گذشتہ صدی کے نصفِ اوّل تک اربابِ نشاط نے اپنے عروج کے دنوں کا تمدن اور وقار کسی حد تک قائم رکھا تھا۔ بیگم سمرو جس نے ہندوستان کی تاریخ میں اپنا نام چھوڑا ہے اپنی اصل کے لحاظ سے دلی کی محض ایک طوائف تھی۔ لیکن ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ ولیم بنٹنک کو بھی اس کی خدمت میں اپنا ہدیۂ نیاز بھیجنے میں تأمل نہ ہوا۔ اس کے علاوہ بے شمار طوائفیں ہندوستان کے اطراف میں باعزت زندگی بسر کر رہی تھیں مثلاً چندا جو بہ عہدِ عالمگیر ثانی دکن میں گزری ہے تیر اندازی اور نیزہ بازی میں مردوں کی طرح کامل مہارت رکھتی تھی۔ شعرا کی بڑی قدردان تھی۔ کئی سو سپاہی اور کچھ شعراء اس کی ملازمت میں تھے۔ کہا جاتا ہے کہ چندا سب سے پہلی عورت ہے جس نے اُردو میں اپنا دیوان مرتب کیا۔ یہ دیوان اب نایاب ہے مگر اس کی ایک جلد جو اُس نے ۱۷۹۹ء میں خود ایک انگریز کو نذر کی تھی، اب تک برٹش میوزیم (لندن) میں[1] موجود ہے۔ اس کے دو شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں ؎

اخلاق سے تو اپنے واقف جہاں رہے گا — پر آپ کو غلط کچھ اب تک گماں رہے گا

اک لحت پارہ پارہ کر ڈالوں آئینے کو — پر کیا کروں کہ تیرا مُنہ درمیاں رہے گا

انگریزی حکومت کے قیام کے بعد بھی آج سے پچاس سال قبل تک اربابِ نشاط میں پرانی روشنی کے نمونے ایک حد تک باقی رہے ہیں۔ میں ان یادگاروں کے صرف ایک کمال یعنی فنِ شعرگوئی کے چند نمونے میں شاعرہ کے نام اور کہیں کہیں مختصر حالات کی تخصیص کے ساتھ یہاں درج کرتا ہوں:—

---

(۱) تذکرہ شمیم سخن مؤلفہ مولوی عبدالحی وکیل۔

۱۔ امیر طوائف (پورنیہ۔ بنگال) ؎

کھل گیا رازِ نہاں پیتے ہی اک ساغرِ عشق — اب شرف لے گئے غافل تِرے ہشیاروں پر

۲۔ پکھراج بیگم (اکبر آباد) ؎

دنیا میں مثلِ خواب ہماری حیات ہے — کیونکر خیالِ یار نہ پیشِ نظر رہے

تاریکیٔ عمل سے کیا قبر میں مقام — منزل میں شب ہوئی تو سرا میں اُتر رہے

۳۔ حسن (دربھنگہ)

یا الٰہی کیا ہوئے وہ میرے داغ آرزو — کچھ اندھیرا سا نظر آتا ہے مجھ کو دل کے پاس

۴۔ مشتری (خیر آباد) یہ ایک باکمال رقاصہ خوش گلو مغنیہ خوش فکر شاعرہ اور ایک اچھی خوش نویس ہونے کے علاوہ صاحب دیوان فارسی و اُردو بھی تھی۔ اس کا شعر ہے ؎

مِلے خاک میں جورِ گردوں دوں سے — مکیں کیسے کیسے مکاں کیسے کیسے

اب انہیں عورتوں کے دو ایک شعر بغیر ناموں کی تخصیص کے سنیئے ؎

ہنس کر رُلا دیا کبھی رو کر ہنسا دیا — اے فتنہ ساز دونوں میں تجھ کو کمال ہے

کچھ رحم کرتی ہے شبِ فرقت میں تیری یاد — کچھ مہربان ہجر میں تیرا خیال ہے

اپنی اپنی ہر ایک کہتا ہے — کوئی میرا نہ مُدعا سمجھا

ہائے بے فائدہ خراب ہُوا — عشق کی میں نہ انتہا سمجھا

نہ ہوئی شہر و دشت میں تسکیں — اب کہاں لے کے جایئے دل کو

گذشتہ نصف صدی میں اس طبقے پر ایسا سریع زوال آیا کہ اب اپنی بہترین شاعری کو اس سے منسوب کرتے ہوئے ہمیں خواہ مخواہ شرم آتی ہے لیکن جنہوں نے یہ زوال اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے وہ شرم کے اس احساس سے ناآشنا ہیں۔ اس کے برعکس وہ اس انقلاب پر ماتم کرتے ہیں۔ ذیل کی عبارت پنڈت رتن ناتھ سرشار کے "فسانۂ آزاد" سے نقل کی گئی ہے:۔

"وہ چہک دہک اب کہاں، وہ دھوم نہ وہ سامان۔ وہ ولولہ نہ وہ ارمان، اگرچہ پرانی صحبتیں دیکھی ہیں۔ . . . . اور میاں جو لطف ہم نے دیکھے ہیں ہفت اقلیم کے بادشاہ کسی خاقان کج کلاہ خسرو گیتی پناہ کو خواب میں بھی نصیب نہ ہوئے ہوں گے۔ یہ قیصر باغ روکش

باغِ نعیم، نمونۂ فردوس بریں تھا۔ جدھر دیکھو سبزانِ گلابی پوش، جدھر جاؤ رندانِ ساغر نوش، کہیں پریوں کا ہجوم، کہیں ماہرویوں کی دھوم ....
اب یہاں رہ کیا گیا۔ گلی کوچوں میں کتے لوٹتے ہیں سو جب سے دو گنڈے کتا ملنے لگا اب وہ بھی نظر نہیں آتے۔ اللہ اللہ ایک وہ زمانہ
تھا کہ ساقنوں کے مزاج نہیں ملتے تھے۔ بانکے ترچھے رئیس زادے ایک ایک دم کی دو دو اشرفیاں کھنا کھن اور چھنا چھن پھینک دیتے تھے
یا اب ایک یہ زمانہ ہے۔ کہ شہر بھر میں اس سرے سے اُس سرے تک شمع لے کر ڈھونڈیئے تو شمع رو . . . . محبوب آئینہ زانو کا پتہ
نہیں . . . . کل محمد علی کی دُکان سے دو بیڑے خمیرا بنوا کر فرنگی محل سے نئی سڑک کی طرف جو نکلا تو نکڑ پر ایک ہاتھی بندھا دیکھا، سونڈ سے
گھاس اچھال رہا تھا۔ پوچھا کیوں میاں یہ کس کا ہاتھی ہے؟ ایک خوش قطع خوش وضع جوان بول اُٹھا کہ حضرت یہ بی حیدر جان کا ہاتھی
ہے۔ قسم خدا کی، جھوٹ بولنا اور سؤر کا کھانا برابر ہے۔ واللہ ایسا سرور ہُوا کہ آنکھیں پُرنم ہوگئیں۔ سر جھک گیا، دل بھر آیا، اللہ رے عروج

خدا آباد رکھے لکھنؤ کو پھر غنیمت ہے نظر کوئی نہ کوئی اچھی صورت آ ہی جاتی ہے

میں نے طوائفوں کی حیثیت واضح کرنے میں تفصیل سے کام لیا ہے تاکہ یہ سمجھنے میں دقت نہ رہے کہ مشرق کے بڑے بڑے شعرا،
شق و محبت کے بیان میں صدہا برس تک کس طرح ان عورتوں پر قانع رہ سکے۔ اب میں مجملاً امرد پرستی کا ذکر کروں گا۔ کم و بیش تمام
رقی ممالک میں یہ چیز موجود تھی مگر ایران اس معاملے میں اپنے تاریخی حریف یونان کا صحیح مدِ مقابل ثابت ہُوا۔ ایران اور اس کے ہمسایہ
مالک کے متعلق مولانا شبلی لکھتے ہیں:۔

باوجود جنگی زندگی کے شاہد پرستی عام طور پر رائج تھی، بڑے بڑے قاہر اور متشرع سلاطین علانیہ حسن پرستی کرتے تھے۔ ان کی مدح میں
جو قصائد لکھے جاتے تھے، اِن میں اُن کے معشوقوں کا بھی تذکرہ کیا جاتا تھا۔ خود سلاطین شعرا سے فرمائش کرکے یہ مضامین لکھواتے تھے
ترک غلام گھر گھر پھیلے ہوئے تھے اور جلوت و خلوت میں شریکِ صحبت تھے۔ اکثر شعرا ان غلاموں کے شیفتہ تھے، اور عشقیہ اشعار
میں انہی کا ذکر کرتے تھے۔ (شعر العجم۔ ج ۵۔ صفحہ)

اگر ہم اپنے شعرا اور سلاطین کے تذکروں پر ایک سرسری سی نظر بھی ڈالیں تو وہاں بھی ہمیں یہی چرچے بار بار ملتے ہیں۔ دقیقی کو
پنے ایک خوشرو غلام سے محبت تھی۔ اور آخر اُسی کے ہاتھ سے مارا گیا۔ عرفی ہندوستان پہنچا تو جہانگیر پر جو اس وقت شہزادہ سلیم تھا عاشق
ہوگیا اور بعض تذکروں کا بیان ہے کہ اسی جُرم کی پاداش میں عرفی کو زہر دے دیا گیا۔ سلطان محمود کو ایاز سے بے حد محبت تھی اور بڑے بڑے
متعدد اُمرا کی ناراضی بھی محمود کو اس بات پر آمادہ نہ کر سکی کہ ایاز کو اپنے قرب سے محروم کرتا۔ الغرض یہی وہ تمدن تھا جس نے ہماری عشقیہ
شاعری میں اس قسم کے جذبات پیدا کئے ؎

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دلِ مارا بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

چناں مرگِ رقیب آزردہ کرد آں طفلِ بدخو را — کہ غمخواراں بہ مرگِ من تسلّی می کنند اورا

یہ ناز، یہ غرور، لڑکپن میں تو نہ تھا — کیا تم جوان ہو کے بڑے آدمی ہوئے

حسن تھا تیرا بہت عالم فریب — خط کے آنے پر بھی اک عالم رہا

میرؔ کیا سادے ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب — اسی عطار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں

مگر اس امرد پرستی کی تحریک کا سب سے خوش آئند پہلو وہ تھا جس کے ماتحت مردوں کی باہمی دوستی کا ایک زیادہ بلند پاکیزہ اور لطیف تصور قائم ہوا جس میں ہوا و ہوس کو کوئی دخل نہ تھا، ارباب نشاط لاکھ شائستہ اور فہمیدہ تھیں لیکن ان کے تعلق کی کاروباری نوعیت کی وجہ سے بارہا ان کی رفاقت میں مردوں کے لئے ایک تشنگی رہ جاتی تھی۔ اس کمی کو دوستی نے پورا کر دیا۔ اس دوستداری میں عشق و محبت ہی کے مانند جوش و قوت ہوتی تھی۔ خود گذشتہ صدی کی مودت میں وہ شان تھی کہ اب اس کا بتدریج زوال ہمیں نمایاں طور پر محسوس ہوتا ہے۔ غالبؔ کے دوستوں ہی کو لیجئے۔ میرن صاحب، میرزا تفتہ، میر مہدی کس کے ساتھ ان کو دلی لگاؤ معلوم نہیں ہوتا۔ ان سچی دوستیوں میں ایک ایسا جوش و جذبہ تھا جس کی مثالیں اب روز بروز کم ہو رہی ہیں۔ جب خواجہ حالیؔ پہلے پہل غالبؔ سے ملے تو ان کا سن کچھ بیس سال سے زیادہ نہ تھا۔ غالب کی عمر اس وقت ساٹھ برس کے لگ بھگ تھی۔ لیکن "یادگارِ غالب" کے ابتدائی صفحات سے ان کے تعلقات کا اندازہ کیجئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا بچپن کے کھیلے ہوئے ہم عمر بے تکلف دوست ہیں۔ عارفؔ کے متعلق مرزا غالبؔ کس محبت اور ملاطفت سے لکھتے ہیں: ؎

آں پسندیدہ خوئے عارف نام — کہ رُخش شمعِ دُودمانِ منست

از نشاطِ نگارشِ نامش — خامہ رقاص در بنانِ منست

آنکہ در بزمِ قرب و خلوتِ اُنس — غمگسار و مزاج دانِ منست

زورِ بازوئے کامرانیٔ من — راحتِ روحِ ناتوانِ منست

× × × × × × × × × × ×

ہم بہ روئے تو مائلم مائل — کایں گلِ باغ و بوستانِ منست

× × × × × × × × × × ×

جاوداں باش اے کہ در گیتی　　　سخنت عمر جاودانِ منست

اربابِ نشاط کے وجود کا بھی اس طرح ایک لطیف تر پہلو ہے مگر اس کا بیان آگے آئے گا۔ یہاں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ مشرق کی عشقیہ شاعری میں شاہدبازی اور امرد پرستی کے یہ مناظر دیکھ کر ہمیں چیں بہ جبیں ہونے کا حق حاصل نہیں ہے۔ ہومر کی نظموں میں شرک توہّم اور جہل کو بہت بڑا دخل ہے لیکن الیڈ کو پڑھ کر ہم پورا لطف اٹھا سکتے ہیں۔ شیکسپیر جس سوسائٹی کی تصویر ہمیں دیتا ہے اس کی بربریت فحش گوئی اور فسق کو ہم بہ آسانی نظر انداز کر جاتے ہیں۔ اسی طرح مشرقی شاعری بھی کچھ خاص معاشرتی حالات کا پرتو ہے جن کی پیدائش کے اسباب سے میں بتفصیل بحث کر چکا ہوں۔

اب سوال یہ ہے کہ ان حالات نے جو جذبۂ عشق پیدا کیا اس کی ترکیب کن عناصر سے ہوئی اور اس کی اہم ترین خصوصیات کیا تھیں؛ اس بحث کے لئے اب ہمیں عمرانیات سے قطع نظر کر کے خالص ادبی تنقید کی طرف رجوع کرنا ہے اور اقوامِ مشرق کی عشقیہ شاعری کے مطالعے سے یہ معلوم کرنا ہے کہ اس کے مشترک صفات و کیفیات کیا ہیں؛

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ مغربی دستور کے خلاف کوئی شریف اور صاحبِ خاندان عورت جذباتِ عشق کا موضوع نہیں بنائی گئی۔ کہیں کہیں قصّے کہانیوں میں بادشاہزادیوں کی عشق بازی کا ذکر آجاتا ہے لیکن عام شرفاء کی بہو بیٹیوں کی ان ہنگاموں میں شرکت ہمیشہ نہایت مکروہ بدذوقی اور بے حیائی تصوّر کی گئی ہے۔ یہ قول خصوصیت کے ساتھ ان ممالک پر صادق آتا ہے جو ایرانی تہذیب سے زیادہ متاثر رہے۔ مرزا شوق نے اپنی مثنوی "زہرِ عشق" میں ایک شریف سوداگر کی لڑکی کا عشق اسی سوداگر کے محلّے میں رہنے والے ایک شخص سے دکھایا ہے۔ ضروریاتِ وقت کے احساس سے انہوں نے اس لڑکی کی بے راہ روی کی قیمت اس سے یوں لی ہے کہ وہ خود اپنی جان پر کھیل کر اپنی محبّت کے جوش اور شدّت کو اپنی خطا کی سفارش بنا دیتی ہے لیکن رائے عامہ نے مرزا شوق کی اس بغاوت کو کبھی معاف نہیں کیا اور ان کی مثنوی آج تک بے حد رکیک سمجھی جاتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ میر حسن کی "سحرالبیان" جو عریاں نویسی میں "زہرِ عشق" سے کچھ زیادہ نہیں تو کسی طرح کم بھی نہیں ہے۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے ناقابلِ گرفت خیال کی جاتی ہے۔

ہندی شاعری میں البتہ شریف عورتیں عشق و عاشقی کے سلسلے میں بارہا نمودار ہوتی ہیں۔ اس موضوع پر میری واقفیت بہت محدود ہے۔ ہندی کی عشقیہ شاعری پر غالباً ان روایات کا بہت گہرا اثر پڑا ہے جو کرشن جی اور گوپیوں کے متعلق مشہور ہیں چنانچہ یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ ہندی میں عورت بالعموم اپنے شوہر کو یاد کرتی ہے جو پردیس میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ محبّت کے جذبہ کو اس قدر لطیف اور روحانی شکل دی جاتی ہے کہ اس پر کسی حیثیت سے اعتراض کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس طرح ہندی کی عشقیہ شاعری دراصل نظامِ خاندانی کے لئے ایک تعمیری قوّت کا درجہ رکھتی ہے۔ چند مثالوں سے میرا مطلب واضح ہو جائے گا۔ فراق کی بے چینی کے ذکر میں عورت کہتی ہے ؂

پیتم تم پردیس سدھارے لے گئے مور چین　　　تمرے کارن رام دُہائی تڑپت ہوں دن رین

نیا چاند نکلنے والا ہے۔مہجور بیوی کو خیال ہوتا ہے کہ شاید اُس کے شوہر کی نظر بھی باقی دنیا کی طرح اُس کی طرف اُٹھے ؎

آج چندرماں دُوج ہے جگ چتوت چھوں اور ہمرے اور وا متر کے نین بسے اک ٹھور

یہ محبت عارضی نہیں بلکہ ہمیشہ قائم رہنے والی ہے ؎

چھن چڑھے چھن اُترے سو تو پریم نہ ہوئے آٹھ پہر لاگیو رہے پریم کہاوے سوئے

جہاں شوخی اور شرارت کا کوئی مضمون ادا کیا ہے وہاں بھی یہ اخلاقی متانت برقرار رکھی ہے۔پپیہا اپنی پی کہاں کی پکار لگا رہا ہے۔عورت چمک کر اس سے کہتی ہے تو پیا کو بلانے والا کہاں سے پیدا ہوگیا۔جی چاہتا ہے تیری چونچ کاٹ ڈالوں اور اس پر نمک چھڑک دوں ؎

چونچ تیہاری کاٹ کے تاپے چھڑکوں لُون پیا میرے، میں پیو کی، تو پی کے سو کون؛

مشرقی شاعری کی کسی صنف میں ہمارے وضع کئے ہوئے عام اصُول سے اگر صحیح معنوں میں انحراف ہے تو وہ دورِ جاہلیت کی عربی شاعری میں ہے جہاں صاحبِ خاندان عورتوں سے بے تکلف اظہارِ عشق کیا جاتا تھا اور ان کے نام بھی بلا تامل شاعر کی زبان پر آجاتے تھے اسلامی عہد میں کم از کم نام لینے کی رسم برابر جاری رہی چنانچہ فرزدق اور اس کی بنت عم نوار، جمیل وبثینہ، قیس ولیلےٰ کے نام اس سلسلے میں مشہور ہیں۔یہاں میں صرف حُطیئہ کی ایک نظم کے چار شعر نقل کروں گا جن میں وہ ایک عرب شریف زادی ہند کے متعلق اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے:؎

عَرَفْتُ مَنَازِلًا مِنْ اٰلِ هِنْدٍ عَفَتْ بَيْنَ الْمُؤَبَّلِ وَالشَّوِيِّ

میں نے ہند کے خاندان کی فرودگاہ کو پہچان لیا جس کے آثار مؤبل اور شوی کے درمیان مٹ رہے تھے

غَذِيَّةٌ بَيْنَ اَبْوَابٍ وَّ دُوْرٍ سَقَاهَا بَرْدُ رَائِحَةِ الْعَشِيِّ

وہ گھر کی چاردیواری کے اندر پلی تھی رات کی بارش کا ٹھنڈا پانی اس کی پیاس بجھاتا تھا

مُنَعَّمَةٌ تَصُوْنُ لَيْكَ مِنْهَا كَصَوْنِكَ مِنْ رِدَاءٍ شَرْعَبِيِّ

وہ نازک اندام اپنے آپ کو تجھ سے یوں بچا بچا کر رکھتی تھی جیسے تو شرعبی چوغے کو سنبھال سنبھال کر رکھے

وَمَا لَكَ غَيْرُ تَنْظَارٍ اِلَيْهَا كَمَا نَظَرَ الْفَقِيْرُ اِلَى الْغَنِيِّ

اور تجھے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ایسی نظروں سے اُس کی طرف دیکھتا رہے جن سے کوئی تہی دست کسی مالدار کی طرف دیکھتا ہے

مشرقی شاعری کے عام قانون سے عربی شاعری کس طرح مستثنےٰ رہ گئی۔یہ کوئی ناقابلِ تشریح واقعہ نہیں۔عربوں کی معاشرت

بڑی حد تک یورپی طریقے کی قبیلہ پرستی پر مبنی تھی اور قبیلے کا قیام محض میاں بیوی کے تعلقات کے قیام پر منحصر نہ تھا۔ عورتیں آزادی سے باہر پھر سکتی تھیں اور اس طرح مردوں کی نگاہوں سے مستور نہ رہتی تھیں۔ ایک دوسری وجہ عربوں کی یہ مسلمہ قومی خصوصیت تھی کہ وہ شعر اور حقیقت میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔ ان کے شعر ان کی زندگی کا دستور العمل تھے اور اس کے برعکس جو کچھ انہیں زندگی میں واقعی پیش آتا تھا اسی کو شعر میں بیان کر دیتے تھے۔ اس کی مثالیں لاتعداد ہیں۔ میں یہاں صرف قیس عامری کا ایک نہایت سیدھا سادھا مگر نہایت نفیس شعر نقل کرتا ہوں۔ لیلےٰ عراق میں بیمار ہو گئی ہے، قیس کو حسرت ہوتی ہے کہ معالجے کے لئے وہ اس کے پاس موجود نہ ہوا اس سیدھی سی بات کے بیان میں شاعر نے عجیب تاثیر بھر دی ہے ؎

يَقُولُونَ لَيلَى فِي الْعِرَاقِ مَرِيضَةٌ

کہتے ہیں کہ لیلےٰ عراق میں بیمار پڑی ہے

فَيَا لَيْتَنِي كُنْتُ الطَّبِيبُ الْمُدَاوِيَا

اے کاش میں ہی اُس کا معالج طبیب ہوتا!

بایں ہمہ ظہورِ اسلام کے بعد عربوں کی اس آزادہ گوئی پر بھی نمایاں اثر پڑا۔ یزید کی بہن کا واقعہ مشہور ہے کہ کس طرح بعض عشقیہ اشعار نے جن کا خطاب اس خاتون سے تھا یزید کا پورا قہر و غضب شاعر پر نازل کرایا۔ عہد بنو اُمیہ کے مشہور شاعر فرزدق کے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کا واقعہ پیش آیا۔ جب وہ مدینے میں پناہ گزین تھا اس نے نظم میں اپنے معاملاتِ اُلفت پر اس انداز سے روشنی ڈالی کہ اسلامی شریعت اس کی حیا سوز عُریانی کی متحمل نہ ہو سکی اور یہ اشعار لکھنے کی پاداش میں اُسے شہر بدر ہونا پڑا۔

عورتوں کے پردہ نشین ہو جانے سے ایک خاص چیز جو مشرق میں نمودار ہوئی پہلی نظر کا عشق تھا۔ بعض لوگ ناواقفیت کی وجہ سے اس قسم کے عشق کو محض ڈھکوسلا اور مشرقی ادبیات کی خامی سمجھتے ہیں۔ مگر جب ذکور و اناث کی علیحدگی نہایت شدید ہو تو پھر محض ایک ہی نظر میں قدرت کو اپنا اقتضا پورا کرنا پڑتا ہے۔ الف لیلہ کی کہانیوں میں عشق کی پہلی واردات کا بیان عام طور پر اس طرح ہوتا ہے کہ "صاحبو! میں غش کھا کر وہیں گر پڑا۔" اس قسم کے اشعار میں ؎

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ — ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجو کہ چلا میں

ملک کی آب و ہوا کا اثر بھی ضرور بروئے کار آیا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ اس قسم کے فوری ہیجان کو پردے کے رواج سے بہت گہرا تعلق تھا۔ "سحر البیان" میں بدرِ منیر جب پہلی مرتبہ بینظیر کو دیکھتی ہے تو شاعر نہایت مختصر طور پر ساری کیفیت کھینچتا ہے ؎

گئے دیکھتے ہی سب آپس میں مل — نظر سے نظر، جی سے جی، دل سے دل

غرض بے نظیر اور بدرِ منیر — گرے دونوں آپس میں ہو کر اسیر

لیکن غالب نے اس کیفیت کی ترجمانی کا حق شاید سب سے بہتر ادا کیا ہے ؎

دِل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی　　دونوں کو اِک ادا میں رضا مند کر گئی

اربابِ نشاط کو عشقیہ شاعری میں جب ایک نمایاں جگہ حاصل ہوگئی تو اس کے کچھ نہایت اہم اثرات شاعری میں رُونما ہوئے رائے عامہ اگرچہ طوائفوں کے وجود سے نہایت وسیع پیمانے پر تجاہل کرتی تھی مگر مذہب اور شریعت کو قدرتاً اس صُورتِ حال پر سخت اعتراض تھا "ناصح" اور "واعظ" کا وجود یہیں سے پیدا ہوتا ہے۔ عورتوں کا عفیف طبقہ تو خیر خارج از بحث تھا ہی چونکہ شاہدانِ بازاری کے متعلق بھی عدمِ جواز کا یہ احساس عشاق کے دل میں ہمیشہ موجود ہوتا تھا اس لئے اخفا اور پردہ پوشی بلکہ خوف کا ایک سایہ ہماری تمام عشقیہ شاعری پر پڑا ہوا ہے ؎

دِل کی لاگ کہیں جو ہو تو بہتر چھپائے رکھ اُس کو　　یعنی عشق ہُوا ظاہر تو لوگوں میں رسوا ہوگا

یہ لَے یہاں تک بڑھی کہ اُلفت کو چھپائے رکھنا عشق کی شریعت میں بجائے خود ایک کارِ ثواب ٹھیرا ؎

اے مرغِ سحر عشق زِ پروانہ بیاموز　　کاں سوختہ را جاں شد و آواز نیامد

ذوق نے اِس خیال کو بڑی خوبی سے اُردو کا لباس پہنایا ہے ؎

پروانہ بھی تھا گرمِ تپش پر کھلا نہ راز　　بُلبل کی تنگ حوصلگی تھی کہ غُل ہُوا!

جب اس قسم کا اخفا کارِ نیک قرار پایا تو اس اخفا پر تفاخر کے جذبات کا پیدا ہوجانا بھی یقینی تھا ؎

کوئی میرے برابر کیا کرے گا ضبطِ اُلفت کو　　نہیں آتا زباں تک دِل سے حرفِ آرزو برسوں

اسی طرح خوشی کی گھڑیوں کے بیان میں "شبِ وصل" کا ذکر بے انتہا زیادہ کیا گیا ہے۔ شاید یہ کہا جائے کہ حسن و عشق کے معاملات میں رات کی فضا قدرتاً ایک سحر و دل رُبائی پیدا کردیتی ہے۔ یہ درست ہے لیکن مشرق میں لمحاتِ مسرت پر بالالتزام تاریکی کا پردہ ڈالنے کی یہ تخصیص بڑی حد تک عشاق کے خوف اور عدمِ جواز کے احساس سے پیدا ہوئی ورنہ کوئی وجہ نہیں ہے کہ مغربی شاعری میں شبِ وصال کا ذکر اس کثرت سے نہ ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہاں عشاق دن کی روشنی میں بھی مِل سکتے تھے اور کوئی معاشرتی یا مذہبی پابندی ایسی نہ تھی جو شاعر کو اظہارِ عشق سے باز رکھتی ـــ تاہم شبِ وصل کا موضوع جب ایک دفعہ ہاتھ لگ گیا تو ہمارے شعرائنے اس کے ادبی امکانات سے پُورا فائدہ اُٹھایا اور اس پر بہت دلکش اور لطیف مضمون آفرینیاں کیں۔ اس موقع پر فیضی کے دو شعر یاد آتے ہیں ؎

نہ گویم اے فلک از کج روی ہا یست تو برگردی　　شبِ وصل است خواہم اند کے آہستہ تر گردی

زِ مہتابِ رُخش کاشانۂ من روشن است امشب　　اگر وقتِ طلوعت آید اے خورشید برگردی

اُردو میں بھی یہ ذکر بار بار آیا ہے ؎

دی شبِ وصل مؤذن نے اذاں پچھلے پہر — ہائے کم بخت کو کس وقت خدا یاد آیا

داغ کا شعر ہے ؎

تمہیں دعویٰ تھا ہم ہوں گے مقابل ماہِ کامل کے — خدا کی شان ہے لو وصل کی شب چودھویں نکلی

اربابِ نشاط کے وجود نے ہماری شاعری میں ایک اور طرزِ خیال بھی نہایت شدت سے پیدا کر دیا۔ یہ رشک و رقابت کا جذبہ تھا۔ اس کی ب وجہ عورت کی شدید حفاظت کا وہ تصور تھا جو مشرقی سوسائٹی نے قائم کیا۔ الف لیلہ کی کہانیوں میں نسوانی عصمت کے متعلق ایک تلخ سہرائی انداز جو بار بار ملتا ہے بڑی حد تک اسی وجہ سے پیدا ہوا، اگرچہ اُس عہد کے خاص حالات کو بھی اس میں خاصا دخل معلوم ہوتا ہے۔ شرق کی اخلاقی تاریخ میں ایسے زمانے ضرور آئے جن پر اظہارِ اطمینان نہیں کیا جا سکتا۔ الف لیلہ کی کہانیوں میں اگر اُس زمانے کے بغداد ر قاہرہ کی صحیح تصویر پیش کی گئی ہے تو یہ اعتراف کئے بغیر چارہ نہیں کہ ان شہروں کی شریف زادیاں جو اپنے محافظ خواجہ سراؤں کی آنکھوں یں نہایت طراری سے خاک جھونکتی تھیں، بلندیٔ اخلاق کی کوئی قابلِ تعریف مثال قائم نہیں کر گئیں۔ پھر بھی نسوانی عصمت کا ذکر کرتے ہوئے زمحی الف لیلہ کے اس حصے کے مصنف یا مصنفین کے بیان میں جھلکتی ہے، اُسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ بجائے خود عورت کی عصمت ان کے نزدیک کتنی گراں بہا چیز تھی اور اس کے تحفظ کے لئے یہ لوگ کس طرح مضطرب رہتے تھے۔

لیکن رقابت و بدگمانی کے پیدا ہونے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ بالعموم طوائفوں کے کئی کئی عشاق ہوتے تھے۔ فارسی اور اردو شاعری میں س واقعے کی طرف بار بار اشارے آتے ہیں۔ شفائی کا شعر ہے ؎

مرغے چو ہمائے دلِ من گشتہ اسیرت — شکرانۂ ایں صید تہی کن قفسے چند

غالب کہتا ہے ؎

ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا — بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

یہ مضمون اکابر شعراء میں بغیر زحمتِ تلاش کے بار بار ملتا ہے ؎

ہزار جانِ گرامی بسوخت زیں غیرت — کہ ہر صباح و مسا شمعِ مجلسِ دگری

اس میں لطف یہ ہے کہ جو لوگ غیرت سے جل رہے ہیں وہ بھی تعداد میں کم از کم ایک ہزار ہیں ؎

جاتا ہے یار تیغ بکف غیر کی طرف — اے کشتۂ وفا تری غیرت کو کیا ہوا

با آں کہ بہ پرسیدنِ ما آمدہ مریم — کایاز کہ پرسید رہِ خانۂ ما را

اسی قسم کا خیال غالب نے بھی ظاہر کیا ہے ؎

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

رشک کے مضامین اردو شعر میں غالب سے بہتر کسی نے نہیں باندھے اور غالب نے جو کئی اور لحاظ سے بھی غیرت کا شاعر ہے ان مضامین میں ایسی لطیف نکتہ آفرینیاں کی ہیں کہ خود یہ موضوع بلند ہو گیا ہے ؎

ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لئے بہار میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گل

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے مرتے ہیں و لے ان کی تمنا نہیں کرتے

کرتا ہے بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے

یہی مشرقی حیا شاعری میں ایک حد تک معشوق کی تذکیر کا باعث ہوئی اگرچہ یہ ظاہر ہے کہ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ خود معشوق بار ہا جنسِ ذکور میں سے ہوتا تھا۔ بہرحال اس خصوصیت سے مشرقی شاعری کو بالواسطہ ایک بہت بڑا فائدہ پہنچا۔ اس کی وجہ سے تین طبیعتوں کا عام میلان یہ رہا کہ معشوق کی جنس شعر میں ظاہر ہی نہ ہونے پائے۔ مثلاً اس شعر میں یہ کہنا مشکل ہے کہ محبوب عورت ہے یا مرد ؎

دیکھنا بھی تو انہیں دُور سے دیکھا کرنا شیوۂ عشق نہیں حُسن کو رُسوا کرنا

شیوۂ حور و پری خوب و لطیف است و لے خوبی آنست و لطافت کہ فلانے دارد

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ معشوق کے دوسرے صفات کے بجائے شاعر کی توجہ عشق کی نفسیاتی کیفیتوں پر زیادہ مبذول رہی۔ ہمارے درجۂ دوم کے شعرا میں بھی یہ خصوصیت ایسے امتیاز کے ساتھ موجود ہے کہ ہماری شاعری میں نفسیاتی کیفیات کے مطالعے کا ایک عظیم الشان سرمایہ جمع ہو گیا ہے اور ہمارا یہ دعویٰ بالکل بجا ہو گا کہ دُنیا کی کسی اور زبان کی شاعری اس باب میں ہماری شاعری سے مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ہماری تنقیدِ شعر آج تک صرف اسی پہلو پر روشنی ڈالتی رہی ہے اس لئے میں یہاں اس سے قطع نظر کرتا ہوں البتہ طوائفوں کے وجود سے ہماری عشقیہ شاعری میں شوخی، شرارت اور بذلہ سنجی کا جو عنصر داخل ہوا اس کا مختصر سا ذکر یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے:-

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ یہ عورتیں چونکہ بڑے بڑے ناموران علم و ادب کی ہم جلیس تھیں اس لئے ان کے ذہن اور احساس میں ایک نفاست اور چٹک مٹک پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ نوعمری کی شادی جو شریف عورتوں کی تعلیم کو قبل از وقت روک دیتی تھی، ان کے لئے اکتسابِ علم میں سدِ راہ نہ ہو سکتی تھی۔ ساتھ ہی نسل ہا نسل سے محفل آرائی چونکہ ان کا مشغلہ تھی اس لئے ان کی گفتگو میں ایک ایسا سلیقہ اور ان کی تواضع میں ایک ایسا قرینہ تھا جس کی پردہ نشین عورتوں سے اُمید نہ رکھی جا سکتی

چنانچہ ہمارے شعراء نے معاملاتِ عشق کے بیان میں جگہ جگہ ان کی شوخی یا حاضر جوابی کا ذکر کیا ہے۔ ذیل کے اشعار میں جن واقعات کا اشارہ نکلتا ہے ان کی شُستہ اور لطیف ظرافت اپنی مثال آپ ہے ۔

یہ عذرِ امتحانِ جذبِ دل کیسے نکل آیا — میں الزام اُن کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا — دل کہاں کہ گم کیجے ؟ ہم نے مدعا پایا!

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیئے غیر سے تہی — سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یُوں

زہرہ دارم وعدۂ دیریں بیادش آورم — لب زہم نکشودہ می گوید کہ ایں ابرام چیست

سازد خموش تا من حسرت کشیدہ را — گوید شنیدہ ام سخن ناشنیدہ را

میر درد نے بھی کچھ اسی قسم کا ایک شعر اُردو میں لکھا ہے ۔

ذکر میرا ہی وہ کرتا تھا صریحاً لیکن — میں نے پوچھا تو کہا خیر یہ مذکور نہ تھا

لیکن طوالفوں نے ہماری شاعری کی ایک اس سے بھی بڑی خدمت انجام دی اور وہ بھی ایک ایسے زاویے میں جہاں اس کا گمان نہ ہو سکتا تھا۔ تصوف نے معرفت کے جو خیالات قائم کئے تھے ان کو شعر کے قالب میں ڈھلنے کے قابل بنا دینا کوئی چھوٹی سی خدمت نہ ہے ۔

نکہت جاں بخش دارد خاکِ کوئے گلرخاں — عارفاں زانجا مشامِ عقل مشکیں کردہ اند

عرفان اور عشق میں دو بنیادی باتیں مشترک ہیں۔ اوّل حُسن یا حُسنِ مطلق کا نظارہ اور اس نظارہ کے میسر نہ ہونے کی صورت میں کا پیہم اضطراب، دوم جلوۂ حُسن کے اس سرچشمے سے داخل ہونے کی آرزو۔ عاشقانہ اور صوفیانہ نظارہ خالص جمالیاتی نظارے سے ن عاطف سے مختلف ہے کہ آخر الذکر میں قبضہ و تسلّط کی کوئی آرزو نہیں ہوتی لیکن اوّل الذکر میں حُسن کے اس مظہر سے کسی نہ کسی طرح مل نے کی شدید آرزو ضرور موجود ہوتی ہے۔ عشق اور معرفت میں ایک اور بنیادی عنصر کا اشتراک بھی ہے۔ دونوں کے لئے ایک تیز احساس اور جذبے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ عشق کی طرح تصوف کی بنیاد بھی تمام تر واردات و جذبات پر قائم ہے پھر پردے کے رواج نے مضامین معرفت کے شاعرانہ بیان میں اور آسانی پیدا کر دی۔ یہ شعر دیکھئے ۔

مژدم در انتظار دریں پردہ راہ نیست یا ہست و پردہ دار نشانم نمی دہد

جب وہ جمالِ دل فروز، صورتِ مہرِ نیم روز آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں مُنہ چھپائے کیوں

صوفی کو یہ مجبوری تھی کہ جب تک وہ تجریدات سے اُتر کر مادی تشبیہ و تمثیل کی دُنیا میں نہ آتا اس کا جذبۂ عرفان شعر کی صورت اختیار نہیں کرسکتا تھا۔ ادھر شاعر کو یہ دعوے تھا کہ معشوق کا حُسن بھی اس کو حسن کے خالق کی یاد دلاتا ہے ؎

پڑھیں درود نہ کیوں دیکھ کر حسینوں کو خیالِ صنعتِ صانع ہے پاک بینوں کو

فریبِ حسنِ بتاں پیشکش اسیر تو ایم اگر خطست وگر خال دام و دانۂ تست

ان مشترک خصوصیات کی وجہ سے تصوف کے مضامین بہ آسانی شعر کا قالب اختیار کر گئے۔ اس نکتے کو سمجھنے کے لئے ہمیں ان تدریجات پر ایک مختصر سی نظر ڈالنی چاہئے جو عاشقانہ تخیل کو صوفیانہ تخیل سے جدا کرتی ہیں۔ پہلے ہم دلِ گداختہ کی اُس جذبی کیفیت کو لیتے ہیں جو عشق و تصوّف دونوں کی پہلی شرط ہے۔ اُردو شاعری کے ابتدائی دَور میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں مثلاً محمد قُلی قطب شاہ والی گولکنڈہ کے یہ شعر ؎

پیا باج پیالہ پیا جائے نا پیا باج یک تل جیا جائے نا
کہے تھے پیا بن صبوری کرو کہا جائے۔ اتا کیا جائے نا
جے عشق نئیں وہ بڑا کور ہے کدھیں اس سے مل بیسیا جائے نا

پیہم سجود پائے صنم پر دمِ وداع مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

دو عالم سوختن نیرنگ عشق است شہادت ابتدائے جنگ عشق است

بہ گیتی ہر کجا دردِ دلے بود بہم کردند و عشقش نام کردند

یہاں محبت پر میر کے ایک قطعے کا حوالہ خاص طور پر برمحل معلوم ہوتا ہے ؎

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نُور نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور

محبت مسبب، محبت سبب | محبت سے آتے ہیں کارِ عجب
* * * * * * * *
محبت ہی اس کارخانے میں ہے | محبت سے سب کچھ زمانے میں ہے
* * * * * * * *
محبت کی آتش سے اخگر ہے دل | محبت نہ ہوئے تو پتھر ہے دل
* * * * * * * *
محبت سے پروانہ آتش بجاں | محبت سے بلبل ہے گرمِ فغاں

اس منزل کے بعد مجازی عشق کو عشق الٰہی کا رنگ دے دینا اور مسائل عرفان و سلوک کو شعر کا لباس پہنانے کے لئے کاروبارِ عاشقی کے طور پر بیان کر دینا کون سا مشکل رہ جاتا ہے۔ داغ کے اس شعر کے متعلق تو شاید شبہ کیا جا سکے کہ معلوم نہیں کہ مجاز کا مضمون بیان کیا ہے یا معرفت کا ۔

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں | صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

گر ذوق کا یہ شعر دیکھیے ۔

پردہ درِ کعبہ کا اُٹھانا تو ہے آساں | پر پردۂ رخسارِ صنم اُٹھ نہیں سکتا

یہاں صنم سے مراد قطعاً ذاتِ باری تعالےٰ ہے۔ اگرچہ صنعتِ ذو معنیین جو صوفیانہ شاعری کی پہلی شرط ہے۔ یہاں نمایاں طور پر موجود ہے۔ شاعری میں تصوّف کے اور مضامین دیکھئے، وہ بھی تمام تر عشق کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں ۔

تہمت زدہ ام کرد بہ عشق دگرے کاش | پرسند کہ غیر از تو بہ عالم بدگرے ہست

اس شعر میں وحدت الوجود کو جو تصوّف کا خاص مسئلہ ہے معشوق کی یکتائی کے ساتھ کس خوبی سے ملا دیا ہے۔ اسی طرح عرفی کا شعر ہے ۔

عالمے در جلوہ و عاشق نہ بیند غیر دوست | گر ز مجنوں پرسی اندر کارواں یک محمل است

الٰہیات کے بعض مضامین بیان کرنے میں عشق کا پردہ بہت ہی ہلکا رہ جاتا ہے لیکن اس کی موجودگی پھر بھی ناقابلِ انکار ہے ۔

طغیانِ ناز بیں کہ جگر گوشۂ خلیل | سر زیر تیغ داد و شہید کشش نمی کنند

عجیب اتفاق یہ ہے کہ آزاد مشربی اور رندی کے مضامین میں بھی عشاق اور صوفیہ متحد ہو گئے۔ ایک گروہ قیدِ معاشرت سے آزاد تھا، دوسرا قیدِ شرع سے۔ چنانچہ اس بات پر بھی نہایت آزادی سے فخر کا اظہار ہونے لگا کہ ہمارا ظرف متشرع جماعت کے ظرف سے بہت بڑا ہے۔ غالب کہتا ہے ۔

ہر چہ فلک نخواست است ہیچ کس از فلک نخواست　　　ظرفِ فقیہ مے نہ جُست بادہ، ما گزک نخواست

اور خواجہ حافظ نے تو اپنی سوسائٹی کے اقانیم اربعہ کو ایک ہی شعر میں کوس ڈالا ہے

نہ قاضیم نہ مدرّس نہ محتسب نہ فقیہ　　　مرا چہ سود کہ منع شراب خوارہ کنم

دعائے پیر مغاں گر اے زاہد مرا ایں گو　　　کہ ایں آوارۂ کوئے بتاں آوارہ تر بادا

تصوّف و شعر کے اس اتحاد سے رندی و خراباتی اور شراب و ساقی کو بھی ایک متین اور بلند مفہوم مل گیا ہے

رازِ درونِ پردہ ز رندانِ مست پرس　　　کیں حال نیست صوفیِ عالی مقام را

بے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید　　　کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسمِ منزلہا

اگر تصوّف کی چاشنی اس کے ساتھ شامل نہ ہو جاتی تو ہماری عشقیہ شاعری کیا رنگ اختیار کرتی، اس کے متعلق اب صرف از روئے قیاس کچھ کہا جا سکتا ہے۔ پھر بھی اس نتیجے تک پہنچنا شاید دشوار نہ ہو کہ عشق و محبت کا موضوع چونکہ بہرحال بازاری عورتیں تھیں اس۔ عجب نہیں کہ ہماری شاعری کا ایک بہت بڑا حصّہ اس قسم کے اشعار پر مشتمل ہوتا ہے

کسی کی محرمِ آبِ رواں کی یاد آئی　　　حباب کے جو برابر کوئی حباب آیا

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ　　　دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ

غبار آلود ہے پائے حنائی　　　رُلا کر آئے ہیں مدفن کسی کا

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ تصوّف نے عشقیہ شاعری کو رکیک ابتذال سے محفوظ کرنے میں مشرق کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دی لیکن سوال یہ ہے کہ محبوب کی ذات کا کوئی بلند اخلاقی تصوّر قائم کرنے میں بھی اس نے ہمارے شعراء کی کچھ رہنمائی کی یا نہیں۔ میرے نزدیک اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔ اس مسئلے پر میں یہاں کسی قدر تفصیل سے بحث کروں گا۔

سب سے پہلے ہمیں مشرقی محبوب کی وہ تصویر دیکھنے کی کوشش کرنی چاہیئے جو شعراء کے کلام میں ہمیں ملتی ہے۔ یہاں ابتدا ہی کو اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ معشوق کے شاہدِ بازاری ہونے کا اثر بڑے بڑے اساتذہ میں بھی جگہ جگہ نمایاں ہے

آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو　　　ہے بوالہوسوں پر بھی ستم ناز تو دیکھو

اُس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک — شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

نہ ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے — پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے

لگے مُنہ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب — زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا

خاموشی ما گشت بد آموز بتاں را — زیں پیش وگرنہ اثرے بود فغاں را

از یک حدیثِ لطف کہ آں ہم دروغ بود — امشب ز دفتر گلہ صد باب شستہ ایم

ہر چہ بخواہی بگو کایں ہمہ دشنام تلخ — چوں بہ لبت می رسد شہد و شکر می شود

کار با مطربۂ زہرہ نہادے دارم — گر لبم نالہ بہ ہنجار سراید چہ عجب

جہاں معشوق کا نقشہ وہ ہو جو ان اشعار اور اس قسم کے ہزاروں اور اشعار میں ہم کو نظر آتا ہے۔ وہاں معشوق کی ذات کا کسی بلند اخلاقی تصور سے وابستہ ہونا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے مشرقی شاعری میں محبت کے جذبے نے ایک ایسی صورت اختیار کی جس کی مثال مغرب کی شاعری میں کہیں نہیں ملتی۔ مشرقی محبوب کہیں بھی اخلاقِ حسنہ کے تصور پر پورا نہیں اُترتا اور نہ عاشق کو یہ خیال ہوتا ہے کہ اس کے محبوب میں کوئی نیکی موجود ہے۔ جہاں کہیں نیکی کا ذکر آبھی جاتا ہے وہاں بدی کا پہلو ضرور ساتھ ہی اُبھر آتا ہے۔ غالب کے یہ دو شعر دیکھئے ؎

ضد کی ہے اور بات مگر خُو بُری نہیں — بھولے سے اس نے سینکڑوں وعدے وفا کئے

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے — جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

اگر جذبۂ عشق کی تحلیل کی جائے تو ظاہر ہوگا کہ اس کا نقطۂ آغاز وہ لذت ہے جو مخالف جنس کے حُسن کے نظارے سے حاصل ہوتی ہے لیکن جوں جوں اس جذبے میں لطافت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ یہ استلذاذ نظر کے علاوہ باقی تمام حواس (لمس، سمع، شم) تک جا پہنچتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ جسمانی مشقت بھی لذیذ معلوم ہوتی ہے جو محبوب کی خاطر برداشت کی جائے۔ اس سے آگے بڑھ کر یہ لطیف

جسمانی لذت عقلی اخلاقی یا روحانی سرور کی شکل بھی اختیار کر سکتی ہے اگرچہ پھر عاشق کی رسائی اس منزل تک نہیں ہوتی۔ بہرحال عشق سے مراد یہ ہے کہ انسان کی پوری ہستی کسی دوسرے کے حوالے ہو جائے اور اس کی زندگی کی تمام لذتوں اور مسرتوں کو کسی دوسرے سے نسبت ہو۔ عشق میں عاشق کو اپنی ناتمامی کا احساس ہوتا ہے اور اسے محبوب سے واصل ہو کر اپنی تکمیل کی آرزو پیدا ہوتی ہے۔ مشرق میں یہ تکمیل پوری شخصیت کی تکمیل کبھی نہیں ہوتی۔ اس تکمیل میں جسمانی اور عقلی پہلوؤں کو تو دخل ہوتا ہے یعنی محبوب کے حسن اور اس کی ظرافت، ذکاوتِ حس وغیرہ کا ذکر تو ہوتا ہے مگر عاشق محبوب کے اخلاقی فضائل کی طرف کوئی اشارہ نہیں کرتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ محبوب کی اس ظاہری حیثیت کے بیان کیا شعراء نے بہت سی لطافتیں پیدا کی ہیں۔ اور حُسنِ جسمانی کے بہت سے نازک پہلوؤں پر ان کی نظر گئی ہے مثلاً ؎

شوخی نہیں کرشمہ و ناز و خرام نیست — بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

لطیفہ ایست نہانی کہ عشق از و خیزد — کہ نام آں نہ لبِ لعل وخط زنگاریست

بجلی اِک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا — بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

لیکن محبوب کا حُسن چونکہ تمام رُوحانی کیفیتوں سے بے نیاز ہوتا ہے۔ اس لئے طبیعت کا پستی کی طرف مائل ہو جانا کچھ عجب نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے عشق و ہوس کا امتیاز جس شدت سے مشرقی شاعری میں نظر آتا ہے مغربی شاعری میں اس کا شائبہ تک موجود نہیں۔ خواجہ حافظ کا ایک نہایت دلکش شعر ہے ؎

تند آمیختہ با گل نہ علاجِ دلِ ماست — بوسۂ چند بیامیز بہ دشنامے چند

اس شعر کی لطافت سے انکار نہیں لیکن مغربی شاعر کبھی اس موضوع کا ذکر اس انداز میں نہیں کرتا۔ کیونکہ وہاں محبوب عورت کی حیثیت اور ہے۔ دیکھئے اسی مضمون پر شیلے کس پاسِ احترام سے لکھتا ہے ؎

I fear thy kisses gentle maiden

شیریں ادا دوشیزہ! تیرے بوسے مجھ پر ایک خوف طاری کر دیتے ہیں۔

Thou needest not fear mine

لیکن تو میرے بوسوں سے خائف کیوں ہے ؟

My spirit is too deeply laden

میری (محزون) روح اتنی گراں بار ہو رہی ہے۔

Ever to burthen thine.

کہ تیری روح کبھی اس کا بوجھ محسوس نہیں کر سکتی ۔

I fear thy mien, thy tones, thy motion,

مجھے تیرا حسین چہرہ، تیری آواز، تیری ایک ایک حرکت ہراساں کر دیتی ہے

Thou needest not fear mine.

لیکن تُو مجھ سے کیوں خائف ہو؟

Innocent is the heart's devotion

اُس دل کا نیاز بالکل بے لوث ہے ۔

With which I worship thine.

جس سے میں تیری پرستش کرتا ہوں۔

عاشق کے دل میں مشرقی محبوب کا کوئی اخلاقی احترام نہیں ہوتا۔ اس کی عظمت خالص جنسی یا جمالیاتی ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ طوائفوں کا وجود نظامِ معاشرت کے اصل مرکز سے باہر تھا۔ سوسائٹی میں اُسی شخص کی عزت ہے جو سوسائٹی میں اپنے منصب کا حق ادا کرے۔ طوائفوں کو ماں یا بہن کی حیثیت سے سوسائٹی میں کوئی منصب حاصل ہی نہ تھا۔ اس لئے سوسائٹی کے اخلاقی احکام بھی ان پر سختی سے نافذ نہ کئے جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شعرا نے معشوق کا جو تصور قائم کیا وہ سوسائٹی کے اخلاقی احکام کی حد سے باہر تھا چنانچہ کسی قسم کے فضائلِ اخلاق اس تصور سے وابستہ نہیں ہو سکے۔

اس موقع پر تصوف بھی عشق و محبت کی مدد نہیں کر سکا۔ صوفیانہ شاعری میں فضائل معاشری سے بلند تر چیزیں ہی بیان ہو سکیں۔ کیونکہ جس ہستی کا ذکر وہاں تھا وہ مافوق الانسان اور اس لئے معاشرت کے اخلاقی احکام سے بالاتر تھی۔ یہ توجیہ صحیح ہو یا غلط، اتنا یقینی ہے کہ صوفی شعرا کے کلام میں ہستیٔ مطلق کا تصور بحیثیتِ سرچشمۂ حُسن کے تو ہے لیکن بحیثیت سرچشمہ خیر کے کہیں نہیں ہے "صوفی" کا خدا نیکی کا خدا ہو تو ہو مگر "صوفی شاعر" کا خدا یکتائی، بے نیازی اور کبریائی کا خدا ہے۔ چونکہ مشرقی محبوب میں کوئی اخلاقی صفات نظر نہیں آتے تھے اس لئے صوفی شعرا مجبور تھے کہ خدا کے اخلاقی صفات کو بھی بالکل نظر انداز کر دیں۔ تصوف کا بلند سے بلند شعر لے لیجئے اس میں یہی بات نظر آئے گی ؎

اے کہ ز دیدہ غائبی در دلِ ما نشستہ　　　　حُسنِ تو جلوہ می کند ویں ہمہ پردہ بستہ

مدار جلوہ دریغ از دلم کہ خرمن حسن — بخوشہ چینیٔ آئینہ کم نمی گردد

اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا — جو دوئی کی بُو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

مشرقی اور مغربی شاعری میں یہی فرق ہے کہ مشرقی شاعر جب عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی کی طرف بڑھتا ہے تو معشوق اور خدا کو ایک کر دیتا ہے ؎

اللہ رے یہ رُتبہ معشوق کا محشر میں — اللہ بھی مجنوں کو لیلےٰ نظر آتا ہے

برعکس اس کے مغربی شاعر کے ذہن میں شدید روحانی ہیجان کے وقت بھی یہ وحدت قائم نہیں ہوسکتی۔ خدا اور محبوب کی دوئی ہر صورت میں قائم رہتی ہے۔ لیکن اس سے مرد اور عورت کی باہمی محبت میں ایک ایسی پاکیزگی اور روحانی بلندی پیدا ہوجاتی ہے جو مشرقی شاعری میں کہیں نظر نہیں آتی۔ فرانسیسی شاعر اور افسانہ نویس وکٹر ہیوگو اپنی ایک نظم میں کہتا ہے ؎

میں نے اُس ساعدِ سیمیں کو جس میں ہلکی سی لرزش تھی۔

محبت سے دبایا۔ اور ہمارے دلوں نے عشق کی جاں نواز فتح مندی کا اقرار کیا۔

خدا کی روحِ عظیم الشان، پیاری پیاری رات پر چھائی ہوئی تھی۔

محبت ہمارے دلوں پر چھا رہی تھی۔ ستاروں کا نور جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔

اور ستاروں نے دھیمی دھیمی سرگوشیوں میں فضائے حسین کے خدا سے کہا: "ہم جانتے ہیں، اے ازل و ابد کے خداوندا!

اے ہمارے پیارے مالک، سب عشق و محبت تجھ سے ہے، ہم نورِ محبت ہی سے تو فروزاں ہیں! حسن کو تو نے ہی بنایا ہے!"

اس تمام بحث سے نتیجہ یہ نکلا کہ تصوّف کے اثر کے باوجود مشرقی شاعری کا محبوب اخلاقی صفات سے متصف نہیں ہوسکا۔ یہاں بھی عربی شاعری نے ایک حد تک الگ رُخ اختیار کیا ہے۔ کیونکہ عرب کی عورتیں جو اظہارِ عشق کا موضوع تھیں معاشرت کے اخلاقی دائرے سے باہر نہ تھیں قبیلے کی اخلاقی ذمہ داریاں ان پر بھی اسی طرح عائد ہوتی تھیں جس طرح مردوں پر۔ عربی معاشرت کے نزدیک جو چیزیں نیکیاں تھیں وہ عربی محبوب کے لئے بھی نیکیاں تھیں۔ عربوں کے فضائلِ اخلاق، شجاعت، مہمان نوازی وغیرہ میں عورتیں مردوں کے ساتھ برابر کی شریک تھیں۔ چنانچہ شاعر اپنی بیوی یا محبوبہ سے بلاتکلف خطاب کرتا ہے :-

يَا رَبَّةَ الْبَيْتِ قومي غيرِ صاغرةٍ — ضُمّي اِلَيْكِ رحالَ القَوْمِ وَالقُرُبا

اے میری گھروالی تو اپنی شان عظمت و غرور کے ساتھ اُٹھ ـــ اور اس مہمان جماعت کے کجاوے اور تھیلے اپنے پاس سنبھال کر رکھ لے (یعنی اپنی حفاظت میں لے لے خود اپنی عظمت نہیں گھٹے گی کیونکہ یہ فرض ہم اپنے ذمے لے چکے ہیں)

زمانۂ جاہلیت میں عورتیں محاربین کے عقب میں ٹھیرائی جاتی تھیں اور لڑنے والوں کے دل ان کے قرب کی وجہ سے قوی رہتے تھے۔ عمرو ابن معدی کرب جو بعد میں مسلمان ہوگیا کہتا ہے ؎

لَمَّا رَأَيْتُ نِسَاءَنَا يَفْحَصْنَ بِالْمَعْزَاءِ شَدًّا

جب میں نے دیکھا کہ ہماری عورتوں کے بھاگتے ہوئے قدم سنگلاخ زمین میں گہرے نقوش چھوڑتے جا رہے ہیں

وَبَدَتْ لَمِيسُ كَأَنَّهَا بَدْرُ السَّمَاءِ إِذَا تَبَدَّى

اور لمیس نے اپنا چہرہ یوں دکھا دیا جیسے آسمان پر بدر کامل طلوع ہوتا ہے

وَبَدَتْ مَحَاسِنُهَا الَّتِي تُخْفِي وَكَانَ الْأَمْرُ جِدًّا

اور اپنے چھپے ہوئے حسن و جمال کو آشکار کر دیا ، اُس وقت تو معاملہ واقعی حد سے گزر گیا

نَازَلْتُ كَبْشَهُمْ وَلَمْ أَرَ مِنْ نِزَالِ الْكَبْشِ بُدًّا

میں اُن کے سردار پر ٹوٹ پڑا کیونکہ اُس پر ٹوٹ پڑنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا

اسیمہ پر الشنفری الازدی کے مشہور اشعار کی طرف یہاں اشارہ کرنا ہی کافی ہوگا ۔ ان مثالوں سے اتنا ظاہر ہو جاتا ہے کہ اُردو اور فارسی کے خلاف عربی شعرا نے عورت کا جو تصور پیش کیا وہ ان کی معاشرت کی مجموعی تحریک سے منفصل نہیں تھا لیکن با ایں ہمہ یہ بھی ظاہر ہے کہ بعض ایسے نرم و لطیف محاسن جو خاص طور پر نسوانیت کا زیور ہیں اور مغرب میں عورت کے اخلاقی مرتبے کو بہت بلند کر دیتے ہیں ۔ عربی معاشرت میں مفقود تھے ۔ نسوانی احترام کی وہ پاکیزہ جھلک جو ہمیں ڈینٹے اور اس کے بعد کے کئی یوروپین شعرا میں ملتی ہے عربی شاعری میں بھی نظر نہیں آتی ۔ مثلاً ڈینٹے کہتا ہے ؎

سر رہگزار میرا سلام لیتے ہوئے

میرے دل کی ملکہ پر حلم اور پاکیزگی کا ایسا نور برستا ہے

کہ زبان تھرا جاتی ہے اور اسے کچھ کہنے کا یارا نہیں رہتا

اور آنکھیں جو اس کے دیکھنے کو بے چین ہوتی ہیں ، اس کے نظارے کی تاب نہیں لا سکتیں ۔

اور ہر طرف سے تحسین کی آوازیں سُننے کے باوجود

وہ اپنے انکسار کی قبا زیب تن کئے اطمینان سے چلی جاتی ہے ۔

اُس وقت وہ ایک ایسی ہستی معلوم ہوتی ہے جو آسمان سے زمین پر صرف اِس لئے بھیجی گئی ہو

کہ انسان اپنی آنکھوں سے ایک معجزے کا ظہور دیکھ لے ۔

یہ وہ جذبہ ہے جس سے مغربی عشق میں وہ تحریک پیدا ہوئی جسے "رومانی محبت" کا نام دیا جاتا ہے ۔ اس میں محبوب کے حسنِ باطن پر بہت زیادہ زور ہوتا ہے اور مذہبی جذبات اور روحانیت کے عناصر اس کے ساتھ نمایاں طور پر ملے ہوئے ہوتے ہیں ۔ عربی شعرا

کے مذہب میں کسی قسم کی روحانیت کو دخل نہ تھا۔ اس لئے محبت کی یہ شکل تو وہاں پیدا ہو بھی نہ سکتی تھی لیکن ویسے بھی عربی شاعری میں بحیثیت مجموعی محبوب کے خارجی صفات ہی عاشق کا سرمایۂ حیات ہیں۔ جو مثالیں میں نے پہلے دی ہیں ان سے بھی یہ ظاہر ہے کہ عربی عاشق کے لئے عورت نہ نفسہا روحانی قوت کا سرچشمہ نہیں تھی بلکہ اس کے حسن ظاہر سے شاعر کی شجاعت حمیت یا مروت کے جذبات کو حرکت ہوتی تھی۔ قیس عامری کا یہ شعر سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے لیکن ڈینٹی کے مندرجہ بالا اشعار سے اگر اس کا مقابلہ کیا جائے تو ایک ہی نظر میں معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ عشقیہ شاعری کی ایک مختلف صنف ہے ؎

فَشَابَ بَنُو الیلیٰ وَشَابَ ابنُ بِنْتِھَا ۔۔۔ وَحِرْقَۃُ لَیلیٰ فِی الفُؤادِ کَمَا ھِیَا

لیلیٰ کے بیٹے جوان ہو گئے اور اس کی بیٹی کا لڑکا بلوغ کو پہنچ گیا ۔۔۔ مگر لیلیٰ کے عشق کی آگ دل میں اُسی طرح بھڑک رہی ہے۔

یہ شعر بے حد پاکیزہ اور پُراثر ہے لیکن عربی اشعار کی بے شمار اکثریت بہت وضاحت کے ساتھ یہ ثابت کر دیتی ہے کہ عربی شاعری محبوب کے جسمانی تصور پر زیادہ قائم رہی۔ یہ شعر دیکھئے ؎

مَحَاسِنُھَا لِاَعْیُنِنَا نِھَابٌ ۔۔۔ وَاَنْفُسُنَا لِاَعْیُنِنَا نِھَابٌ

ہماری آنکھیں اس کے حسن و جمال کو لوٹتی ہیں ۔۔۔ اور ہمارے جان و دل کو اس کی آنکھیں تاراج کرتی ہیں

فَوَاللہِ لَوْ لَا خَشْیَۃُ النَّاسِ وَالْحَیَا ۔۔۔ لَعَانَقْتُھَا بَیْنَ الْمَقَامِ وَزَمْزَمِ

بخدا اگر لوگوں کا خوف اور حیا دامنگیر نہ ہوتی ۔۔۔ تو میں مقام اور زمزم کے درمیان ہی اس سے ہمکنار ہو جاتا

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ مشرقی عشق کی ترکیب کچھ اخلاقی عناصر سے بھی ہوئی ہے یا اسے تمام تر لذت حواس سے سروکار رہا ہے ہمارے شعرا نے معشوق کا جو تصور قائم کیا ہے وہ اخلاقی حدود سے بالاتر ہے یا کم از کم ان سے باہر ہے۔

بعض دفعہ بیچارے عاشق کو خود بُرا بننا پڑتا ہے تاکہ معشوق کی عیب پوشی ہو ؎

بہ بدی در ہمہ جا نام برآرم کہ مباد ۔۔۔ خون من ریزی و گویند سزاوار نہ بود

مغربی عاشق اپنے آپ کو معشوق کے قابل ثابت کرنے کے لئے غالباً اپنی نیک نامی کا اشتہار دیتا۔

اگر معشوق کی شوخی ظرافت لطیف رمز و کنایہ اور نزاکت فہم و بیان سے قطع نظر کیا جائے تو مشرقی معشوق کے متعلق جو کچھ بھی ہم کہہ سکتے ہیں اس کا خلاصہ حافظ کے اس شعر میں موجود ہے ؎

پرسیدم از طبیبے احوال دوست گفتا ۔۔۔ فی بعدھا عذاباً فی قربھا السلامہ

حقیقت یہ ہے کہ مشرق کی عشقیہ شاعری میں اخلاقی زندگی کا سُراغ عاشق کی ذات تک پہنچتا ہے۔ عاشق کے عشق کا کمال ہر جگہ بتلاتا ہے معشوق کے نقائص و عیوب کو اس لئے جلا دی گئی ہے کہ عاشق کی غیر مشروط وفاداری زیادہ نمایاں ہو جائے ؎

مرتا ہوں اُس آواز پہ ہر چند سر اُڑ جائے　　جلاد سے لیکن وہ کہے جائیں کہاں اور

وب کا تمام جور و جفا اس لئے ہے کہ عشق کے کمال کو اور چمکائے جو شخص جفائے دوست سے گھبرا جائے وہ عاشق نہیں بوالہوس ہے۔ ہر عاشق صادق ن کی راہ میں بڑی سے بڑی سختیاں اُٹھانے کے لئے تیار رہی نہیں۔ بلکہ مضطرب رہتا ہے ؎

وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ　　ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

ستم کوشی میں بھی عشق کی انتہائی بلندی تک پہنچنے کے لئے بہت سے مدارج طے کرنے پڑتے ہیں ؎

جائے ہنوز نیست بہ ذوقِ دیارِ عشق　　ہر چند جور ہست و ستم ہست و داد نیست

ں منزل سے گزرنا در اصل انسانیت کی تکمیل ہے محض زہد و ریاضت سے کوئی شخص خدا کی رحمت کا بھی سزاوار نہیں ہو سکتا ؎

یارب بہ زاہداں چہ دہی خُلد رائگاں　　جورِ بتاں نہ دیدہ و دل خوں نہ کردہ کس

اس بحث سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ صوفیا کے خاص کمالات صبر و رضا، حلم و توکل اور قناعت کس طرح عشقیہ شاعری کے بیان میں سانی سما سکے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ شاہدانِ بازاری نے بھی عشق میں ایثار و فدویت کے جذبے کی بلند ترین شکل پیدا کی۔ غالب کا یہ شعر کیھیے۔ اس میں کتنا عظیم الشان جوش اور خلوص ہے اور شاعر نے کس خوبی سے معشوق کے عیوب میں سے بھی عاشق کا اخلاقی کمال پیدا کیا ہے ؎

ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی　　جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

وہ سوز و گداز جو اس طرح طبیعت میں آجاتا تھا۔ اس سے روح کی تطہیر ضرور ہوتی تھی ؎

ہیچ اکسیر بہ تاثیرِ محبت نہ رسد　　کفر آوردم و در عشق تو ایماں کردم

جس تمدن کے آغوش میں عشق کے اس تصور نے پرورش پائی تھی وہ گزشتہ صدی میں اپنی آخری ہچکی لے چکا ہے۔ انیسویں صدی نے ری مشرقی تہذیب کا زوال ہی نہیں بلکہ دُنیا کے ایک عظیم الشان ادبی دور کا خاتمہ دیکھا ہے۔ ہمارا شاعرانہ کمال بھی ہماری تہذیب کے ساتھ رخصت ہو چکا ہے۔ ہماری نئی شاعری میں ابھی اتنی بھی قوت پیدا نہیں ہوئی کہ ہم اسے اپنے قدیم اساتذہ کے جوش، وسعت اور زندگی سے نسبت دینے کا خیال کر سکیں۔ حافظ اور غالب کے پائے کے شعراء پیدا کرنے کے لئے ابھی ہمیں ایک زمانہ درکار ہے۔ عہدِ حاضر میں ہماری عشقیہ شاعری کے امکانات کیا ہیں؟ اس کا قطعی جواب دینا ابھی ممکن نہیں۔ لیکن معاشرتی حالات میں ایک تبدیلی ضرور ہو رہی ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ نظامِ خاندانی کو ضعف آ رہا ہے لیکن اس کی اساس پر نظرِ ثانی ضرور کی جا رہی ہے۔ معاشرتی تنظیم کی اس چھوٹی سی اکائی سے مشرقی انسان تنگ کتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ خاندان سمٹتے سمٹتے اب کنبہ بن گیا ہے۔ برادری سے الگ ہونا آسان ہو گیا ہے۔ عورتوں اور مردوں کے آزادانہ میل جول میں روز بروز آسانیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ ہنے پر سیاسی، معاشرتی اور مذہبی حیثیت سے حملے کئے جا رہے ہیں اور آزادیِ نسواں کی تحریک بتدریج قوت پکڑ رہی ہے۔ یہ کہنا دشوار ہے کہ یہ رَد عمل کرے گی لیکن یہ ایک الگ موضوع ہے جس پر بحث کرنے کا یہاں موقع نہیں +

حمید احمد خاں

اُردو

صورتیں اور بھی دُنیا میں ہیں گویائی کی — پر عجب شان ہے اُردو تری زیبائی کی
دھوم عالم میں مچی ہے تری یکتائی کی — تیری شوخی کی، نزاکت کی، دل آرائی کی

تیرے انداز نرالے، تری گھاتیں پیاری
تیرے مضمون انوکھے، تری باتیں پیاری

رونقِ بزمِ جہاں، حُسنِ لطافت تیرا — چرخِ اقلیمِ سخن، اوجِ بلاغت تیرا
چشمۂ فیض ہے، آئینِ سلاست تیرا — مایۂ ناز ہے، گلزارِ فصاحت تیرا

یہ تری طرزِ ادا، یہ تری شیریں گفتار!
کون ہے جو نہ اس انداز پہ ہو جائے نثار!

جو ملا تجھ سے وہ تفریقِ جہاں بھول گیا — قومیت بھول گیا، نام ونشاں بھول گیا
صوبہ و ملک کُجا، اپنا مکاں بھول گیا — مختصر یہ ہے کہ وہ اپنی زباں بھول گیا

جُملہ اقوام کو آپس میں ملایا تُو نے!
آ کے دُنیا میں یہ اعجاز دکھایا تُو نے!

محمود اسرائیلی

(منقول از زمانہ)

اُردو

اُردو کے تین ربع کے مالک ہیں خود ہنود — پھر کیا سبب جو اس سے اُنہیں انحراف ہے
یعنی اُردو ہے چیز اُنہیں کے مذاق کی — اُردو کی تین جزو یہی صاف صاف ہے

قوم کیسی، کس کو اب اُردو زباں کی فکر ہے — غم غلط کرنا ہے بس اور آب و ناں کی فکر ہے
ایک پر اجماع اکثر کا بہت مشکل ہے اب — سب ہیں مضطر اپنے مُنہ مٹھو میاں کی فکر ہے
ہو نہیں سکتی مرتب کوئی بزمِ سامعیں — ہر زباں کو ایک تازہ داستاں کی فکر ہے

ہے تگاپو اس قدر مرکز مگر کوئی نہیں — فرنیچر ہم لے رہے ہیں اور گھر کوئی نہیں

دل میں جو پڑ گئی ہے گرہ کھول ڈالئے — اِک دم میں کُل متاعِ سخن تول ڈالئے
ترکیب ہے ترقیِ اُردو کی بس یہ خوب — جو آپ بول سکتے ہیں سب بول ڈالئے

اوروں کی کہی ہوئی جو دُہراتے ہیں — وہ فونوگراف کی طرح گاتے ہیں
خود سوچ کے حسبِ حال مضمون نکال — انسان یونہیں ترقیاں پاتے ہیں

اُردو میں جو سب شریک ہونے کے نہیں — اس ملک کے کام ٹھیک ہونے کے نہیں
ممکن نہیں شیخ امرءالقیس بنیں — پنڈت جی والمیک ہونے کے نہیں

اکبر

اُردو

مہمان کو، بالخصوص ایسے مہمان کو جسے معلوم ہو کہ میزبان نے اپنا مطلب نکالنے کے لئے مجبور ہو کر اسے مدعو کیا ہے جس کی حیثیت چھپانے نہ چھپے اور بھلانے نہ بھولے جس کی خو بو، نشست برخاست میزبان کے گھرانے سے بالکل الگ ہو۔ کس قدر مصیبت کا سامنا ہوتا ہے: دل میں سوچتا ہے کہ کہاں آگیا اور کیوں آگیا: رہوں کہ جاؤں؛ پرایا گھر قید خانے سے کم نہیں۔ ایک طرف مہمان کا یہ حال ہوتا ہے تو دوسری طرف میزبان کے خویش واقربا فطرتی تقاضے سے مجبور چہ میگوئیوں سے باز نہیں رہ سکتے۔ کوئی گُل طویل کا فقرہ چست کرتا ہے تو کوئی ان کی آوازے کانوں میں اُنگلیاں دیتا ہے۔ کوئی دبی زبان سے کوئی علانیہ "جی ہاں۔ ان کا رہنا ہو چکا۔ تم دیکھ لینا جو دو چار دن میں نہ بھاگ نکلیں۔ اونٹ، بھیڑ، بکری میں کیا رہے گا!" یہ سب کچھ کہا جاتا ہے، محسوس کیا جاتا ہے مگر ضروریات زندگی وہ بلائے بے درماں ہیں کہ متعدد مثالوں میں یگانگی پیدا کر ہی دیتی ہیں۔

اس پُر لطف دو طرفہ کشمکش کا ڈراما رائج الوقت اُردو میں دلفریب منظر پیش کر رہا ہے۔ "مولینا" "علے ہذا القیاس" تو کسی نہ کسی طرح ہندی الوطن ہو گئے مگر "مسمیان" "علے رؤس الاشہاد" اور "علی الرغم" ابھی تک یہاں کے گلی کوچوں سے پورے آشنا نہیں ہوئے اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ لوگ جو "عین" "قاف" کے بھاری ڈول حلق کے گہرے کنوئیں سے کھینچنے میں مشاق ہیں یہ کیا ان سے منوں بوجھل جملے قومی جلسوں میں تڑاق پڑاق بولتے چلے جاتے ہیں اور ان کی تحریروں میں تو "نظریہ" "مطمح نظر" "نصب العین" "قائد" "مدیر" وغیرہ وغیرہ کے وہ جال تنتے ہیں کہ زبان کی بیکس چڑیا پھڑپھڑاتی رہ جاتی ہے۔ مگر ذکر ان لوگوں کا ہے نہ ان کے ان پڑھ نقالوں کا، نہ صرف عرب یا مصر کے مہمانوں کا۔ انگریزی ہی کو دیکھئے۔ کس قدر عجیب ہے کہ "ڈبل" جیسا موٹا بھینسا تو بن بلائے دندناتا ہوا آ گھسے مگر مس "تھیوری" جیسی پری کو ادب کے نقیب ہر دفعہ دورباش سنائیں، کارخانوں کے "انجن" اور "انجنیئر" کی تو آؤ بھگت ہو مگر یونیورسٹی سے "آئی ڈیل" اور "آئی ڈیلسٹ" کو ہر دفعہ اطلاعی کارڈ بھیجنا پڑے۔ اسی "مسٹر کارڈ" کی ہر دلعزیزی ملاحظہ کیجئے جو کارڈ نہیں کہہ سکتے وہ "کارڈ" "رڈ" پر زور دے کر کہتے ہیں مگر کہتے ضرور ہیں۔ اس سارے معاملے کی تہ میں جو خفیف سا راز ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ عوام الناس تو صرف پابندِ سلاست ہیں جس لفظ سے جلدی اور آسانی سے صحیح مفہوم ادا ہو سکے اس کا رواج فے الفور ہو جاتا ہے۔ کرکٹ میں "آؤٹ"، کچہری میں "کیس" "ڈسمس" اور گھروں میں "فری پان" "ڈسک" وغیرہ اپنے ہندی الاصل مترادفوں سے زیادہ زبان زد ہیں کیونکہ مطلب کا چھکڑا نہ کبھی رُکا ہے نہ رُکے گا اور جہاں تک بولنے والوں کا تعلق

ہے یہ قانون اٹل ہے۔ ستحریریں البتہ نو واردوں کی دیکھ بھال سختی بلکہ تعصب سے کی جاتی ہے اور کچھ عرصہ سے یہ تعصب بجائے ادبی تہذیب کے خلافتی تشدد ہو چلا ہے جو زبان کے لئے سمِ قاتل ہے۔ اصرار اس بات پر ہے کہ چاہے لکھنے والے کا جی نہ مانے اور چاہے اس کا مطلب فوت ہو جائے مگر انگریزی کا لفظ پاس نہ پھٹکے بلکہ مطالب کی گرفتاری کے لئے قاموس اور صراح کے ٹھنڈے لوہے کو پیٹ پیٹ کر اُلٹی پُلٹی ترکیبوں کی زنجیریں تیار کی جائیں۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ میدانِ علم میں "تھیوری" اور "نظریہ" کی "آئی ڈیل" اور "نصب العین" کی تگ و دو ہوتی رہے۔ کیا تعجب ہے کہ الگ الگ رنگ میں دونوں کام دے جائیں۔ زبان ابھی بنتے بنے گی اور زبانوں کی عمر کے لحاظ سے اُردو ابھی ہے کتنے دن کی؟

اسے آئیں گی شوخیاں آتے آتے

بشرطیکہ اس ہندی نژاد، نام کی تُرکن کی لُوٹ مار چوطرفہ جاری رہے +

فلک پیما

اُردو اور دوسری زبانیں

"ہر زبان کو اپنا دوست سمجھ کر اُس کے الفاظ حاصل کیجئے اور اُردو زبان کو عام فہم اور سب قوموں کی خدمت کے قابل بنا دیجئے!"

(از خطبۂ صدارت آل انڈیا اُردو کانفرنس ۱۹۳۴ء) **محمد اکبر خاں رئیس ہوتی**

اُردو کی کامیابی کا طریقہ

یہ مقابلہ کا زمانہ ہے ہر عمدہ اور ارزاں چیز گھٹیا اور گراں چیز پر فوقیت لے جائے گی۔ خواہ سیاسی قوتیں کتنی ہی سدِ راہ ہوں۔ اگر اُردو کو ہندی کے مقابلے میں زیادہ آسان اور ہر قسم کے ذخیرے سے مالا مال کر دیا گیا تو کوئی وجہ نہیں کہ آنے والی نسلیں اُردو کو فوقیت نہ دیں۔

(از بیدار) **خلیل احمد**

محفلِ ادب

ہندو مسلمان اور ہندوستان کا علم ادب

میرے اہلِ وطن! تمہاری جماعت دو فرقوں سے مرکب ہے۔ ایک ہندو، ایک مسلمان۔ تم جانتے ہو کہ ہندو کون ہیں؟ ہندو وہ ہیں کہ آج ہم جس بات کی آرزو کرتے ہیں وہ اُن کی زبان کا اصلی جوہر ہے۔ اگر بھاشا ہے تو وہ اصلی حالتوں کے ادا کرنے میں سب پر فائق ہے۔ سنسکرت کی قوت نظم خود حد بیان سے باہر ہے۔ کیونکہ مضامین شاعرانہ در کنار۔ اُس نے تاریخ سے لے کر جغرافیہ۔ طب۔ منطق۔ فقہ تک ہر علم کو لیا۔ نظم کی جنتری میں کھینچ لیا۔ دوسرا جز مسلمان۔ جن کی اصل عرب۔ عربی وہ زبان ہے کہ جس میں سر تو بالائے طاق۔ گھروں کی عورتیں بلکہ لونڈیاں جب اپنی جوشِ تقریر پر آتی تھیں تو اُن کا کلام ایک پُر زور نظم ہو جاتا تھا۔ کیا یہ افسوس کی بات نہیں کہ ایسے بزرگوں کی اولاد تم بزرگوں کی میراثوں سے محروم ہو۔ کیا یہ حیف کی جگہ نہیں کہ اوروں کے سامنے ہماری زبان ضعف بیانی کے ساتھ ہزار نقصوں سے مطعون ہو اے خاکِ ہندوستان اگر تجھ میں امرا القیس اور لبید نہیں تو کوئی کالیداس ہی نکال۔ اے ہندوستان کے صحرا و دشت فردوسی اور سعدی نہیں تو کوئی والمیک ہی پیدا کر دو +

(از نیرنگِ خیال) ―――――― آزاد

قدیم اُردو شعراء

قدیم اُردو شعراء کے کلام میں بہتیرے ایسے خیالات ملیں گے جنہیں موجودہ زمانے کا مذاق قبول نہیں کر سکتا یا جو موجودہ معیار کے مطابق پایۂ تہذیب سے گرے ہوئے ہیں۔ مگر محض خیالات کی پستی سے تنگ آ کر ہمیں اُن کے شاعرانہ جوہر کو نہ بھول جانا چاہیئے اور یہ نہ خیال کرنا چاہیئے کہ محض پند و نصائح نظم کرنے کا نام شاعری ہے۔ قدیم اُردو شاعروں کے خیالات بلند نہ ہوں مگر ان کا انداز سخن شاعرانہ ہے اُن کی زبان شاعرانہ تاثیر کا ذخیرہ ہے۔ جو مضامین وہ نظم کرتے ہیں اُن میں اُن کے دلی جذبات کا پرتو نظر آتا ہے یہی شاعری ہے۔

اگر آتش و انیس و غالب کی شاعرانہ وقعت کا صحیح اندازہ ہم سے نہ ہو سکا تو اُن کی شاعری کا قصور نہ تھا بلکہ اپنی قومی بےخبری کے عالم میں جہاں ہم نے زندگی کے بہت سے معاملات میں مغربی تہذیب کے اکثر اصولوں کی غلط تعبیر کی وہاں انگریزی شاعری کے غیر صحیح اندازے سے ہم نے اپنا مذاقِ سخن بھی اُلٹا سیدھا قائم کر لیا۔ زبان و شاعری کی آیندہ اصلاح و ترقی کے لئے قدیم شعراء کے اندازِ سخن اور رنگِ بیان کا صحیح اندازہ کرنا ہمارے لئے نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ جس غیر صحیح مذاقِ سخن کی بنیاد پر ہم قدیم رنگِ سخن کی قدر نہ کر

ہے اُس کی مدد سے ہم زبان و شاعری میں نئے جوہر نہیں پیدا کر سکتے۔

از مضامینِ چکبست، چکبست

ہندی اور اُردو کے حامی

ہندوؤں کا سارا علمی، قومی اور مذہبی لٹریچر ہندی رسم الخط میں ہے۔ ہندی کے حامیوں نے اپنی قدیم تہذیب کو زندہ کرنے کے لئے پوری بے جگری سے کام شروع کر دیا۔ نہایت خوبصورت اور مکمل ٹائپ تیار کیا اور طباعت و کتابت کا تمام حسن و جمال اس کے اندر بھرنے کی کوشش کی۔ ہر قسم کے لٹریچر سے اس کے خزانۂ ادب کو معمور کیا۔ ہر علم و فن کا ترجمہ ہندی زبان میں شائع کیا۔ دفتروں کے منشیوں نے، ڈاک خانوں کے کلرکوں نے، اسکولوں کے ماسٹروں نے، شہروں اور بستیوں کے قومی خادموں نے، امیروں، تاجروں اور رئیسوں نے، مصنفوں اور اخبار نویسوں نے ہر طریق سے اس کی ترویج کی کوشش کی، حکومت پر زور ڈالا، ان پڑھوں کو روشناس کیا اور اس تمام جد و جہد کا یہ نتیجہ ہے کہ آج اُردو والوں کو اُردو زبان کی حفاظت کے لئے فتووں کی ضرورت پیش آ رہی ہے۔ لیکن جب مسلمانوں کے دلوں ہی میں اُردو کی ترویج کا جذبہ نہیں ہے تو فتووں کے نسخے کب تک زندگی برقرار رکھیں گے؀

حرم سرا کی حفاظت کو تیغ ہی نہ رہی　　　تو کام دیں گی یہ چلمن کی تیلیاں کب تک

افسوس اس کا ہے کہ اُردو کے حامی صرف جذباتی ہنگامہ آرائی سے کام لے کر کامیاب ہو جانا چاہتے ہیں اور ٹھنڈے دل سے کبھی اس امر پر غور نہیں کرتے کہ ہندی کی ترویج اور اُردو کے عدمِ ترویج کے اسباب کیا ہیں۔ ہندی کے حامیوں نے منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے عملی تدابیر ہی سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے علمی اور فنی اعتبار سے بھی قابلِ تعریف کام کیا ہے۔ انہوں نے ہندی رسم الخط کی خامیاں دور کرنے میں کسی قسم کی قدامت پرستی کو دخل نہیں دیا اور باوجودیکہ ہندی رسم الخط اپنی تحریر و کتابت کے اعتبار سے نہایت طویل، صبر آزما، وقت انگیز اور پیچیدہ ہے۔ اور بہت سے حروف و اصوات سے محروم ہے۔ پھر بھی ہندی والے مایوس نہیں ہیں اور اس میں مسلسل اصلاح کرتے جاتے ہیں۔ انہوں نے ہندی میں بہت سے نئے حروف کا اضافہ کیا ہے۔ کاما، کولن، سیمی کولن وغیرہ شامل کئے ہیں اور اب اس فکر میں ہیں کہ اسے اور زیادہ سہل بنایا جائے لیکن اُردو کے حامی؛ تو اُن کی حالت بالکل عجیب ہے وہ جانتے ہیں نستعلیق کا ٹائپ تیار کرنا محالات سے ہے۔ بڑی بڑی ریاستیں بھی اس مسئلے میں کامیاب نہیں ہو سکیں۔ ان کو معلوم ہے کہ ٹائپ کے بغیر کسی زبان کا زندہ رہنا ناممکن ہے اور وہ ہندی تو درکنار کسی معمولی سے معمولی زبان کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتی لیکن بجز "اُردو کی حفاظت کرو اور یہ ہماری مذہبی اور قومی زبان ہے" کے نعرے لگانے کے اصلاح کی طرف ایک قدم نہیں بڑھاتے۔ وہ جسم کے امراض کا علاج نہیں کرتے۔ بلکہ یاقوتیاں اور مفرحات کھلا کر مریض کو سکون و قرار دینا چاہتے ہیں اُن کی اُردو کانفرنسیں بیکار ہیں۔ اُن کے ممبر اور گھوڑوں کی پرورش میں مصروف ہیں۔ ان کا تعلیم یافتہ طبقہ انگریزی اخبارات و کتب پڑھتا ہوا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ

وہ اپنی نجی مجالس میں بھی اُردو بولنے کی بجائے انگریزی بولتے ہیں۔ اُن کی قومی کانفرنسوں کے خطبے انگریزی میں چھپتے ہیں۔ ان کی تجاویز انگریزی میں مرتب ہوتی ہیں۔ پھر جب حالت یہ ہے تو اس کی توقع کیوں کی جائے کہ اردو زندہ رہے گی۔ حقیقت میں حیرت تو اس بات پر ہے کہ وہ زندہ کیوں ہے۔

(مدینہ)

اُردو کو قومی زبان بنانا

قوم کی زبان بنانا یا اسے ہر پہلو سے ترقی دینا ایک انسان یا ایک جرگہ کا کام نہیں۔ اس کے لئے جمہور متعلقہ کی مساعی درکار ہیں۔ کام جو کرنا ہے۔ وہ بے اصول توسیع کا نہیں بلکہ اس میں زبان کی تہذیب و تدوین بھی شامل ہے۔ اس کی علمی استطاعت میں ترقی کے ساتھ اس کی لطافت اور ترنم کا بھی لحاظ رکھنا ہے۔ الفاظ کے ذخیرہ اور محاسن ادبی کی بھی توفیر لازم ہے۔ اور یہ بھی مدنظر رکھنا ہے کہ جو خوبیاں پہلے سے اُردو میں موجود ہیں وہ کہیں زائل نہ ہو جائیں۔ اس کام میں پنجاب دہلی اور لکھنؤ کے ساتھ مل کر ممتاز اور نمایاں حصہ لے سکتا ہے۔ کیں میں انگریزی داں، عربی داں اور سنسکرت داں اہلِ زبان اور غیر اہلِ زبان سخن سنج اور ناظم و ناثر علمی اشغال میں مصروف کار اور صاحب تخیل صیرفی اور فلسفی سخن فہم اور نقاد و مبصر سب کے شریک کار ہونے کی ضرورت ہے۔

صاحب علم و فن و فہم و ادب ہیں درکار ۔۔۔ باغ اُردو ئے معلےٰ میں تب آئے گی بہار

(از منشورات) کیفی

جائزۂ زبانِ اُردو

اُردو ہندوستان کے ہر علاقے میں کم و بیش بولی یا سمجھی جاتی ہے۔ ہر صوبے کے حالات مختلف ہیں اور اس لئے اُسی مناسبت سے ہماری زبان کی حالت بھی ہر جگہ یکساں نہیں۔ اب تک اس بارے میں ہماری تقریریں اور تحریریں زیادہ تر قیاس پر مبنی رہی ہیں۔ صحیح واقعات اور اعداد و شمار کی تحقیق کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس لئے انجمن ترقی اُردو نے یہ تہیہ کیا ہے کہ ہندوستان کے ہر صوبے اور علاقے نیز دیسی ریاستوں میں اُردو زبان کا جائزہ لیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ ہر مقام پر اس کی کیا حالت ہے اور اس کی ترقی اور اشاعت کی کیا تدبیر ہو سکتی ہے۔

استفسارات دربارہ جائزۂ زبانِ اُردو

آپ کے صوبے یا علاقے میں

۱۔ ایسے اشخاص کی تعداد جو

(الف) اُردو بولتے ہیں، یعنی جن کی مادری زبان اُردو ہے۔

(ب) اپنی مادری زبان کے علاوہ اُردو بول سکتے ہیں۔

(ج) اُردو لکھتے پڑھتے ہیں یا لکھ پڑھ سکتے ہیں۔
(د) اُردو سمجھ سکتے ہیں۔
۲۔ (ا) سرکاری اور امدادی مدارس کی تعداد جن میں اُردو کی تعلیم دی جاتی ہے۔
(ب) یہ تعلیم کس درجے تک ہوتی ہے۔
(ج) اس کے درسی نصاب کی کیا حالت ہے۔
(د) طلبہ کی تعداد۔
۳۔ غیر سرکاری مکاتب نیز قدیم طرز کے عربی فارسی کے مدارس کی تعداد جن میں اُردو پڑھائی جاتی ہے یا اُردو ذریعۂ تعلیم ہے۔ نیز تعداد طلبہ۔
۴۔ سرکاری اور نجی اردو کتب خانوں کی تعداد۔ نیز ایسے کتب خانوں کی تعداد جن میں اُردو کتابیں بھی موجود ہیں۔
۵۔ ایسی انجمنوں اور اداروں کی تعداد جو اُردو کی خدمت کرتے ہیں (ان میں اُردو کی مختلف قسم کی بزمیں، دارالمطالعے، مشاعرے وغیرہ سب شامل ہیں)۔
۶۔ اُردو مطابع اور جرائد کی تعداد اور حالت۔
۷۔ سرکاری محکموں اور عدالتوں میں اُردو زبان کے استعمال کی کیا حالت ہے۔
۸۔ جب سے انگریزی عملداری قائم ہوئی ہے سررشتۂ تعلیم نے اُردو سیکھنے سکھانے کے متعلق کون کون سے احکام نافذ کئے ہیں۔ ان احکام کی نقل یا خلاصہ مع حوالۂ تاریخ و سنہ و نمبر۔
۹۔ آپ کی رائے میں کونسی ایسی تدابیر ہو سکتی ہیں جن سے آپ کے علاقے میں اُردو کی اشاعت و ترقی میں مدد مل سکتی ہے۔

مذکورہ بالا استفسارات کے جواب اُردو زبان کے جائزے کے لئے لازم ہیں۔ اُمید ہے کہ جہاں تک ممکن ہوگا احتیاط کے ساتھ ان معلومات کے فراہم کرنے کی کوشش کی جائے گی لیکن بعض علاقوں میں مقامی لحاظ سے اُردو زبان کے متعلق بعض ایسے اُمور کا پایا جانا ممکن ہے جو ان استفسارات کے تحت میں نہیں آتے، لہٰذا ایسے تمام اُمور خاص طور پر درج فرما دیئے جائیں تاکہ رپورٹ کی ترتیب کے وقت وہ پیش نظر رہیں۔

اس کے علاوہ ہر علاقے میں اُردو زبان و ادب کی جو عام حالت ہے اُس کا معلوم ہونا بھی ضروری ہے۔ مثلاً (۱) وہاں اُردو زبان ترقی پر ہے یا انحطاط پر؟ انحطاط ہے تو کیوں؟ (۲) لوگوں کو اُردو سیکھنے اور پڑھنے کا شوق ہے یا نہیں اور وہ اُردو زبان کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ (۳) وہاں کی اُردو زبان میں اگر کچھ مقامی خصوصیات پائی جاتی ہوں تو اُنہیں قلم بند کر دیا جائے۔ (۴) اُردو زبان کا وہاں کی مقامی اور قرب و جوار کی بولیوں پر اور ان بولیوں کا اُردو پر کیا اثر ہوا ہے۔ (۵) وہاں اُردو میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ کب سے ہے اور کون کون سے ایسے نامی اور ممتاز مصنف یا شاعر گزرے ہیں جن کی وجہ سے اُردو زبان کو فروغ ہوا یا وہاں کے لوگوں میں شوق پیدا ہوا۔ (۶) وہاں کی سب سے قدیم اُردو تصنیف یا نظم وغیرہ

(۷) ان لوگوں کے نام بھی لکھے جائیں جنہوں نے اُردو زبان کی ترقی و اشاعت میں خاص طور پر کوشش کی۔

ہر علاقے میں کوئی نہ کوئی صاحب ایسے ضرور ہوں گے جنہوں نے ان مسائل پر غور یا تحقیق کی ہوگی۔ اگر اُن سے درخواست کی جائے گی تو اُمید ہے کہ وہ ضروری معلومات بہم پہنچا دیں گے۔

ان تمام اُمور کا علم ہونا ضروری ہے تاکہ رپورٹ میں ہر علاقے کے متعلق حتے الامکان مکمل اطلاعات مہیا کر دی جائیں۔

(از اُردو) عبدالحق

اُردو میں تبدیلیوں کی ضرورت

جاننا چاہیئے کہ اگر اُردو زندہ زبان ہے تو اس میں تبدیلیاں ہوں گی۔ وہ اصلاح و ترمیم اور ترقی یا تنزل سے آزاد اور مستغنی نہیں رہ سکتی۔ قدامت پرست ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ کیا وہ حضرات وہی زبان لکھتے اور بولتے ہیں جو اب سے دو صدی پہلے سو برس پہلے، میں کہتا ہوں پچاس برس پہلے بولی جاتی تھی۔ متروکات کی لمبی فہرست کیا سبق سکھاتی ہے۔ جب آپ نے ناجی اور یکرنگ، ولی اور مظہر کی زبان چھوڑ دی اور اس میں تبدیلیاں اور ترقیاں کیں تو اب کہ ضرورت جائز ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال رہی ہے کیا وجہ ہے کہ ناسخ اور آتش، غالب و ذوق و مومن کی زبان میں ترمیم اور ترقی سے روکا جائے۔ ایک ترمیم دوسری ترمیم کے اور ایک ترقی مزید ترقی کے جواز کو مستحکم اور لابد قرار دیتی ہے۔ ہم کو آئندہ پر نظر رکھنی چاہیئے۔ بزرگ کہہ گئے ہیں سہ مردِ آخر بیں مبارک بندہ ایست

(از کلیم) کیفی

اُردو ادبیات میں انقلاب کی ضرورت

اے زمین کے عجیب تریں باشندو، اہلِ ہند! تمہاری قوتِ شامہ کو کس زہر نے سُن کر دیا ہے! کیا تمہاری سانس تمہیں خبر نہیں دیتی کہ ہندوستان کے گلزاروں میں انقلاب کی بوئے گُل بن کر فضاؤں میں مچل رہا ہے؟

اور خدارا بتاؤ کیا اب بھی وقت نہیں آیا ہے کہ سینۂ ہندوستان میں انقلاب کا جو سرخ شعلہ آہستہ آہستہ تھرتھرا رہا ہے، اُسے ہوا دینا شروع کر دیا جائے؛ — انقلاب۔ انقلاب۔ ہر شے میں انقلاب۔ ہر جہت سے انقلاب۔ زندگی کے ہر شعبے میں انقلاب۔ تہذیب و تمدن میں انقلاب۔ آداب و رسوم میں انقلاب۔ نظریات و معتقدات میں انقلاب۔ مسلّمات و کلّیات میں انقلاب۔ سیاسیات و مذہبیات میں انقلاب۔ انقلاب۔ یکسر انقلاب۔ تمام تر انقلاب اور مکمل انقلاب۔ لیکن آپ جانتے ہیں ان تمام انقلابات کا سرچشمہ کہاں ہے؛ — نفسیات سے پوچھئے، وہ جواب دے گی کہ انسان کے ذہن و خیل اور صحیح فکر میں "دحبت تک" ذہن و خیال" میں انقلاب نہ آئے گا کسی نوع کے انقلاب کی اُمید رکھنا ایک مہمل سی بات ہے۔ لیکن اس "ذہنی" انقلاب کا سرچشمہ کہاں ہے؛ دنیا کی زندہ اور مُردہ قوموں کی تاریخ سے سوال کیجئے۔ وہ جواب دے گی "قوموں کے ادبیات" میں!

(از کلیم) جوش

کپڑوں پر بیل بوٹے

نکالنے کی مشین





ناظرین ادالائیکین کی خدمت میں التماس ہے کہ وہ اپنی شریف بیگمات اور نیک بخت لڑکیوں کو بیکار نہ رہنے دیں ورنہ کاہل، سست اور ہمیشہ کیواسطے بیمار ہوجائیں گی۔ آپ ان کے لیے کشیدہ کی مشین منگوا کر باسلیقہ بنادیں۔ مشین کا نقشہ آپ کے پیش نظر ہے تھوڑے وقت اور ذرا سی محنت سے نہایت خوبصورت اور اونی ریشمی کشیدہ کاری نہایت اعلےٰ اور دیرپا بنائی جاسکتی ہے اس مشین سے کپڑوں پر اعلےٰ درجہ کے نقش بیل بوٹے پھول پتے تکیوں کے غلاف بچوں کی ٹوپیاں۔ مخمل کی گورگابیاں۔ سلیپر۔ جھالر اور کئی قسم کی گلکاری بنائی جاتی ہے۔ اس کا چلانا بہت آسان ہے غریبوں کے لیئے روزگار اور امیروں کی زنیت ہے۔ پرچہ ترکیب استعمال ہمراہ ہوگا۔ قیمت درجہ اول ۸ للعہ درجہ دوم ۳ درجہ سوم ۸ نقلی ۸ محصول معاف۔

مشین کے متعلق لوگوں کی رائے انگریزی سے مترجمہ۔

آپ کی ارسال کردہ کشیدہ کاڑھنے کی مشین بہت پسند کی گئی براے مہربانی دو عدد مشین میرے دوستوں کے لیے بذریعہ وی۔پی۔ ارسال کردیں۔

دستخط
M. D. ENKATACHALAM EA 89 MADRAS

گورکھ سنگھ صاحب جمعدار آئی ایم۔ ڈی وزیرستان تحریر فرماتے ہیں۔ کہ آپ نے جو مشین کشیدہ کاڑھنے کی چار روپے آٹھ آنے والی بذریعہ وی۔پی۔ ارسال کی ہے اس سے کام اچھا نکلتا۔ میرے خیال میں کوئی گھر اس کے بغیر نہیں رہنا چاہیئے ان کے علاوہ اور سرٹیفکیٹ موجود ہیں۔

ترکر اینڈ کمپنی رلے۔ ۱۸ مچھی ہٹہ سٹریٹ لاہور

(پنجاب)

ادبیات اردو میں ایک انقلاب

جادوگر

اور

دوسرے افسانے

مصنفہ چیخوف   مترجمہ سعید قریشی   مقدمہ از سعادت حسن منٹو

یہ تینوں نام کتاب کی اہمیت کی کافی ضمانت ہیں

اگر آپ روسی طلبہ کی انقلابی سرگرمیوں کی صحیح تصویر دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ روس کی دوشیزہ لڑکیوں کے پاک جذبہ الفت کو اپنے دلوں پر طاری کرنا چاہتے ہیں۔

اگر آپ اس فضا میں سانس لینا چاہتے ہیں۔ جو آج سے کچھ عرصہ قبل سرزمین روس پر چھائی ہوئی تھی

اگر آپ روسی مزدور کے نفسیات سے واقف ہونا چاہتے ہیں

اگر آپ رومان کے دلدادہ ہیں۔ اگر آپ ہیجان کے خواہشمند ہیں

اگر آپ کو تجزیہ نفسی کے مطالعہ کا شوق ہے

اگر آپ کو ٹریجڈی پسند ہے۔ اگر آپ کو کامیڈی مرغوب ہے

تو

جادوگر اور دوسرے افسانے

مطالعہ فرمائیں

یہ کتاب روس کے جوان فکر مصنف کے سرخ قلم کی رقم زدہ ہے

اس کے ساتھ ایک مختصر مگر دلچسپ مقدمہ بھی شامل ہے

کتابت و طباعت عمدہ۔ کاغذ دبیز حجم۔ اصفحات سرورق جاذب نظر قیمت ۸ر

ملنے کا پتہ

پبلشرز کمپنی۔ بیرون دہلی گیٹ

لاہور

جدید فہرست کارخانہ مفت طلب فرمائیے!

طبقۂ نسواں میں اس کارخانہ کا عطر [illegible] نہایت مقبول ہے

یہ کارخانہ سنہ ۱۸۳۹ء سے نیکنامی کے ساتھ جاری ہے

اعلان

طلسم زندگی نصف قیمت پر

میاں بشیر احمد صاحب کی مشہور کتاب "طلسم زندگی" جس پر ملک کے ادبا اور جرائد و رسائل نے نہایت حوصلہ افزا ریویو کیے ہیں اور جو اپنے بیش قیمت کاغذ اعلےٰ کتابت وطباعت گراں مایہ رنگین تصاویر صفحات جمیل اور مطلا جلد کے لحاظ سے ہندوستانی مطبوعات کیا یورپ کی حسین ترین کتابوں کے مقابلے میں پیش کی جاسکتی ہے اس مہینے سے اس کی بقیہ جلدیں نصف قیمت پر فروخت ہوں گی ڈھائی روپے اس کتاب کی اصل لاگت سے بھی کم ہیں امید ہے کہ شائقین اس موقع سے فائدہ اٹھائیں گے۔

مضامین فلک پیما

ہم مسرت سے اعلان کرتے ہیں کہ "ہمایوں" کے مقالہ نگار خصوصی حضرتِ فلک پیما کے گراں قدر مضامین کا مجموعہ جو تقریباً چار سو صفحات پر مشتمل ہوگا۔ اس مہینے کے اندر چھپ کر تیار ہو جائیگا۔ اس کا کاغذ اور کتابت وطباعت نہایت نفیس اور قیمت دو روپے کے قریب ہوگی "فلک پیما" کے مضامین کی تعریف تحصیل حاصل ہے

فرمائش جلد بھیجیے تاکہ کتاب چھپتے ہی آپ کے نام بھیج دی جائے۔

مینیجر "ہمایوں"۔ ۲۳ لارنس روڈ لاہور

سید عبداللطیف پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ میں چھپوا کر دفتر رسالہ "ہمایوں" ۲۳ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا۔

قواعد

۱۔ "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲۔ علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ۱/ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتّر صفحے ماہوار اور سوا نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی
اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتہً بھیجا جائے گا۔

۸۔ جواب طلب امور کے لئے ۱/ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہئے۔

۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے چھ آنے ششماہی تین روپے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۸/

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتا تحریر کیجئے۔

۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافے پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھئے

مینیجر رسالہ ہمایوں

۲۳۔ لارنس روڈ۔ لاہور

Title and Picteur Printed at the Halftone Press, Ram Nagar, Lahore.

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

(غالب)

بیادگار علامہ فضیلے آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی وادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں بی۔ اے

بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی اصل حقیقت

مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اُردو نے ذیل میں ایک نہایت اہم بیان "بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی اصل حقیقت" شائع کیا ہے جس میں انہوں نے اپنے اس مشاہدے اور تجربے کی بنا پر جو انہیں ۲۴ و ۲۵ اپریل کے اس ہندی انجمن کے اجلاس سے حاصل ہوا اہلِ اردو پر یہ واضح کر دیا ہے کہ مہاتما گاندھی اور اُن کے رفقا ئے کار اب اُردو کی تباہی اور ہندی کی اشاعت پر کمربستہ ہیں۔ ہمیں یہ کہنے میں ذرا تامل نہیں کہ ہم سب اپنی زبان کی حفاظت اور اشاعت و ترقی کے معاملے میں انجمن ترقی اُردو کا پورا ساتھ دیں گے۔

(ب)

بہت سے اصحاب اس جملے کے معنے نہیں سمجھیں گے اور اس عنوان کو پڑھ کر انہیں اُلجھن ہو گی۔ اس لئے سب سے اوّل یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس کے معنے ہیں "ہندوستان بھر کی ادبیات کی انجمن"۔ اس کا پہلا اجلاس ۲۴ اور ۲۵ اپریل کو ناگپور میں ہوا۔ مہاتما گاندھی اس کے صدر تھے۔ انہیں تاریخوں میں "ہندی ساہتیہ سمیلن" کے اجلاس بھی مختلف اوقات میں وہیں ہوئے۔ اس کے صدر بابو راجندر پرشاد تھے۔ اس سے قبل کہ میں پرشد کے اس اجلاس کے حالات بیان کروں، یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس کی "شانِ نزول" سے مختصر طور پر بحث کروں یعنی یہ کہ یہ انجمن کن وجوہ سے وجود میں آئی اس کا اصل مقصد کیا ہے جب تک یہ نہ کیا جائیگا اسکی پوری حقیقت سمجھ میں نہ آئیگی۔

مسٹر کاکا کالیلکر اس اجلاس کی مجلسِ استقبالیہ کے صدر تھے۔ انہوں نے اپنے ایڈریس میں بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی پیدائش کا حال کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ میں اسی کا خلاصہ یہاں لکھتا ہوں کیونکہ ان کا بیان زیادہ مستند سمجھا جائیگا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ۱۹۱۹ء میں مہاراشٹ ساہتیا سمیلن منعقدہ بڑودہ میں سب سے پہلے یہ خیال پیدا ہوا۔ اس کے بعد کولھاپور کے اجلاس میں مہاراجہ بڑودہ نے بھارت ساہتیا پرشد کا خاکہ بہت پرزور طریقے پر پیش کیا۔ پھر کراچی میں کانگریس کے موقع پر مسٹر کنھیا لال منشی سے جو میری بات چیت ہوئی تو اس میں بھی ہم نے ایک ایسی سوسائٹی کی ضرورت کو محسوس کیا۔ پچھلے سال جب اندور میں ہندی ساہتیا سمیلن کا اجلاس مہاتما گاندھی کی صدارت میں ہوا اور ہم ایک جا جمع ہوئے تو ایک مفصل تجویز اس کے متعلق منظور کی گئی۔ جسے عمل میں لانے کے لئے مسٹر کنھیا لال منشی ہری ہر شرما اور گردھا شرما کی ایک کمیٹی بنائی گئی۔ ہندی ساہتیا سمیلن کے چند مہینے کے بعد مہاراشٹ ساہتیا سمیلن کا اجلاس بھی اندور میں ہوا۔ اُس نے بھی کولھاپور کے تخیل کو عمل میں لانے کے لئے ہندی ساہتیا سمیلن سے تبادلۂ خیالات کیا۔ ہندی ساہتیا سمیلن نے کاکا کالیلکر، ہری بھاؤ اپادھیا ئے اور بابا رگھوداس کو اندور بھیجا۔ اندور مہاراشٹ ساہتیا سمیلن نے اپنی ساہتیا پرشد کو اطلاع دی کہ بھارتیہ ساہتیا پرشد کے لئے ایک مہاراشٹ کمیٹی قائم کی جائے جو ہندی ساہتیا سمیلن کو بھارتیہ ساہتیا سمیلن قائم کرنے میں مدد دے۔ اسی طرح کرناٹک اور گجرات

کی ساہتیا سمیلنوں نے بھی اس تحریک کو سراہا۔

یہ تو ہے اس کی پیدایش اور ابتدا کی حقیقت۔ اب رہا اس کا مقصد سو وہ اُس قرارداد سے ظاہر ہے جو ناگپور کے اجلاس میں منظور کی گئی۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:-

"اس پرشد کا اُدیش (مقصد) ہوگا کہ (الف) ہندوستان کی سب پرانتوں کی بھاشاؤں کے ساہتیوں (ادبوں) اور ساہتکاروں (ادیبوں) میں آپس میں میل کرنا اور اس نام سے بھارتیہ ساہتیوں کی ترقی اور پھیلاؤ میں مددگار ہونا (ب) اس سبھا کا کام ہندی یعنی ہندوستانی میں ہوگا ...... "

اُس کمیٹی نے جو اس انجمن کے مقاصد کی تکمیل کے لئے مقرر کی گئی تھی پہلا کام یہ کیا کہ ماہانہ "ہنس" کو جو کئی سال سے ملک کے قابل ادیب منشی پریم چند صاحب کی اڈیٹری میں جاری تھا اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا اور اب اُسے پرشد کا رسالہ بنانے کا فیصلہ کیا گیا ہے اور منشی پریم چند صاحب کے ساتھ گجراتی زبان کے ادیب اور مؤرخ مسٹر کنھیا لال منشی بھی اس کی اڈیٹری میں شریک ہو گئے ہیں۔

اس مختصر تمہید کے بعد جو بھارتیہ ساہتیا پرشد کی پیدایش اور مقاصد کے متعلق تھی۔ میں آپ کو اس کے پہلے اجلاس کی روئیداد سنانا چاہتا ہوں جو ہم سب کے لئے خاص اہمیت رکھتی ہے۔

۲۴ اپریل ۱۹۳۶ء کو تقریباً ۱ بجے دن کے اس کا پہلا جلسہ شروع ہوا۔ سب سے اول مسٹر کاکا کالیلکر نے اپنا اڈریس پڑھکر سنایا۔ اس کے بعد صدر انجمن مہاتما گاندھی کا مطبوعہ اڈریس جو صرف ایک صفحہ کا تھا تقسیم کر دیا گیا اور مہاتما جی نے یہ کہکر کہ مطبوعہ اڈریس پڑھکر سنانا فضول ہے آپ خود پڑھ لیں گے۔ زبانی تقریر شروع کر دی۔ یہ ایسی آہستہ آواز میں تھی کہ پاس والے بھی اچھی طرح نہ سن سکے۔

پرشد کے اس جلسے کا سب سے بڑا کارنامہ وہ ریزولیشن تھا جسے میں اوپر نقل کرچکا ہوں۔ مذیادہ تر بحث اسی پر ہی۔ اسکے پہلے جزسے کسی کو اختلاف نہ تھا البتہ دوسرے جز پر بہت کچھ گفتگو رہی۔ اصل سودے میں یہ الفاظ نہ تھے کہ اس پرشد یا انجمن کی ساری کارروائی ہندی ہندوستانی میں ہو گی۔ یہ لفظ پہلی بار یہاں سننے میں آیا۔ غالباً یہ مہاتما گاندھی کے جدت پسند دماغ کا نتیجہ تھا۔ میں نے مہاتما جی سے کہا کہ انڈین نیشنل کانگرس نے ا ریزولیوشن میں یہ طے کیا تھا کہ اس ملک کی زبان ہندوستانی ہو گی خواہ وہ ناگری حروف میں ہو یا فارسی حروف میں۔ اس کے بعد آپ نے ہنس کے متعلق تحریر شائع کی اُس میں آپ لکھتے ہیں کہ اس رسالے کے مضامین کی زبان ہندی اتھوا (یا) ہندوستانی ہوگی۔ اس کے کیا معنے۔ فرمانے لگے کہ کانگریس ریزولیوشن بھی میں نے ہی بنایا تھا۔ میں نے عرض کیا یہ صحیح ہے لیکن اُسوقت ہندوستانی کے معنے ہم ہرگز ہندی نہیں سمجھتے تھے۔ کہنے لگے کہ اب ہم اُس کے معنے بتا دیتے ہیں جو ہنس کی تحریر میں آپ نے دیکھے۔ یہ گاندھی جی کی محض زبردستی ہے۔ یہ انہوں نے ایک نیا لفظ ایجاد کیا ہے یعنی ہند ہندوستانی جو بالکل بے معنی ہے۔ یہی لفظ پرشد کی مجلس استقبالیہ کے صدر کاکا کالیلکر صاحب نے اپنے اڈریس میں استعمال کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان صا نے پہلے سے یہ طے کر لیا تھا کہ ہندوستانی کا لفظ تنہا استعمال نہ کیا جائے تاکہ اسکی گنجایش ہی باقی نہ رہے کہ ہم میں سے کوئی شخص اس کا مفہوم اردو۔

جب گاندھی جی سے سوال کیا گیا کہ "ہندی ہندوستانی" سے آپکا کیا مطلب ہے تو فرمایا وہ ہندی جو آگے چلکر ہندوستانی ہونیوالی ہے۔ اس پر یہ اعتراض کیا گیا یہ کوئی زبان نہ ہوئی۔ یہ تو آپ کی خواہش یا منتہا ہے۔ اس سوال کے جواب میں کہ ہندی کونسی زبان ہے اور ہندوستانی کونسی، مہاتما جی نے فرمایا کہ ہندی ادبی زبان ہے اور عام لوگ کم سمجھتے ہیں اور ہندوستانی وہ زبان ہے جو عام لوگ بول چال میں استعمال کرتے ہیں لیکن ابھی اس کا ادب نہیں بنا۔ اپنے مطبوعہ ایڈریس میں انہوں نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ ہندی کو ہندوستانی کہنے کا یہ مطلب ہے کہ اس بھاشا میں اُن فارسی الفاظ کو جو زبان میں رائج ہو گئے ہیں ترک نہ کیا جائے غرض صبح کا جلسہ اسی پر ختم ہو گیا اور کوئی بات طے نہ ہوئی۔

سہ پہر کے جلسے میں پھر یہی بحث چھڑ گئی جب مہاتما جی سے یہ کہا گیا کہ ریزولیوشن میں یا تو آپ ہندی کا لفظ رکھئے یا ہندوستانی کا، ہندی ہندوستانی کے کوئی معنے نہیں تو فرمایا کہ ہم یہ فیصلہ کر چکے ہیں اور میں ہندی کو نہیں چھوڑ سکتا۔ مجھے ہندی سمیلن کیساتھ ساتھ چلنا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ نیشنل کانگرس کے فیصلے کیساتھ ساتھ کیوں نہیں چلتے جس نے یہ قطعی فیصلہ کر دیا ہے کہ ملک کی زبان ہندوستانی ہوگی۔ میں نے دانستہ دوبارہ یہ بات اس لئے کہی تھی کہ صبح کی گفتگو کے وقت پنڈت جواہر لال نہرو موجود نہ تھے اس وقت وہ میرے قریب تشریف رکھتے تھے اور خیال تھا کہ وہ بحیثیت صدر کانگرس کے ضرور میری تائید کرینگے لیکن مجھے افسوس اور کسی قدر مایوسی ہوئی کہ انہوں نے ایک لفظ بھی نہ کہا اور خاموش بیٹھے رہے۔ اور ایک نہیں وہاں اکٹھے تین کانگرس کے صدر موجود تھے (دو سابق اور ایک حال) مگر کوئی ٹس سے مس نہ ہوا۔ گاندھی جی نے میرے سوال کے جواب میں وہی کہا جو صبح فرما چکے تھے۔ اِسکے بعد جب یہ گفتگو ہو چکی تو گاندھی جی نے "ہندی ہندوستانی" کو بدلکر "ہندی یعنی ہندوستانی" کے الفاظ رکھدیئے۔ اسی پر اختر حسین صاحب رائے پوری نے یہ ترمیم پیش کی کہ ریزولیوشن میں یا تو لفظ ہندی رکھا جائے یا ہندوستانی کیونکہ مہاتما جی خود ہندی اور ہندوستانی کے دو الگ الگ مفہوم بتا چکے ہیں۔ اس بنا پر ہندی اور ہندوستانی ایک زبان نہیں ہو سکتیں اور اسلئے "ہندی یعنی ہندوستانی" بے معنی ہو گا۔ ان دونوں میں سے کوئی ایک لفظ رکھنا مناسب ہوگا۔ میں نے یہانتک کہا کہ آپ صرف ہندی رکھئے اور میں اسکی تائید کرونگا۔ اس پر وہ ہنسنے لگے اور کہا یہ نہیں ہو سکتا۔ آخر مہاتما جی نے ووٹ پر آمادگی ظاہر کی۔ مسٹر کنھیالال منشی نے کہا کہ یہ معاملہ ادبی اور لسانی ہے ووٹ سے طے نہیں ہونا چاہئے۔ مہاتما جی نے کہا کہ ووٹ کے سوا کوئی چارہ نہیں فیصلے کی یہی ایک تدبیر ہے۔ ووٹ کا حکم صادر ہوا لیکن ووٹ لینے سے پہلے بڑی ہوشیاری یہ کی گئی کہ ہندی سمیلن کے ان نمائندوں کو بھی ووٹ کا حق دیدیا گیا جو اسوقت اس جلسے میں حاضر تھے نتیجہ یہ ہوا کہ کثرت رائے اس ترمیم کے خلاف نکلی۔ اگر ہندی سمیلن کے نمائندوں کو ووٹ کی اجازت نہ دی جاتی جس کا انہیں حق حاصل نہ تھا تو ترمیم غالباً منظور کرنی پڑتی مگر مہاتما گاندھی بھارتیہ ساہتیہ پرشد کو ہندی سمیلن کا بچہ سمجھتے ہیں اور ان کے تصور میں یہ دو مجلسیں کبھی الگ نہیں ہونے پائیں حالانکہ بقول منشی پریم چند کے یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ پہلے دن کی کارروائی یہیں ختم ہو گئی۔

اصل معاملہ تو پہلے ہی دن طے ہو چکا تھا دوسرے دن ۲۵ اپریل کو ایک معمولی جلسہ ہوا۔ پہلے دن سہ پہر کو ایک گفتگو یہ بھی چھڑ گئی تھی کہ ہمیں اپنی زبانوں کے ادب کا رُخ بدلنا چاہئے۔ پرانے فرسودہ خیالی مضامین کو دہرانا موجودہ حالات کے بالکل منافی ہے ہمیں اپنے ادب کو زندہ اور زندگی کے حالات کے مطابق بنانا چاہئے۔ اس بحث میں پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی حصہ لیا اور یہ الزام ہوا

کہ دوسرے روز ایک ریزولیوشن اس مضمون کا پیش کیا جائے۔ کنھیا لال منشی اور دو ایک اور صاحب اس خیال کی مخالفت کرتے رہے۔ پرشد کے مہارتھیوں نے اس خوف سے کہ کہیں جدید خیال والے کوئی سخت ریزولیوشن پیش نہ کردیں، رات ہی کو اس مضمون کا ایک ہلکا سا ریزولیوشن تیار کیا اور دوسرے روز اجلاس شروع ہوتے ہی پہلے اسے پڑھکر سنایا جو بلا اختلاف منظور کرلیا گیا لیکن یہ ریزولیشن بہت کچھ تصریح کا محتاج تھا، اسلئے ان صاحبوں نے جو دیسی ادبیات کی اصلاح پر مصر تھے ایک الگ بیان شائع کیا۔ اسکے بعد انتظامی کمیٹی کے ارکان کا انتخاب ہوا۔ ان میں سے چند تو ہندی ساہتیا سمیلن نے اپنے حق کی بنا پر اپنے نمایندے انتخاب کئے اور کچھ بھارت ساہتیا سمیلن نے اور چند متفرق اشخاص منتخب ہوئے۔ بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے پہلے اجلاس کی کارروائی ختم ہوئی۔

اب اس کارروائی پر میں مختصر سا تبصرہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپنے یہ دیکھ لیا کہ ہندستانی کو ہندی ہیں اور ہندی کے معنے ہندستانی بنانے میں پھر "ہندی ہندستانی" کی جدید لفظ کے اختراع میں اور آخر میں ہندی یعنی ہندستانی کے الفاظ میں کیسے کیسے پہلو بدلے ہیں۔ پہلے اردو کا لفظ ترک کرکے ہندستانی اختیار کیا گیا تھا۔ یہانتک کچھ مضائقہ نہ تھا اور اس پر ہم بھی رضامند تھے اور ہمارے بعض مستند ادیبوں اور اہل الرائے اصحاب نے یہ لفظ لکھنا شروع کردیا تھا بلکہ انکا اصرار تھا کہ اردو کی بجائے اب ہندستانی لکھا جائے اور اس پر ایک حد تک عمل بھی ہونے لگا تھا۔ فریقین نے یہ سمجھوتا تسلیم کرلیا تھا۔ اب ہندستانی کا لفظ بھی متروکات میں داخل ہوگیا اور صرف ہندی رہ گیا۔ معترض کیلئے انکے پاس جواب موجود ہے وہی جو گاندھی جی نے فرمایا "ہندی یعنی ہندستانی"۔ گاندھی جی نے رسالہ ہنس کی زبان کو بھی ہندی اتھوا ہندستانی فرمایا ہے۔ جب ان سے کہا گیا کہ ہنس کی زبان بہت کٹھن ہے وہ ہندستانی نہیں ہوسکتی بلکہ اسکی زبان کلکتہ کے مشہور رسالہ وشال بھارت سے بھی زیادہ مشکل ہے تو انہیں حیرت ہوئی۔ ہنس کے ایڈیٹروں نے تو صاف صاف لکھدیا ہے کہ "اب ہندی ملکی زبان کی صورت اختیار کرکے خاص و عام کی زبان ہوچکی ہے۔ مہاتما گاندھی جیسے ملک کے سدھارنیوالے اسے زندہ ملکی زبان بنانیکا عہد کر چکے ہیں"۔ اسکی تائید بابو راجندر پرشاد کے اس خطبہ صدارت سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے ہندی ساہتیا سمیلن میں پڑھا تھا۔ اس میں انہوں بھارتیا ساہتیہ پرشد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ "خوشی کی بات ہے کہ اس کمیٹی کی کوشش سے بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی بنیاد ڈالی جارہی ہے۔ اور اس کا پہلا اجلاس اس ناگپور میں مہاتما گاندھی کی صدارت میں ہورہا ہے۔ اس کے ذریعہ سے ایک فائدہ یہ ہوگا کہ ہندی کے پرچار کے متعلق لوگوں میں جو غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے وہ بھی دور ہوجائیگی اور ہمیں امید ہے کہ اس سے ہندی پرچار میں مدد ملے گی"۔ کاکا کالیلکر صاحب نے بھی اپنے اڈریس میں صاف طور پر اس کا اعلان کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ "جن لوگوں نے اس تحریک (بھارتیہ ساہتیہ پرشد) کی ابتدا کی ہے انہوں نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ ہمارا سارا کاروبار راشٹر بھاشا (قومی زبان) ہندی ہندستانی میں چلے گا۔ ہماری کوشش ہے کہ تمام ہندوستان کی بھاشاؤں کی ابجد ایک ہی ہو اور سب میں ناگری لپی (رسم خط) جاری ہوجائے تاکہ وہ اپنے اپنے صوبے کی زبان کا کام ناگری میں کریں"۔

یہ الفاظ ایسے صاف اور صریح ہیں کہ ان کیلئے کسی دلیل و حجت کی ضرورت نہیں۔ بھارتیا ساہتیہ پرشد کا یہ مقصد بیشک قابل تعریف ہے کہ وہ دیسی زبانوں کے ادبیات کی اصلاح و ترقی چاہتی ہے لیکن اس کا دوسرا مقصد بلاشبہ ہندی زبان کا پرچار ہے جس میں وہ اور

ہندی سمیلن دونوں متفق ہیں۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ پرشد کے اجلاس کی تاریخیں اور مقام بدل کر اسے انہیں ایام اور اسی مقام میں رکھا گیا جن تاریخوں میں اور جہاں ہندی سمیلن کا اجلاس تجویز ہوا تھا۔ تاکہ ہندی سمیلن کے اثر اور امداد سے مستفید ہو سکے۔ مغرض یہ کہ پرشد ادبیات کے مسئلے سے گذر کر زبان کی اشاعت پر آگئی ہے اور مختلف زبانوں کے ادب اور ادیبوں کے اتحاد عمل سے ہندی کے پرچار کا مقصد حاصل کرنا چاہتی ہے۔

اس ضمن میں میں اس امر کا اظہار ضروری خیال کرتا ہوں کہ منشی پریم چند صاحب شروع سے آخر تک ہمارے ساتھ رہے اور وہ اس تمام گفتگو اور بحث سے بددل ہی نہیں تھے بلکہ برہم بھی ہوئے۔ اُن کی دلی تمنا تھی کہ ہندی اردو کے جھگڑے کو مٹا کر کوئی ایسی صورت پیدا کی جائے جو دونوں فریقوں میں مقبول ہو سکے لیکن جو کارروائی وہاں ہوئی اس سے وہ بھی ایسے ہی مایوس ہوئے جیسے ہم میں سے بعض لوگ۔

اسی گفتگو میں بنگال، مہاراشٹر اور جنوبی ہند کے بعض علاقوں کے نمائندوں نے یہ کہا (اور غالباً ان کا یہ کہنا ایک حد تک درست ہے) کہ ہندی میں سنسکرت الفاظ کا قائم رکھنا اور داخل کرنا ضروری ہے کیونکہ اُن سنسکرت لفظوں کا سمجھنا ہمارے لئے زیادہ آسان ہے بہ نسبت اُن ہندی اور فارسی لفظوں کے جو آپ کی سہل ہندی میں استعمال ہوتے ہیں اس لئے کہ ہماری زبانوں میں پہلے ہی سے سنسکرت الفاظ بکثرت موجود ہیں۔ ان زبانوں کی بنیاد زیادہ تر سنسکرت پر ہے۔ اس خیال کی تائید کاکا کالیلکر کے اڈریس سے بھی ہوتی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ "میں اہل دکن کی طرف سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ ہم کو آپ کی (یعنی شمالی ہند کی) ہندی سمجھنے میں مشکل پڑتی ہے۔ پنڈت جواہرلال کی ہندی آپ کیلئے عام فہم ہوگی مگر ہمارے لئے کٹھن ہے۔ ... وہ ہندی بھی جو دہلی لکھنؤ کے بازاروں میں گنوار لوگ سمجھ سکتے ہیں وہ نیچرل ہندی ہے لیکن اُسے بھی ہم بہت ہی کم سمجھتے ہیں۔ ... کانگرس میں جو ہندی بولی جاتی ہے اس میں فارسی شبدوں کی اس قدر بھرمار ہوتی کہ دیہات سے آنیوالے نمایندوں کیلئے انگریزی اور ہندی دونوں بھاشائیں یکساں مشکل ہو جاتی ہیں۔"

اسی دوران میں لغت کی بحث نکلی یعنی ایک ایسی ڈکشنری تیار کیجائے جس میں عام فہم الفاظ کے علاوہ وہ تمام الفاظ جمع کئے جائیں جو ہندی ہندی بنگالی مرہٹی گجراتی وغیرہ میں مشترک ہیں اور ان تمام الفاظ کی تعداد دو اڑھائی ہزار سے زیادہ نہ ہو۔ اس میں دو مشکلیں ہیں ایک تو یہ کہ ہندی اور خاص کر فارسی الفاظ کی صورتیں مختلف زبانوں میں بگڑ بگڑ کر ایسی ہو گئی ہیں کہ ایک لفظ ہونے پر بھی اُن کا پہچاننا مشکل ہوتا ہے۔ دوسرے لفظ تو ایک ہی ہے لیکن مرہٹی میں اس کے معنے کچھ ہیں اور ہندی یا بنگالی میں کچھ اور۔ علاوہ اس کے ایسی ڈکشنری اُن مبتدیوں کیلئے تو کسی قدر کارآمد ہو سکتی ہے جو زبان سیکھنا چاہتے ہیں لیکن ادب کی ضروریات کیلئے بالکل کارآمد نہیں ہو سکتی۔ ہم نے ۱۹۲۳ء میں آل انڈیا اینٹیل کانفرنس میں جس کا اجلاس بڑودہ میں ہوا تھا۔ یہ تجویز پیش کی تھی اور اس پر عمل بھی شروع کر دیا تھا کہ تمام ہندی ادب اور زبان کو پڑھکر اردو فارسی عربی الفاظ اور محاورے چن لئے جائیں اور اسی طرح اردو ادب اور زبان کا مطالعہ کر کے تمام ہندی الفاظ اور محاورے نکال لئے جائیں اور اُن سب کو ایک جگہ جمع کر کے کتاب کی صورت میں شائع کیا جائے تاکہ معلوم ہو کہ ہماری زبان کا مشترکہ سرمایہ کیا ہے اس کے بعد جن الفاظ کے اضافے کی ضرورت ہو یا جو اصلاحات بنانی مقصود ہوں تو وہ ایک ایسی کمیٹی کے مشورے سے ہو جس میں دونوں زبانوں کے نمائندے ہوں لیکن موجودہ حالات دیکھکر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی تمام کوششیں بے سود ہیں +

میں ایک بات کہنی بھول گیا وہ یہ کہ پہلے دن کے اجلاس میں پروفیسر محمد مجیب (جامعہ ملیہ دہلی) کا ایک خط انگریزی زبان میں مہاتما جی کے نام وصول ہوا۔ یہ خط نہایت معقول اور مدلل ہے اور بہت ادب و خلوص سے مہاتما جی سے یہ اپیل کی ہے کہ وہ نیشنل کانگرس کے فیصلے پر قائم رہیں جس نے ملک کی زبان "ہندستانی" قرار دی ہے۔ انہوں نے مہاتما جی کی اندور والی تقریر نیز "ہنس" والی تحریر کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جن میں ہندی یا ہندوستانی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور ہندی کے معنے ہندستانی قرار دیئے ہیں جو درست نہیں۔ اردو یا ہندستانی سے بالکل قطع نظر کی گئی ہے۔ بھارتیا ساہتیہ پرشد کے قائم ہونے اور ہنس کے جاری ہونے سے ان کو بہت خوشی ہوئی تھی کہ یہ مشترکہ اور عام زبان کے بنانے میں مضبوط بنیاد کا کام دینگے لیکن ہنس کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ اس میں زیادہ تر سنسکرت آمیز ہندی کا استعمال کیا گیا ہے اور اس کی دوسرے ہندی رسالوں کی زبان سے مشکل ہے۔ مجیب صاحب ساہتیہ پرشد کے ساتھ "بھارت" کے لفظ کو بھی پسند نہیں کرتے۔ کیونکہ اس لفظ کا مفہوم آریائی ہندستان ہوتا ہے اور اس لئے اس سے نہ صرف مسلمان اور ان کی تمام کوششیں جو ہندی زندگی بنانے میں صرف ہوئیں بلکہ صدہا سال کے تغیرات اور ارتقائی منازل جو ہم نے طے کئے ہیں وہ بھی خارج ہو جاتے ہیں۔ ان کی رائے میں بھارت کی بجائے ہندستانی کا لفظ زیادہ مناسب ہوتا۔ مجیب صاحب نے ایک بات اور بھی لکھی ہے جو صحیح معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ عربی اور سنسکرت میں اصطلاحی الفاظ کا بہت بڑا خزانہ ہے لیکن ہماری عام اور مشترکہ زبان کو ان میں سے کسی پر بھی منحصر نہیں کرنا چاہیئے۔ عربی اگر غیر زبان ہے تو سنسکرت بھی اس ملک میں کبھی عام طور پر نہیں بولی جاتی تھی جو لوگ ہندی زبان سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہندی میں سنسکرت کے الفاظ اصلی حالت میں نہیں پائے جاتے تلفظ کی سہولت نے ان کی صورتوں کو کچھ کا کچھ کر دیا ہے مثلاً گرام کا گانو ہو گیا، ورش کا برس بن گیا۔ اب پھر اصل سنسکرت الفاظ کی طرف رجوع کرنا اور مروجہ الفاظ کو ترک کر دینا یا تو اظہار شیخت ہے یا جہل یا تعصب پر مبنی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ حضرات اس زندہ زبان کی اشاعت سے کچھ سروکار نہیں رکھتے جو عام طور پر بولی جاتی ہے بلکہ انہیں ہندی زندگی کو آریائی بنانے کی فکر ہے۔ مجیب صاحب نے اس خط کا بھی ذکر کیا ہے جو مسٹر کنھیا لال منشی نے عاقل صاحب (جامعہ ملیہ) کے خط کے جواب میں تحریر فرمایا تھا۔ اس میں مسٹر منشی لکھتے ہیں کہ گجراتیوں، مرہٹوں، بنگالیوں اور کرالیوں نے جن روایات پر اپنی ادبی زبان کو بنایا ہے ان میں اردو کا عنصر تقریباً معدوم ہے۔ مجیب صاحب اسے تسلیم نہیں کرتے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس میں مطلق شبہ نہیں کہ گجراتی، مرہٹی اور بنگالی زبانوں میں فارسی الفاظ کی بہت بڑی تعداد موجود ہے۔ اور میں ہرگز اس امر کے ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ انہیں آپس میں ایک دوسرے سے نیز مسلمانوں سے قریب آنے کے لئے اپنی زبانوں کو سنسکرت آمیز بنانے کی ضرورت ہے۔ علاوہ اس کے صرف خالص اردو عنصر سے ہمیں بحث نہیں بلکہ ہماری بحث شمالی ہند کی زندہ زبان اور محاورات سے ہے اگر یہ زندہ زبان مشترکہ زبان کی بنیاد قرار دی جائے تو مسلمان پوری طرح اس کا ساتھ دینے کے لئے آمادہ ہیں لیکن سنسکرت کی طرف رجعت کرنے کے یہ معنے ہیں کہ وہ کل مسلمان اور ان کی تمام خدمات جو انہوں نے ہندی، بنگالی اور گجراتی کے حق میں کی ہیں ناقابل لحاظ ہیں۔ ان حالات میں ہم سے شرکت کی درخواست کرنا گویا ہماری ہلاکت میں خود ہماری شرکت کی استدعا کرنا ہے۔"

اسکے بعد انھوں نے مسٹر پرشوتم داس ٹنڈن کی اس تقریر کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے الہ آباد میں ہندی میوزیم کے افتتاح کے وقت فرمائی تھی جس میں انھوں نے یہ کہا تھا کہ چینی زبان کے بعد ہندی زبان ایشیا میں سب سے زیادہ بولی جاتی ہے اس کے معنے یہ ہوئے کہ عام اور مشترکہ زبان کا سوال طے ہوگیا یعنی وہ زبان ہندی ہوگی کیونکہ ہندوستان میں اسی زبان کے بولنے والے سب سے زیادہ تعداد میں ہیں۔ لہذا ہندوستانی کے حامی کسی گنتی میں نہیں یہ "فرقہ وارانہ تصفیہ" کی طرح ایک نئے فساد کی بنیاد ڈالی جارہی ہے۔

خط کے آخر میں پروفیسر مجیب نے چند امور خاص طور پر مہاتماجی کے غور کے لئے پیش کئے ہیں اور ان سے التجا کی ہے کہ اگر وہ مناسب خیال فرمائیں تو وہ عام اعلان کی بنیاد کا کام دے سکتے ہیں۔ وہ امور یہ ہیں۔

۱ ۔ ہمارے مشترکہ زبان ہندوستانی کے نام سے موسوم ہوگی نہ کہ ہندی کے نام سے۔

۲۔ ہندوستانی کو کسی فرقے کے مذہبی روایات مطلق کوئی تعلق نہ ہوگا۔

۳۔ لفظ کا معیار اس کا رواج ہوگا نہ کہ اس کا دیسی یا بدیسی ہونا۔

۴۔ تمام وہ الفاظ جو اردو کے ہندو اہل قلم نے اور ہندی کے مسلمان مصنفوں نے استعمال کئے ہیں مروجہ الفاظ تسلیم کئے جائیں۔

۵۔ اصطلاحی الفاظ خاص کر سیاسی اصطلاحات کے انتخاب میں سنسکرت کی اصطلاحات کو ترجیح نہ دی جائے بلکہ اردو، ہندی اور سنسکرت کی مصطلحات کے فطری انتخاب کی بھی گنجائش رکھی جائے۔

۶۔ دیوناگری اور عربی رسم خط دونوں مسلم خیال کئے جائیں اور ان تمام اداروں میں جن کی پالیسی ہندوستانی کے حامیوں کے ہاتھ میں ہو۔ دونوں خطوں کے سکھانے کی سہولت بہم پہنچائی جائے۔

میں نے خط کا خلاصہ بیان کردیا ہے۔ پورا خط پنڈت جواہر لال نہرو صاحب نے پڑھکر سنایا۔ اس پر کوئی توجہ نہیں کیگئی اور خط داخل دفتر ہوگیا۔ البتہ پنڈت جواہر لال صاحب نے یہ فرمایا کہ تعجب ہے کہ مجیب صاحب جیسے تعلیمیافتہ شخص کو ٹنڈن صاحب کے بیان پر اعتراض ہے ان کا ہرگز یہ مطلب نہ تھا۔ ان کا کیا مطلب تھا یہ سمجھ میں نہ آیا۔ جس خلوص اور امید اور لجاجت کیساتھ یہ خط مہاتماجی کی خدمت میں لکھا گیا تھا اس کا تقاضا یہ تھا کہ مہاتماجی اس بارے میں اپنا کوئی خیال ظاہر فرماتے اور جو بدگمانی اُن کے اور ان کے رفقا کے رویہ سے پیدا ہوگئی ہے۔ اسے رفع کرتے لیکن افسوس اُنھوں نے ایک لفظ بھی نہ کہا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات نے ہندی کے پرچار اور اسے قومی زبان بنانیکا تہیہ کرلیا ہے

اجلاس کے دوران میں جبکہ زبان کی بحث چھڑی ہوئی تھی مہاتما گاندھی نے ایک ایسی بات کہی جسے سُنکر مجھے بیحد تعجب اور افسوس ہُوا انھوں نے فرمایا کہ اردو زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے، قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا اور پھیلایا۔ مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں۔ حیرت ہے کہ جس شخص کی صحبت میں مدتوں مولینا محمد علی مرحوم، مولینا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر سید محمود جیسے لوگ رہے ہوں وہ اپنی زبان سے ایسی بات نکالے جو سرتاسر غلط، بے بنیاد اور بے اصل ہے۔ میں ہرچند یہ توجیہہ کرکے

اپنی تسلی کرنا چاہتا ہوں کہ مہاتما جی نے یہ بات ناواقفیت کی بنا پر کہی ہے لیکن دل نہیں مانتا۔

مہاتما جی اپنی تقریر میں ہندی اردو یا ہندوستانی کی بحث میں بار بار ہندو اور مسلمان کے لفظ استعمال کرتے تھے میں نے ایک آدھ بار ٹوکا کہ یہ ہندو مسلم سوال نہیں ہے بلکہ بحث ہندی اردو یا ہندوستانی کی ہے۔ ہزارہا ہندو ایسے ہیں جن کی زبان اردو ہے وہ اردو کے ادیب ہیں اسی طرح ہزاروں مسلمان ہیں جو ہندی بولتے اور لکھتے ہیں۔ اسلئے اس بحث کو فرقہ داری رنگ نہیں دینا چاہئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گاندھی جی کا دماغ اور خیال انحطاط پذیر ہو رہا ہے۔ اس ضمن میں میں نے گاندھی جی سے یہ بھی عرض کیا کہ مہاتما جی آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ اردو زبان میں ہندی کے الفاظ اور محاورے جس کثرت سے ہیں خود ہندی زبان میں اسقدر نہیں۔ یہ سنکر گاندھی جی اور دوسرے صاحبوں کو بڑی حیرت ہوئی مینے کہا کہ مینے اس پر خوب غور کیا ہے اور میں اپنے اس دعویٰ کو ثابت کر سکتا ہوں۔ گاندھی جی نے فرمایا کہ یہ کیونکر ہوا۔ مینے کہا اسکی وجہ ہے کہ اردو زبان کی بنیاد عوام کی زبان پر ہے جو اسوقت بولی جاتی تھی اور اسلئے اس میں وہ تمام ہندی لفظ اور محاورے آگئے جو عام لوگوں کی زبان پر تھے۔ ہندی زبان کتابی ہے عوام کی بولی سے اسے بہت کم سابقہ رہا ہے اسے جب کسی لفظ کی ضرورت ہوتی ہے تو سنسکرت کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے اردو ہندی کی نسبت زیادہ ہندی ہے۔

ایک دن وہ تھا کہ مہاتما گاندھی نے ہندوستانی یعنی اردو زبان اور فارسی حروف میں اپنے دست خاص سے حکیم اجمل خاں کو خط لکھا تھا اور آج یہ وقت آگیا ہے کہ اردو تو اردو وہ تنہا ہندوستانی کا لفظ بھی سننا اور لکھنا پسند نہیں کرتے۔ انہوں نے اپنی گفتگو میں جو بر سر اجلاس تھی ایکبار نہیں کئی بار فرمایا کہ اگر ریزولیوشن میں تنہا ہندوستانی کا لفظ رکھا گیا تو اسکا مطلب اردو سمجھا جائیگا۔ لیکن انڈین نیشنل کانگرس کے ریزولیوشن میں تنہا ہندوستانی کا لفظ رکھتے ہوئے یہ خیال نہ آیا۔

آخر اس قلب ماہیت (Change of heart) کی کیا وجہ ہے؟ کون سے ایسے نئے اسباب رونما ہوئے ہیں جو اس حیرت انگیز انقلاب کا باعث ہوئے؟ غور کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس تمام تغیر و تبدل، توڑ جوڑ اور داؤ پیچ کا باعث ہمارے ملک کا بدنصیب پالیٹکس ہے جبتک مہاتما گاندھی اور انکے رفقا کو یہ توقع تھی کہ مسلمانوں سے کوئی سیاسی سمجھوتا ہو جائیگا اسوقت تک وہ ہندوستانی ہندوستانی پکارتے رہے جو تھپک کر سلانے کیلئے اچھی خاصی لوری تھی لیکن جب انہیں اسکی توقع نہ رہی یا انہوں نے ایسے سمجھوتے کی ضرورت نہ سمجھی تو ریا کی چادر اتار پھینکی اور اصلی رنگ میں نظر آنے لگے وہ شوق سے ہندی کا پرچار کریں وہ ہندی نہیں چھوڑ سکتے تو ہم بھی اردو نہیں چھوڑ سکتے۔ ان کو اگر اپنے وسیع ذرائع اور وسائل پر گھمنڈ ہے تو ہم بھی کچھ ایسے ہیٹے نہیں۔

ایسی صورت میں ہمارے لئے اسکے سوا اب کوئی چارہ باقی نہیں کہ ہم اپنی زبان کے بچانے اور اسکی اشاعت و ترقی کیلئے کمربستہ ہو جائیں۔ ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ اسکے متعلق ہم ایک مفصل تجویز عنقریب پیش کرنے والے ہیں۔

عبدالحق
آنریری سکرٹری انجمن ترقی اردو

جلد (۲۹) نمبر (۶)

فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہ جون ۱۹۳۶ء

تصویر:- تیرانداز

چندہ سالانہ عہ ششماہی ہے مع محصول — فی پرچہ ۸ر

بزمِ ہمایوں

آخر یہ خیال چھوڑنا ہی پڑا کہ اہلِ اُردو کی تنظیم نہیں ہو سکتی یا اس قدر دشوار ہے کہ اس کی بجائے بہتر ہے کہ جو کام جہاں جس طرح ہو رہا ہے ہوتا رہے۔ گزشتہ دو تین ماہ سے مدیرِ ہمایوں کو یہ خبط رہا کہ اُردو کے لئے کچھ کرنا چاہیئے! دہلی میں لاہور میں بڑے بڑے آدمیوں سے اور بظاہر چھوٹے چھوٹے' انسانوں سے بھی جا کر ملا کہا کچھ کرنا چاہیئے سب نے کہا ہاں ضرور لیکن یہ بات بھی یاد تھی کہ ہمارے ہاں تنظیم مشکل ہے ناممکن سی ہے۔ پھر خیال آیا کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ مختلف اصحاب سے کہا جائے کہ وہ اپنی اپنی جگہ مختلف کام کریں؛ اگر کر رہے ہیں تو زیادہ مستعدی اور باقاعدگی کے ساتھ کریں اگر نہیں کر رہے تو جس کام سے دلچسپی ہے وہ کرنے لگ جائیں تاکہ اُردو کے لئے اس طرح پر تقسیمِ کار کے ذریعے سے ٹھوس کام ہونا ہے۔ ایک آدھ شخص اُکسانے والا ہے دوسرے کام کرنے والے اپنی ایک بیاض میں الگ الگ صفحات پر الگ الگ شعبے قائم کئے اُن کے مقابل میں مختلف حضرات کے نام لکھے یہ صاحب یہ کام کریں گے وہ صاحب وہ کام کریں گے۔ یوں ہی کئی ہفتوں تک کچھ باہر کی دُنیا میں کچھ گویا اپنے دل و دماغ میں دوڑ دھوپ کرتا رہا۔ بعض رُوٹھے ہوؤں کو منایا جن سے کبھی نہ ملا تھا ملا پوچھا بتایا گھنٹوں اپنا سر کھپایا یا دوسروں کا وقت ضائع کیا۔ آخر جی چاہا کہ ایک دن ان اصحاب کو جن سے یہ بات چیت ہوتی رہی ہے اکٹھا کیا جائے، اِن سے کہا جائے کہ یہ لیجئے آپ ہیں جن سے الگ الگ گفتگو ہوتی رہی، آپ ایک دوسرے کو جانتے پہچانتے ہیں۔ اب فرمائیے کیا ارادہ ہے۔ اگر تنظیم مشکل ہے تو خیر ملاقات ہی سہی۔ جو مختلف خیال کے احباب جمع ہوئے وہ تھوڑے سے بحث مباحثے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ تنظیم کے سرسینگ نہیں ہوتے یہ اکٹھا ہونا ہی تنظیم کی ابتدا ہے چلئے آج ہی سے ایک منظّم جماعت بننے کا ارادہ کرلیں۔ قصّہ کوتاہ اس جماعت کا نام "انجمنِ اُردو پنجاب" رکھا گیا اور مدیرِ ہمایوں کو اس کا سکرٹری مقرر کیا گیا۔

۸ رمئی کو مدیرِ ہمایوں کے مکان "المنظر" واقع ۲۳۔ لارنس روڈ۔ لاہور کے کتب خانے میں یہ مجمع منعقد ہوا اور قواعد و ضوابط وغیرہ تجویز کرنے کے لئے ایک عارضی سب کمیٹی مقرر کی گئی۔ ۹ رمئی کو وہیں نو اصحاب کی یہ کمیٹی بیٹھی اور چند نتائج پر پہنچی ۱۳ رمئی کو انجمن کی مجلسِ عامہ پھر یکجا ہوئی اور کچھ گفت و شنید اور غور و خوض کے بعد مرتب شدہ قواعد و ضوابط ضروری ترمیم کے بعد منظور ہوئے، عہدہ دار تین سال کے لئے منتخب ہوئے اور چند دیگر امور بھی مجلس نے طے کر لئے۔

انجمن کے اغراض و مقاصد حسبِ ذیل ہیں:۔

۱۔ اُردو زبان اور رسم الخط کی ترقی و ترویج

۲۔ اُردو کو ہندوستان کی مشترکہ قومی زبان کی حیثیت سے فروغ دینا۔

۳۔ مستند اور معیاری زبان کو جدید اور مقامی ضروریات کا لحاظ رکھتے ہوئے وسعت دینا۔

۴۔ ایک شعبۂ ادب کا قیام جس میں مختلف علمی و ادبی موضوعات پر مقالے پڑھے جائیں اور جس کے ماتحت تصنیف و تالیف اور تراجم اور تحقیق و تدقیق کا کام کیا جائے۔

۵۔ اُردو کے نشو و ارتقا کا جائزہ لیتے رہنا۔

۶۔ اخبارات رسائل سینما ریڈیو وغیرہ کے ذریعے سے اُردو کی نشر و اشاعت۔

۷۔ اُردو زبان کی موجودہ دفتری، عدالتی اور تعلیمی حیثیت کا تحفظ۔

۸۔ پنجاب یونیورسٹی اور محکمہ تعلیم میں اُردو کے فروغ کی کوشش کرنا۔

۹۔ درسی کتابوں کی زبان کا احتساب انتقاد اور اصلاح۔

۱۰۔ مختلف مقامات میں باقاعدہ ملحقہ انجمنوں کا قیام اور الحاق اور جہاں کہیں ایسی انجمنیں موجود ہوں اُن کو الحاق کی دعوت دینا۔

ذرائع کار کے سلسلے میں انجمن نے فی الحال مفصلہ ذیل چھ شعبے قائم کیے ہیں۔

۱۔ شعبۂ تحفظ اُردو ـــــــ جس کا کام زبانِ اُردو کا تحفظ اور استحکام اُس کے خلاف ناجائز حملوں کی مدافعت اور مختلف صورتوں میں انجمن کے مقاصد کی نمائندگی ہوگا۔

۲۔ شعبۂ نشر و اشاعت ـــــــ جس کا کام اخبارات، رسائل، سینما، ڈراما اور ریڈیو کے ذریعے سے اُردو کی ترویج ہوگا۔

۳۔ شعبۂ ادب و انتقاد ـــــــ جس کا کام کتبِ درسی کی اصلاح و تنقید زبان کی عام درستی و توسیع اور "بنیادی اُردو" کی تشکیل ہوگا۔

۴۔ شعبۂ علوم و فنون ـــــــ جس کا کام اُردو میں جدید علوم کی ترقی و توسیع ہوگا۔

۵۔ شعبۂ مشاعرہ ـــــــ جس کا کام مشاعروں کے ذریعے سے پُرانی اور نئی قسم کی شاعری کے بہترین نمونے پیش کرنا اور اُردو کو مقبولِ عام بنانا ہوگا۔

۶۔ شعبۂ نسواں ـــــــ جس کا کام ہندوستانی گھروں میں اُردو کی ایک مناسب فضا پیدا کرنا اور اُردو کو گویا قوم کی گھُٹی میں داخل کرنا ہوگا۔

انجمن کی ایک مجلسِ عامہ ہوگی جو تمام ارکان پر مشتمل ہوگی اور جس کا عام اجلاس کم از کم سال میں ایک بار منعقد ہوگا اور ایک مجلسِ عاملہ جس کے اکیس ارکان ہوں گے اور جس کا انعقاد عموماً مہینے میں ایک بار ہوا کرے گا۔ شعبہ جات میں ہر شعبے کا ایک ناظم مقرر کیا گیا ہے اور چند ارکان۔ سب ناظم مہینے میں ایک دفعہ مجلسِ عاملہ میں اپنی تحریری رپورٹ پیش کریں گے۔

ہر شخص (زن و مرد) جس کو انجمن کے اغراض و مقاصد سے اتفاق ہو اس انجمن کا رکن بن سکتا ہے۔ چندہ ایک روپیہ سالانہ پیشگی ہے۔

انجمن کے عہدہ دار مفصلہ ذیل ہیں:۔

سرپرست:۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال، سر تیج بہادر سپرو، سر اکبر حیدری، سر راس مسعود، سر عبدالقادر۔

صدر:۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفیؔ۔

نائب صدر:- مولانا ظفر علی خاں، ڈاکٹر ایس ایس بھٹناگر، خواجہ دل محمد، پروفیسر محمد دین تاثیر، سید حبیب ایڈیٹر سیاست۔

سکرٹری:- میاں بشیر احمد۔

جائنٹ سکرٹری۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ایم۔اے۔ پی۔ایچ۔ڈی

دو اسسٹنٹ سکرٹری:- جنہیں سکرٹری حسب ضرورت تجویز کرے گا۔

مجلس عاملہ:- صدر، نائب صدر، سکرٹری، جائنٹ سکرٹری، دو اسسٹنٹ سکرٹری اور حضرات سالک حفیظ، تاجور، احمد شجاع، امتیاز علی تاج ہری چند اختر، چراغ حسن حسرت، عطاء الرحمٰن، حمید احمد خاں، غلام مصطفیٰ تبسم، فیاض محمود۔

شعبہ جات کے ناظم یہ ہیں:-

شعبۂ تحفظ اردو ——— مولانا عبدالمجید خاں سالک ایڈیٹر انقلاب

شعبۂ نشر و اشاعت ——— سید امتیاز علی تاج ایڈیٹر تہذیب نسواں

شعبۂ ادب و انتقاد ——— پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی

شعبۂ علوم و فنون ——— ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم پی ایچ ڈی

شعبۂ مشاعرہ ——— پروفیسر مولانا تاجور ایڈیٹر شاہکار

شعبۂ نسواں ——— بیگم بشیر احمد

۱۳ مئی کے جلسے میں ایک ہزار دو سو روپیہ چندہ ہوا جس میں پانچ سو روپے سکرٹری نے پیش کئے اور دو سو تئیس انجمن ارباب علم کی طرف سے مولانا تاجور اور شیخ ضیاء الدین شمسی نے دیئے۔

انجمن کا دفتر فی الحال ۲۳۔ لارنس روڈ لاہور میں ہوگا۔

بانیانِ انجمن کو توقع ہے کہ اہلِ ملک زیادہ سے زیادہ تعداد میں انجمن کی رکنیت قبول کر کے اردو کی حمایت اور اپنی حب الوطنی کا عملی ثبوت دیں گے۔

انجمن نے اپنے اجلاس منعقدہ ۱۳ مئی ۱۹۳۶ء میں حسب ذیل قراردادیں منظور کیں:-

(۱) انجمن اردو پنجاب کا متفقہ فیصلہ ہے کہ ہندوستان کی رائج الوقت ملکی زبان اردو ہے اور یہ بلاتغیر اسی اور صرف اسی نام یعنی اردو سے موسوم رہنی چاہیے۔ (۲) اس انجمن کا یہ فیصلہ ہے کہ بعض حلقوں کی یہ تجویز کہ ملک کی واحد مشترکہ زبان کے لئے مختلف رسم الخط اختیار کئے جائیں قطعاً ناقابلِ عمل اور غیر ضروری ہے۔ ملک کی مشترکہ زبان اردو کا رسم الخط پہلے ہی سے موزوں، سلجھا ہوا اور جدید ضروریات کے مطابق ہے اور نہ صرف ہندوستان ہی میں رائج ہے بلکہ مشرقی اقطاع کے چند ممالک کو چھوڑ کر تقریباً تمام ایشیائی اور بیشتر افریقی ممالک میں اس کی ہمہ گیری مسلم ہے۔

یہ بھی قرار پایا کہ ان قراردادوں کی نقلیں پریس کو اور حکومتِ ہند اور تمام صوبجاتی حکومتوں کو بھیجی جائیں۔

بشیر احمد



تیر انداز

جہاں نما

جاپان اور اسلام

ا پان میں نئی تہذیب کے اثرات کو قبول کرنے کی غیر معمولی صلاحیت ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اُسے اپنی قومی خصوصیات نے کی قدرت بھی حاصل ہے۔ اسلام کا اثر جاپان نے بالواسطہ قبول کیا ہے۔ چین میں بہت سے جاپانی آباد ہیں یہیں ے بعض نے اسلام کے اصول سے آشنا ہو کر اسے اپنا مذہب بنا لیا۔ اس قسم کے جاپانی مسلمانوں کی تعداد تین سو ہے اور یہ اب بھی اپنے جاپانی ناموں ہی سے موسوم ہیں۔

ا پان کے دار السلطنت ٹوکیو میں ایک اسلامی درسگاہ بھی موجود ہے۔ اس کے کارپرداز وہ مسلمان ہیں جو سوویٹ روس سے دیئے گئے تھے۔ اس درس گاہ سے نہ صرف تاتاری مسلمان فائدہ اُٹھاتے ہیں بلکہ جاپانی بھی مستفید ہوتے ہیں۔ طلبہ کو ی اور انگریزی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جمعہ کے دن یہ درس گاہ مسجد کا کام دیتی ہے اور اس کے صدر معلم امام قربانعلی جمعہ پڑھاتے ہیں۔

ا پان کی ایک بہت بڑی بندرگاہ کوبے ہے۔ یہاں مختلف نسلوں کے بہت سے مسلمان آباد ہیں۔ کثرت تاتاریوں کی ، کے بعد وہ ہندوستانی مسلمان ہیں جو جاپان کو اپنا دوسرا وطن بنا چکے ہیں۔ کوبے میں ہندوستانیوں کی ایک بہت ہے جہاں شام کو ہندی تاجر تفریح کے لئے جمع ہو جاتے ہیں لیکن مسلمان مدت سے ایک مسجد کی ضرورت بھی محسوس کر رہے تھے ۱۹۲[illegible]ء سے کوبے میں ایک نفیس مسجد زیر تعمیر تھی۔ جو اب مکمل ہو چکی ہے۔

دبے میں تاتاری مسلمانوں کی دو مجالس بھی قائم ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں میں مذہبی اور معاشرتی بیداری پیدا ، تاتاری عورتیں ان مقاصد کے لئے اپنے مردوں کے دوش بدوش کام کرتی ہیں کیونکہ انہیں ہمیشہ سے کسی قسم کی ے بغیر پوری آزادی حاصل رہی ہے۔

ا پان کے علاوہ منچوکوؤ میں بھی مسلمان آباد ہیں۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ شہنشاہ منچوکوؤ کی رعایا میں اس وقت تیس لاکھ شامل ہیں۔ ان میں بہت سے ایسے مسلمان ہیں جو سوویٹ روس سے بھاگ کر یہاں پناہ گزیں ہوئے ہیں۔ ہاربن میں یسے ہی روسی آباد ہیں۔ ان کا ایک کثیر الاشاعت اسلامی اخبار بھی ہے جس کی اشاعت جاپان کے علاوہ ایسے تمام

مقامات میں ہوتی ہے جہاں روسی اور تاتاری مسلمان پناہ گزیں آباد ہیں۔

جاپان میں اسلامی مذہبی کتابوں کی بہت ضرورت ہے۔ یہ کتابیں متوہمانہ تنگ خیالیوں سے پاک ہونی چاہئیں کیونکہ جاپان کے لوگ بہت فہیم اور ہوشیار ہیں اور جاہل ملاؤں کے ڈھکوسلوں سے متاثر نہیں ہو سکتے۔ ہر جگہ اور بالخصوص جاپان میں اسلام اپنی اصلی ابتدائی صورت میں پیش ہونا چاہئے۔

جواہر لال نہرو

جواہر لال کا سنہ پیدائش ۱۸۸۹ء ہے۔ بچپن میں وہ یورپین نرسوں کی گود میں پرورش پاتے رہے اور ان کی تعلیم و تربیت انگریزی ماحول میں ہوئی۔ ۱۹۱۶ء میں پنڈت موتی لال انہیں انگلستان لے گئے اور یہ ہیرو کے مشہور مدرسہ میں داخل کر دیئے گئے۔ ۱۹۰۷ء میں یہ کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہوئے۔ یہاں ڈاکٹر کچلو، مسٹر تصدق احمد خاں شروانی، ڈاکٹر سید محمود، مسٹر کے ایم خواجہ اور سر شاہ محمد سلیمان اُن کے ہم عہد طلبہ تھے۔ ۱۹۱۰ء میں جواہر لال علم الحیوانات کی ڈگری لے کر گریجویٹ ہوئے اور آئی سی ایس کے مقابلہ میں شامل ہونے کے لئے لنڈن چلے گئے۔ یہ آئی سی ایس کے مقابلہ میں ناکام رہے لیکن اس ناکامی سے ملک کو ایک پُرخلوص خادم کے مل جانے سے جو فائدہ ہوا وہ اس نقصان سے بہت بڑا ہے جو سول سروس کو ان کی خدمات سے محرومی کی صورت میں اُٹھانا پڑا۔ ۱۹۱۲ء میں جب یہ بیرسٹر بن کر واپس آئے تو ان پر افسرجیت بے طرح چھا رہی تھی۔ ۱۹۱۶ء میں ان کی شادی کملا کول سے ہوئی جو افسوس کہ حال ہی میں انتقال کر گئی ہیں۔ جواہر لال پہلے پہل ۱۹۱۲ء میں بانکی پور کانگریس کے اجلاس میں شامل ہوئے اور دوسرے سال پراونشل کانگریس کمیٹی کے رُکن بن گئے۔ اس زمانے میں وکلا سیاسیات میں محض تفریحی طور پر حصہ لیا کرتے تھے مگر جواہر لال نہرو کا نقطۂ نظر جدا تھا۔ جب جنوبی افریقہ کی تحریک شروع ہوئی تو یہ سیاسیات کو ذرا اور سنجیدگی کی نظر سے دیکھنے لگے اور ۱۹۱۶ء میں جب مسز بیسنٹ نے ہوم رول لیگ کی بنیاد ڈالی تو یہ پوری سرگرمی سے اس کے کام میں مشغول ہو گئے۔

پنڈت موتی لال نہرو کے سیاسی خیالات میں ابھی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ ان دونوں میں کبھی کبھی کسی حد تک تلخی بھی پیدا ہو جاتی تھی مگر جواہر لال "صداقت" کی پیروی پر اڑے رہے۔

۱۹۱۹ء میں مہاتما گاندھی نے ستیا گرہ کی تحریک شروع کی۔ باپ کی خواہش کے خلاف جواہر لال اس تحریک میں شامل ہو گئے۔ اسی اثنا میں پنڈت موتی لال نہرو کو مہاتما گاندھی سے متواتر ملاقات کا موقع ملا اور آخر وہ بھی "گاندھیت" کے پرستار بن گئے۔

تحریکِ عدم تعاون میں جواہر لال مہاتما گاندھی کا دستِ راست بنے رہے۔ اور کانگریس کے جنرل سکرٹری اور روزنامہ انڈیپنڈنٹ کے مدیر کی حیثیت سے اپنا پورا وقت خدمتِ وطن میں صرف کرنے لگے۔

اس کے بعد پرنس آف ویلز کے خیر مقدم سے مقاطعہ کی تحریک شروع ہوئی۔ کانگریس خلافِ قانون قرار دے دی گئی اور جواہر لال کو ایک سال قید کی سزا ملی۔ مگر یہ قید کے آٹھ مہینے کاٹنے کے بعد ۱۹۲۳ء میں رہا کر دیئے گئے۔

۱۹۲۶ء میں انہیں اپنی بیوی کے علاج کے لئے یورپ جانا پڑا۔ یورپ اور سوویٹ روس کی سیاحت کے بعد وہ پورے پورے اشتراکی بن گئے۔ قیامِ یورپ کے دوران میں اُنہوں نے برسلز انٹرنیشنل کانگریس میں حصّہ لیا اور اس کے پانچ اجلاسوں میں سے ایک کی صدارت بھی کی۔

جب جواہر لال لاہور کانگریس کے صدر منتخب ہوئے تو اُن کی صدارت میں مہاتما گاندھی نے آزادیٔ کامل کی قرارداد پیش کی۔

اس کے بعد نمک کی ستیاگرہ کی تحریک شروع ہوئی اور جواہر لال دوبارہ گرفتار کر لئے گئے۔ آزادی کے بعد انہوں نے پھر کام شروع کیا لیکن سات دن بھی زنداں سے باہر رہنے نہ پائے تھے کہ دوبارہ اسیر ہو گئے۔ مفاہمتِ گاندھی و ارون کے بعد ان کو پھر چھٹکارا ملا لیکن دوبارہ ایک تقریر کی پاداش میں حوالۂ زنداں کر دیئے گئے۔

اب جبکہ ان کی بیوی سوئٹزرلینڈ میں بستر مرگ پر پڑی تھی حکومت نے انہیں جیل سے نکل کر سوئٹزرلینڈ جانے کی اجازت دے دی اور اس کے بعد انہیں ایک دفعہ پھر آزادی کا پروانہ بھی مل گیا۔ چنانچہ فی الحال آزاد ہیں۔

اُن کا سیاسی نظریہ اشتراکیت اور عدم تشدد ہے۔ جیل میں وہ اپنا وقت تصنیف و تالیف میں گزارتے ہیں اور اُن کی کتابیں نہایت قدر کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔

نازیوں کے ماتحت جرمنی کی تعلیمی حالت

بعض مغربی آمر نہ صرف دوسری قوموں کے امن کے دشمن ہیں بلکہ وہ بہت سی باتوں میں اپنی قوم سے بھی دوستی کے پردے میں دشمنی کرتے ہیں۔ جرمنی کے نظامِ تعلیم کا وقار دنیا بھر میں مسلّم تھا۔ ۱۹۳۲ء سے قبل جب نازی برسرِ اقتدار نہ آئے تھے ریش کی یونیورسٹیوں میں طلبہ کی تعداد ایک لاکھ سے زاید تھی۔ نازیوں نے عسکریت کے مقابلہ میں تعلیم کو پس پشت ڈالنے میں وہ ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے کہ طلبہ کی یہ تعداد کم ہوتے ہوتے پچپن ہزار تک گر گئی ہے۔ نسلی امتیاز اور سیاسی عقاید سے اختلاف کی بنا پر سینکڑوں فاضل جرمن پروفیسر یونیورسٹیوں سے الگ کر دیئے گئے ہیں۔ سب سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ سیاسی تعصب کے یہ جراثیم بعض قابل جرمن

پروفیسروں کے دماغ کو بھی ماؤف کر چکے ہیں۔ چنانچہ پروفیسر لینارڈ اور پروفیسر شارک جو نوبل پرائز حاصل کر چکے ہیں آج کل محض نسلی اختلاف کی بنا پر آئین سٹائن کے علمی نظریوں کو جھٹلا رہے ہیں۔ دلیل یہ ہے کہ یہ یہودی طبعیات کے مسائل ہیں ہمیں خالص جرمن طبعیات کی ضرورت ہے۔ ان حالات کے بعد جرمنی کی قدیم یونیورسٹی ہائڈلبرگ کی پانسو پچاسویں سالگرہ کے موقع پر جب انگریزی یونیورسٹیوں کے بعض نمائندوں کو دعوت شرکت دی گئی تو اُنہوں نے نہایت زوردار الفاظ میں شریک ہونے سے انکار کر دیا اور ان کا یہ طرزِ عمل ہے بھی درست کیونکہ تعلیمی معاملات میں نسلی امتیاز اور سیاسی اختلافات کو کوئی وقعت حاصل نہ ہونی چاہئے۔ ہر مہذب ملک کا فرض ہے کہ علم کو ان تنگ نظرانہ قیود سے بچائے اور اپنے ملک کے سررشتہ تعلیمات کو سیاسی مصالح کی پابندیوں سے آزاد رکھے۔

سوویٹ روس کا اندرونی منظر

ایتھل مینن نے اپنے تازہ سفرِ روس کے تاثرات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ روس میں تعمیرات کا کام اس وسعت اور سرعت کے ساتھ جاری ہے کہ میں ایک ہی سال بعد ماسکو کو پہچان نہ سکی۔ ہر جگہ اور ہر طرف یہاں تک کہ جنگلوں اور میدانوں میں بھی عمارت پر عمارت بن رہی ہے۔ کہیں مزدوروں کے گھر ہیں کہیں سینما اور تھیٹر۔ کہیں دوسری عمارتیں۔ یہ سلسلۂ تعمیر کسی خاص شہر یا علاقے تک محدود نہیں۔ یوکرین، قفقاز، جارجیا، آرمینیا اور ترکستان میں ہر جگہ مکانات، مدرسے، ہوٹل، تفریح گاہیں اور یونیورسٹیاں وغیرہ زیرِ تعمیر ہیں۔

سوویٹ روس کے راستے میں اپنے مخصوص حالات کی وجہ سے جو سینکڑوں رُکاوٹیں ہیں اُن کے باوجود ترقی کی یہ حیرت انگیز رفتار ایک معجزے سے کم معلوم نہیں ہوتی۔ یہ درست ہے کہ روس کے سامنے ایک بہت بڑا کام ہے اور ابھی اس کے علاقے میں لاکھوں آدمی بہت بُرے حالات میں رہتے ہیں لیکن یہ بات کسی طرح روس کی اولوالعزمانہ مساعی کی تنقیص کا موجب نہیں ہو سکتی۔ یہ درست ہے کہ آبادی کا ایک حصّہ بند کچے مکانوں میں رہتا ہے، بعض لوگ رات کو باہر سونے پر مجبور ہیں اور جگہ جگہ گداگروں سے سامنا ہوتا ہے لیکن سوویٹ روس کے کارکن یقین دلاتے ہیں کہ حالات سرعت کے ساتھ تبدیل ہو رہے ہیں۔ عمارات کی تعمیر فی الحقیقت روز و شب جاری رہتی ہے اور کوئی دن جاتا ہے کہ روس کے ہر باشندے کو رہنے کے لئے اچھا مکان مل جائے گا۔ روس میں سامانِ خوراک کی فراوانی ہے۔ روسیوں کا مقصد یہ نہیں کہ مزدوری کی شرح بڑھائی جائے بلکہ اُن کے پیشِ نظر ضروریاتِ زندگی کو ارزاں کر دینا ہے + ہم روس کو ایک مثالی ملک نہیں کہہ سکتے مگر پھر بھی نامساعد حالات کے باوجود اس کی موجودہ ترقی قابلِ تعریف ہے لیکن یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ روس بھی اب تک جماعتی امتیاز اور امیری غریبی کے فرق کو مٹانے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکا اور اس کے لئے ایک عرصہ درکار ہے۔

علّامۂ راشد الخیری مرحوم

افسوس کہ ۳ر فروری ۱۹۳۶ء کی صبح کو پُرانی دِلّی کی آخری یادگار مٹ گئی یعنی علامۂ راشد الخیری راہگرائے عالمِ باقی ہوگئے۔ علامۂ مرحوم کا انتقال اُردو کی ادبی دُنیا میں اس سال کا سب سے بڑا حادثہ ہے۔ مرحوم کی قومی یا اسلامی خدمات سے قطعِ نظر اُن کا ادبی مرتبہ بھی مسلّمہ طور پر اس قدر بلند ہے کہ اب اُن کی مسند پر کوئی دوسرا شخص بیٹھنے کے قابل نظر نہیں آتا۔ افسانہ نویسی میں مہارتِ فن اور اثر آفرینی کے ساتھ قدرتِ زبان انتخابِ الفاظ اور حسنِ نگارش کا جو انداز انہوں نے پیدا کیا وہ انہیں کا تھا اور انہیں کے ساتھ ختم ہوگیا۔ بلاشبہ وہ ایک صاحبِ طرز ادیب تھے اور قدرت ایسے جوہر قابل پیدا کرنے میں ہمیشہ بہت بخل سے کام لیتی رہی ہے۔

مصلحِ قوم کی حیثیت سے جو کام علّامۂ مرحوم نے اپنے لئے مخصوص کیا اس کا اختصاص اس بات کی روشن دلیل ہے کہ وہ فلسفۂ اصلاح کے ماہرِ کامل تھے۔ شخصی اصلاح اصلاح کے حصنِ حصین کی داغ بیل ہے اور گھر کی اصلاح اس کی بنیاد۔ علامۂ مرحوم نے اسلامی گھروں کی اصلاح کا کام اپنے ذمہ لیا اور پند و نصیحت کے تلخابہ کو ادب کی شکر میں ملونی سے اس قدر خوشگوار بنا دیا کہ تلخی محسوس بھی نہ ہوئی اور دوا اپنا کام کرتی رہی۔

افسوس کہ وہ شمع فروزاں جو ایک سوتی ہوئی قوم کے تاریک شبستانوں میں سالہا سال انوار کے موتی بکھیرتی رہی ہمیشہ کے لئے بجھ گئی۔ عورتوں کا محسنِ اعظم چل بسا۔ بے زبانوں کی زبان خاموش ہوگئی۔

راشد الخیری کا نام اُردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اور اُن کا کام اس منزل کے آئندہ رہروں کے لئے سنگِ میل کا کام دے گا۔ علامۂ مرحوم نے بے شمار تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ راقم کی رائے میں اُن کی سب سے بڑی یادگار یوں قائم ہوسکتی ہے کہ کوئی اُردو داں گھرانا اُن کی کتابوں سے خالی نہ رہے۔

ہمایوں کو مرحوم کی بیگم صاحبہ، ان کے صاحبزادوں اور اعزہ و اقربا سے اس سانحۂ عظیم میں دلی ہمدردی ہے۔ خدا اُن کو صبر کی توفیق دے۔

ج ع خ

"طیورِ آوارہ"

تقریباً سترہ سال ہوئے میں نے ٹیگور کی کتاب Stray Birds ("کنکا") یعنی "آوارہ پرندے" کا ترجمہ انگریزی سے اُردو میں کیا اور حضرت نیاز فتح پوری سے درخواست کی کہ وہ اس کا دیباچہ لکھیں۔ ایک مقفل الماری میں جہاں بعض اور ایسی چیزیں بھی پڑی ہیں چند روز ہوئے اُسے دیکھا، جی چاہا کہ اسے شائع کردوں۔ چنانچہ سرسری طور پر اسے پھر پڑھ کر ناظرین ہمایوں کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

ب ل

مقدّمہ

میرے لئے یہ دوسری مسرت بخش فرصت ہے کہ سر رابندرا ناتھ ٹیگور کی کسی تصنیف کے ترجمہ پر مقدمہ لکھ رہا ہوں۔ میرے لئے اس میں مسرت کیا ہے، ٹیگور کی تصانیف میں وہ خصوصیت کیا ہے جس کو میں اپنے لئے اس درجہ دلکش پاتا ہوں؛ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب دینا میرے لئے آسان نہیں ہے۔

میرے نزدیک جذبات منطق کے جوہر ہیں، جو تجزیہ کو قبول نہیں کرسکتے۔ پھر میں اپنی مسرت کی ترکیب سے کیونکر کسی کو آگاہ کرسکتا ہوں جب کہ دُنیا میں بہت سی چیزوں کا فلسفۂ لذت و الم ہمارے لئے اِک رازِ سربستہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

میں اگر کسی چیز، کسی خیال یا کسی جذبہ سے متاثر ہوتا ہوں تو زیادہ سے زیادہ اس کی تفسیر اس طرح کرسکتا ہوں کہ "یہ میری فطرت ہے" لیکن غالباً میری یہ تفسیر اور زیادہ صراحت طلب ہوگی، جبکہ فلسفۂ تاثر سے زیادہ فطرت بجائے خود اِک عقدۂ دشوار تر ہے۔ اس لئے اگر میں ٹیگور کے جذبات اور اپنے تاثرات کی پوری کیفیت بیان کرنے سے قاصر رہوں تو اس کا سبب یہ نہ قرار دیا جائے کہ اس کے جذبات منافیِ فطرت ہیں، یا میرے تاثرات ناقص و نامکمل۔ بلکہ اس کا سبب صرف یہی ہے کہ حقیقی جذبات و تاثرات کا تعلق بہ نسبت قاؔل کے زیادہ تر حاؔل کی دُنیا سے ہے اور حاؔل اگر بیان ہوجائے تو وہ حال نہیں ہے قاؔل ہے۔

یوں تو ہم شاعرانہ زبان میں موسیقی و نقاشی کو بھی اِک شعر سے تعبیر کرسکتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ شعر کے ساتھ موسیقی و نقاشی اس قدر ممزوج نظر آتی ہیں کہ بسا اوقات ہمارے لئے اُن کو علیحدہ علیحدہ کرنا ناممکن ہوجاتا ہے۔ ہمارا النفس اس امر کا ادراک تو کرتا ہے

فلاں شعر میں نغمہ و صورت گری بھی پنہاں ہیں۔ لیکن کیونکر پنہاں ہیں۔ اُن میں باہم امتزاج کس طرح ثابت ہو سکتا ہے، یہ زبان کے بس کی بات نہیں۔

ساون کے مہینہ میں افقِ فلک پر قوسِ قزح نمودار ہوتی ہے تو اس کی رنگینیوں کو ہم علیحدہ علیحدہ محسوس تو کرتے ہیں۔ لیکن نہیں بتا سکتے کہ دو رنگوں کا خطِ اتصال کہاں ہے، سرخ رنگ کہاں ختم ہوتا ہے اور سبز کس جگہ سے شروع ہوتا ہے۔ باوصف ایک دوسرے سے علیحدہ ہونے کے وہ باہم اس قدر گھلے ملے نظر آتے ہیں کہ ہم تفریقِ الوان کے حدود قائم کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح ایک اچھا شعر بھی گویا قوسِ قزح ہے کہ ہم اس کے اندر یہ نہیں بتا سکتے کہ موسیقی کا تعلق فلاں جزو سے ہے اور نقاشی کا فلاں جزو سے۔ بہ حیثیتِ مجموعی ہم اُن کے لطائف سے متاثر ہوتے ہیں اور ہر ایک کے اثر کو قبول کرتے ہیں لیکن اس کیفیت و تاثر کا اظہار بہت دشوار ہے۔ ایک شخص یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ میں نے جذبات و تاثرات دو چیزوں کا علیحدہ علیحدہ ذکر کیا۔ حالانکہ یہ دونوں فی الحقیقت ایک ہی چیز ہیں۔ ہر جذبہ ایک تاثر ہے اور ہر تاثر ایک جذبہ پر منتہی ہوتا ہے اور اس بنا پر کہہ سکتا ہے کہ جب جذبات و تاثرات کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی، ہماری زبان اُن کے اظہار پر قادر نہیں تو پھر دُنیا میں کوئی شعر، شعر ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ شعر کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ جذبات کا آئینہ ہو۔ اور جذبات ناقابلِ اظہار چیز ہیں۔ بادی النظر میں یہ اعتراض صحیح و درست معلوم ہوتا ہے۔ لیکن فی الحقیقت معترض کی یہ دلیل نادرست ہے۔ ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ شعر جذبات کا آئینہ ہوتا ہے لیکن یہ تسلیم نہیں کہ شعر خود ایک جذبہ ہے۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہم کبھی خود لذت و الم کو ظاہر نہیں کرتے۔ بلکہ اُن سے جو اثر ہمارے جوارحِ ظاہری پر ہوتا ہے، اس کو بیان کرتے ہیں۔ اس لئے شعر صرف اک انعکاس ہے ہماری حسیات کا نہ کہ عین ہماری حسیات۔ ہمارے جذبات و تاثرات اعراض ہیں اور وہ الگ کبھی نظر نہیں آ سکتے۔ اور وہ ہمیشہ کسی دوسری چیز کے اندر رہ کر نمایاں ہو سکتے ہیں۔

ہم کسی رنگین چیز میں رنگ کو نہیں دیکھتے۔ بلکہ اُس کی رنگینی کو دیکھتے ہیں۔ گلاب رنگین ہے لیکن سرخ رنگ تو نہیں۔ بادل کو ہم اُودا کہہ سکتے ہیں لیکن وہ اُودا رنگ نہیں ہے۔

اسی طرح آپ کسی شعر یا کسی فقرے کو لے لیجئے اس کے اندر صرف نتیجۂ تاثرات کا اظہار ہوتا ہے نہ کہ نفسِ تاثرات کا۔

میں جنگل میں ایک شیر دیکھتا ہوں اور ایک شدید خوف اپنے دل میں محسوس کرتا ہوں۔ جو ایک تاثر پنہاں ہے لیکن اس تاثر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ میں کانپنے لگتا ہوں اور بیہوش ہو کر گر پڑتا ہوں۔ پھر جب میں اس واقعہ کو بیان کرتا ہوں تو اپنے خوف کا اظہار صرف اس طرح کرتا ہوں کہ میرے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا اور میرے ہوش و حواس سلب ہو گئے۔ پھر غور کرو کہ جسم کی کپکپی وغیرہ خود خوف ہے یا اس کا نتیجہ۔

ہم شام کو افق میں شفق کی بے شمار رنگینیوں کو دیکھتے ہیں اور ایک جذبۂ مسرت سے مغلوب ہو کر بے اختیار کہہ اُٹھتے ہیں کہ "کیا

قیامت ہے" کیا اس فقرہ سے ہم نے اس مسرت کو ظاہر کیا جو محسوس کی؛ نہیں بلکہ اس مسرت سے متاثر ہو کر یہ فقرہ بے اختیار نکل گیا جس کا مقصود یہ ہے کہ جس طرح قیامت میں ہر چیز درہم برہم متلاطم نظر آئے گی۔ اسی طرح اس وقت میرے جذبات کا عالم ہے۔

ہم ایک حسین چیز کو دیکھتے ہیں اور سبحان اللہ کہہ اُٹھتے ہیں۔ کیا یہ سبحان اللہ اور ہمارا تاثر ایک ہی چیز ہے۔ ہرگز نہیں۔

الغرض آپ جس قدر غور کریں گے اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ہم اپنی زبان سے کبھی اپنے تاثر کا اظہار نہیں کرتے بلکہ اس تاثر سے جو نتیجہ پیدا ہوتا ہے یا اس سے جو خیالات ذہن میں اس وقت مجتمع ہوتے ہیں اُن کو ظاہر کرتے ہیں۔ جیسے ایک نقاش کہ وہ صفحۂ کاغذ پر اصل شئے مُصَوَّر کو نہیں لے آتا بلکہ ایسے نقوش پیدا کرتا ہے جس سے آپ اصل شئے کے متعلق اندازہ لگا سکیں۔ پھر جب یہ ثابت ہے کہ کسی شعر میں اصل جذبہ کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ اس کے نتائج وغیرہ کا بیان ہوتا ہے تو پھر اب معیارِ تنقید صرف یہ رہ گیا کہ ہم الفاظ کو دیکھ کر اُن پر حکم لگائیں کہ ان الفاظ سے اس نے اپنے نتائجِ تاثر کی پوری تصویر کھینچی ہے یا نہیں۔ اور اس لحاظ سے شعر میں اہم ترین چیز صرف اس کا اندازِ بیان ہے۔ اور اس سے ہم کو یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کے اندر کس نوع کے جذبات پیدا ہونے جن سے مجبور ہو کر کوئی شعر یا فقرہ اس کی زبان سے نکل گیا۔

یہ امر مسلّمہ جمہور ہے کہ صحیح معنے میں شعر وہی ہے جس میں جذبات سے بحث کی جائے پھر جس طرح جذبات کے مدارج ہیں، اسی طرح شعر کے بھی ہیں۔ اور جذبات کے معیار سے ایک شعر کے پست و بلند ہونے پر حکم لگایا جاتا ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ ہر شعر خواہ وہ بُرا ہو یا اچھا کسی نہ کسی جذبہ کے ماتحت آسکتا ہے اور اس لحاظ سے کسی شعر کو بُرا نہ ہونا چاہئے۔ لیکن سوال صرف یہ نہیں ہے کہ وہ جذبہ پست ہے یا بلند۔ بلکہ یہی دیکھنے کی چیز ہے کہ آیا کہنے والے کے دل میں خود بھی کوئی جذبہ پیدا ہُوا تھا یا نہیں یا محض اس نے قیاس و تنقید سے کام لے کر اس کا اظہار کیا۔ اور یہیں سے شاعری کی دو قسمیں ہو جاتی ہیں، فطری و اکتسابی اور یہیں سے فنِ شعر کی بنیاد بہ حیثیت ایک مستقل آرٹ ہونے کے شروع ہو جاتی ہے۔ یقیناً کوئی شعر آرٹ سے خالی نہیں ہوتا۔ کیونکہ اپنے خیال کو مقررہ حدود کے اندر ظاہر کرنے کے لئے تکلیف و تصنّع کی ضرورت ہوتی ہے اور اس تکلف و تصنع کی نگہداشت آرٹ ہے۔ لیکن یہاں بھی یہ نکتہ فراموش کئے جانے کے قابل نہیں ہے کہ شاعری محض آرٹ کی غرض سے کرنا اور آرٹ کو صرف شاعری کے لئے حاصل کرنا۔ اس میں بہت بڑا فرق ہے اور یہی وہ فرق ہے جس کو لوگ نظر انداز کر جاتے ہیں اور شعر کے حقیقی مفہوم سے آگاہ نہیں ہوتے۔ میں اس جگہ دہلی لکھنؤ کی شاعری سے بحث کرنا نہیں چاہتا۔ ورنہ غالباً میں اس فرق کو زیادہ وضاحت کے ساتھ مثالیں دے کر سمجھا سکتا۔ دورِ مشیں کے شعراء اُردو میں سے بھی بہت سے شاعر ایسے گزرے ہیں جن کا مطمحِ نظر اُن کے کلام سے معلوم ہوتا ہے۔

میر مسلّم الثبوت شاعر مانا گیا ہے لیکن فن کے لحاظ سے آپ اس کے کلام میں غلطیاں پائیں گے۔ برخلاف اس کے ذوق کو دیکھئے کہ اُس کے ہاں مشکل سے کوئی فن کی غلطی نظر آئے گی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ اپنے جذبات و تاثرات کے اظہار کو بالکل شاعری

سمجھتا تھا۔ اور اس کے سامنے فن کی پروا نہیں کرتا تھا۔ اور یہ شاعری کرتے تھے محض فن کے لئے جس کی پابندی جذبات نہیں کر سکتے۔

میں اس سے قبل ظاہر کر چکا ہوں کہ اصل چیز دیکھنے کی صرف اندازِ بیان ہے جس سے جذبات کی پستی و بلندی کا اندازہ کیا جاتا ہے اور اسی پر حکم لگا کر داغ و جرأت کی شاعری کو میر و درد کی شاعری سے الگ کیا جاتا ہے۔ جس کے موازنہ سے آپ معیار کی پستی و بلندی کو نہایت وضاحت کے ساتھ سمجھ سکتے ہیں۔ یقیناً جرأت و داغ بھی فطری شاعر تھے اور جن کیفیات و تاثرات کو وہ بیان کرتے تھے ان میں آرٹ و تصنع بہت کم ہوتا تھا۔ لیکن تاثرات کا وہ علو جو آپ میر و درد کے کلام میں پائیں گے۔ وہاں اس کا کوسوں پتہ نہیں۔ اس سے مقصود جرأت و داغ کی توہین نہیں کیونکہ ان کا میدانِ سخن ہی میر و درد کی جولانگاہِ فکر سے بالکل علیحدہ تھا اور یہ حقیقت ہے کہ وہ اس میدان کے مرد تھے۔ یقیناً اگر میر و درد سے کہا جاتا کہ وہ داغ و جرأت کے رنگ میں کوشش کریں تو کبھی کامیاب نہ ہو سکتے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ ایک ہی جذبہ مختلف اندازِ بیان سے پست و بلند ہو جاتا ہے لیکن میری رائے میں اندازِ بیان بھی پیدا ہوتا ہے طرفِ جذبات سے اور انہیں کے عمق کے لحاظ سے طریقِ ادا میں بھی بلندی و پستی پیدا ہوتی ہے۔ غالب کا مشہور شعر ہے ؂

کہیں نظر نہ لگے اُن کے دست و بازو کو — یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

مومن اسی مضمون کو بیان کرتا ہے ؂

میری تغیرِ رنگ کو مت دیکھ — تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

دونوں شعروں کی ترکیب ایک ہی تاثر سے ہوئی ہے لیکن مومن کا شعر بہت بلند ہے۔ غالب نے زخمِ جگر کی تخصیص کر کے نہ صرف معنی کو محدود کر دیا بلکہ جذبات آرٹ سے دب گئے۔ زخمِ جگر اور دست و بازوئے یار سے کوئی واسطہ نہیں۔ اگر زخمِ جگر کو دیکھ کر نظر لگ سکتی ہے تو صرف نگاہ کو نہ کہ دست و بازو کو۔ مومن نے تغیرِ حال کے لفظ سے مفہوم میں نہایت وسعت پیدا کر دی۔ اور اس طرح دوسرے مصرع میں صرف "تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے" کہہ کر آرٹ کے تصنع سے اس شعر کو جدا کر دیا۔ میر کا شعر ہے :؂

میری تغیرِ حال پر مت جا — انقلابات ہیں زمانے کے

اپنی جگہ یہ شعر بہت مکمل ہے اور سمجھ میں نہیں آسکتا تھا کہ جذباتِ بصیرت و اعتبار کے اظہار میں اس سے زیادہ ارتقاء کیا ہو سکتا ہے، لیکن درد نے ثابت کر دیا کہ اظہارِ جذبات کے طریقے غیر محدود ہیں اور ہم کسی اندازِ بیان کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ منتہٰی ہے۔ درد کا شعر ہے : ؂

میری تغیرِ حال کو مت دیکھ — یوں بھی اے مہربان ہوتا ہے

دوسرے مصرعہ نے اس خیال کو جس قدر بلند کردیا ہے وہ ارباب نظر سے مخفی نہیں۔ اس جگہ یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ انداز بیان طرز ادا تابع ہیں جذبات کے یا نہیں جہاں تک میں نے اس مسئلہ پر غور کیا ہے۔ یہی محسوس کیا کہ ہمیشہ انداز بیان میں عمق و وسعت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب خود جذبات عمیق ہوں۔ یقیناً غالب اس جذبہ سے متاثر نہ تھا جس جذبہ نے مومن کو بیقرار بنا دیا تھا۔ اور اسی طرح درد کے جذبات میں بہ نسبت میر کے زیادہ گہرائی تھی۔ ورنہ مومن و درد اپنے انداز بیان میں ایسا غلو اور اس قدر بے ساختہ انداز سے ظاہر کرنے میں کبھی کامیاب نہ ہوتے۔ غالب کا مشہور شعر ہے:

دیر نہیں حرم نہیں، در نہیں آستاں نہیں ۔۔۔ بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

معلوم ہوتا ہے غالب اپنے محبوب کے مکان یا دروازہ کے راستہ پر ڈٹ کر بیٹھ گئے ہیں اور دل میں یہ ڈر رہے ہیں کہ کہیں یہاں سے بھی نہ اٹھا دیئے جائیں۔ اس خیال سے جو تکلیف انہیں ہوتی ہے وہ اس کو اس طرح دور کرنا چاہتے ہیں کہ ہمیں اٹھانے کا حق کسی کو کیا ہے اپنا راستہ پر بیٹھے ہوئے ہیں لیکن ایک شاعر نے اس خیال کو بہت زیادہ بلند کردیا ہے لکھا ہے:

برہم نہ ہو چلا میں اٹھ کر یہاں سے بھی اب ۔۔۔ سچ ہے کہ رہ گزر ہے کچھ میرا گھر نہیں ہے

عشق کی افتادگی، محبت کی بے چارگی، بے کسی و بے نوائی جس تکمیل کے ساتھ اس شعر میں نمایاں ہے غالب کے شعر میں نہیں اس سے غالب یا دنیا میں کسی شاعر کی توہین نہیں۔ کیونکہ جس طرح جذبات غالب کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح میر کے دل میں اسی طرح افریقہ کے ایک وحشی کے قلب میں بھی۔ اب رہ گیا انداز بیان۔ سو اس کے لئے کوئی حد مقرر نہیں کی جاسکتی۔ وہ ایک وسیع میدان ہے اور جب تک دنیا قائم ہے طریق ادا اپنے غیر محدود وسائل کے ساتھ ہمیشہ ناقابل احاطہ کہا جائے گا۔

چونکہ شاعرانہ جذبات کی مختلف کیفیات ہم تک صرف انداز بیان کی مختلف صورتوں میں ہو کر پہنچتی ہیں۔ اس لئے تنقید کی کامیابی زیادہ تر طرز ادا پر منحصر ہے۔ اور ہم اس کو دیکھ کر جذبات کے عروج و زوال پر حکم لگا سکتے ہیں۔ چنانچہ میں کوشش کروں گا کہ ٹیگور کی اس تصنیف پر اس زاویۂ نگاہ سے تبصرہ کروں اور بتاؤں کہ اس حیثیت سے ٹیگور کے کلام کا کیا مرتبہ ہے۔

ٹیگور نے جو شہرت دنیائے شاعری میں حاصل کی ہے وہ محتاج تعارف نہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کے معترفین کا عنصر غالب وہ ہے جس نے صرف دوسرے لوگوں سے سن کر یا یہ معلوم کرکے کہ اس نے نوبل پرائز حاصل کیا ہے اس کو قابل عزت سمجھا ہے یورپ اور نیز ایشیا کے ان لوگوں نے جو انگریزی جانتے ہیں اس کی عزت صرف ان تراجم کو پڑھ کر کی جو انگریزی میں خود اس نے اپنی تصانیف کے کئے ہیں۔ اور یقیناً وہ لوگ اس کی شاعری کی حقیقی روح سمجھنے سے معذور ہیں۔ کیونکہ ترجمہ میں جتنا حسن ایک تصنیف کا زائل ہو جاتا ہے۔ وہ ظاہر ہے اور افسوس ہے کہ میں بھی بنگالی زبان سے ناواقف ہوں کہ اس کی اصل تصانیف کو دیکھ کر اس

شاعری پر کوئی حکم لگا سکوں۔ اُردو میں ٹیگور کی جن تصانیف کا ترجمہ ہوا ہے اوّل تو بہت کم ہیں اور دوسرے اگر ہیں بھی تو اس میں اختلاف ہے کہ وہ کس حدتک صحیح و قابلِ اعتنا ہیں۔ اور نیز یہ امر فیصلہ طلب ہے کہ اس کی تصانیف کا ترجمہ نہایت مغلق، پیچیدہ، غیر مانوس الفاظ میں کیا جائے جیسا کہ ہمارے ایک قابلِ دوست نے اس کے ایک مشہور ڈراما کے ترجمہ سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یا نہایت سہل و آسان الفاظ میں جو میرے عزیز دوست میاں بشیر احمد صاحب کا خیال ہے اور جس کی پابندی اُنہوں نے اس ترجمہ میں کی ہے۔ میں اس وقت اس سے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھتا، صرف ذوقِ سلیم اور مستقبل پر چھوڑتا ہوں، اس امر پر اعتماد کرکے کہ only the fittest survive (بقا اسی کو ہے جو بہتر و اصلح ہے)۔

میں اس مقدمہ میں ٹیگور کی سیرۃ اور اُس کے خاندانی حالات سے بھی بحث نہیں کروں گا اور نہ اُس کی شہرت و شاعری کی کوئی تاریخ مرتب کرنا میرا نصب العین ہے بلکہ مقصود صرف اس کے جذبات و تاثرات سے بحث کرنا ہے جو اس کی مختلف تصانیف میں مختلف ہی صورت و انداز سے نمایاں ہیں۔

ٹیگور کی اس وقت تک متعدد تصانیف شائع ہو چکی ہیں جن میں گیتان جلی زیادہ وقیع سمجھی جاتی ہے، لیکن یہ غلطی غالباً صرف اس واقعہ کی بنا پر کی جاتی ہے کہ اس کتاب کی اشاعت پر اس کو نوبل پرائز دیا گیا، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس کی تمام تصانیف اپنے اپنے رنگ کے لحاظ سے قابلِ قدر ہیں اور بادنیٰ تغیرِ بیان سب میں وہی مخصوص کیفیت پیدا ہے۔

جہاں تک میں نے ٹیگور کے کلام کا مطالعہ کیا ہے، اس کے خیالات کو یا تو مسئلہ وحدت الوجود سے متعلق پایا ہے، یا مسائل مابعد الطبیعت سے اور اگر وہ اس جادۂ محبوب سے کہیں ہٹ گیا ہے تو پھر وطن پرستی، حریت و مساوات کے جذبات اُس نے ظاہر کئے ہیں وہ حُسن و عشق کا بیان بھی کرتا ہے لیکن اپنے مخصوص رنگ میں، اس لئے بحیثیت مجموعی اس کا کلام عام سطح سے بہت بلند نظر آتا ہے۔

منجملہ اس کی دیگر مشہور تصانیف کے ایک تازہ ترین تصنیف "Stray Birds" ہے، جس کا ترجمہ میرے صدیق عزیز میاں بشیر احمد صاحب بی۔اے بیرسٹرایٹ لا، (لاہور) نے کیا ہے اور یہ مقدمہ اسی ترجمہ سے متعلق ہے۔

یہ کتاب بہت مختصر ہے، لیکن نہایت دلکش۔ ٹیگور نے اس میں اپنے مختلف خیالات چھوٹے چھوٹے جملوں کی صورت میں یکجا کر دیئے ہیں، اس لئے میں نہیں سمجھ سکتا کہ ادبی نقطۂ نگاہ سے ایک شخص اپنے "خیالاتِ پریشاں" کا دوسرا نام "طیورِ آوارہ" سے بہتر کیا تجویز کر سکتا ہے۔

میں اس جگہ مختلف مقامات سے کچھ اقتباس پیش کروں گا۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ ٹیگور اپنے جذبات و تاثرات کے

اظہار کی غرض سے کیا لطیف اندازِ بیان اختیار کرتا ہے اور اس کی تخیل کیسی دلکش، کس قدر نادر اور کس درجہ مؤثر ہوتی ہے۔
نہ صرف طیور آوارہ" میں بلکہ ہر تصنیف میں اس کا روشن رنگ، روح، موت، حیات بعد الموت، دنیا کی بے حقیقتی اور اسی کے ساتھ تناسخ سے بحث کرتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ وہ ما بعد الطبیعت کے ان مسائل پر عجیب و غریب انداز سے روشنی ڈالتا ہے
اِک جگہ لکھتا ہے "میری روح کی غمگینی اُس کا نقابِ عروسی ہے۔ وہ منتظر ہے کہ رات آئے اور یہ پردہ اٹھ جائے۔"
ٹیگور اکثر رات، شام، تاریکی وغیرہ بول کر موت مراد لیتا ہے۔ روح کی غمگینی کو نقابِ عروسی کہنا اور اس طرح اذیتِ حیات کو نہ صرف خوشگوار بلکہ نہایت عزیز ثابت کرنا ٹیگور کا نہایت محبوب فلسفہ ہے۔ اس کا اعتقاد ہے کہ فنا ہو جانے کے بعد جو زندگی شروع ہو جاتی ہے وہ زیادہ پُر لطف ہے اور حقیقی حیات اسی کا نام ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ لکھتا ہے:-

"موت کی ضرب زندگی کے سکے کو بیش بہا بنا دیتی ہے۔"

موت کی حقیقت ان الفاظ میں بتاتا ہے:-

"وہ جو اضمحلال میں ختم ہو جائے موت ہے لیکن مکمل اختتام تو غیر متناہی میں ہے"

یعنی موت صرف ایک نوع کا اضمحلالِ روح ہے۔ روح کا اختتام اُس وقت ہوتا ہے جب وہ خدائے قدوس کے غیر متناہی جلوہ میں مل جائے کیونکہ وہی روح کا حیزِ اصلی ہے۔

تناسخ کے عقیدہ کو ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے:-

"رات مرجھانے والے دن کو بوسہ دے کر اس سے یوں سرگوشی کرتی ہے کہ میں ہوں موت تیری ماں۔ مجھے پھر تیری تجدیدِ حیات کرنی ہے"

اِسی اعتقاد کے زیرِ اثر وہ دوسرا اندازِ بیان اختیار کرتے ہوئے کائنات و حیاتِ کائنات کی حقیقت کو بتاتا ہے:-

"یہ زندگی اِک سمندر کا عبور کرنا ہے جہاں ہم سب ایک ہی تنگ جہاز میں باہم ملتے ہیں، موت ہمیں ساحل پر پہنچا دیتی ہے اور پھر ہم الگ الگ دنیاؤں کی طرف رُخ کر لیتے ہیں"

ایک جگہ وہ موت کو ماں سے تعبیر کرتا ہے:-

"کام کاج کا دن ہو چکا ہے۔ اے ماں میرے چہرہ کو اپنی باہوں میں چھپا لے اور مجھے خواب دیکھنے دے۔"

حیات بعد الموت کو خواب دیکھنے سے تعبیر کرنا کس قدر لطیف کنایہ ہے۔

کبھی کبھی ٹیگور موت کو سکون و سکوت سے بھی تعبیر کرتا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ نہایت بلیغ انداز سے ذکر کرتا ہے "مجھے اپنی خاموشی کے مرکز پر لے چل اور میرے دل کو نغموں سے لبریز کر دے"۔ خاموشی کے مرکز پر پہنچ کر نغموں سے لبریز ہو جانے کی توقع کرنا۔ حالانکہ سکوت وصدا دو متضاد چیزیں ہیں، ٹیگور کا مخصوص اندازِ بیان ہے۔

مطالعۂ فطرت کے سلسلہ میں ہنگامۂ عالم کے ساتھ ساتھ جلوۂ خداوندی سے بہرہ اندوز ہو جانے کے خیال کو ظاہر کرتا ہے کہ :۔

"صبح میں ہجوم کے ساتھ رستہ پر سے گزر رہا تھا تو میں نے شہ نشین پر تیرے تبسم کو دیکھ پایا اور نغمہ زن ہو کر ساری شورش کو بھول گیا۔"

ایک صوفی مظاہر و آثار کو دیکھ کر عین ذات کے سمجھنے اور پا لینے کو متعسر محسوس کرتا ہے اور پھر متحیر ہو جاتا ہے۔ اسی تاثر کو ٹیگور بیان کرتا ہے اور کس قدر لطیف رنگ اختیار کیا ہے :۔

"یہ تاریکی کا اَن دیکھا شعلہ کیسا ہو گا جس کی چنگاریاں ستارے ہیں"

تاروں کو چنگاریاں کہنا اور ماورائے عالم محسوس کو تاریکی کے غیر مرئی شعلہ سے تعبیر کرنا جیسی نادر تخئیل ہے ظاہر ہے۔

درسِ عمل و تعلیم اخلاق کے متعلق بھی ٹیگور کے متعدد اقوال ہیں جو نفسِ انسانی کو اچھی طرح متاثر کر سکتے ہیں۔ مثلاً

"آرام کا تعلق کام سے اسی طرح ہے جیسے پپوٹوں کا آنکھ سے۔"

وہ لوگ جو دعویٰ کرنے میں زیادہ جری اور عمل میں اسی نسبت سے زیادہ مضمحل ہیں، اُنہیں ان الفاظ سے شرمندہ کرتا ہے :۔

"قول نے عمل سے کہا، میں اپنی بے بضاعتی سے شرمندہ ہوں۔ عمل نے جواب دیا کہ جب میں تمہیں دیکھتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ میں کس قدر حقیر ہوں۔"

وہ لوگ جو اپنے فلسفہ و حکمت کے زعم میں خدا کی قوت کو بھلا بیٹھے ہیں اُن کو تنبیہ کرتا ہے :۔

"وہ دل جو منطق ہی منطق ہو اس چاقو کے مانند ہے جو صرف پھل ہی پھل ہے۔ جو اُسے استعمال کرتا ہے اپنے ہاتھ کاٹ لیتا ہے۔"

لوگوں میں ولولۂ عمل پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے :۔

"یہ نہ کہو کہ صبح ہو گئی ہے اور پھر ایک گزرا ہوا دن کہہ کر اس سے مُنہ پھیر لو۔ اس پر اس طرح نگاہ ڈالو گویا وہ ایک نوزائیدہ بچہ ہے جو کوئی نام نہیں رکھتا۔"

مدعا یہ ہے کہ تم اپنے ہر دن کو اس طرح صرف کرو کہ وہ تمہاری یادگار بن جائے اور دُنیا اُس دن کو فراموش نہ کر سکے۔ یہی اُس دن کا نام رکھنا ہے۔

شہرت طلب لوگوں کو نصیحت کرتا ہے :۔

"بابرکت ہے وہ شخص جس کی شہرت حقیقت سے زیادہ روشن نہیں"

عالمِ یاس میں ایک قوم ہمت ہار جاتی ہے اور ہاتھ پاؤں ڈال کر اپنے تئیں فنا کے سپرد کر دیتی ہے۔ لیکن جس طرح اسلام میں نومیدی کفر سمجھی جاتی ہے اسی طرح ٹیگور بھی اس کا بطلان کرتا ہے کہ :۔

"ہر بچہ یہ پیغام لے کر آتا ہے کہ خدا ابھی انسان سے مایوس نہیں ہوا۔"

یعنی جب تک نظامِ کائنات قائم ہے، جب تک دُنیا کے موجودہ اصُول باقی ہیں کسی قوم کو نا اُمید نہ ہونا چاہئے۔ یہ کہنا کہ "خدا ابھی انسان سے مایوس نہیں ہُوا" حقیقتاً انسان کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے مایوس نہ ہو۔

انکسار سے جو شرف انسان کو حاصل ہوتا ہے اُسے ایک جگہ ایک تشبیہ کی صُورت میں ظاہر کرتا ہے:۔

"بادل کا ٹکڑا آسمان کے گوشہ میں عجز کے ساتھ قائم تھا۔ صبح نے آکر اُسے اپنا سنہری تاج پہنا دیا۔"

تصنّع سے احتراز اور سادگی کے اختیار کرنے میں جو برکات پنہاں ہیں اُنہیں ظاہر کرتا ہے:۔

"سُورج روشنی کی سادہ قبا رکھتا ہے۔ بادل شوخی و رنگینی سے مزیّن ہیں۔"

دوسری جگہ لکھتا ہے:۔

"چڑیا کے پروں کو سونے سے مزیّن کردو۔ پھر وہ کبھی فضائے آسمان میں نہ اُڑے گی۔"

اسی حقیقت کو دوسری طرح بیان کرتا ہے:۔

"آنکھیں اپنی حقیقت پر فخر نہیں کرتیں۔ بلکہ اپنی عینک پر۔"

"طیورِ آوارہ" میں متعدد اقوال ایسے بھی ہیں جنہیں سیاسی کہہ سکتے ہیں اور جو حاکم و محکوم کے تعلقات ظاہر کرتے ہوئے حریّت و مساوات کا صحیح درس دیتے ہیں۔

"ہتوڑے کی ضربیں نہیں۔ بلکہ آبِ رواں کا رقص اپنے نغموں سے سنگریزوں کو سڈول بناتا ہے۔" یا

"ٹھوکر زمین سے صرف گرد پیدا کر سکتی ہے اناج نہیں۔"

"خدا کی قوتِ عظمیٰ ہلکی نسیم میں ہے، تیز طوفان میں نہیں۔"

حریّت و آزادی کو نعمتیں ثابت کرتا ہے:۔

"آبشار یہ گیت گاتا ہے کہ جب میں آزادی کو پا لیتا ہوں تو میں سراپا گیت بن جاتا ہوں۔"

وطن پرستی کے جذبہ کو کس قدر حسُن کے ساتھ اور کتنے لطیف پیرایہ میں بیان کیا ہے:۔

"اے دوست۔ میری شراب میرے ہی جام میں لے۔ جب وہ غیروں کے ساغر میں ڈال دی جاتی ہے تو اپنے رنگین کف کا ہار کھو دیتی ہے۔"

اِک صوفی مشرب شخص کائنات میں ہر چیز کو خواہ وہ کتنی حقیر کیوں نہ ہو عزیز سمجھتا ہے اور پست و بلند ادنےٰ و اعلےٰ سب کو ایک ہی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ چنانچہ ٹیگور لکھتا ہے:۔

"شبنم کے قطرے نے جھیل سے کہا تو ایک بڑا قطرہ ہے کنول کے پتے کے نیچے میں ایک چھوٹا قطرہ ہوں اُس کے اُوپر" یا

"جڑیں شاخیں ہیں زمین کے نیچے چھپی ہوئی، شاخیں جڑیں ہیں ہوا میں پھیلی ہوئی۔"

ض جذباتِ محبت وعشق اس مجموعہ میں کم نظر آتے ہیں۔ لیکن جہاں کہیں ہیں وہاں اسی رنگ میں ہیں جو ٹیگور کا حصّہ ہے۔ مثلاً

"تم مسکرائے اور مجھ سے کوئی بات نہ کی، میں نے محسوس کیا کہ یہی وہ بات تھی جس کا مدت سے انتظار تھا۔"

ی کو دیکھ کر مسکرا دینا اور کوئی بات نہ کرنا یہ وہ ادا ہے جس کی لذتیں یقیناً اپنے بے پایاں ہونے کے لحاظ سے ناقابلِ بیان ہیں۔ لیکن لہ کر" مجھے مدت سے اسی بات کا انتظار تھا" ٹیگور نے اس قدر اُن کا احاطہ کرلیا کہ اس سے زیادہ ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ ندرت یال کی بھی بعض مثالیں نظر آتی ہیں لیکن میں نے صرف ایک جملہ منتخب کیا ہے اور نہیں سمجھ سکتا کہ کن الفاظ میں اس کے خیال کی اد دوں۔ لکھتا ہے :-

"درخت پنجوں پر کھڑے ہوئے آسمان کو جھانک رہے ہیں۔ گویا یہ زمین کی بیقرار تمنائیں ہیں۔"

بہ حد ہے تخیل کی نزاکت و ندرت کی۔

اب نہایت مختصر الفاظ میں اس ترجمہ کے متعلق مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ ادبی کتابوں کے ترجمہ کا حسن یہ ہے کہ اصل کتاب کا کوئی لفظ ترک نہ ہو اور اُس کے ساتھ سلاست و روانی قائم رہے۔ ہرچند یہ بہت مشکل کام ہے۔ اور ہر شخص اس پر قادر نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر آپ اصل کتاب اور اس ترجمہ کو ملا کر دیکھیں گے تو معلوم کریں گے کہ قابل مترجم نے کس حد تک اس کا لحاظ رکھا ہے۔ میں نے جہاں تک غور کیا ہے۔ اس کامیابی کی وجہ صرف یہ معلوم ہوتی ہے کہ مترجم خود فطرت کی طرف سے نہایت سلیم المذاق طبیعت لے کر آیا ہے اور یہی فیضانِ فطرت تھا جس نے صحیح مطالب کے سمجھنے میں اس کی بہت مدد کی۔

اکثر مقامات کتاب میں ایسے تھے کہ ان کا ترجمہ بہت مشکل تھا لیکن مترجم نے اس خوبی کے ساتھ اس کو طے کیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ بعض جگہ ترجمہ میں ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ جو نہ صرف فصیح و سلیس ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اُن سے بہتر کوئی دوسرا لفظ تجویز ہی نہیں ہو سکتا۔ مثلاً (۲۸۶) میں " Lead " کا ترجمہ " لے چل " کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہ تھی۔

میں مترجم کو اس کامیابی پر مبارکباد دیتا ہوں جو صرف ایک مخلص دوست نہیں بلکہ ایک نقاد و مقدمہ نگار کی طرف سے پیش کی جاتی ہے۔

نیاز فتحپوری

طیورِ آوارہ

فصلِ بہار کے آوارہ پرندے میرے دریچے کے سامنے آتے ہیں اور گاتے ہوئے اُڑ جاتے ہیں۔
اور موسمِ خزاں کی زرد پتیاں جن کا ساز خاموش ہو چکا ہے تھرتھراتی ہیں اور وہیں ایک آہ کے ساتھ گر پڑتی ہیں!

اے دُنیا کی ننھی ننھی خانہ بدوش ہستیو! میرے لفظوں میں اپنا کھوج چھوڑ جاؤ۔

دُنیا اپنے چاہنے والے کے سامنے اپنی وسعت کا نقاب اُتار ڈالتی ہے وہ سمٹ کر ایک گیت بن جاتی ہے یا ایک جاودانی بوسہ۔

یہ دُنیا کے آنسو ہی ہیں جو اس کے تبسم کو تازہ و شاداب رکھتے ہیں۔

وسیع صحرا سبزے کی اس ننھی پتی کی محبت میں جل رہا ہے جو جھومتی ہے اور ہنستی ہوئی غائب ہو جاتی ہے۔

اگر تم سورج کے اوجھل ہونے پر آنسو بہاؤ گے تو ستاروں کو بھی نہ دیکھ سکو گے۔

اے رقص کرتے ہوئے پانی! تیرے رستے کی یہ ریت تجھ سے ہر گھڑی تیرے گیت اور تیرے رقص کی بخشش طلب کرتی ہے کیا تو اس کی بے بسی میں اُس کی مدد نہ کرے گا؛

اس کا اُداس سا چہرہ میرے خوابوں کو راتوں کی بارش کی طرح معمور کئے ہوئے ہے۔

کبھی ہم نے یہ خواب دیکھا تھا کہ ہم ایک دوسرے سے بیگانہ ہیں۔ بیدار ہو کر ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں ایک دوسرے سے محبت تھی۔

جیسے شام خاموش درختوں پر چھا جاتی ہے کچھ اس طرح غم میرے دل میں تحلیل ہو کر سکون و اطمینان کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

کچھ اَن دیکھی انگلیاں ہلکی ہلکی ہوا کی طرح میرے دل پر نغمی لہروں کی دلکش راگنیاں چھیڑ رہی ہیں۔

"اے سمندر! تیری زبان کیا ہے؟"
"ابدی سوال کی زبان"
"اے آسمان! تیرا جواب کونسی زبان ہے؟"
"ابدی خاموشی کی زبان"

اے دل! دُنیا کی اُن دھیمی دھیمی آوازوں کو کان دھر کے سُن جن کے ساتھ وہ تجھ سے اظہارِ محبت کرتی ہے۔

آفرینش کا راز رات کی تاریکی کی طرح عمیق ہے، علم کی فریب کاریاں صبح کے کہر کی مانند ہیں۔

کسی چٹان پر اپنی محبت کی بنیاد نہ رکھو محض اس لئے کہ وہ اُونچی ہے۔

میں آج صبح اپنی کھڑکی میں بیٹھا ہوں اور دُنیا ایک راہرو کی طرح اک لمحے کے لئے کھڑی ہو کر مجھے کچھ اشارہ کرتی ہے اور چلی جاتی ہے۔

میرے یہ ننھے ننھے خیال پتیوں کی سرسراہٹ ہیں۔ وہ خوشی میں آ کر میرے دل سے سرگوشیاں کرنے لگتے ہیں۔

حقیقت میں جو کچھ تم ہو تم نہیں دیکھتے۔ جو تم دیکھتے ہو وہ فقط تمہارا سایہ ہے۔

میری خواہشیں نادان ہیں۔ اے میرے آقا! جب تو گاتا ہے تو غُل مچانے لگتی ہیں۔ تو مجھے سننے کی توفیق عطا فرما۔

میں خود بہترین کو نہیں چُن سکتا لیکن بہترین آپ مجھے چُن لیتا ہے۔

جو لوگ اپنی شمعوں کو پسِ پشت رکھتے ہیں ان کا سایہ اُنہیں کے رستے پر پڑتا ہے۔

میرے لئے یہ امر کہ میں موجود ہوں اِک دائمی حیرت ہے اور یہی زندگی ہے۔

"ہم سرسرانے والے پتے، طوفانوں کے نعروں پر لبیک کہتے ہیں لیکن تم کون ہو جو اس قدر خاموش ہو؟"
"میں تو محض ایک پھُول ہوں"

آرام کا تعلق کام سے اس طرح ہے جیسے پپوٹوں کا آنکھوں سے۔

انسان فطرتاً ایک بچہ ہے۔ اُس کی قوت قوتِ نشوونما ہے۔

خدا ہم سے سُورج اور زمین کے عوض شکریہ طلب نہیں کرتا مگر ہاں وہ ہم سے اُن پھُولوں کا جواب ضرور چاہتا ہے جو اُس نے ہم کو عطا کئے ہیں۔

وہ روشنی جو ایک برہنہ بچے کی طرح سبز پتیوں سے کھیلتی ہے خوش نصیب ہے کہ وہ انسان کی دروغ گوئی سے بے خبر ہے۔

اے حسن! اپنی حقیقت کو محبت میں ڈھونڈ، اپنے آئینے کی خوشامد میں نہ دیکھ۔

میرا دل روز و شب دُنیا کے ساحل پر موج زن ہے اور اُس پر آنسوؤں سے اپنا نام ان لفظوں میں لکھتا رہتا ہے:- "میں تجھ سے محبت کرتا ہوں"

اے چاند! تو کس شے کا انتظار کر رہا ہے؟ "سورج کو سلام کرنے کے لئے جس کے واسطے مجھے راستہ چھوڑ دینا چاہئے"۔

درخت میرے دریچے تک پہنچ کر رہ جاتے ہیں وہ بے زبان زمین کی تمنا بھری آواز ہیں۔

خدا کی ہر صبح خود اُس کے لئے ایک نئی حیرت ہے۔

زندگی دُنیا کے مطالبات میں، اپنی دولت اور محبت کے مطالبات میں اپنی قیمت پالیتی ہے۔

دریا کے خشک پاٹ کے گزشتہ احسانوں کا شکریہ کوئی ادا نہیں کرتا۔

پرندہ چاہتا ہے کہ وہ بادل ہوتا، بادل چاہتا ہے کہ وہ پرندہ ہوتا۔

آبشار یہ گیت گاتا ہے کہ جب میں اپنی آزادی کو پالیتا ہوں تو میں سراپا نغمہ بن جاتا ہوں۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ دل کیوں خاموشی میں مضمحل ہو جاتا ہے۔ اس کا سبب وہ چھوٹی چھوٹی بھولی بسری نامعلوم حاجتیں ن کے لئے یہ کبھی دستِ سوال نہیں بڑھاتا۔

اے عورت! جب تو اپنے گھر کے کاروبار میں چلتی پھرتی ہے تو تیرے اعضا اس طرح نغمہ ریز ہوتے ہیں جیسے ایک کوہستانی پنے سنگریزوں میں۔

سورج مشرق کو اپنا آخریں سلام کرتے ہوئے مغربی سمندر کے اُس پار جا رہا ہے۔

اپنی غذا پر عیب نہ رکھو اس لئے کہ تمہیں بھوک نہیں۔

درخت گویا پنجوں پر کھڑے ہوئے آسمان کو جھانک رہے ہیں یہ زمین کی بے قرار تمنائیں ہیں۔

تم مسکرائے اور مجھ سے کوئی بات نہ کی اور میں نے محسوس کیا کہ یہی وہ بات تھی جس کا مجھے مدت سے انتظار تھا۔

مچھلی پانی میں خاموش ہے جانور زمین پر شور مچاتا ہے اور پرندہ ہوا میں اپنی راگنی چھیڑتا ہے لیکن انسان اپنے سمندر کی خموشی زمین کی شورش اور فضائے آسمان کی موسیقی یہ سبھی چیزیں رکھتا ہے۔

دُنیا منتظر دل کے تاروں پر گزرتی ہے تو درد بھرے نغمے پیدا کر دیتی ہے۔

اُس نے اپنے ہتھیاروں کو اپنا دیوتا بنا لیا ہے۔ جب اُس کے ہتھیار بازی جیت جاتے ہیں تو وہ آپ سے آپ مغلوب ہو جاتا ہے۔

خدا آفرینش سے اپنی ماہیت کو پا لیتا ہے۔

سایہ اپنا نقاب ڈالے ہوئے پوشیدہ انکسار کے ساتھ اپنی محبت کے خاموش قدموں سے روشنی کے پیچھے ہو لیتا ہے۔

ستارے جگنو بن کر نظر آنے سے نہیں جھجکتے۔

تیرا شکر گزار ہوں کہ میں قوت کے پہیوں میں سے نہیں ہوں، بلکہ اُس زندہ مخلوق میں سے ہوں جسے وہ کچل ڈالتے ہیں

پُر عزم دل ہر نقطے پر جم کر بیٹھ جاتا ہے اور مطلق جنبش نہیں کرتا۔

بشیر احمد

قطب جنوبی کا انگریز سیّاح

انگریز جہاز ران کیپٹن رابرٹ فالکن سکاٹ نے ۱۹۱۰ء میں قطب جنوبی کی طرف ایک مہم کی رہنمائی کی۔ چنانچہ وہ اور اس کے چند منچلے ساتھی ت کے تند زمہریری عناصر کا مقابلہ کرتے ہوئے مرتے مٹتے ۱۸ جنوری ۱۹۱۲ء کو قطب جنوبی تک جا پہنچے۔ لیکن وہاں ناروے کے سیاح امنڈسین٭ کا جھنڈا ہی سے گڑا دیکھ کر سکاٹ کو سخت صدمہ ہوا کہ قطب جنوبی کے اولیں کامیاب سیاح کی حیثیت سے وہ اپنی قوم کے نام کو چار چاند لگانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ ناچار وہ ں کے بچے کھچے ہمراہی دل شکستہ ہو کر لوٹے اور رفیقوں کی منزل بہ منزل موت اور بھوک ورجان لیوا طوفانوں کا دلیرانہ مقابلہ کرتے ہوئے آخر سکاٹ بھی اپنے دو باقی ماندہ ں کے ساتھ ایک جائے پناہ ون ٹان ڈپو سے صرف گیارہ میل پرے راہئ عدم ہوا۔ یہ نظم سر عبدالقادر کے قابل اور ہونہار صاحبزادہ مسٹر منظور قادر نے اس مہم کے متعلق ایک فلمی تماشا دیکھ کر لکھی ہے۔

حامد علی خاں

آبادیوں سے دور بہت، ایک سرزمیں
بے انتہا عجیب ہے ٭ اُس سرزمین پر
زندہ نہیں ہے کچھ بھی ہر اک سُو جمود ہے
مفقود ہے ازل سے وہاں نامِ زندگی
اِک شے نے بھی نہیں ہے پیا جامِ زندگی ٭
مست اپنے اپنے حال میں قدرت کے کارکُن
دن رات اپنے کام میں مصروف ہیں وہاں —
بجلی چمک چمک کے کڑکتی ہے بار بار۔
بادل گرج گرج کے برستے ہیں بار بار۔
اور تُند خو ہوائیں، اُمڈ اور گھر کے، وال
اُٹھتی ہیں زور و شور سے۔ بے حد خروش سے،
جو راستے میں آئے ہٹا کر اُسے پرے
بس اپنی دُھن میں محو، چلی جا رہی ہیں وہ۔
اور برف، ہر طرف سے برستی ہے صبح و شام۔

٭امنڈسین سکاٹ سے صرف بارہ دن پہلے وہاں پہنچ چکا تھا۔

گویا فضا ہو ایک سمندر، وسیع سا۔
اور اُس میں برف سے ہوں بنی موج ہائے تیز +
واں عُنصروں کا شور ہے۔ لیکن وہ شور کچھ
ہے اِس طرح کا، جس سے بڑھے اور بھی سکوت۔
اور آدمی بھی اپنی بڑائی کے باوجود۔
اور اپنے ادّعائے خدائی کے باوجود۔
قدرت کے اس شکوہ و جلالت کے سامنے۔
احساس اپنی ہستیٔ ناچیز کا کرے +
دیووں کے قد کے، برف کے تودے، جمے ہوئے۔
پھرتے ہیں سطحِ بحر پہ یوں تیرتے ہوئے
گویا کہ آسمان پہ بادل ہوں اُڑ رہے +
اور اُن میں غار بن رہے ہیں، طرح طرح کے۔
کچھ غار ہیں کہ لعل و جواہر کی کان کا
دھوکا ہو اُن پہ جب پڑے خورشید کی کرن +
اور ایسے بھی ہیں غار جو ہیں اس قدر مہیب
یاد آئیں جن کے دیکھے، بلائیں وہ سب کی سب
جن کی کہانیوں سے لڑکپن میں رونگٹے
دہشت کے مارے تن پہ بہت دیر دیر تک
رہتے تھے یوں کھڑے کہ وہ کانٹے ہوں جس طرح +
مدھم سی ایک روشنی، ہر وقت، اُس جگہ
رہتی ہے، جیسے صبح کو سُورج نکلنے سے
پہلے، اُفق پہ پھیلتی ہے جُوئے شیرِ صبح +
اِس دلفریب جھٹپٹے میں ایک ایک چیز

مُبہم سی، اور جسم سے فارغ سی، یوں نظر
آتی ہے، جیسے ساری یہ چیزیں ہوں خواب کی ÷
اور برف کی سفیدی پہ پڑتی ہے جب یہ ضَو
تو اُس میں ایک رنگ عیاں اس طرح کا ہے
جو نُور کا ہو یا ہو خدا کے ظہور کا۔
قدرت بڑے جلال سے جلوہ فگن ہے واں۔
ہر منزل ایک منزلِ ہمت شکن ہے واں ÷

اِس ارضِ پُرشکوہ پر اک مردِ شیر دل
سینے میں آرزوؤں کا طوفاں لئے ہوئے۔
دُنیا کی آفتوں سے نڈر جاں لئے ہوئے،
پہنچا۔ کچھ اپنے ساتھ مصاحب لئے ہوئے ÷
اُس مردِ شیر دل کا ارادہ یہ تھا، کہ وہ
پہلا وہ جاندار ہو، جس نے کہ اُس جگہ
رکھا ہو پیر، جب سے بنی ہے یہ کائنات ÷
سردی بہت شدید تھی۔ اتنی، کہ خون جسم
میں جائے جم، اگر نہ حفاظت کرے کوئی۔
اور کان اور ناک جھڑیں خاک کی طرح ÷
مردانہ وار سارے مصائب کو جھیل کے
سَو بار اپنی جانِ گرامی پہ کھیل کے۔
وہ باوقار شخص، وہاں تک پہنچ گیا
جس جا پہ۔ اس کے دِل کا یہ ارمان تھا۔ کہ کوئی
بھی ذی حیات شے نہ ہو پہنچی کبھی وہاں ÷

لیکن جب اُس مقام پر پہنچا۔ تو اُس نے واں
پہلے ہی ایک جھنڈے کو پایا گڑا ہُوا۔
اِک اور شخص جو کہ بہادر بھی اور تیز
بھی تھا، وہاں پہنچ کے چلا جا چکا تھا۔ اور
اپنی بہادری کا نشاں دائم القیام
اُس جا پہ چھوڑ آیا تھا + یہ بات دیکھ کر
دل اُس کا چُور ہو گیا۔ اور ساتھیوں سمیت
وہ دل شکستہ مرد پلٹ آیا۔ اور راہ
میں بے شمار کلفتوں، رنجوں، مصیبتوں
سے گھر کے۔ جاں نثار و وفادار و پُرخلوص
اصحاب کے سمیت۔ ہُوا راہیِ عدم +
اُس شیر دل دلیر کی پاکیزہ یادیں ——
زندہ رہیں گے جس کے چمکتے ہوئے نشان۔
اور داستان جس کی بڑائی کی، تا ابد
خلقِ خدا کے وردِ زباں ہوگی روز و شب۔
اور جس کے کارہائے نمایاں، ہزارہا
لوگوں کو جوش و ہمت و جرأت دِلائیں گے ——
اُس سرزمین پر جو بہت دُوریاں سے ہے ——
لکڑی کا اِک لگا ہے ذرا سا نشانِ قبر +
واں ہر طرف اُجاڑ ہے، اور برف ہے بہت۔
اور نام کو نہیں ہے وہاں کوئی زندہ شے۔
نیچے ہے بحر برف کا۔ اور اوپر ابر ہے۔
اس وسعتِ عظیم میں تنہا وہ قبر ہے +

منظور قادر

کہانیوں کی کہانی

یاد نہیں پڑتا کہ کس محقق نے لکھا مگر یہ امرِ واقع ہے کہ ایک فاضلِ اجل نے بہت چھان بین کے بعد یہ قرار دیا کہ دُنیا میں صرف چھ سات قسم کی تو اصل کہانیاں ہیں اور باقی ان حراؤں کے کچھ تھوڑے بہت اُلٹ پھیر کے ساتھ محض نقلی فوٹو ہیں۔ کہانیوں کی نسبت دیانتداری سے کہہ سکتا ہوں ع

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

قسم اوّل تو وہ ہے جو رامائن میں ہے یعنی ایک عصمت کی دیوی ایک بوالہوس کے پنجہ سے نجات پاتی ہے مگر شک کا شکار ہو کر جیتی آگ میں سے بال بال بچ کر نکلتی ہے۔

قسم دوم وہ ہے کہ قسمت کا لکھا پورا ہوتا ہے مگر بیچارے شیر افگن کی جان مفت میں جاتی ہے۔

قسم سوم کا الف لیلہ ایک زندۂ جاوید مرقع ہے یعنی یہ کہ مرد کے مظالم سے بچنے کے لئے صنفِ نازک کو لطفِ تکلم کا ماہر بننا پڑتا ہے۔ مرد لاکھ سوچے مگر جب عورت چاہے کہ وہ اس کے پنجہ سے آزاد نہ ہو تو مرد قطعی عاجز ہے۔

قسم اوّل و دوم میں عورت کی فتح اور بوالہوس اور ظالم کی شکست ہے۔ قسم دوم تقدیر کا کھیل ہے۔ دیول دیوی ہو کہ مہرالنسا ہو وہی ہوتا ہے جو غیر متوقع ہو۔

قسم چہارم میں عورت کو براہِ راست تو کچھ دخل نہیں مگر پسِ پردہ عورت کی دُور اندیشی اس کی جبلی حماقت کو چھپا نہیں سکتی۔ رستم جیسے باپ کے ہاتھوں سہراب جیسا سپوت قتل ہوتا ہے۔ یہ کہانی اس بقائے دوام کی آرزو کا مضحکہ ہے جس کے پنجہ میں اکثر شجاع گرفتار ہیں۔

قسم پنجم وہ ہے جس میں محض اختلافِ طبائع کا ڈراما ہے۔ اس کی آج کل کے زمانے میں ایک زندہ مثال موجود ہے یعنی انگورہ اور ہماری پاشا۔ پہلے وہ کھیل ہوا جسے اردو کے شاعر نے یوں بیان کیا ہے ع

دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

پھر نتیجہ یہ ہوا کہ آگ بجھ گئی اور خاکستر کا ڈھیر بکھر گیا۔

چھٹی اور ساتویں قسم مجھے خود اپنے لفظوں میں بیان کرنی پڑیں گی:۔

قسم ششم۔ سلطان محمود کے درباریوں نے جب دیکھا کہ ایاز کو سلطان کے مزاج میں غیر معمولی دخل ہے تو اس کوشش میں مبتلا ہوئے کہ کسی طرح یہ راز و نیاز کا سلسلہ ختم ہو۔ سلطان ایک ہی کائیاں تھا۔ فوراً بھانپ گیا اور موقع کی تاک میں رہا۔ ایک دن ایک جوہری نے برسرِ دربار ایک بیش بہا موتی پیش کیا۔ سلطان نے وزراء راست و چپ کو یہ موتی دکھلایا۔ ہر ایک رطب اللسان تھا کہ شاہانِ زمانہ میں کم کسی خاقان و قیصر کو اس قسم کا نایاب موتی نصیب ہوا ہوگا۔ جب تمام وزراء تعریف کے پل باندھ چکے تو سلطان نے وزیرِ اول کو حکم دیا کہ اس موتی کو فوراً چکنا چور کردو۔ وزیرِ اول نے دست بستہ عرض کی کہ احقر العباد کی کیا مجال کہ اس گوہرِ نایاب کو تلف کرے۔ یہ سُن کر سلطان نے وزیرِ دوم کو وہی حکم دیا۔ وزیرِ دوم نے دل میں سوچا کہ "جس خدمت سے وزیرِ اول پہلوتہی کر چکا ہے عین حماقت ہوگی اگر میں پیش قدمی کروں"۔ چنانچہ اس نے بھی مناسب الفاظ میں معذرت کی۔ القصہ یکے بعد دیگرے سلطان کے ساتوں وزیر موتی کو چکنا چور کرنے سے گریز کر گئے۔ اس کے بعد سلطان نے ایاز کو بلایا اور حکم دیا کہ "ایاز اس موتی کو کچل دو"۔ ایاز نے آؤ دیکھا نہ تاؤ بھدا سا پتھر اُٹھا تاڑک سے موتی کو پیس کر دھر دیا۔

سلطان۔ ارے او نابکار! تیرے سامنے سات وزیروں نے انکار کیا اور تو ایسا فاتر العقل نکلا کہ تو نے بلا سوچے سمجھے وہ موتی جو ہفت اقلیم میں لاثانی تھا برباد کر دیا۔

ایاز۔ سلطان! میری تقصیر۔

سلطان نے یہ کہہ کر دربار برخاست کر دیا کہ وہ لوگ جو ایاز کے شاکی ہیں، اپنے اور ایاز کے درمیان جو فرق ہے اسی ایک جملہ سے سمجھ لیں کہ اس نے یہ نہیں کہا کہ تعمیلِ حکمِ سلطانی میں اس نے موتی برباد کیا۔ اس نے یہی کہا کہ "میری تقصیر"۔ ایاز کے بدخواہ اِس پر بھی اپنے ارادوں سے نہ ٹلے اور آخر سلطان کے پاس حلفی بیان کیا کہ ایاز جس کو سلطان نے معتبر سمجھ کر خاص توشہ خانہ کا افسر مقرر کیا ہے چھپ کر راتوں کو توشہ خانے میں جاتا ہے اور خدا جانے وہاں سے کیا کیا نکال لاتا ہے۔ سلطان محمود جیسے زر پرست کے سامنے یہ شکایت کچھ معمولی شکایت نہ تھی اور آخر سلطان نے موقع نکالا کہ دربار میں تو یہ مشہور ہوا کہ سلطان شکار کو دُور نکل گیا ہے مگر سلطان ساری دُنیا سے خفیہ ایک چور رستہ سے خود اپنے توشہ خانے میں رات کے انتظار میں چھپ رہا۔ اندھیرا چھایا، رات ہوئی اور آخر قطعی تاریکی۔ سلطان کیا دیکھتا ہے کہ توشہ خانے کا دروازہ باہر سے کُھلا ایاز اندر داخل ہُوا۔

قریب تھا کہ سلطان ایاز کی طرف لپک کر اس کے سینہ میں خنجر بھونک دے مگر جس باتدبیر اولوالعزم نے سترہ حملے ہندوستان پر حملہ خراسان اور بخارا پر کئے تھے وہ رُکا، ٹھٹھکا اور دل ہی دل میں کہنے لگا کہ پہلے دیکھیوں ہوتا کیا ہے —— یہ چند لمحے سلطان کے لئے زندگی کے بدترین ثابت ہوئے تھے کیونکہ سلطنت کا جانا یا جان کا جانا کچھ بھی نہیں مگر جس سے پیار ہو اس

کا اٹھ جانا قیامت ہے۔ سلطان ٹھٹکا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایاز اپنا بیش قیمت خلعت اُتار کر رکھ دیتا ہے اور ایک گٹھڑی کھول کر اس میں سے اپنے پُرانے کپڑے نکال کر پہنتا ہے۔ یہ پھٹے پُرانے چیتھڑے پہن کر ایاز ایک قدِ آدم آئینہ کے سامنے کھڑا ہو کر شمع کی روشنی میں اپنے عکس کو مخاطب کر کے کہتا ہے :۔

"ایاز ! قدرِ خود بشناس"

سات دفعہ بلند آواز سے یہ کہتا ہے اور پھر اپنا لباسِ فاخرہ پہن کر توشہ خانے کو مقفل کر کے چلا جاتا ہے۔ پہلے تو سلطان جہاں تھا وہیں دنگ رہ جاتا ہے اور پھر دو نفل شکرانے کے ادا کر کے پورے اطمینانِ قلب کے ساتھ توشہ خانے سے اسی چور رستے سے مراجعت کرتا ہے۔ اطمینانِ قلب کے ساتھ مگر ساتھ ہی یہ بھی ہوتا ہے کہ ؎

محمود غزنوی کہ ہزاراں غلام داشت

عشقش چناں گرفت غلامِ غلام شُد

قسم ہفتم صوفیا کے متعلق ہے۔ روایت ہے کہ ایک درویش کسی جنگل میں دن رات عبادت میں مشغول تھا۔ اس قدر مشغول تھا کہ اُسے یہ خیال کرنے کا بھی موقع نہ ملتا تھا کہ وہ عبادت کر رہا ہے اور عبادت کوئی غیر معمولی قابلِ تعریف ہے۔ عبادت کا شوق تھا عبادت کرتا تھا اور اس سے زیادہ اسے کسی اُدھیڑبُن کا موقع ہی نہ تھا۔ شیطان علیہ اللعنت کو یہ سُوجھی کہ ہو تو اس درویش کو ورغلاؤ۔ چنانچہ یہ موذی ایک لمبا لبادہ سبز عمامہ ڈاٹ تسبیح ہزار دانہ بازو سے لپیٹ جنگل میں اس وقت نمودار ہُوا جب وہ سیدھا سادھا درویش نمازِ عصر ادا کر رہا تھا۔ شیطان نے بھی نفلی نماز ادا کی اور وہ لمبے لمبے سجدے کئے کہ درویش اس خلوص پر حیران رہ گیا۔ ابلیس نماز ادا کرنے کے بعد ہاتھ اُٹھا کر گڑگڑاتی آواز میں درگاہِ الٰہی میں گویا دُعا کر رہا تھا اور دورانِ دعا میں اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی ٹپک کر اس کی مصنوعی سفید ریش مقطع پر ختم ہوتی تھی۔ درویش سے نہ رہا گیا اور وہ ان فاتِ شریف کے قریب بصد ادب پہنچ کر یوں ملتجی ہُوا۔

درویش۔ قبلہ ! نماز تو بُری بھلی میں بھی ادا کرتا ہوں مگر جو شانِ خلوص آپ کی دعا میں ہے وہ مجھے آج تک نصیب نہیں۔ للہ اپنے پاؤں کے تصدق مجھے کچھ نصیحت کیجئے کہ مجھے بھی وہ حضورِ قلب نصیب ہو جو آپ کو حاصل ہے۔

ابلیس۔ بیٹا ! تم ہزاروں لاکھوں سے اچھے ہو مگر اصل بات یہ ہے کہ تم پر درِ توبہ بند ہے۔ تم نے گناہ نہیں کیا اس لئے تمہاری عبادت میں وہ لذت نہیں جو ان لوگوں کو حاصل ہے جن پر درِ توبہ باز ہے۔

یہ کہہ کر شیطان علیہ اللعنت تو چلتا بنا مگر اُس بھولے درویش کے دل میں بات بیٹھ گئی کہ یہ بزرگ کہتا سچ تھا کہ مجھ پر درِ توبہ بند ہے۔ یہ سوچتے سوچتے آخر درویش نے شہر کی راہ لی۔ آدھی رات گزری تو شہر میں وارد ہُوا۔ سب مکان بند تھے مگر ایک قحبہ

کے بالاخانے میں روشنی تھی۔ درویش وہیں جا پہنچا اور چپکا بیٹھ گیا۔ یُونہی جب بیٹھا رہا تو آخر اس عورت نے پوچھا کہ سائیں جی آپ کو یہاں کیا کام ہے؟

درویش ۔ بیوی میں گناہ کرنے آیا ہوں۔

قحبہ ۔ بسم اللہ۔ بندی کا تو پیشہ ہی یہ ہے مگر اجازت ہو تو پوچھوں کہ کیوں یہ آپ کو سُوجھی ہے؟

درویش نے کل حال بیان کیا اور کہا کہ ایک بزرگ کی نصیحت ہے کہ جب تک گناہ نہ کروں گا مجھ پر در توبہ بند رہے گا اور میری عبادت میں خلوص پیدا نہ ہوگا۔

قحبہ ۔ بالکل بجا اور درست۔ مگر بندی کو یہ بتائیے کہ کیا اس بزرگ نے یہ بھی آپ کو یقین دلادیا تھا کہ گناہ کے بعد اس قدر عمر کا وقفہ آپ کو ملے گا کہ آپ توبہ کر سکیں؟ ــــ

یہ سنتے ہی درویش کی آنکھیں کُھل گئیں اور وہ سمجھ گیا کہ افوہ! وہ بزرگ نہ تھا شیطان تھا جو ورغلانے آیا تھا اور رحمتِ الٰہی کا تقاضا تھا کہ مجھے ایک قحبہ کی زبانی ہدایت ہو۔ لاحول ولا قوۃ کہتے ہوئے درویش تو جنگل کو راہی ہوا اور کہانی ختم ہوئی۔

(۲)

یہ ساتوں کہانیاں، مروّجہ افسانوں سے کہیں پُرانی، چمنستانِ خیال کے اُس حصّے میں جو کہانیوں کے لئے مخصوص ہے اِٹھلا اِٹھلا خراماں ایک دوسری سے باتیں ہلا رہی تھیں کہ ایک بولی:۔

ایک ۔ بُوا! جو ہم نہ ہوتے تو انسان کا کیا حال ہوتا؟

دوسری ۔ اری دیوانی! کیسی بات کرتی ہو؟ ہم نہ ہوتے تو انسان ہوتا ہی کیسے؟ وہی بندر کا بندر رہتا۔

ایک ۔ پیاری دیکھو مذاق مت کرو۔ کیا سچ کہہ رہی ہو کہ انسانیت کا مدار ہم ساتوں پر ہے؟

تیسری ۔ تو اور کیا؟ انسان نے ہزاروں معبود نیست و نابُود کر دیئے مگر ہم سب سے وہی قدیم مراعات ہیں۔ ہم نہ ہوتے، تو وہ کلاہ و مغز جسے انسان بہت تن کر پہنتا ہے یعنی تہذیب، وہی نہ ہوتی۔ کہانیوں سے اپنے آپ کو اُکسا اُکسا کر انسان شمعِ بزمِ کائنات بننے کو ہے۔

ایک ۔ اچھی بحث نہیں کرتی مگر یہ تو بتا دو کہ کیا کسی انسان نے کوئی نئی کہانی بھی ایجاد کی؟

چوتھی ۔ بہت نے کوشش کی ہے مگر کامیابی مشکل ہے۔ اکثر تو یہی کرتے ہیں کہ میری آنکھ، تیری ناک خلط ملط کر نیا سوانگ پیش کر دیتے ہیں مگر یہ بھی ہے کہ بعض تقریباً کامیاب ہو ہی جاتے ہیں۔

ان کہانیوں میں یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ ایک طرف سے آواز آئی "بہولیو! آداب"

سب کی سب بولیں "اری تم کون ہو؟" نووارد بولی "بیویو! میں آٹھویں کہانی ہوں" سب کہتی ہیں "آؤ بسر و چشم مگر اپنی سرگزشت تو کہو" اور یہ تو وارد شرماتی لجاتی یوں بولی:۔

(۳)

نووارد ۔ میں اپنا حال کہتے ہوئے جھجکتی ہوں کہ آپ خیال کریں گی کہ کل کی بچی اور یوں بڑھ بڑھ کے باتیں بناتی ہے۔ اور مجھے یہ بھی وہم ہے کہیں جو بے انتہا آسان ہوں کہانی کہلانے کے قابل بھی ہوں یا نہیں؛

پرانی کہانیاں ۔ نہ جھجکو نہ وہم کرو۔ بے تکلف آسان بنتی چلی جاؤ۔

نووارد ۔ اچھا تو سنئے:۔

"ہزاروں سال دنیا صرف آپ کی گرویدہ رہی ہے مگر اب کچھ عرصہ سے مجھے بھی لوگ چاہنے لگے ہیں۔ میں بچوں کی کہانی ہوں مگر وہ نہیں جسے بچے سُن کر خوش ہوں بلکہ وہ ہوں کہ بچوں کی سرگزشت پر بڑے بڑے تعجب سے غور کریں۔ جب صرف آپ کا دور دورہ تھا تو خیال یہ تھا کہ زندگی کی منزل بڑے ہو کر شروع ہوتی ہے اور بچپن اس سفر کے مجبوری کے پہلے دو چار لغو قدم ہیں۔ اب چرچا یہ ہے کہ بچپن بجائے خود ایک شاندار مہم ہے۔ عورت اور مرد کے خرخشے سے پاک، دولت کی آرزو کی مصیبت سے آزاد، علم اور عقل کی جہالت سے بالاتر۔"

پرانی کہانیاں ۔ ارے تم تو بہت ہی پیاری ہو کچھ ذرا سا اپنا حال اور بیان کرو۔

نووارد ۔ جی ہاں دل کی آنکھوں دِل کے کانوں سے دیکھئے اور سنئے:۔

[بالکل کمسن لڑکا اچانک کیا دیکھتا ہے کہ باپ ماں کے کلّے گویا دانتوں سے کاٹ رہا ہے۔ دل ہی دل میں دانت پیستا ہوا ایک طرف کو غصہ میں بھرا ہوا ٹل جاتا ہے۔ وہاں مُنی سی بہن سے بے اعتنائی سے ذکر کرتا ہے "ابھی دیکھا کہ آبا نے امّی کو خوب مارا۔"

مُنی بہن ۔ تم بھی تو مجھے مارتے ہو؛

کمسن لڑکا ۔ نرس کہاں ہے؛

مُنی بہن ۔ کل آبا نے نرس کو مارا تھا۔ میں ابا کو اپنی گڑیا دے دوں گی پھر وہ کسی کو نہ ماریں گے۔

کمسن لڑکا ۔ میں امّی کو اپنا چاقو دوں گا۔

مُنی بہن ۔ کل اس ہمسائے لڑکے نے مجھ سے میرا چاکولیٹ چھین لیا۔

کمسن لڑکا ۔ میں اس کی دو گولیاں چھپا دوں گا۔ آؤ ان کے گھر چلیں۔

مُنی بہن ۔ میں نہیں جاتی ۔

(کمسن لڑکا ایک اجنبی کتے کی طرف پتھر پھینکتا ہے ۔ کُتا بھونکتا ہے ۔ دونوں بچے چیختے ہیں ۔ نرس اور ماں

چیخ پکار سُن کر بھاگی آتی ہیں ۔ ماں بیٹے کو، نرس لڑکی کو پیار سے بہلاتی ہیں)

کمسن لڑکا ۔ امی! ایک موٹا سا ریچھ لے لو جو کتے کو کھا جائے اور ابا مجھے ماریں تو ابا کو بھی کاٹ لے ۔]

(۴)

پُرانی کہانیوں اور نووارد میں یہ گپ بازی ابھی چل رہی تھی کہ ان سے حلیہ میں بالکل مختلف مگر بنی ٹھنی ایک لیڈی آنکلیں ۔

لیڈی ۔ کیا مجھے اجازت ہے کہ شریک مجلس ہوسکوں ؛

ایک پرانی کہانی ۔ (کسی قدر رعونت سے) شوق سے مگر اپنی تعریف تو فرمائیے ۔

لیڈی ۔ میں بھی کہانی ہی ہوں اور دل سے متمنی ہوں کہ آپ میں شامل ہوسکوں ۔

دوسری پرانی کہانی ۔ (بے اعتنائی سے) کچھ آپ بیتی فرمائیے ۔

لیڈی ۔ میں وہ کہانی ہوں جس میں کسی کو دراصل کچھ بھی نہیں ہوتا ۔ وہ چیزیں جو آپ کی دنیا میں اہم ہیں یعنی عشق، اعتبار، حکومت دولت، عقل، وفا وہ اب متروک ہیں ۔ عشق ہو کہ نہ ہو یا یہ کہ ہو کر پانی کی طرح بہ جائے کوئی سرگرداں نہیں ہوتا ۔ یہی حال دولت عقل اور حکومت کا ہے ۔ شخصی عزّ و جاہ و اختیار کا اب بول بالا نہیں ۔ جس طرح آپ کے طفیل ایک سچلا سا بندر بھدا مگر کارکن انسان بن گیا اُسی طرح میرے طفیل وہ بھدا کارکن اپنے قویٰ اور جذبات کا ایک دُور اندیش انجنیئر بن رہا ہے ۔ آپ نینیکی کہانیاں تھیں میں آنکھ کھلنے کا افسانہ ہوں ۔ آپ سپاہ انفرادی کشمکش تھیں میں جامعیت کی لہر ہوں ۔ آپ باغ میں فواروں کی طرح چھلکتی تھیں میں بہار کی طرح پھیلتی ہوں ۔

پرانی کہانیاں ۔ تمہارا تو دیباچہ ہی ختم ہونے میں نہیں آتا ۔

نووارد ۔ بس ایک فقرہ اور اور پھر میں اپنی سرگزشت بالکل مختصر کہہ ڈالوں گی ۔

پرانی کہانیاں ۔ وہ کیا فقرہ ؛

نووارد ۔ بس یہ کہ آپ کے زمانے میں شخصی آرزوئیں پوری ہونے کی آرزو تھی ۔ میرے عہد میں نئی آرزو پیدا کرنے کی آرزوئیں ہیں ۔

سنئے :-

مجھ میں شخصیتیں برسرِ کار نہیں بلکہ چند شور برسرِ کار ہیں ۔ مدھم سادہ شور جو پہلے امریکا میں ہوا جب سمندر نے چائے چھانی پھر وہ دھماکا جو پیرس میں ہوا اور اب وہ گرج جو ماسکو میں ہے ۔ شخصیتوں کے ساتھ کچھ ہی ہو چند دن کوئی کروگرین لے اور کوئی

قیصر مگر وہ شعور کی لہر نہیں رُکتی جو محض شخصیتوں اور شخصی قصّوں کو ڈبو کر رہے گی ۔ مجھ میں مرگ بھی ہے، یا بن بھی ہے فتح بھی ہے مگر محض چند چرچوں کی ۔ انسانوں کے چرچے انسانوں سے کہیں زیادہ اہم ہیں ۔ عمرو، زید جئیں یا مریں کسی کو دلچسپی نہیں البتہ اگر عمرو کوئی نیا چرچا رائج کر دے اور اس چرچے کا تصادم زید کے قائم کردہ شعور سے ہو تو اس تصادم کے غازہ سے میری رونق دوبالا ہوتی ہے اور دلچسپی جس قدر بھی ہے وہ شخصی قسمت سے نہیں بلکہ محض اس بات سے کہ کسی چھوٹے سے نئے شعور نے پُرانے مشہور چرچے کو نیچا دکھایا ۔

لیڈی یہیں تک گفتگو کرنے پائی تھی کہ سب کہانیاں ناک بھوں چڑھانے لگیں اور آخر ایک بولی:۔

ایک کہانی ۔ مہربانی فرما کر یہ اپنی لن ترانیاں رہنے دو! تم کہانی نہیں ہو بلکہ وہ نٹ کھٹ ہو جو روز بدلتی ہے یعنی تاریخ ۔

دوسری کہانی ۔ جی ہاں اور خوب یاد رکھئے کہ آپ میں اور ہم میں فرق یہ ہے کہ ہم جھوٹی ہو کر بھی سچی ہیں اور آپ سچی ہو کر بھی جھوٹی ہیں

لیڈی اپنا سا منہ لے کر چلی جاتی ہیں اور کہانیوں میں پھر گفتگو شروع ہوتی ہے ۔

تیسری کہانی ۔ شکر ہے اس مُردار سے تو چھُٹی ہوئی ۔ چڑیل کو دیکھو کہ بنی سنوری کیسی ہے ۔ اُن کہیں کی ۔

چوتھی کہانی ۔ (نووارد کی طرف اشارہ کر کے) تمہاری بے حد دلچسپ گفتگو میں خواہ مخواہ مُخل ہوئی ۔

نووارد ۔ آپا! کیوں بُرا مانتی ہو ۔ دُنیا میں تو اسے کوئی پوچھتا نہیں ۔ ایک گھر سے نکلتی ہے دوسرے میں گھُستی ہے ۔ آج اِس کی، کل اُس کی ۔ بس یہی کافی ہے کہ ہم لوگوں نے اسے مُنہ نہیں لگایا ۔

(۵)

وہی کہانی جس نے پہلے یہ ذکر چھیڑا تھا کہ کیا کسی انسان نے کوئی نئی کہانی بھی ایجاد کی نووارد کو گدگدی کرتے ہوئے کہتی ہے:۔

ایک کہانی ۔ اچھی بُوا تمہارے آنے سے سات سے آٹھ تو ہم ہو گئے مگر جی چاہتا ہے کہ یونان کی کرشمہ جمال نو دیویوں کی طرح ہم بھی نو بن جائیں ۔ نو کا ناچ خوب رہتا ہے یعنی ایک بیچ میں اور چار جوڑے دلفریب رقص سے دائرہ باندھ کر پل پل میں بیچ والی کو بدلتے ہوئے سمیٹتے ہوئے کائنات کا نمونہ بن جاتے ہیں ۔ کیا تمہارے موجدوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو بالکل انوکھی سی کہانی لکھ ڈالے ۔ تم تو ضرور جانتی ہو گی ۔

نووارد ۔ ہے تو سہی اور جانتی بھی ہوں مگر یونہی اُڑتی ہوئی افواہ سُنی تھی کہ دو چار جادو نگاہوں کی کافرادائیوں سے تنگ آ کر بچارا مسلمان ہو چلا ہے ۔

سب کہانیاں ۔ (ٹھٹھے پر ٹھٹھا لگاتی ہیں) "مسلمان ہو چلا ہے" ہا ہا ہا ۔ "مسلمان ہو چلا ہے" ہا ہا ہو ہو ۔ ہا ہا ہو ہو ۔ واللہ یہ کہانی خوب رہی ۔ ہا ہا ہو ہو ۔ ۔ ۔

نووارد۔ (جھینپ کر) بیویو تم لے لو سچ مچ سُنا تھا۔

سب کہانیاں۔ (بشکل سے ہنسی کو ضبط کرکے) بیوی تم ابھی بھولی ہو۔ جس طرح تاریخ کے لئے کہانی بننا ناممکن ہے اسی طرح ہر تمہارے دوست کے لئے . . . . .

نووارد۔ (بات کاٹ کر) بھئی تم سب کیوں اس کے پیچھے پڑی ہو؛ انسان کیا ہے۔ بجائے خود ایک کہانی ہے۔ اسے بیان
گویا چلو اس کا دل بہلائیں اور اسے بچالیں۔

سب کہانیاں۔ یہ نہیں کرتے۔

انسان مرجاتے ہیں کہانیاں رہ جاتی ہیں۔

فلک پیما

ور پھر اس واقعہ کو اب ایک سال ہونے کو ہے اور یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ خود منوّر اسے بھول گیا ہے مگر چونکہ میں نے اس سے بھی کہہ دیا تھا لہ میں اسے کسی نہ کسی دن لکھ دوں گا، اس لئے میں اُمید کرتا ہوں کہ اب وہ اس واقعہ کے اعادہ سے ناراض نہیں ہو گا۔

ایک دن غالباً فروری کے مہینے میں منوّر شام کے وقت مجھ سے ملنے آیا۔ ہمیں ملے دو ہفتے سے زیادہ ہو گئے تھے اس لئے س کا آنا باعثِ مسرت تھا اور میں نے بہت اشتیاق سے اس کا خیر مقدم کیا۔ مگر میں نے دیکھا کہ اس کا انداز کچھ بشاش نہیں ہے لکہ اگر پژمردہ نہیں تو خاموش اور غیر معمولی طور پر متین تھا۔ میں نے کہا خیر تو ہے۔ کہنے لگا نہیں بات تو کوئی نہیں ہونی چاہئے مگر طبیعت کچھ پریشان ضرور ہے۔ چونکہ عادتاً وہ قدرے راست گو واقع ہوا ہے میں سمجھ گیا کہ ضرور کوئی وجہ ہے۔ چنانچہ میں نے کہا ' اتنے دن کہاں رہے؟ ہیں ایک دن ہو گئے تمہیں دیکھا نہیں '۔ کہنے لگا ' یہیں تھا، کچھ دنوں کے لئے گوجرانوالہ ایک کام کو گیا تھا '۔ میں نے یہ تو نہ پوچھا کہ ام کیا تھا مگر مجھے محسوس ہُوا کہ گوجرانوالہ کا لفظ ادا کرنے میں اس کا لہجہ عجیب سا تھا کم از کم فرق ضرور تھا۔ جیسے کوئی بات اِس لفظ کے دا کرنے میں مانع ہو۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ میرا شک درست تھا یا نہیں مگر اس کی آواز میں ارتعاش کے علاوہ کچھ تلخی کی آمیزش ھی تھی۔ بہرحال میں نے اس سے گوجرانوالہ کے متعلق مطلقاً کچھ نہ پوچھا، محض اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ مگر وہ معمول کے خلاف کچھ باتیں رکے چپ ہو جاتا تھا۔ دو ایک دفعہ جب وہ میرے سلسلہ کلام کو جاری کرنے پر بھی چپ رہا تو میں نے اس سے بہت زور سے پوچھا لا بھی کیا ہو گیا ہے، کوئی وجہ ضرور ہے جو اتنے ملول ہو۔ کوئی واقعہ پیش آیا ہے تو مجھے بتاؤ شاید میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں اور اگر یں بھی میں کچھ کر سکتا تو بھی کہہ ڈالو۔ شاید تمہارا دل ہی ہلکا ہو جائے۔ اس پر اُس نے مجھے ایک دفعہ ٹکٹکی باندھ کر دیکھا مگر میں جان گیا لہ اس کی آنکھیں تھکی ہوئی ہیں اور اس کی نگاہ لااُبالی ہے۔ آخر کار تھک کے میں نے ذرا سختی سے پوچھا کہ بھئی کیوں گھُلے جا رہے ہو ا ہمیں بھی بتاؤ۔ جب بہت اصرار کیا تو اس نے یہ واقعہ سنایا۔

' تمہیں یاد ہو گا ابھی کچھ منٹ ہوئے۔ میں نے تم سے گوجرانوالہ کا ذکر کیا تھا۔ مجھے وہاں ایک کام تھا۔ واپسی پر گاڑی واڑی کا تو مجھے یاد نہیں تھا میں لاریوں کے اڈے پر چلا گیا۔ وہاں پہنچ کے معلوم ہُوا کہ کسی بس سروس کی لاری بس دو منٹ میں چلنے ہی والی ہے۔ مگر شاید تم ہو بس سروسوں کی لاریاں دور دور مقاموں کے درمیان چلتی ہیں۔ یہ لاری سیالکوٹ اور لاہور کے درمیان چلتی تھی۔ چنانچہ جب میں ٹکٹ لے بیٹھنے لگا تو دیکھا کہ اگلی نشست تو رُکی ہوئی تھی ہی، درمیانی درجہ یا حصّہ بھی کسی ہندو خاندان سے اٹا پڑا تھا۔ غالباً کسی برات پر جا رہے تھے۔ برات نہیں، مجھے خیال نہ تھا کہ سب نشستیں پُر ہوں گی چنانچہ میں جو اندر داخل ہونے لگا تو ایک لڑکا جو انہیں میں سے تھا بولا ' صاحب یہاں سب مستورات بیٹھی ہیں اگر آپ پیچھے بیٹھ جائیں تو نوازش ہو گی '۔ میں نے خیال کیا شاید سارا درجہ ہی محفوظ کرا رکھا ہو گا مگر میں لاری میں اب تک کبھی پچھلے حصّہ میں نہیں بیٹھا۔ کچھ مجھے تامّل ہُوا مگر ڈرائیور کہنے لگا " صاحب بیٹھنا ہے تو بیٹھئے گاڑی چلنے والی ہے "۔ چنانچہ طوعاً و کرہاً میں پچھلے حصّہ میں داخل ہو گیا، ٹکٹ بھی لے چکا تھا یہ بھی خیال تھا کہ جانے دوسری لاری کب چلے۔ اور پھر پچھلے

حصّہ کی دائیں جانب کی وہ نشست جو بالکل درمیانی حصّہ کے ساتھ لگتی تھی خالی تھی یا کم از کم وہاں ایک مسافر بیٹھ سکتا تھا چنانچہ میں اسی نشست کی طرف لپکا اور بیٹھ گیا۔ اب جو اطمینان سے نظر اُٹھا کے اِرد گرد دیکھا تو معلوم ہُوا کہ یہ نشست بھی کوئی بُری نہ تھی۔ میرے دائیں طرف برات والیاں بیٹھی تھیں اور خوش قسمتی سے اِن میں سے جن کی پشت میری طرف تھی اِن میں ایک وہ لڑکا تھا ایک اس کے ساتھ پانچ ایک برس کی پیاری سی چھوٹی بچی تھی اور ایک بوڑھی عورت اور ایک اور لڑکی جس کی عمر کوئی سات ایک برس کی ہو گی۔ البتہ جو ستورات اب میرے مقابل تھیں، مقابل ہی سمجھو کیونکہ میں تقریباً انہیں کی طرف رُخ کر کے بیٹھا تھا یعنی بیٹھا تو آڑا تھا مگر میں انہیں بآسانی دیکھ سکتا تھا اور وہ سب میری طرف دیکھ سکتی تھیں۔ اگر چاہتیں یعنی کہ۔

میں پہلے شاید کہہ چکا ہوں کہ یہ خواتین کسی برات میں جا رہی تھیں اور جب اس پر اس امر کا خیال کیا جائے کہ وہ ہندو عورتیں تھیں تو تم اندازہ کر سکتے ہو کہ لباس کے لحاظ سے تو وہ سب کی سب جگمگا رہی ہونگی اور خصوصیت سے ایک تو شاید تازہ شادی شدہ تھی یا کم از کم اسے ایک سال سے زیادہ تو ہرگز نہیں ہُوا ہوگا کیونکہ ایک تو اس کے کپڑے ہی سب سے اچھے تھے اور پھر زیور کے لحاظ سے بھی وہ سب سے ممتاز تھی اور یوں تو گویا تم جانو میرے لئے تو اس کے سوا وہاں گویا اور کوئی تھا ہی نہیں۔ میں نے دو ایک نظر میں سب کو دیکھ لیا اور پھر ان کو بھی جن کی پشت میری طرف تھی۔ لڑکے کی پشت میری طرف تھی اس لئے اس کی طرف سے تو تسلّی تھی۔ اس کے ساتھ کی سواری وہ ننھی منی سی لڑکی تھی۔ جانتے ہو اتنی عمر کا بچہ کبھی نچلا نہیں بیٹھ سکتا۔ چنانچہ سب سے پہلے جس نے میری توجہ اپنی طرف منعطف کرائی وہ یہی لڑکی تھی جسے بار بار وہ جو سامنے کی نشست پر کونے میں بیٹھی تھی یہ کہہ کے چپ کراتی تھی " اری چاند تو آرام سے تو بیٹھ" چاند رانی معلوم ہُوا اس چھوٹی سی سُرخ گالوں والی شوخ لڑکی کا نام تھا۔ کرتی وہ کیا تھی؛ یہ پوچھو وہ کرتی کیا نہ تھی! کبھی اُٹھتی کبھی بیٹھتی، اور ہر وقت اپنی چھوٹی سی ریشمی اوڑھنی کو اپنے سر کے گرد لپیٹنے میں مشغول رہتی۔" پھر ایک جیب میں سے جو کافی پھُولی ہوئی تھی ایک بڑا سا ریشمی رومال نکال کے چوُسنے والی مٹھائی کی ایک گولی نکالتی، رومال کو پھر جیب میں ٹھونستی اور مٹھائی کو مُنہ میں ڈال کے اپنے دوپٹہ کو جو اس اثنا میں ضرور سر پر سے اُتر گیا ہوتا سنبھالنے لگ جاتی، یا اپنی جگہ کھڑے ہو کر پچھلے حصّہ کی طرف مُنہ کر کے ہم سب کی طرف ایک ایک نظر غور سے دیکھ کر پیچھے کی کھڑکی سے سڑک اور ہٹتے ہوئے درختوں کو دیکھتی رہتی۔ مگر ایک منٹ سے زیادہ نہیں اس کا دہن چھوٹا سا تھا اور جب وہ پیچھے دیکھتی تو منہ میں وہ گولی ہونے کے باعث اس کے ہونٹ ضرور ملے ہوئے ہوتے، مُنہ گویا ایک ننھی سی گلاب کی کلی لگتا، اور چونکہ توجہ اس کی یا سڑک کی طرف یا کسی اور چیز کی طرف مرکوز رہتی، اس لئے چہرہ جو عام طور پر جب اس کا رُخ اپنی ماں یا نانی یا ممانی یا ماموں کی طرف ہوتا، شوخی اور شرارت اور ہنسی اور خوشی سے چمکتا ہوتا، اس قدر متین نظر آتا کہ میں نے موٹر کے چلنے کے پانچ منٹ کے اندر اندر اس سے واقفیت پیدا کر لی۔ اور وہ اس طرح کہ جب وہ ہماری طرف دیکھ رہی تھی تو میں نے آہستہ سے ایک انگلی سے اس کے بائیں گال کو سہلا دیا۔ پہلے تو وہ ایسا کرنے پر دو ایک دفعہ شرما کر اور تھوڑا بہت غصّہ کر کے فوراً ہی

نہ دوسری طرف کر لیتی مگر اس کے ایسا کرنے پر بھی اسے دوپٹہ درست کرنے کی ضرورت پیش آ جاتی تو میں موقع پا کر اس کے ادھورے سوال کو جواب میرے نزدیک تر ہوتا، سہلا دیتا، آہستہ سے اس کے بالوں کو اپنے ہاتھ سے سہلا دیتا۔ اس پر وہ اتنا لجا جاتی کہ دوہری ہو کر گول ہو جاتی۔ مگر چونکہ نچلا بیٹھنا اس کے لئے ناممکن تھا وہ مجھے بھول کر اور میرے چمکارنے یا گدگدانے کو بھول کر اپنی ماں سے یا اپنی ممانی سے جو بالکل اس کے سامنے بیٹھی تھی، سوال جواب میں مشغول ہو جاتی۔

میں نے چاند کے متعلق اتنی لمبی تمہید اس لئے دی ہے کہ دراصل میرے اس واقعہ یا سانحہ کی روح اگر چاند نہ تھی تو وسیلہ چاند ضرور تھی۔ اس کے بائیں طرف جو بوڑھی عورت بیٹھی تھی وہ اتنی کم سخن تھی کہ مجھے یاد بھی نہیں کہ اس نے ایک دفعہ بھی کچھ کہا ہو، اگرچہ کچھ نہ کچھ تو وہ بولی ہو گی۔ چاند کے سامنے والی نشست پر جو تین فرد تھے ان میں سے معلوم ہوا کہ جو عورت لڑکے کے سامنے بیٹھی تھی وہ چاند کی نانی تھی۔ پھر چاند کے سامنے اس کی ممانی اور پھر اس کی ماں جس کی گود میں ایک دودھ پیتا بچہ تھا۔ یہ معلوم نہیں کہ وہ برات سے واپس جا رہی تھیں یا برات کو جا رہی تھیں، غالباً کسی شادی سے واپس آ رہی تھیں۔

چاند سے چھیڑ چھاڑ شروع کرنے سے پہلے ہی میں نے اس کے سامنے بیٹھنے والی کو آنکھ بھر کے دیکھ لیا تھا اور جو میں نے دیکھا تھا وہ یہ کہ اس کی عمر بیس اکیس سے بمشکل زیادہ ہو گی۔ گول چہرہ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، گلابی ہونٹ، چھوٹی سی خوش قطع ناک اور چھوٹے چھوٹے مگر خوب جڑے ہوئے چمکتے ہوئے سفید دانت جو اکثر جھلکتے ہی رہتے تھے۔ باقی رہے کپڑے سو ان کا عالم یہ تھا کہ گلابی رنگ کا بنارسی دوپٹہ تھا اور آتشی گلابی کمخواب کا سوٹ اور کامدانی گرگابی۔ قمیص پہ ہلکے زرد رنگ کا اونی سوئیٹر کوٹ اور زیور؛ زیور کا تو ٹھکانا ہی نہیں تھا، کڑے بھی تھے اور چوڑیاں بھی اور گھڑی پہنچی بھی جس میں اوم بنا ہوا تھا اور جسے شاید نفیسیاں کہتے ہیں اور گلے میں ہار اور نیکلس اور ہاتھوں میں انگوٹھیاں، کانوں میں لمبے لمبے بُندے۔ دوپٹے کے اوپر جوگیا رنگ کی چادر۔ لباس سے ہی ظاہر ہوتا تھا کہ شادی کو بہت عرصہ نہیں ہوا۔ اور یہ بھی کہ کسی امیر گھرانے کی بہو ہے۔

جو چیز اس کی ہر وقت نظر کے سامنے رہتی ہے وہ اس کی مسکراہٹ ہے۔ ہر وقت اس کے ہونٹوں پر ایک ہلکا سا تبسم کھیلتا رہتا تھا، معلوم ہوتا تھا کہ یہ ہونٹ بنے ہی مسکراہٹ کے لئے ہیں اور پھر اسی کی مسکراہٹ کے لئے۔ تم نے بہت سی خوبصورت لڑکیوں کو مسکراتے دیکھا ہو گا، اچھا بہت سی کو نہیں تو کچھ تو ضرور دیکھی ہوں گی۔ اور شاید ہر لڑکی ہی جوان ہو کر مسکرا سکتی ہے یا کم از کم عام طور پر یہی خیال کیا جاتا ہے مگر دراصل یہ خیال غلط ہے اور لوگوں کی بیوقوفی نہیں تو ناتجربہ کاری پر مبنی ہے۔ ورنہ میری بھی چوبیس سال کی عمر ہے میں بھی تو ایسی مسکراہٹ کبھی دیکھتا! تبسم کیا تھا حسن کا رقص تھا، نشہ تھا، نشہ . . . . . . یقین جانو جب اس مسکراہٹ سے اس نے مجھے دیکھا تو میں دو تین سیکنڈ سے زیادہ اس کی آنکھوں میں نہیں دیکھ سکا اور اس کی آنکھیں! اللہ! . . . آنکھیں تھیں وہ! اتھاہ گہرائیاں! ان میں جھجک بالکل نہ تھی۔ ان میں اطمینان، سکون، غرور، احساسِ حسن تھا۔ اور ظاہر تھا کہ وہ جانتی تھی

کہ ان میں جاذبیت ہے اور میرا ان کے سامنے جھک جانا یا مجھے اس کے حسن کا اعتراف کرنا لازمی تھا ۔ بے باکی! خود اعتمادی! میں تمہیں کیا بتاؤں! میں تو نہ دیکھ سکا۔ یقین جانو میں تو شرما گیا۔

پہلے تو میں نے سرسری طور پر محسوس کیا تھا کہ وہ خوبصورت ہے مگر چونکہ لاری ابھی چلی ہی تھی، میں نے زیادہ مہلت نہ کی، اور اس کے درجے کی باقی عورتوں کو اچھی طرح دیکھا کیا اور ان کی باتیں سنتا گیا مگر اُس کو اچھی طرح دیکھنے کا موقع نہ آیا تھا دوسرے چاند رانی ہی مجھے اپنی طرف مشغول رکھنے میں کافی تھی ۔ ایسی پیاری اور سرخ وسپید اور شوخ کہ پہلے پانچ منٹ تو جیسا میں نے کہا ہے میں اسی میں مشغول رہا ۔ ایک دفعہ جو وہ گول مول بنی ہوئی سمٹائی اپنے آپ کو دوپٹہ میں لپیٹتی جا رہی تھی اور میں کبھی یہاں کبھی وہاں انگلی سے گدگدا رہا تھا، تو میری نظر اُٹھ کے اس کی ماں پر جا پڑی ۔ اتفاق سے وہ بھی میری طرف دیکھ رہی تھی اور مسکرا بھی رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں سے جو میری نظر اُٹھ کر اس کی آنکھوں میں گئی تو میں کچھ عرصہ کے لئے چاند رانی اور لاری اور برات اور سب کچھ بھول گیا ۔ معلوم نہیں میں ایک منٹ دیکھتا رہتا تو کیا ہوجاتا، میں تو پانچ سیکنڈ سے زیادہ نہیں دیکھ سکا ہوں گا ۔ مگر تمہیں کیا بتاؤں ان آنکھوں میں کیا دیکھا ۔ شاعر تو پیٹتے رہتے ہیں، شرمائی ہوئی، باحیا، کنواری نظر کو، میں کہتا ہوں اُن آنکھوں کو کیا دیکھنا آئے جو شرم وحیا سے آپ ہی بند ہوئی جاتی ہوں ۔ آنکھیں تو وہ تھیں! میں کبھی نہیں بتا سکتا کہ ان آنکھوں کا یقین، ان کی بے حجابی، ان کی گویا "معلومیت" جیسے کہ مرد عورت کا فرق، اجنبی اور غیر محرم کی غیریت، سب پردے فضول ہیں اور دیکھنے والی آنکھ کے سامنے سب چیزیں عریاں ہیں! یقین کرو مجھے تو اپنی نظر سے شرم آگئی، مجھے محسوس ہوا کہ گویا اسے معلوم ہے کہ میری نظر کیا کہہ رہی ہے! کس چیز کی خواہش کر سکتی! کونسی چیز اسے مل سکتی ہے، مرد عورتوں کو کس نظر سے اور کس لئے دیکھتے ہیں اور ان سے کس چیز کے طالب ہوتے ہیں ۔ اور تم یہ تھا کہ اس جاننے والی نظر کے باوجود بھی اس کی آنکھیں ایک جوان لڑکی کی آنکھیں تھیں اور اس کی مسکراہٹ میں شباب کا تمام نشہ موجود تھا ۔"

یہ کہہ کے بیچارہ منور اُٹھ کھڑا ہوا اور بے چینی سے دو قدم اِدھر اور دو قدم اُدھر پھرا، پھر جیسے یک دم چونک کر بیٹھ گیا اور اِک کمزور سی مسکراہٹ سے میری طرف دیکھنے لگا ۔ میں خوب غور سے اس کی کہانی سن رہا تھا ۔ میں جانتا تھا جتنا حساس وہ ہے اور مجھے اس کے احساسات کے ساتھ ہمدردی بھی تھی، اگرچہ چونکہ اس سے قبل اس نے کبھی اپنی جذباتی زندگی سے مجھے اچھی طرح روشناس نہیں کیا تھا، میں حیران ضرور ہوا کہ یہ خاموش سا شرمیلی آنکھوں والا نوجوان جس چیز سے اتنا متاثر ہو گیا ہے وہ اتنی جاذب تھی بھی یا نہیں؛ مگر منور پھر شروع ہو گیا تھا :-

"میں نے تو اپنی آنکھیں نیچی کر لیں مگر نہ جانے وہ مجھے کتنا عرصہ دیکھتی رہی، یا شاید اس نے دوبارہ دیکھنا شروع کر دیا ہو کیونکہ جب کچھ دیر بعد میں نے پھر اس کی طرف دیکھا تو وہ پھر میری طرف دیکھ رہی تھی، اب کی دفعہ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا

بلکہ میں اس کے ہونٹوں، اس کے چہرے، اس کے ہاتھوں کی طرف جن میں سے ایک میں رومال پکڑا ہوا تھا، دیکھتا رہا۔ کلائیوں پر اس نے نفیسیاں پہن رکھی تھیں، نفیسیوں کی طرف میں اس لئے بھی غور سے دیکھتا رہا کہ میں اوّل اوّل یہ نہ معلوم کر سکا کہ ان کے درمیان سُرخ سے جو نقوش بنے ہوئے ہیں وہ کیا ہیں، غور کرنے سے معلوم ہوا کہ وہ اوم ہے۔ مگر اس کے بعد پھر جو میں نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں پھر میری جانب دیکھ رہی تھیں، میں نے قدرے بے چینی سے اپنے بائیں طرف دیکھا کہ شاید وہ کسی اور کی طرف دیکھ رہی ہو مگر نہیں، میں نے محسوس کیا کہ یہ پلکوں سے آدھی آدھی ڈھکی ہوئی آنکھیں جن کی چمک اور نظر اور عمق اور وثوق پلکوں میں سے چھن چھن کر مجھ تک پہنچ رہا تھا میری طرف ہی جھکی ہوئی ہیں اور وہ نگاہیں میرے جسم، دماغ اور دل سے گزر کر میری تمام حسیات کو بے نقاب کر کے کمال آسانی اور اطمینان اور لطف سے ایک کتاب کی طرح پڑھ رہی ہیں شاید یہ سب کچھ اس ترتیب سے مجھے اسی وقت نہ سوجھا ہو مگر یہ احساس اسی وقت کا ہے، شاید بعد میں مَیں نے سوچ اور فکر میں ان احساسات کو ترتیب دے دیا ہو۔ کیونکہ اب تو مجھے یہی یاد آتا ہے کہ وہ نظریں گویا بہت ہی حلیم نظریں تھیں۔

اس کے کافی عرصہ بعد یعنی تقریباً دس منٹ تک اس نے میری طرف نہیں دیکھا۔ مطلقاً نہیں، مگر اس اثنا میں میں چاند رانی سے بہت بے تکلف ہو گیا تھا۔ اب وہ میرے گدگدانے یا ہاتھ لگانے سے اتنی سمٹتی نہ تھی، بلکہ اگرچہ بظاہر وہ میری توجہ اور چھیڑ چھاڑ سے اب تک ناپسندیدگی یا حجاب کا اظہار کرتی تھی مگر مجھے معلوم تھا کہ اس نے مجھے گویا قبول کر لیا ہے اور وہ بھی نہایت غیر جانب داری سے اپنی توجہ آدھی اپنے سامنے بیٹھے ہوئے افراد کی طرف رکھتی تھی اور آدھی یا میری طرف یا ان اطراف اور اشیا کی طرف جن سے میں اس تک پہنچ سکوں۔ لطف یہ تھا کہ جیسا کہ میں کہہ رہا ہوں جب کبھی میں اسے چھیڑتا یا گدگداتا یا اس کے گال یا اس کے بالوں کو سہلاتا، تو وہ منہ ایسا ہی بناتی تھی جیسے کہ میرا ایسا کرنا اُسے ناپسند ہے اور اگر میں دو منٹ تک بھی اس کی طرف سے اپنی توجہ ہٹا لیتا تو وہ اس اجتناب کو محسوس کر لیتی اور کنکھیوں سے میری طرف دیکھ لیتی اور یا لاری کے پچھلے حصّہ کی طرف منہ کر کے اپنی نشست پر کھڑی ہو جاتی اور بغیر اِدھر اُدھر دیکھنے کے سیدھی، پیچھے ہٹتی ہوئی، سڑک یا اس پر گزرتے ہوئے لوگوں یا چھکڑوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہتی مگر دراصل مجھے معلوم ہوتا کہ اسے انتظار اس بات کا تھا کہ کب میں اس سے پھر کھیلوں۔

ان دو کے علاوہ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں چاند کی والدہ بھی اس کی ممانی کے دائیں طرف بیٹھی تھی اور جب میں چاند کی طرف نہ دیکھتا اور جب میں اس کی ممانی کی طرف نہ دیکھ سکتا تو چاند کی ماں کی طرف دیکھتا رہتا۔ مجھے یاد ہے کہ اس ڈیڑھ یا پونے دو گھنٹوں کے سفر میں ایک گھنٹے سے زیادہ میں چاند کی والدہ کی طرف دیکھتا رہا ہوں گا یا اس کی باتوں کو سنتا رہا ہوں گا۔ مگر میں مانتا ہوں کہ بعض عورتوں میں نہ دیکھتے ہوئے دیکھنے کا ملکہ بھی کامل طور پر موجود ہوتا ہے کیونکہ اس عورت کو اچھی طرح معلوم ہو گا کہ میں اس کی طرف دیکھ رہا ہوں اور اس کی باتوں کو غور سے سُن رہا ہوں، مگر اس نے ایک مرتبہ سنتے ہوئے ایک مرتبہ بھی دانستہ طور پر میری طرف نہیں دیکھا۔

اب شاید تمہیں یہ خیال ہو کہ اتنی مدت تک ایک عورت کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رہنا بدتمیزی ہے۔ میں مانتا ہوں کہ واقعی یہ آداب کے خلاف ہے اور شاید تم جانتے ہو کہ میں ایسی حرکت عام طور پر کرنے کے ناقابل ہوں، بلکہ اگر کہیں میرا گزر ایسے گلی کوچے سے ہو جائے جہاں عورتیں بیٹھی ہوں یا موجود ہوں تو میرے لئے وہ میں پچیس قدم ایک مصیبت بن جاتے ہیں اور میں نے آج تک کبھی اچھی طرح نظر اٹھا کے ایسی عورتوں کو نہیں دیکھا مگر یہاں ایک بات جو میری بہت معاون تھی وہ یہ تھی کہ اس عورت نے گویا میری طرف نہ دیکھنے کا عہد کر رکھا تھا۔ شاید چھپلتی ہوئی نظر مجھ پر سے پڑ کر گزر گئی ہو گی کیونکہ آخر میں تو چاندرانی کے عین پیچھے اور اسی سمت میں بیٹھا تھا اور وہ کرنے میں تو بھی تقریباً میری طرف رُخ کئے بیٹھی تھی۔ اور اس لئے بھی کہ وہ تمام وقت ہی چاند کی ممانی اور نانی اور چوتھی عورت جو چاند کے ساتھ بیٹھی تھی اس سے تیز تیز لہجہ میں باتیں کرتی رہی۔ پہلی باتیں جن سے رفتہ رفتہ ان سب کا رشتہ آپس میں معلوم ہوا وہ یہ تھیں :- دوسروں سے وہ کہہ رہی تھی" ہائے ہائے یہ بھی کیا طریقہ ہوا، پورن کی ماں نے شام دیوی کے بیاہ پر مجھے دو لڈو اور تھوڑے سے مرمرے بھیجے ترکس کے ہاتھ؛ اپنی چھوٹی کانتی کے ہاتھ، میں نے کہا میں تو لیتی نہیں، میں تو لیتی نہیں۔ بھیجا تو دوسرے دن اور آپ تو آنہ سکی، بھیجا تو بالشت بھر کی لڑکی کے ہاتھ، میں نے کہا میں کیوں لوں، برابر کی شریک ہے میں ہی کیوں نیچی ہوں، دو لڈو اور مٹھی بھر مٹھائی! اور کانتی کے ہاتھ! میں نے تو کہہ ہی دیا تھا کہ لے جا، مار اپنی ماتا کے سر پر کہ چاند کے پتا جی بیٹھے تھے، کہنے لگے تم تو ناحق ناراض ہوتی ہو، تمہیں وہ خود دینے نہیں آئی، تو تمہارے ہاں کچھ ہو گا تو تم بھی نہ جانا، تم بھی چاند کے ہاتھ ہی بھیج دینا، میں نے کہا اچھا میں بھی چاند کے ہاتھ ہی بھیجوں گی (اور دودھ پیتے بچہ کو ہاتھ لگا کے) میں بھی کاکا جی کے ہاتھ ہی بھیجوں گی، میں بھی آپ نہیں جاؤں گی، دیورانی ہوئی تو کیا ہے، میں بھی آپ کبھی نہ جاؤں گی، میں چاند کے ہاتھ بھی کیوں بھیجوں گی، میں نوکر کے ہاتھ بھیجوں گی، میں نوکر کے ہاتھ ہی بھیجوں گی، میں نے کہا چاند کے پتا جی سے، میں چاند کے ہاتھ کیوں بھیجوں گی، میں بھی نوکر کے ہاتھ ہی بھیجوں گی۔ یہ بھی کیا طریقہ ہوا! پورن کی ماں کو تو لین دین اور بھاجی کا کوئی طریقہ آیا ہی نہیں، مٹھائی بھیجی تو چٹکی سی، اور کانتی کے ہاتھ! میں بھی نوکر کے ہاتھ ہی بھیجوں گی"

"جس تیزی سے اور اشاروں اور اعضا اور نقوش کی حرکت کی مدد سے اس نے یہ سب کچھ کہا وہ میرے لئے اتنا دلچسپ تھا کہ میں تو مبہوت ہو کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا، اس لئے بھی کہ زیادہ دفعہ چاند کی ممانی کی طرف دیکھنا بھی تو مخدوش تھا۔ اب چاند کی ماں اپنی ماں یعنی چاند کی نانی سے کہہ رہی تھی " آپ سے میں نے کئی دفعہ کہا آپ لاہور آئیں تو میں آپ کو قلعہ دکھاؤں، میں چڑیا گھر دکھاؤں، میں انار کلی دکھاؤں، میں سینما دکھاؤں، آپ تو آتیں ہی نہیں، اب چلی ہیں تو ہم کل سب چلیں گے، تین ٹانگے لیں گے، تین دو میں تو ہم سب نہ آسکیں گے، سویرے کھانا کھا کے، دس بجے گھر سے نکلیں گے، سارا دن سیر کریں گے، سارا دن، میں آپ کو دریا پر لے چلوں گی، سارا دن ٹانگے رکھیں گے، شام کو آپ کو نہر بھی دکھائیں گے، اب تو سردیاں ہیں وہاں رونق نہیں ہوتی،

گرمیوں میں تو شام کو وہاں میلا لگا رہتا ہے۔" ابھی وہ یہیں تک پہنچی تھی کہ وہ لڑکا بولا "تو بہن جی، ماتا جی نے تو کبھی شالامار باغ بھی نہیں دیکھا ہو گا اور سینما بھی، تو آج کل "مہاتما" جیسی فلم آئی ہوئی ہے، ماتا جی نے تو کبھی سینما دیکھا ہی نہیں، افسوس ہے میرا تو امتحان قریب ہے ورنہ میں بھی ساتھ رہتا مگر آپ تو ساتھ ہوں گی، انہیں سینما تو دکھایئے اور بھائی جی بھی تو شام کو دفتر سے آ جائیں گے۔" اس پر ان کی والدہ نے کہا "میں تو لاہور آتی، اس لئے نہیں آئی کہ ٹھہروں کہاں، اب منوہر کی بدلی ہو گئی ہے اب آ جایا کروں گی۔" معلوم ہوا منوہر چاند کی ممانی کا خاوند ہے، تم جانتے ہو نا یہ ہندو لوگ اپنی لڑکیوں کے ہاں نہیں رہتے، اور نہ ان کے ہاں کا کھاتے ہیں، شاید پانی بھی نہیں پیتے، اسی لئے غالباً اس لڑکے اور ہاں معلوم ہوا اس لڑکے کا نام مراری تھا اسی لئے اس مراری کی ماں چاند کی ماں کے ہاں نہیں اترتی تھی۔ خیر اس دفعہ معلوم ہوا کہ وہ منوہر کے ہاں جا رہی تھی۔

ایسی ویسی ہی باتیں ہوتی رہیں مگر مجھے ابھی خود اس کا نام نہ معلوم ہوا اور نہ یہ کہ وہ کہاں رہتے ہیں۔ اس سے یہ مطلب نہ لے لینا کہ ان کا پتہ معلوم کرنے سے میرا کوئی مدعا تھا مگر جانتے ہو مجھے لحظہ بلحظہ یہ امر شاق گزر رہا تھا کہ اب لاہور آ جائے گا اور یہ لوگ تو چلے جائیں گے اور میں خود بھی لاری چھوڑ دوں گا اور پھر شاید ہم کبھی نہ مل سکیں گے۔ مگر باوجود اس کے اس کا نام جاننے کے لئے میرے اشتیاق کا یہ عالم تھا کہ میں بار بار اس کی طرف ملتجی نگاہوں سے دیکھنے لگا اور چونکہ میں نے اس اثنا میں پانچ چھ مرتبہ گھڑی کو بھی دیکھا شاید وہ سمجھ گئی ہو گی کیونکہ اب کی بار جو اس نے مجھے دیکھا تو اس کی مسکراہٹ میں شوخی کے علاوہ میرے اضطراب کا علم ضرور تھا، یہ میں نہیں بتا سکتا کہ مجھے یہ کیسے معلوم ہو گیا، اگر تم میری جگہ ہوتے تو تم بھی اس کی آنکھوں اور اس کے تبسم کو بھانپ لیتے، اس کا ہر احساس تو شاید تم نہ سمجھ سکتے (اس پر میں ذرا مسکرایا) مگر ایسا صاف جذبہ تو اس کا ذکی الحس بشرہ صاف ظاہر کر رہا تھا۔ کم از کم اس کی پُرمعنی نگاہ سے مجھے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ضرور میری بے چینی کی وجہ کو پہچان رہی ہے۔ اب لاہور غالباً بیس میل رہ گیا تھا اور مجھے ہر منٹ یہی خیال ہو رہا تھا کہ ہم اب لاہور پہنچے کہ اب، حالانکہ لاری کم از کم پینتالیس منٹ لیتی۔ مگر میں سوچتا کہ پون گھنٹہ کیا ہوتا ہے یہ تو ابھی ختم ہو جائے گا اور پھر اس کی پتلی پتلی گلابی اور مرتبان رنگ کی انگلیاں اور ان میں سبز اور نیلے نگوں کی انگوٹھیاں اور اس کی کلائیوں کی نفیسیاں کہاں چلی جائیں گی۔ مجھے زیور اس سے پہلے لگتا ہی برا تھا اور جب کبھی میں ان عورتوں کو دیکھتا جو زیوروں سے لدی ہوتی تھیں تو مجھے سخت نفرت ہوتی اور اب مجھے یہ خیال ہی نہ تھا کہ اس نے زیور بھی پہن رکھے ہیں کہ نہیں، البتہ اس کی کلائیوں پر وہ گھڑی پہنچیاں اس قدر اچھی معلوم ہوتی تھیں کہ جب میں اس کے چہرے کی طرف نہ دیکھ رہا ہوتا تو اس کے ہاتھوں یا کلائیوں یا ان پہنچیوں کی طرف دیکھتا ہوتا۔ اور خوش قسمتی سے اسے کسی طرح معلوم ہو گیا کہ اس کے ہاتھ اور اس کی کلائیاں مجھے اچھی لگتی ہیں، کیونکہ یا تو عام طور پر اس کے ہاتھ اس کی چادر کے اندر ہوتے تھے کیونکہ ہوا میں بڑی خنکی تھی اور یا اب شاید ہی وہ ایک آدھ بار چھپائے گئے ہوں گے، بلکہ عام طور پر تو وہ دونوں یا کم از کم ایک تو کہنی کے سہارے

گھٹنوں پر ٹیکے ہوئے چہرہ تھامنے میں مصروف رہتے، شاید اس کے پاؤں کے نیچے کوئی سوٹ کیس ہوگا کیونکہ اس کے گھٹنے اٹھے ہوئے تھے، اس لئے اس کی کہنیوں کے لئے ٹیکنے کے لئے جگہ بھی موجود تھی۔ یوں بیٹھی پتلی پتلی گلابی ناخنوں والی انگلیاں نرم گالوں کو حائل کئے ہوئے وہ چاندرانی سے منٹوں تک باتوں میں مصروف رہتی اور کیا باتیں ہوتیں!"

اس پر منور نے ایک ٹھنڈا سانس لیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ بھئی یہ تو میں سمجھ گیا کہ 'وہ' ماہ طلعت ضرور ہی تمہارے جذبات سے متاثر ہو رہی ہوگی اور ہوگی بھی اسی قابل کہ تم والہانہ طور پر اسے دیکھتے رہتے اور کاش کہ تمہارا سفر لمبا ہوتا یا تمہاری لاری ہی راستہ میں فیل ہو جاتی تاکہ تمہیں ایک آدھ گھنٹہ اور مل جاتا مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ خاندان تو ہندو عورتوں کا تھا اور جانتے ہو اپنے اعمال کی پاداش میں مسلمان لڑکیوں کو ہم پردہ کی وجہ سے نہیں دیکھ سکتے اور ہندو لڑکیاں ہمیں مسلمان سمجھ کر نہیں دیکھتیں۔ تمہیں وہ کس طرح دیکھتی رہی اور تمہارے دیکھنے کو وہ کیسے برداشت کرتی رہی، نہ بے پروائی کی نہ تیوری چڑھائی نہ آنکھوں سے شعلہ باری کی اور نہ تمہاری طرف سے منہ ہی پھیرا اور نہ نشست ہی تبدیل کی؛ یہ میں نہیں سمجھا۔

منور نے کہا: "ٹھیک کہتے ہو ہماری ملعون زندگی سے بدتر اور کیا زندگی ہو سکتی ہے، ہندوستان میں تو لڑکیوں کا مردوں کی طرف دیکھنا بھی گناہ ہے، زندگی کا لطف خاک آئے، اس سے تو افریقہ ہی میں پیدا ہوتے! ہم سے تو حبشی ہی اچھی زندگی بسر کرتے ہوں گے، اتنی قیدیں، اتنی رکاوٹیں! احساس کو بیدار کرنے کے لئے ہزاروں لاکھوں چیزیں موجود ہیں، اور دل کی تسلی کے لئے ایک بھی نہیں! مگر کیا کریں؛ . . . . . اور ہاں تم پوچھ رہے تھے کہ میری طرف اس نے دیکھا کیوں؛ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ کیوں؛ میں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ کچھ لمحوں کے لئے میرا ستارہ کسی منحوس برج سے نکل کر اکیلا گشت لگا رہا ہوگا۔ اور کیا بتاؤں! اور ہندو مسلمان کے متعلق تو جواب آسان ہے کہ میں سوٹ پہنے ہوئے تھے اور سر پر ہیٹ تھا، شکل سے نہ ہندو لگتا ہوں نہ مسلمان! یا دونوں ہی۔ اور شاید اسے یہ خیال ہی نہ آیا ہو، کیونکہ آخر اسے بھی تو معلوم ہوگا کہ یہ ڈیڑھ دو گھنٹہ کا سفر ہے پھر وہ کہاں اور میں کہاں اور اگر اسے نہ بھی آیا ہو تو مجھے تو ہر لحہ یہی خیال آ آ کے گھبرا رہا تھا۔"

"مگر میرے لئے سوائے اس کے کہ چاندرانی سے چھیڑ چھاڑ یا پیار میں مشغول رہوں اور اس کی ممانی کی طرف دیکھوں اور کیا تھا۔ چنانچہ اب چاندرانی نے بھی میرے قرب کو تسلیم کر لیا تھا اور اپنے گدگدانے کو میرا حق مان لیا تھا۔ مگر اس وقت چاندرانی میرے بہت کام آئی، خدا اسے جوان ہونے پر بھی اتنی ہی کامنی اور من موہنی رکھے، جتنی پیاری وہ پانچ برس کی عمر میں تھی، میری خوش قسمتی کہ اس کی ممانی اب اس سے یہ باتیں کر رہی تھی" چاندجی اپنے ماموں کے گھر چلوگی، انہیں پتہ ہے اپنے ماموں کے گھر کا؛" چاندجی چپ تھی اور مگن مگر موٹی موٹی آنکھوں سے اپنی ممانی کو نہایت عبادت مندانہ انداز سے ــ جسے پیار سے دیکھنا اگر جواب ہو سکتا ہے تو چاندجی اپنی ممانی سے خوب باتیں کر رہی تھی۔ ظاہر تھا کہ چاندرانی کو اگر کسی سے پیار

نا تو اپنی ممانی سے اور ممانی کے مُنہ پر جو مسکراہٹ تھی اس میں اتنا پیار اور اتنی ملائمت تھی کہ مجھے تو چاندرانی ہی سے ایک
د کے لئے حسد ہو گیا۔ مگر چاندرانی سے جو باتیں ہو رہی تھیں وہ میرے لئے اس قدر دلچسپ تھیں کہ مجھے اور کسی چیز کا دھیان
یک سیکنڈ سے زیادہ عرصہ تک نہیں رہ سکتا تھا۔ چاندرانی سے پوچھا جا رہا تھا "چاندجی تم اپنے ماموں جان کے گھر آؤ گی نا؟ کہاں
ہے تمہارے ماموں جان کا گھر؟ پنج محل روڈ پر؟ جانتی ہو کہاں ہے پنج محل روڈ؟ تم تو لاہور کی رہنے والی ہو، تم نے تو لاہور کی
اب سیر کی ہو گی۔ چاندجی ہمارے ہاں آؤ گی نا، ہم اور تم سیر کو چلیں گے، ہم اور تم چڑیا گھر چلیں گے، ہم اور تم لارنس باغ
چلیں گے، ہم اور تم خوب سیر کریں گے، تم پنج محل روڈ پر آنا، تمہارے گھر سے دُور تو نہیں، اپنی ماتا جی کو لے کے آنا ہم سب
سیر کو چلیں گے، ہم تو لارنس باغ میں شام کو سیر کیا کرتے ہیں، تم نہیں کیا کرتیں، ہائے سیر نہیں جایا کرتیں؛ چاندجی تم ہمارے
پاس آ جاؤ، ہم تمہیں ماتا جی سے لے لیں گے، ہم تمہیں اپنے پاس رکھیں گے، ہم روز شام کو سیر کو جایا کریں گے، ہم موٹر پر
جایا کریں گے۔ موٹر پر سیر کرو گی نا۔ ہم تمہیں موٹر پر سیر کرائیں گے، ہم گرمیوں میں نہر پہ جایا کریں گے، تم بھی آؤ گی نا؟" چاندرانی
کھل کھل کے ہنس رہی تھی اور اپنی جگہ سے اُٹھ کر وہ اپنی ممانی جان سے لپٹی جا رہی تھی۔ مگر ایک منٹ کے بعد ممانی جان
نے پھر آنکھ اٹھا کر میری طرف دیکھا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے۔ کیا نظر تھی! ایسا محسوس ہوا کہ میرا دل اس نگاہ کی گرمی
محسوس کر رہا ہے۔ اور اب بھی اس کی آنکھوں میں وہی پُرمعنی چمک تھی۔"

"میں نے سوچا کہ یہ تو پتہ چل گیا کہ وہ رہتی کہاں ہے مگر اس سے فائدہ؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اسے پھر دیکھ
سکوں اور وہ بیاہی بھی ہوئی ہے، اس کا تو خاوند بھی ہے، اور خاوند سے اسے ضرور پیار ہو گا، ابھی تو شادی کو زیادہ عرصہ ہوئے
نہیں معلوم ہوتا۔ ایک نہیں تو ڈیڑھ سال ہُوا ہو گا اور میں مسافر، اجنبی اور ڈیڑھ گھنٹہ کا سفر! اور میں کون اور میرے لئے کس کی
دلچسپی، کس کا شوق، بکواس! اسی اُدھیڑبن میں میرا چہرہ اُداس سا ہو گیا ہو گا اور میں نے چاندرانی کو چھیڑنا چھوڑا، غالباً اس
کی طرف پانچ منٹ تک دیکھا بھی نہیں تھا کہ چاندجی نے اپنی جگہ کھڑے ہو کر میری طرف مُنہ کر کے دوپٹہ لیتے لیتے دوپٹہ کو ایک
دفعہ اس طرح جھٹکا دیا کہ میرے ہیٹ پر آ لگا۔ ہیٹ ٹیڑھا ہو گیا۔ میں نے ہیٹ اُتار کے اپنے گھٹنوں پر رکھ لیا اور اُس
وقت سوچا کہ اور سب کچھ تو نظر کا دھوکا ہو گا، مگر چاندرانی تو واقعی ایک پیاری سی لڑکی تھی اور وہ تو کم از کم سچائی سے آرزومند تھی
کہ میں اس سے کھیلوں۔ مان لیا کہ وہ مجھے لاہور پہنچنے پر پانچ منٹ کے اندر اندر بھُول جائے گی مگر اس وقت تو وہ حقیقی طور پر
مجھ سے کھیلنے کے لئے مشتاق تھی اور پھر وہ تھی اتنی پیاری سی۔ چنانچہ میں نے اس کی ممانی کی طرف پانچ منٹ تک نہ دیکھا۔ . . ."

"اب اپنے آپ پر لعنت بھیجتا ہوں کہ وہ پانچ منٹ بھی کیوں ضائع کئے۔ دیکھتا رہتا تو کیا تھا، اسے کیا پروا کہ میں کیوں
اُداس ہوں یا میرا جی کیا چاہتا ہے۔ مگر خیر میں نے دو تین میل تک اسے نہ دیکھا۔ پھر جو دیکھتا ہوں تو ایسا محسوس ہُوا کہ وہ مجھے

متجسس نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ معلوم نہیں وہ کیا جاننا چاہتی تھی مگر اس کی نگاہ بالکل غیر مضطرب اور پُرسکون تھی، جیسے کوئی حادثہ اسے گھبرا نہیں سکتا۔ واللہ! مجھے معلوم نہ تھا کہ دُنیا میں ایسی آنکھیں بھی ہو سکتی ہیں! کیا صاف اور بے ہراس نگاہ تھی! یہ تو کبھی میرے قیاس میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ اسے میرے ساتھ کچھ دلچسپی پیدا ہونے کا امکان بھی ہے اور آخر تم جانتے ہو لاری میں ڈیڑھ گھنٹے کا سفر فقط ایک سو منٹ ہوں گے اور کیا ہے؛ اس سے کچھ توقع کرنا حماقت تھی مگر میرا دل چاہتا تھا کہ ایسی نظر اتنی تیز اور پُرسنی' لااُبالی نہ ہو، مجھے شک پڑتا تھا کہ اسے میری گھبراہٹ اور میرے اشتیاق سے لطف آرہا ہے۔ مگر پھر اس کی مسکراہٹ کو دیکھتا تھا تو اس میں کوئی ترشی نہ تھی اور وہ ایسی ملائم اور میٹھی اور رحیم تھی! شاید!"

یہ کہہ کے منور پھر ایک دو منٹ کے لئے چُپ ہو گیا، میں نے بھی اس "شاید" کی تشریح اس سے نہ پوچھنی چاہی۔ پھر وہ ذرا مدھم آواز میں بولنے لگا:۔

اس کے بعد میں کسی خیال میں مستغرق تھا کہ مجھے 'اس' کی آواز نے چونکا دیا۔ وہ کہہ رہی تھی اور میں نے دیکھا کہ چاند کی ماں سے "آپ نے ہی تو اُس دن مجھ سے کہا تھا کہ شانتی تو یہیں بیٹھ، میں کھانا کھِلا کے تجھے اندر بُلاتی ہوں اور جب میں تھک کے آپ کا انتظار کر کے اندر چلی گئی تو آپ ناراض ہو گئیں اور اب تک آپ نہیں بھولیں۔"

"تم تو پہلے ہی چاہتی تھیں کہ باہر نہ بیٹھو" یہ چاند کی ماں نے کہا مگر ترش لہجہ میں۔" اور میں نے تو تمہیں باہر بھی کھُلے منہ بیٹھے دیکھا تھا، میرے دیور جیٹھ سارے ہی گزر رہے تھے، وہ بھی کیا کہتے ہوں گے کہ کل کی دُلہن اور ننگے مُنہ، میری سُسرال تھی، میرا خیال کیا ہوتا، مگر وہ تو آج کل کی پڑھی لکھی لڑکیاں ہوتی ہی ایسی ہیں۔"

"مگر میں کہاں اندر جاتی تھی، آپ ہی نے کہا تھا شانتی یہاں بیٹھ، میں وہیں بیٹھی رہی اور بھی میرے پاس بہتیری تھیں۔ کسی نے بھی بُرا نہیں مانا اور گھونگٹ نکالنے سے تو مجھے بہت گھبراہٹ ہوتی ہے، اور نکالتی تو باقی سب مجھے کھا نہ لیتیں، شانتی یہ کیا؛ اور شانتی یہ کیوں؛ اندر بیٹھی تھی تو کسی نے کہا شانتی باہر آکے بیٹھ، تو ابھی دلہن ہے، باہر نکل کے مہمانوں میں بیٹھ صحن میں رونق ہو، تو شانتی باہر جا بیٹھی پھر سب ایک ایک کر کے شانتی کے پاس سے اُٹھ بھی گئیں تو شانتی وہاں کیا کرتی؛ اور گھونگٹ تو میں نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ مجھ سے نکالا نہیں جاتا۔"

"بہن تم تو آزاد ہو، تمہاری مرضی ہے، میں نے تو یہی کہا تھا کہ اندر میرے جیٹھ دیور بیٹھے ہیں میں نے کہا اُٹھ جائیں تو تم آجانا!"

"تو بہن جی وہ تو میرے پاس ہی کوئی نہ بیٹھا رہا اور آپ بھی نہ آئیں اور پرایا گھر میں گھُمڑی بن کے بیٹھی کیا کرتی؛ اور مجھے خیال تھا کہ سب اُٹھ گئے ہوں گے۔"

"یہی تو میں کہتی ہوں، میری سُسرال کی بات تھی، سب کہتے ہوں گے کہ ان کی دلہن سال بھی ہوا نہیں سب کے سامنے منہ

ملے پھرتی تھی، اور حرج تو کوئی نہ تھا۔"

"تو بہن جی مجھے کیا پتہ تھا کہ ابھی تک اندر کوئی بیٹھا ہے۔ یا پھر باہر ہی آپ کسی کو میرے پاس بھیج دیتیں۔ آپ کرتی ہی زبردستی ہیں اور آپ نے یہ بات ایک دفعہ نہیں کی، کئی دفعہ کی ہے، ہم تو کبھی اتنی دُور تک بات کو نہیں کھینچتے، آپ کی عادت ہی کچھ ایسی ہے۔"

"تو بہن تو کونسی کم ہے تو بھی تو ایسی نہیں کہ . . . . . "

یہاں چاند کی نانی بیچ میں آگئی اور اس نے کہا "اچھا اچھا جانے دو، شانتی تو ہی جانے دے، ساوتری (یہ چاند کی ماں ہے) چھوڑ ابھی کر ایک بات، کیا بُری عادت ہے تیری! اب لاہور تو آنے کو ہوگا، شام ہو چلی ہے۔ یہ موٹر ہمیں گھر تک پہنچا آئے گی یا کہیں اور چھوڑ دے گی؟"

مراری نے کہا "ماتاجی یہ تو چونگی خانہ کے اڈے کی لاری ہے۔ یہ تو ہمیں سٹیشن پر ہی چھوڑ دے گی وہاں سے ہمیں ٹانگا لینا پڑے گا۔" اس پر ساوتری نے جو اتنے میں شانتی سے اپنی چپقلش شاید بھول بھی چکی تھی کہا "یہ ہمیں شاہ عالمی کے اڈے پر پہنچا دے تو اچھا ہے، وہاں ٹانگے ہمیں کرشن نگر تک مل جائیں گے۔ نہیں تو یہ لاری ہی ہمیں کرشن نگر پہنچا دے۔"

میں نے کہا "یہ کرشن نگر کہاں ہے؟"

منوز نے کہا "معلوم نہیں یہیں کہیں ہو گا۔ عجیب عجیب سے نام لوگوں نے رکھ لئے ہیں، اچھرے وچھرے کی طرف ہو گا یا کہیں اور طرف، ہماری بلا جانے، میں تو تمہیں بتاتا ہوں جو میں نے سُنا۔ اب شاید لاہور پانچ چھ میل رہ گیا تھا۔ اگرچہ شاہدرہ ابھی نہیں آیا تھا، شام پڑ رہی تھی۔ میں لاہور کی نزدیکی سے بہت گھبرایا، مگر جانتے ہو کچھ کر نہیں سکتا تھا، نام تو اس نے مجھے اپنا بتا دیا تھا مگر شاید اس کا یہ مطلب نہ ہو سپھر سوائے اس کے کہ میں اس کے چہرے یا آنکھوں یا ہونٹوں یا اس کے ہاتھوں کو دیکھتا رہوں، اور کیا کر سکتا تھا۔ روشنی ابھی اتنی تھی کہ میں سب کچھ بآسانی دیکھ سکوں۔ ہاتھوں کا اس کے ڈھنگ تھا کہ غضب، ہاتھ کیا تھے موتیا کے پھول تھے، ایسا لطیف رنگ، ایسی نرم جلد کہ محسوس ہوتا تھا کہ ہاتھ لگانے سے ان پر داغ پڑ جائے گا۔ میں نے کہا اس کی نند یا ساس یا کوئی دیکھتا ہے تو دیکھے باقی پندرہ منٹ تو میں سوائے اس کے دیکھنے کے اور کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ مگر دیکھنے سے کیا سیری ہو سکتی ہے؛ اور آنکھوں کی بھُوک کا احساس دوسرے کو ہو بھی جائے تو اس سے کیا ہوتا ہے! مگر میں دیکھتا رہا۔ کبھی کبھی چاند رانی پر بھی نظر ڈال دیتا مگر اس سے کھیلنے کو زیادہ جی نہیں چاہتا تھا لاؤ اب منتظر رہتی کہ کب میں گدگداؤں مگر میں کئی کئی منٹ اس کی طرف دیکھ بھی نہ سکتا۔"

"اب مجھے اس کا نام بھی معلوم تھا، اور یہ بھی کہ وہ کہاں رہتی ہے مگر یہ کہ میں پھر کبھی اسے دیکھ سکوں گا یہ خیال مجھے بہت بے چین کر دیتا مگر میرا خیال ہے کہ میں اس کے چہرے میں اتنا منہمک تھا اور لاہور پہنچنے کے ڈر سے میں اتنا مضطرب

ہو رہا تھا کہ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ تمام باتیں یعنی اسے پھر نہ دیکھنے کا ڈر اور اسے دیکھنے کا گمان اور ایسے ویسے اندیشے مجھے سُوجھ بھی رہے تھے کہ نہیں، مجھے یہ بھی وثوق سے یاد نہیں کہ کیا میرا اس وقت واقعی خیال تھا اس نے اپنا نام اور پتہ مجھے دانستہ طور پر بتایا ہے؛ شاید یہ محض میرے دماغ کی آفرینش تھی یا شاید اس کی نگاہوں کا کچھ مطلب تھا! یا وہ مجھے اب ہر دو یا تین منٹ کے بعد ٹکٹکی باندھ کے کیوں دیکھ لیتی تھی، یا اب آنکھوں میں وہ بے پروائی اور غرور کیوں نہیں تھا، یا کیا واقعی اس کی نظر میں کچھ بے چینی موجود تھی، یا اس کی مسکراہٹ اب کیوں غائب ہوگئی تھی، یا اب اس کے ہاتھ کیوں رومال کو لپیٹنے مروڑنے کھولنے اور کھولنے میں مشغول تھے، یا اب وہ کیوں نظریں ملا کر آنکھیں جھکا لیتی تھی؛ افسوس ہے ان سوالوں کا جواب شاید مجھے تاحشر نہیں مل سکے گا؛

مجھے اب اس بات کا افسوس بھی ہے کہ میں چاندرانی سے بھی کیوں کھیلتا رہا۔ میں ساری راہ اسے ہی کیوں نہ دیکھتا رہا۔ آخر میں اس کے ہونٹ نہ مسکرا رہے تھے نہ بولنے کے لئے کھلے ہوئے تھے مگر ان کے ایک ایک خط سے ان کے خفیف سے جھکاؤ سے کتنی ملائمت کا اظہار ہو رہا تھا!

لاہور آگیا۔ ہم اڈے پر پہنچ گئے اور لاری کھڑی ہوگئی۔ اس وقت سب مسافر اُترنے میں مشغول ہو گئے۔ ان کے حصے میں دونوں طرف کی کھڑکیاں کُھلی تھیں، 'وہ' چونکہ بیچ میں بیٹھی تھی، شاید اس لئے، وہ سب سے آخر میں اُتری، میں بھی اپنی کھڑکی سے دُور تھا میں بھی بیٹھا رہا۔ اُترتی دفعہ بھی اُس نے مجھے خاص اپنی نظر سے دیکھا۔ کاش وہ اُترتی دفعہ ہی مجھے اس نظر سے نہ دیکھتی! پھر بھی میں شاید اسے کبھی بھول جاتا؛

میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا وہ کبھی پنج محل روڈ پر نہیں گیا یا کیا وہ اسے کبھی لارنس باغ میں نہیں دکھائی دی؛ مگر اس کی نظر کی افسردگی کو دیکھ کر مجھے یہ پوچھنا بے سُود ہی معلوم ہُوا۔

سید فیاض محمود

حیرت

مرے خیال نے چوما ہے بارہا تجھ کو
مِل آئی ہے مری پُرشوق التجا تجھ کو
مرے دھڑکتے ہوئے دل کی تشنگی کے شرار
گئے ہیں گھر میں ترے ڈھونڈنے سکون و قرار
خموش، تاروں بھری، حُسن خیز راتوں میں
رہا ہے دِل مرا مشغول تیری باتوں میں
وہ راستے تو جہاں سے گزر کے جاتی ہے
ہمیشہ ان میں مری روح گیت گاتی ہے
مری نگاہ نے کھائی ہیں لغزشیں اکثر
ترے لطیف و صبیح و جوان ہونٹوں پر
ترے تکلمِ جاں بخش میں ہے آوارہ
مری سماعتِ تشنہ کا سازِ صد پارہ
مگر تُو کہتی ہے "مَیں جانتی نہیں تجھ کو"
نہ ہے نہ آئے گا اس بات کا یقیں مجھ کو

عدم

شانتی نکیتن میں دیہاتی گیتوں کا تذکرہ

۲۰ر اپریل ۱۹۳۴ء کا واقعہ ہے۔

اِس بار شانتی نکیتن کا نظارہ میرے لئے اور بھی شیریں و روح پرور تھا۔ کلکتہ سے میرے ہمراہ سوامی سدانند جی بھی تشریف لائے تھے۔ پُرغور نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے اُنہوں نے کہنا شروع کیا ——"بھئی! شانتی نکیتن کیا ہے شعر و نغمہ کا ایک لاجواب تیرتھ ہے۔ مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ جب میں ۱۹۳۲ء میں یہاں آیا تھا اس وقت مجھے یہاں کے گرد و پیش کی ہر چیز اتنی پیاری پیاری نہیں لگی تھی"۔

میں نے کہا —— "آپ ٹھیک ہی فرماتے ہوں گے۔ میرا خیال بھی یہی ہے کہ اب کی شانتی نکیتن پر کچھ نیا ہی نکھار آ گیا ہے۔ فطرت کی رنگینیوں نے اِس جذبات و احساسات کے آشیانہ میں ایک عجب انداز پیدا کر دیا ہے۔ شانتی نکیتن کی بڑی خوبی یہی ہے کہ جب بھی آپ یہاں تشریف لائیں یہ آپ کو نیا نیا ہی سا محسوس ہو"۔

شام ہو چلی تھی۔ مَیں ایک کتاب کے اوراق اُلٹنے میں مصروف تھا۔

معاً آواز آئی —— "چلو سیر کرنے چلو گے؟"

سامنے شانتی نکیتن کے پروفیسر ہزاری پرشاد جی کھڑے تھے۔ اُن کے ساتھ کئی طالب علم بھی تھے۔

میں نے کہا —— "سیر اَور پھر آپ کے ساتھ! یہ تو خدا روز دے"۔

ہزاری پرشاد جی نے مسکرا کر کہا: "واہ کیا کہنے ایسے حسنِ ظن کے"۔

اِس کے بعد ہم سیر کے لئے نکل پڑے۔ سوامی سدانند جی بھی ہمارے ساتھ تھے۔ راستہ میں ہزاری پرشاد جی نے طالب علموں سے سوامی جی کا اور میرا تعارف کرایا۔ کوئی یو۔پی سے آیا تھا تو کوئی بہار سے۔ ایک صاحب گجراتی تھے۔ دو طالب علم جنوبی ہند سے تھے۔ مختلف صُوبوں کی روحیں ایک ساتھ چل رہی تھیں۔

چلتے چلتے ہم کافی دُور نکل آئے تھے۔ اب یہ طے ہُوا کہ ایک جگہ بیٹھ کر بات چیت کی جائے۔

بیٹھتے ہی سوامی سدانند نے کہنا شروع کیا —— "مجھے آپ جیسے بندے بہت پیارے لگتے ہیں۔ مَیں مٹھرا لیکا جہاں گرد آپ جیسے بندوں سے ملنا میرے لئے تیرتھ یاترا سے کم نہیں ہے۔ وطن کا مستقبل آپ سے بہت فیض پائے گا۔ یہ میں ضرور کہوں گا

ہزاری پرشاد جی سے سوامی جی کا تعارف پرانا تھا مگر ساتھ کے طالب علموں کے لئے وہ نئے ہی تھے۔ سبھی میں اُن کے الفاظ نے پھونک دی۔

اِس کے بعد دِہاتی گیتوں کا تذکرہ چھیڑا۔

ہزاری پرشاد جی نے کہا ــــ "یہ بہت خوشی کی بات ہے کہ اب ہمارے ہاں دِہاتی گیتوں کی دیکھ بھال کے سوال پر غور ے لگا ہے۔ اچھا ہی ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ اپنا فرض پہچان رہا ہے۔ پنجاب، یو۔پی، بہار، بنگال، مدراس اور گجرات وغیرہ ی دُھن کے پکّے اس طرف جھکے ہیں۔ اُن کی محنت رنگ لا رہی ہے۔ مگر دِہاتی گیتوں کے حلقہ میں کام کرنے والے حضرات ہ لینا چاہیئے کہ وہ ایک بہت بڑا کام کرنے جا رہے ہیں۔ یہ کام اِتنا وسیع ہے کہ کسی ایک آدمی کے لئے دِہاتی گیتوں کے ہر روشنی ڈال سکنا بہت مشکل ہوگا، اس لئے یہ ضروری ہوگیا ہے کہ جو کوئی بھی اس حلقہ میں کام شروع کرے وہ اپنے لئے ایک خاص شعبہ منتخب کرے۔ پورانوں کا ایک افسانہ ہے کہ ایک بار خُدا نے بے شمار مقامات سے تل تل بھر حُسن اکٹھا کیا راس حُسن سے "تلوتما" نامی بے مثال حسینہ کو بنایا۔ اگر خدا نے تل تل بھر حسن ہی جمع کیا ہوتا اور یہ نہ سوچا ہوتا کہ کس قسم زنین کو بنانے کے لئے یہ مصالحہ اکٹھا کیا جا رہا ہے تو یہ حُسن کا انبار شاید دُنیا کی بدصُورت ترین چیز ہی ہوتا۔ مگر خدا نے ترکیب ے پہلے ہی اپنے سامنے ایک بے مثال حسینہ کا نقشہ بنا لیا تھا۔ دِہاتی گیتوں کے سُراغرسانوں کو بھی اپنے سامنے اپنی ا" کا نقشہ بنا لینا چاہیئے۔"

یوں تو پروفیسر ہزاری پرشاد جی کی شخصیت کئی طرح سے قابلِ قدر ہے۔ وہ کتنی ہی زبانوں کے عالم ہیں۔ کمال کے ذاق ہیں اور پھر دوستوں کے دوست، کافی سنجیدہ واقع ہوئے ہیں مگر اتنے سنجیدہ نہیں کہ ہنسنا ہی بھول گئے ہوں۔ وہ ِس سکتے ہیں اور اپنے دوستوں کو ہنسا سکتے ہیں۔ کسی پُرانے ساتھی سے ملتے وقت وہ اُس سے ہمکنار ہوئے بغیر نہیں رہ ۔ مگر اب معلوم ہُوا کہ وہ صرف دوستوں کے دوست ہی نہیں ہیں دِہاتی گیتوں کے عاشق بھی ہیں اور صرف عاشق ہی نہیں اس ہی چار قدم آگے بڑھے ہوئے ہیں۔

میں نے کہا ــــ "دِہاتی گیتوں کا کھوج لگانے والے اصحاب کو چاہیئے کہ وہ آپ کی حیات بخش نصیحت سے فائدہ اُٹھائیں۔"

دویدی جی کے رُخِ زیبا پر مُسکراہٹ کھیلنے لگی۔ اپنی بات کو ذرا آگے بڑھاتے ہوئے اُنہوں نے کہنا شروع کیا ــــ "اب دِہاتی گیتوں کے جتنے مجموعے مجھے ملے ہیں اُن میں اس بات پر بہت زور دیا گیا ہے کہ کتنے ہی گیت اتنے رسیلے اور دلرُبا کہ کالی داس اور بھوبھوتی جیسے سنسکرت شعراء کا کلام اُن کے سامنے کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتا۔ بلاشبہ کئی ایک گیتوں کے لئے یہ نظریہ ٹھیک ہے مگر کیا دِہاتی گیتوں کا یہی پہلو سب سے اہم ہے؟ اور کیا یہ بات مان لینے سے کوئی بھی صاحب دل

ں داس اور بھو بھوتی کے کلام کو نظرانداز کر کے صرف دیہاتی گیتوں کے مطالعہ سے مطمئن ہو جائے گا؛ مجھے اِس امر میں بہت شک ہے۔
ں دیہاتی گیتوں کے مصنّفوں کا دِل بھی اُنہیں جذبات و احساسات سے متاثر ہُوا جن کا رنگ کالی داس اور بھو بھُوتی وغیرہ کے
م میں موجود ہے۔ اِس بات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ دیہاتی گیتوں کے شاعر بھی کالی داس وغیرہ کے طبقہ سے
ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ آج کا شاعر کالی داس سے مُنہ موڑ کر دیہاتی گیت لکھنے کی طرف متوجہ ہوگا۔ گھاس اور بانس فطرت
ے ایک ہی شعبہ سے تعلق رکھتے ہیں مگر کوئی ذی شعُور انسان بانس کی جگہ گھاس کا استعمال نہیں کرے گا۔ شانتی نکتین کے نزدیک
سنتھال قوم بستی ہے۔ یہ لوگ قدیم طرزِ معاشرت کے دلدادہ ہیں اور بے حد سادہ ہیں مگر ان کی سادگی پر فدا ہو کر بالکل اِنہیں کے
تش قدم پر چلنا ہمیں منظور نہ ہو۔ ہم سنتھالوں سے پیار کر سکتے ہیں مگر اُن کے درمیان سنتھال بن کر رہنا ہمیں پسند نہیں ہوگا۔
جہ صاف ہے۔ ایسا کرنے سے وقت کے ساتھ غیر ذمّہ دارانہ سلوک ہوگا جس زمانہ میں ہم بس رہے ہیں اُس کا بھی ہم پر کچھ حق ہے۔
مذیب حاضر ہم سے مطالبہ کرتی ہے کہ ہم رفتارِ زمانہ کے ساتھ دوش بدوش چلیں۔ ایسا نہ کرنے سے ہم قصور وار ٹھہرائے جائیں گے۔
دہاتی گیتوں کی وکالت کرنے والے حضرات کو سمجھ لینا چاہئیے کہ ان کی تعریف کرتے وقت وہ یہ نہ بھُول جایا کریں کہ ان جانفزا نغموں پر
زمان و مکان کا بہت اثر ہُوا ہے اور اپنے زمان و مکان پر روشنی ڈالنے کی خوبی ہی ان جانفزا نغموں کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

سامعین نے دویدی جی کی تقریر کو بہت غور سے سُنا۔

میں نے کہا —— "دویدی جی! آپ کا ارشاد اب میرے لئے مشعلِ راہ ہوگا"۔

اپنی بات کو اور بھی زوردار بناتے ہوئے دویدی جی نے کہا —— "کیا یہ امر باعثِ افسوس نہیں ہے کہ ہمارے بہت
سے نوجوان شعراء اب گیت لکھنے لگے ہیں اور وہ بھی اس لئے نہیں کہ اُن کا فطری مَیلان اُس طرف ہے بلکہ صرف اس لئے کہ وہ
کھدر کے پرچار کو تقویت دیں؛ اور اس پر طرّہ یہ کہ ہمارے بہت سے اہلِ قلم نے اِن معمولی گیت لکھنے والوں کی ہمت افزائی
کرنا اپنا فرض سمجھ لیا ہے"۔

اتنے میں ریلوے لائن سے "بُت بُت" کرتی ہوئی گاڑی نکل گئی۔ ہم سب اُس کی طرف متوجہ ہو گئے اور دویدی جی کو دم
لینے کا اچھا موقع مِل گیا۔

اب ہم نے دویدی جی سے یہ سوال کیا —— "تو آپ کے خیال میں دہاتی گیتوں کی سب سے بڑی اہمیت کیا ہے؟"

دویدی جی نے سلسلۂ تقریر جاری کرتے ہوئے کہا —— "دہاتی گیتوں کی دِلکشی صرف اُن کے شاعرانہ رنگ تک ہی محدود
نہیں ہے۔ انہیں ایک بلند مقصد کے لئے استعمال کرنا ہوگا۔ اِن کی مدد سے ہم ایک پرانی دُنیا کو پانا چاہتے ہیں جِسے یا تو ہم بھُول
چکے ہیں یا جسے ہم غلط سمجھ بیٹھے ہیں۔ قدیم آریوں کے آنے سے پہلے ہندوستان میں ایک تہذیب کا وجود تھا جو اپنی جگہ ایک خاص

اہمیت رکھتی تھی۔ اُس تہذیب کے ساتھ ساتھ کتنے ہی تمدّن اِس وسیع ملک کے ہر گوشہ میں موجود تھے۔ سیاسی حیثیت سے تو آریا لوگ ہندوستان پر قابض ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے مگر وہ یہاں کی تہذیب و تمدّن کو مسخر نہ کر سکے۔ یہاں کی پُرانی تہذیب آریا تہذیب سے بالکل مختلف تھی اور آج بھی عوام کے رسم و رواج میں اُس کی جھلک موجود ہے۔ آریا تہذیب اپنے ویدوں کو آسمانی صحیفے سمجھتی تھی۔ ہمارے پُرانے دیہاتی گیت یہاں کی پُرانی تہذیب کے وید ہیں۔ وید بھی آریوں کے گیت ہی تھے اور دیہاتی گیتوں کی مانند ہی سُن سُن کر یاد کیے جاتے تھے۔ اِسی لئے انہیں "شُرتی" بھی کہتے تھے۔ خوش قسمتی سے وید کتابوں کی شکل میں محفوظ کر لئے گئے۔ دیہاتی گیت ویسے ہی نسل در نسل صرف گائے اور سُنے جاتے ہیں۔ زمانہ کے ساتھ ساتھ اِن گیتوں نے نہ جانے کتنی بار زبان کا جامہ بدلا ہو گا مگر اُن کی روح ایک دم پُرانی ہی معلوم ہوتی ہے۔ جس طرح ہم ویدوں کے مطالعہ سے آریا تہذیب سے واقف ہوتے ہیں اُسی طرح پُرانے دیہاتی گیت اُس پُرانی تہذیب پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔ محکمۂ آثارِ قدیمہ سے تعلق رکھنے والے اصحاب اگر اسے بُرا محسوس نہ کریں تو میں کہہ سکتا ہوں کہ "موہنجو داڑو" جیسی پُرانی عمارات کے کھنڈر اور کھ نہیں صرف دیہاتی گیتوں کی تفسیریں ہی ہیں۔"

"جنگِ یورپ سے جن ریاستوں کو سوراج ملا اُن میں سے ایک "لتھوآنیا" بھی ہے۔ اس ملک کے ایک زبردست عالم (Prof. Paskericious) جو Kaunas University سے تعلق رکھتے ہیں یہاں شانتی نکیتن میں تشریف لائے تھے۔ ایک تقریر کے دوران میں اُنہوں نے فرمایا کہ پچھلے پانچ سو سال سے "لتھوآنیا" عیسائیت کے زیرِ اثر رہا ہے اور برابر آزادی کے لئے جدّ و جہد کرتا رہا ہے۔ ہمارے عیسائی حکمرانوں نے ہمارے پُرانے قومی ادب کو تباہ کر دیا اور ہماری زبان کو بھی اُن کے عہد میں بہت نقصان پہنچا۔ ہزاروں کی تعداد میں ہمارے لوگ وطن کو خیر باد کہہ کر امریکا میں جا بسے اور اپنے کو لتھوآنین کہنے میں بھی اُنہیں شرم محسوس ہونے لگی۔ اِس وقت جب ہمیں آزادی نصیب ہو چکی ہے، ہم اپنی پُرانی تہذیب و تمدّن کی اور اپنے قومی ادب کی تجدید کرنا چاہتے ہیں۔ مگر آہ! ہمارے پاس اب کچھ بھی تو باقی نہیں رہا۔ اگر کچھ بچ پایا ہے تو وہ ہمارے دیہاتی گیت ہیں جو ہمارے عوام پر نہ جانے کب سے قبضہ کئے ہوئے ہیں۔ خاص کر ہماری عورتیں اِن گیتوں پر بہت فدا ہیں۔ ہماری قوم جو کہ چیونٹیوں سے بھی زیادہ جفاکش ہے اب اپنے دیہاتی گیتوں کی روشنی میں اپنی کھوئی ہوئی دُنیا کو حاصل کرنے میں کوشاں ہے۔ ہمارے فاضل اور عالم حضرات نے پُرانے گیت اور افسانے جمع کر کے تین ضخیم کتابوں کی شکل میں شایع کئے ہیں۔ گیتوں اور افسانوں کا بہت سا مصالحہ ایسا بھی پڑا ہے جو ابھی تک شایع نہیں ہو سکا۔ اِن گیتوں سے پتہ چلا ہے کہ لتھوآنیا کی پُرانی تہذیب پر ہندوستانی تمدّن کا بہت اثر رہ چکا تھا۔ چنانچہ جب ایک لتھوآنین دوسرے لتھوآنین سے ملتا تھا تو "رام رام" کہا کرتا تھا۔ رام اور راون کے نام بھی رائج تھے۔ جب کوئی لتھوآنین ملکِ عدم کی تیاری کرتا تھا تو اُس کے لواحقین

"رام نام ست" کہا کرتے تھے ؛

"یہ ہے دیہاتی گیتوں کی اہمیت۔ گو اِس بات کا دعویٰ کیا جاتا ہے کہ عیسائیت کسی قسم کی تخریب کا درس نہیں دیتی لیکن یہ امر واقع ہے کہ جس تہذیب پر بھی عیسائیت کا اثر ہؤا وہ اپنے اصلی رنگ کو زندہ نہ رکھ سکی۔ ابھی کل کی بات ہے کہ امریکا میں ایک بہت بڑی قوم آباد تھی مگر عیسائیت کی مہربانی سے آج اُس قوم کے فرد (نیگرو لوگ) صفحۂ ہستی سے مٹتے چلے جا رہے ہیں۔ اِس عیسائی تہذیب کی لپیٹ میں آ کر بھی ملغو آئین تمدّن سر اُٹھا سکا ہے تو صرف اپنے دیہاتی گیتوں کے بل بوتے پر۔ پھر کیا ہم ہندوستانی اپنے وطن کی پُرانی تہذیب و تمدّن کو اپنے گیتوں کے آئینے میں نہیں دیکھ سکتے؟"

یہاں پہنچ کر دویدی جی رُک گئے۔ سوامی سدانند جی کہہ اُٹھے ــ "بس دویدی جی! آپ کی بات ختم ہو گئی کیا؟"

"نہیں۔ ہرگز نہیں۔ میری کہانی ابھی لمبی ہے۔ اب تک صرف دیباچہ ہی ہؤا ہے۔" ــــ یہ کہتے ہی دویدی جی عجب انداز سے مُسکرا اُٹھے۔

میں نے کہا ــــ "اچھا تو دویدی جی! چلنے دیجئے اپنی پنجاب میل۔"

دویدی جی نے پھر سلسلۂ تقریر شروع کیا ــــ "کئی سال ہوئے مجھے بھی دیہاتی گیتوں کے سلسلہ میں تھوڑا سا وقت لگانے کا موقع مِلا تھا۔ اپنے ایک دوست کے ساتھ میں اپنے گاؤں میں وہ گیت جمع کرنے لگا جو خاص طور پر ہماری مستورات میں رائج ہیں۔ "ماتا دیئی" (شیتلا) کی پوجا کے ایک گیت میں ایک بند آتا تھا جس سے یہ پتہ چلتا تھا کہ "ماتا دیئی" کی شادی "الی سیر" (علی شیر) سے ہوئی تھی۔ میں نے یہ گیت لکھ کر اپنے دوست کو دیا۔ وہ ہندو تھے اور اِس گیت کے "الی سیر" پر اُنہوں نے جھٹ سے اعتراض کر دیا۔ اُنہوں نے یہ بھی کہا کہ ہندو مستورات کو ایسے گیت گانے بند کر دینے چاہئیں۔ پتہ نہیں یہ "الی سیر" کون تھے مگر میرے ایک بنگالی دوست منوموہن گھوش ایم اے نے بتلایا ہے کہ "الی سیر" علی شیر کی بگڑی ہوئی شکل نہیں ہے بلکہ یہ بُدھ مت کے کسی سادھو کا نام ہوگا۔ اُنہوں نے یہ بھی بتلایا کہ "الی سیر" سے ملتا جلتا ایک نام اُنہوں نے بُدھ مت کے سادھوؤں کے درمیان پایا بھی ہے۔ نہ جانے حقیقت کیا ہے۔ اُس گیت کے اَور کسی بند سے اس کے متعلق اَور کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ لیکن اگر اس نظریے سے اِن گیتوں کا مطالعہ کیا جائے تو ایک گیت میں نہ سہی کسی اور گیت میں "الی سیر" کا کچھ پتہ چل سکتا ہے۔ اس طرح سے ایک بھُولی ہوئی بات ہماری واقفیت کی چیز بن سکتی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ "الی سیر" کی واقفیت ہماری کسی عظیم تحقیق کا موجب نہیں ہو گی۔"

"وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ دیہاتی گیتوں کی دُنیا میں بے شمار تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ساتھ ہی اضافہ کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ یہ تبدیلیاں اور اضافے ہی بتلاتے ہیں کہ اِن گیتوں میں اب بھی زندگی موجود ہے۔ بے شمار گیت ایسے ہیں جن کا عوام الناس کے عام رسم و رواج کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ اِن رسم و رواج کی واقفیت بھی بہت ضروری ہو گی۔ ساتھ ہی گیتو

ُر اور تال وغیرہ کو بھی خاص اہمیت دی جانی چاہیئے۔ یہاں مجھے اپنی ایک آپ بیتی یاد آرہی ہے۔ ایک بار مجھے شانتی نکیتن کے یسر کشیتی موہن سین کے ساتھ ٹہلنے کا موقع ملا۔ شانتی نکیتن سے کافی دور نکل کر ہم ایک جگہ بیٹھ گئے۔ رات کے آٹھ بجے ہوں گے۔ ول ہیں مشعلیں لئے سنتھال عورتوں کی ایک ٹولی بڑے میٹھے سُر سے گاتی چلی جا رہی تھی۔ سلسلہ تقریر بند کرتے ہوئے پروفیسر ن نے کہا — "سنیئے"۔ ہم دونوں خاموش ہو کر سننے لگے۔ اب وہ ٹولی کافی دور نکل گئی تھی مگر دور سے بھی اُن کے گیت کا صاف سنائی دے رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد پروفیسر سین نے پوچھا — "کہئے کیا سُنا؟" میں جیسے کوئی بھولی ہوئی بات سوچنے ۔ مجھے یاد آیا کہ میرے اپنے گاؤں کی عورتیں اسی سُر میں گیت گاتی ہوئی گنگا پوجنے جایا کرتی ہیں۔ میں نے یہ بات پروفیسر ن سے کہی تو انہوں نے ہنستے ہوئے فرمایا — "آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ لفظ "گنگا" آریا لوگوں کا لفظ نہیں ہے بلکہ آریوں ہ آنے سے پہلے بھی ہندوستان کی مقامی قوم میں رائج تھا۔ یہ سنتھال لوگ اُسی قوم سے ہیں۔ آپ کے صوبہ کی مستورات نے نے گنگا پوجا گیت کے لئے سنتھال عورتوں سے ہی وہ سُر مستعار لیا ہوگا"۔ پروفیسر سین کی اس بات سے مجھے یہ یقین ضرور آ اکہ دیہاتی گیتوں کا مطالعہ کرتے وقت اُن کے سُر تال کی واقفیت بھی کتنی ضروری ہے۔ اگر دیہاتی گیتوں کے سراغ رساں ان ں پر غور کرتے ہوئے اپنے راستے پر چلیں تو وہ اُن طالب علموں کے سامنے ایک بیش قیمت خزانہ رکھ سکیں گے جو کہ عہدِ ماضی ے بھولے ہوئے افسانوں کو از سرِ نو زندہ شکل میں سننا چاہتے ہیں"۔

یہاں پہنچ کر دویدی جی کی "پنجاب میل" رُک گئی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اُنہوں نے دیہاتی گیتوں کے تذکرہ کو منزلِ مقصود ۔ پہنچا دیا ہے۔

دویدی جی نے مسکرا کر کہا — "بس کھیل ختم"۔

باقی ساتھیوں نے کہا — "مگر ہم تو کچھ دیہاتی گیت سُننے کے لئے بے قرار ہو رہے ہیں"۔

دویدی جی نے میری طرف آنکھیں اُٹھاتے ہوئے کہا — "یہ کام تو کوئی ستیارتھی ہی کر سکتا ہے"۔

باقی ساتھی کہہ اُٹھے — "تو ٹھیک ہے۔ ایک ستیارتھی تو آج ہمارے بیچ میں موجود ہی ہے نا"۔

میں جیسے کچھ لجا سا گیا۔ سوامی سدانند جی نے میرے دل کی بات بھانپ لی۔ معاً میرے کان میں اُن کے یہ الفاظ آنے دیکھو بھئی ستیارتھی! اب تمہاری باری ہے۔ میدان سے بھاگنا بھی کیا مردوں کا کام ہے"؟

میں نے آنکھیں اُوپر اُٹھائیں۔ سبھی آنکھیں میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ اب میں سمجھا کہ یہاں ٹال مٹول نہ چلے گی۔

سوامی جی نے پھر کہا — "اتنی دیر؟ بس شروع کر دو نا!"

میں نے کہا — "شروع تو کر دوں لیکن دویدی جی جیسے عالم دوست کے سامنے کچھ کہتے جھجکنا ہی چاہیئے۔ اِن کا سا علم

مجھ میں کہاں! نہ مجھ میں ابھی تک ان کی سی سوجھ ہی آسکی ہے جس کی برکت سے میں گیتوں کے پیچھے ان کے مکان وزمان تک اپنی نگاہ پہنچا سکوں"۔

دویدی جی بول اُٹھے —— "بھئی! یہ مذاق کبھی پھر سہی۔ جو وقت اِس دیباچہ میں خرچ کر رہے ہو اچند دیہاتی گیت سنانے میں لگا دو نا۔"

میں نے کہا —— "صرف دِہاتی گیت ہی!"

دویدی جی کے طالب علموں نے یک آواز ہو کر کہا —— "ہاں ہاں، صرف دِہاتی گیت ہی۔ باقی باتیں ہم دویدی جی سے سمجھتے رہیں گے"۔

آخر میں نے گجرات کا ایک دِہاتی گیت پیش کیا :-

گام ماں ساسروں نے گام ماں پیئریوں رے لول	جس گاؤں میں لڑکی کے میکے ہیں وہاں ہی اُس کی سسرال ہے۔
دِیکری کرجو سُکھ دُکھ نی بات جو۔	ماں نے کہا —— بیٹی! ذرا اپنے سُکھ دُکھ کی کہانی تو سُنا۔
کولاں ساسریاں ماں جیوڈں رے لول۔	آہ! کتنا مشکل ہے محبت سے خالی سسرال میں رہنا۔

سُکھ نہ بارا تے ماڑی وہی گیا رے لول!	لڑکی بولی —— سُکھ کے دن تو کبھی کے ختم ہو گئے اماں!
دُکھ نہ اُگیاں چھے جھیناں جھاڑ جو!	اب تو دُکھ کی چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں اُگ رہی ہیں۔
کولاں ساسریاں ماں جیوڈں رے لول!	آہ! کتنی مشکل ہے محبت سے خالی سسرال کی زندگی!

پچھواڑے اُو بھی نندی سانبھلے رے لول	گھر کے پچھواڑے میں نند چوری سے اپنی بھاوج کی باتیں سُن رہی ہے۔
بہو کرے چھے اپناں گھر نی بات جو۔	وہ سوچتی ہے۔ دُلہن اپنی سسرال کی شکایت کر رہی ہے!
بہوئے بگوویاں موٹاں کھورڑاں رے لول۔	آہ! ہماری دُلہن نے ہمارے اعلیٰ خاندان کو بدنام کر دیا ہے۔

نندی اے جئی ساسُو نے سمجھاویوں رے لول	نند نے جا کر دُلہن کی ساس کو خبر دی۔
بہو کرے چھے آپناں گھر نی بات جو۔	دُلہن اپنی سسرال کی شکایت کر رہی ہے۔
بہوئے بگوویاں موٹاں کھورڑاں رے لول۔	آہ! ہماری دُلہن نے ہمارے اعلیٰ خاندان کو بدنام کر دیا ہے!

ساسوئے جی سُسرا نے سمجھلادیوں رے لول	ساس نے جا کر دُلہن کے سُسر کو خبر دی۔
بہوُ کرے چھے آپناں گھرنی بات جو۔	دلہن اپنی سُسرال کی شکایت کر رہی ہے۔
ہُوئے بگوویاں موٹاں کھورڑاں رے لول۔	آہ! ہماری دُلہن نے ہمارے اعلےٰ خاندان کو بدنام کر دیا ہے!

سسرائے جی جیٹھ نے سمجھلادیوں رے لول۔	سُسر نے جا کر دُلہن کے جیٹھ (خاوند کا بڑا بھائی) کو خبر دی۔
بہوُ کرے چھے آپناں گھرنی بات جو۔	دُلہن اپنی سُسرال کی شکایت کر رہی ہے۔
بہوئے بگوویاں موٹاں کھورڑاں رے لول۔	آہ! ہماری دُلہن نے ہمارے اعلےٰ خاندان کو بدنام کر دیا ہے!

جیٹھے جی پرنیاں نے سمجھلادیوں رے لول۔	جیٹھ نے جا کر دُلہن کے رفیقِ حیات کو خبر کر دی۔
بہو کرے چھے آپناں گھرنی بات جو	دُلہن اپنی سُسرال کی شکایت کر رہی ہے۔
ہُوئے بگوویاں موٹاں کھورڑاں رے لول۔	آہ! ہماری دُلہن نے ہمارے اعلیٰ خاندان کو بدنام کر دیا ہے!

پرنیں جی تیجی گھوڑو چھوڑیو رے لول۔	دُلہن کا رفیقِ حیات اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر چل پڑا۔
جی اُبھاڑیو گاندھی ڑا نے ہاٹ جو	پنساری کی دُکان پر پہنچ کر وہ ٹھہر گیا۔
ہُوئے بگوویاں موٹاں کھورڑاں رے لول۔	آہ! ہماری دُلہن نے ہمارے اعلےٰ خاندان کو بدنام کر دیا ہے!

ادمہ شیر املیاں تولاویاں رے لول۔	پنساری کی دُکان سے دُلہن کے رفیقِ حیات نے پاؤ بھر کوئی نشیلی شے لی۔
پاشیر تولاویو سومل کھار جو۔	اور پاؤ بھر "سومل کھار" زہر خرید لیا۔
ہُوئے بگوویاں موٹاں کھورڑاں رے لول۔	آہ! ہماری دلہن نے ہمارے اعلےٰ خاندان کو بدنام کر دیا ہے!

سونلا بانکڑے اِل گھولیاں رے لول۔	(گھر پہنچ کر) دُلہن کے رفیقِ حیات نے طلائی کٹورے میں زہر گھول لیا۔
ہٹو گوری نکر ہوُں پی جاؤں جو۔	ملکۂ حسن دُلہن کے ہاتھ میں یہ کٹورا دے کر اُس نے کہا ـــــ اسے تم پی جاؤ ورنہ تمہارے دیکھتے ہی دیکھتے اسے میں پی جاؤں گا۔
ہوئے بگوویاں موٹاں کھورڑاں رے لول۔	آہ! ہماری دُلہن نے ہمارے اعلےٰ خاندان کو بدنام کر دیا ہے۔

گنک دئی نے گوراں دیثی پی گیاں رے لول۔	ایک گھونٹ میں دُلہن سارا زہر پی گئی۔
گھڑ چولاں نی سٹانسی اپنے سوڑ جو۔	"گھر چولاں" نامی انگیا پہن کر وہ ہمیشہ کی نیند سوگئی۔
بھوئے بگوویاں موٹاں کھوڑاں رے لول۔	آہ! ہماری دُلہن نے ہمارے اعلےٰ خاندان کو بدنام کردیا ہے!

آٹھ کاٹھ ناں لاکڑاں منگاویاں رے لول۔	دُلہن کے رفیقِ حیات نے "آٹھ کاٹھ" کی لکڑی منگوائی۔
کھوکھری ہانڈی ماں لیدہی آگ جو۔	اور ٹوٹی ہوئی ہانڈی میں اُس نے آگ ڈال لی۔
بھوئے بگوویاں موٹاں کھورڑاں رے لول۔	آہ! ہماری دُلہن نے ہمارے اعلےٰ خاندان کو بدنام کردیا ہے!

پہیلو وِسامون گھرنے اومبرے رے لول۔	دُلہن کی لاش اُٹھانے والے پہلے آنگن میں رُکے۔
بیجو وِسامون جھانپا بہار جو۔	پھر وہ گھر کے دروازے پر تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر گئے۔
بھوئے بگوویاں موٹاں کھورڑاں رے لول۔	آہ! ہماری دُلہن نے ہمارے اعلےٰ خاندان کو بدنام کردیا ہے!

تریجو وِسامون گام نے گواندرے رے لول۔	تیسری بار لاش اُٹھانے والے گاؤں کی سرحد پر رُکے۔
چوتھو وِسامون سمشان جو۔	چوتھی بار اُنہوں نے ٹھیک شمشان بھومی میں جاکر سانس لیا۔
بھوئے بگوویاں موٹاں کھورڑاں رے لول۔	آہ! ہماری دُلہن نے ہمارے اعلےٰ خاندان کو بدنام کردیا ہے۔

سونلا سرکھی بھونے چیہ بلے رے لول۔	دُلہن کی چتا ایک دم سُنہری ہو اُٹھی ہے۔
روپ لا سرکھی بھو نی راکھ جو۔	اور چاندی کی سی بھبھوت بنتی چلی جارہی ہے۔
بھوئے بگوویاں موٹاں کھورڑاں رے لول۔	آہ! ہماری دُلہن نے ہمارے اعلےٰ خاندان کو بدنام کردیا ہے!

بالی جھالی نے جیوڑو گھرے آویو رے لول۔	شمشان بھومی سے واپس آکر دُلہن کے رفیقِ حیات نے کہا اے ماں! اب تمہارے لئے یہ گھر بہت کھلا ہوگیا۔
ہنوسے ماڑی مندرسیئے موکلان جو۔	مگر اپنی وفادار دُلہن سے ہاتھ دھوکر میں اب دوسروں کی مدد کا محتاج ہوگیا ہوں۔
بھوئے بگوویاں موٹاں کھورڑاں رے لول۔	آہ! ہماری دُلہن نے ہمارے اعلےٰ خاندان کو بدنام کردیا ہے!

واں بوے ماڑی دسے جہ دوٹا واٹ جو
سڑ لو اوشیالو ہوسے ہڑں رہنور سے لول۔
بھوئے بگوریاں موٹاں کھورڑاں رسے لول۔

یہ گیت ہمارے گجراتی ساتھی کو بھی یاد تھا۔ جب اُس نے سب کے کہنے پر اسے گجرات کے دیسی سُروں میں گا کر سُنایا تو خوب سماں بندھا۔ گیت کے اُداس سُر سامعین کو گیت کی روح تک لے گئے۔

میں نے کہا ـــ "گیتوں کی شاعرانہ نزاکت ترجمہ کے ریگستان میں آکر بہت جلد خشک ہو جاتی ہے۔ مگر کوئی اور چارہ بھی تو نہیں ہے۔ ترجمہ کے بغیر گزارہ بھی تو نہیں ہو سکتا۔ گیتوں کے کتنے ہی الفاظ مترجم کے لئے بڑی پیچیدگی کا باعث بن جاتے ہیں۔ ان الفاظ کی back ground میں اکثر مقامی کلچر کا اتنا گہرا رنگ رہتا ہے کہ لفظی ترجمہ میں ہم ان کی روح تک نہیں پہنچ سکتے۔"

اس خیال میں ہمارے سبھی دوست متفق نظر آئے۔

اب مندرجہ بالا گیت کے پلاٹ پر بحث ہوئی۔

"مجھے تو اس گیت کی ہیروین کی Tragedy نے ایک دم رُلا دیا ہے" ـــ ایک صاحب نے حسرت آمیز لہجہ میں فرمایا۔

میں نے کہا ـــ "بالکل ٹھیک فرمایا آپ نے۔ اِس سے زیادہ بُری حالت ہو سکتی ہے کیا؟ بے چاری دُلہن کو ذرا سی بات پر مرنے کے لئے مجبور کر دینا، اِس سے زیادہ دِل شکن اور کونسا واقعہ ہوگا؟ آخر نند میں کچھ تحمّل کا مادہ ہونا چاہئے تھا۔ اُس کی بدمزاجی مجھے تو بہت کھٹکتی ہے۔ دُلہن پر اِس سخت حکومت کے کچھ معنی بھی تو ہوں! اور مجھے تو دُلہن کے رفیقِ حیات کی عقل پر بھی غصہ آرہا ہے۔ جب وقت تھا تب تو اُس نے دُور اندیشی سے کام نہ لیا۔ جب پنچھی پنجرے سے اُڑ گیا تو اُسے اپنی غلطی کا قدرے احساس ہوتا ہے۔ دیکھئے، کتنا غضب ہو گیا! نند نے اپنے والدین اور بھائیوں کو اپنی بھاوج کے خلاف ایسی پٹی پڑھائی کہ اُن بھلے مانسوں نے اِنصاف کی بات سننے کی تکلیف ہی نہ اُٹھائی۔ نند کیا ہے بارود کی پُڑیا ہے۔"

ایک صاحب کہہ اُٹھے ـــ "برج بھاشا کی ایک کہاوت ہے ـــ 'ماٹی کی نند براویں'۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نند مٹی کی مُورتی بھی کیوں نہ ہو، اپنی بھاوج کا وہ اِس حالت میں بھی مُنہ چڑاتی رہے گی۔

ایک دوسرے صاحب نے کہا ـــ "ایسے گیت ہی ہمارے عوام الناس کے دُکھ درد کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔ وطن کی عام زخمی زندگی اِن گیتوں میں آنسو بہاتی نظر آتی ہے! کیا یہ آنسو وطن کے شاعروں اور مضمون نگاروں کو اپنی طرف راغب نہ کر سکیں گے۔ ایک روسی مصنف نے لکھا ہے ـــ کیا تم مصنف بننا چاہتے ہو؟ اپنے عوام الناس کے دیرینہ کرب و کوفت کی تاریخ پڑھو۔ اگر اس دوران میں تمہاری آنکھیں خون کے آنسو نہ رو دیں تو اپنے ہاتھ سے قلم پھینک دو۔"

سوامی سدانند جی بڑے غور سے یہ ساری بات چیت سن رہے تھے۔ وہ بولے ــــ "اس گیت پر اب کافی غور ہو چکا ہے میں تو یہی دعا کروں گا کہ ہمارے وطن کی گھریلو زندگی پر شانتی نکیتن کی مہر لگ جائے تا کہ لوگ محبت سے رہیں اور باہمی نفرت کے جذبات سر نہ اٹھا سکیں۔ اچھا تو اب کوئی اور گیت سناؤ نا!"

میں نے کہا ــــ "اچھا سنئے سندھ میں عمر اور ماروی کا گیت بہت ہر دلعزیز ہے۔ بےچاری ماروی کو عمر کی جیل میں قیدی کی شکل میں رہنا پڑا تھا۔ وہ ایک چرواہے کی لڑکی تھی۔ اُس نے کوئی جرم نہ کیا تھا۔ بات دراصل یہ تھی کہ عمر جو حاکم وقت تھا اُس پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ وہ اُسے پکڑ لے گیا تھا اور زبردستی اُس سے شادی کرنے کے خیال سے اُس نے اُسے اپنے جیل میں ڈال دیا تھا۔ ماروی اپنے وطن کی یاد میں آنسو بہا کر کہتی ہے :-

الہا ائیں م ہوئے	یا خدا کہیں ایسا نہ ہو کہ میں یہاں جیل میں ہی لقمۂ اجل بن جاؤں!
جئیں آؤں مراں بند میں	میرا جسم زنجیروں سے جکڑا ہوا ہے اور میں دن رات رو تی رہتی ہوں۔
جسُو زنجیرن میں ، راتیوں ڈیہاں روئے	جی چاہتا ہے کہ میں اپنے وطن میں پہنچ جاؤں۔
پیرڑاہی بنیاں لوئے ، پوئے مرپنج نم ڈیہاں را۔	بعد ازاں خواہ میں مر ہی جاؤں۔

سوامی سدانند جی نے کہا ــــ "سدیئی کے گیت کا کوئی بند بھی سنائیے نا!"

میں نے کہا ــــ "سدیئی کا گیت دیہاتی گڑھوال کی ایک خاص چیز ہے۔ نہ جانے سدیئی کون تھی اور کس گاؤں کی رہنے والی تھی مگر گڑھوالی دل آج اس کے گیت گاتا نہیں تھکتا۔ پوڑھی کے پنڈت تارادت گیرولا نے آج سے کئی سال پیشتر دہرہ دون کے گڑھوالی پریس سے اسے شائع کیا تھا۔ سدیئی گاؤں کی دلہن ہے اور سسرال میں رہتی ہے۔ اِس گیت کا ایک بند میں نے مسوری میں پنڈت مدن موہن مالویہ جی کو سنایا تھا۔ وہ کہہ اٹھے تھے ــــ "اِس میں تو حسرت کی ایک زوردار ندی بہتی ہے"۔

وہ بند یہ ہے :-

ہے اُونچی ڈانڈیوں ! تُمی نیسی جاوا۔	جُھک جاؤ۔ اے اُونچی اُونچی پہاڑیو! جُھک جاؤ۔
گھنوں کلائیوں ! تُمی چھانٹی ہووا۔	اے چیڑ کے گھنے درختو! میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔
مَیں کو لگی چھ کھد مئیر ڑاکی	میں اپنے میکے کے لئے ترس رہی ہوں۔
بُواجی کو دیکھن دیس دیوا۔	دیکھ لینے دو ، مجھے اپنے والدین کا وطن دیکھ لینے دو۔

سدیئی کے جذبات کو صاف کرتے ہوئے میں نے پھر کہا ــــ "سدیئی سسرال میں بیٹھی بیٹھی ہی پہاڑ کی دوسری طرف بسے ہوئے اپنے والدین کے گاؤں کو دیکھنے کے لئے بے تاب ہو رہی ہے۔ سوچتی ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ نہ میرے سامنے اُونچی

ہی پہاڑیاں ہوتیں نہ یہ چیڑ کے گھنے درخت ۔ بس میں یہاں سے ہی ماں باپ کا وطن دیکھ سکوں ۔"

اس کے بعد میں نے نیپال کا ایک گیت سنایا :-

کو شکاری ہتی کو ہو ؛ کو ہو ؛	" تم کون ہو ؛ اے شیروں کے شکاری ! تم کون ہو ؛
ے دیئی رامروجوانی کسے دیئو یو روپ ؛'	کس نے عطا کی تمہیں یہ جوانی اور کس نے بخشا ہے تمہیں یہ حسن ؛"
بابا کو چھورا م باگھیئے کو شکاری ۔	"میں بہادر باپ کا نور نظر ہوں اور شیروں کا شکاری ہوں ۔
بالے دیئو جوانی دیوتائی سے دیئو نی روپ '	خدا نے مجھے یہ جوانی عطا کی ہے اور اسی نے بخشا ہے یہ حسن '
بارا کو چھورا لے ماری ر دیوئی باگھ	لو بہادر باپ کے بیٹے نے شیر کو مار گرایا ہے ۔
ریئے ماں اس کو جھلکن چھ بہادری ۔	شکاری کے رخ زیبا پر بہادری جھلک رہی ہے ۔"

نیپالی شکاری کی روح پرور شخصیت ہمارے سبھی دوستوں کو پسند آئی ۔ ایک صاحب خاص طور پر اہنسا (عدم تشدد) کے قایل ہیں مگر شیروں کا شکاری انہیں بھی بھا گیا ۔ گیت کی ہیروئن کی سبھی نے تعریف کی ۔ ایک صاحب بول اٹھے ـــ" اجی شیروں کے شکاری سے ایسا سوال نیپالی کی کوئی بہادر دلہن ہی کر سکتی ہے ۔"

نیپال سے ہماری توجہ یک لخت کشمیر کی طرف چلی گئی ۔

دویدی جی نے کہا ـــ" کیا کشمیر جنت نظیر میں ایسے گیت بھی گائے جاتے ہیں جن میں زعفران کا ذکر خیر بھی آیا ہو ؛"

میں نے کہا ـــ" ہاں ہاں ایسے گیتوں کی بھی وہاں کمی نہیں ہے ۔ اچھا تو سنئے :-

ی نی جائے کونگ پوش خیال	اے زعفران کے پھول ! گھمنڈ نہ کر
ہیس چھیہ خوت برہ نفیس	میں تجھ سے کہیں بڑھ کر ہوں ۔

"دیکھا آپ نے ! کشمیر کی نازنین اپنے حسن کو کیسر کی شگفتگی سے کہیں بڑھ کر سمجھتی ہے ۔ اور سنئے ۔ کشمیری ماں کی لوری میں زعفران کا ذکر آیا ہے :-

ر چھو چرن برا نوزک باوو	اے میرے بچے ! تیرے پاؤں بہت ہی نازک ہیں ۔
ک پوش چھی مچی کران باوو	زعفران کے پھول تیرے نازک پاؤں کا بوسہ لے رہے ہیں ۔

ہاں ہاں ایک گیت میں پھول ہی چلا تھا ۔ شادی کے گیتوں کا ایک مشہور بند ہے :-

ن بوئے چھئی پر اشن	دولہے کی ماں تیرے انتظار میں کھڑی ہے ۔
کا نیری ماہرن کونگ پوش ترا ون ۔	اے دلہن ! زعفران کے پھول چھڑکتی ہوئی یہاں آجا ۔

کشمیر سے ہماری توجہ کو پنجاب میں آتے دیر نہ لگی۔

سوامی سدانند جی نے کہا ــــــ " بس ایک گیت پنجاب کا سنا دیجئے۔ اس کے بعد آج کی کارروائی ختم سمجھی جائے گی"۔

میں نے کہا ــــــ " لیجئے صاحب! پنجاب کا گیت بھی سن لیجئے۔ ایک لڑکی سسرال میں ہے۔ بے چاری کا ایک ہی بھائی ہے، ماں لقمۂ اجل بن چکی ہے۔ باپ نے دوسری شادی کر لی ہے۔ ادھر سسرال میں جب یہ لڑکی اپنی بدمذاق ساس کی جلی کٹی باتیں سنتی ہے تو اسے اپنے بچپن کے شیریں ایام کی یاد آتی ہے جب وہ مکمل آزادی کی گود میں کھیل سکتی تھی اپنے اندرونی جذبات اور حقیقی احساسات کو اس لڑکی نے گیت کی شکل دینے میں کمال کر دیا ہے۔ کرب و کوفت کی انتہائی حالت میں آنسو بہا بہا کر اس لڑکی نے اپنا زخمی دل پیش کیا ہے:۔

اُڈ جا چڑیے نی اُڈ بہہ جا کھڑکی	اے چڑیا! یہاں سے اُڑ جا اور سامنے کھڑکی میں بیٹھ جا۔
میری انبڑی باجھوں نی سب دیندے جھڑکی۔	میری ماں میرے پاس نہیں ہے، ہائے اُس کی غیر حاضری میں مجھے ہر کوئی جھڑک دیتا ہے۔
میرے بابل دِتڑی دُور سے!	آہ! ابا جان نے مجھے یہاں اس دُور دراز پردیس میں بیاہ دیا ہے۔
دُور سے وے سُن دھرمی ویرا!	اے میرے مہربان بھائی! میں اس پردیس میں آنسو بہاتی رہتی ہوں۔
پردیس بیٹھی جھور سے!	(مگر تجھ تک میری رسائی نہیں ہو سکتی!)

اُڈ جا چڑیے نی اُڈ بہہ جا چھت نی۔	اے چڑیا! یہاں سے اُڑ جا اور وہاں چھت پر بیٹھ جا۔
میری انبڑی باجھوں کون بھیجے خط نی۔	اب اِس دُنیا میں میری ماں نہیں ہے اُس کی غیر حاضری میں مجھے کوئی خط نہیں لکھتا!
میرے بابل دِتڑی دُور سے!	آہ! ابا جان نے مجھے اِس دور دراز پردیس میں بیاہ دیا ہے۔
دُور سے وے سُن دھرمی ویرا!	اے میرے مہربان بھائی! میں اس پردیس میں آنسو بہاتی رہتی ہوں۔
پردیس بیٹھی جھور سے!	(مگر تجھ تک میری رسائی نہیں ہو سکتی!)

اُڈ جا چڑیے نی اُڈ بہہ جا ریتے	اے چڑیا! یہاں سے اُڑ جا اور وہاں ریت پر بیٹھ جا۔
میری انبڑی باجھوں نی کون کردا چیتے!	اب اِس دُنیا میں میری ماں نہیں ہے، اُس کی غیر حاضری میں مجھے کوئی یاد تک نہیں کرتا۔
میرے بابل دِتڑی دُور سے!	آہ! ابا جان نے مجھے اِس دُور دراز پردیس میں بیاہ دیا ہے۔
دُور سے وے سُن دھرمی ویرا!	اے میرے مہربان بھائی! میں اس پردیس میں آنسو بہاتی رہتی ہوں

پردیس بیٹھی جھورے ! (مگر تجھ تک میری رسائی نہیں)

اُڈجا کاواں ! وے تیریاں لمّیاں چھاواں	اے کوّے ! یہاں سے اُڑجا - تیرا سایہ بہت لمبا ہے۔
مِن منتیاں دے جگ جیون ماواں	خدا کرے سوہیلی مائیں لقمۂ اجل بن جائیں اور اپنی مائیں ہزاروں سال تک زندہ رہیں۔
میرے بابل وِتّرڈی دُورے !	آہ ! ابّاجان نے مجھے اس دُور دراز پردیس میں بیاہ دیا ہے۔
دُورے دے سُن دھرمی ویرا !	اے میرے مہربان بھائی ! میں اس پردیس میں آنسو بہاتی رہتی ہوں۔
پردیس بیٹھی جھورے !	(مگر تجھ تک میری رسائی نہیں !)"

اِس کے بعد ہم سب دوست آشرم کی طرف لوٹ پڑے۔

اگلے دن گورودیو (شاعر ٹیگور) کے پاس بیٹھ کر بھی دیہاتی گیتوں کے متعلق تذکرہ کرنے کا موقع ملا - اُس کی شیریں یاد اپنی جگہ اور بھی روح پرور ہے۔

ہندوستان کے مختلف علاقوں کے دیہاتی گیتوں کی تلاش میں مجھے اکثر ایک مسافر کی مانند گھومنا پڑتا ہے۔ نئے نئے مقامات پر نئے نئے دوست ملتے ہیں - تقریباً ہر جگہ دیہاتی گیتوں کا تذکرہ کرنے کے موقعے ملتے ہیں مگر ہر جگہ شانتی نکیتن کی سی باذاق شخصیتیں نہیں ملا کرتیں۔ تبھی تو مجھے شانتی نکیتن کبھی نہیں بھُولتا - خاص کر دیہاتی گیتوں کے تذکرہ کی مندرجہ بالا محفل کے ہیرو پروفیسر ہزاری پرشاد دویدی کی یاد میں مجھے ایک خاص لطف آیا کرتا ہے ٭

دیو اندر ستیارتھی

محفلِ ادب

روگ کا راگ

اُنہیں جی سے میں کیسے بھلاؤں سکھی!
مرے جی کو جو آکے لُبھا ہی گئے
مرے من میں وہ پریم بسا ہی گئے
مجھے پریت کا روگ لگا ہی گئے
کئے میں نے ہزار ہزار جتن
کہ بچا رہے پریت کی آگ سے من
مرے من میں اُبھار کے اپنی لگن
وہ لگاؤ کی آگ لگا ہی گئے
بڑے سُکھ سے یہ بیتے تھے چودہ برس
کبھی میں نے چکھا نہ تھا پریم کا رس
مرے نیناں کو شیام دکھا کے درس
مرے ہردے میں چاہ بسا ہی گئے
کبھی سپنوں کی چھاؤں میں سوئی نہ تھی
کبھی بھُول کے دُکھ سے مَیں روئی نہ تھی
مجھے پریم کے سپنے دکھا ہی گئے
مجھے پریم کے دُکھ سے رُلا ہی گئے
رہے رات کی رات سدھار گئے
مجھے سپنا سمجھ کے بسار گئے
میں تھی ہار گلے سے اُتار گئے
مَیں دِیا تھی جسے وہ بجھا ہی گئے
سکھی! کوئلیں ساوُنی گائیں گی پھر
نئی کلیاں بھی چھاؤنی چھائیں گی پھر
مری چین کی راتیں نہ آئیں گی پھر
جنہیں نین کے نیر مٹا ہی گئے
مرے جی میں تھی بات چھپائے رکھوں
سکھی! چاہ کو من میں دبائے رکھوں
اُنہیں دیکھ کے آنسو جو آ ہی گئے
مری چاہ کا بھید وہ پا ہی گئے!

راجکماری بکاؤلی — روملی

عربی شاعری میں محبت کے سرچشمے

اہلِ عرب مختلف بادیہ نشین قبائل میں منقسم تھے اور خانہ بدوشوں کی طرح کسی چشمے یا سرسبز و شاداب چراگاہوں کی تلاش میں گھومتے رہتے تھے۔ ملک کی جغرافی حالت کا نقشہ مولانا حالی نے اپنے مسدس میں خوب ہی کھینچا ہے ۔

پہاڑ اور ٹیلے، سراب اور بیاباں   کھجوروں کے جھنڈ اور خارِ مغیلاں

عربوں کی شاعری اور صحرائی زندگی کی ساری دلچسپیاں آزاد معاشقہ کی مرہونِ منت ہیں۔ ایک چھوٹے سے قبیلے کی کائنات کیا تھی؛ ——— چند گھوڑے، گدھیاں، اکھٹے اور خانہ داری سے متعلق چند ضروری چیزیں۔ ہر ہر قبیلہ کا ایک رائد ہوا کرتا تھا جس کو ہم ہرکارہ یا خبر رساں کہہ سکتے ہیں۔ اس کے ذمے جو خدمت تھی وہ یہ کہ جب چشمہ کا پانی گھٹنے لگے تو گھوڑے پر سوار ہو دور دراز ریگستان میں نکل جائے اور کسی تالاب یا چشمہ کا پتا لگائے۔ اس کی اطلاع پر یہ چھوٹی سی دنیا اپنے تمام ساز و سامان کے ساتھ منتقل ہو جایا کرتی تھی۔ جرِ ثقیل کا موجد کہتا ہے کہ اگر مجھ کو اس کرۂ ارضی سے کہیں باہر مع اس آلہ کے پہنچا دو تو میرا دعویٰ ہے کہ اپنے اس آلہ کی مدد سے تمہاری دنیا کو اٹھا سکتا ہوں۔ اطلس کا بھی جو یونانی مجسمہ بنایا گیا ہے اس میں دنیا کو اس کی پیٹھ پر دکھایا گیا ہے اور الف لیلہ میں "الہ دین" کے محل کا انتقال بھی اسی خیال کی آئینہ بندی ہے۔ عرب کے یہ جاہلی شعراء ساری دنیا کو اپنے قبیلے میں سمیٹ لیتے تھے اور پھر انہی اجزا کو پھیلا کر کائنات کے ہر شعبے پر محیط کر دیتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا ایک قبیلہ کے خیمہ زن ہونے کے بعد ہی کوئی دوسرا قافلہ بھی فروکش ہو جاتا۔ دونوں کے خیمے اس سرسبز و شاداب چراگاہ پر چھا جاتے۔ ایک طرف چشمہ کا ابلتا ہوا پانی اردگرد "کھجوروں کے جھنڈ" اور ان کے سایہ میں ہری ہری گھانسیں۔ ان کے ہاں نہ تو پردے کا رواج تھا اور نہ سماجی زندگی کے موجودہ وہ معاشرتی قوانین جن کی بنیاد تکلفات پر قائم ہے۔ دونوں قبیلوں کے لڑکے اور لڑکیاں آپس میں بے تکلف ملتے تھے اور ان کی یہ پرخلوص ملاقاتیں رفتہ رفتہ ایک دوسرے کو موہ لیتی تھیں۔ ان کو نہ تو عرب کے علاوہ کسی اور دنیا کے صحیح حالات معلوم تھے اور نہ ان کی ترقیاں۔ ان کی دنیا بس وہی تھی جس کو وہ دیکھتے تھے۔ انہی میں رہ کر وہ تمام زمینی مسرت سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ یہ وہ عالم ہے جہاں اشیاء کی ماہیت سے ناواقفیت ہی بجائے خود ایک آسمانی نعمت اور برکت ہے اور جہاں دلیل کی روشنی ایک ناقابلِ بیان تاریکی یا ایک قابلِ نفریں حماقت۔

مشہور نقاد ابن رشیق بدوی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب کبھی کسی شاعر کا کسی عربی قبیلہ میں ورود ہوتا تو اس کی خبر پاتے ہی اور اور لوگ یہاں مجتمع ہو جاتے تھے اور اس کو وہ اپنی عین خوش قسمتی تصور کرتے تھے۔ دعوتیں ہوتی تھیں اور قبیلہ کی تمام عورتیں اس طرح گاتی بجاتی تھیں گویا کہ وہ شادی بیاہ کی خوشیاں منا رہی ہیں۔ چھوٹے بڑے ایک دوسرے کو مبارک بادیں دیتے پھرتے تھے ——— کیوں کہ ایک شاعر ان کی عزت کا نگہبان، ان کی شہرت کو برقرار رکھنے کا ایک آلہ کار، ان کے ناموں کو بلند کرنے والا اور ان کے شاندار کارناموں کو بقائے دوام بخشنے کا ذریعہ تھا۔ صرف تین موقعوں پر آپس میں اظہار مسرت کیا کرتے تھے:۔

(۱) کوئی لڑکا پیدا ہو۔

(۲) کوئی شاعر پہنچ جائے۔

(۳) کوئی گھوڑی بچھیرا جنے۔

جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے دونوں قبیلوں کا یہ اتفاقیہ اجتماع حسن و عشق کے لئے ایک رنگین اور پرکیف دنیا پیش کر دیتا تھا جس کی فضا میں یاس و حرماں کے لئے کوئی جگہ نہ ہوتی تھی۔ عربی خون کی مستغنا و بوندیں ہمیشہ کے لئے موجزن ہو جاتی تھیں۔ پھر جب پانی خشک ہونے لگتا تو یہ ناٹک بھی اختتام پر آجاتا اور وہ منظر بھی سامنے آجاتا ؎

"جب بہ تقریب سفر یار نے محمل باندھا"

ادھر تو یہ حال کہ دل میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی، ڈبڈبائی ہوئی گلابی آنکھیں اور اُن میں ایک حسرت و یاس کا پیغام۔ اُدھر محمل چل پڑتا۔ یعنی منقش چادر ہلنے لگتی، محمل کے پردے اُٹھ جاتے اور گوری گوری انگلیاں الوداعی سلام کے لئے اُٹھنے لگتیں اور ہم دیکھتے ہی دیکھتے ؎

"پس محمل نشینے صد غبارے"

"علی گڈھ میگزین"

اُردو میں آریائی اور سامی الفاظ کا تناسب

پروفیسر سلیم مرحوم نے فرہنگ آصفیہ کے حوالے سے اُردو میں مختلف زبانوں کے الفاظ کی حسب ذیل جدول پیش کی ہے:۔

فرہنگ آصفیہ میں الفاظ کی مجموعی تعداد ۵۴۰۰۹ ہے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

(۱) ہندی جس کے ساتھ پنجابی اور پوربی زبان کے بعض خاص الفاظ بھی شامل ہیں	۲۱۶۴۴
(۲) اُردو یعنی وہ الفاظ جو غیر زبانوں سے ہندی کے ساتھ مل کر بنے ہیں	۱۷۵۰۵
(۳) عربی	۷۵۸۴
(۴) فارسی	۶۰۴۱
(۵) سنسکرت	۵۵۴
(۶) انگریزی	۵۰۰
(۷) مختلف	۱۸۱
میزان کل	۵۴۰۰۹

یہ تفصیل ہر قسم کے شکوک کا نہایت آسانی سے ازالہ کر سکتی ہے۔ اس کے بعد یہ کہنا کہ اُردو ہندی نژاد نہیں ہے!

ہندوستان کی مشترک زبان بننے کی حق دار نہیں ہے یا اہلیت نہیں رکھتی لاعلمی اور ناانصافی ہے۔

"سہیل"

بگھی

جو تحائف سب سے پہلے انگریزی سفارت چین میں لے کر گئی اُن میں ایک بگھی بھی تھی۔ اور یہ شاہ جارج سوم کے ذاتی تحفے کے طور پر انتخاب کی گئی تھی۔ لیکن اس کے استعمال کا صحیح طریقہ پیکن والوں کے لئے ایک زبردست راز تھا۔ لارڈ میکارٹنے صدرِ سفارت نے کچھ غیر مکمل تشریح اس بارے میں کی بھی تھی، لیکن چونکہ یہ باتیں صدرِ سفارت نے رخصت ہوتے وقت برابر سرگوشیوں کے دوران میں کہہ دی تھیں، اس لئے دانشِ شاہی ان سے بہت کم منور ہوئی اور اشد ضرورت محسوس ہوئی کہ سلطنت کے اس نہایت اہم مسئلے کو سوچنے کے لئے کابینۂ چین کی کونسل بلائی جائے کہ بادشاہ سلامت بگھی پر کس جگہ بیٹھیں۔ کوچبان کی نشست پر جو کپڑا تھا وہ غیر معمولی طور پر بھڑک دار تھا۔ چنانچہ کچھ تو اس خیال سے اور کچھ اس وجہ سے کہ یہی جگہ گاڑی کی نشستوں میں سب سے بلند اور آگے ہے نیز چاند دیوتا کے بھی نزدیک ہے، متفقہ طور پر سب اس نتیجے پر پہنچے اور فیصلہ ہوا کہ کوکس ہی شاہی تخت ہے، اور بدنصیب کوچبان کے متعلق یہ قرار پایا کہ جس جگہ بھی اُسے کوئی ٹھکانا ملے بیٹھ جائے۔

بگھی میں گھوڑے جُت جانے کے بعد نہایت تمکنت اور وقار کے ساتھ ڈھولوں کے شور کے درمیان شاہِ چین اپنے نئے انگریزی تخت پر جلوہ فرما ہُوا۔ اس کے دائیں طرف وزیر خزانہ بیٹھا اور بائیں طرف شاہی مسخروں کا سردار۔ پیکن کے باشندے اس نظارے پر مسرور تھے اور اس تمام مجمع میں صرف ایک شخص غیر مطمئن تھا، اور وہ کوچبان تھا۔ یہ سرکش آدمی بڑی گستاخی سے چلّایا۔ "میں کس جگہ بیٹھوں؟" لیکن ممبران پریوی کونسل نے اس کی اس گستاخانہ چیخ پکار پر بگھی کا دروازہ کھولا اور اسے ٹھوکریں مار کر اندر دھکیل دیا۔ کوچبان کے پاس اگرچہ اندر کی تمام جگہ تھی۔ لیکن لالچ بُری بلا ہے۔ وہ اب بھی غیر مطمئن تھا: "میں کہتا ہوں" اس نے فی البدیہہ فریاد کرتے ہوئے چیخنا شروع کیا اور کھڑکی سے سر نکال کر شاہنشاہ سے مخاطب ہُوا۔ "میں کہتا ہوں، میں گھوڑوں کی باگیں کس طرح پکڑوں؟" بادشاہ نے کہا "کسی طرح پکڑو، چھوکرے مگر ہماری اس شان و شوکت میں خلل اندازی مت کرو۔ خواہ کھڑکیوں میں سے پکڑو، خواہ چابیوں کے سوراخوں میں سے، ہمیں اس سے کچھ سروکار نہیں"۔ آخر کار اس ضدی کوچبان نے اُس رسی کو جسے کھینچ کر کوچبان کو ٹھہرنے کا اشارہ کیا جاتا ہے باگوں کے ساتھ باندھ دیا اور گاڑی کو اس تیزی سے چلایا، جس کی اہلِ پیکن کو کوئی اُمید نہ تھی۔ شاہنشاہ ایک مختصر سا چکر لگا کر واپس ہُوا اور نہایت جاہ و حشم کے ساتھ اور ایک مصمم ارادے کے ساتھ کہ پھر کبھی اس پر سوار نہ ہوگا "تخت" سے اُترا۔ عوام کو حکم دیا گیا کہ وہ اس گردن توڑ مرض سے بادشاہ کے بال بال بچنے پر شکرانے کی نماز ادا کریں اور شاہی بگھی فو نا دیوتا کو جس کا ملفوظ طبقہ علما کے نزدیک فی فی ہے بھینٹ چڑھا دی گئی۔

"سلیم" (ادبی دنیا)

بھکاری کی صدا

بات نہ پُوچھے بابا کوئی دَر دَر دی آواز — کیوں بجتا ہے اب بھی پاپی یہ جیون کا ساز
طوفاں سر پر رات اندھیری، ہر دم اک منجدھار — میرا پیالہ ننّا ہے اور قسمت کھیون ہار
بات نہ پوچھے بابا کوئی

یہ گرد تاروں کے ہمسایہ، یہ اونچے استھان — یاں مانگے پہ بھی ملتا ہے کب بھکشو کو دان
جس کو دیکھو داتا ہے اور سب داتا ہیں چور — اس نگری میں سب کو پایا پکّا لال کٹھور
بات نہ پوچھے بابا کوئی

چاند ستارے لعنت بھیجیں سُورج دے دھتکار — بیٹھے بیٹھے دھیان میں مجھ کو دھکّے دے سنسار
مایا بن جیون ہے جگ میں جیون کا اُپمان — مایا ہی جنجال ہے بابا مایا ہی نروان
بات نہ پوچھے بابا کوئی

بھیک بھکاری دان اور داتا سب کو پرے جان — پریم بھکاری کب رکھتے ہیں بھکشا پر ایمان
آس یہ ہے وہ چھم چھم کرتی کوٹھوں دوڑی آئے — اُوپر سے اِک آنسو ٹپکے اور پیالہ بھر جائے

(ساغر نظامی) — "ایشیا"

مطبوعات

بادۂ مشرق۔ حصہ اول جلد اول حجم ۵۰۰ صفحات۔ حضرت ساغر کی شاعرانہ شہرت اور مقبولیت اب تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ ایک سچے ہندوستانی شاعر ہیں اور ان کے نغمے جوشِ شباب ترنم اور فطرت پرستی کے آئینہ دار ہیں۔ کتاب جس اہتمام سے شائع ہوئی ہے وہ شاید ہی اُردو کے کسی شاعر کو پہلے میسر ہوا ہو۔ اس کی نفیس جلد، اس کا کاغذ کتابت وطباعت اور اس کی خوبصورت نقاشی اور نقاوید نہ صرف ساغر کے مذاقِ سلیم کی گواہ ہیں بلکہ اُن گراں قدر مصارف کا اندازہ بھی دلاتی ہیں جن کے کفیل نواب سر سالار جنگ اور متعدد دوسرے اُمرا ہوئے ہیں۔ دیباچہ نگاروں میں مولوی عبدالحق صاحب، مسز سروجنی نائڈو، خواجہ حسن نظامی اور ڈاکٹر سید محمود شامل ہیں۔ اُردو کا کوئی کتب خانہ اس کتاب سے خالی نہ رہنا چاہئے۔ قیمت اگرچہ درج نہیں لیکن پانچ روپے سے کم کیا ہوگی پھر بھی یہ کتاب سستی ہے۔ پتا:۔ ادبی مرکز میرٹھ۔

مکتبہ جامعہ کی جدید کتابیں :۔

(۱) **الفرت کا بیج**۔ ایک دلچسپ ڈراما از جناب اشتیاق حسین صاحب قریشی۔ قیمت ۸ر

(۲) **تسخیر یاس**۔ جناب یاس ٹونکی کی چند ابتدائی غزلوں کا مجموعہ مع دیباچہ۔

(۳) **کلامِ جوہر**۔ مولانا محمد علی مرحوم کا کلامِ دلپذیر۔ قیمت ۸ر

(۴) **کسان**۔ اس کے افلاس کے اسباب اور ان کا علاج مصنفہ چودھری مختار سنگھ ایم۔ ایل۔ اے۔ ایم۔ ایل۔ سی۔ قیمت مجلد ۱۲ر

(۵) **جاپان**۔ مصنفہ مسٹر چمن لال مترجمہ محمود علی صاحب جامعی۔ جاپان کے متعلق ایک جامع کتاب۔ غیر مجلد ۱۲ر۔ مجلد عمر۔

یہ تمام کتابیں پڑھنے کے قابل ہیں۔ مکتبہ جامعہ دہلی سے منگائیے۔

رفیقِ نسواں۔ ڈاکٹر حافظ محمد بشیر ساکن چوک فرید امرت سر نے جو کتابیں صحت کے متعلق مرتب کی ہیں اُن میں یہ سب سے زیادہ مستند کتاب ہے۔ یہ فی الحقیقت دایہ، زچہ اور بچہ کے متعلق رہنما کا کام دے سکتی ہے۔ اس کی قیمت دو روپے ہے۔

اُن کی اور کتابیں جو ریویو کے لئے موصول ہوئی ہیں حسب ذیل ہیں :۔

کلیدِ صحت۔ قیمت حصہ اول ۲ر، حصہ دوم ۵ر

تپ دِق یا سِل۔ ۲۰۰ صفحات۔ قیمت ۸ر

ہیضہ۔ ضخامت ۴۰ صفحات۔ قیمت ۴ر

سہیل: غالباً ۱۹۲۶ء میں یہ سہ ماہی رسالہ علی گڑھ سے جاری ہؤا تھا اور ۱۹۲۷ء کے وسط میں بند ہو گیا۔ ہمیں مسرت ہے کہ پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی اور پروفیسر آل احمد صاحب سرور نے جو علی گڑھ کی ادبی زندگی کے روح و رواں ہیں۔ اسے دوبارہ زندہ کرنے کی ٹھانی ہے۔ پہلے یہ رسالہ سہ ماہی تھا اب سالنامے کی صورت میں شائع ہؤا کرے گا۔ اس وقت سالنامہ ۱۹۳۶ء ہمارے سامنے ہے جس کی ظاہری و معنوی حیثیت حسنِ مذاق اور بلندیٔ معیار کے اعتبار سے یکساں دلکش ہے۔ اس کی تقطیع "ہمایوں" کے برابر ہے اور حجم ۴۰۰ صفحات کے قریب۔ سرورق سادہ اور خوبصورت ہے۔ بیشتر تصاویر فنی حیثیت سے بہت قابلِ قدر ہیں۔ رسالے میں نظموں افسانوں اور ڈراموں کے پہلو بہ پہلو بلند پایہ علمی و تنقیدی مضامین بھی ہیں جن میں سے بعض عنوانات نمونے کے طور پر یہاں درج کئے ہیں تاکہ رسالے کی علمی و ادبی حیثیت کا اندازہ ہو سکے :۔ مصوری کے میلانات نو۔ اناطول فرانس کا فلسفۂ زندگی تعلیم اور اسلامی معاشرت۔ نظم نگاری کی اہمیت۔ اردو اور اس کے تاریخی ماخذ۔ غزل گوئی پر ایک نظر۔ مضطر خیر آبادی۔ بہار اور اردو شاعری۔ حافظ کے کلام میں کلام۔ حالی ایک محبِ وطن کی حیثیت سے۔ وغیرہ۔ سالنامے کی قیمت تین روپے مع محصول ہے جو اس کی خوبیوں کے مقابلے میں زیادہ نہیں۔

پتا :۔ دفتر سہیل انجمن اردوئے معلیٰ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

سراج۔ یہ ہفتہ وار اخبار بمبئی سے جاری ہؤا ہے اس میں سیاسی اور تاریخی مضامین مزاحیہ مقالے اور نظمیں شائع ہوتی ہیں۔ معیار کے اعتبار سے قابلِ قدر ہے۔ تصویریں بھی چھپتی ہیں قیمت فی پرچہ ایک آنہ ہے۔ مینیجر سراج بمبئی سے نمونہ منگا کر دیکھئے۔

اجتماع۔ یہ سیاسی، مذہبی، تاریخی اور ادبی ہفتہ وار اخبار مسٹر ہلال احمد زبیری ایم۔ اے نے دہلی سے شائع کیا۔ اُردو میں اس قسم کے بلند پایہ اخبارات کی کمی ہے۔ اُمید ہے کہ اہلِ ملک قدر کریں گے۔ پتا : دفتر اخبار اجتماع دہلی۔

شاہجہاں کا سالگرہ نمبر۔ دہلی کا یہ رسالہ جو مسٹر دمی اشرف کی ادارت میں نہایت کامیابی سے جاری ہے زیادہ تر ادب و افسانہ کے لئے مخصوص ہے اور اپنے فرائض کو بہت خوش اسلوبی سے انجام دے رہا ہے۔ اس رسالے کا چندہ صرف ۴؍ مع محصول ہے۔ سالنامے میں تصویریں بھی ہیں اور اس کی قیمت ۸؍ رہے۔ حجم ۷۰ صفحے۔ پتا :۔ دفتر شاہجہان دہلی۔

سالنامۂ شاہکار۔ علامہ تاجور صاحب نے لاہور سے یہ بلند پایہ رسالہ ایک مدت سے جاری کر رکھا ہے۔ حال ہی میں مارچ اور اپریل کے پرچوں کی یک جا ترتیب سے ڈیڑھ سو صفحات پر "شاہکار" کا سالنامہ شائع ہؤا ہے۔ جو حسنِ ترتیب انتخابِ مضامین اور معیار کے اعتبار سے قابلِ تعریف ہے۔ قیمت ۱۲؍ ۔ دفتر "شاہکار" لاہور سے طلب فرمائیے۔

بادۂ مشرق

راجہ صاحب سے صبح کے وقت لارنس گارڈن میں جب ملنا ہوتا ہے تو وہ اکثر فارسی اُردو کے چند دلکش اشعار سُنا دیا کرتے ہیں۔
پچھلے روز اُن سے وہاں ملا تو انہوں نے بادۂ مشرق کا ذکر کیا اور بعض خیالات **کا اظہار کیا جو میری خواہش** پر انہوں نے قلمبند کر دیئے۔

ب

بادۂ مشرق جو ساغر نظامی کے کلام کا مجموعہ ہے کچھ دنوں سے میرے زیرِ مطالعہ ہے۔ اس وقت تک کوئی تبصرہ اس مجموعۂ نظم کا میری نظر سے نہیں گزرا۔ میں سخن گو تو مطلق نہیں مگر سخن سنج ہونے کا بھی مجھے دعوےٰ نہیں۔ بہرحال آپ کے کہنے کے بموجب میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہوں۔ زمانۂ حال کی شاعری گل و بلبل اور حسن و عشق کے مضامین تک ہی محدود نہیں ہے جن اعلےٰ خیالات کے تضمین پر آج کل کے بلند پایہ شاعروں نے جن میں سے ساغر نظامی کو صفِ اوّل میں شمار کرنا چاہیئے توجہ مبذول کی ہے انہیں پڑھ کر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میں چند الفاظ اس بارے میں لکھوں کہ فلاسفر میں اور ایسے شاعر میں جو فلسفیانہ مضامین پر کچھ لکھے کیا فرق ہے۔ فلاسفر ان حقائق کو جو وہ فلسفیانہ نظرِ تعمق سے معلوم کرتا ہے۔ سادہ الفاظ میں بیان کرتا ہے جن میں سوائے اس کے اور کوئی مقصود نہیں ہوتا کہ صریح الفاظ میں حقیقت کو بیان کیا جائے۔ وہ صرف و نحو کی قواعد ہی کا پابند ہوتا ہے اس کا مقصد جہاں تک الفاظ کے انتخاب اور بندش کا تعلق ہے صرف یہ ہوتا ہے کہ فعل فاعل اور مفعول سے جملہ فعلیہ اور مبتدا اور خبر سے جملہ اسمیہ بن جائے۔ شاعر جب فلسفیانہ مضامین پر طبع آزمائی کرتا ہے تو وہ الفاظ کو ایسا قالب دیتا ہے جن سے جذبات (بُرے یا بھلے) پیدا ہوں۔ فلاسفر کہے گا "العالم حادث"۔ شاعر کہے گا "سکون ایک تغیر کو ہے زمانے میں"۔ فلاسفر کا استدلال محض اس غرض سے ہوتا ہے کہ وہ حقائقِ معلوم و مسلّمہ کے ذریعے سے دیگر حقائق کو معلوم کرے۔ شاعر کا استدلال جذبات کے پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کا انتخابِ الفاظ اسی غرض کے تابع ہوتا ہے۔ استدلال میں اگر کوئی صنعت پیدا ہو تو اس سے اس کو کوئی سروکار نہیں۔ فلاسفر کہے گا کہ حلوائی کو شیرینی سے سیری پیدا ہو جاتی ہے اس لئے کہ وہ ہر وقت اس کے پاس موجود ہے۔ اس اصول کو وہ یوں بیان کرے گا کہ "کل مبذولاً مملولاً"۔ شاعر کی دلیل یہ ہو گی کہ ؎

نیفتد کار سازاں را بکس در کارِ خود حاجت — نخاریدن نہ باشد احتیاجے پشت ناخن را

ساغر صاحب نے اپنے کلام میں بہت اچھی طرح سے فلسفیانہ حقائق کو بیان کیا ہے اور ان حقائق کے بیان میں اعلےٰ درجہ کی بندشِ الفاظ سے کام لیا ہے۔ ساغر کا تاریخ دُنیا کا مطالعہ بہت وسیع معلوم ہوتا ہے۔ اُردو، ہندی اور فارسی زبان پر اُن کو اقتدارِ کامل ہے۔ تاریخی مضامین کے انتخاب میں ان کا نصب العین قوی ہے۔ آگرہ کے تاج پر انہوں نے کئی نظمیں لکھی ہیں جن میں سے تاج اور صبح کا ستارہ خاص طور پر قابلِ ملاحظہ ہیں۔ جمنا کی نظم میں سری کرشن کی زندگی کے حالات اور مہابھارت کے کل واقعات کو نہایت پُر اثر الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ایک نظم خاص سری کرشن پر بھی ہے۔

ماضیاتِ عالم پر چاند کا تبصرہ پڑھنے سے قوموں کے اُتار چڑھاؤ کی تصویر ذہن کے سامنے آجاتی ہے اور عبرت کا سبق دیتی ہے۔ وطنیت پر جو نظم لکھی گئی ہے وہ شاعر کے حبِ وطن کے جذبات کو نہایت خوبی سے بیان کرتی
پجارن کی نظم پڑھنے والوں کو یہ تمیز کرنا مشکل ہوگا کہ اس کے لکھنے والا اُردو شاعر ہے یا ہندی کوی۔

پرانے شاعروں میں مستزاد کا استعمال بہت کم تھا۔ مگر آج کل مستزاد کی توسیع نہ صرف ایرانی شاعروں میں ہو ہوئی ہے بلکہ ہندوستانی شاعروں میں بھی۔ ساغر صاحب نے اس کا استعمال بہت اچھی طرح سے کیا ہے۔ اور اکثر جگہ ہے۔ ساغر صاحب ابھی عنفوانِ شباب میں ہیں۔ بعض نکتہ چینوں کو ان کی تصریفات پر شاید کچھ اعتراض ہو لیکن اس اعتراض کو وقعت نہیں دیتا۔ تجدیدِ خیالات کے ساتھ تجدیدِ طرزِ اظہارِ خیالات وابستہ ہے۔ کچھ عرصہ کے ب جب ساغر صاحب کا کلام مستند کلام سمجھا جائے گا تو تصریفات گوارا ہو جائیں گی۔ اس مجموعۂ نظم کی ابھی خاطر خواہ اشا نہیں ہوئی ہے۔ اس مجموعہ کی ایک ارزاں ایڈیشن بھی نکلنی چاہیے جس میں طباعت کی وہ خوبیاں ضروری نہیں جو ا نسخہ میں ہیں جو میرے سامنے ہے۔

دُنیا اور ما فیہا کو جو اصحابِ نظرِ تعمق سے دیکھتے ہیں اور مذاقِ سخن بھی رکھتے ہیں انہیں یہ مجموعۂ نظم بالضر پسند آئے گا۔

نرندرا ناتھ

۱۸ مئی ۱۹۳۶ء

قواعد

۱۔ "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲۔ علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ۱ر کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتّر صفحے ماہوار اور سوا نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہئے۔
اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

۸۔ جواب طلب امور کے لئے ۱ر کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہئے۔

۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے چھ آنے ششماہی تین روپے (مع محصولڈاک) فی پرچہ ۸ر۔

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتا تحریر کیجئے۔

۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافے پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھئے۔

مینیجر رسالہ ہمایوں
۲۳۔ لارنس روڈ لاہور

Title and Pictures Printed at the Halftone Press, Ram Nagar, Lahore.

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

(غالب)

بیادگارِ علامہ فضیلۃ آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہُمایُوں

ایڈیٹر: بشیر احمد بی۔ اے (آکسن) بیرسٹرایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں ایم اے

فہرستِ مضامین

جلد (۳۰) — نمبر (۳)

"ہمایوں" بابت ماہِ ستمبر ۱۹۳۶ء

تصاویر:۔ (۱) مولانا محمد حسین ادیب مرحوم و مغفور (۲) جدید روس کی ایک کارکن لڑکی

چندہ سالانہ [illegible] — ششماہی [illegible] (مع محصول)

بزمِ ہمایوں

اس مہینے ہمیں اس اطلاع سے نہایت صدمہ پہنچا ہے کہ اُردو ادب کے قابل نقاد اور ہمایوں کے قابل مضمون نگار جناب مولانا محمد حسین صاحب ادیب ایم۔ اے۔ بی۔ ای۔ ڈی اس دارِ ناپائدار سے رحلت فرما گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

ایک مدت سے مولانائے مرحوم کا کوئی مضمون "ہمایوں" میں شائع نہ ہوا تھا اور کچھ دنوں سے ہمیں ان کی طرف سے کوئی خط بھی موصول نہ ہوا تھا [illegible] خطوط کا جواب بھی حیدر آباد دکن سے نہ ملا۔ آخری خط جب دکن سے واپس آ گیا تو ہم نے مولانائے مرحوم کو ان کے وطن آرہ کے پتے پر ایک خط لکھا جس میں ان کی خیریت کے متعلق بہت تشویش ظاہر کی۔ افسوس کہ ۲۲ اگست کو اس کے جواب میں احمد حسین صاحب نے ہمیں ان کے انتقال کی [illegible] خبر سنائی۔

مولانائے مرحوم نے اُردو میں صحیح اصولِ تنقید کا صحیح ذوق پیدا کرنے میں جو حصہ لیا وہ فراموش کرنے کے قابل نہیں۔ اردو کی بزم میں اُن کی جگہ بآسانی پُر نہیں ہو سکتی۔ افسوس کہ موت نے ایسے وقت میں ان کو ہم سے چھین لیا جب اردو زبان کو ان کی خدمات کی بے انتہا ضرورت تھی۔

شمع یہ سودائی دلسوزیِ پروانہ ہے　　　گیسوئے اُردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے

دو سال قبل مولانائے مرحوم نے راقم کے نام اپنے ایک خط میں اپنا مجموعۂ مضامین شائع کرنے کا ارادہ ظاہر فرمایا تھا۔ ہمیں مولانائے مرحوم کے عزیزوں سے توقع ہے کہ اب وہ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر اپنے اس فرض سے عہدہ برا ہونے کی کوشش کریں گے جو ان پر نہ صرف اپنے مرحوم عزیز کی طرف سے بلکہ اُردو ادب کی طرف سے بھی عائد ہوتا ہے۔

مولانا محمد حسین ادیب مرحوم و مغفور کا وطن آرہ ضلع شاہ آباد تھا جہاں وہ ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی اردو فارسی کی ابتدائی تعلیم پرانے دستور کے مطابق گھر پر ہوئی۔ سکول اور کالج میں اُن کا زمانۂ طالب علمی نہایت شاندار رہا۔ نصابی تعلیم کے علاوہ اُن کا بیشتر وقت عام مطالعہ میں گزرتا تھا۔ زمانۂ ملازمت میں بھی یہ شوق روز افزوں رہا چنانچہ ان کے ذاتی کتب خانے میں کتابوں کا ایک نایاب ذخیرہ ہے۔ تحریکِ ترکِ موالات کے زمانے میں مولانائے مرحوم گورنمنٹ کی ملازمت ترک کر کے حیدر آباد چلے گئے جہاں سر راس مسعود نے انہیں ایک گزیٹڈ عہدے پر فائز کیا۔

مرحوم ایک خاموش کام کرنے والے [illegible] علمی و فنی تحقیق کے علاوہ [illegible] اخلاقیات سے [illegible] شغف تھا۔ کثرتِ مطالعہ اور انتہائی محنت [illegible] چند سال سے اُن کی صحت [illegible] احمد حسین صاحب [illegible] مولانائے مرحوم [illegible]



مولانا محمد حسین ادیب مرحوم و مغفور



سوویت روس کی ایک کارکن

جہاں نما

سوویٹ روس میں عورتوں کی حیثیت

روس کی موجودہ حکومت دنیا کا سب سے بڑا سیاسی اور معاشری تجربہ ہے۔ زار کی حکومت کا تختہ اُلٹنے کے بعد سوویٹ حکومت کے زیر اثر معاشری انقلابات نے روس کی کایا بالکل پلٹ دی ہے۔ اس ضمن میں عورتوں کی سیاسی اور معاشری حیثیت میں جو انقلاب پیدا ہوا ہے وہ شاید اُس انقلاب سے بھی زیادہ اہم ہے جس نے مزدوروں کو سرمایہ داروں کے چنگل سے نجات دلائی ہے۔

یہ قول مبالغے سے بالکل پاک ہے کہ دنیا کے کسی ملک میں عورت رواجی یا قانونی حق تلفیوں سے اتنی کامل طور پر آزاد نہیں جتنی کہ روس میں ہے۔ عورتیں خانگی اور معاشری زندگی میں مردوں کی ہم مرتبہ ہیں اور انہیں ہر وہ ملازمت حاصل کرنے کا حق حاصل ہے جس کے لئے انہوں نے اہلیت پیدا کر لی ہو۔ ایک صاحب جو کچھ عرصہ قبل لنڈن یونیورسٹی سے ایک تعلیمی سیاحت کے لئے روس گئے تھے لکھتے ہیں کہ ماسکو میں ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ بیشمار عورتیں ڈاکٹر، انجنیئر، پروفیسر، ایڈیٹر، صناع اور جج وغیرہ کے عہدوں پر فائز ہیں۔ مقامی سوویٹوں میں (جیسے ہندوستان کے ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپل کمیٹیاں ہیں) عورتوں کو مردوں سے بھی زیادہ عہدے حاصل ہیں۔ تجارتی جہازوں میں، طیاروں میں اور ملکی معاملات میں عورتوں کو مصروفِ عمل دیکھ کر عجیب کیفیت نظر آتی ہے۔ ہر قسم کے تجارتی کاروبار میں عورتیں غیر معمولی طور پر مفید ثابت ہوئی ہیں۔ کپڑے کے کارخانوں میں عورتوں کو منیجر اور ڈائرکٹر تک کے عہدے حاصل ہیں۔ ہر بڑے کارخانے میں باورچی خانے اور بچوں کی پرورش گاہ کا انتظام بھی ہے چنانچہ عورتیں خانہ داری کی ذمہ داری سے آزاد ہیں۔

ریلوے اور آمد و رفت کے دیگر انتظامات میں عورتوں کو بہت دخل حاصل ہے۔ ماسکو میں بہت سی عورتوں کو سٹیشن ماسٹر اور ٹرین کنٹرولر کے عہدے حاصل ہیں۔ لنڈن میں کوئی ٹرام چلانے والی عورت نظر نہیں آتی لیکن ماسکو میں بہت سی ایسی عورتیں ہیں جو ٹرام [illegible] [illegible] تحقیق و تفتیش کا کام بھی زیادہ تر عورتوں کے سپرد ہے۔ میں نے ایک [illegible] تجربہ گاہ میں ایک ادھیڑ عمر کی عورت کو [illegible] جرائم کے متعلق تحقیقات کرتے [illegible] [illegible] سے بگڑے ہوئے دیکھا اس کے اردگرد اس کی ہم پیشہ [illegible] [illegible] کی ایک [illegible] [illegible] اس کے [illegible] [illegible] کے بچوں کی طرح [illegible] احترام [illegible] کے ساتھ اس کے [illegible]

[illegible]

کو حاصل ہیں۔ انہیں نئے معلموں کے تقرر اور نصاب تعلیم کے انتخاب پر پورا اختیار ہے۔ ناخواندگی کے استیصال کے لئے روس نے جو مہم شروع کررکھی ہے اس کی کارکن بھی عورتیں ہی ہیں اور اس سلسلے میں اُن کے تعلیمی حلقات سے روس کے رودیارڈ چھکے نظر آتے ہیں۔

شعبۂ قانون میں بھی عورتوں نے حیرت انگیز قابلیت کا ثبوت دیا ہے چنانچہ بیرسٹر عورتیں قانونی معاملات میں عوام کی بہت اچھی طرح رہنمائی کرتی ہیں۔

سینماؤں، لائبریریوں، عجائب خانوں، نمائش گاہوں، عام جلسوں وغیرہ میں بھی عورتوں کی کثرت ہوتی ہے۔

دوسرے مہذب ملکوں میں عورتوں کو فوج میں شامل ہونے کی اجازت نہیں لیکن روس میں عورتوں کو فوجی سپاہی بننے کی تعلیم دی جاتی ہے ۱۹۳۴ء میں بیس ہزار عورتوں کو فوجی ہوابازی اور چار لاکھ ساٹھ ہزار عورتوں کو مشین گن چلانے کا کام سکھایا گیا۔ بندوق چلانا تو ہر لڑکی کو سکھایا جاتا ہے۔

بچوں کی پیدائش، پرورش اور نگہداشت کے لئے جیسے اچھے ادارات روس میں ہیں دُنیا میں کہیں نہیں۔ حکومت کی طرف سے بچوں اور ماؤں کے آرام کے لئے ہر قسم کا اچھے سے اچھا انتظام موجود ہے۔ ان اداروں میں بہت تجربہ کار نرسیں ہوتی ہیں جو بچوں کو کھلاتی پلاتی نہلاتی اور کپڑے پہناتی ہیں، ان سب چیزوں کا انتظام حکومت کی طرف سے ہوتا ہے۔

سوویٹ روس میں نوجوان عورتوں کو بناؤ سنگھار اور عشقبازی کی فرصت نہیں "عشق کا دلیوتا" سلطنت کا دشمن سمجھا جاتا ہے۔ وہاں تو سب کو روس کی ترقی اور خوش حالی سے عشق ہے اور اس کے لئے چاروں کھونٹ کام! کام! کام! کا شور برپا ہے۔

بنگالی زبان کا ارتقاء

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بنگالی زبان کو ایشور چندر ودیا ساگر یا مادھو سدن دت نے فروغ دیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس زبان کی لسانی وسعت اور ادبی شوکت بنکم چندر چٹرجی کے ادبی ذوق کی رہین منت ہے جو بنگال کے ایک ناول نویس، مزاحیہ نگار، نقاد اور مفکر کی حیثیت سے غیر فانی شہرت حاصل کرچکا ہے۔ کہتے ہیں کہ بنکم چندر چٹرجی کے ناولوں نے بنگالیوں کی ذہنی اور معاشری زندگی میں ایک نمایاں تبدیلی پیدا کردی ہے۔ بنکم کی معاش کا انحصار اس کے ناولوں کی فروخت پر نہ تھا اگرچہ یہ تعلیم یافتہ حلقوں میں بڑے شوق سے پڑھے جاتے تھے۔ چنانچہ بہت سے لوگوں کو یہ معلوم کرکے حیرت ہوگی کہ بنکم ایک سرکاری عہدہ دار یعنی مجسٹریٹ تھا۔ لیکن سرکاری فرائض کی بجا آوری کے باوجود اس نے صبح اور شام کے اوقات ادبی مشاغل کے لئے وقف کر رکھے تھے۔ انہیں محدود اوقات میں اس نے اپنے دماغی افکار کو اپنے ہم وطنوں کے سامنے ایسے خوشنما اور دلاویز انداز میں پیش کیا کہ وہ فطرت انسانی کا ایک باکمال مصور سمجھا جانے لگا بنگال میں ایسے شاعروں کی کمی نہیں جن کی شاعری نے عوام کے دلوں میں حب وطن کا جذبہ پیدا کیا اور گو بنکم بہت بڑا شاعر نہ تھا لیکن "بندے ماترم" کا مشہور اور مقبول گیت جو ہندوستان کی قومی مجالس میں نہایت حمیت سے پڑھا جاتا ہے اسی کا ادبی شاہکار ہے

بنکم اپنے زمانے کا بہت بڑا انشا پرداز تھا۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کا اس نے ایک دلکش اور دلنشیں پیرایہ میں صحیح مرقع کھینچا ہو۔ اس کی تحریر انسانی جذبات وحسیات کی آئینہ دار تھی، وہ متانت ظرافت رنج اور خوشی کے مختلف پہلوؤں کو نہایت قابلیت سے نمایاں کرتا تھا۔ بنگالی زبان پر اس کو اس قدر قدرت حاصل تھی کہ کوئی شخص اس وقت تک نثر نگاری میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکا۔ اس کی تصانیف میں "چندر شیکھر" اور "کرشن کانت کی وصیت" بنگالی ادب کے اعلیٰ ترین شاہکار ہیں ؎

لندن یونیورسٹی کا صد سالہ جشنِ مسرت

اس سال ۲۹ر جون ۱۹۳۶ء سے ۳ جولائی ۱۹۳۶ء تک لندن یونیورسٹی کا صد سالہ جشنِ مسرت منایا گیا۔ لندن یونیورسٹی کو سو سال قبل انگلستان کے بادشاہ ولیم چہارم نے چارٹر عطا کیا تھا۔ علمی دُنیا کے اس اہم واقعہ کی یادگار منانے کے لئے ایک خاص جلسہ منعقد کیا گیا جس میں تمام دنیا کی یونیورسٹیوں کے نمائندے شامل ہوئے۔ اس تقریب پر بہت سے فضلاء کو اعزازی ڈگریاں دی گئیں۔ یہ اجتماع جس میں مختلف ممالک کے نمائندے سیاہ، زرد، سُرخ، نیلے اور سبز رنگ کے گاؤن پہنے نظر آتے تھے نہایت دلکش منظر پیش کرتا تھا۔

لندن یونیورسٹی کے قیام کی تجویز بنتھم نے پیش کی تھی۔ یورپ کے اکثر بڑے بڑے شہروں میں اس سے پہلے ہی یونیورسٹیاں قائم ہو چکی تھیں۔

اس زمانہ میں مذہبی رقابت کا دَور دَورہ تھا۔ چنانچہ اس کی بدولت علوم وفنون کی تحریک کو بھی تقویت پہنچی۔ جب وِگ جماعت (Whigs) کے نمائندوں نے یونیورسٹی کالج کا افتتاح کرتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ اس میں ہر شخص داخل ہو سکتا ہے خواہ وہ کلیسائے انگلستان کا پیرو ہو یا نہ ہو تو کلیسائے انگلستان نے اس اعلان کو اپنے لئے ایک تہدید قرار دیا۔ چنانچہ ٹوری جماعت (Tories) نے ڈیوک آف ولنگٹن کی قیادت میں کنگز کالج قائم کرنے کے لئے سرمایہ فراہم کیا۔ تاکہ اس کالج میں تعلیم کے دیگر شعبوں کے ساتھ کلیسائے انگلستان کے مقرر کردہ نصاب کے مطابق مذہبی تعلیم کا انتظام بھی ہو۔ ان دونوں تعلیمی اداروں نے جو ایک دوسرے کے حریف تھے اپنا کام تو شروع کر دیا، لیکن طلبہ کو چار یا پانچ سال تک کوئی ڈگری نہ ملی۔ آخر نومبر ۱۸۳۶ء میں شاہی چارٹر سے لندن یونیورسٹی قائم کی گئی، جسے یونیورسٹی کالج، کنگز کالج، اور دیگر درسگاہوں کے طلبہ کا امتحان لینے اور انہیں ڈگری دینے کے اختیارات دیئے گئے۔ یہ درسگاہیں لندن کے تمام اطراف میں مختلف عمارتوں میں واقع ہیں۔ لیکن لندن یونیورسٹی کی اپنی کوئی خاص عمارت نہ تھی۔ آخر جب ۱۹۲۷ء میں راک فیلر نے یونیورسٹی کی امداد کے لئے چار لاکھ پاؤنڈ کی رقم بطور عطیہ دی تو اس کی مدد سے ۱۱½ ایکڑ زمین خرید لی گئی۔ اس قطعہ میں جو "برٹش میوزیم" کے پیچھے واقع ہے شاندار عمارتیں تیار ہو رہی ہیں۔ لندن یونیورسٹی کی صد سالہ یادگار کے بعد جلد ہی ان عمارات کا ایک حصہ یونیورسٹی کے استعمال کے لئے تیار ہو جائے گا ؎

ہندوستان کا نیا آئینِ حکومت

حکومت کرتے ہوئے تقریباً ایک صدی گزر چکی ہے لیکن خود روشن خیال اور منصف مزاج انگریزوں کا قول ہے کہ ابھی انگلستان کی طرف سے ہندوستانیوں کے متعلق سچے اعتماد و تعاون کی خفیف سے خفیف جھلک بھی نظر نہیں آئی۔ اس میں شک نہیں کہ جدید اصلاحات کی بعض دفعات بظاہر بہت دلآویز ہیں اور یہ گمان ہوتا ہے کہ ہندوستانی اپنے اندرونی معاملات میں اب پہلے سے زیادہ مختار ہوں گے لیکن اگر جدید آئینِ حکومت کی دفعات پر ایک غائر نظر ڈالی جائے تو ہم بہت جلد اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ جو نام نہاد آزادی یا خود مختاری ہمیں دی گئی ہے وہ سراب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ ہندوستانیوں کے حقوق کے مقابلہ میں برطانوی مفاد کی حفاظت کا نہایت اہتمام سے خیال رکھا گیا ہے۔ حکومت کے آئین میں ایک جملہ بھی ایسا نہیں جس میں ہم کو اس امر کے متعلق وعدہ یا تسلی دی گئی ہو کہ ہم ایک ہزار سال میں بھی کامل خود مختاری یا سلطنت برطانیہ کے اندر درجۂ مستعمرات حاصل کرنے کے مستحق قرار دیئے جائیں گے۔ حکومت انگلستان نے مبہم پیرایہ میں البتہ اہلِ ہند کو زمانۂ مستقبل میں کچھ نہ کچھ دینے کی اُمید دلائی ہے لیکن اس مستقبل کا نہ مبتدا ہے نہ منتہا۔ یہ "کچھ نہ کچھ" کیا ہوگا اس کا صحیح جواب ہندوستان کے ماہرینِ سیاست ہی دے سکتے ہیں ہمیں محض اتنا معلوم ہے کہ ہندوستان کا مستقبل کلیتہً انگریزوں کے ہاتھ میں ہے۔ مسٹر ایس کے لاہری اپنی نئی کتاب "ہندوستان کا آئینِ جدید" میں لکھتے ہیں:۔

ا۔ ہندوستان کے نئے آئین میں شخصی حقوق کے تحفظ کے متعلق کوئی ایسی دفعہ نہیں جو حکومت کے مقابلے میں پیش کی جاسکے حکومت جس شخص کو چاہے گرفتار کرسکتی ہے اور مقدمہ کی سماعت کے بغیر جس قدر عرصہ تک چاہے، اسے قید رکھ سکتی ہے۔

ب۔ آئینِ حکومت میں آئندہ برطانوی دارالعوام کے منشار کے بغیر کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ ہندوستان کو اس معاملہ میں کوئی اختیار نہیں دیا گیا۔

ج۔ فوج اور پولیس کی جمعیت پر انگریزوں کو پورا اقتدار حاصل رہے گا۔ ہندوستان اپنی مرضی سے ایک سپاہی یا ایک کانسٹبل بھی نہیں رکھ سکتا۔

د۔ ہندوستان کے خارجی معاملات کی باگ بالکل انگریزوں کے ہاتھ میں ہوگی۔

ہ۔ ہندوستان کے قومی مالیات پر انگریزوں کی نگرانی ہوگی۔ ملک کی آمدنی میں سے خواہ وہ ٹیکس کی ہو یا دیگر محاصلِ عامہ کی ہندوستانی انگریز حکام کی مرضی کے بغیر ایک روپیہ بھی خرچ کرنے کے مجاز نہیں۔

و۔ جدید آئین کے رو سے ہندوستان کے لئے وائسرائے ایک مطلق العنان بادشاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ جس قانون کو چاہے اور جب چاہے اپنے خاص اختیارات سے حرفِ غلط کی طرح مٹا سکتا ہے۔ وہ ہندوستان کے بیس کروڑ باشندوں کی شدید مخالفت یا احتجاج کے باوجود جو قانون چاہے نافذ کرسکتا ہے۔ ہندوستان کے کئی گذشتہ وائسرائے آرڈیننسوں کی شکل میں بارہا اپنی مطلق العنانی کا مظاہرہ کرچکے ہیں۔ جدید آئینِ حکومت میں وائسرائے کو اور زیادہ اختیارات دے دیئے گئے ہیں اور وہ عملاً ہندوستان کے سیاہ

ہ کا مالک ہوگا۔

چین کی مجاہد عورتیں

چین کی تحریک آزادی میں عورتوں نے جس حیرت انگیز جدوجہد اور استقلال کا عملی ثبوت دیا ہے اس کی تفصیل بجائے خود ایک دلچسپ ق آموز داستان ہے۔ آج سے بیس برس پہلے عورتیں عام طور پر چینی سوسائٹی میں حقیر اور ناکارہ سمجھی جاتی تھیں۔ لیکن جب چین کے خلاف ن کی غاصبانہ روش اور چینیوں کی خانہ جنگی کے تباہ کن نتائج نے ملک میں بیداری کی ایک زبردست لہر پیدا کر دی تو مردوں کے ساتھ ں نے بھی تحریک آزادی میں نمایاں حصہ لیا۔ ۹ دسمبر ۱۹۳۵ء میں چین کی دو لڑکیوں نے ایک زبردست جلوس کی قیادت کے ض انجام دیئے۔ انہوں نے چینی اور انگریزی زبان میں گلیوں اور بازاروں میں لوگوں کو تحریکِ آزادی کے اغراض و مقاصد سمجھائے۔ تحریک مخالفین یعنی حکام نے کوڑوں اور تلواروں کی طاقت سے چینی طالب علم لڑکیوں کی زبان بند کرنی چاہی مگر ان جانباز لڑکیوں پر جو آزادی کے میں سرشار تھیں کوئی دھمکی کارگر نہ ہوئی۔ وہ بڑے بڑے جلسوں میں سامعین سے بذریعہ میگافون خطاب کرتی تھیں۔ پیپنگ کے دو ہروں میں پولیس نے بہت سی لڑکیوں کو گرفتار کر لیا۔ انہیں سرِ بازار بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا اور وحشیانہ طریقہ سے انہیں مار پیٹا۔ یس کی اس سفاکانہ مارپیٹ میں کئی لڑکیوں کے بال ان کے سروں سے اکھڑ گئے۔ مگر ان اولوالعزم جانبازوں نے اُف تک نہ کی۔ جب پولیس نے غضبناک لہجہ میں ان سے پوچھا کہ کیا تم پھر شرارت کرو گی؟" تو سب نے ایک دل اور ایک آواز کے ساتھ یہ جواب دیا کہ ں ہماری اس شرارت کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک ہمارے سر قلم نہ کر دیئے جائیں گے۔" آزادی کی تحریک میں ین کی کسان عورتیں اور کارخانوں میں کام کرنے والی عورتیں بھی شامل ہو گئی ہیں۔

ہالی وُڈ میں حُسن کی قیمت

ہالی وُڈ میں جہاں امریکا کے فلم سٹار رہتے ہیں حسین بننے اور حسین نظر آنے کے مصارف نہایت گراں قدر ہیں۔ ہالی وڈ ے ایک حسن خانے کے ناظم نے بتایا ہے کہ ایک عام فلم ایکٹرس قیامِ حُسن کے لئے پانچ پاؤنڈ فی ہفتہ سے لے کر گیارہ پاؤنڈ فی ہفتہ ک صرف کرتی ہے۔ اکثر ایکٹرسیں ہفتہ میں تین مرتبہ چہرے کی مالش کراتی ہیں۔ ان مالشوں کی اُجرت فی بار سات شلنگ ادا کی جاتی ہے اگر کریم انگلستان یا فرانس سے منگوائی جائے تو قیمت دگنی لی جاتی ہے۔ اسی طرح بالوں کو لہردار بنانے، پلکوں کو نوکیلا کرنے ابرو قلم لگانے، سر کی مالش اور مصنوعی ناخن وغیرہ لگانے کے لئے اس سے کچھ زیادہ یا کم اُجرتیں مقرر ہیں۔ اندازہ یہ ہے کہ ہالی وڈ کی مشہور ایکٹرسیں کم از کم پانسو پاؤنڈ سالانہ اپنے حُسن کی قیمت ادا کرتی ہیں۔

طیورِ آوارہ

موت میں کئی ایک ہو جاتے ہیں زندگی میں ایک کئی بن جاتا ہے جب خدا جاتا رہے گا تو صرف ایک ہی مذہب رہ جائے گا۔

نقاش قدرت کا شیدائی ہے اِس لئے وہ اُس کا غلام بھی ہے اور آقا بھی۔

"اے پھل! تُو مجھ سے کتنی دُور ہے؟" "اے پھول! میں تیرے دِل میں مستور ہوں"

یہ بیکلی اس ہستی کے لئے ہے جس کا احساس تاریکی میں کیا جاتا ہے لیکن جو دن کے وقت نظروں سے غائب رہتی ہے۔

شبنم کے قطرے نے جھیل سے کہا "تُو ایک بڑا قطرہ ہے کنول کے پتے کے نیچے، میں ایک چھوٹا قطرہ ہوں اُس کے اُوپر"

قبضہ کُند ہے لیکن خوش ہے کہ وہ تلوار کی دھار کا محافظ ہے۔

تاریکی میں وحدت یکساں نظر آتی ہے روشنی میں وہ کثرت ہو جاتی ہے۔

وسیع زمین سبزے کی اعانت سے مہماں نواز بن جاتی ہے۔

پتیوں کی پیدائش و موت اُس گرداب کے سریع السیر پیچ و تاب ہیں جس کے بڑے دائرے آہستگی کے ساتھ ستاروں میں گردش کیا کرتے ہیں۔

قوت نے دنیا سے کہا "تو میری ہے" دنیا نے اُسے اپنے تخت پر مقید کر دیا۔ محبت نے دنیا سے کہا "میں تیری ہوں" دنیا نے اُسے اپنے گھر کی آزادی بخش دی۔

کُہر بھی گویا زمین کی تمنا ہے، وہ آفتاب کو چھپا لیتی ہے جس کے لئے زمین بیقرار ہے۔

اے میرے دل! خاموش ہو! یہ اونچے اونچے درخت زمین کی دُعائیں ہیں۔

ہنگامی شورش جاودانی موسیقی کی ہنسی اُڑاتی ہے۔

جب میں اُن گئے گزرے وقتوں کو یاد کرتا ہوں جو کبھی زیست اور محبت اور موت کی ندی پر اپنی مستی میں بہتے تھے اور اب ایسے ہوئے ہیں کہ گویا تھے ہی نہیں تو میں اِس دُنیا سے گزر جانے کی آزادی کو اپنے دل میں محسوس کرنے لگتا ہوں اور مطمئن ہو جاتا ہوں۔

میری رُوح کی غمگینی اُس کا نقابِ عروسی ہے۔ وہ منتظر ہے کہ رات آئے اور یہ پردہ اُٹھ جائے۔

موت کی ضرب زندگی کے سکّے کو بیش بہا بنا دیتی ہے۔ پھر اس سے وہ کچھ خریدا جا سکتا ہے جو فی الحقیقت انمول ہے۔

بادل کا ٹکڑا آسمان کے ایک گوشے میں عجز کے ساتھ قائم تھا۔
صبح نے آکر اُسے اپنا سنہری تاج پہنا دیا۔

گرد کی توہین ہوتی ہے اور وہ جواب میں پھول دیتی ہے۔

پھولوں کو چننے اور رکھ چھوڑنے کے لئے اِدھر اُدھر نہ ٹھہرو بلکہ گشت کئے جاؤ کہ پھول تمہاری راہ میں آپ سے آپ شگفتہ رہیں گے۔

جڑیں شاخیں ہیں زمین کے نیچے پھیلی ہوئی
شاخیں جڑیں ہیں ہوا میں بکھری ہوئی

دور دراز بہار کی موسیقی فصلِ خزاں کے گرد اپنے پر پھڑپھڑاتی ہے اور اپنے دیرینہ نشیمن کو ڈھونڈتی پھرتی ہے۔

اپنی جیب سے خوبیاں اُدھار دے کر اپنے دوست کی توہین نہ کرو۔

گمنام دنوں کا مس میرے دل سے اسی طرح لپٹا ہوا ہے جیسے کسی پُرانے درخت سے کائی۔

گونج اصل آواز پر پھبتی اُڑاتی ہے یہ یقین دلانے کے لئے کہ اصلی وہی ہے۔

جب کوئی مرفہ الحال خدا کی خاص رعایت پر فخر کرتا ہے تو خدا شرما جاتا ہے۔

میرا سایہ میرے ہی رستے پر پڑتا ہے کیونکہ میں نے اُس شمع کو روشن نہیں کیا جو میرے پہلو میں موجود ہے۔

انسان ہجوم کے اندر اپنی خاموشی کی بلند آوازوں کو گم کرنے کی غرض سے جاتا ہے۔

وہ جو اضمحلال میں ختم ہو جائے موت ہے لیکن مکمل اختتام تو صرف اُس کے اندر ہے جس کا انجام کوئی نہیں۔

سورج روشنی کی سادہ قبا رکھتا ہے۔ بادل شوخی و رنگینی سے مزین ہیں۔

پہاڑیاں گویا اُن بچوں کی چیخیں ہیں جو اپنی باہیں پھیلا کر ستاروں کو پکڑ لینا چاہتے ہوں۔

رستہ اپنی بھیڑ میں بھی تنہا رہتا ہے۔
کیونکہ کسی کو اس سے محبت نہیں۔

گرنے والی زرد پتیاں اور گزر جانے والی بدلیاں اُس قوت کا مضحکہ اُڑاتی ہیں جو اپنی منہ زور سانسوں پر فخر کرتی ہے۔

آج روزِ روشن میں زمین ایک چرخہ کاتنے والی عورت کی مانند میرے سامنے کسی ایک فراموش کردہ زبان میں زمانۂ قدیم کا گیت گنگنا رہی ہے۔

سبزہ اُسی دُنیائے پاک کے شایاں ہے جہاں وہ نشو و نما پاتا ہے۔

خواب ایک باتونی زوجہ ہے۔ نیند ایک شوہر ہے جو خاموشی کے ساتھ زحمت اُٹھا رہا ہے۔

رات مُرجھائے ہوئے دن کو بوسہ دے کر اُس سے یوں سرگوشی کرتی ہے کہ "میں ہوں موت، تیری ماں۔ میں تجھے اِک نیا جنم دوں گی۔"

اے اندھیری رات! میں تیری خوبصورتی کو اسی طرح محسوس کرتا ہوں جیسے ایک محبوبہ کے حسن کو جب وہ شمع گُل کر دے۔

میری کامران دُنیا ناکام دنیاؤں کو اپنے اندر پنہاں رکھتی ہے۔

پیارے دوست! جب میں ان لہروں کے شیریں نغمے سُنتا ہوں تو میں تیرے اُن عمیق خیالات کی خاموشی کا احساس کرنے لگتا ہوں جو اکثر شام کے دھندلکے میں اس ساحل پر تُو نے میرے گوش گزار کیے۔

پرندہ اسے اِک لطیف خدمت سمجھتا ہے کہ وہ مچھلیوں کو ہوا کی سیر کرائے۔

رات نے سورج سے کہا: "تو مجھے چاند کی صورت میں اپنے محبت نامے بھیجتا ہے اور میں سبزے پر شبنم کے آنسوؤں میں اپنا جواب چھوڑ دیتی ہوں۔"

عظمتِ فطرت ایک بچہ ہے جب وہ فنا ہو جاتی ہے تو دنیا کو اپنا عظیم الشان بچپن بطور ترکہ چھوڑ جاتی ہے۔

ہتھوڑے کی ضرب نہیں بلکہ بہتے ہوئے پانی کا رقص اپنے نغموں سے سنگریزوں کو سڈول بناتا ہے۔

شہد کی مکھی پھولوں سے شہد چوستی ہے اور اپنا شکریہ بھنبھنا کر اڑ جاتی ہے لیکن شوخ تیتری کو یقین ہے کہ پھولوں پر اُس کا شکر واجب ہے۔

کسی بات کو برملا کہہ دینا آسان ہے جب تم اُسے ٹھیک کہنے کے لیے صبر نہ کرو۔

ممکن غیر ممکن سے کہتا ہے "تمہارا مسکن کہاں ہے" جواب ملتا ہے "بیکاروں کے خوابِ موہوم میں"۔

اگر تم کوئی غلطی نہ کرنا چاہو گے تو تم سچائی سے بھی محروم ہو جاؤ گے۔

میں اپنے دل کی اُداسی کے پیچھے بعض چیزوں کی سرسراہٹ سُن رہا ہوں لیکن میں اُنہیں دیکھ نہیں سکتا۔

فرصت اپنی حالتِ انہماک میں بھی ایک کام ہے، سمندر کا سکون لہروں کی جنبش ہے۔

پتی جب محبت کرتی ہے تو پھول ہو جاتی ہے۔ پھول جب پرستش کرتا ہے تو پھل بن جاتا ہے۔

زمین کے اندر جڑیں شاخوں کو بارآور کرتی ہیں لیکن وہ کچھ معاوضہ طلب نہیں کرتیں۔

آج موسمِ بارش کی شام میں ہوا مضطرب ہے۔ میں وجد کرتی ہوئی ٹہنیوں کو دیکھتا ہوں اور موجودات کی عظمت پر بہت

زا جاتا ہوں۔

آدھی رات کے طوفان نے کسی دیہاتی بچے کی طرح جسے تاریکی میں بے وقت جگا دیا جائے کھیلنا اور غل مچانا شروع کر دیا ہے۔

اے سمندر! اے طوفان کی اداس دلہن! تو اپنے چاہنے والے کے تعاقب میں بیکار موجوں کے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔

قول نے عمل سے کہا "میں اپنی بے بضاعتی سے شرمندہ ہوں"۔
عمل نے جواب دیا "جب میں تمہیں دیکھتا ہوں پھر مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میں کس قدر حقیر ہوں"۔

وقت تغیر کی دولت ہے لیکن گھڑی کے نقلی چکر میں آ کر یہ محض تغیر ہی تغیر بن جاتا ہے اور اپنی ساری دولت کھو بیٹھتا ہے۔

حقیقت اپنے لباس میں واقعات کی سخت بندش کو محسوس کرتی ہے۔ افسانوں میں وہ آزادی سے چلتی پھرتی ہے۔

جب میں "یہاں" "وہاں" سفر کرتا تھا تو اے رستے! میں تجھ سے تنگ آ گیا تھا لیکن اب جبکہ تو ہر سمت کو میری رہنمائی کرتا ہے میں نے تجھ سے رشتۂ محبت قائم کر لیا ہے۔

مجھے خیال کرنے دو کہ ان تاروں میں ایک تارا ایسا بھی ہے جو کائنات کی نامعلوم تاریکی میں میری زندگی کا رہبر ہے!

اے عورت! اپنی انگلیوں کی لطافت سے تو نے میری چیزوں کو چھو لیا اور ان میں موسیقی کی طرح ترتیب پیدا ہو گئی۔

ایک غمگین آواز نے اپنا کاشانہ گذرے ہوئے زمانے کے ویرانے میں بنا رکھا ہے۔ وہ رات میں مجھے یہ گیت سناتی ہے کہ "میں تجھ سے محبت کرتی تھی"۔

(ترجمہ از ٹیگور)

بشیر احمد

تاثرات

(تاج محل کو دیکھ کر!)

نفس کے تار پر لرزاں ہیں جو ماندہ وگیں نغمے
جہانِ عشق و مستی ہیں ہیں وہ شیریں تریں نغمے

انہیں نغموں سے ہے عہدِ وفا پائندہ و محکم
جمالِ دوست کی تفسیر ہیں یہ دل نشیں نغمے

فراق و وصل کیا؛ شرحِ حدیثِ آرزومندی
وہی حرفِ تمنا ہے، کہیں نالے کہیں نغمے

زمانہ گوش بر آواز ہے جن کے لئے اب بھی
کوئی جمنا کنارے سُن رہا ہے وہ حسیں نغمے

لرز جاتے تھے دل جس کے جلالِ پادشاہی سے
فضائے "تاج" میں آوارہ ہیں اس کے حزیں نغمے

سلیں مرمر کی ہیں یا رہ گئے ہیں منجمد ہو کر
کسی مہجور کے جذباتِ اُلفت کے امیں نغمے

سنا کوئی کہانی رودِ جمنا اُس زمانے کی!
پریشاں تھے ہواؤں میں تری جب آتشیں نغمے

ستارے بھی ترے شورِ نوا پر رقص کرتے تھے
امانت ہیں تری موجوں میں وہ جان آفریں نغمے

سُراغِ عہدِ رفتہ ڈھونڈتا ہوں تیرے ساحل پر
زباں پر ہیں مری پروردۂ ذوقِ یقیں نغمے

حفیظ ہوشیارپوری

دولت اور محبّت

مندرجہ ذیل مضمون میرے ناول* "نیرنگ" کا ایک باب ہے، پانچ چھ سال سے اوقاتِ فرصت کا بیشتر حصّہ اسی ناول کی تحریر کے وقت کرتا رہا ہوں اب کہ یہ چیز تکمیل کے نزدیک ہے، اور اشاعت و طباعت کے مرحلوں کے سوا اور کچھ باقی نہیں رہا قارئینِ ہمایوں کی خدمت میں اس کا ایک حصّہ پیش کیا جاتا ہے۔

مختصراً اس ناول کا موضوع یہ ہے کہ مشرقی تہذیب اور مغربی تمدّن کی ٹکر سے بعض مسائل ایسے پیچیدہ پیدا ہو گئے ہیں کہ جلد تر ان کا حل مہیا نہ ہوا تو موجودہ نسل کے نوجوان (ان میں لڑکیاں بھی شامل ہیں) کو سخت تکلیف یا اضطراب کا مقابلہ کرنا ہوگا۔

موجودہ انقلاب کے محرکات یوں تو بہت نئے نہیں ہیں لیکن جنگِ عظیم کے بعد واقعات کی رفتار ایسی سریع اور انقلاب کی حرکت ایسی شدید تھی کہ بظاہر جنگِ عظیم ہی اس ذہنی کشمکش کا باعث سمجھی گئی ہے۔

مثال کے طور پر تعلیم و تربیت کے مسئلے کو لیجئے، جن خاندانوں میں ابھی تک مشرقی تہذیب کے علم بردار بڑے بوڑھے موجود ہیں وہ بتقاضائے وقت نوجوانوں کی تعلیم کے حامی تو ضرور ہیں لیکن مغربی تعلیم کے لازمی نتائج سے بچنا چاہتے ہیں۔ لڑکا ایم۔ اے پاس کرے، ضرور، مغربی علوم و فنون سے بہرہ یاب ہو، بہت خوب، لیکن شادی بیاہ کے معاملوں میں، تقریبات کے سلسلے میں، مراسم بے ہودہ کے معاملے میں بالکل خاموش رہے، جو کچھ بڑے بوڑھے اس کے لئے تجویز کریں، اس پر آمنّا و صدقنا کہے۔ اس صورتِ حالات کا نتیجہ ایک سخت قسم کی کشمکش ہوگا! دوسری طرف لڑکیوں کے متعلق بھی اچھے لکھے پڑھے گھرانوں میں کچھ اس قسم کے خیالات رائج ہیں کہ پڑھ لکھ کر ان کو ایسا سعادت آثار اور "برخوردار" رہنا چاہیئے کہ چاہے ماں باپ شادی کے سلسلے میں ان کو جہنّم میں دھکیل دیں وہ بالکل اعتراض نہ کریں بلکہ اس جہنّم میں دھکیلا جانا اپنی ابدی سعادت تصوّر کریں، گھر کی کسی بیہودہ رسم پر اعتراض نہ کریں، بڑی بوڑھیوں کے سامنے زبان نہ کھولیں، یعنی مغرب کی تعلیم کے باوجود دل و دماغ بالکل مشرقی رکھیں۔

ان سے توقع کی جاتی ہے کہ تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی تربیت بھی ہوتی رہے، ظاہر ہے کہ جب تک والدین خود تعاون نہ کریں گے اور اولاد کی ذہنی تربیت کی طرف خاص توجہ نہ فرمائیں گے، محض انگریزی تعلیم دلوانے سے تربیت، نہ ہو سکے گی۔

ایک طرف یہ مسائل ہیں یعنی بیرونی یا خارجی کشمکش، نوجوانوں اور بڑھوں کے درمیان، دوسری طرف ایک باطنی کشمکش کے

* یہ ناول ہاشمی بک ڈپو لاہور کے اہتمام سے طبع ہو رہا ہے، نومبر کے وسط تک شائع ہو جائے گا۔

آثار نمایاں ہیں۔ یعنی ملک کے معاشرتی اور اقتصادی حالات ایسے خراب ہو چکے ہیں کہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم حاصل کرنے کے باوجود یونیورسٹی حتیٰ کہ نوجوان بےروزگار ہی ہو جائیں، اس کا نتیجہ اور زیادہ خوفناک نکلتا ہے، تعلیم یافتہ نوجوان کے دل میں اپنے تفوق کا احساس ہے، اسے اپنی اہمیت پر ناز ہے، اُسے اپنی لیاقت پر اعتماد ہے، چھوٹی موٹی نوکری کرنے کے لئے وہ تیار نہیں، اور اچھی ملازمت مل نہیں سکتی، تجارت وغیرہ کی طرف وہ راغب نہیں، نتیجہ؛ اضطراب و اختلال و اضطرار! اس ذہنی اضطراب کے باعث ہمارے گھر لڑائی کا اکھاڑا بنے رہتے ہیں، والدین اس بات کے متوقع کہ اولاد تعلیم سے فارغ ہو کر برسرِ کار ہو، اولاد مجبور ہے ؎

غمِ آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں — میری ہمتوں کی پستی مرے شوق کی بلندی

تو اس بیرونی اور باطنی کشمکش کے باعث ایک معاشرتی حزنیہ (Tragedy) کے تمام سامان مہیا ہیں۔ کوئی ناول نویس ان حقائق سے آنکھیں بند نہیں کر سکتا، اس کشمکش کے ساتھ ساتھ ایک عام اضطراب کی رَو بھی جاری ہے، یعنی اقتصادی بدحالی اور نظامِ اخلاق میں انقلاب پیدا ہو جانے کی وجہ سے، بالعموم دنیا میں اور خاص طور پر ہندوستان میں ایک عام بےچینی سی پیدا ہو گئی ہے، نوجوان اس بےچینی سے زیادہ متاثر ہیں۔

نیرنگ کا مقصد ہے کہ نوجوان کے اس اضطراب و اختلال کی ایک تصویر پیش کرے! مشرق و مغرب کے امتزاج سے جو مسائل پیدا ہوئے ہیں ان کی طرف توجہ منعطف کرائے، نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی مجبوریوں کا مرقع دکھا کر بڑے بوڑھوں کو دعوتِ فکر دے،

پہلے ابواب کا خلاصہ

رضا، میر حسن علی جاگیردار کا اکلوتا لڑکا ہے، ایف اے تک تعلیم پائی ہے، ماں کے کہنے سے اس کے بعد تعلیم کو مضرِ صحت سمجھ کر خیرباد کہہ دی ہے، بچپن سے سنتا آیا ہے کہ اس کی منگنی اس کے چچا میر حسین علی کی لڑکی مقصود سے ہو چکی ہے، بیگم یعنی رضا کی والدہ اس رشتے کے خلاف ہے، وہ رضا کے لئے کسی امیر کبیر رئیس کی لڑکی پسند کر چکی ہے، رضا مقصود کو دیکھ چکا ہے اور اس کے دل میں اس دیکھنے کے تاثرات بہت دلفریب ہیں۔ بیگم کے آگے دم مارنے کی مجال نہیں، میر حسن علی یعنی رضا کے والد دبے الفاظ میں بیوی کو سمجھا چکے ہیں لیکن بیگم اپنی ضد پر قائم ہیں۔ رضا کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرے۔ یہیں سے باب شروع ہوتا ہے۔

کردار

رضا۔	پچیس سالہ نوجوان میر حسن علی کا اکلوتا لڑکا۔
مقصود	رضا کی عمزاد، اس کی منگیتر
عنایت	میر حسن علی کی لے پالک۔
شودھیان سنگھ، مبارک علی	رضا کے دوست

چوتھا باب

دو مختلف نقطہ ہائے نظر

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ   پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

رضا آنے کو تو مردانخانے میں آ گیا لیکن ابھی تک دل کے اضطراب و انتشار کی وہی حالت تھی، بار بار دماغ پر زور ڈالتا تھا کہ اماں نے میرے سامنے جھوٹ کیوں بولا، لیکن یہ عقدہ حل نہ ہوتا تھا، اُسے ماں پر اتنا بھروسا تھا کہ اس کے خیال میں یہ بات کبھی آ ہی نہ سکتی تھی کہ وہ جھوٹ بھی بول سکتی ہے، پھر اس کی پرورش بھی کچھ ایسے طریقے سے ہوئی تھی کہ ماں کا اثر بہت زیادہ تھا۔ میر صاحب گوشہ نشین اور مرنج مرنجاں قسم کے آدمی تھے، نہ کسی کے لینے میں نہ دینے میں، انہوں نے رضا کی تعلیم و تربیت کا سارا بوجھ رضا کی ماں پر ڈال دیا تھا، خود تو وہ اس گھر میں صفر کی حیثیت رکھتے تھے، رضا نے جب سے ہوش سنبھالا، گھر کا مختار اور مہتمم ماں ہی کو پایا، باپ کے متعلق بس وہ اس قدر جانتا تھا کہ ایک مشفق لیکن بے پروا و بے نیاز شخصیت ہے جس کی زندگی کا مقصد گھر کے مصارف کی کفالت ہے اور بس، جاگیر کا انتظام بھی بیگم (رضا کی والدہ) کے سپرد تھا، صرف دستخط میر صاحب کے ہوتے تھے، مختصر یہ کہ اس گھر میں بیگم کے سامنے کوئی چل نہ سکتا تھا اور مشکل کے وقت رضا بھی فطرۃً ماں ہی کی طرف رجوع کرتا تھا، ان حالات میں ضروری تھا کہ رضا پر ماں کا اثر زیادہ ہوتا اور یہی ہُوا۔ ماں ہی کے کہنے کے مطابق رضا نے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ دی۔ اور اب اُسے معلوم ہو رہا تھا کہ ماں ہی کے کہنے کے مطابق وہ چچا سے بھی چھوٹا جا رہا ہے، اس کی ماں نے جو دلیلیں نیا رشتہ کرنے کے حق میں دی تھیں اس وقت وہ ان سے متأثر تو ضرور ہو گیا تھا لیکن عنایت کی زبانی میر صاحب (رضا کے والد) کے تامل کا قصہ سُن کر اُسے ایک اُلجھن سی پیدا ہو گئی تھی۔

ساتھ ہی اُسے چچا اور چچی کا مشفقانہ سلوک یاد آتا تھا اور جب یہ خیال کرتا تھا کہ نسبت توڑنے سے ان کو کتنا رنج ہو گا تو اپنے دل میں سخت اضطراب محسوس کرتا تھا۔

عنایت نے الفاظ میں جو ایک تصویر مقصود کی کھینچی تھی، اس کو یاد کر کے، وہ نقش جو اس کے دل پر مقصود کے متعلق پہلے موجود تھے اور گہرے ہو گئے تھے، آج سے سات آٹھ سال پہلے جب وہ پہلی بار کلکتہ گیا تھا، یہ واقعہ اُسے خوب یاد تھا، اس وقت مقصود آٹھ سال کی بچی تھی، بڑی شوخ اور کھلنڈری، لیکن اب جو کوئی سال بھر ہوتا ہے اس نے مقصود کو دیکھا تو حیران سا رہ گیا، اس کھلنڈری بچی کی جگہ اب ایک متین اور سنجیدہ لڑکی نے لے لی تھی، جب رضا اندر چچی کے پاس جا کر بیٹھا ہے اور اسے ایک متین لڑکی نے فوراً جھک کر، ماتھے پر ہاتھ رکھ کر، آنکھیں جھکا کر، اور ذرا لجا کر، سلام کیا ہے تو رضا حیرانی میں سلام کا جواب دینا بھول گیا ہے

سر انہیں تیغ بردن کساں نیست   آہ مظہر خم سلام کسے!

رضا کو خوب یاد تھا کہ اس وقت اس کی چچی نے ہنس کر کہا تھا: "ارے بھئی، تم مقصود کو نہیں پہچانتے"؛ اور رضا نے جواب دیا تھا" یہ مقصود ہیں!"

یہ بات سُن کر مقصود اور شرما گئی تھی اور رضا نے دیکھا تھا کہ اس کے گالوں پر ہلکی ہلکی سُرخی دوڑ گئی ہے، رضا نے پوچھا تھا "کیوں مقصود اچھی تو ہو؟" اور اس نے اسی طرح سر جھکائے نہایت دھیمی آواز میں کہا تھا "جی ہاں"۔ رضا اس وقت بھی اس کی آواز کے لوچ اور نغمے سے بہت متاثر ہوا تھا، اور اب اس وقت تو وہ لوچ اور نغمہ گویا اس کے دل میں لرز رہا تھا، اس کے بعد رضا کو زیادہ مرتبہ مقصود سے ملنے کا نہیں ملا تھا، پردہ تو نہیں تھا لیکن دونوں طرف حجاب سا تھا، جس کی وجہ سے کوئی بات معمولی رسمی باتوں اور ہاں نہیں کے سوا ہو سکتی تھی، باوجود اس کے جتنے موقعے اسے مقصود کو دیکھنے کے ملے، انہیں سے رضا نے یہ اندازہ قائم کیا تھا کہ وہ نہایت متین سنجیدہ اور شائستہ لڑکی ہے، اس کے کپڑے کتنے سادہ ہوتے تھے، لیکن اس کے بدن پر کس طرح سج جاتے تھے! کس طرح وہ چُپ چاپ گویا دبے پاؤں اس کے پاس سے نکل جاتی تھی، کیسے سلیقے اور متانت سے وہ ہر کام کرتی تھی! دوپٹہ کتنا سنبھال کر اوڑھتی تھی، گفتگو میں کیسی شائستگی ملحوظ رکھتی تھی! رضا سوچا کرتا تھا کہ اگر ایک بار وہ ہنس پڑے کھلکھلا کر ہنس پڑے تو کیا ہو! یہ متین چہرہ ہنستا ہوا کتنا پیارا معلوم ہو! اور پھر اتفاق سے اس نے ایک بار اُسے ہنستے ہوئے سُن اور دیکھ ہی لیا۔

مقصود اور اس کی خالہ زاد بہن کنیزہ اوپر کے کمرے میں بیٹھی تھیں اور رضا باورچی خانے سے آ رہا تھا، مقصود اور کنیزہ کا خیال تھا کہ رضا نیچے مردانخانے میں ہوگا کیونکہ وہ ہمیشہ وہیں ناشتہ کیا کرتا تھا، لیکن آج وہ اتفاق سے باورچی خانے میں آ گیا تھا۔ گذرتے وقت رضا نے کمرے میں جھانک کر دیکھا، کنیزہ نے کوئی بات کی تھی، جس کو سُن کر مقصود کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی، عین اس وقت مقصود اور رضا کی آنکھیں چار ہوئیں اور مقصود نے فوراً اپنی بانہوں سے اپنا مُنہ چھپا لیا، لیکن وہ لمحہ! وہ ہنسی کی شگفتہ آواز! رضا کی زندگی کا ایک جزو بن کر رہ گئی، رضا کو یوں معلوم ہوا گویا اس کے ارد گرد ہر چیز ہنس رہی ہے، ناچ رہی ہے اور جب اس نے اپنا مُنہ چھپا لیا تو یوں معلوم ہوا گویا دُنیا کے ہونٹوں پر ہنسی جم کر رہ گئی، خشک ہو گئی، ہر چیز بے حس و حرکت ہو گئی، بے جان ہو گئی، ہائے وہ کیا کسی کا شعر تھا ؎

تنہا نہ تری زلفِ رسا لے گئی دل کو   مکھڑے کو چھپانے کی ادا لے گئی دل کو

اسی ادھیڑبن میں تھا کہ مبارک علی اور شودھیان سنگھ کی باتوں کی آواز آئی، چونک کر اُٹھا اور آئینے آئینے کنگھا ہوا ڈیوڑھی تک گیا۔ آگے آگے ایک سکھ نوجوان ہنستا ہوا آ رہا تھا، اس کے پیچھے ایک اور غیر معین عمر کا نوجوان تھا۔ شودھیان سنگھ کوئی پچیس چھبیس سال کا نوجوان تھا، لمبا تڑنگا، دُبلا پتلا، رنگ سانولا تھا، عینک لگائے، لیکن کچھ ایسی بات تھی کہ اس کے چہرے کا غلبہ پا جاتا تھا، دھیان سنگھ اور رضا ایف اے تک ایک ہی کالج میں پڑھتے رہے تھے، ان دنوں میں خوب گاڑھی چھنتی تھی

کے بعد رضا نے تو تعلیم کو خیر باد کہا اور شودھیان سنگھ نے بی اے کرنے کے بعد آئی اے سی کے مقابلے کا امتحان دیا۔ بس اب نتیجے کا منتظر تھا۔ مبارک علی پست قد بھاری بھرکم، ستائیس سے تیس سال تک کا آدمی تھا، بڑی بڑی مونچھیں، ان پر اکثر رضا اور مبارک میں بحث ہو جایا کرتی تھی، مبارک علی کا خیال تھا کہ مونچھوں کے بغیر مرد نامکمل رہتا ہے اور رضا کہتا تھا کہ بڑی بڑی مونچھیں رکھ کر آدمی "ہوّا" ہو جاتا ہے، جس سے بچوں کے ڈرانے کا کام تو لیا جا سکتا ہے لیکن اور کسی مصرف کا نہیں رہتا۔ ظاہر ہے کہ شودھیان سنگھ اس معاملے میں بولنے کا مجاز نہ تھا کہ وہ تو داڑھی بھی رکھتا تھا، مبارک علی بھی ایف۔ اے تک رضا کے ساتھ پڑھتا رہا تھا لیکن ایف اے میں فیل ہو جانے کے بعد اس نے بھی تعلیم کو خیر باد کہہ دی تھی اور اب بیکار تھا، باپ کی جائداد کا انتظام کرتا تھا یا خوش گپیوں میں وقت کاٹ دیتا تھا۔

دونوں دوست اندر آکر مردانخانے میں بیٹھ گئے۔

شودھیان سنگھ نے بیٹھتے ہی کہا "یار کیا حبس دم ہو کر بیٹھے ہو، چلو باہر نکلیں، یہاں تو بڑی گرمی ہے۔"

رضا۔ "نہیں بھئی! آج میں سیر کو نہیں جاتا، میری طبیعت خراب ہے۔"

مبارک علی۔ "لو بنا! نواب صاحب کی طبیعت خراب ہے! مزاج ناساز ہے!! ذرا علیل ہیں!!! پاؤں میں مہندی لگی ہے! میں نہ کہتا تھا کہ وہ گھر سے نہیں نکلیں گے۔ اور اس گرمی میں اُنہیں نکلنے کون دیتا ہے؟"

رضا یہ باتیں سُن کر مسکرا رہا تھا، لیکن شودھیان سنگھ غور سے رضا کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

آخر اس نے مبارک کی بات کاٹ کر کہا "نہیں بھئی مبارک! آج ضرور کوئی اور بات ہے! آج تو نواب صاحب کی جگہ مجھے کوئی اور رضا بیٹھا دکھائی دیتا ہے۔"

یہ بات سُن کر رضا سنبھل کر بیٹھ گیا، واقعی آج اس کو اپنے اندر تغیر کا احساس ہوتا تھا، گویا یکایک کسی بات کی ذمہ داری اس کے کاندھوں پر رکھ دی گئی ہو، اور وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکتا ہو!

مبارک علی۔ "تو پھر کیا بات ہے؟"

شودھیان سنگھ۔ "یہ تو مجھے پتا نہیں، لیکن ہے کوئی بات ضرور"

مبارک علی۔ (ہنس کر) "ہم بتائیں؟"

رضا۔ (مسکرا کر) "اچھا بتاؤ"

مبارک علی۔ "آپ کسی پر عاشق ہو گئے ہیں۔"

یہ سُن کر رضا بہت ہنسا۔ اور شودھیان سنگھ نے رضا کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا، پھر کہا "وہ عاشق ہونے کے

یہ تو سینے ہوتے ہیں؟"

مبارک علی: "تو اور کیسے عاشق ہوتے ہیں، کیا ان کے سر پر سینگ ہوتے ہیں؟"

دھیان سنگھ: "واہ سینگ تو ہوتے ہی ہیں، اور دُم بھی ہوتے ہیں؟"

رضا۔ (ہنس کر) "تو گویا جانور ہوتے ہیں؟"

دھیان سنگھ: "جی ہاں! جانور ہوتے ہیں، اور جانور بھی ایسے کہ علم الحیوانات میں آج تک ان کی حیثیت معلوم نہ ہو سکی۔"

مبارک علی: "وہ کس طرح؟"

دھیان سنگھ۔ "تو سنئے! عاشق پہلے تو کسی کمسن معشوق پر مرنے لگتے ہیں اور اسے کھلاتے رہتے ہیں"

رضا۔ (ہنس کر) "واہ! کھلاتے رہتے ہیں۔ تو کیا عاشق معشوق کی آیا ہوتے ہیں؟"

دھیان سنگھ۔ "بلکہ اس سے بڑھ کر، آپ نے سنا نہیں؟ ؎

کمسنی کھیل رہی ہے ابھی کیا رکھا ہے   آسرا آسرے والوں نے لگا رکھا ہے"

مبارک علی۔ "بھئی خوب! پھر کیا ہوتا ہے؟"

دھیان سنگھ۔ "پھر معشوق چودہ سال کا ہوتا ہے اور وہ اُسے اپنی محبت کا افسانہ الف لیلہ کی ایک کہانی کے رنگ میں سناتے ہیں معشوق کہانی سُن تو لیتا ہے لیکن جواب کوئی نہیں دیتا۔"

رضا۔ "کیا شرط ہے؟"

دھیان سنگھ۔ "ہاں شرط ہے۔ سُنو ؎

سُن تو لی مجھ سے کہانی میری   اس نے گو بات نہ مانی میری"

رضا۔ "اچھا پھر"

دھیان سنگھ۔ "پھر عاشقوں کا حافظہ خراب ہو جاتا ہے۔ دل و دماغ کام کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اور جو کچھ انہوں نے لکھ رکھا ہوتا ہے وہ بالکل بھول کر گنوار، اُجڈ، بدتمیز ہو جاتے ہیں، سنئے ؎

مکتبِ عشق میں جو ہو اُسے کیا یاد رہے   نہ لکھا یاد رہے اور نہ پڑھا یاد رہے"

مبارک علی۔ "پھر"

دھیان سنگھ۔ "پھر دوست انہیں سمجھانے کے لئے آتے ہیں کہ کیوں دماغ خراب ہوا ہے۔ جوتیاں کھاؤ گے، یا پاگل خانے بھجوائے جاؤ گے۔ تو عاشق ان کی کوئی بات نہیں سمجھتے، بلکہ باؤلے کتے کی طرح سمجھانے والوں کو کاٹنے دوڑتے ہیں ملاحظہ ہو ؎

حضرتِ ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ — کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا؟

اس کے بعد معشوق کو اس بات کی خبر ہوتی ہے، تو اُسے بڑا تاؤ آتا ہے، اور وہ حاکمِ شہر سے شکایت کرتا ہے اور کہہ سُن کر عاشق کو قید خانے بھجوا دیتا ہے، جو عاشق پہلے پہل قید خانے میں آتے ہیں، وہ بہت گھبراتے ہیں، در اصل جیل کی کھڑکیاں سُن کر ان کا دم فنا ہوتا ہے، دوسرے قیدیوں کو دیکھ کر اپنی حالت پر زار زار روتے ہیں۔ دیکھئے عزیز لکھنوی کا یہ شعر ؎

دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیراں ہونا — وہ مرا پہلے پہل داخلِ زنداں ہونا

لیکن بعض عاشق عادی چوروں کی طرح عادی عاشق بھی ہوتے ہیں، یہ ایسے کھیل کئی بار کھیل چکے ہوتے ہیں، اور کئی بار قید ہو جانے کی وجہ سے وہ بے خوف ہو چکے ہوتے ہیں بلکہ عادی مجرموں کی طرح بالکل بے باک ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کے سخت جان اور ڈھیٹ عاشق اکثر یہ گنگناتے ہوئے سُنے جاتے ہیں ؎

خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں — ہیں گرفتارِ بلا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

تو مختصر یہ ہے کہ اکثر تو قید خانے میں سڑ سڑ کر جان دے دیتے ہیں۔ جو باہر نکلتے ہیں ان کو دق ہو جاتی ہے، اور اکثر مر جاتے ہیں، لیکن ان کی غیر شریفانہ حرکتوں پر معشوقوں کو ایسا تاؤ آتا ہے کہ قبر پر جا کر ٹھوکریں لگاتے ہیں مثلاً ؎

کہتے ہیں ٹھوکروں سے تجھے ہم اُٹھائیں گے — سونے نہ دیں گے چین سے کنجِ مزار میں

ان عاشقوں میں بعض ایسے نامعقول ہوتے ہیں کہ قبر کے اندر سے چلاتے رہتے ہیں ؎

آہستہ برگِ گل بفشاں بر مزارِ ما — بس نازکست شیشۂ دل در کنارِ ما"

اس دوران میں رضا اور مبارک علی ہنس ہنس کر دوہرے ہوئے جاتے تھے اور دھیان سنگھ نہایت متانت اور سنجیدگی سے تقریر کر رہا تھا۔ آخر جب ذرا ہنسی کا دورہ کم ہوا تو دھیان سنگھ نے کہا "سنا آپ نے، ایسے ہوتے ہیں عاشق، تو بتائیے جانور ہوئے کہ نہیں، اور یہ بھی کہئے کہ ان کو جانوروں کی کونسی صنف میں شامل کیا جائے؟"

رضا: "سچ ہے بھئی، جانور ہی ہوئے"

مبارک علی: "تو معلوم ہوا کہ یہ علامات رضا کی نہیں ہیں۔ اب ہم بتائیں ان کو کیا ہوا؟"

دھیان سنگھ: "اچھا بتاؤ"

مبارک علی: "ان پر کوئی عاشق ہو گیا ہے"

یہ بات سُن کر رضا چونکا، اور اُسے بے ساختہ عنایت کا فقرہ یاد آیا جو مقصود نے کہا تھا کہ عنایت تم بڑی اچھی لڑکی ہو اور بھاگوان بھی ہو، اور ایکا ایکی مقصود کی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے آ گئی۔

دھیان سنگھ اس دوران میں غور سے رضا کے چہرے کے تغیرات کا مطالعہ کر رہا تھا۔ آخر اس نے پوچھا "تو بتاؤ رضا، کیا ہی بات ہے ؟"

رضا۔ "نہیں بھئی، بات دراصل یہ ہے کہ میری شادی ہونے والی ہے"۔

یہ بات سن کر دھیان سنگھ اور مبارک علی دونوں نے یک زبان ہو کر کہا "تو اس میں پھر بسورنے کی کیا بات ہے ؟"

رضا۔ "تم ساری بات بھی تو سنو، تمہیں شاید معلوم نہ ہو کہ میری بات چچا حسین علی کے ہاں طے پا چکی تھی۔ اب اماں کا خیال ہے کہ وہاں سے نسبت توڑ کر سید زماں شاہ کو جو ملتان کے رئیس اعظم ہیں اُن کے ہاں کر دیں۔ مجھے یہ خوف ہے کہ چچا کو اس سے بہت رنج ہوگا"۔

دھیان سنگھ۔ "تو کیا پہلے نسبت تم نے خود کی تھی یا تمہارے ایما سے ہوئی تھی ؟"

رضا۔ "نہیں، تو، بس بڑوں ہی بڑوں میں فیصلہ ہو گیا تھا"۔

دھیان سنگھ۔ "تو پھر تمہارے چچا تم سے کیوں ناراض ہوں گے، تمہارے والدین نے رشتہ کیا اور انہیں نے توڑا تمہارا اس میں کیا قصور۔ وہ کیا جانتے نہیں کہ تمہیں اس بات میں کوئی اختیار نہیں ہے ؟"

رضا۔ "یہ تو وہ جانتے ہیں"۔

دھیان سنگھ۔ "تو پھر"

رضا۔ "بات یہ ہے کہ میں خود چاہتا تھا کہ ——"

مبارک علی۔ "ہاں تو یوں کہو نا کہ یہ رشتہ تمہیں پسند تھا"۔

رضا۔ (کچھ سوچ کر) "ہاں۔ یہی کہنا چاہئے"۔

دھیان سنگھ۔ "تم نے اپنی منگیتر کو دیکھا ہے اور وہ تمہیں پسند ہے ؟"

رضا۔ بس یہی سمجھ لو! دیکھنے کو تو کئی بار دیکھا ہے! لیکن بس دیکھا ہی دیکھا ہے، اور بظاہر تو وہ بڑی اچھی لڑکی معلوم ہوتی ہے"۔

دھیان سنگھ۔ "تو بھئی شادی تو دلوں کا سودا ہے، اگر تم سمجھتے ہو کہ اس لڑکی کے ساتھ تمہاری زندگی اچھی گذرے گی تو رشتہ کرنے میں کیا رکاوٹ ہے ؛ اور تمہاری اماں اس رشتے کے کیوں خلاف ہیں ؟ —— کیا تم نے اپنی پسندیدگی کا اظہار ان کے سامنے نہیں کیا ؟

رضا۔ "کچھ دبے الفاظ میں کیا تو ہے، لیکن وہ کہتی ہیں کہ وہ اس گھر کا انتظام نہیں سنبھال سکے گی، وہ اور کئی طرح سے یہ رشتہ مناسب نہیں خیال کرتیں"۔

دھیان سنگھ۔ "تو پھر ان کا خیال ٹھیک ہوگا! مجھے یہ دو رُخی چالیں پسند نہیں، یا تو آدمی اپنا رشتہ آپ پسند کرے اور اپنی

ذمہ داری پر کرے، یا پھر پرانے مشرقی طریقے پر ماں باپ پر چھوڑ دے، یہ جو ہیں بین سی بے ہودہ سی بات ہے کہ بس لڑکے نے لڑکی کو دیکھا ہے، اس کا مطلب میری سمجھ میں کبھی نہیں آیا، ایک بار دیکھنے سے کیا معلوم ہوتا ہے، کوئی لڑکی کے چہرے پر اس کا سارا حال تھوڑا ہی لکھا ہوتا ہے، اگر تم خاص طور پر وہاں شادی کرنا چاہتے ہو اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں یہ تو دلوں کا سودا ہے اور لڑکی کے متعلق تمہیں اعتبار ہے تو ماں باپ سے صاف صاف کہہ دو اور اگر یونہی "ایک بار دیکھا ہے دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے" والا معاملہ ہے تو جانے دو، آخر ماں باپ تمہارے کوئی دشمن تو نہیں ہیں۔ تمہاری بہتری ہی کے لئے نسبت توڑ رہے ہوں گے، ہاں بس یہ سمجھ لو کہ لڑکی کے ساتھ تمہیں رہنا ہے، تمہاری والدہ کو نہیں رہنا۔"

مبارک علی:۔ "اچھا یہ بتاؤ کہ جہاں تمہاری والدہ اب رشتہ کرنا چاہتی ہیں، وہ کیا تمہارے چچا کے خاندان سے اچھا خاندان ہے۔"

رضا:۔ "ہاں، ان کی ایک ہی لڑکی ہے اور لاکھوں کی جائداد ہے، بس وہی وارث ہے۔"

مبارک علی:۔ "تو بھئی، مجھ سے پوچھو تو فوراً کر لو۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو فوراً یہ رشتہ منظور کر لیتا۔ تمہارے چچا آخر تمہارے چچا ہیں۔ چھوٹیں گے تھوڑا ہی! تھوڑے سے عرصے کے بعد خود ہی من جائیں گے، تم اور جگہ رشتہ کر کے اپنے بازو مضبوط کر لو بھئی میں ہوتا تو فوراً یہ رشتہ کر لیتا!"

دھیان سنگھ:۔ "نہیں رضا، یوں نہیں، اس معاملے کو یوں دیکھو کہ تمہاری زندگی کس طرح اچھی گزرے گی، اگر تمہیں اعتبار ہے کہ چچا کے ہاں شادی کرنے سے تم خوش رہ سکو گے تو دولت کی طرف دیکھنا فضول ہے۔ کیا تمہارے پاس دولت کم ہے؟ اور پھر بھی اس طرح کی حاصل کی ہوئی دولت میری نظر میں کوئی اچھی چیز نہیں ہے، دولت کی خاطر اچھا رشتہ نہ چھوڑو۔ ہاں اگر تم سمجھتے ہو کہ ایک ہی جیسی بات ہے، اور تمہارا دل اس طرف خاص طور پر مائل نہیں ہے تو فیصلہ ماں باپ پر چھوڑ دو۔ آخر پہلے بھی تو انہوں نے تمہارا رشتہ کیا تھا اور تم نے اب تک دخل نہیں دیا۔ اب بھی چپکے ہو رہو، یوں میں اندازے سے کہتا ہوں کہ تمہارے چچا کی طبیعت کا رنگ دیکھتے ہوئے، اُن کی اولاد زندگی کے سفر کے لئے موزوں تو ہونی چاہئے

رضا:۔ بس یہی بات ہے، کچھ فیصلہ نہیں کر سکتا، طرح طرح کے خیالات پیدا ہوتے ہیں، یہ بھی سوچتا ہوں کہ اماں کا دل اس طرف سے بے طرح پھٹ گیا ہے ابھی سچ تو یہ ہے کہ میں اُن کی حکم عدولی نہیں کر سکتا اور یوں کچھ......" مبارک علی:۔ "یوں کچھ کیا بھئی عجیب آدمی ہے۔ دولت اور پھر خود گھر آتی ہے اور یہ شخص فیصلہ نہیں کر سکتا، ماں اس رشتے کے حق میں، باپ اس رشتے کے حق میں، رشتہ اچھا اپنا دل کسی خاص طرف مائل نہیں، پھر تکلف کیا ہے؟" دھیان سنگھ:۔ "رضا اس بات کا فیصلہ مشورے سے نہیں ہوگا، تم خود علیحدگی میں سوچو اور جو باتیں میں نے کہی ہیں ان کو نظر میں رکھو۔ دل کو ٹٹولو اور پھر فیصلہ کرو۔ لو اب میں رخصت ہوتا ہوں تم تو چلو گے نہیں۔ آؤ مبارک۔"

مبارک علی:۔ "تو لیجئے نواب صاحب رخصت۔" دونوں دوست سلام کر کے رخصت ہوئے۔

دوستوں کے جانے کے بعد رضا بہت دیر سوچتا رہا، آخر کار اس کے دل نے یہی فیصلہ کیا کہ اماں نے جو سوچا ہے وہ میری بہتری کے لئے سوچا ہے، لیکن رات کو دیر تک اس کی آنکھوں کے سامنے ایک متین اور سنجیدہ لڑکی کی تصویر آتی رہی جو بار بار انہیں سمجھا رہی

ساقی نامہ

اُٹھ اے ساقی اُٹھ اور جامِ شرابِ ارغواں لے آ
غلط ہو جائے جس شے سے غمِ ہر دو جہاں لے آ

مجھے آسودۂ رنجِ دورِ صبح و شام سے کر دے
مرے ساغر کو خونِ گردشِ ایام سے بھر دے

شباب و حسن کی شعریّتیں ساغر میں حل کر لا
بہارِ خلد کی رنگینیاں اِک جام میں بھر لا

ترے صدقے پلا دے اِک چھلکتا جامِ مے ساقی
غمِ گیتی کا درماں جس سے ہو لے آ وہ شے ساقی

وہ شے بن جائے دنیا بھولی بسری داستاں جس سے
وہ شے پہلو بچائے انقلابِ آسماں جس سے

وہ شے موجِ رواں جس کی مہِ نو سے عبارت ہے
طلوعِ صبحِ عشرت جس کے پرتو سے عبارت ہے

وہ شے خوابیدہ ہے جس میں تلاطم روحِ طوفاں کا
وہ شے جس کی خموشی نغمہ ہے سازِ رگِ جاں کا

وہ شے دنیا و دیں پر جس کے جلوے مسکراتے ہیں
وہ شے لہروں میں جس کی کفر و ایماں ڈوب جاتے ہیں

وہ شے جس میں نشاطِ بیخودی پنہاں ہے لا ساقی
پلا ساقی۔ مجھے دنیا سے بیگانہ بنا ساقی

ریاض عباسی

ایک آزاد لمحہ کی ترجمانی

میں بالکل نیا ہوں یہ دنیا بہت پرانی ہے۔ اس پرانی دنیا کے گردش کے مارے سورج اور ستاروں سے دل کیا بہلے؛
سورج، چاند اور تارے چمک رہے ہیں، گھوم رہے ہیں مگر لاکھوں سالوں میں کروڑوں میل روزانہ طے کرکے بھی یہ کہیں پہنچے
ان خدائی خواروں سے مجھے کیا نسبت؛

میں بالکل نیا ہوں — یہ پرانی چیزیں مجھے کیوں آلودہ کر رہی ہیں؛ کیا میرے لئے کوئی نئی چیز نہیں بنی؛ میں بھی کیا پانی کی بوند ہوں کہ ندی میں فنا ہونے کو بقا سمجھوں؛

مجھ میں **قدرتِ تخلیق** ہے۔ خود اپنے لئے نئی دنیا آراستہ کروں گا۔ کروں گا نہیں بلکہ کر رہا ہوں۔ حسرتوں آرزوؤں کی پامال شدہ دُنیا طے کرکے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتا ہوں۔

یہ لو میری نئی دنیا بن چلی۔ وہ نیلا اتھمد جو ہر وقت سوکھنے کے اوپر کی طرف تنا رہتا تھا گاؤ خورد ہو گیا۔ اس سے مجھے کس قدر نفرت تھی۔ اب میں ہوں اور ایک اُجلی نکھری دُنیا۔ دقیانوسی سورج اور تاروں کی آوارہ گردی کی لغو حرکت کی بجائے دلفریب رقص ہیں۔ نئی آنکھوں میں نئی نگاہیں ہیں۔ نگاہوں میں نئے رنگ ہیں۔ فوارے ہوا میں قلابازیاں لگا رہے ہیں۔ چلتے پھرتے باغ اور ناچتے کودتے پیران فواروں سے لپٹے ہیں اور پھر یہ جا اور وہ جا۔

اس نئی دنیا میں جو چاہے جہاں چاہے بیٹھ جائے ہر جگہ عیش ہے۔ اس پرانی دُنیا کی طرح نہیں کہ بیٹھو تو زمین پر اور گرو بھی زمین پر۔

صرف میں ہی آزاد نہیں۔ ہر چیز آزاد ہے۔ کوئی مجبوری کوئی ممانعت مطلقاً نہیں۔ پل میں جوان بوڑھا اور بوڑھا جوان بن رہا ہے۔ پیڑ سمٹ کر پھول بن رہے ہیں۔ پھول اکڑ کر تنا ور درختوں کی مستانہ ادا سے لہرا رہے ہیں۔ میری نئی دُنیا ایک خدائی جشن ہے۔

اب مجھے نیند آ رہی ہے اور میرا کھیل ہو چکا۔ میری نئی دنیا میرے ساتھ ہی اچھی۔ لاؤ جاتے جاتے پھر اس پرانی دُنیا کو ردی کی ٹوکری سے نکال کر پھیلا دوں۔

فلک پیما

نوجوان سپاہی کا خطاب اپنی محبوبہ سے

سُن قسم کھاتا ہوں میں اے دلبرِ زہرہ جبیں
شورشِ جنگ و جدل سے کانپ اُٹھیگی جب

یا تو میں رَن میں شہیدِ آبرو ہو جاؤں گا
چاک دامانِ وطن کا یا رفو ہو جاؤ

تیرے جلووں کی قسم چمکیں گے جب رَن میں تبر
قہر بن کر یں صفِ اعدا پہ ڈالو

مسکراتا طنز کرتا رَن میں جب آؤں گا میں
دشمنوں کے سر کا گودا تک چبا جاؤ

دیکھ کر سُرخی ترے لب کی لگی ہو دل میں آگ
مست کر دیگا مجھے تیغوں کی جھنکار کا

ہو گا میرے واسطے تیرا تبسم اذنِ جنگ
رَن میں پہنچوں گا تو اُڑ جائے گا غداروں کا

جب کبھی یاد آئے گی میدان میں تیری صدا
پیس دوں گا سامنے اس وقت جو کچھ

تیری چھاگل کی صدا پر وجد کرتا جاؤں گا
ڈانٹتا ، للکارتا ، لڑتا ہا بھڑتا

قول میرا یاد رکھ میرا ارادہ ہے اٹل
یوں اٹل ہے یہ ارادہ جیسے بنیہ

وقت آنے پر مری تیغ آزمائی دیکھنا
میری خونریزی مری رنگیں قبائی دیکھنا

جلال بلیح

اُردو شاعری میں مقامی مذہب اور عقاید

(۲)

موجودہ دور کے بعض شاعروں نے کرشن کنھیا کے جنم پر یا خود اُن کی زندگی پر جو نظمیں لکھی ہیں اُن پر روحانی عنصر زیادہ غالب ہے اس لئے وہ نظیر اکبر آبادی کے رنگ سے الگ ہیں اور کرشن کی زندگی کے روحانی پہلو پر روشنی ڈالتی ہیں چکبست کی نظم ہے ؎

راہ تاریک ہے اور سر پہ گرج بادل کی — دونگڑا مینہ کا ہے بوندیں نہیں ہلکی ہلکی
شوخ و طرار و حسیں چھوکریاں گوکل کی — چلی آتی ہیں صراحی لئے جمنا جل کی

دل لڑکپن کی اُمنگوں پہ مچل جاتا ہے
کھلکھلا پڑتی ہیں جب پاؤں پھسل جاتا ہے

تھا جو دُنیا کو رہِ راست پہ لانا منظور — جلوۂ حق نے کیا قالبِ خاکی میں ظہور
جوشِ رحمت سے غنی فیض و کرم سے معمور — ظلمتِ جہل مٹانے کو بڑھا چشمۂ نُور

پردۂ غیب سے متھرا کے چمن تک پہنچا
بڑھ کے متھرا سے کرکشیتر کے رن تک پہنچا

دیکھ کر جنگ کے طوفاں میں ارجن کو اُداس — یوں دیا وعظ کہ ہشیار ہو اے کشتۂ یاس
روح و قالب کی جُدائی پہ عبث ہے وسواس — جو مسافر ہے وہ منزل پہ بدلتا ہے لباس

رُوح دنیا کی مسافر ہے اجل منزل ہے
اس سفر میں جو کھٹکتا ہے وہ کانٹا دل ہے

صاف نیت ہے تو بیکار ہے انجام کا ڈر — پاک شے ہے جو ہیں رکھتے ہیں فقط حق پہ نظر
خود ریاضت کو سمجھتے ہیں ریاضت کا ثمر — پھل کے لالچ میں لگاتے نہیں نیکی کا شجر

اُن کی آنکھوں میں ہی داغ وفا پیارے ہیں
مرد ہیں ٹکڑے جو آگ کے انگارے ہیں

پھول مایا کے جو کھلتے ہیں لبھانے کیلئے سانپ بچھو ہیں مسافر کے ستانے کیلئے
سلسلۂ ہستیِ فانی کا مٹانے کیلئے بزمِ عالم سے نہ جا لوٹ کے آنے کیلئے

تیری ہستی کا جو ہے راگ بھلا دے اُس کو
پردۂ سازِ حقیقت میں چھپا دے اُس کو

تیری آنکھوں سے اگر دُور ہو مایا کا نقاب دیکھ پھر کیا نظر آتے ہیں عزیز و احباب
بے وفاؤں کی مروّت میں نہ کر عمر خراب حق پرستوں کی امانت ہے ترا زورِ شباب

دھرم پر جو نہ فدا ہو وہ جوانی کیا ہے
دودھ کی دھار ہے تلوار کا پانی کیا ہے

چکبست نے اس نظم میں کرشن اور گیتا کا فلسفہ ایک شاعر کی طرح بے تعلق ہو کر بیان کیا ہے۔ ایک شاعر کرشن کی زندگی کے اس روحانی پہلو کی بنیاد خود اپنی زبان میں اور اپنے جذبات کے طریقے پر رکھتا ہے۔ محروم کے چند شعر ہیں جو اُنھوں نے کرشن پر لکھے ہیں ؎

ہر بے خودِ محبت مستِ مئے حقیقت کرتا ہے دھیان تیرا، جپتا ہے نام تیرا
ہر دَور میں ہزاروں، پی پی کے اُٹھ گئے ہیں اب تک چھلک رہا ہے محفل میں جام تیرا
عالم کا ذرہ ذرہ کھچتا ہے تیری جانب الفت کا سلسلہ ہے سارا نظام تیرا
کانوں میں بانسری کی آواز آرہی ہے گیتا سُنا رہی ہے دلکش پیام تیرا

موجودہ دور کے بہت بعد کے شاعروں میں سے چند نے کرشن کی زندگی کے رومانی پہلو پر بہت اچھی شاعرانہ نظمیں لکھی ہیں۔ ایسے شاعروں میں اندر جیت شرما کے گیت اور حفیظ جالندھری کی مستقل نظمیں بے حد کیف آور اور شاعرانہ خیالات کا مجموعہ ہیں، جو کرشن کی زندگی کے ایک دلکش پہلو کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ان میں رومان، موسیقی، ترنم اور شاعری سب کچھ ہے اور ہندوستان کی سرزمین میں پیدا ہونے والے اس سخنور نے ہماری شاعری کو ایک نہایت کیف آور خیال کا سرچشمہ بخشا ہے جو لکھنے اور پڑھنے والے دونوں کو سرشار بنا تا ہے۔
لیکن اب ہم بجائے کرشن کی زندگی کے بعض دوسری ایسی مستقل نظموں کا ذکر کریں گے جن میں کرشن کے علاوہ ہند کے دوسرے مذہبی سورماؤں کا ذکر ہے۔ پوری نظمیں انہیں پر لکھی گئی ہیں اور ان کی زندگی کے کسی خاص پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اس طرح کی نظموں میں محروم کی ایک نظم "سری رام چندر مہاراج" کے چند شعر اس جگہ نقل کیے جاتے ہیں ؎

موہنی مورت تری دل کے صنم خانے میں ہے تو ہے دل میں یا چراغِ طُور کاشانے میں ہے
روح کو ملتے ہیں کیا کیا خواب جنت کے مزے کس قدر تاثیر تسکیں تیرے افسانے میں ہے

گنگا جمنا بھی وہی ہیں اور اجودھیا بھی وہی   پھر تامل اس قدر کیوں جلوہ فرمانے میں ہے

چھب دکھا دے پھر ہمیں اے آئینۂ چشم دل

دم قدم سے ہو ترے آباد کوئے چشم دل

اقبال نے بھی رام پر ایک اچھی نظم لکھی ہے۔ اُس کے خیالات کا انداز بھی اسی طرح کا ہے جیسا محروم کا۔ مذہب کے اس پہلو نے ہماری شاعری میں جس جس طرح جلوہ فرمائی کی اُس کے اندازے کے لئے جتنی مثالیں دی گئیں وہ بہت کافی ہیں۔ اب ایک تیسرا پہلو جس کا مظاہرہ ہماری شاعری میں جابجا ہے وہ ہندوستان والوں کے بہت سے خاص خاص مذہبی عقائد اور عبادت کے خاص طریقے ہیں۔ مسلمانوں کی زندگی کے خالص مذہبی پہلوؤں کا ذکر مقامی اثر کے ضمن میں نہیں آسکتا اس لئے کہ وہ ہندوستان میں بھی ویسا ہی ہے جیسا ہندوستان کے باہر۔ البتہ خود یہاں کے خاص مذہب ہنود کی عبادت کے بعض طریقے، ہندوؤں کی بعض مذہبی رسوم اور اُن کا جو اثر مسلمانوں پر پڑا اُسے مقامی مذہب اور عقیدے کے اثر کی اچھی مثال کہا جاسکتا ہے۔

ہندوستان کی مذہبی زندگی کا ایک پہلو جوگیوں، رشیوں اور منیوں کی زندگی کا وہ حصہ ہے جو وہ عموماً جنگلوں میں کاٹتے ہیں۔ زندگی کو ہندو مذہب کے بعض عقائد کی رو سے چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا بچپن اور تعلیم، دوسرا شادی کی زندگی، تیسرا آبادی میں رہ کر عبادت اور چوتھا بیراگ یا جنگل کی زندگی۔ اس زندگی کا چوتھا پہلو ہر حیثیت سے زیادہ روحانی ہے۔ اس لئے شاعروں نے اسی پہلو کو شاعری میں زیادہ جگہ دی ہے اور عشقیہ شاعری تک میں اسے نظم کیا ہے۔ مختلف شاعروں کے اکا دکا شعروں سے زندگی کے اس پہلو کا اندازہ ہوسکتا ہے ؎

لیا گر عقل نے مُنہ میں دلِ بیتاب کا گٹکا	تو جوگی جی دھرا رہ جائے گا سیماب کا گٹکا	(انشاء)
یہ کیونکر بن کے بن ٹیسو کے پھولوں کے نظر آویں	جو جنگل جی سے جوگی آپ لیویں بھاگ کا جوڑا	(٭)
یہ جو مہنت بیٹھے ہیں رادھا کے کُنڈ پر	اوتار بن کے گرتے ہیں پریوں کے جھُنڈ پر	(٭)
ستی اک ہو گئی بیراگن آ کر گھاٹ پر تب سے	ردا سا چھا رہا ہے اور سب بیراگ پانی پر	(٭)
پھرتا ہے جوگی بنا تیرے لئے آفتاب	خط شعاعی نہیں، سر پہ کھُلی ہے جٹا	(ظفر)
کب تلک دھونی رمائے جوگیوں کی سی رہوں	بیٹھے بیٹھے در پہ تیرے میرا آسن جل گیا	(مہر)
تجھ عشق میں جل جل کر جوگی کی لیا صورت	اِک بار ارے موہن چھاتی سوں لگا سُجا	(ولی)
براگی جو کہاتے ہیں اُسے گھر بار کرنا کیا	ہوئی جوگن جو ؟ بی اُسے سنسار کرنا کیا	(٭)
ہم کی بیراگ کی اُداسی ہوں	دل بھی بیراگی و اُداسی ہے	(٭)

زلف تیری ہے موج جمنا کی — پاس تل اُس کے جوں سناسی ہے (ولی)

مہنت اک سمت کو دھونی رمائے — کہیں جوگی جٹا سر پر چڑھائے

ملے مُنہ پر بھبوت آنکھیں کئے لال — بچھائے ہیں ہرن کی شیر کی کھال (معراج المضامین)

زندگی کا یہی پہلو ہے جس کی ترجمانی جا بجا مثنوی میرحسن میں ہوتی ہے ؎

پہن سیلی اور گیروا اوڑھ کھیس — چلی بھر کے صحرا کو جوگن کا بھیس

زمرد کی سمرن کو ہاتھوں میں ڈال — اور اک بین کاندھے پہ اپنے سنبھال

بچھا مرگ چھالے کو اور لے کے بین — دو زانو سنبھل کر وہ زہرہ جبین

ع مثل ہے کہ جوگی ہوئے کس کے میت

اس زندگی کی مصوری کا ایک بہت اچھا نمونہ چودھری خوشی محمد ناظر کی نظم جوگی ہے۔ اس کے چند بندوں سے بیراگ کی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی پڑ جائے گی ؎

یاں قلۂ کوہ پہ رہتا تھا۔ اک مست قلندر بیراگی — تھی راکھ جٹا میں جوگی کی۔ اور انگ بھبوت رمائی تھی

تھا راکھ کا جوگی کا بستر۔ اور راکھ کا پیراہن تن پر — تھی ایک لنگوٹی زیب کمر۔ جو گھٹنوں تک لٹکائی تھی

سب خلق خدا سے بیگانہ۔ وہ مست قلندر دیوانہ — بیٹھا تھا جوگی مستانہ۔ آنکھوں میں مستی چھائی تھی

جوگی کی گفتگو ؎

کیوں بابا ناحق جوگی کو۔ تم کس لئے آکے ستاتے ہو — ہیں پنکھ پکھیرو بن باسی۔ تم جال میں آن پھنساتے ہو

ہم حرص و ہوا کو چھوڑ چکے۔ اس نگری سے مُنہ موڑ چکے — ہم جو زنجیریں توڑ چکے۔ تم لا کے وہی پہناتے ہو

تم پوجا کرتے ہو دھن کی۔ ہم سیوا کرتے ہیں ساجن کی — ہم جوت جگاتے ہیں من کی۔ تم اُس کو آکے بجھاتے ہو

سنسار سے یاں مکھ پھیر لیے۔ من میں ساجن کا ڈیرا ہے — یاں آنکھ لڑی ہے پیتم سے۔ تم کس سے آنکھ ملاتے ہو

جس زندگی کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرنے کے لئے یہ مثالیں لکھی گئی ہیں وہ صرف ہندوستان کے لئے مخصوص ہے۔ صوفیانہ زندگی میں دُنیا کے چھوڑنے کی جو تعلیم ہے وہ اس سے بالکل جداگانہ ہے۔ اس لئے اس انداز کو دیکھنے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے شاعروں نے زندگی کے اس پہلو کی ترجمانی کرنے میں ہندوستان کی مخصوص روایات سے مدد لی۔

اسی مذہبی زندگی کا دوسرا پہلو پوجا پاٹ کے طریقے ہیں۔ یوں تو مختلف شاعروں نے اس حیثیت سے شاعری میں نئے نئے خیالات داخل کئے ہیں لیکن اس جگہ صرف ایک آدھ مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ صرف یہی مثالیں اس زندگی کے اس پہلو کو نمایاں کرنے کے

لئے کافی ہیں۔

پوجا کا سامان ؎

سنہری تھالیاں چومکھ سے روشن | بتاسے، دُوب، تُلسی، دھوپ، چندن
مٹھائی، ناریل، پھول اور چاول | گلوری۔ کالے تل۔ سیندور، گوگل
چڑھاتے ہیں نہانے میں لبِ آب | جہاں دیکھو وہاں پوجا کا اسباب

مذہبی زندگی کے بعض دوسرے پہلو ؎

بھجن گاتے ہوئے پنڈے کسی جا | کہیں جگ ہے کہیں ہے یوم پوجا
کہیں باہم جوان و پیر و کودک | کوئی پوتھی لئے ہے کوئی پستک
کہیں ہے بھاگوت گیتا کا چرچا | مہابھارت ہے رامائن کسی جا
کوئی اشلوک پڑھ کر پوجتا ہے | کہیں پنگل کا ٹیکا ہو رہا ہے
کہیں ویدانت ہے میمانسا ہے | کہیں جوگ اور بیدک بدیا ہے
پرانوں کی کہیں ہوتی ہے تجدید | کہیں ہوتی ہے دیبی پاٹ کی دید (معراج المضامین)

مسلمانوں کا مذہب اوہام پرستیوں سے دور ہے لیکن اس کے باوجود بھی ہندوستان کے مسلمانوں کی زندگی اور ان کے اکثر عقائد میں اوہام پرستی کا غلبہ ہے۔ اسے صرف ہندوستان کی فضا کا اثر سمجھنا چاہئے کہ اکثر موقعوں پر جو چیزیں مذہب کے خلاف ہیں انھیں مذہب کا جزو سمجھ کر کیا جاتا ہے یا اگر ایسا نہیں تو ان باتوں پر اعتقاد ضرور ہوتا ہے اور وہ مسلمانوں کے اعمال پر سختی سے اپنا قبضہ جما لیتی ہیں۔ اس کی مثالیں غور کرنے والا ہر وقت دیکھ اور محسوس کر سکتا ہے۔ ہمارے شاعروں کے کلام پر زندگی کے ان پہلوؤں کا جو اثر ہے اُس کے لئے زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں۔ صرف دو ایک شاعروں کے کلام کی مثالیں کافی ہیں ؎

مستقل ایسا ہُوا جو اتفاق | مرگ ان بچوں کی گزری سب پہ شاق
حفظ اس کی کوکھ کا لازم ہُوا | جھاڑنے پھونکنے کا ہر اک عازم ہُوا
نذریں مانیں نقش لائے ڈھونڈ کر | نیل کے ڈوروں میں باندھے (؟)
غنچوں پر بعضوں نے افسوں لکھے | بعضوں نے تعویذ لے کر خوں لکھے
گوشت کی چیلوں کو پھینکی بوٹیاں | ماش کی موٹی پکائیں روٹیاں
بو بہر یہ کے تئیں مانا بہت | بلیوں کو بھی دیا کھانا بہت (میر)

لاتا گل و عطر میں کبھی گر — فرماتے یہ مجھ سے مسکرا کر
یہ گل تو عمل کیا ہوا ہے — یہ عطر فسوں پڑھا ہوا ہے
سونگھوں ہی اسے نہ میں لگاؤں — ممکن نہیں تیرے دم میں آؤں (مومن)
کیا پنڈتوں نے جو اپنا بچار — تو پھر انگلیوں پر کیا کچھ شمار

. . . .

مقرر ترے چاہئے ہو پسر — کہ دیتی ہے یوں اپنی پوتھی خبر (میرحسن)
حلوے کی پکا کر اک کڑھائی — شیرینی دیو کو چڑھائی (نسیم)
پالا کس کس طرح نہیں جانی — کون منت تھی جو نہیں مانی
روشنی مسجدوں میں کرتی تھی — جا کے درگاہ چوکی بھرتی تھی

. . . .

ان مثالوں کے علاوہ ریختی میں کثرت سے ایسے عقائد کی مثالیں ملتی ہیں جن کا انداز قریب قریب یہی ہے اور جس سے انداز ہوتا ہے کہ عام مذہبی عقائد شاعری پر کس طرح اپنا اثر کرتے ہیں۔

سیاسی انقلابات کی وجہ سے بھی انسان کے مذہبی عقائد میں بڑا تزلزل پیدا ہو جاتا ہے، یہ ذکر ذرا زیادہ تفصیل چاہتا ہے اور اس لئے اس کو سیاسی انقلابات کے سلسلہ میں زیادہ تفصیل سے بیان کیا جائے گا۔ لیکن اس کے علاوہ ابھی ایک خاص چیز کا ذکر بے حد ضروری ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ مذہب کے مختلف پہلو کس حد تک شاعری پر اپنا اثر ڈالتے ہیں۔

ہر قوم کے لوگ سال میں کچھ نہ کچھ تیوہار ضرور مناتے ہیں اور ہر جگہ ان تیوہاروں کے ساتھ مذہب ملا ہوا ہے۔ ہر تیوہار کی بنیاد کسی نہ کسی مذہبی واقعہ سے ہے اس لئے ان کی حیثیت بھی ایک مذہبی چیز کی سی ہو گئی ہے اور لوگ اسے مذہب کا خاص جزو سمجھ کر خاص خاص تیوہاروں میں مخصوص باتیں عمل میں لاتے ہیں۔ شاعری انسانی زندگی کے اس پہلو سے بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی اور اس پہلو کے اظہار کے بعد ہمیں اس کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ مذہب کے مختلف پہلوؤں کو شاعری سے کتنا قریب کا تعلق ہے۔

ہندوستان کے تیوہاروں میں بہت سے تو ایسے ہیں جو حقیقت میں موسموں کے سلسلے میں ہوتے ہیں اور اس لئے اُن کی مختلف خصوصیات مناظرِ فطرت کی تحت میں زیادہ موزوں طریقے سے بیان ہو سکتی ہیں۔ اس جگہ صرف دو خاص تیوہاروں اور اُن کے ایسے خاص پہلوؤں کا ذکر کیا جائے گا جنہوں نے ہماری شاعری پر اثر ڈالا ہے۔

ہولی اور دیوالی پر اردو کے قدیم اور جدید شاعروں نے جو مستقل نظمیں لکھی ہیں اُن کا ذکر تو بعد میں ہوگا پہلے چند غزل گو

ہاروں کے بعض بعض ایسے اشعار درج کئے جاتے ہیں جن میں انہوں نے ان دونوں تیوہاروں کی خصوصیتوں کو اپنے جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے اور ان سے تشبیہ اور استعاروں کا کام لے کر شاعرانہ لطف پیدا کیا ہے ؎

ع نین دیول میں پتلی ہے ویا کعبہ میں ہے اسود (ولی)

تری زلفاں کے حلقے میں دسے یوں نقش رُخ روشن   کہ جیسے ہند کے بھیتر لگیں دیوے دوالی میں (〃)

. . . .

بتاتے ہیں ہم تم کو گیا شیخ جیو   ذرا آنے دیجے تو ہولی کی رُت (انشاء)

ہجوم رکھتے ہیں جاں بازیوں ترے آگے   جواریوں کا دوالی میں جیسے جمگھٹ ہو (ناسخ)

ہولی کے اب بہانے چھڑکا ہے رنگ کس نے   نام خدا تجھ اوپر اس آن عجب سماں ہے

خاکِ شہیدِ ناز سے بھی ہولی کھیلئے   رنگ اس میں ہے گلال کا بُو ہے عبیر کی (آتش)

میر اور نظیر اکبرآبادی کے علاوہ موجودہ دور شاعری میں ان دونوں تیوہاروں پر جو مستقل نظمیں لکھی گئی ہیں۔ اُن سے ہر شخص واقف ہے لیکن میر اور نظیر کی نظمیں اس اثر کی زیادہ دلکش مثالیں پیش کرتی ہیں ؎

آؤ ساقی بہار پھر آئی   ہولی میں کتنی شادیاں لائی

جس طرف دیکھو معرکہ سا ہے   شہر ہے یا کوئی تماشا ہے

. . . .

. . . .

قمقمے بھر گلال کے مارے   مہوشاں لالہ رُخ ہوئے سارے

خوان بھر بھر عبیر لاتے ہیں   گل کی پتی ملا اُڑاتے ہیں

جشنِ نوروزِ ہند ہولی ہے
راگ اور رنگ، بولی ٹھولی ہے

آئے تکلیں بنا کے صورت باز   دُرم ڈھاڑی بنے بجا کر ساز

کوئی جوگی کوئی فقیر بنا   کوئی ڈاڑھی لگا کے پیر بنا

کوئی بنیا بنا کوئی اوباش   نقل کرتے تھے ان سبھوں کی معاش

کچھ سپاہی بنے تھے کچھ تجار   کوئی زاہد ہوا کوئی خمار

جس کی تقلید کی سو ویسی طرح   اصل ہوتی نہیں ہے ایسی طرح (میر)

دوالی سے

جہاں میں یارو عجب طرح کا ہے یہ تیوہار | کسی نے نقد لیا اور کوئی کرے ہے اُدھار
کھلونے کھیلوں بتاشوں کا گرم ہے بازار | ہر اک دُکاں میں چراغوں کی ہو رہی ہے بہار

سبھوں کو فکر ہے اب جا بجا دوالی کا

مٹھائیوں کی دُکانیں لگا کے حلوائی | پکارتے ہیں کہ لالہ" دیوالی ہے آئی"
بتاسے لے کوئی برنی کسی نے تلوائی | کھلونے والوں کی ان سے زیادہ بن آئی

گویا انہوں کے واں راج آگیا دوالی کا

ہر اک مکاں میں جلا پھر دیا دوالی کا | ہر اک طرف کو اُجالا ہوا دوالی کا
صرف حرام کی کوڑی کا جن کا ہے بیوپار | اُنہوں نے کھایا ہی اس دن کے واسطے اودھار
کہے ہے ہنس کے قرضخواہوں سے ہر اک اک بار | دوالی آئی ہے سب دھن چلائینگے اک بار

خدا کے فضل سے ہے آسرا دوالی کا

کسی نے گھر کی حویلی گرو رکھا ہاری | جو کچھ بھی جنس میسر بنا بنا ہاری
کسی نے چیز کسی کی چرا چھپا ہاری | کسی نے گٹھڑی پڑوسن کی اپنی لا ہاری

یہ ہار جیت کا چرچا پڑا دوالی میں

(نظیر)

اس طرح کی مثالیں ہمیں سب سے زیادہ نظیر اکبر آبادی کے کلام میں ملتی ہیں جن میں انہوں نے ان مخصوص تیوہاروں کی تمام جزئیات کو نہایت کمال کے ساتھ نظم کیا ہے۔ اور اس طرح مذہب کے اس پہلو سے ہماری شاعری مقامی خصوصیات کے اس رنگ میں رنگی گئی۔

مجموعی حیثیت سے ہم نے جن جن طریقوں سے شاعری کی مختلف اصناف پر نظر ڈالی اور اس کی مختلف اور متعدد مثالیں دکھیں اُن سے بہت اچھی طرح اندازہ ہو سکتا ہے کہ مقامی مذہب کی مختلف خصوصیات نے شاعری کو اپنے رنگ میں رنگا اور اس لئے اُردو شاعری ہندوستان کی مقامی شاعری معلوم ہونے لگی ۔

سید وقار عظیم

ردِ عمل

دلِ پُر نور کو تاریک بنا دے کوئی
شمعِ احساس کو اے کاش بجھا دے کوئی

کیا ملا محرمیٔ راز سے جز حسرت و غم
آہ پھر بے خبرِ راز بنا دے کوئی

عقل کے ڈستے ہوئے سانپ کو ممکن ہو اگر
رُوحِ پاکیزہ کے ایواں سے اٹھا دے کوئی

علم و عرفاں کے گہر ہائے گراں مایہ کو
کاش پھر گردِ جہالت میں دبا دے کوئی

شرم سی آتی ہے اب نازِ خردمندی سے
از سرِ نو مجھے دیوانہ بنا دے کوئی

مرے افکار سے مرجھائے ہوئے ہونٹوں سے
مسکراہٹ کی حسیں لہر اٹھا دے کوئی

میری ظلمات سمارات درخشاں ہو جائے
آہ خوابیدہ ستاروں کو جگا دے کوئی

مری مغموم و حزیں صبح شگفتہ ہو جائے
غنچے دلگیر ہیں کیوں ان کو ہنسا دے کوئی

آہ وہ عیش جو مہمل نظر آتے تھے مجھے
رُوشناس اُن سے پھر اک بار کرا دے کوئی

یہ نہ ممکن ہو تو از رُوئے مروّت اک دن
بے خطر مجھ کو عدمؔ زہر پلا دے کوئی

عدم

پیار

وحشتِ عشق اُس آسودۂ وحشت پہ نثار
چاکِ دل کو نہ کیا چاکِ گریباں جس نے

طائرِ سدرہ اُس افتادۂ اُلفت پہ نثار
نہ کیا جذبِ تمنا کو پر افشاں جس نے

وا ہے اُس کے لئے آغوشِ شبستانِ نگار
نہ کیا شامِ جدائی کو پشیماں جس نے

نکہتِ گیسوئے جاناں کو ہے حسرت اُس کی
نہ کیا بوئے محبت کو پریشاں جس نے

حلقۂ بازوئے محبوب ہے قسمت اُس کی
آرزوؤں کو کیا قیدیٔ زنداں جس نے

خود محبت ہی ہے اُس مردِ وفا کا درماں
نہ کیا دردِ غمِ عشق کا درماں جس نے

اِس کا ایثار ہے ایثار! ـــ کہ سو بار کیا
لذتِ درد کو بھی درد پہ قرباں جس نے

ایسے دیوانے کو محبوب نہ کیوں پیار کرے
جو نہ محبوب سے بھی عشق کا اظہار کرے

روش صدیقی

گزری ہوئی باتیں

(عشق، رقابت اور حسد کی ایک دردناک داستان)

۱۹۱۳ء کا ذکر ہے کہ میں اٹلی میں مصروف سیاحت تھا۔ میرا خیال ہے کہ کسی ملک سے بخوبی واقف ہونے کے لئے پاپیادہ اس کی سیاحت کرنی چاہئے اور میں اسی طریقہ پر کاربند تھا۔

ایک روز سرِ شام گھومتا پھرتا ایک سرائے تک جا پہنچا جس کے پھاٹک کے سامنے ایک ضعیف العمر شخص کرسی پر بیٹھا، ڈوبتے ہوئے سورج کی خوشگوار گرمی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میں نے سگریٹ سلگانے کے لئے اُس سے ایک دیاسلائی مانگی۔ اس نے دیاسلائی مجھے دیتے ہوئے کہا "تشریف رکھئے! آپ تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں"۔ میں اُس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے شراب کا ایک لبریز جام میری طرف بڑھا کر، بوڑھے کھوسٹ لوگوں کی طرح گفتگو کا لامتناہی سلسلہ جاری کر دیا۔ اس نے بغیر پوچھے ہی مجھے بتا دیا کہ میں سرائے کا مالک ہوں اور میرا نام الفریڈو ہے۔ اس کے بعد اُس نے میرے متعلق سب کچھ دریافت کر لیا۔ پھر اٹلی کے موسم، انگور کی فصل اور حکومت کے عاید کردہ بھاری بھاری ٹیکسوں کی نسبت خیال آرائی کرنے لگا۔

باتوں ہی باتوں میں کافی وقت نکل گیا۔ اچھی خاصی رات ہو گئی۔ میں نے اجازت چاہی۔ مگر چونکہ میری جائے قیام بارہ میل کے فاصلہ پر تھی اور رات کے وقت اتنی طویل مسافت طے کرنا خطرہ اور زحمت سے خالی نہ تھا، اس لئے الفریڈو نے اصرار کیا کہ رات میں اسی کی سرائے میں گزاروں۔

اُس نے کہا "میں آپ کو صاف ستھرا کمرہ دوں گا۔ یہ کوئی معمولی سرائے نہیں ہے اور کسی ایسے ویسے مسافر کو میں یہاں ٹھیراتا بھی نہیں ——— مگر جناب آپ کی باتیں مجھے بڑی دلچسپ معلوم ہوتی ہیں۔ براہِ کرم میری دعوت قبول فرمائیے!"

شکی مزاج لوگوں کے نزدیک، سناٹے کے مقام پر، رات کے وقت، کسی ایسے مسافر کو جس کی جیب زرِ نقد سے پُر ہو، اس قسم کی دعوت یقیناً قتل و غارت کے منشاء سے دی جاتی ہے۔ مگر میں شکی مزاج نہیں۔ اور الفریڈو بظاہر قتل و غارت کرنے والا انسان معلوم بھی نہیں ہوتا تھا۔

تاہم اس نے میرے آرام کا خون کر ڈالا اور میری نیند لوٹ لی۔

قصہ کوتاہ میں نے اس کی دعوت قبول کر لی۔ خندہ پیشانی سے میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد اس نے سرائے کی طرف

رُخ کرکے پکارا "تِھلما"

لمحہ بھر بعد تِھلما دروازہ پر آموجود ہوئی۔ اُس کے ہاتھ میں ایک چراغ تھا جس کی دھیمی دھیمی روشنی میں مَیں نے دیکھا کہ وہ بڑھاپے سے کُبڑی ہو رہی ہے اور اُس کے خوش آئند چہرہ پر سینکڑوں جھریاں پڑی ہیں۔

الفریڈو نے اُسے ایک "معزز مہمان" کے لئے کمرہ درست کرنے اور کھانا تیار کرنے کی ہدایت کی اور پھر گفتگو میں محو ہو گیا۔

کھانے سے فراغت پا کر ہم دوبارہ پھاٹک کے سامنے کرسیوں پر آ بیٹھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی، ہلکی ہلکی ہوا، اور اچھی اچھی فضا نے الفریڈو کو چند گزری ہوئی باتیں" یاد دلا دیں، جنہیں وہ برسبیلِ تذکرہ بیان کرنے لگا۔ اُس کا طرزِ بیان ایک ایسے مقرر کا سا تھا جسے سامع کی حوصلہ افزا توجہ اور اس پر مستزاد شراب کے نشہ نے پُرجوش بنا دیا ہو۔

اُس نے ایک طویل تمہید کے بعد کہا "میں شہر پیرو گیا میں پیدا ہوا تھا۔ جہاں میرے والد تجارت کرتے تھے۔ ان کی صرف دو اولادیں تھیں ـــــ ایک میں اور دوسرا آرٹرو۔ ہم دونوں توام بھائی تھے اور شاید اسی لئے ہم شکل ہم خیال اور ہم مزاج واقع ہوئے تھے۔ میرے بھائی کو بحری سفر سے دلی لگاؤ تھا۔ چنانچہ وہ ایک جہاز کا کپتان بن گیا۔ مجھے بھی جہاز رانی سے رغبت تھی مگر والد نے میری مرضی کے خلاف مجھے تجارت میں لگا دیا ـــــ یونہی دن گزرتے رہے یہاں تک کہ میں نے اپنی عمر کی بائیسویں منزل میں قدم رکھا۔

یک بیک میری زندگی میں ایک انقلاب آ گیا ـــــ ایک روز کمپنی باغ میں ٹہلتے ٹہلتے میری آنکھیں ایک دوشیزہ سے لڑ گئیں۔ وہ حسین تھی اور پُرشباب! ـــــ موسمِ بہار کی ایک پُرکیف صبح کے مانند حسین، اور باغِ اِرم کی ایک نیم شگفتہ کلی کی طرح پُرشباب!

"اور لطف یہ ہے کہ میں اُسے پہلے سے جانتا بھی تھا۔ اُس کا نام تِھلما تھا۔ تاہم اُس وقت مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے آج پہلی بار دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ میں یہ بھی محسوس کر چکا تھا کہ وہ بلا کی حسین اور بالکل جوان ہے۔ مگر اب سے پیشتر اس احساس نے کبھی میرے دل کی دھڑکن میں اضافہ نہیں کیا تھا۔ بارہا میں اُس سے گفتگو بھی کر چکا تھا۔ مگر آج اُس کی مخمور آنکھیں اور متبسم مگر خاموش لب خدا جانے کیا کہہ رہے تھے ـــــ ہنوز اُس کی نشیلی آنکھوں کی چمک اور پتلے پتلے ہونٹوں کی مسکراہٹ فنا نہ ہونے پائی تھی کہ میرا دل اُس کے قدموں پر لوٹنے لگا۔

"اور سچ جانئے جناب، کہ اگر ایک منٹ پہلے مجھے اُس کی موت کی خبر بھی ملتی تو شاید میرے دل پر مطلق اثر نہ ہوتا۔

"میں اُس سے کچھ کہہ نہ سکا۔ بات ہی نہ کر سکا۔ بالکل گم سُم ہو کے رہ گیا۔ اور تھوڑی دیر بعد گھر چلا آیا ـــــ مگر اور اُداس!

"دوسرے دن اُسی وقت میں پھر کمپنی باغ جا پہنچا۔ وہ پھر مجھے ملی۔ اور اس کی خمار آلود آنکھوں نے مجھے ایک پیغام دیا جسے
ل کرتے نہ معلوم کیوں میرا جی ہچکچاتا تھا۔

"چند روز اسی طرح گزر گئے!

"محبت کے سلسلہ میں یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ اسی لئے عرضِ حال میں مجھے دقتیں نظر آتی تھیں۔ بارہا میں نے چاہا کہ اُس پر
ں بڑھتی ہوئی محبت کا اظہار کر دوں۔ ایک مرتبہ ساری رات جاگ کر بیانِ مدعا کے لئے مناسب الفاظ بھی چن لئے اور کئی دفعہ تنہائی
ں انہیں مؤثر ترین طریقہ پر ادا کرنے کی مشق بھی کر لی۔ مگر جب موقع آیا۔ تو جرأت و ہمت نے جواب دے دیا۔ زبان نے ساتھ نہ دیا۔
بوں پر مُہر لگ گئی۔

"تھوڑے دن بعد وہ شہر سے کہیں باہر چلی گئی۔ اُس کی جُدائی نے میرے رہے سہے صبر و قرار کو بھی بھاڑ میں جھونک
یا۔ اور شاید میری عقل بھی زائل ہو گئی تھی۔ کیونکہ ایک دو نہیں، متعدد راتیں میں نے اس کے گھر کے سامنے اندوہ و یاس کے
الم میں کھڑے ہی کھڑے گزار دیں ——— یقیناً محبت ایک جنون ہے، ایک خبط ہے، اور نہایت ہی خطرناک خبط!"

اس قدر بیان کرنے کے بعد، شراب کے دو ایک گھونٹ چڑھانے کے لئے الفریڈو رُک گیا۔ ابھی اس نے گلاس منہ سے لگایا
ں تھا کہ سرائے کے اندر سے تھلما کی آواز آئی:۔ "رات زیادہ گزر گئی ہے، الفریڈو!"

الفریڈو ہنس دیا۔ اور جواب دیئے بغیر اپنی دلچسپ داستان کا بقیہ حصّہ یوں بیان کرنے لگا:۔

"محبت نے میرے دل و دماغ پر مسلّط ہو کر مجھے بالکل نکمّا بنا دیا تھا۔ ایک تو کام کرتا ہی نہیں، اور اگر کرتا بھی تو نہایت
بے دلی سے اور بالکل غلط سلط۔ اور پھر اپنی غلطیاں اپنے والد کے سر تھوپ کر اُن سے لڑتا ——— میری بشّاش طبیعت کے
س انقلاب نے انہیں بھی حیران و پریشان کر رکھا تھا۔

"آخر خدا نے میری سُن لی۔ تھلما واپس آ گئی۔ میں کمپنی باغ میں اُس سے ملا اور بصد مشکل کانپتے ہوئے ہونٹوں اور دھڑکتے ہوئے
دل کے ساتھ اپنی بے پناہ محبت کا اظہار کرنے لگا۔ نہ معلوم جوشِ جنوں میں کیا کیا کچھ بکتا رہا۔ وہ ایک ایک لفظ توجہ سے سنتی رہی۔ جب
میں چپ ہوا تو وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا دی ——— اب وہ میری ہو چکی تھی!

"اس مبارک دن کے بعد، ہر شام مجھے کمپنی باغ کے ایک سنسان گوشہ میں پاتی، جہاں تھلما پہلے ہی سے میری منتظر ہوتی ———
ہم گھنٹوں بیٹھے اپنے خوشگوار مستقبل کے متعلق خیال آرائی کرتے رہتے، اپنے بیانِ محبت پر بوسوں کی مہر ثبت کرتے اور دوسرے دن
ملنے کے لئے جُدا ہو جاتے۔

"آخر میرے والد کو میری محبت کی خبر ہو گئی اور انہوں نے تھلما کے والدین سے مل کر یہ طے کر لیا کہ آئندہ کرسمس کے موقع

پر ہماری شادی ہو جائے۔

"اُن دنوں ہمارے شہر میں ایک کارنیوال آیا ہوا تھا ـــــ اُس زمانہ کے لوگ تمام تفریحوں پر کارنیوال کو ترجیح دیتے تھے۔ جب کوئی کارنیوال آتا، تو مرد اپنا کاروبار بند کر دیتے۔ عورتیں خانگی ذمّہ داریوں سے بے پروا ہو جاتیں، اور بچے اپنے عزیز ترین کھلونے تک بھول بیٹھتے ـــــ الغرض کیا بوڑھے اور کیا بچے! کارنیوال کا شوق سب کو دیوانہ بنا دیتا۔

"میں نے بھی تھلما کے ساتھ کارنیوال چلنے کے لئے ایک دن مقرر کیا ـــــ اب ذرا غور کیجئے جناب کہ اس زندگی میں کیسے کیسے عجیب واقعات رونما ہوتے ہیں۔ ادھر چند روز سے میرے والد کی طبیعت کچھ ناساز رہنے لگی تھی۔ اس خیال سے کہ شاید طبیعت زیادہ بگڑنے کی صورت میں انہیں میری ضرورت پڑے، میں نے انہیں بتا دیا کہ ۷ بجے شام کو تھلما سے ملنے کمپنی باغ جاؤں گا اور وہاں سے ہم دونوں کارنیوال چلے جائیں گے۔

"سوءِ اتفاق سے اس روز میری گھڑی سُست ہو گئی اور اس لئے مجھے کمپنی باغ پہنچنے میں نصف ساعت کی تاخیر ہو گئی۔ تھلما جائے مقررہ پر موجود نہ تھی۔ میں سمجھا کہ شاید میرے دیر کرنے پر برہم ہو کر واپس چلی گئی۔ مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ اگر میں ذرا بھی ٹھنڈے دل سے غور کرتا تو یہ حقیقت مجھ پر روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی کہ شام کے وقت باغ کے سنسان حصّہ میں کسی نوجوان لڑکی کا تنہا ٹھیرنا مناسب نہیں۔ مگر قسمت کسی اور ہی گھات میں تھی۔ اس وقت تو مجھے یہی سُوجھ رہا تھا کہ اپنی تمام تر رعنائی و زیبائی کے باوجود تھلما کے مزاج میں غرور و غصّہ کا عنصر بدرجۂ اتم موجود ہے۔

"ایک مایوس انسان کی طرح غم و غصّہ میں بھرا، ابھی میں وہیں کھڑا تھا کہ میرے سامنے سے ایک نوجوان جوڑا گزرا گھُل مل کر باتیں کرتا، ہشاش بشاش، ہنستا مسکراتا اور چُہلیں کرتا ـــــ یہ دیکھ کر میرے سینے میں آتشِ رشک بھڑک اُٹھی۔ میں سوچنے لگا۔ کاش تھلما موجود ہوتی! تو میں بھی یونہی خوش خوش کارنیوال جا پہنچتا ـــــ مگر وہ بگڑ کر چلی گئی۔ ضدن کہیں کی!

"میں اسی رنج و یاس کے عالم میں پیچ و تاب کھاتا، ایک شراب خانہ میں جا گھُسا اور اندھا دُھند جام پر جام چڑھانے لگا۔ ابھی ایک ہی بوتل پی تھی کہ میرے دل میں غصّہ کے ساتھ ایک خوفناک انتقامی جذبہ نے بھی جگہ لے لی اور میں سوچنے لگا کہ کسی طرح تھلما کو آج کی نازیبا حرکت کی سزا دینا چاہئے۔

"شراب خانہ میں مجھے ایک شناسا سوداگر مل گیا جو اکثر ہماری دکان پر مختلف چیزیں سستے سستے داموں پر فروخت کر جایا کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ ایک سونے کی صلیب اور ایک چاندی کے دستے والا خنجر فروخت کرنا چاہتا تھا۔ سر دست میرے پاس قیمت ادا کرنے کے لئے کافی رقم نہ تھی۔ مگر میری دکان ایمانداری اور خوش معاملگی میں دور دور مشہور تھی۔ چنانچہ اس نے قیمت کا معاملہ دوسرے دن پر اُٹھا رکھا اور دونوں چیزیں میرے حوالہ کر کے چلتا بنا۔ میں نے صلیب کوٹ کے اندر والی جیب میں رکھ لی اور

ہاتھ میں لئے شراب خانہ سے نکل پڑا۔

"وہ کارنیوال کی آخری حالت تھی۔ لوگ خوشیوں کے راگ الاپتے اور دیوانوں کی طرح غل غپاڑا مچاتے جوق در جوق کارنیوال کی طرف رواں تھے۔ سب کی دیکھا دیکھی، بالکل غیر ارادی طور پر میں بھی کارنیوال جا پہنچا۔ وہاں یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ تھلما ایک شخص کے ساتھ مصروفِ سیر ہے۔ اُس کا ساتھی مسخروں کا لباس پہنے تھا، اور چہرے پر ایک لمبی سی مصنوعی ناک لگائے تھا۔ موجودہ حالت میں اس کی اصلی شکل و شباہت کا اندازہ لگانا محال تھا۔ اُس کا ہاتھ تھلما کی کمر میں پڑا تھا۔ اور وہ دونوں ہنس رہے تھے۔ خوب قہقہے مار کر ہنس رہے تھے۔

"میں سچ کہتا ہوں، جناب، کہ اگر آسمان سے کڑکتی ہوئی بجلی بھی گرتی تو اس جاں سوز منظر کی طرح مجھے نہ جلا سکتی!

"تھلما کو اپنا سمجھنے کی خوشی میں میں یہ بالکل بھول بیٹھا تھا کہ شہر پیرو گیا میں میرے علاوہ اور بھی کئی گبرو جوان موجود ہیں۔ مگر اب ایک ایک کر کے مجھے اپنے سب رقیب یاد آ رہے تھے۔

"خنجر میان سے باہر ہو چکا تھا۔ اگر ایک منٹ کا وقفہ اور ملتا تو وہ میرے رقیب کی پشت میں پیوست ہو کر اُسے دوسری دُنیا میں منتقل کر دیتا ـــــ مگر ایک جمِ غفیر کے بے پناہ ریلے نے مجھے دھکیل دھکیل کر اپنے انتقام سے دور کر دیا۔ اور وہ دونوں بھی کہیں بھیڑ میں میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔

"جناب! آپ میری حالت کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ میرا دل آتشِ حسد سے جل رہا تھا، غم و غصہ نے مجھے دیوانہ بنا رکھا تھا۔ شراب کا نشہ بدمستی سے دوسرے درجہ پر تھا اور رقابت کی پیاس بجھانے کے لئے میرے پاس ایک خنجرِ آبدار موجود تھا ـــــ ظاہر ہے کہ اُس کا انجام کچھ ہولناک ہی ہونا تھا۔

"کارنیوال میں تماشائیوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر مجھے خلافِ مرضی اِدھر اُدھر دھکیلتا پھرتا تھا اور میری متجسس نگاہیں ہر لمحہ میں تھلما اور اُس کے ساتھی کو تلاش کرتی تھیں۔ جوئندہ یابندہ! آخر میری نظروں نے کارنیوال کے پھاٹک کے پاس انہیں ڈھونڈ ہی لیا۔ میں اُن کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ تاہم میرا ہاتھ خنجر کی طرف نہ بڑھا۔ کیونکہ میرا عقدہ اب کسی قدر عقل کے قابو میں آ چکا تھا اور انتقام کی آگ بجھانے کے لئے میں کسی مناسب موقع کا منتظر تھا تاکہ قانون کے ہاتھوں سُولی کا منہ نہ دیکھنا پڑے۔

"کارنیوال سے نکل کر وہ دونوں تھلما کے گھر کی جانب روانہ ہو گئے اور اُن کے پیچھے پیچھے میں بھی چل پڑا۔ وہ دونوں اپنی گفتگو میں اس درجہ کھوئے تھے کہ انہوں نے ایک مرتبہ بھی پلٹ کر یہ نہ دیکھا کہ ان کے عقب میں موت کا فرشتہ بنا کون آ رہا ہے!

"جب گھر آ گیا تو تھلما نے اپنی بلوریں باہیں، اپنے ہمراہی نوجوان کے گلے میں حمائل کر دیں اور نہایت گرمجوشی سے اُسے ایک طویل بوسہ دیا ـــــ اُف! جناب! اس جانکاہ منظر نے میرے دل میں حسد و رقابت کی دبی ہوئی آگ کو از سرِ نو بھڑکا دیا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ میں

دونوں کو قتل کر ڈالوں گا! مگر مرد کو پہلے!

"تھلما گھر چلی گئی۔ نوجوان ایک مرتبہ کھلکھلا کر ہنسا اور نہایت اطمینان کے ساتھ سیٹی بجاتا ہوا ایک طرف روانہ ہوگیا۔ چند گام کے فاصلہ سے میں بھی اس کا تعاقب کرنے لگا۔

"وہ اس طرح دوسروں کی توجہ جذب کر رہا تھا جیسے مقناطیس لوہے کے ٹکڑے کو کھینچتا ہے۔ مرد اور بوڑھی عورتیں تو درکنار حسین اور جوان چھوکریوں تک کے پاس اُس کے لئے ایک لنواز تبسم، پُرمذاق جملہ، یا کوئی چبھتی سی پھبتی ضرور تھی، اور میرے لئے کسی کے مُنہ میں زبان تک نہ تھی۔ بلکہ اکثر راہگیر مجھے دیکھ کر اس طرح کترا جاتے گویا میں کوئی ڈراؤنی چیز ہوں۔

"غالباً تھلما پوری طرح میرے عزیز دوست، کی تشنگیٔ عشق نہ بجھا سکی تھی۔ کیونکہ راستہ میں ایک اور شوخ وطرار لڑکی کو دیکھ کر اُس کا دل مچل گیا اور وہ معنی خیز انداز سے مسکرانے لگا۔ جواباً وہ بھی متبسم ہوگئی۔ بس پھر کیا تھا! وہ لپکا اور لڑکی کا ہاتھ تھام کر اُسے قریب والے ریسٹران میں لے گیا۔ وہاں بلند قہقہوں کے درمیان اُن دونوں نے خوب شراب پی۔ میں باہر کھڑا دیکھتا رہا۔

"ریسٹران سے نکل کر وہ دونوں نہایت جوش کے ساتھ گلے ملے، ایک وداعی بوسہ لیا، اور الگ الگ روانہ ہوگئے۔ لڑکی اِدھر اور وہ اُدھر! پہلے کی طرح خاموشی سے میں اُس کا تعاقب کرتا رہا۔

"آخر وہ موقع جس کا مجھے انتظار تھا آہی گیا ـــــ سنسان سڑک، ہولناک سناٹا، بے پناہ تاریکی، ہُو کا عالم، کوئی یار نہ مددگار، گواہ نہ شاہد! ـــــ بھلا اس سے بہتر اور کون موقع ہوسکتا تھا؟ میں نے دو چار لمبے لمبے ڈگ مارے اور قریب جا کر اُس کا گریبان مضبوطی سے پکڑ لیا۔ وہ چونک اُٹھا، اُچھل پڑا، ڈر گیا، اور چیخا:- 'کون ہے؟' ـــــ میں پاگل ہو رہا تھا، بالکل پاگل۔ حسد و رقابت کے علاوہ شراب نے بھی مجھے دیوانہ بنانے میں کافی حصّہ لیا تھا۔ میں نے ایک خوفناک ہنسی کے ساتھ جواب دیا:- 'ملک الموت!' ـــــ وہ گھبرا گیا۔ اور اپنی مدافعت کے لئے ایک چاقو جیب سے نکال کر میرے شانے میں بھونک دیا۔ چاقو کھاتے ہی میں نے جھٹ اپنا خنجر اُس کے سینے میں اُتار دیا۔ ایک دلدوز چیخ کے ساتھ وہ زمین پر آرہا۔ خنجر اب تک اُس کے سینے میں پیوست تھا اور مجھے اُس کی لاش چھپانے کی فکر لگی تھی!

"میں نے اُس کی لاش کو گھسیٹ کر ایک مکان کے بند دروازہ کے برابر دیوار کے سہارے بٹھا دیا۔ سڑک کے ٹمٹماتے ہوئے لیمپ کی دھندلی روشنی میں ایسا معلوم ہونے لگا جیسے کوئی شرابی ضرورت سے زیادہ پی لینے کے بعد، دیوار کے سہارے بیٹھا اُونگھ رہا ہو۔

"میرے شانے کا زخم کچھ گہرا نہ تھا۔ کیونکہ میرے دبیز کپڑوں میں پیرتا ہُوا اُس کے چھوٹے سے چاقو کا تھوڑا ہی سا حصّہ میرے جسم میں اُتر سکا تھا۔ میں نے رومال پھاڑ کر زخم پر پٹی باندھ دی۔

"اب مجھے تھلما سے بھگتنا تھا۔

"میں سیدھا تھلما کے گھر جا پہنچا۔ دستک دی، اور اندر بلا لیا گیا۔ وہ جاگ رہی تھی، اور گھر پر تنہا تھی۔ گھر والے ہنوز کارنیوال

ی دلچسپیوں میں حصہ لے رہے تھے۔ مجھے تحیّر آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے تھلما نے پوچھا :۔ "تم واپس کیوں آگئے ؟"

" میں زور سے ہنس پڑا۔ وہ ڈر کے پیچھے ہٹ گئی۔ اُس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ مجھے نشہ میں چور، اور غلط فہمی میں مبتلا تصور کر ہی ہے —— میں ہنستا تھا۔ مگر اُس سے انتقام لینے کے لئے میرے ہاتھوں میں کافی طاقت تھی۔

میں نے پوچھا :۔ "اُس کا کیا نام تھا؟" —— اُس نے جواب دیا "کہں کا ؟" میں پھر حقارت آمیز انداز سے ہنسا اور پوچھنے لگا "وہ تمہیں ماں ملا تھا؟" —— اُس نے پھر تعجب سے پوچھا "کون ؟"

" اس 'تجاہلِ عارفانہ' پر مجھے غصہ آگیا اور میں نے جھنجھلا کر کہا :۔ "مجھ سے پوچھتی ہو کون ؟ تم خود نہیں جانتیں ؟ —— مکار کہیں ! وہی جس کے ساتھ کارنیوال میں تم گلچھرے اُڑا رہی تھیں ؟"

" اس نے حیرت و استعجاب سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا :۔ "کارنیوال تو میں تمہارے ہی ساتھ گئی تھی"

" اُس کی معصوم آنکھیں گواہی دے رہی تھیں کہ وہ سچ بول رہی ہے، تاہم میں نے جو کچھ دیکھا تھا، اپنی ہی آنکھوں سے دیکھا ا۔ میں سوچنے لگا ! الٰہی یہ کیا ماجرا ہے ؟ آخر اس نتیجہ پر پہنچا کہ شاید میرے بھیس میں کوئی اور شخص تھلما کو کارنیوال لے گیا ہوگا۔

جب میں نے تھلما پر یہ خیال ظاہر کیا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور کہنے لگی :۔ "تم اور صرف تم میرے ساتھ تھے۔ مسخروں کا لباس پہنے، اور ایک لمبی سی مصنوعی ناک لگائے ! —— مگر ——"

"میں نے کہا۔ 'خدا گواہ ہے کہ میں تمہارے ساتھ نہ تھا۔ مجھے دیر ہو گئی تھی اور جب میں کیپنی باغ پہنچا تو تم وہاں موجود نہ تھیں'۔

" میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے خبطی سمجھ رہی ہے —— کیا میں واقعی دیوانہ تھا ؟ کیا یہ سب کچھ صرف خواب تھا ؟ جگر کانپ رہا تھا۔ بدن میں رعشہ تھا اور میں سوچ رہا تھا۔ یک بیک مجھے اُس لاش کا خیال آیا جو سڑک کے کنارے، دیوار کے سہارے پڑی تھی —— میں پلٹا، اور تھلما کو متحیّر اور مبہوت کھڑا چھوڑ کر، سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔

" ذرا غور کیجئے، جناب، میں آیا تھا تھلما کو قتل کرنے۔ اور اب بھاگا جا رہا تھا، بالکل غیر ارادی طور پر، قطعی دیوانگی کے عالم میں ! یہی میرے افسانہ کا عجیب ترین پہلو ہے۔ میں خود نہیں سمجھ سکتا کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔ میرا خیال ہے کہ شاید سخت امتحان کے موقع پر انسان کا دماغ دلائل و براہین کی قیود سے آزاد ہو کر اکثر اپنی ہی سی کر جاتا ہے۔

" جب میں گھر پہنچا تو والد کو ایک کتاب کے مطالعہ میں مشغول پایا۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے پوچھا :۔ 'تم آگئے آلفریڈو، اور آرتھر کہاں ہے ؟'

" آپ کو یاد ہوگا جناب، میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میرا ایک بھائی تھا، مجھ سے بالکل مشابہ !

" میں نے والد سے کہا 'آرتھر تو سفر پر گیا ہے'۔ اور جب میں یہ الفاظ ادا کر رہا تھا تو کوئی غیبی ہاتھ میرے دل کو مسل رہا

تھا۔ والد نے جواب دیا ’آرتھر تو آج واپس آگیا تھا اور تمہیں پوچھتا تھا۔ میں نے بتا دیا کہ ۶ بجے اپنی صنوبر سے ملنے تم کمپنی باغ جاؤ گے۔‘

”یہ سنتے ہی میرے پیروں کی زمین نکل گئی۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا، سر چکرا اٹھا، دل ڈوب گیا، آواز بیٹھ گئی۔ بعد مشکل میں کہہ سکا:۔ ’ابا! مجھے کمپنی باغ پہنچنے میں دیر ہوگئی۔ آرتھر وہاں مجھ سے پہلے پہنچ گیا۔ تھلما نے اس پر میرا دھوکا کھایا ہوگا۔ اور شاید وہ بھی مذاق کی خاطر خاموش رہا۔ وہ دونوں کارنیوال چلے گئے۔ میں نے خود انہیں کارنیوال میں گھومتے پھرتے دیکھا۔ آخری وقت تک اس نے تھلما کو حقیقت سے آشنا نہیں کیا۔ اُسے گھر پہنچ کر میرا مذاق اڑانے کے لئے وہ خوش خوش واپس آرہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اُسے ایک اجنبی رقیب سمجھ کر میں شروع ہی سے اُس کا پیچھا کر رہا تھا۔ غم و غصہ نے مجھے دیوانہ بنا ڈالا تھا، میرا دل آتش رقابت سے جل رہا تھا، میں غضب ناک ہو رہا تھا، اور میرے ہاتھ میں ایک خنجر تھا ——‘

”میرے والد چونک پڑے، اُچھل پڑے، گویا کسی نے گولی ماردی ہو۔ اُنہوں نے گھبرا کر پوچھا ’یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ آرتھر کہاں ہے؟‘ —— میں نے جواب دیا ’وہ مرگیا۔ اور میرا خنجر اُس کے سینے میں پیوست ہے۔‘

”بظاہر میں بالکل پرسکون، مطمئن اور خاموش تھا۔ گویا اس سانحہ نے مجھ پر ذرا بھی اثر نہ کیا تھا۔ مگر در اصل میری حالت اس درجہ قابلِ رحم تھی کہ والد پریشان ہوگئے، مجھے تسلی دینے لگے، اور اس معاملہ کو نہایت ہوشیاری سے چھپا ڈالا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی —— اس واقعہ کے چند ماہ بعد تھلما سے میری شادی ہوگئی۔

”آج کئی سال گزر جانے کے باوجود اپنے بیکس بھائی کی خوفناک موت کی یاد میرے دل میں تازہ ہے۔ اور شاید یہ اسی گناہ کی پاداش ہے کہ آج تک میں دنیا میں پھول پھل نہ سکا۔“

اس نے اپنی داستان ختم کردی۔ میں نے دیکھا اُس کی دہنی آنکھ کی پلکوں پر آنسو کا ایک قطرہ تھرتھرا رہا تھا۔
میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کے کہا، ”خیر! یہ سب گزری ہوئی باتیں ہیں اور اب ان کی اہمیت ختم ہوچکی ہے۔“

مرزا یاور علی

(ترجمہ بہ تصرف)

طائرانِ صحرا[1]

بڑا آنسو

کِس کی آنکھوں سے گرا ہے؟
یہ سمندر —— یہ بڑا سا آنسو

ایک منظر

ویران تھا صحرا
خاموش تھا دریا
دریا کے کنارے
سردی سے ٹھٹھرتا
چپ چاپ تھا بیٹھا
کالا سا پہاڑ ایک

بُلبلے کے نیچے سے

اِس پر بہت ہنستا ہوں میں
ہاں اے خدا سُن تو ذرا
یہ آسماں کا بُلبلا
کیوں تُو نے مجھ پر رکھ دیا

---

[1] یہ دلکش اندازِ تخئیل اردو میں پہلے موجود نہیں اور ایک حد تک جاپانی شاعری کے تاثرات کا نتیجہ ہے۔ لیکن پیشِ نظر لطیف تخیلات ترجمہ نہیں بلکہ طبع زاد ہیں۔ "ھمایوں"

شاعرِ تنہا

صحن میں نرگس کے اک سُوکھے ہوئے پودے کے پاس
ایک تتلی دھوپ میں جس کا چمکتا تھا لباس
اُڑتے اُڑتے ایک لمحے کے لئے آ کر رُکی
اور پھر کچھ سوچ کر صحرا کی جانب اُڑ گئی
یونہی آتی ہے مرے اُجڑے ہوئے دِل تک خوشی
میرے غم سے خوف کھاتی کانپتی ڈرتی ہوئی

بیری کے تلے

اِک دن اس بیری کے نیچے
دنیا کی نظروں سے چھپ کے
پاؤں میں لغزش دل میں دھڑکے
لے کر اک لڑکی آئی تھی

راہبِ خشمگیں

فلک پر چاند کی کھڑکی کھلی ہے
مزے سے ساری دُنیا سو رہی ہے
بیاباں میں گھنے پیپل کے نیچے
خفا ہوں آج میں اپنے خدا سے

دو لڑکے اور ایک لڑکی

سڑک پر تیز لُو جب چل رہی تھی
کنوئیں کے پاس اِک لڑکی کھڑی تھی

ہوا میں اس کی ساری اُڑ رہی تھی
قریب آئے جو مَیں اور میرا ساتھی
بہت تھیں اس کی بانہیں گوری گوری

ضدّی لڑکی

جہاں اک زرد تتلی اُڑ رہی تھی
جہاں شیشم کی اِک ڈالی جُھکی تھی
جہاں ڈالی سے قمری اُڑ گئی تھی
وہیں وہ شوخ ادا لڑکی کھڑی تھی
جو اپنی بات پر اب تک اڑی تھی

سرزمینِ محبّت

جہاں شفاف ندی بہ رہی ہے
جہاں چھوٹی سی اِک کشتی کھڑی ہے
جہاں سُورج مکھی کا پھُول اُگا ہے
پہاڑی پر جہاں سارس کھڑا ہے
وہیں پر چاندنی راتوں کو اکثر
مجھے رہتی ہے تیری یاد شب بھر

مہدی علی خاں

میرؔ کی شاعری پر ایک اجمالی نظر[۱]

"شاعری تخیل و جذبات کی زبان ہے"

ہزلٹ کا یہ جملہ ایسا ہے جس کی تردید میں کوئی لب کشائی نہیں کر سکتا۔ یہ چھوٹا سا فقرہ تمام شاعری کی شرح ہے الفاظ "تخیل و جذبات" کا جامہ پہن کر جب شاعر کے لبوں سے نکلتے ہیں تو سامع کے دل پر منقوش ہو جاتے ہیں۔ یہی شاعری کی جامع تعریف ہے۔

دورِ حاضر ایجاد و اختراع تلاش و جستجو کے لئے مخصوص ہے، آئے دن ہزار ہا قسم کی جدتیں ظہور میں آتی ہیں، آج انسان محض سائنس کی وجہ سے کبھی ہوا میں پرواز کرتا ہے اور کبھی تہ آب محو خرام ہے، وہ برگ و ثمر سے تجربہ حاصل کرتا ہے، پھول پھل کا تجزیہ کر کے اس کے تعمیری اجزا معلوم کرتا ہے مگر پھر بھی ایک چیز رہ جاتی ہے جہاں سائنس کے تجربات لاحاصل ہوتے ہیں، برگ کی رنگت، گل کی نکہت و نزاکت اور پھل کی لطافت سائنس دان کے دائرۂ فہم سے باہر ہے۔ ایک سائنسدان کبھی نہیں سمجھ سکتا کہ تبسم کی رنگینیوں سے آراستہ چہرہ جراحتِ دل کے اسباب اپنے میں کیا کچھ رکھتا ہے، اس کی عقل مادری محبت و پدری شفقت کے سمجھنے سے قاصر ہے یہی وہ خطۂ فردوس ہے جہاں شاعری اور صرف شاعری کی پہنچ ہے، رنج و الم، محبت و الفت، سرور و انبساط کے لطیف جذبات محض شاعری کے ذریعہ ظاہر ہو سکتے ہیں۔

شاعری ہر کس و ناکس کے حصہ میں نہیں آئی، حقیقی شاعر کبھی کبھی پیدا ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ عصرِ حاضر کے رسائل میں اگرچہ "جذبات لطیفہ، افکار عالیہ، کیفیات، تجلیات" جیسے دلکش عنوانات سے تخیلات شاعر پیشِ نظر ہوتے ہیں مگر ان میں اتنی قوت نہیں ہوتی کہ خوابیدہ جذبات میں ذرا بھی حرکت پیدا کر سکیں، معلوم ہوا کہ یہ نہ شاعری ہے اور نہ کوئی شاعر ہے، ہمیں تو اس شاعری کی ضرورت ہے جس میں ہمارے جذبات کا انعکاس ہو جو ہمارے تخیلات کی صحیح تصویر ہو۔ یہ دونوں باتیں میر تقی کے کلام میں بہ درجۂ اتم موجود ہیں۔

"شاعر اپنی صدی کی بہترین تصنیف ہے" جوش ملیح آبادی کا یہ مقولہ بالکل صحیح ہے، ہر شاعر اپنا اور اپنے عہد کا آئینہ ہوتا ہے اس کی شاعری زمانہ کے مذاق اور خصوصیات سے پُر ہوتی ہے، وہ گرد و پیش کے واقعات سے متأثر ہوتا ہے، اپنی زندگی کے نشیب و فراز سے اثر گیر ہوتا ہے اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میرؔ کی شاعری پر نظر ڈالنے سے پہلے ان حالات و واقعات اور ماحول سے آگاہی ہو جائے جس میں اس شاعر شیریں مقال نے پرورش پائی۔

میرؔ صاحب کے والد نے دو شادیاں کیں۔ دوسری شادی سراج الدین علی خاں آرزو کی بہن سے ہوئی میر صاحب انہیں کے بطن سے

۱۷۲۱ء میں پیدا ہوئے میر صاحب کے والد نہایت متقی پرہیزگار فقیر انسان تھے اور یہی وجہ تھی کہ میر صاحب نے بھی فقیرانہ زندگی میں عمر کاٹ دی دوسری وجہ اس اثر کے قبول کرنے کی یہ تھی کہ سید امان اللہ (جنہیں میر صاحب چچا کہتے تھے) کے زیرِ عاطفت میر صاحب نے پرورش پائی سید امان اللہ صاحب کو درویشوں اور فقیروں سے بہت زیادہ انس و یگانگی تھی جب کبھی کسی مزار سیدہ کے کاشانہ مقدس پر جاتے میر صاحب کو ساتھ لے جاتے اور یہی خاص وجہ ہے کہ اگر میر صاحب درویش نہیں بنے تو درویش منش تو ہو ہی گئے۔

ہجوم مصائب نے میر صاحب کو کمسنی ہی سے گھیر لیا تھا اُن کے والد میر صاحب کی صغیرسنی میں رحلت کر گئے، اعزہ و اقربا نے مدا دامانت کرنے سے مُنہ پھیر لیا یہاں تک کہ ان کے ماموں آرزو کا رویہ بھی نہایت دل آزار رہا اس لئے میر صاحب کو گیارہ سال کی عمر میں تفکراتِ دنیوی نے گھیر لیا، بسر اوقات کی فکر دامنگیر ہو گئی۔

سیاسی مطلع بھی کچھ صاف نہ تھا، ہندوستان صدہا چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں تقسیم ہو گیا تھا، اور ہو رہا تھا، وہی مغلیہ سلطنت جس کے شکوہ و جلال کا آفتاب تمام ہندوستان پر چمکتا تھا اب گوشہ عدم میں روپوش ہو رہی تھی وہی مغلیہ حکومت جس کی عظمت کے ڈنکے شرق و مغرب میں بجتے تھے اب اسی کی بربادی کے افسانے چار دانگ عالم میں مشہور ہو رہے تھے سرکشی و غداری ملک میں پھیل رہی تھی جان و مال کی حفاظت مشکل ہو گئی تھی بنگال میں انگریز قوت پکڑ رہے تھے جنوبی ہند میں مرہٹے تخت و تاج کی خاطر ملک کو تاراج کر رہے تھے سلطنت کی وسعت کے سلئے خوں ریزی ان کا عام مشغلہ تھا۔ ہاں اودھ اس ہنگامہ و فساد کے زمانہ میں بھی مے عشرت کی جرعہ نوشی میں مشغول تھا مگر وہاں تک ہر کس و ناکس کی رسائی دشوار تھی۔ پھر بھی باکمال قدر و منزلت اور داد و دہش کے لالچ سے نوابانِ اودھ کے دربار میں پہنچ جاتے چنانچہ میر صاحب بھی ۱۷۸۳ء میں لکھنؤ پہنچ گئے مگر وہاں بھی اُن کی بلحاظ قابلیت خاطر نہیں ہوئی۔

میر صاحب ایسے عالم میں جبکہ حکومتوں کا آفتابِ اقبال و ظفر افق عدم میں غروب ہو رہا تھا دُنیا میں جلوہ گر ہوئے، کس مپرسی و بیکسی کی آغوش میں پرورش پائی، غم و اندوہ کی گود میں پلے، حزن و ملال کی فضا میں بڑھے۔ بقول شاعر ؎

جس گھڑی صانعِ قدرت نے کیا غم پیدا غم کو درکار تھا ہمدم سو ہوئے ہم پیدا

اس میں مبالغہ نہیں کہ میر صاحب کے خمیر میں رنج و الم کی آمیزش زیادہ تھی، میر صاحب کا دل شعلۂ حرماں تھا، ان کی زندگی کا کوئی لمحہ اور کوئی ثانیہ ایسا نہیں گزرا جو افکار و انتشار سے آزاد ہو وہ تمام عمر حوادث ارضی و سماوی کے تختۂ مشق بنے رہے ان کا خرمن دل برقِ حوادث کو کچھ ایسا پسند آیا تھا کہ ہمیشہ اس کو "جلایا خاک کیا، خاک کو کیا برباد" اور یہی وجہ ہے کہ ان کا دیوان ہزاروں حسرتوں لاکھوں ارمانوں کا مجموعہ ہے ؎

ہم کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب ہم نے درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

عدل سے دیکھئے یک شعر شور انگیز نکلے ہو   قیامت کا سا ہنگامہ ہے ہر جا میرے دیوان میں

میر صاحب کا دیوان اشعارِ شور انگیز سے پُر ہے۔ اُن کا درد و غم ذاتی تجربات کا حاصل ہے اس لئے کلام میں اثر ہے۔ اثر میر صاحب کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کے کسی شعر کو لے لیجئے اس کا حرف حرف دل پر خاص اثر پیدا کرتا ہے یہ کیفیت ایک دلِ سوختہ اور جگر تپیدہ میں ہی ہو سکتی ہے اور حقیقت تو یہ ہے ع

بے دل کے جلے سوزِ سخن میں نہیں ہوتا

یہ ان کا سوز و گداز ہے جو میر کو دوسرے شعراء سے ممتاز کرتا ہے ان کا کلام درد سے لبریز ہے، نا ممکن ہے کوئی انسان پڑھے اور اس کے دل پر چوٹ نہ لگے، میر صاحب فگار دل تھے ان کے لئے دُنیا کی خوشیاں جشن و سرود و محفلِ طرب بے معنی چیزیں ہیں، انہیں تو اسی میں لطف آتا ہے۔ خود بادیدۂ نم رہئے اور دوسروں کو چشم پُر نم کیجئے، خود آہ و فغاں سے آسمان سر پر اُٹھائیے اور دوسروں کو بھی آہ و زاری پر مجبور کیجئے ؎

ہماری تو گذری اسی طور عمر   یہی نالہ کرنا یہی زاریاں

جب ایک شخص کی عمر بھر کا مشغلہ صرف شور و شیون ہی ہو تو کیسے ممکن ہے کہ اس کا کلام اس رنگ سے متنوع ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام درد سے بھرا ہے جس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب کا دل ٹھنڈی آہوں کے لئے وقف ہو گیا تھا چند اشعار بطورِ مثال ہدیۂ ناظرین ہیں جن کے حرف حرف سے اضطراب و اضمحلال، یاس و حسرت نمایاں ہے ؎

. . . .

. . . .

رہا تو تو اکثر المناک میر   ترا طور کچھ خوش نہ آیا ہمیں

فیض اے ابرِ چشم تر سے اُٹھا   آج دامن وسیع ہے اس کا

تاب کس کو جو حالِ میر سنے   حال ہی اور کچھ ہے مجلس کا

ایسے وحشی کہاں ہیں اے خوباں   میر کو تم عبث اُداس کیا

سرہانے میر کے آہستہ بولو   ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

ہائے کیا مقطع ہے۔ بیساختہ جی چاہتا ہے کہ اگر شاعر موجود ہو تو اس کا مُنہ جواہرات سے بھر دیا جائے مختلف اوقات میں مختلف اساتذۂ فن نے اسی مضمون کو باندھا۔ ملاحظہ ہوں ؎

سرہانے میر کے آہستہ بولو   ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے   (میر)

سودا کی جو بالیں پہ ہوا شورِ قیامت — خدامِ ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے (سودا)

بالیں پہ کہاں میری ہنگامۂ محشر نے — لو اٹھو کہیں حضرت کیا دیر لگائی ہے (ذوق)

شورِ محشر امیرؔ کو نہ جگا — سو گیا ہے غریب سونے دے (امیر)

صرف یہ شعر ہی نہیں ہے بلکہ ہزارہا ایسے ہیں جو اپنی آپ نظیر ہیں۔ دوسرے اساتذہ نے اسی مضمون پر طبع آزمائی کی مگر کجا میرؔ۔ مقابلہ کیجئے ؎

منتظر قتل کے وعدہ کا ہے اپنے یعنی — جیتا مرنے کے لئے ہے یہ گنہگار ہنوز (میر)

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب — قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور (غالب)

تیز یوں ہی نہ تھی شب آتشِ شوق — تھی خبر گرم اُن کے آنے کی (میر)

تھی خبر گرم اُن کے آنے کی — آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا (غالب)

نہ گیا اس طرف کا خط لکھنا — ہاتھ جب تک مرا قلم نہ ہوا (میر)

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں — ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے (غالب)

آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم — اک شعلہ برقِ خرمنِ صد کوہِ طور تھا (میر)

اب یہ ناقدانِ فن سمجھ سکتے ہیں کہ کون آفتاب ہے اور کون ماہتاب۔ کسبِ نور کے بعد ضروری نہیں کہ چاند خورشید کی ضیا پیدا کر سکے۔

میر صاحب مسلم الثبوت شاعر ہیں اور یہی وجہ ہے کہ غالب جیسا شاعر کہتا ہے "آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں" اور حضرتِ ذوق نے تو اپنی انتہائی قابلیت سے کام لیا مگر ہر کوشش کے بعد معلوم ہوا کہ وہ ہنوز طفلِ مکتب ہیں بالآخر اپنے عجز کا اظہار کئے بغیر وہ بھی نہ رہ سکے ؎

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب — ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا (ذوق)

یہ انوری کا مشہور قطعہ ہے جو گلی گلی مخلوق کی زبان پر ہے ؎

ہر بلائے کز آسماں رسد — گرچہ بر دیگرے قضا باشد

بر زمیں نارسیدہ می پرسد — خانۂ انوری کجا باشد (انوری)

میر صاحب نے اسی مضمون کو اپنے شعر میں باندھا جس بیان طرزِ ادا نشستِ الفاظ کے مجموعے نے شعر کو انوری کے قطعہ سے کہیں بلند و بلیغ کر دیا ؎

جب کوندتی ہے بجلی تب جانبِ گلستاں — رکھتی ہے چھیڑ میرے خاشاکِ آشیاں سے (میر)

شعر میں لفظ "جانبِ گلستاں" وہی درجہ رکھتا ہے جو روح جسم کے لئے۔ جانبِ گلستاں سے پتہ چلتا ہے کہ آشیاں کنارِ چمن پر واقع ہے اور اس وجہ سے بہارِ باغ سے لطف حاصل نہیں ہوتا اور دل محظوظ نہیں ہوتا۔ یہ بہت زبردست غم ہے اور دوسرے یہ کہ جب بجلی چمکتی ہے تو جانبِ گلستاں مگر افسوس آشیانے پر گرتی نہیں۔ اے کاش وہ اسے جلا کر خاک کر دے تو کم سے کم ایک طرف سے تو بےفکری حاصل ہو جائے۔

مگر ایسا کیوں ہونے لگا وہ تو ڈراتی ہے کہ اب گری اب گری تا کہ میرا دل ہمیشہ خوف اور اضطراب سے بھرا رہے۔ نتیجہ یہ کہ مجھے ہمیشہ رنج و آلام گھیرے رکھتے ہیں، اطمینان کبھی حاصل نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے انوری کے قطعہ میں مزاج کا رنگ نمایاں ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنے والے حوادث کوئی اثر نہیں رکھتے۔

مذکورہ بالا مضمون تو جملہ معترضہ کی حیثیت رکھتا تھا اب ہم میر کے رنگِ تغزل کو دیکھتے ہیں جو پرانے شعراء کا ایک مخصوص مضمون ہو گیا تھا۔ اردو شعراء غزل گوئی کو معیارِ شاعری خیال کرتے تھے۔ اس صنف میں وہ ایسی جدت و ندرت پیدا کرتے تھے جس کو سن کر دل وجد کرنے لگتا ہے۔ غزل شاعری کی وہ صنف ہے جس میں اشعار انفرادی حیثیت سے عشق و محبت کے متعلق کہے جائیں۔ شوق و حسرت سرمستی و بے خودی رنج والم جیسے نازک جذبات کو پرانے شعراء نہایت خوبصورتی سے ادا کرتے تھے مگر جو بات میر صاحب کو حاصل تھی وہ دوسروں کو نصیب نہ ہوئی میر صاحب ہجر و وصال اور ایام رفتہ و زمانہ گذشتہ کے واقعات بیان کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں وہ ان واقعات کو جو ہر کہ و مہ کو پیش آتے ہیں نہایت خوبی سے باندھتے ہیں۔ علاوہ عامۃ الورود واقعات کے اظہار کے طرز ادا نہایت جمیل ہے، الفاظ کا انتخاب اور اس میں شیرینی پیدا کرنا میر صاحب ہی کا حصہ ہے مستزاد یہ کہ کلام میں سادگی و بے ساختگی سلاست و روانی بدرجۂ اتم موجود ہے غرض ان کا کلام ظاہری و معنوی خوبیوں سے آراستہ ہے۔ ان کا کلام ایک ایسا پھول ہے جو نہ محض رنگین و لطیف ہے بلکہ بہ غایت شمیم انگیز بھی ہے۔ چند اشعار ذیل میں پیشِ نظر ہیں ؎

کوفت سے جان لب پہ آئی ہے ہم نے کیا چوٹ دل پہ کھائی ہے

لکھتے رقعہ لکھے گئے دفتر شوق نے بات کیا بڑھائی ہے

دیدنی ہے شکستگی دل کی کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

دن نہیں رات نہیں، صبح نہیں شام نہیں وقت ملنے کا مگر داخلِ ایام نہیں

ہو گا کسی دیوار کے سائے کے تلے میر کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے اس طرح کے جینے کو کہاں سے جگر آوے

کلام وہی کچھ خوب ہے جس میں ندرت بندش کی چستی اور ترکیب الفاظ میں موزونیت ہو۔ اگر یہ تمام خصوصیات مفقود ہیں تو کلام پھیکا اور غیر دلچسپ ہو گا۔ ندرت شعر میں وہ خوبی پیدا کر دیتی ہے کہ بار بار پڑھنے پر بھی دل سیر نہیں ہوتا، میر صاحب کا کلام جہاں سادگی و روانی کے لئے مخصوص ہے وہاں ندرت کا پہلو بھی لئے ہوئے ہے ؎

اب کی جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

مضمون کس قدر پیش پا افتادہ ہے مگر ہائے طرز ادا شعر میں جان پڑ گئی۔

شب رخصت ہو رہی ہے سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا ہے، صبح کا تارا بھی چراغ سحری ہے، اس کی جھلملاہٹ بہت زیادہ دلفریب ہے۔
یا معلوم ہوتا ہے کہ وہ معشوق سے آنکھیں لڑا رہا تھا مگر محبوب کی چشمک زنی کا مقابلہ نہ کر سکا اور غروب ہو گیا، اس مضمون کو میر صاحب کس خوبصورتی
سے باندھتے ہیں ؎

چشم نجم سپہر جھپکی ہے　　صدقے اس انکھڑیاں لڑانے کے

تشبیہ کا استعمال شاعری کی جان ہے، تشبیہ زیور ہے جسے شعر پہن کر آراستہ ہوتا ہے اور ذوق شعر رکھنے والوں کے لئے سامان انبساط
مہیا کرتا ہے تشبیہہ دور از کار نہ ہو بلکہ بالکل برجستہ اور موزوں ہو تشبیہ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اصل چیز کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔
ذیل کے اشعار بہترین مثالیں ہیں ؎

دور سے چرخ کے نکل نہ سکے　　ضعف نے ہم کو مور طاس کیا

نازکی ان لبوں کی کیا کہئے　　پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

صبح چمن کا جلوہ ہندی بتوں میں دیکھا　　صندل بھری جبیں میں ہونٹوں کی لالیاں ہیں

میر ان نیم باز آنکھوں میں　　ساری مستی شراب کی سی ہے

شاعری کے لئے جس قدر موسیقیت و موزونیت کی ضرورت ہے اسی قدر فصاحت و سلاست لابدی ہے، اگر شعر فصاحت و سلاست
سے مبرا و منزہ ہے تو کیف و لطف سے محروم ہو جائے گا اس لئے شعر کو پر کیف و لطیف بنانے کے لئے ظاہری و معنوی خوبیوں کا ہونا ضروری
ہے الفاظ کا انتخاب اور پھر ان کی ترتیب و نشست سلاست و روانی، سادگی و بے ساختگی، ندرت و جدت اور آخر میں لفظوں کے فصیح و برمحل
استعمال کے باہمی امتزاج سے ادب کا صوری حسن ترکیب پاتا ہے جس کا کلام کے اندر ہونا ضروری ہے۔
دوم شاعر کو حساس ہونا چاہئے اگر شاعر میں متاثر و منفعل ہونے کی قوت نہیں تو وہ دوسروں پر بھی کوئی اثر پیدا نہیں کر سکتا اس
لئے اسے لطافت احساس کا مالک ہونا چاہئے، شاعر کو نکتہ رس نگاہ رکھنا چاہئے وہ مناظر جو عوام کی چشم دنگاہ کے لئے موہوم شے ہیں شاعر ان
سے تعلق اپنے دل میں دنیائے جذبات رکھتا ہے، تیسرے یہ کہ شاعر میں صدق اظہار کا ملکہ ہو جن کیفیات سے وہ خود اثر گیر ہوا ہے وہ
انہیں دوسروں پر منتقل کر سکے۔

اگر متذکرہ بالا اوصاف شاعر میں موجود ہیں وہ حقیقی معنی میں شاعر ہے اس کا کلام زندہ جاوید ہے۔
اردو شاعری میں گنے چنے اساتذہ ہیں جو اس کسوٹی پر پورے اترتے ہیں، میر صاحب کا درجہ اول ہے ان کا کلام ان تمام مستحسن
خوبیوں سے مالا مال ہے جس سے شاعر دائمی حیات حاصل کرتا ہے ؎

وہ گور غریباں پہ ہیں آنے والے　　بھلے جینے والوں سے مرجانے والے

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات　　کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

دل جلا ہے جوں بدر کے شبنم نے کہا گل سے	اب ہم تو چلے یاں سے رہ تو جو رہا چاہے
الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا	دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا
ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی	چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

میر صاحب فی البدیہہ بھی کہا کرتے تھے، عہدِ عتیق میں عرب بدو فراوانیٔ جذبات سے مجبور ہو کر ایسے اشعار کہا کرتے تھے جو سطحِ دل پر ایسے منقوش ہو جاتے جن کا حک ہونا ناممکنات سے تھا۔ میر صاحب اکثر واردات قلبی سے مجبور ہو کر لافانی شعر کہہ دیتے تھے۔ میر صاحب کی زندگی کا واقعہ ہے، انہوں نے اپنی دخترِ نیک اختر کی شادی کی قدرت کو کچھ ایسا ہی منظور تھا کہ شادی غمی میں بدل گئی، لڑکی کا انتقال ہو گیا۔ میر صاحب کو اطلاع ملی، آپ مردہ بیٹی کے پاس گئے اور اسی وقت فرمایا ؎

اب آیا یاد اے آرامِ جاں اس نامرادی میں	کفن دینا تمہیں بھولے تھے ہم اسبابِ شادی میں

۱۱۷۳ھ میں میر صاحب بے روزگاری اور افلاس سے مجبور ہو کر لکھنؤ تشریف لے گئے۔ اس زمانہ میں لکھنؤ علم و ہنر عیش و عشرت کا مرکز ہو رہا تھا جب آپ وہاں پہنچے ہیں تو معلوم ہوا کہ مشاعرہ منعقد ہے، آپ مشاعرہ میں ڈھال تلوار لگائے گئے، لوگوں نے فوراً تاڑ لیا آپ اجنبی ہیں۔ ان کی ہیئتِ کذائی کا خوب مذاق اڑایا، آپ اُسی وقت اشعار کہتے ہیں جو درد و غم میں ڈوبے ہیں، اپنی مفلوک الحالی اور دہلی کی بربادی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں جب حضار نے اشعار سنے تو انہیں معلوم ہو گیا کہ آپ کوئی معمولی ہستی نہیں ہیں۔ بلکہ آسمانِ شاعری کے درخشاں آفتاب ہیں۔ بعدہٗ دربارِ شاہی میں آپ کی رسائی ہوئی اور وظیفہ مقرر ہو گیا۔ وہ اشعار جو میر صاحب نے لوگوں کا منہ بند کرنے کے لئے کہے تھے مرقوم ہیں :؎

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو	ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب	رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے

اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

میر صاحب کا فلسفہ

افلاس ایسا خدائی قہر ہے جو راسخ العقیدہ لوگوں میں بھی لغزش پیدا کر دیتا ہے مگر جو شریف النسل ہیں وہ اس کی پروا بھی نہیں کرتے بلکہ ان کے لئے ایک حرفِ غلط کی حیثیت رکھتا ہے، باوجود چرخِ نیلوفر کے انتہائی ظلم کے میر صاحب کے اصولوں میں فرا لغزش پیدا نہ ہوئی، کسی کے سامنے دستِ تمنا دراز کرنا ان کے لئے موت سے بدتر تھا، وہ خود نہ کسی سے طالب ہوتے تھے اور نہ کسی دوسرے کو اس مذموم حرکت کا مرتکب ہونے دیتے تھے ؎

میر بندوں سے کام کب نکلا	مانگنا ہے جو کچھ خدا سے مانگ

جاہ و حشم کی طلب اُن کے احساس خودداری کو کوئی صدمہ نہ پہنچا سکتی تھی، تملق اُن کی شان کے خلاف تھا، اپنی عزت و خودداری کی وجہ
نہوں نے بہت نقصان اُٹھایا یہاں تک کہ وہ میر بے دماغ کے نام سے مشہور ہو گئے۔ بدماغی اس درجہ کو پہنچ گئی کہ لوگ خوشامد کرتے ہیں مگر میر
ب کے پاس ان کلمات کے سننے کے لئے گوش نیوش ہی نہیں ؎

اُٹھا جو باغ سے میں بے دماغ تو نہ پھرا ہزار مرغِ گلستاں مجھے پکارا ہے

دنیا دار لوگ کچھ عجیب طبیعت رکھتے ہیں اگر کسی صاحبِ کمال کی خاطر و تواضع کریں گے تو یہ سمجھ کر کہ عظیم الشان احسان کر رہے ہیں میر
ب کا دل ایسا کہاں تھا جو اس بار کو برداشت کر سکتا۔ وہ لکھتے ہیں ؎

گل نے بہت کہا کہ چمن سے نہ جائیے گلگشت کو جو آیئے آنکھوں پہ آیئے
میں بے دماغ کر کے تغافل چلا گیا وہ دِل کہاں کہ ناز کسی کے اُٹھایئے

وجہ تھی کہ قصیدہ گوئی طبیعت کی اُفتاد کے خلاف تھی اور جو دو چار کہے بھی ہیں وہ کچھ زیادہ اچھے نہیں ؎

مجھ کو دماغِ وصفِ گل و یاسمن نہیں میں جوں نسیم بادِ فروشِ چمن نہیں

پیہم مصائب نے میر صاحب کو قنوطیت پسند بنا دیا تھا، وہ یاس و حسرت کی جھلک ہر شے میں دیکھتے تھے احزن و ملال اُن کے لئے ہر چیز سے
شے تھا، ان کے دل کو خیال بہت صدمہ پہنچاتا تھا کہ لوگ نام و نمود کی تلاش میں کوشاں ہیں اور اس کے حصول کے لئے غیر خوددارانہ ذرائع بروئے
لا رہے ہیں۔ ایک شاعر کے لئے ناممکن ہے کہ وہ خاموشی کے ساتھ لوگوں کی بے معنی حرکت کا مطالعہ کرتا رہے۔ میر صاحب فرماتے ہیں ؎

تھا ملک جن کے زیرِ نگیں صاف مٹ گئے تم اس خیال میں ہو کہ نام و نشاں رہے

میر صاحب کا کلام فلسفہ اور حکمت سے پُر ہے، دُنیا کی بے ثباتی کا نقشہ انہوں نے نہایت ہی مؤثر طریقے سے سینکڑوں پیرایوں میں کھینچا
ہے، میر صاحب نے ہزار طرح سے سمجھایا ہے کہ یہ دنیا ذلیل دُنیا اس قابل نہیں کہ اس سے دل لگایا جائے جس نے بھی اس سے محبت و الفت کا
ظہار کیا یہ اُس کے حق میں دشمن ثابت ہوئی، یہ فعل دانشمندانہ بھی نہیں ہے کہ ہم درمیانِ سفر کسی مقام سے دلچسپی پیدا کر لیں، ہمیں
د رکھنا چاہئے کہ ہم حالتِ سفر میں ہیں، یہ عالم محض سرائے ہے یا منزل ہے جہاں ہم کچھ دیر کے لئے آرام کی غرض سے ٹھہر گئے ہیں، دم لےکر
گے بڑھ چلیں گے ؎

زندگانی بھی ایک وقفہ ہے یعنی آگے چلیں گے دم لےکر

للہٰ یہ جانتے ہوئے کہ یہ رہگذر ہے مگر اس سرائے میں تعمیر کا قصد کیا جائے تو نہایت نامناسب ہے، ہمیں اس دہر ناپائدار سے کسی قسم کا لگاؤ نہ
لگانا چاہئے کیونکہ "اس کارواں سرا کے ہیں سب لوگ رفتنی" جو لوگ اس خیال میں مست ہیں کہ یہ پیر زال انہیں جاہ و حشم، عزت و وقار عنایت
رے گی یہ ان کی محض وہم پرستی ہے انہیں جاننا چاہئے ؎

دنیا میں دیر رہنا ہوتا نہیں کسی کا   یہ تو سرائے فانی اِک کارواں سرا ہے

ہر چیز کی بے ثباتی نے شیکسپیئر پر ثابت کر دیا تھا کہ وہ دُنیا جو کبھی اس کے لئے رنگ و بُو کا مجموعہ تھی، اس کی حقیقت نقش بر آب سے زیادہ نہیں اس لئے وہ کہتا ہے

We are such stuff
As dreams are made of.

میر صاحب بھی عالم کو خواب سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے ان کی نظروں میں ہر چیز "رفتنی" ہے۔

کچھ نہیں اور دیکھیں ہیں کیا کیا   خواب کا سا ہے یاں کا عالم بھی

میر صاحب علامہ اقبال کی طرح عمل کی تلقین کرتے ہیں۔ لمحات زندگی بہت مختصر ہیں اس لئے جو کچھ ہو سکے ہمیں تعجیل کے ساتھ کرنا چاہئے۔ عیش و طرب جشن و سرور میں مشغول رہنا خواب غفلت کے مترادف ہے، اس تضیع اوقات سے کیا فائدہ، بہتر صورت حال یہ ہے کہ اس نیند سے بیدار ہوں جس نے ہمیں بالکل ناکارہ کر دیا۔ ہمیں جاگنا چاہئے کیونکہ وہ ساعت بہت قریب ہے جب ہم دائمی نیند کا لطف اٹھائیں گے۔

رُباعی

اب وقت عزیز کو جو یوں کھوؤ گے   پھر سوچ کے غفلت کے تئیں روؤ گے
کیا خواب گراں پہ میل روز و شب ہے   جاگو ٹک میر پھر بہت سوؤ گے

میر صاحب اکثر اُن لوگوں سے جو میر صاحب سے ریاست و امارت غرض ہر طرح سے بہتر تھے اور فنا ہو چکے تھے سبق عبرت لیتے تھے۔

زیر فلک بھلا تو روُوے ہے آپ کو میر   کس کس طرح کا عالم یاں خاک ہو گیا ہے

غرور و نخوت ایک ایسا گھن ہے جو انسان کو عضو معطل کی طرح بیکار بنا دیتا ہے، اس نخوت کی وجہ سے ہزارہا لوگ خاک میں مل گئے جو عشرت کے جھولے میں جھولتے تھے اور مے عیش کی جرعہ خواریوں میں مصروف رہتے تھے جن کا سر غرور سے نیچے نہ جھکتا تھا آج منوں مٹی کے نیچے دبے پڑے ہیں اور نقش پا کی طرح روندے جا رہے ہیں، میر صاحب نہایت ہی بھلے انداز میں تعلی و غرور سے منع کرتے ہیں ؎

کل پاؤں اِک کاسۂ سر پر جو آ گیا   یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر   میں بھی کبھو کسو کا سر پُر غرور تھا

عشق و محبت کے معاملہ میں میر صاحب کا مقولہ تھا کہ عشق میں اگر جان چلی جائے تو عین راحت ہے تکالیف عشق میں پیش آتی ہیں مگر جس نے بلا و آفت کے جام نوش کئے ہیں وہ کب نوائب سے ڈرتا ہے، اگر محبوب عاشق کے قتل کا خواہاں ہے تو محب کو چاہئے فوراً سر تسلیم خم کر دے ؎

زیر شمشیر ستم میرؔ تڑپنا کیسا | سر بھی تسلیم محبت میں ہلایا نہ گیا

میرؔ صاحب کی مثنویوں کی تعداد بھی چودہ پندرہ کے قریب ہے ان میں شعلۂ عشق بہت زیادہ مشہور ہے۔ میرؔ صاحب نے اپنی مثنویوں میں زندگی کے ہر رُخ کو اچھی طرح سے ظاہر کیا جو دلیل ہے اس بات کی کہ میرؔ صاحب کی قوتِ مشاہدہ بہت زبردست تھی، اکثر مثنویوں میں اسا زگاریٔ زمانہ کی شکایت کی ہے۔ مثنویاں زبان، طرزِ ادا، جذبات نگاری اور واقعہ نگاری کو اچھی طرح ظاہر کرتی ہیں۔

میرؔ صاحب فارسی سے اردو میں ترجمہ کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں، ان کے ترجمہ کا جب فارسی شعر سے تقابل کیا جاتا ہے تو معلوم نہیں ہوتا کہ فارسی میں ترجمہ ہُوا ہے یا فارسی سے ترجمہ ہُوا ہے دو اشعار ذیل میں درج ہیں جو کما حقہٗ دعویٰ پر پورے اُترتے ہیں ؎

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم | باید اول بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ | ان سے بھی تو پوچھئے تم اتنے کیوں پیارے ہوئے

گفتہ بودم چو بیائی غم دل با تو بگویم | چہ بگویم کہ غم از دل برود چوں تو بیائی

کہتے تھے کہ یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا | سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

میرؔ صاحب اس دور میں پیدا ہوئے تھے جب کہ اُردو زبان عہدِ طفلی میں تھی، بات بات میں لڑکھڑاہٹ اور لکنت نمایاں تھی، الفاظ کی قلت تھی، میرؔ صاحب نے ایسے دور میں اُردو میں بہت کچھ اضافہ کیا۔ فارسی الفاظ سے محاورے ترجمہ کئے، نماز کرنا، تر دامن ہونا اور سر پر خاک ڈالنا فارسی محاوروں "نماز کردن، تر کردن اور خاک بر سر کردن" سے ترجمہ کئے ہیں۔

تجویہ ۔ میرؔ صاحب کا کلام اثر و تاثیر میں ڈوبا ہُوا ہے، میرؔ صاحب شعلۂ حرماں ہیں، ان کی زبان سے جو لفظ نکلتا ہے سوز و گداز میں ڈوبا ہوتا ہے۔ رنگِ تغزل ان کے یہاں بہترین ہے یاس و حسرت حزن و ملال مسرّت و انبساط زمانہ رفتہ کی یاد عامتہ الورود واقعات ان کی غزلیات میں پائے جاتے ہیں علاوہ ازیں ان کا کلام ظاہری و معنوی خوبیوں سے آراستہ ہے لطافت صدق اظہار قوت مشاہدہ میرؔ کی شاعری کا جزو لاینفک ہیں زبان نہایت سلیس فصیح و شیریں ہے تشبیہات موزوں و برجستہ ہیں مبالغہ حسب ضرورت موجود اور اسلوب دلکش ہے تصوف اور فلسفہ کا رنگ نمایاں ہے۔

میرؔ صاحب کا کلام اردو ادب کے لئے مایۂ ناز چیز ہے۔ ادبِ اُردو سے دلچسپی رکھنے والے حضرات جتنی بھی میرؔ کی لافانی شاعری کی قدر کریں کم ہے۔ ایسا شاعر ہمیشہ پیدا نہیں ہوتا اور جو اس کی تقلید کرتے ہیں اور خود کو میرؔ کا ہم پلہ قرار دیتے ہیں ادعاءِ باطل کے مدعی ہیں ؎

جو اس کا رنگ ہے وہ کسب سے حاصل نہیں ہوتا | الم پرور دماغ اس سا کسی کا دل نہیں ہوتا (وحشت)

الیاس سہارنپوری

انکسار

دل کو فروغ ہے اگر مائلِ انکسار ہو
سر کو فراز ہے تبھی قدموں پہ جب نثار ہو

دل ہو فدائے جستجو جان ہو وقفِ آرزو
زیست کا مدعا یہ ہے صدقۂ شوقِ یار ہو

عشق میں حسن ہو نہاں حسن میں عشق ہو نہاں
پھولوں میں جس طرح نہاں حسنِ رخِ بہار ہو

تشنہ لبوں کے سامنے ساغرِ دل تو پیش کر
بزمِ جہاں میں اے بشر ساقیِ غمگسار ہو

عشق کی آرزو یہی، حسن کی آبرو یہی،
تیرِ نگاہِ ناز سے قلب و جگر فگار ہو

شوق وہی ہو رات دن، دل میں ہو آرزو وہی
صبح سے صبح تک وہی آنکھ کو انتظار ہو

بھرتا ہے دم جو عشق کا، پہلے خودی کو دے مٹا
یار پہ اپنے پھر فدا شوق سے بار بار ہو

تیرا ہے دامنِ مراد مقصدِ زندگی یہی
یاس و جنوں کے ہاتھ سے چاک ہو تار تار ہو

نخلِ مراد دہر میں ہوتا ہے بارور تبھی
کشتِ امیدِ دل اگر خون سے لالہ زار ہو

عشق کو ناز ہے یہی، وصل کا راز ہے یہی
مٹ کے رہِ نیاز میں خاکِ درِ نگار ہو

عشق کا یہ کمال ہے، اصل میں یہ وصال ہے
فعل ہے یا خیال ہے وقفِ رضائے یار ہو

پھر ہے وصال و ہجر کیا کیسی خزاں ہے کیا بہار
دست بکار و دل بہ یار تیرا اگر شعار ہو

رام پرشاد ناشاد

مُقرّر

صبح کا منظر بہت دلفریب تھا۔ پَو پھٹتے ہی ڈاکٹر عبدالواحد ایم۔ایل۔اے کا جنازہ قبرستان کو روانہ ہُوا۔ مرحوم کو بیک وقت دو بیماریاں لاحق تھیں۔ بیوی کی بدمزاجی اور خود اپنی بادہ نوشی۔ انہی دونوں امراض نے بالآخر غریب کی جان لی۔

جنازہ ابھی راستہ ہی میں تھا کہ مرحوم کا دوست اور ہم پیالہ اور ہم نوالہ پروفیسر اسلم کرایہ کی موٹر پر سوار ہو کر شہر کے سب سے بڑے مقرر رشید کے گھر پہنچا۔ رشید ابھی کم عمر ہی تھا مگر اس کا سا مقرر صوبہ بھر میں کوئی بھی نہ تھا۔ ہر طرف اس کی شہرت کا ڈنکا بج رہا تھا۔ شادی کی تقاریب، غمی کی مجالس، مذہبی تہواروں اور قومی جلسوں، غرضیکہ ہر جگہ اس کی مانگ تھی، کوئی صحبت بھی اس کے بغیر پُرلطف نہیں سمجھی جاتی تھی۔ گویائی کی قابلیت اس میں اس قدر تھی کہ فی البدیہہ ہر موضوع پر طویل تقریریں کر سکتا تھا۔ سوتے جاگتے، نشہ میں، بھوک میں، شکم سیری میں، ہر حال میں اس کی زبان فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دینے کے لئے تیار رہتی تھی۔ اس کی تقریریں ہمیشہ طولانی ہُوا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی تو وہ اس قدر بے خود ہو جاتا تھا کہ تمام مجلس سنتے سنتے اکتا جاتی تھی مگر وہ خاموش ہونے میں نہ آتا تھا۔ بارہا ایسا ہُوا کہ اُسے پولیس کی امداد سے چُپ کرایا گیا۔

پروفیسر اسلم کو خوش قسمتی سے یہ مشہور خطیب گھر ہی پر موجود مِلا۔ اسلم نے دوڑ کر اُس سے معانقہ کیا اور غمناک آواز میں کہنے لگا۔

"رشید! پیارے رشید! ایک اہم ضرورت درپیش ہے۔ خدا کے لئے جلدی کپڑے پہنو اور میرے ساتھ چلو۔ ہمارا ایک عزیز دوست فوت ہو گیا ہے۔ عنقریب ہم اُسے سپردِ خاک کرنے والے ہیں لیکن قبرستان میں تمہاری ماتمی تقریر نہایت ضروری ہے۔ بڑی اُمیدیں لے کر حاضر ہُوا ہوں۔ مایوس واپس نہ کرنا۔ یہ موت معمولی موت نہیں ہے۔ ڈاکٹر واحد ایم۔ایل۔اے دُنیا سے رخصت ہو رہا ہے۔ ہمیں بڑی خفت اُٹھانی پڑے گی اگر لاش بغیر تمہاری تقریر کے دفن کر دی گئی۔"

رشید نے جماہی لے کر سوال کیا "وہی شرابی رُکنِ اسمبلی؟"

"ہاں" پروفیسر نے جواب دیا "قبرستان میں تمہاری تواضع کا پورا سامان مہیا ہے۔ پلاؤ، شیرینی، شراب کباب سب کچھ ہی منگا۔ پھر نقد سے بھی خدمت کی جائے گی۔ اب جلدی کرو اور چل کر اپنی فصاحت سے سب کو مسحور کر ڈالو۔"

رشید نے فوراً اپنے [illegible] بال پریشان کر ڈالے۔ سیاہ لباس پہن لیا اور موٹر میں بیٹھتے ہوئے پروفیسر سے کہنے لگا۔ "میں ڈاکٹر کو خوب جانتا تھا۔ نہایت ذلیل مکار [illegible] میرے خیال میں [illegible] زمین پر اس سے زیادہ خبیث کوئی انسان بھی نہ تھا۔"

"بہت خوب" رشید نے جواب دیا "مُردوں کی صرف خوبیاں ہی یاد کرنی چاہئیں لیکن ڈاکٹر تھا بہت کمینہ" ـــــ جنازہ قبرستان کو آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ دونوں راستہ ہی میں جنازہ کے ساتھ مل گئے۔ اور جن چوراہوں پر رُک کر شراب خانوں میں کھڑے کھڑے تین بوتلیں بھی اُڑا گئے۔

جنازہ قبرستان پہنچ گیا۔ لاش قبر کے سامنے رکھی گئی۔ مرحوم کی بیوہ و بعض رشتہ دار عورتوں نے دستور کے مطابق رونا اور بین کرنا شروع کیا جب وہ روتے روتے تھک گئیں اور چپ ہوئیں تو رشید آگے بڑھا، حاضرین کو خطیبانہ انداز سے گھورا اور تقریر شروع کر دی۔

"یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں، حقیقت ہے یا خواب ہے۔ میں جاگ رہا ہوں یا میری آنکھیں بند ہیں اور سو رہا ہوں۔ لوگو! مجھے بتاؤ میں کہاں کھڑا ہوں! یہ قبر جو منہ پھاڑے میرے سامنے موجود ہے یہ تابوت جس پر سیاہ ریشمی چادر پڑی ہے۔ یہ میرے صبر و شکیب کو غارت کئے ڈالتی ہے۔ یہ آہ و بکا۔ یہ ماتم! یہ پُرنم آنکھیں!! یہ مرجھائے ہوئے رخسار! یہ پریشان بال!!! آہ آہ! میرے مولا! یہ کیا ماجرا ہے؟ کیسا غمناک! جگر خراش خواب دیکھ رہا ہوں۔ . . . . لیکن نہیں، اُف ہائے میری قسمت! مجھے اعتراف کرنا چاہئے۔ یہ سب خواب نہیں ہے، وائے حسرت یہ حقیقت ہے۔ ایسی تلخ حقیقت جس سے انکار ممکن نہیں، اگرچہ اس کا اعتراف بھی آسان نہیں!

"اُف ظالم فلک! تو نے آج تک مجھے اسی لئے زندہ رکھ چھوڑا تھا کہ یہ دن اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں؟ میری زبان ساکت رہنا چاہتی ہے۔ میرا دل سینہ کے اندر مرغِ بسمل بن گیا ہے۔ میرا سر چکرا گیا ہے اور دماغ قابو سے باہر ہے۔ خدایا! فریاد! مجھے صرف اتنی قوت دے دے کہ دو آنسو ملک و ملت کے زعیم پر بہالوں! اللہ اللہ! کل یہ جسم جو آج بے حس و حرکت پڑا ہے اپنے اندر بے نظیر حُسن رکھتا تھا۔ اس کی قوت سے پہاڑ بھی لرزتے تھے، اس کی پھرتی ہوا کو بھی شرماتی تھی۔ یہ جسم ہر لحظہ متحرک تھا، ہر لحظہ محنت شاقہ میں مشغول تھا، کس کے لئے؟ کیا اپنے آرام کے لئے؟ نہیں واللہ نہیں! اپنے ہم جنسوں کے آرام کے لئے، یتیموں کے لئے، بیواؤں کے لئے محتاجوں کے لئے! ـــــ بُرا ہو موت کا کس ستم کو اس نے مارا ہے؟ کس حاتم کو ہم سے چھینا ہے؟ دوستو! تابوت کے اندر کیا ہے؟ تم کہتے ہو ڈاکٹر ساجد جو اپنی جان کھو چکا ہے، لیکن نہیں سنو تابوت کے اندر کیا ہے؟ اس میں مردہ جسم نہیں بلکہ علم و کرم ہے، شجاعت و بسالت ہے، تقویٰ و طہارت ہے! نیکی ہے! بھلائی ہے! اخلاق کا پشتارہ ہے! زمین کا نور ہے! آسمان کے مکین مسرور ہیں کہ یہ وجودِ مسعود اُن میں پہنچ رہا ہے، اُن کی مسرت بجا ہے لیکن آہ زمین پر آج قیامتِ صغریٰ ہے۔ زمین تاریک ہے کیونکہ اُس کا نور آسمان پر چلا گیا ہے!

"آہ! اب اس ملک کی کیا حالت ہوگی؟ غریب کیسے زندہ رہیں گے؟ یتیموں کا اب کون والی ہوگا؟ بیواؤں کا کون سہارا ہوگا؟ ملک کی حکومت کس طرح چلے گی؟ بلاشبہ حکومت کے پاس آدمیوں کی کمی نہیں مگر وہ جو واقعی آدمی تھا آج ہم اُسے سپردِ خاک کر رہے ہیں۔ ایسا مدبر اب کہاں پیدا ہوگا! عقل و دانش کا وہ عالم تھا کہ ساری دُنیا اس کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرتی تھی۔ اخلاص اس درجہ کا تھا کہ فرشتے بھی رشک کرتے تھے۔ دوستو! یہاں کیا دیکھتے ہو؟ شہر میں واپس جا کر روؤ گے اور ایسا روؤ گے کہ آنکھیں خشک ہو جائیں گی! آج پورا شہر رو رہا ہے، در و دیوار رو رہے ہیں۔ یہاں تک کہ ماتم کناں ہیں! آہ ساجد! تجھ پر سارا جہان رو رہا ہے، اور کیوں نہ روئے؟ تیری پوری زندگی دوسروں کی خدمت کے لئے وقف تھی۔

دوستو! میں جانتا ہوں۔ تم جانتے ہو۔ بلکہ ہر فرد جانتا ہے کہ ڈاکٹر ساجد عمر بھر غریب رہا کیونکہ اُس نے اپنی تمام دولت غریبوں کو دے دی تھی۔ اللہ معلوم ہے وہ ایسا فیاض تھا کہ اپنی تنخواہ تک کا بڑا حصہ فقیروں میں تقسیم کر دیا کرتا تھا۔ خدمتِ خلق کا یہی جذبہ تھا کہ صاحب نے شادی نہیں کی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ گھر بسانے کے بعد آدمی مخلوقِ خدا کی کماحقہ خدمت نہیں کر سکتا۔

"اللہ اکبر! آج ہم کیسے دردمند، کیسے دوست، کیسے رفیق سے بچھڑ رہے ہیں۔ مجھے تعجب ہے کہ ساجد کی موت کے بعد ہم کس طرح جئیں گے۔ ہمارے دلوں کو کیونکر صبر آئے گا! لیکن خدا کا یہ کارخانہ اسی طرح چل رہا ہے۔ آدمی کو ناچار صبر کرنا پڑتا ہے۔ زہر کا پیالہ بہت کڑوا اور قلب و روح کو قتل کرنے والا ہے۔ مگر طوعاً و کرہاً پینا ہی پڑے گا۔"

"لیکن یہ کیا ہے کہ تمہیں صبر کی نصیحت کرتا ہوں اور خود صبر حاصل نہیں کر سکتا۔ تمہیں بیقراری سے منع کرتا ہوں اور خود بیقرار ہوا جاتا ہوں! تمہاری آنکھوں کے آنسو روکتا ہوں اور خود میری آنکھیں آنسوؤں کے دریا بہا رہی ہیں! تمہارے دلوں کی آگ سرد کرنا چاہتا ہوں مگر میرا دل سینہ کی آگ کے کباب ہوا جاتا ہے۔

"الوداع! اے پاک روح الوداع! الوداع اے زہد و ریاضت الوداع! الوداع اے جود و سخا الوداع! قسم خدا کی اس وقت بھی مرحوم کی نورانی صورت میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مر جانے پر بھی یہ ملکوتی نقش زندہ ہے۔ آہ وہ روشن کشادہ پیشانی، وہ صاف چکنی ٹھوڑی جس پر داڑھی کا گرد کبھی جمع نہ ہونے پایا۔ وہ دلکش آواز، وہ ذمہ داریوں کے بوجھ سے جھکے ہوئے کندھے، اللہ کی رحمت ان ہڈیوں پر، ہزار ہزار رحمت اس جسم مقدس پر! ڈاکٹر ساجد! ہم تجھ کو بھلا دیں گے تو بھی ہمیں ہمیشہ یاد رکھنا کیونکہ تیری یاد سے ہمارے دل ہمیشہ معمور رہیں گے .....!"

فاضل مقرر کی زبان سے بار بار ساجد کا نام سن کر حاضرین حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکتے تھے۔ یہ دلدوز مرثیہ ساجد کے نام پر سنایا جا رہا تھا حالانکہ وہ زندہ موجود تھا اور خود اسی مقام پر سامعین کے زمرہ میں کھڑا تھا۔ شراب کے نشہ میں فاضل مقرر کو یاد نہ رہا کہ مرنے والا ڈاکٹر واحد ایم۔ ایل۔ اے ہے نہ کہ ڈاکٹر ساجد ایم۔ ایل۔ اے! یہی سبب تھا کہ تقریر میں اُس نے تمام صفات ساجد کے بیان کر ڈالے۔ واحد مجرد نہ تھا۔ اس کی بیوی بذات خود تابوت کے سامنے کھڑی تھی۔ تمام شہر اس عورت سے واقف تھا۔ وہ اپنی بدمزاجی میں ضرب المثل تھی اور "مرد مارنی" کے لقب سے مشہور تھی کیونکہ وہ اپنے شوہر کو ہمیشہ پیٹا کرتی تھی۔ اسی طرح واحد کی داڑھی بھی منڈی نہ تھی، اس کے منہ پر تو اتنے بال تھے کہ سب لوگ اس پر پھبتیاں کسا کرتے تھے۔

مگر مقرر کو اس تحقیق کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اُسے تو پُر زور اور پُراثر تقریر کرنی تھی اور بس۔ چنانچہ فصاحت کے دریا برابر بہاتا رہا۔ اب لاش قبر میں اتار کر رکھ دی گئی۔ اور مرحوم کا منہ آخری دید کے لئے کھولا گیا۔ مقرر نے بھی جھک کر اُسے دیکھا۔ ایک نہایت مکروہ اور منحوس چہرہ نظر کے سامنے موجود تھا۔ مقرر نے اپنی تقریر کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے برجستہ کہا "آہ ساجد! تیری صورت تو اچھی نہ تھی مگر تیری سیرت ایسی تھی کہ فرشتے بھی تعظیم سے تیرے آگے جھک جاتے تھے"۔ یہ کہتے ہی مقرر ٹھٹک گیا۔ اب اُسے ذرا ہوش آیا کہ بار بار میں کس کا نام لے رہا ہوں! اور حقیقت میں کون مرا ہے! فرط حیرت و ندامت سے اُس نے نگاہیں نیچی کر لیں۔ مگر فوراً پروفیسر اسلم کی طرف مڑا اور اُسے جھڑک کر کہنے لگا "اسلم تیرا بُرا ہو۔ تُو نے مجھ سے کہا تھا کہ "وہ" مر گیا ہے حالانکہ "وہ" زندہ ہے!"

"وہ کون؟" نشے سے چُور پروفیسر نے سوال کیا۔ "یہ شرارت" مقرر نے غصہ سے کہا "اب پوچھتے ہو کون! ساجد حالانکہ ساجد وہ سامنے کھڑا ہے!" "بیوقوف کس نے کہا کہ ساجد مر گیا!" اسلم نے جواب دیا "میں نے تو واحد کا نام بتایا تھا!" مقرر نے ذرا سوچ کر کہا "تم نے کہا تھا ایم ایل اے مر گیا" "یہ سچ ہے" پروفیسر نے کہا "مگر اسمبلی کے ممبر بہت ہوا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر واحد اور ڈاکٹر ساجد دونوں بیک وقت رکن اسمبلی تھے!"

"مگر مجھے اس تشریح کی کیا خبر تھی!" مقرر نے اور زیادہ ندامت سے کہا۔ واپسی میں حاضرین میں کوئی نہ تھا جو اس عجیب تقریر پر ہنس نہ رہا ہو۔

حمید نظامی

(ماخوذ از حیوف)

عشرتِ برشگال

ہاں ساقیا نکال پُرانے سبو نکال
ہندی ہوں میں، بہار ہے مجھ کو یہ برشگال
سب مل کے وجد کرتے ہیں گلشن کے نونہال
دکھلاتی ہے نسیم جو اٹکھیلیوں کی چال

شالیں ہری ہری نظر آتی ہیں ہر طرف
سب ایک رنگ میں ہیں تکلف ہی برطرف

کل تک تھی جاں گداز مری حسرتِ نگاہ
لیکن ہے آج اور ہی کیفیتِ نگاہ
بن کر رہی نوید طرب عشرتِ نگاہ
میرے لئے بھی اب ہے چمن جنتِ نگاہ

دلبر ہے پاس رنج سے حاصل فراغ ہے
برسات کا زمانہ ہے دل باغ باغ ہے

دلکش سرور بخش ہوا کی نوازشات
خوش کُن نشاط ریز فضا کا ہے التفات
بارش کے تار تار میں ہے نغمۂ حیات
مربوط کیا اسی سے ہیں اجزائے کائنات

قدرت کا ہاتھ چھیڑ رہا ہے ستار پھر
دیکھو برس رہا ہے وہ ابرِ بہار پھر

برسات میں ہے لطفِ شبِ مہتاب کا — کیا پوچھنا مری نگہِ انتخاب کا
یہ چودھویں کا چاند یہ عالم شباب کا — شوخی میں اس کی رنگ ہے کچھ کچھ حجاب کا
یہ ابر کی سیاہ قناتیں بڑی بڑی
چھپ چھپ کے چاند کا یہ نکلنا گھڑی گھڑی

برسات ہی میں آتے ہیں ہر بات کے مزے — کیونکر کہوں لطیف خیالات کے مزے
ہیں جانفزا کسی کی ملاقات کے مزے — ہے ہے یہ دل پسند مدارات کے مزے
احسان ہے یہ مُنعمِ فطرت نواز کا
"کِن نعمتوں کو حُکم دیا ہے جواز کا"

ہر قسم کے مذاق سے دل میرا شاد ہے — اے دوست ذایقہ مجھے ہر شئے کا یاد ہے
پوشیدہ کیا کسی سے مرا اجتہاد ہے — ممنوع ہے وہ چیز جو وجہِ فساد ہے
چکھے کبھی لطافتِ انگور کے مزے
پائے کبھی معانقۂ حُور کے مزے

جھولا جھُلا دیا جو کسی گلعذار کو — ساتھ اپنے کر لیا روشِ روزگار کو
راحت ہوئی نصیب دلِ بے قرار کو — سمجھائیں اب حقیقتِ حُسنِ بہار کو
یہ دَورِ برشگال یہ عہدِ شباب واہ
یہ جلوہ اور یہ نگہِ کامیاب واہ

علی منظور حیدرآبادی

آسکر وائلڈ کے نظریات

(فرینک ہیرس اپنی کتاب "آسکر وائلڈ، اس کی حیات اور اعترافات" میں لکھتا ہے کہ آسکر وائلڈ دنیا کے بہترین گفتگو کرنے والوں میں سے تھا۔ بحیثیت تمثیل نگار مشہور ہونے سے بہت پہلے اس کے انداز گفتگو نے لندن کو اس کے قدموں پر لا گرایا تھا۔ اس کی عدم موجودگی میں ہر تقریب نامکمل تصور کی جاتی جس وقت وہ گفتگو کرتا تو تمام مجمع پر حیرت انگیز سکوت طاری ہو جاتا۔ سب سے زیادہ دلکش اس کے خود ساختہ فقرات اور نظریات تھے جنہیں وہ نہایت خوش اسلوبی سے سلجھے ہوئے الفاظ میں بیان کرتا۔ اس طرح سامعین کا شوق افزوں ہو جاتا۔ ذیل میں آسکر وائلڈ کے چند وہ الوکھے خیال جمع کئے گئے ہیں جنہیں سننے کے لئے ہزاروں خواتین مضطرب نظر آیا کرتی تھیں۔)

'خلق' اس رویّہ کا نام ہے جو ناپسندیدہ اشخاص کے لئے اختیار کیا جاتا ہے۔

دوسرے لوگوں کی سچائی کا نام "جھوٹ" ہے۔

اگر دنیا میں ہمدردی کم ہوتی تو مصائب بھی کم ہوتے۔

غیر متوقع باتوں کی توقع کرنا جدید عقلیت کا امتیازی نشان ہے۔

میں اس قدر بھوکا ہوں جتنی ایک بیوہ خاوند کے لئے، اس قدر تھکا ہوا ہوں جتنی ایک دوشیزہ اچھی نصیحت سے، اس قدر خشک ہوں جتنا کسی راہب کا وعظ۔

فقط شہرت ہی ایک ایسی تہمت ہے جو کبھی مجھ پر نہیں لگائی گئی۔

وعظ ایک بے لذت چٹنی ہے جب تمہارے پاس کچھ اور کھانے کو نہ ہو۔

محبت کے بغیر زندگی اس نیستاں کے مانند ہے۔ جو کنارِ دریا پر پرورش پاتا ہے لیکن موسیقی سے معرّا ہوتا ہے۔

عورت کی محبت مردوں کو فرشتوں میں تبدیل کر سکتی ہے۔

جہاں کوئی قانون نہ ہوگا وہاں کوئی قانون شکن نہ ہوگا۔ اس لئے تمام لوگ نیک ہوں گے۔

جو لوگ محبت کی خاطر کوئی گناہ کرتے ہیں، وہ کوئی گناہ نہیں کرتے۔

عورتیں تصاویر ہیں اور مرد معمّے!

زاہد اور گناہگار میں صرف یہی فرق ہے کہ ہر زاہد کا "ماضی" ہوتا ہے اور گناہگار کا "مستقبل"!

شمیم جمیلی بی۔اے

محفلِ ادب

"ہندی ہندوستانی" کی مفسدانہ ترکیب

"اُردو کو مٹانے کے لئے اب تک جتنی کوششیں کی گئیں اور اس کے خلاف جس قدر زہریلا پروپگنڈا کیا گیا اس کی وضاحت کی یہاں ضرورت نہیں مختصرًا یوں سمجھئے کہ چند متعصب ہندو حضرات نے اس غریب زبان کا گلا گھونٹ دینے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا یا مگر اُنہیں ہمیشہ مایوسی ہوئی کہ اسے جتنا دبایا گیا یہ اُتنی ہی اُبھری یہاں تک کہ ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چھا گئی بلکہ دُنیا کے اور حصّوں میں بھی اس نے اپنا قبضہ جما یا۔ یہ اُردو کی ہر دلعزیزی کا بیّن ثبوت تھا۔ جسے دیکھ کر چشم حاسد پھڑکنے لگی اور خواہ مخواہ اسے مسلمانوں کی زبان بتا کر ہندوؤں کو اُس کی مخالفت پر اُبھار دیا۔ یہانتک کہ گاندھی جی نے بھی اعلان کر دیا کہ اُردو زبان قرآن شریف کے حروف میں لکھی جاتی ہے اس لئے مسلمانوں کی زبان ہے۔ گاندھی جی کے اس معصومانہ اظہارِ خیال پر آپ کا جی چاہے تو ہنس لیجئے مگر فی الحقیقت یہ مقام اُن کے دماغی افلاس اور سیاہ باطنی پر رونے کا ہے۔ یہ اُن کے دل کی سیاہی تھی جو زبان سے ٹپک پڑی۔ جو زبان عام طور سے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اُسے "اُردو" کہنا تو کجا "ہندوستانی" کہنا بھی گاندھی جی کو گوارا نہیں۔ اُنھوں نے اپنی زبان کا ایک نیا نام گھڑا ہے "ہندی ہندوستانی" سیاسیات کے اس مہاتما نے ہندو مسلم خلیج کو وسیع تر کرنے کے لئے اب ادبیات میں دخل دینا شروع کیا ہے۔ خدا شریر النفس انسانوں سے بچائے گاندھی جی کو اپنی غلطی کا احساس تو اُسی وقت ہو گیا ہوگا جب مولوی عبدالحق صاحب نے "پرشد" ہی میں اُن کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا مگر وہ ابھی اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں۔ اِسے چاہے عذرِ گناہ بدتر از گناہ سمجھئے چاہے (ہندی ہندوستانی میں) ڈھٹائی۔ بہرحال گاندھی جی اور اُن کے متعصب رفقا کو واضح رہے کہ اُن کے کہنے کے مطابق اگر اُردو صرف مسلمانوں ہی کی زبان ہے تو مسلمان اس کے تحفظ کے لئے دامے درمے قدمے جو کچھ بھی کر سکتے ہیں اس سے دریغ نہیں کریں گے اور مفسدین یہ دیکھ کر کچھ کم رنجیدہ نہ ہوں گے کہ منصف مزاج و حق پسند ہندو بھی اس معاملہ میں مسلمانوں ہی کا ساتھ دیں گے۔"

"ساقی"

گاندھی جی کی نئی بانی

"ذیل میں گاندھی جی کا وہ خطبہ درج کیا جاتا ہے جو بھارتیہ ساہتیہ پرشید کے صدر ہونے کی حیثیت سے انہوں نے ناگپور میں پڑھا تھا۔ اگر قارئینِ نگار میں سے کوئی صاحب اس کو سمجھ لیں تو اس کی ذمہ داری گاندھی جی کے سر نہیں ہے بلکہ وہی اس کے جوابدہ ہیں کیونکہ لکھنے والے کا مقصود تو یہی تھا کہ کوئی مسلمان اسے صحیح پڑھ بھی نہ سکے، سمجھنے کا کیا ذکر ہے۔

یہ ہے وہ زبان جسے ہندوستان کی مشترکہ زبان سمجھنے پر اصرار کیا جاتا ہے اور یہ ہے وہ اُردو جسے حق گستر انہ طور پر غالب کے جلسہ میں بجائے

نظم کے نثر میں پیش کیا جا رہا ہے۔ مرزا نوشہ اگر آج زندہ ہوتے تو وہی پوچھ سکتے تھے کہ "یہ انداز گفتگو کیا ہے"۔ ہم اس کے اعتراف میں سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ بیشک عربی فارسی کے الفاظ قابلِ ترک ہیں اور یہ "دیوبانی" لائقِ احترام۔

ہمارے عزیز دوست میاں بشیر احمد بی۔اے اور زبان کو سہل تر بنانے کے سلسلہ میں اسی قسم کا مشورہ دینے والے دوسرے حضرات انشا، اس جدید نمونہ کو دیکھ کر غالباً بہت خوش ہوں گے کیونکہ "عربی فارسی الفاظ" ترک کر کے ایک دوسرے سے بات کرنے کی مثال شاید ہی اس سے بہتر کوئی اور مل سکے! (نیاز)

اس سبھا کا سبھاپتیتو مجھے دینے کے کارن جب میں ڈھونڈھتا ہوں تو دو ہی پرتیت ہوتے ہیں۔ ایک میرا ساہتیہ کار نہ ہونا اور اس لئے کم سے کم دیش کا کارن ہونا تھا دوسرا میرا ہندوستان کی سب بھاشاؤں کا پریم جو کچھ ہو میں آشا کرتا ہوں کہ ہم کچھ نہ کچھ سیوا کریں گے اور بھوشیہ میں اپنا سیوا کشیتر بڑھاویں گے۔

یدی ہم شری نگر سے لے کر کنیا کماری تک اور کراچی سے لے کر ڈبرو گڑھ تک جو پردیش ہیں اسے ایک مانتے ہیں اور اس کے لوگوں کو ایک پرجا سمجھتے ہیں تو اس پردیش کے پرتیک بھاگ کے ساہتیہ کار، بھاشا شاستری اتیادی آپس میں کیوں نہ ملیں اور بھن بھن بھاشاؤں دوارا ہندوستان کی یتھا یوگیہ سیوا کیوں نہ کریں............" "نگار"

"ہمایوں" قارئین "ہمایوں" پر رحم کھا کر "نگار" سے مہاتما صاحب کی باقی تقریر نقل نہیں کی جاتی۔ آگے بھی اسی طرح کی "یتھا یوگیہ سیوا" اور "بھن بھن بھاشاؤں" دوارا کی پہیلی ہوئی ہے جسے سمجھنے کے لئے مہاتماؤں کی ایک فوج درکار ہے۔

قومی زبان اور رسم الخط کے متعلق پنڈت جواہر لال کے خیالات

ذیل میں ہم پنڈت جواہر لال کی خود نوشتہ سوانح عمری سے کچھ اقتباسات "جامعہ" سے لے کر درج کر رہے ہیں۔ پنڈت جواہر لال سے قومی زبان کے بارے میں زیادہ بے تعصبی کی توقع تھی مگر ان کے موجودہ خیالات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی رائج اور قدرتی قومی زبان کو چھوڑ کر اس "مصنوعی قومی زبان" کے متعلق بڑی بڑی اُمیدیں دل میں رکھتے ہیں جس میں چند سو سال پہلے بعض ہندوؤں نے کچھ دوہے اور چند نظمیں لکھی تھیں اور جواب تو نہیں مگر کبھی ترقی پا کر شاید ہندوؤں کی مذہبی زبان بن جائے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مہا سبھائی ذہنیت کے لوگوں نے جہاں اپنے زہریلے متعصبانہ طرزِ عمل سے گاندھی صاحب کو متاثر کر لیا ہے وہاں جواہر لال کو بھی نہیں چھوڑا۔ ایسے لوگ ہر اس چیز کو مٹا دینا چاہتے ہیں جس میں ہندو مسلمانوں کا اشتراک ہو چنانچہ اب یہ لوگ ہنیے جھاڑ کر اردو کے پیچھے پڑ گئے ہیں یہاں تک کہ اس کا نام (ہندستانی) بھی اس سے چھین لینا چاہتے ہیں۔ واضح رہے کہ ہندی بھی اُردو ہی کا قدیم نام ہے جو پہلے کی طرح مار کر آنکھوں آنکھوں میں لے اُڑے۔ ع سادگی اُردو کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ "ہمایوں"

"(میری بہن کرشنا کی) شادی کا دعوت نامہ ہندوستانی زبان اور لاطینی رسم خط میں لکھا گیا تھا۔ یہ ایک انوکھی بات تھی کیونکہ اس قسم کے دعوت نامے ہمیشہ یا تو ناگری رسم خط میں لکھے جاتے ہیں یا فارسی میں، سوائے فوج اور مشن کے پادریوں کے کسی اور شخص کے ذہن میں بھی کبھی یہ بات نہیں آتی کہ ہندوستانی کو لاطینی رسم خط میں بھی لکھا جا سکتا ہے۔ میں نے تجربہ کے لئے لاطینی رسم خط کو استعمال کیا کہ دیکھوں مختلف لوگوں پر اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔ دعوت نامے بہت کم لوگوں کو بھیجے گئے تھے۔ اگر وسیع حلقہ تک ان دعوت ناموں کی رسائی ہوتی تو اس کا اثر اور بھی غیر موافق ہوتا۔ گاندھی جی نے بھی میری اس بات کو پسند نہیں کیا۔

لاطینی رسم خط کی طرف میرا میلان تو بہت عرصہ سے تھا۔ لیکن اس موقع پر میں نے اس کا استعمال اس کی حمایت کے سلسلہ میں نہیں کیا تھا ترکی اور مرکزی ایشیا میں اس کی کامیابی کو دیکھ کر مجھ پر بہت اثر ہوا تھا اور بظاہر اس کی تائید میں جو دلیلیں پیش کی جاتی تھیں وہ بھی مجھے معقول معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن پھر بھی میں پوری طرح قایل نہیں ہوا تھا اور اگر قایل ہو بھی جاتا تو میں یہ بخوبی جانتا تھا کہ ہندوستان کی جو آج کل حالت ہے اس میں اس کے اختیار کئے جانے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ تمام طبقوں کی طرف سے خواہ وہ قوم پرست ہوں یا مذہبی، ہندو ہوں یا مسلمان، قدیم خیال کے ہوں یا جدید خیال کے اس کی شدید مخالفت کی جائے گی اور میں اس بات کو بھی محسوس کرتا تھا کہ یہ مخالفت محض جذبات پر ہی مبنی نہ ہوگی بلکہ اس سے زیادہ گہری ہوگی۔ رسم خط اور ادب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ رسم خط کی تبدیلی کسی ایسی زبان کے لئے جس کے گذشتہ ادب کا ذخیرہ بہت بڑا ہو ایک بنیادی انقلاب کی حیثیت رکھتی ہے رسم خط کو بدل دیجئے، آپ کے سامنے الفاظ کی نئی تصویریں، نئی آوازیں نئے خیالات پیدا ہو جائیں گے۔ پرانے ادب اور نئے ادب میں ایک ناقابل عبور خلیج پیدا ہو جائے گی اور قدیم ادب آپ کے لئے ایک مردہ غیر زبان کا ادب بن جائے گا جس مقام کے ادب میں کوئی چیز محفوظ رکھنے کے لایق نہ ہو وہاں تو اس قسم کا خطرہ برداشت کیا جا سکتا ہے لیکن ہندوستان میں اس قسم کی تبدیلی کا خیال کرنا میرے لئے تقریباً ناممکن ہے۔ کیوں کہ ہمارے ادب کا ذخیرہ نہ صرف بیش بہا اور وسیع ہے بلکہ ہماری تاریخ اور ہمارے خیالات کے ساتھ قومی طور پر وابستہ ہے اور ہمارے عوام کی زندگیوں سے ایسے گہرا تعلق ہے۔ اس قسم کی تبدیلی کو جبراً رائج کرنا گویا جسم کے زندہ عضو کو کاٹ ڈالنا ہے جس سے عوام کی تعلیم کی ترقی میں بڑی رکاوٹ پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

پھر اس کے علاوہ ہندوستان میں تو اس مسئلہ پر آج کل کوئی علمی اور نظری گفتگو بھی نہیں ہوتی۔ اس لئے اس سے قطع نظر کر کے دوسرا مسئلہ جو لایق غور ہے وہ یہ ہے کہ سنسکرت سے نکلی ہوئی تمام زبانوں مثلاً ہندی، بنگالی، مرہٹی اور گجراتی کے لئے ایک مشترکہ رسم خط اختیار کیا جائے اور اس غرض کے لئے موجودہ رسم خط میں اصلاح کی جائے۔ ان چاروں زبانوں کے رسوم خط کا منبع و مخرج در اصل ایک ہی ہے اور ان میں باہم کچھ ایسا زیادہ فرق بھی نہیں ہے۔ اس لئے ان سب کے واسطے ایک مشترکہ رسم خط کے دریافت کرنے میں کوئی دشواری نہ ہونی چاہئے۔

ہمارے انگریز حکمرانوں نے ہندوستان کے بارے میں ساری دنیا میں عجیب و غریب افسانے مشہور کر رکھے ہیں۔ انہیں افسانوں میں سے ایک یہ ہے کہ ہندوستان میں کئی سو (مجھے صحیح تعداد یاد نہیں) زبانیں ہیں اور اس کے ثبوت کے لئے مردم شماری کی رپورٹ کو پیش کیا جاتا ہے۔ ان سب زبانوں کو مجموعی طور پر ورناکیولر (یعنی غلاموں کی زبان) کہا جاتا ہے۔ ہمارے ملک والوں نے بھی ناواقفیت کی بنا پر اس نام کو قبول کر لیا ہے۔ لیکن بڑے تعجب کی بات یہ ہے کہ ساری عمر ہندوستان میں بسر کرنے کے باوجود بہت کم انگریزوں کو یہ توفیق ہوتی ہے کہ ان کئی سو زبانوں میں سے کسی ایک کو بھی سیکھنے کی زحمت اٹھائیں۔ ان لوگوں نے اپنے خانساماؤں اور آیاؤں کی مدد سے ایک عجیب و غریب زبان پیدا کی ہے جسے ایک طرح کی ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی کہنا چاہئے۔ اسے ہی یہ ہندوستان کی صحیح زبان سمجھتے ہیں جس طرح ہندوستان کی زندگی کے متعلق ان کا علم یہ اپنے ماتحتوں اور خوشامدیوں سے حاصل کرتے ہیں اسی طرح ہندوستانی زبان کا تخیل انہیں اپنے خانگی ملازموں کی معرفت حاصل ہوتا ہے جو بیچارے قصداً ٹوٹی پھوٹی زبان اس لئے بولتے ہیں کہ انہیں یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ ان کے "صاحب لوگ" اس کے علاوہ

کوئی اور زبان سمجھ ہی نہ سکیں گے۔ یہ انگریز اس بات سے قطعی ناواقف ہوتے ہیں کہ "ہندوستانی" زبان ہیں اور یہاں کی دوسری زبانوں میں بڑی لطافتیں اور ادب کے بیش بہا خزانے موجود ہیں۔

اگر مردم شماری کی رپورٹوں سے ہمیں ایک طرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اور تین سو زبانیں ہیں تو دوسری طرف یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جرمنی میں تقریباً پچاس ساٹھ زبانیں ہیں۔ میں نے کسی شخص کو جہاں تک میری یاد کام کرتی ہے کبھی جرمنی کی نااتفاقی اور انتشار کے ثبوت میں زبانوں کی اس کثرت کو پیش کرتے ہوئے نہیں سنا۔ واقعہ یہ ہے کہ مردم شماری میں ہر قسم کی چھوٹی چھوٹی زبانوں کا جن کو بعض اوقات صرف چند ہزار آدمی بولتے ہیں شمار کر لیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ علمی منزویات کی وجہ سے بعض وقت ایک ہی زبان کے مختلف بول چال کے طریقوں کو مختلف زبانوں کا مرتبہ دے دیا جاتا ہے۔ جب میں ہندوستان کے رقبہ کا خیال کرتا ہوں تو مجھے اس کی زبانوں کی کمی پر حیرت ہوتی ہے۔ اگر یورپ کے برابر رقبہ کے اس ملک کا مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ زبان کا جہاں تک تعلق ہے ہندوستان میں دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ اتحاد پایا جاتا ہے۔ لیکن تعلیم کی کمی کی وجہ سے یہاں ابھی تک مشترک معیار پیدا نہیں ہو سکے۔ اور بول چال کی بہت سی زبانیں بن گئی ہیں۔ ہندوستان کی (اگر اس سے برما کو الگ کر دیا جائے) خاص خاص زبانیں حسب ذیل ہیں:۔ ہندوستانی (ہندی اور اردو دونوں شکلوں کے ساتھ) بنگالی، گجراتی، مرہٹی، تامل، تلیگو، ملیالم اور کنٹری۔ اگر ان میں آسامی، اڑیا، سندھی، پشتو اور پنجابی کا بھی اضافہ کر لیا جائے تو سوائے چند پہاڑی اور جنگلی علاقوں کی زبان کے پھر ملک کی کوئی اور زبان باقی ہی نہیں رہتی۔ ان سب زبانوں میں ہندی آریائی نسل کی وہ زبانیں جو ہندوستان کے تمام شمالی، مرکزی اور مغربی حصہ پر چھائی ہوئی ہیں ایک دوسرے سے بہت زیادہ قریب اور متحد ہیں۔ جنوب کی دراوڑی زبانیں گو مختلف ہیں لیکن ان پر سنسکرت کا بہت اثر پڑا ہے اور یہ سنسکرت الفاظ سے بھری ہوئی ہیں۔

مندرجہ بالا آٹھ خاص زبانوں میں سے ہر ایک کے پاس ایک پرانا اور بیش بہا ادب موجود ہے اور ان میں سے ہر زبان ایک ایسے علاقہ میں بولی جاتی ہے جس کو آسانی کے ساتھ دوسرے علاقوں سے ممتاز کر کے متعین کیا جا سکتا ہے۔ بولنے والوں کی تعداد کے لحاظ سے ان زبانوں کا شمار دنیا کی بڑی زبانوں میں کیا جا سکتا ہے۔ بنگالی بولنے والوں کی تعداد ۵ کروڑ ہے۔ رہی ہندوستانی تو اسے اس کی مختلف شکلوں کے ساتھ میرا خیال ہے (میرے پاس یہاں صحیح اعداد نہیں ہیں) ہندوستان کے چودہ کروڑ آدمی بولتے ہیں اور جزئی طور پر ملک کے سب حصوں میں اس کے سمجھنے والے لوگ مل جاتے ہیں[1]۔ ظاہر ہے کہ اس زبان کی ترقی کے امکانات بہت وسیع ہیں۔ یہ سنسکرت کی مستحکم بنیاد پر قائم ہے اور فارسی سے قریبی طور

---

[1] ہندوستانی کے حامیوں کی طرف سے مندرجہ ذیل اعداد دیئے گئے ہیں مجھے یہ نہیں معلوم ہے کہ یہ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری سے لئے گئے ہیں یا اس سے پیشتر یعنی ۱۹۲۱ء کی مردم شماری سے۔ میرا خیال ہے کہ یہ مؤخر الذکر سے لئے گئے ہیں اور جدید اعداد سے ہر عنوان میں خاصی بیشی ہو جائے گی۔

ہندوستانی (جس میں مغربی ہندی پنجابی اور راجستھانی شامل ہیں)	۱۳ کروڑ ۳۰ لاکھ
بنگالی	۴ کروڑ ۳۰ لاکھ
تلیگو	۲ کروڑ ۴۰ لاکھ*
* مرہٹی	۱ کروڑ ۸۸ لاکھ
تامل	۱ کروڑ ۸۸ لاکھ
کنٹری	۱ کروڑ ۳ لاکھ
اڑیا	۱ کروڑ ۱ لاکھ
گجراتی	۹۰ لاکھ
میزان	۲۷ کروڑ ۹۰ لاکھ

بے تعلق ہے۔ ان دونوں سے یہ اپنے الفاظ کے ذخیرہ کو جتنا چاہے بڑھا سکتی ہے۔ اب حال میں انگریزی سے بھی یہی کام لیا جانے لگا ہے صرف جنوب کا دراوڑی ملک ایسا حصہ ہے جہاں ہندوستانی بالکل ایک غیر زبان معلوم ہوتی ہے۔ لیکن وہاں بھی لوگ اس کے سیکھنے کی بڑی کوشش کر رہے ہیں، دو سال گزرے (۱۹۳۲ء میں) میں نے ایک غیر سرکاری رضاکار جماعت کی کارگذاری کے متعلق جو جنوب میں ہندی سکھانے کا کام کر رہی ہے۔ کچھ اعداد دیکھے تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ قائم ہونے کے وقت سے اب تک یعنی گذشتہ چودہ سالوں میں اس کی کوششوں سے صرف احاطہ مدراس میں ۵ لاکھ ۵۰ ہزار آدمیوں نے ہندی سیکھ لی ہے۔ ایک رضاکار جماعت کی کوشش سے جسے حکومت سے کوئی امداد نہیں ملتی اتنا کام ہو جانا بہت غیر معمولی بات ہے۔ پھر اس سے بھی زیادہ قابلِ تعریف یہ بات ہے کہ جتنے لوگ ہندی سیکھتے ہیں وہ آئندہ کے لئے بلامعاوضہ ہندی سکھانے کی خدمت کو اپنی خوشی سے اپنے ذمہ لے لیتے ہیں۔

مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ہندوستانی ہی ہندوستان کی مشترکہ قومی زبان بننے والی ہے معمولی کاموں کے لئے دراصل آج بھی ہندوستانی ہی مشترکہ زبان ہے۔ رسمِ خط کی احمقانہ بحثوں اور سنسکرت اور فارسی الفاظ کے بے جا اور بے جا داخلہ سے زبان کی ترقی میں کچھ رکاوٹ ہو رہی ہے۔ رسمِ خط کے مسئلہ پر چونکہ جذبات بہت مشتعل ہو جاتے ہیں، اس لئے اس کا تو اس کے سوا کوئی دوسرا علاج نہیں ہے کہ دونوں رسوم خط کو سرکاری طور پر تسلیم کر لیا جائے اور لوگ جسے چاہیں اس کے استعمال کرنے کی انہیں اجازت دے دی جائے۔ رہ گیا زبان کا معاملہ تو اس کے لئے اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ انتہا پسند رجحانات نہ بڑھنے پائیں اور روزمرہ کی بول چال کی عام زبان کو بنیاد بنا کر ایک درمیانی ادبی زبان بنائی جائے۔ عوام میں جتنی تعلیم پھیلتی جائے گی یہ بات از خود پیدا ہو جائے گی مگر فی الحال طبقہ متوسط کی چھوٹی چھوٹی جماعتوں کے ہاتھ میں ادب کے معیار کا فیصلہ ہے اور یہ سب اپنی اپنی جگہ پر نہایت تنگ نظر اور قدامت پسند ہیں۔ انہیں ادب کی اُن پرانی اور متروک شکلوں سے گہرا لگاؤ ہے جن میں اب بالکل جان باقی نہیں رہی ہے لیکن عوام سے اور دُنیا کے ادب سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔

ہندوستانی زبان کی ترقی اور توسیع کا یہ نتیجہ نہ ہونا چاہئے کہ دوسری زبانوں مثلاً بنگالی، گجراتی، مرہٹی، اڑیا اور جنوب کی دراوڑی زبانوں کا استعمال یا ان کی وسعت میں کوئی کمی واقع ہو جائے۔ ان میں سے بعض زبانیں تو ہندوستانی سے بھی زیادہ ترقی پسند اور بیدار ہیں۔ ایسی زبانوں کو ان کے اپنے علاقوں میں تعلیمی اور دوسرے اغراض کے لئے سرکاری زبانیں بنا دینا چاہئے کیونکہ عوام میں صرف انہی کے ذریعہ سے تعلیم اور تمدن تیزی کے ساتھ پھیل سکتا ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انگریزی ہندوستان کی مشترکہ زبان بن جائے گی۔ اونچے طبقہ کے پڑھے لکھے لوگوں کی جماعت کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو اس بات کی اہمیت خواب و خیال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی ہے، عوام کی تعلیم اور تمدن کے مسئلہ سے انگریزی کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ ہو سکتا ہے جیسا کہ آج بھی جزئی طور پر ہے کہ انگریزی کو صنعتی علمی اور تجارتی معاملات اور بین الاقوامی تعلقات قائم کرنے کے لئے استعمال کیا جائے ہم میں سے اکثر لوگوں کے لئے دُنیا کے خیالات اور مشاغل سے باخبر رہنے کے واسطے غیر ملکی زبانوں کا جاننا نہایت ضروری ہے اور میں چاہتا ہوں کہ ہماری یونیورسٹیاں انگریزی کے علاوہ فرانسیسی، جرمن، روسی، اسپینی، اطالین سیکھنے کی طرف اپنے طالب علموں

کو پامال کریں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انگریزی سے لاپروائی برتی جائے لیکن اگر ہم دنیا کا ایک صحیح تخیل قائم کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں صرف انگریزی کی عینک سے دُنیا کو نہ دیکھنا چاہئے۔ ایک ہی پہلو اور ایک ہی طرف کے خیالات کو سنتے سنتے ہماری ذہنی ساخت میں توازن باقی نہیں رہا ہے اور ہم ایک جانب زیادہ جھک گئے ہیں ہم میں سے جو لوگ بہت انتہا پسند قوم پرست ہیں وہ بھی اس بات کو بہت کم محسوس کرتے ہیں کہ برطانیہ کے خیالات کا اثر قبول کر کے وہ ہندوستان کے مسائل کے بارے میں کس قدر تنگ نظر اور تنگ خیال ہو گئے ہیں۔

مگر چاہے جتنا بھی ہم دوسری غیر ملکی زبانوں کو ترقی دیں دوسرے ملکوں سے تعلقات قائم کرنے کے لئے انگریزی ہمارے لئے سب سے زیادہ اہم وسیلہ رہے گی۔ اور ایسا ہونا ٹھیک بھی ہے۔ گذشتہ کئی نسلوں سے ہم انگریزی سیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ہمیں اس کوشش میں خاصی کامیابی بھی ہوئی ہے۔ اب اس طویل تربیت کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دینا اور اس سے پورا فائدہ نہ اُٹھانا حماقت ہوگی پھر انگریزی آج بلاشبہ دُنیا کی سب سے اہم اور بہت زیادہ وسیع زبانوں میں سے ہے اور دوسری زبانوں کے مقابلہ میں برابر بڑھتی جا رہی ہے بین الاقوامی تبادلۂ خیال اور ریڈیو براڈکاسٹ کے لئے روز بروز اسے ہی یا اس کی دوسری شکل یعنی امریکن کو ہی زیادہ استعمال کیا جاتا ہے اس لئے ہمیں انگریزی کی تعلیم کو بھی پھیلانا ہوگا۔ جتنی اچھی انگریزی ہم سیکھ سکیں اتنا ہی مناسب ہے لیکن میرے خیال میں انگریزی زبان کی لطافتوں اور باریکیوں سے لطف اُٹھانے کے لئے ہمیں بہت زیادہ دقت اور قوت صرف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ چند افراد ایسا کر سکتے ہیں لیکن کثیر تعداد کے سامنے اس نصب العین کو رکھنا ان پر غیر ضروری بار ڈالنا ہے اور انہیں دوسری سمتوں میں ترقی کرنے سے باز رکھنا ہے۔

کچھ دنوں سے "بنیادی انگریزی" کی تجویز بھی پیش کی جا رہی ہے، یہ تجویز مجھے بہت پسند ہے اور میرا خیال ہے کہ انگریزی کی اس سادہ شکل کا مستقبل بہت وسیع ہے۔ ہمارے لئے یہ مناسب ہوگا کہ معیاری انگریزی کی جگہ ہم اس بنیادی انگریزی کو وسیع پیمانہ پر سکھلائیں اور معیاری انگریزی کو صرف چند ماہرین اور خاص خاص طالب علموں کے لئے چھوڑ دیں۔

میں ذاتی طور پر یہ چاہتا ہوں کہ انگریزی اور دوسری غیر ملکی زبانوں کے الفاظ، ہندوستانی میں خفیف تغیر کے ساتھ یا بجنسہٖ شامل کر لئے جائیں۔ چونکہ ہمارے یہاں جدید اصطلاحیں نہیں ہیں اس لئے یہ بات اور بھی زیادہ ضروری ہے سنسکرت اور عربی فارسی کی نئی اور مشکل اصطلاحیں وضع کرنے سے یہ بہت زیادہ بہتر ہے کہ جدید زبانوں کے مانوس اور معروف لفظوں کا استعمال کر لیا جائے۔ زبان کو خالص رکھنے۔ ایسے لوگ غیر ملکی لفظوں کے استعمال کرنے پر اعتراض کرتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ وہ سخت غلطی کر رہے ہیں کیونکہ کسی زبان کے ترقی دینے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس میں لچک اور یہ صلاحیت پیدا کی جائے کہ وہ دوسری زبانوں کے الفاظ اور خیالات کو جذب کر سکے۔

اپنی بہن کی شادی کے فوراً بعد میں اپنے پُرانے دوست اور رفیقِ کار شیو پرشاد گپتا سے ملنے کے لئے جو ایک سال سے بیمار پڑے ہوئے تھے بنارس گیا۔ جب ان پر فالج کا حملہ ہوا تھا وہ لکھنؤ جیل میں تھے اس کے بعد سے وہ بہت آہستہ آہستہ اچھے ہو رہے تھے۔ میرے بنارس کے قیام کے دوران میں ہندی کی ایک چھوٹی سی انجمن نے مجھے ایک ایڈریس پیش کیا اور میں نے اس کے ممبروں سے نہایت خوش طبعی کے ساتھ غیر رسمی گفتگو کی۔ میں نے معذرت کی کہ میں ماہروں کے سامنے ایسے موضوع پر جس کے متعلق مجھے بہت کم علم ہے کچھ کہتے ہوئے پس و پیش

ہوں لیکن پھر بھی میں نے کچھ تجویزیں پیش کیں۔ میں نے اس پیچیدہ اور رنگین زبان پر اعتراض کیا جو ہندی تحریریں عام طور پر استعمال کی جاتی ہے جس میں سنسکرت کے مشکل الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں اس کی ساخت قدرتی نہیں بلکہ مصنوعی معلوم ہوتی ہے اور جدت کی جگہ طرزِ تحریر میں قدامت کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ میں نے ہمت کر کے کہا کہ یہ درباری طرزِ تحریر جس کا خطاب صرف ایک منتخب طبقہ سے ہوتا ہے ترک کرنا چاہئے اور ہندی لکھنے والوں کو قصداً عوام کے لئے ایسی زبان میں لکھنا چاہئے جو ان کی سمجھ میں آ سکے عوام سے نزدیک آ جانے کے بعد زبان میں جان اور سچائی پیدا ہو جائے گی اور مضمونوں میں عوام کے جذبات کی قوت کا کچھ اثر جھلکنے لگے گا اور وہ اپنا کام بہتر طریقہ پر کر سکیں گے پھر میں نے کہا کہ اگر ہندی کے مصنف مغربی خیال اور ادب پر زیادہ توجہ کریں گے تو اس سے بھی انہیں بہت فائدہ حاصل ہوگا۔ یورپین ناولوں کے کلاسکس نیز ایسی کتابوں کے ترجمے کرنا جن میں جدید خیالات پائے جائیں بہت مفید ہوگا میں نے یہ بھی کہا کہ غالباً جدید بنگالی، گجراتی اور مرہٹی ادب جدید ہندی ادب کے مقابلہ میں زیادہ ترقی یافتہ ہیں اور بلاشبہ پچھلے سالوں میں بنگالی میں ہندی کے مقابلہ میں زیادہ تخلیقی ادب پیدا کیا گیا ہے۔

ہم نے اس مسئلہ پر دوستانہ گفتگو کی اور اس کے بعد میں چلا آیا تھا۔ مجھے اس کا گمان بھی نہ تھا کہ میری گفتگو اخباروں میں بھیج دی جائے گی۔ لیکن حاضرین میں سے کسی نے اس کی رپورٹ ہندی اخباروں کو بھیج دی۔

پھر ہندی اخباروں میں میرے خلاف میری اس جسارت پر کہ میں نے ہندی پر اعتراض کیا اور بنگالی گجراتی اور مرہٹی کو ہندی سے بہتر بتا دیا بڑی لے دے مچی۔ مجھے جاہل مطلق کہا گیا۔ اور ان کا یہ کہنا جہاں تک اس دن کے موضوع کا تعلق ہے بلاشبہ صحیح تھا اور میری تردید کرنے اور میرا منہ بند کرنے کے لئے اور بھی مجھے بہت کچھ سخت سست کہا گیا۔ میرے پاس اس جھگڑے کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے وقت نہ تھا لیکن مجھے معلوم ہوا کہ یہ جھگڑا کئی مہینہ تک چلتا رہا۔ یہاں تک کہ میں دوبارہ جیل میں پہنچ گیا۔

یہ واقعہ میرے لئے بہت سبق آموز تھا۔ اس سے مجھے پتہ چلا کہ ہندی ادیب اور اخبار نویس کس قدر غیر معمولی طور پر حساس واقع ہوئے ہیں۔ مجھے اس بات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ لوگ کسی ایسے مخلص شخص کی تنقید کو بھی جو ان کی بھلائی چاہتا ہے سننا گوارا نہیں کر سکتے۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنی برائیوں اور کمزوریوں پر کس طرح پردہ ڈالے رکھنا چاہتے تھے۔ صحیح تنقید ان لوگوں میں بالکل مفقود ہے اور تنقید کے معیار بھی بہت پست ہیں۔ مصنف اور تنقید نگار میں اکثر جھگڑے ہوتے رہتے ہیں اور اکثر دونوں ایک دوسرے کی نیت پر حملہ کرتے رہتے ہیں۔ ساری ذہنیت میں تنگی، اوچھا پن اور فرقہ پرستی پائی جاتی ہے مصنف اور اخبار نویس صرف ایک دوسرے کے لئے اور ایک نہایت مختصر حلقے کے لئے لکھتے ہیں اور وسیع پبلک اور اس کے مفاد کو بالکل نظر انداز کر جاتے ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر کہ اس کے کہ میدان اس قدر وسیع اور دلچسپ ہے لیکن پھر بھی یہ لوگ بے کار اپنی قوت ضائع کر رہے ہیں ان پر بہت رحم آیا۔

ہندی ادب کا ماضی بہت اچھا ہے لیکن ماضی کے سہارے ہمیشہ زندگی نہیں گزاری جا سکتی۔ مجھے یقین ہے کہ ہندی کا مستقبل بھی شاندار ہوگا اور آگے چل کر ہندی صحافت ملک کی ایک زبردست قوت بن جائے گی۔ مگر ان دونوں کو ترقی اسی وقت ملے گی جب یہ

تنگ رسمی پابندیوں سے اپنے آپ کو آزاد کریں گے اور عوام کو اپنا مخاطب بنائیں گے ۔" "جامعہ"

اہلِ اُردو کو بیداری کا پیغام

نہ سنبھلو گے تو مٹ جاؤ گے اے اُردو زباں والو　　　تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

"اُردو اور ہندی کے قضیہ کے متعلق مدتوں تک ہمیں یہ توقع رہی کہ وہ رہنمایانِ ہند جو ہندوستان کے متفقہ زعیم سمجھے جاتے ہیں ... مفاہمت کی کوئی سبیل پیدا کریں گے اور اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر اس قضیہ کو چکا دیں گے اور دونوں زبانوں کے حامیوں کو الگ الگ پارٹی بندیوں سے ہٹا کر شاہراہِ ادب پر لا کھڑا کریں گے لیکن حالات و واقعات نے ہماری ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا خصوصاً بھارتیہ ساہتیہ ... کے اجلاس کے بعد ہمیں یقین ہو گیا کہ ہم نے جن لوگوں کو اپنی اُمیدوں کا مرکز قرار دیا تھا وہ ہرگز اس قابل نہ تھے بلکہ وہ تو اس قابل بھی نہیں ... کہ ان کو ہندوستان کا متفقہ زعیم سمجھا جائے۔

بہرحال اب یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ "مفاہمت" ناممکنات سے ہے۔ اور ہندی اور اُردو کے حامیوں کے مابین صلح کی کچھ ... تک اور توقع رکھنا حزم و مصلحت اندیشی کے سراسر خلاف ہے بلکہ اب سوال صرف مقابلہ اور مدافعت کا ہے اور اس بات کا اب یقین کر ... چاہیئے کہ جو اپنی پوری طاقت سے مقابلہ کرے گا وہی کامیاب ہو گا۔

مقابلہ اور مدافعت کرنے والوں کے لئے بہت ضروری ہے کہ پہلے وہ اردو اور ہندی کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیں، اردو کی ... درحقیقت یہ ہے کہ اس میں فارسی اور عربی کے الفاظ بہ نسبت سنسکرت وغیرہ کے زیادہ ہیں اور اردو اسی وقت تک اردو باقی رہے گی ج... کہ اس کی اس امتیازی شان کو برقرار رکھا جائے گا اور جس روز اردو میں سنسکرت اور بھاشا کے غیر مانوس الفاظ عربی اور فارسی کے ... زیادہ یا ان کے برابر بھی داخل ہو گئے تو اسی روز یہ سمجھ لینا چاہیے کہ "اردو" اردو باقی نہ رہی بلکہ "ہندی" ہو گئی۔ ہمعصر جامعہ کے ایک ... میں توسیع اُردو کے لئے ایک تجویز یہ بھی پیش کی گئی ہے کہ اُردو میں سنسکرت کے الفاظ کافی استعمال کئے جائیں، اس میں کوئی ... کہ ہندوؤں کو اردو کی طرف مائل رکھنے کے لئے یہ تجویز ضرور مفید ہے لیکن ہمیں اس تجویز پر عمل درآمد کرنے میں یہ خطرہ محسوس ہوتا ... ایسا نہ ہو کہ سنسکرت کے الفاظ استعمال کرنے والے رفتہ رفتہ بے اعتدالیوں پر اُتر آئیں اور سنسکرت کے الفاظ سے وہ اس قدر ... جائیں کہ فارسی اور عربی کے اچھے اور شستہ لفظوں کو ترجیح دینے کی صلاحیت ہی کھو بیٹھیں۔"

"ندیم" گیا

قواعد

۱۔ "ھُمایُوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲۔ علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پُورے اُتریں درج کئے جاتے ہیں

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ۱/۲ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶۔ ہُمایُوں کی ضخامت کم از کم بہتّر صفحے ماہوار اور سوا نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی
اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتًہ بھیجا جائے گا۔

۸۔ جواب طلب امور کے لئے ۱/۲ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیئے۔

۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے چھ آنے ششماہی تین روپے (مع محصولڈاک) فی پرچہ ۸/

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتا تحریر کیجیے۔

۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافے پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھئے

مینیجر رسالہ ہمایوں

۲۳۔ لارنس روڈ۔ لاہور

[Tit]el & Picture Printed at the Half tone Press, Dav Samaj Road, Lahore.

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگارِ علامۂ فضیلۃ آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں بی۔ اے

جلد (۳۰)

فہرست مضامین

"ہمایوں" بابت ماہ اکتوبر ۱۹۳۶ء

تصویر:- بچپن

نمبر (۴)

ندہ سالانہ صہ ششماہی سے مع محصول قیمت فی پرچہ ۸ر

بزمِ ہمایوں

چار ماہ ہوئے کہ اُدھر اخبارات میں اِدھر ہمایوں میں راقم نے یہ تحریک کی تھی کہ اُردو کے تحفظ و ترقی کے لئے لاہور میں جو "انجمن اُردو پنجاب" قائم کی گئی ہے اُردو کے بہی خواہ اور اُس سے محبت رکھنے والے اس انجمن کے رکن بنیں اور علاوہ اس کی امداد کے عملی طور پر اپنے اپنے حلقے میں اپنی علمی و ادبی دلچسپی کا بیش از بیش ثبوت دیں۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس سلسلے میں جو توقعات اہلِ اردو سے وابستہ تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں۔ یہ نہیں کہ کسی نے توجہ نہیں کی، یہ نہیں کہ کسی نے دلچسپی نہیں لی، یہ نہیں کہ کسی کو دلی احساس نہیں، ظاہری توجہ ظاہری دلچسپی اور شاید ایک نیم سا احساس تو بہتوں نے ظاہر کیا تقریریں کیں وعدے کئے جوش میں آئے یہ سب کچھ لیکن عملاً بہت کم کام کر کے دکھایا گیا۔ یہ درست ہے کہ ہمارے اخبارات میں آئے دن اُردو ہندی کے جھگڑے کا ذکر اذکار رہتا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ بجا ہوگا کہ ہندی والوں کی افتراق پسند کارروائیوں اور اُردو والوں کی شاعرانہ کوششوں کی خبریں درج ہوتی ہیں لیکن کتنے اخبارات ہیں، شاید کوئی ہوگا جس نے اس اہم ترین موضوع پر کوئی افتتاحیہ مقالہ سپردِ قلم کیا ہو؛ زیادہ سے زیادہ کبھی کبھار ایک مختصر سا نوٹ لکھ دیا کسی ادبی خبر کو ذرا "اچھی" سی جگہ دے دی اور سمجھ لیا کہ بس ہم اپنے اس نیم قومی نیم اہم فرض سے سبکدوش ہو گئے۔ عام طور پر ہمارے سیاسی حلقوں میں بھی یہی خیال چھایا ہوا ہے کہ ملک و قوم کے ہزاروں ایسے سیاسی و تمدنی مسائل ہیں جو محض ایک صرف و نحو رکھنے والی پڑھی پڑھائی جانے والی روزمرہ کے استعمال کی زبان سے دس گنا زیادہ اہم اور نتیجہ خیز ہیں۔ اس بات کی طرف توجہ نہیں کہ ہماری زبان ہماری روایات کی حامل ہے، وہ روایات جن پر قومی و ملکی وقار کا دار و مدار ہے، یہ نہیں سوجھتی کہ وہ روزمرہ کی چیزیں ہی ہیں جن پر زندگی کا انحصار ہے، ہوا پانی دھوپ کتنی عام ہیں اور کس قدر بیش بہا لیکن کتنے ہیں جو اُن سے کما حقہٗ فائدہ اُٹھاتے ہیں جو اُن کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یہی حال ہماری صبح و شام کی بولی جانے والی زبان کا ہے، کسی کو زیادہ تکلیف اُٹھا کر اسے حاصل نہیں کرنا پڑتا، ایک آنے میں ایک روزانہ اخبار دروازہ کھٹکھٹانے پر تیار، چند روپوں میں کئی کتابیں ہر وقت میز پر موجود اور عموماً طاقِ نسیاں کی زینت، پھر کس کو اس غریب کی قدر ہو؛ وہ تو اُن مرے مٹے بزرگوں نے اس کے نشو و نما میں حصہ لیا، کہتے ہیں اپنا خون پانی ایک کیا، راتوں کو دیئے کی روشنی میں اس کی نوک پلک سنواری، اب اس بجلی کے عہد میں کون اس ہر وقت بنی سنوری رہنے والی ہستی کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہے، ہمارے لئے نئی سے نئی دلچسپیاں، نئی سے نئی مصروفیتیں ہیں۔ دُنیا میں کیا کیا کرنے کو موجود ہے! دُنیا کے واقعات ملک کے ہنگامے قوم کے جھگڑے زبردست تحریکات لرزہ خیز حادثات! ان کے ہوتے اس بیچاری زبان

دل آویز اُردو زبان کی کیا حقیقت ہے ؛

ہم کچھ بھی کہا کریں جو کچھ ہم کرتے ہیں اُس کا مطلب سیدھے سادے لفظوں میں یہی ہے جو اُوپر بیان کیا گیا ہے۔ پھر اس سے کیا نتیجہ نکلتا ہے ؛ کیا ہماری حالت مایوسانہ ہے ؛ کیا اردو زبان بہت پست حالت میں ہے ؛ اُس کا ادب کیا بالکل ناقص ہے ؛ نہیں ہرگز نہیں بلکہ تعجب یہی ہے کہ ایک غافل قوم کی زبان کی حالت ابھی اُس کی غفلت کا نمونہ نہیں بنی، قوم سُست ہے آپس کی لڑائی لڑ حسد کو زندگی کا لطف و حظ سمجھتی ہے مرکزیت سے بھاگتی ہے تنظیم نام کو نہیں جانتی لیکن اُس کی زبان اور اُس زبان کے ادب میں رنگ ہے چاشنی ہے اک تحریک ہے، ماں باپ رونا مُنہ بنائے بیٹھے ہیں لیکن بچے کی فطرت میں ہنسی کھیل کی امنگ سے زندگی موجزن ہے۔ سو مایوسی کی کوئی وجہ نہیں لیکن دوستو! دُنیا کی بہترین چیز. زندگی کا عظیم ترین کارنامہ بھی بیکار و بے سُود ہو کر رہ جاتا ہے اگر ہم اُس سے مُنہ پھیر لیں ۔ اپنی چیزوں کی قدر کرنا سیکھو ورنہ اگر تم ہی اُنہیں حاصل شدہ سمجھ کر اُن سے رُوگردانی کرو گے تو وہ بے قدر اور بے رُوح ہو کر رہ جائیں گی ۔ توجہ کا ثبوت دلچسپی ہے اور دلچسپی کا نتیجہ ایک نئی زندگی کا ظہور!

اُردو کی اہمیت اور وسعت اور ہمہ گیری کے نقطۂ نظر سے انجمنِ اُردو پنجاب ابھی بہت لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول نہیں کرا سکی لیکن جن اصحاب و خواتین نے بھی بغیر زیادہ تحریک کے گویا خود بخود اپنی دلچسپی اور پُرخلوص احساس کا عملی ثبوت دیا ہے اُن میں سے بعض کے خیالات اس قدر حوصلہ افزا اور حیات انگیز ہیں کہ رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ قصور ہم کارکنوں ہی کی کوتاہ عملی کا ہے ورنہ عوام الناس میں ایسے ایسے صاحبِ دل اور حسّاس محبِّ قوم موجود ہیں جن کے ہوتے ہوئے ہماری زبان اور ہماری روایات ہزار خطروں کے اندر بھی محفوظ و مامون رہیں گی۔

لیکن اوروں کو چھوڑیئے، ناظرینِ "ہمایوں" جو "ہمایوں" کو اس قابل سمجھتے ہیں کہ سال بھر میں اس پر پانچ روپے کی رقم صرف کریں کیا وہ اُس دلکش عظیم الشان زبان کے لئے جس کے بغیر اس کا وجود ناممکن ہے ہر سال میں کم از کم ایک روپیہ دے کر انجمن اردو پنجاب کے رُکن نہیں بن سکتے ؛ اُن سے بزور درخواست کی جاتی ہے کہ وہ نہ صرف اسی ماہ کے اندر خود اُس کے رُکن بنیں بلکہ ہر ماہ کم از کم ایک رُکن اس انجمن کو پیش کریں جس کا مقصد ہماری پیاری زبان کی فلاح و ترقی ہے!

بشیر احمد

جہاں نما

تحلیلِ نفسی اور نفسِ غیر شعوری

کسی دوسرے نئے علم نے عہدِ حاضر کی ذہنی فضا کو اتنے کم عرصے میں اس قدر متاثر نہیں کیا جتنا علمِ تحلیلِ نفس نے۔ نظریۂ تحلیلِ نفس نے نفسِ غیر شعوری کے متعلق جو حیرت انگیز انکشافات کئے ہیں اور ہماری روزانہ زندگی کے ایسے واقعات کی توجیہہ جو اب تک محض اتفاق سمجھے جاتے تھے اس دقتِ نظر سے کی ہے کہ اس پر اظہارِ حیرت کے سوا چارہ نہیں رہتا۔

تحلیلِ نفسی کا مقصد ذہنی زندگی کی غیر طبعی کیفیات کا مطالعہ تھا لیکن غیر طبعی ذہنیت کی کیفیتوں کے مطالعہ کے دوران میں طبعی اور غیر طبعی ذہنی زندگی کا امتیاز بتدریج اس طرح اٹھتا گیا کہ اب ان دو بظاہر متناقض ذہنی کیفیات کے درمیان نوعیت کا فرق نہیں رہا محض مدارج کا فرق ہے۔

زیادہ وسیع مفہوم میں تحلیلِ نفسی کی اصطلاح اُن تمام مسالک پر حاوی ہے جو ڈاکٹر فرائڈ کے نظریات سے پیدا ہوئے ہیں۔

نظریۂ تحلیلِ نفسی کی بنیاد ذہنی جبریت کے عقیدہ پر ہے۔ یہ عقیدہ اس مفروضے کی بنا پر قائم ہے کہ ذہنی زندگی میں بھی طبعی زندگی کی طرح علت و معلول کا سلسلہ موجود ہے اور جہاں کسی ذہنی کیفیت کا کوئی صحیح ظاہری اور شعوری سبب معلوم نہ ہو سکے وہاں فی الحقیقت غیر شعوری نفسی عوامل مصروفِ کار ہوتے ہیں۔ یونانیوں کے زمانے ہی سے نفسِ غیر شعوری علمائے نفس کا موضوعِ فکر رہا ہے۔

علمائے نفس محض یہ قیاس کر سکتے تھے کہ شعوری نفس کے علاوہ غیر شعوری نفس بھی ہے لیکن اس کے وجود کے اقرار کے سوا وہ اور کچھ نہ جانتے تھے اور اس کی ماہیت سے مطلق بے خبر تھے۔ غیر شعوری نفس کا علم اس قدر محدود تھا کہ وہ لوگ خواب، التباسِ خیال والتباسِ نظر اور اضغاثِ احلام وغیرہ کی قسم کی غیر شعوری کیفیات کو ناقابلِ توجہ سمجھتے تھے لیکن فرائڈ نے غیر شعوری نفسی کیفیتوں کی ایک وسیع تحقیق شروع کر دی۔ اس نے نہ صرف غیر شعوری نفس کا وجود ثابت کیا بلکہ یہ بھی ثابت کیا کہ اس کا دائرۂ عمل نفسِ شعوری سے بہت زیادہ وسیع ہے۔ ان ذہنی کیفیات کی تشریح کی تلاش کے سلسلے میں اس نے یہ بھی معلوم کیا کہ نفسِ غیر شعوری مقابلتہً زیادہ کامجو اور انسان کے دورِ وحشت کے زیادہ قریب تر ہے۔ اگرچہ اس نظریہ کی حیثیت فی الحال محض ایک مفروضہ کی ہے مگر فرائڈ نے اس سلسلے میں جو بے شمار واقعات جمع کئے ہیں اُن سے یہی نتیجہ نکلتا ہے جو فرائڈ نے اخذ کیا ہے۔

فرائڈ کا نقطۂ نظر سمجھنے کے لئے نفسِ انسانی کو دو ایسے گھرانوں کی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے جو ایک ہی مکان کی دو مختلف منزلوں



میں آباد ہوں۔ بالائی منزل پر رہنے والا گھرانا نفسِ شعوری ہے۔ یہ منزل باقاعدہ آئین پسند اور معزز لوگوں کا مسکن ہے۔ نیچے کی منزل میں مشتبہ اخلاق و کردار کے لوگوں کی ایک تعدادِ کثیر آباد ہے، جو وحشی جوشیلے اور انتہا درجے کے خودغرض اور کامجو ہیں۔

نیچے کی منزل کے بہت سے مکین دراصل بالائی منزل میں آباد تھے لیکن اپنے ناپسندیدہ کردار کے ظاہر ہونے پر وہ اس جگہ سے راندۂ درگاہ فرشتوں کی طرح دھتکار دیئے گئے۔

اُن کا اولین مقصد اپنی خواہشات کی تسکین ہے جو زیادہ تر جنسی جذبات پر مشتمل ہوتی ہیں۔ انہیں اغراض کے لئے یہ بالائی منزل پر آنا چاہتے ہیں، جہاں نمود و نمائش کے بہتر اور وسیع تر مواقع حاصل ہوتے ہیں لیکن یہ بات بالائی منزل کے مکینوں میں خوف و ہراس پیدا کر دیتی ہے اس لئے اُن کی روک تھام کے لئے ایک حاجب یا محتسب مقرر ہے۔ مگر اس کا عمل بھی غیر شعوری ہوتا ہے بعض اوقات محتسب کسی غیر شعوری خواہش کو دبانے میں ناکام رہتا ہے چنانچہ یہ بزور نفسِ شعوری میں داخل ہو جاتی ہے۔ ایسے موقع پر محتسب انتقالِ مکانی کے دوران میں عملِ تصعید سے کام لے کر اس پست خواہش کو قابلِ اعتراض عناصر سے پاک کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اُس کو مناسب لباس پہناتا ہے، اُس کے دورِ وحشت کے اجڈپن اور نفسانیت کو نکال لیتا ہے تاکہ وہ اچھی صحبت میں بیٹھنے کے قابل ہو سکے

تصعید کا یہ عمل خواہش کی ظاہری صورت کو اس قدر بدل دیتا ہے کہ ہمسائے کی بیوی کو بھگا لے جانے کی دبی ہوئی خواہش سگترے کے مربے سے نفرت کی صورت میں ظاہر ہو سکتی ہے۔

ہر شخص زندگی کی چھوٹی چھوٹی ناکامیوں، ذلتوں اور تکلیفوں کے ظاہر کرنے سے بچنا چاہتا ہے۔ ایسے موقعوں پر ہم اظہار کے فطری جذبے کو شعوری طور پر دباتے ہیں۔ اسی طرح ایک غیر شعوری عمل بھی انسان کو دورِ وحشت کے سفلی رجحانات سے ہر وقت روکتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ اختلاف و عناد کے بعض نیم پائدار جذبات کو بھی محتسب سے اپنے اظہار کی اجازت نہیں ملتی۔ اس قسم کے خلقی جذبات عموماً نفسِ شعوری کے دائرے میں داخل ہونے کا کوئی صحیح راستہ نہیں پا سکتے۔ اگر ان جذبات کو اپنے اظہار کا پورا موقع ملے تو نظامِ معاشرہ درہم برہم ہو جائے۔ اسی وجہ سے عملِ احتساب و تصعید کے ذریعے سے ان کی روک تھام ہوتی رہتی ہے۔ چونکہ عملِ تصعید کی حیثیت بالکل غیر شعوری ہوتی ہے اس لئے وہ معمول جس کے اندر سفلی جذبات کی تصعید ہوتی ہے خود ان جذبات سے اپنے آپ کو کسی طرح متعلق نہیں سمجھ سکتا۔ وہ یہ بھی نہیں سمجھتا کہ شعور کی سرحد سے پرے اخلاق کا ایک زیادہ سخت ضابطہ موجود ہے۔

تلک کے غیر مطبوعہ خطوط

بال گنگا دھر تلک نے آج سے تیس سال قبل اپنے ایک انقلاب پسند ہندستانی دوست شیام جی کرشنا ورما کو جو اُن دنوں پیرس میں مقیم تھا دلچسپ خطوں کا ایک سلسلہ لکھا تھا۔ شیام ایک متمول بہی خواہِ خلق تھا اور وہ ہندوستان کے مقاصد کے لئے اپنا روپیہ نہایت فراخ دلی

سے صرف کیا کرتا تھا۔ ان خطوں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس پر تلک کا بہت اثر تھا اور وہ اپنے عطیوں کے معاملے میں بالعموم اسی کے مشورہ پر کاربند ہوتا تھا۔ ایک خط میں سورت کی علیحدگی کے بعد تلک نے اپنی نئی جماعت کے پراپگینڈا کے متعلق ایک نئے منصوبہ کا ذکر کیا ہے۔

ان خطوط سے تلک کی سوانح عمری میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہوا ہے۔ ان سے اس کی ناقابلِ تسخیر قوتِ عمل اور اس کے زندہ و پائندہ اعتمادِ نفس کا ثبوت ملتا ہے۔ اسی سلسلے میں ایک خط کا ذکر ہے جو تلک نے چرول کے مقدمے میں اپنی ناکامی کے بعد لندن سے ہوم رول لیگ کے جنرل سکرٹری مسٹر ڈی۔ وی۔ گوکھلے کو لکھا تھا۔ اس خط سے ذیل کا اقتباس قابلِ ملاحظہ ہے:۔

"یہ خبر کہ مقدمے کی ناکامی نے مجھے مایوس کر دیا ہے بالکل بے بنیاد ہے۔ میں اب اتنا پرانا آزمودہ کار ہو چکا ہوں کہ اگر آسمان بھی نیچے گر پڑے تو میں اس سے بھی مطلق نہیں گھبرا سکتا۔ آسمان کے گرنے سے ہراساں ہونا تو کجا میں تو اس کے گرنے کو بھی اپنے مقصد میں کسی نہ کسی طرح استعمال کروں گا۔ واقعات جیسے بھی ہوں یا جیسے بھی ہو جائیں ان کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ واقعات کی محکومی کسی طرح گوارا نہ کرنی چاہیئے۔ یہی اب تک میرا نصب العین رہا ہے اور اب بھی یہی ہے۔"

تلک کے یہ الفاظ شاندار لوگوں کے شاندار الفاظ کا ایک شاندار نمونہ ہیں۔

موجودہ ہندوستانی فلمیں

ہندوستانی فلموں سے یہ توقع رکھنا بھی درست نہیں کہ وہ یکدم مغربی فلموں کی سی ترقی کر لیں کیونکہ زندگی کا کوئی شعبہ اپنی تکمیل کے لئے ارتقائی مدارج سے بے نیاز نہیں ہو سکتا لیکن یہ مطالبہ بے جا نہیں کہ ان کی ترقی کی رفتار اس قدر سست نہ ہونی چاہیئے جتنی اس وقت تک ہے کیونکہ ہندوستانیوں کے سامنے ہالی وُڈ کے نہایت کامیاب نمونے موجود ہیں۔ افسوس کہ ہمارے اہلِ ملک سنما کی صحیح اہمیت سے ابھی واقف نہیں ہوئے اور اسے محض ایک ادنیٰ تفریح اور جلبِ منفعت کے ذریعہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری فلم کمپنیوں نے تمام فنی مقاصد کو پسِ پشت ڈال رکھا ہے اور وہ ہر بات میں عوام کے جذبات کی پیروی کرتی ہیں۔

ملک میں اچھے ڈائرکٹروں اور اچھے فلمی نقادوں کی افسوسناک کمی ہے۔ غنیمت ہے کہ اب ہمارے بعض ادبا نے اس طرف توجہ کی ہے۔ پچھلے دنوں پنجاب ہوشن کلچر اکیڈیمی لاہور میں مشہور ہندوستانی افسانہ نگار منشی پریم چند نے ہندوستانی فلم کے موضوع پر تقریر کی جس میں انہوں نے کہا کہ ہماری فلمی کمپنیاں فنی یا جمالیاتی معیار سے فلمیں تیار نہیں کرتیں بلکہ فن کے بجائے ان کا معیار اُس روپے کی مقدار ہوتی ہے جو وہ ان کے ذریعہ سے کماتی ہیں۔ ڈائرکٹر عوام کو خوش کرنے کے لئے نہایت بے ڈھب موقعوں پر گانے اور ناچ رکھ دیتے ہیں۔ ان لوگوں کے اس جنون نے ملک کی اس صنعت کو نہایت پستی میں گرا دیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ معاشری مذہبی اور تعلیمی تصاویر بھی اکثر حد درجہ مضحکہ خیز بن جاتی ہیں۔ منشی پریم چند نے کہا کہ ادنیٰ قسم کی سنسنی پیدا کرنے پر بہت پابندی ہونی چاہیئے اور اس بارے میں خاص حدود سے تجاوز نہ کرنا چاہیئے۔ منشی صاحب نے مشورہ دیا کہ سنما سے معاشری اور اخلاقی اصلاح کا کام لیا جائے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سنما کی فنی یا تفریحی حیثیت سے نظر انداز کر دی جائے۔ کیونکہ اس صورت میں یہ محض ایک بیکار اور بے اثر چیز ہو جائے گا

ڈاکٹر تاراچند جی سے دو دو باتیں

ٹھیٹ اُردو میں

مہاراج ۔ نمسکار ۔ میرے ایک ساتھی نے "ہندستانی" میں آپ کا لکھا ہوا وہ ٹکڑا مجھے دکھایا جس میں آپ نے اپنی اکیڈیمی کی جمی ہوئی سبھا کے لکھنے والوں کا گُن مانا اور انہیں نئے ڈھنگ کے سراہا ہے ۔ اسے دیکھ کر میں اس سوچ میں پڑ گیا کیا ایسی لکھت اُردو کہی جا سکتی ہے ۔ میں یہ مانتا ہوں ہند مندر ہے ، اُردو اس کی دیوی ، ہم آپ سب کے سب اس کے پُجاری ۔ آئے دن اُردو دیوی پر ہند ماتا کے چھوٹے بڑے سپوت جو چڑھاوے چڑھا رہے ہیں یہ سب چڑھاوے جیسے پہلے ایک سے تھے اب بھی ویسے ہی ہوتے تو کیا اچھا ہوتا پر ایسا نہیں ۔ ان میں سے اب کچھ ایسے ہو چلے ہیں جو پجاریوں کی بھیڑ بھاڑ میں بھی ان نئے چڑھاووں پر انگلیاں اُٹھ رہی ہیں ۔

اُردو کو بے میل مٹھائی سمجھئے ۔ کئی مٹھائیوں میں سے ایک مٹھائی چن کے الگ کر لینے سے مٹھاس بڑھے گی کیا گھٹ جائے گی ۔ ایک چُنی ہوئی مٹھائی میں اور کئی مٹھائیوں کی مٹھاس نہیں آ سکتی ۔ کسی ہرے بھرے پودے کی جڑ کھود کے کسی سوکھے ہوئے پیڑ کے لئے جگہ نکالنے سے پٹھنٹھ تو بھلا کیا پھلے پھولے گا ۔ وہ ہرا بھرا پودا مرجھا جائے گا ۔ جیتی جاگتی بھاشا میں مٹی ہوئی بولی کے ٹھونسنے سے مری ہوئی بولی تو جی اُٹھنے سے رہی سانس کے ملنے سے جیتی جاگتی بھاشا ادھ موئی ہو جائے گی ۔

راج ہٹ ، بالک ہٹ ، تریا ہٹ ، یہی تین ہٹیں آج تک سُنی تھیں ۔ آپ نے تین تیرہ باٹ کو اچھا سمجھ کے ان تینوں ہٹوں میں ایک کائستھ ہٹ بڑھا کے ہٹوں کی پوری چوکھنڈی بنا دی ۔ جس سبھگھڑی میں اُردو کی نیو ڈالی جا رہی تھی جبھی سے اس کا دھیان رہتا تو آج "تت سم شبدوں" "تت بھو شبد" "سوبھاؤ" "انیکتا" "کلاپ" "ریکھا" "سمبندھ" "دشا" ایسے ہی اور اور بہت سے بول گھل مل کے کب کے بولنے اور لکھنے میں آ چکے ہوتے ۔ پر اب کیا ہوتا ہے اب تو ہاتھی کے دانت باہر نکل چکے ۔ ایک چنا کیا بھاڑ پھوڑے گا ۔ ایک آدھ کے چاہنے سے برسوں میں سیکڑوں ہاتھوں کی سمیٹی ہوئی پونجی کیسے پھینکی جا سکتی ہے ۔ جیسے میرے آپ کے چاہنے سے کوئی بولی وولی نہیں بنتی ۔ ایسے ہی اس میں کتر بیونت بھی ایک آدھ کے چاہنے سے نہیں ہو سکتی ۔

" ھمایوں " مولوی ابوالقاسم صاحب نے اس مضمون میں بہت سچی باتیں کہی ہیں ۔ آخری سطروں سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً یہ مضمون ڈاکٹر تاراچند کو بھیجا گیا تھا لیکن کسی وجہ سے ہندستانی میں نہ چھپ سکا ۔ مضمون کا لہجہ کہیں کہیں ضرورت سے زیادہ سخت ہے ۔

سنسکرت باہر والوں کے جوڑ توڑ سے مٹتی اور ان کے ہاتھوں اس کی یہ گت بنتی تو نہ جانے ان پر کتنی لے دے ہوتی اور ان کی کیسی
ہی دھجیاں اُڑائی جاتیں۔ پر اسے کیا کہئے۔ راج پاٹ کی باگیں اپنے ہاتھ میں رکھنے کی دُھن میں اپنے دھرم کی بھاشا پر گھر والوں ہی نے
الہ جگہ پہرے بٹھائے، باہر والوں سے ملنے جُلنے کی پوری پوری روک تھام کی۔ اسے رات دن گھونٹ گھونٹ کے رکھا۔ اِس لئے برّ
رہ یہ ڈھنڈورا پیٹا جو کوئی "شودر" اس کے کچھ بول بھی سُن لے تو اُس کے کان میں پگھلا ہُوا سیسہ ڈال دیا جائے۔ آئے دن کی
دک ٹوک سے جو ہونا چاہئے تھا وہی ہُوا۔ اسے گھُن لگ گیا۔ ہوتے ہوتے یہ ادھ موئی ہوئی اور پھر مرت کر رہ گئی۔ جب وہ مٹ چکی تو
ب آنکھیں کھُلیں۔ اور اس کے جِلانے کے لئے اب تک سینکڑوں جتن کئے جا چکے اور کئے جا رہے ہیں۔

اُردو کی نیو ڈالنے والوں میں کوئی ایک دھ جتھا تو نہ تھا۔ دیس والے سبھی تھے۔ سب نے مل کر جیسی اس کی نیو ڈالی تھی ویسا ہی
ں کا آشرم بن گیا۔ اب آپ اس پورے آشرم کو ڈھا کے کیا پھر اس کی نئی نیو رکھنا چاہتے ہیں۔ نئی نیو کوئی پودا تو نہیں جو آج لگایا کل
ل نے آیا۔ برسوں کی دوڑ دھوپ سے اب کہیں جا کے اردو ایسی نکھر چلی ہے جسے آج ہم آپ ہی نہیں اونچے اونچے گھرانے ٹکٹکی باندھ
بھ رہے ہیں اور جب اس کا یہ نکھار ہی نہ رہا تو پھر رہا ہی کیا۔ نیا کنواں کھود کے پانی پینا ایک دن دو دن کی تو بات نہیں۔ پھر جب
ب کیا کیجے گا۔ کیا چپ چاپ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کی ٹھانی ہے۔ اُردو اب تک جس سانچے میں ڈھل چکی ہے اسے یونہی
ہنے دیجئے۔ اب رہیں اس کی اور بناؤ سنگھار کی باتیں تو وہ گھاتیں کچھ کٹھن نہیں۔ اسے بے ٹھیس لگے وہ سب کی سب ہو سکتی ہیں
دو کا پیار، پریم، جو چاہے کہئے وہ اب یہی ہے۔

پھیلنے پھولنے اور آگے بڑھنے والی بولیوں میں سے جونسی بولی بھی لیجئے اُس میں آپس کے میل جول، ساتھ رہنے سہنے، راج کے
اُدھر ایسے ہی اِدھر اور سہاروں سے پہلے پہل ایک بھاشا کے بول دوسری میں کچھ کچھ آتے ہیں۔ باہر والی اور یہاں کی بھاشا
لوچ اور لچک ہوئی، ملنے جُلنے میں کوئی رُکاوٹ نہ دکھائی دی اور نئی بھاشا کے بول یہاں کی بات چیت میں پھیلنے لگے تو پھر ان کا تانتا
رہ جاتا ہے اور ان کی کھپت پر کھپت ہوتی چلی جاتی ہے۔ پر کہیں کی بولی راج واج کا دباؤ وباؤ کچھ مانتی ہی نہیں جیسے تاتاریوں اور ترکوں
راج ڈھائی برسوں ایران رہا پر فارسی نے راج واج کی بھاشا کو منہ بھی نہ لگایا۔ ہلاکو سے سلطان حسین میرزا تک برسوں راج کے ساتھ ساتھ
ہنے پہ بھی ترکی بول فارسی میں آگے بڑھ کے جگہ نہ لے سکے۔ انہیں گنا جائے تو سیکڑے میں بہت سے بہت دس بول نکلیں تو نکلیں
ں ایران میں کبھی عربوں کا بھی راج تھا جو بہت نہ رہا پر جب تک بھی رہا کچہریوں کی لکھت پڑھت فارسی ہی میں رہی اس پر بھی دیکھتے
یکھتے عربی ایسی پھیلی جیسے بن میں آگ لگے۔ اس کا گُر یہی ہے ترکی بھاشا کی بناوٹ فارسی سے میل نہیں کھا سکتی تھی اس لئے
نے پر بھی یہ دونوں رُکی رُکی رہیں۔ عربی کا لوچ اور فارسی کی لچک ان دونوں کے ملنے میں کوئی رُکاوٹ نہ تھی اس لئے عربی
رسی دونوں کی دونوں آپس میں گھل مل گئیں۔

کوئی باہر والا کسی کے یہاں آ کے ٹھہرے اور گھر والوں کی آؤ بھگت آنکھیں بچھانے سے وہ اس گھر میں رہ پڑے۔ آپس کے میل ملاپ کے چلنے سے وہ باہر والا اور گھر والے مل جل کے ایک ہو جائیں تو پھر وہ باہر والا نہیں رہتا۔ گھر والا ہی کہلاتا ہے۔ پر جب یہ کھوج لگانے کی دھن رہے کہاں کا تھا۔ یہاں کب آیا تو گھڑی بھر کے لئے اس کے باہر والا ہونے کا دھیان آ جائے تو آئے نہیں تو پھر کبھی نہیں آتا۔ عربی، فارسی بھی ایسا ہی سمجھئے۔ ان دونوں کے بولوں کی اُردو میں کیسی ریل پیل ہے۔ جسے دیکھئے بے سوچے سمجھے انہیں بولتا ہے۔ تو اب یہ کہنا ہی ٹھیک نہیں۔ یہ عربی کے بول ہیں اور یہ فارسی کے۔ عربی، فارسی اب کہاں رہے۔ اب تو یہ اُردو میں ایسے سما گئے ہیں جو اس سے الگ نہیں ہو سکتے۔ وہ اور یہ دونوں کے دونوں ایک ہو کے رہ گئے ہیں۔ جب دونوں ایک ہو گئے تو پھر انہیں عربی، فارسی آپ کیوں کہتے ہیں۔ انہیں اُردو کے گھر کی پونجی کہئے نا اس میں آپ کا کیا بگڑتا ہے۔ چاہئے تو یہ تھا ایسے جتن کئے جاتے جن سے پرائے بھی اپنے بن سکتے پر یہاں تو اپنوں کو بھی پرایا بنانے کا ڈول ڈالا جا رہا ہے۔

کسی بھاشا کی کہانی میں دھرم کی کتھا کو نہ ملانا چاہئے۔ آپ کی یہ بات جی کو بھلی لگی۔ پر اسے کیا کہیں جو دوسری بولیوں کے بول جو آج گھل مل کے اُردو سمجھے جا رہے ہیں انہیں ادبدا کے چھوڑ کر اپنی دھن میں مٹی ہوئی بھاشا کے بول کے بول ڈھونڈ ڈھونڈ کے اپنی لکھت میں آپ لکھتے چلے گئے ہیں اسے جو دیکھے گا کہہ اُٹھے گا۔ دھرم کا پریم لکھنے والے پر ایسا چھایا ہوا ہے جو وہ بولی ٹھولی کو بھی اس سے الگ نہیں دیکھ سکتا اور اس کا پودا دھرم کے مندر کی چھاؤں میں لگانا چاہتا ہے۔

جی چاہتا تھا پنڈت دیا شنکر، پنڈت نوبت رائے، پنڈت رتن ناتھ، پنڈت تربھن نرائن، پنڈت برج نرائن چکبست ان سب پر الگ الگ کچھ نہ کچھ لکھوں پر یہ دھیان آیا آپ کہیں یہ نہ کہہ اُٹھیں۔ رات گئی بات گئی، وہ سماں اب کہاں، پرانی باتیں چھیڑنا کوئی اچھی بات نہیں۔ اچھا نہ سہی انہیں جانے دیجے اور اِدھر اُدھر کیوں جائیے اپنے "ہندستانی" کی سبھا ہی کو دیکھ لیجے۔ اس میں سر تیج بہادر سپرو، مسٹر سچدانند، پنڈت گنگا ناتھ جھا، جو بولی بول رہے ہیں وہ وہی ہے جو آج گھر گھر پھیلی ہوئی ہے اور سب کے سب پڑھے لکھے اسے ہی بولتے ہیں اور جو بولتے ہیں وہی لکھتے ہیں۔ اس ڈگر سے کترا کے نہ جانے آپ کدھر جانا چاہتے ہیں۔ ایک بات پوچھتا ہوں سچ سچ بتایئے گا، اپنے ساتھیوں سے اور گھر میں آپ کی بات چیت کا کیا یہی نرالا ڈھنگ رہتا ہے۔

اچھا آپ نے یہ بھی دیکھا جس پگڈنڈی پر آپ چلنا چاہتے تھے اس پر نہ چل سکے اور پاؤں ڈگمگانے لگے۔ جی بھر کے مٹی ہوئی بھاشا کے بولوں کی آپ نے بھرمار تو کی پر عربی، فارسی سے نہ بچ سکے۔ گنئے تو اس بھرمار پر بھی عربی، فارسی کے کتنے بول آپ لکھ گئے۔ اُردو کو پہلے پرتلیے تو اس میں طوطی کتنی ہے اور لگے ہاتھوں اسے بھی جانچ لیجے کون کون سے اور کہاں کہاں کے بول بات چیت میں بید مرلک چلے آتے ہیں جن کا تانتا بندھا ہوا دیکھئے سمجھ لیجے یہ ہلتے ہوئے دانت نہیں جنہیں جب چاہا ایک جھٹکے میں اکھیڑ کے پھینک دیا۔ اپنی اپنی جگہ یہ سب ایسے جمے ہوئے ہیں جن میں سے کسی کا ہلانا ہنسی کھیل نہیں ہے اور یہ ہلائے جلائے سے ہل نہیں سکتے۔

دیکھئے پورے دیس کی وہی اکیلی بھاشا سمجھی جا سکتی ہے جسے بے سوچے سمجھے سب کے سب تھوڑا بہت بولتے اور سمجھتے ہوں۔ اپنے دیس کے بیچوں بیچ کھڑے ہو کے پکاریئے تو یہی بولی سنائی دے گی جو گھر گھر پھیلی ہوئی ہے۔ یوں دیکھئے تو ہند کے چپے چپے کی بولی کچھ نہ کچھ الگ ہوگی اور ایسی چھوٹی موٹی تو بہت سی نکلیں گی جیسے لماڑوں، گونڈوں، بھیلوں، مارواڑیوں کی بولیاں۔ پر یہ کچھ بڑی نہیں۔ تلنگی، کنڑی، تامل، اوڑیا، کنکن، سنہالی، یہ چھے دراوڑی بولیاں سنسکرت سے بھی پہلے کی ہیں اور جن کی باچھوں میں سنسکرت کا دودھ بھرا ہوا دکھائی دیتا ہے وہ بنگلہ، مرہٹی، پنجابی، سندھی، کشمیری، گجراتی، پشتو یہی سات ہیں۔ ان سب میں سے ایک بولی بھی ایسی نہیں جسے یہاں کے رہنے سہنے والے سب کے سب سمجھ سکیں۔ دیس کے جن جن ٹکڑوں میں وہ بولی جاتی ہیں وہیں ان کے بولنے اور سمجھنے والے بھی ہیں۔ ان ٹکڑوں سے باہر کسی کے سامنے ان بولیوں میں سے کوئی سی بھی بولی بولئے تو سننے والا منہ تکنے لگیگا۔

اُردو ہی ان سب میں ایک ایسی بھاشا ہے جو پورے دیس میں تھوڑی بہت سب جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے نہ آپ کی بنائی ہوئی یہ نرالی اور انوکھی بولی ؛۔ ابھیاس، نیشچے، ان بھو، سنستھا، اودے، کرتویہ، کسی سے اس میں بات چیت کرکے تو دیکھئے وہ کہتا کیا ہے۔ کہے گا کیا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے آپ کا منہ دیکھے گا اور ایک بول بھی نہ سمجھے گا۔

اُردو تو اُردو، مرہٹی گجراتی تک میں عربی، فارسی بولوں کی وہ ریل پیل ہے جو آپ گننا چاہیں تو ان کے بولوں کو گنتے گنتے تھک جائیں گے۔ اس نئی اُپج کو کیا کہا جائے جو بھاشا سارے دیس میں پھیل چکی ہو، چھوٹے سے بڑے تک سب کے سب اسے بولتے ہوں جگہ جگہ اس کے بولنے اور سمجھنے والے مل سکتے ہوں۔ اسے چھوڑ کر آدرش، ویاکرن، سمپتی، ہتوں، وشے، آدھار، ایسے ایسے کڈھب بولوں کو ڈھونڈ ڈھانڈ کے ان سے ایک نئی بولی بنانے اور اس کے پرچار کرنے پر آپ اٹلے ہوئے ہیں۔

کیا اس نئے ڈھنگ کے پرچار میں کھکیڑیں اُٹھانے سے آگے بڑھ کر آپ یہ کہنا چاہتے ہیں :۔ ہم الگ، ہماری بولی الگ ہم بہت اور ہمارے ساتھ رہنے والے بہت تھوڑے۔ اس لئے راج ہمارا ہے اور یہ ہمیں ہی ملنا چاہئے۔ تو ایسی بات منہ سے نکالنے سے پہلے پھر سوچ سمجھ لیجے۔ پہلے تو یوں مانگنے وانگنے سے یہ نہیں ملا کرتا۔ راج کوئی بھیک تو نہیں ہے جو کچھ بھکاریوں کے للیانے گڑگڑانے پر ترس کھا کے ان کی جھولیوں میں ڈال دیا جائے۔ راج لینے کے لئے بہت سی بڑی بڑی کٹھن باتیں ہیں۔ ان سب میں سے پہلی بات کا پہلا گُر یہ ہے :۔ آئے دن گھر والوں میں ملاپ کی پینگیں بڑھیں۔ دکھ سکھ میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائے۔ جو ایک کہے سب اسی کی سی کہیں، ایک کے پھانس لگے تو سب اُدھر ہی جھک پڑیں۔ کسی کے دکھ کو دوسرا اپنا ہی دکھ سمجھے۔ ساتھ رہنے سہنے والوں کے دھرم کتنے ہی الگ الگ کیوں نہ ہوں ان کے لئے آپس میں کوئی جھگڑا ٹنٹا نہ اُٹھنے پائے دھرم ہے کیا۔ اسے سوچ کی آنکھوں سے دیکھنا چاہئے۔ دھرم والے سب کے سب ایک ہی بندھن میں بندھے ہوئے ہیں سب ایک ہی کے منگتے اور ایک ہی چوکھٹ کے بھکاری ہیں۔ اپنے اپنے جتن کرکے اُسی ایک کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں اور اُسی سے سب کی

رنگی ہوئی ہے۔ خدا، پرمیشر، پرماتما، بھگوان یہ سب بول اسی ایک کے لئے بولے جاتے ہیں جس کے نہ مٹنے والے راج کے اُجالے سے چھوٹے بڑے ان گنت سنسار جگمگا رہے ہیں۔ دھرموں کا الگ الگ ہونا اس کے ڈھونڈنے کے الگ الگ رستے ہیں ڈھونڈنے کا ڈھب الگ الگ سہی دیکھنے کی یہ بات ہے جب سب کے سب ایک ہی کے پریم کی مالا جپ رہے ہیں اور اسی کو سب پوج رہے ہیں تو اس پوجنے کے الگ الگ ڈھب پر آنکھیں نکالنا ناک بھوں چڑھانا اس سنسار میں ڈھائی دن کا ساتھ ہو جانے پر لڑنا جھگڑنا کیسا یہ چاہئے ایک دوسرے کے دھرم کی کتھاؤں اور تہواروں میں بے روک ٹوک آئے جائے، اُٹھے بیٹھے۔ آپس میں بھائیوں بھائیوں کا سا برتاؤ ہو۔ جی میں جو ہو وہی مُنہ پر ہو۔ کبھی آپس میں ان بن ہو بھی جائے تو گھر کا جھگڑا گھر ہی میں چکا لیا جائے۔ گھر میں کیا ہُوا باہر والے ٹوہ لگانے پر بھی نہ جان سکیں۔

کل کی بات ہے۔ لارڈ ارون نے گاندھی جی کو بہلا پُھسلا کے لندن بھیجا۔ مہاتما جی وہاں پہنچے اور اپنے دیس والوں سے جو کچھ کہہ چکے تھے نہ جانے وہاں پہنچ کر کیا جوگ پڑا جو اُسے پورا نہ کر سکے۔ بات آگے بڑھی اور گھر کا جھگڑا چکانے کے لئے باہر والے بلائے گئے۔ جو جھگڑا گھر ہی میں نہ چُک سکا باہر والوں سے وہ بھلا کیا چُکتا۔ آپس کی تُو تُو مَیں مَیں پر اپنے پرائے سب کے سب ہنس پڑے، دونوں کے ہنسنے میں بل ہی بل تھا۔ اپنوں کی ہنسی تو کھسیانے پن کی تھی اور دوسروں کی ایسی جیسے برسات کی پھسلن میں کسی کا پاؤں پھسلے اور پھسلتے ہی اس کے دھم سے گرنے کے دھماکے پر دیکھنے والے کھل کھلا کے ہنس پڑیں۔

جب گھر کا گھر سا تا روہن بن گیا ہو۔ آپس میں پھوٹ پڑی ہو۔ جو بات ایک کہے اوبدا کے دوسرا اسے جھٹلائے۔ ایک کو ایک کھائے جاتا ہو۔ چھوٹی سے چھوٹی بات میں اُلجھ کر بات کا بتنگڑ بنانے کی دھن ہو۔ بات بات میں ناک بھوں چڑھائی جاتی ہو۔ آئے دن آپس میں چھری کٹاری اور جلی کٹی رہتی ہو۔ کسی کو چین سے بیٹھنے کا دھیان تک نہ ہو۔ مار دھاڑ چیخ پکار سے جی بہلتا ہو۔ گھر ہی میں لڑ جھگڑ کے اپنا گھمنڈ توڑا جا رہا ہو۔ جس گھر میں ایسا اُودھم مچا ہُوا ہو تو پھر گھر والوں کا پنپنا آگے بڑھنا اور راج چاہنا کیسا۔ اس کی تو وہی بات ہے جیسے کوئی دُہری تہری بیڑیاں ہتھکڑیاں پہننے پر بھی یہی سمجھتا رہے یہ کوئی روک ٹوک ہی نہیں۔ جب جی چاہے میں ادھر اُدھر آ جا سکتا ہوں۔

جھاڑو کی سینکیں آپ کو توڑنے کے لئے دے دی جائیں تو ایک ایک دو دو کر کے چٹکی بجاتے میں توڑ توڑ کے آپ سب کا ڈھیر لگا دیں گے اور جو انہیں کا ایک بڑا گٹھا توڑنے کے لئے سامنے ڈال دیا جائے تو پھر آپ کتنا ہی اسے توڑنا چاہیں وہ گٹھا ٹس سے مس بھی نہ ہو سکے گا۔ گھاس پھوس ایک جگہ ہونے سے نہ لوٹ سکے اور بھلے مانسوں کی ٹولیوں کی ٹولیاں، جتھے کے جتھے الگ الگ ہونے سے آئے دن لُوٹتے رہیں۔ دیکھئے ہمارے آپ کے جتنے گھاس پھوس سے بھی کچے بودے نکلے وہ ہلائے سے بھی نہیں ہلتا اور یہ دن رات لُوٹتے چلے جا رہے ہیں۔ اس آپا دھاپی میں یہ سمجھ گئے جو یہ بات سوچ سکے۔ اب تک ہمارا الگ تھلگ

ں نیچا دکھاتا اور ہمیں توڑ مروڑ کے روندتا رہا۔ ہم سب کے سب ایک ہی جگہ کے رہنے سہنے والے گھاس پھوس کے گٹھے کا
لیوں نہ کرلیں جو ہمیں کوئی نہ توڑ سکے۔ کسی نے یہ سچ کہا ہے جب بُرے دن آتے ہیں تو مت اُلٹی ہو جاتی ہے۔

یہیں تک لکھنے پایا تھا جو کانوں میں کچھ اور بھنک پڑی اور ساتھ ہی وہ سب کچھ سُنا اور لکھا ہُوا دیکھا جو "بھارتیہ ساہتیہ
" میں ہو چکا۔ مولوی عبدالحق صاحب (آنریری سکرٹری انجمن ترقیٔ اُردو) نے ساہتیہ پریشد کی کھلم کھلا بات چیت میں گاندھی
، جو کہنا چاہا ہوں ہاں کرکے گاندھی جی نے اسے ٹال دیا اور مولوی صاحب اس پر کھُل کر کچھ نہ کہہ سکے۔ ایسے ہی پروفیسر محمد مجیب
ب (جامعۂ ملیہ) نے گاندھی جی کو جو کچھ لکھ بھیجا تھا اس کا پورا سُن لینا بھی مہاتما جی کو دوبھر ہو گیا۔ یہاں کی بھاشا کے لئے "ہندی
نی" کے یہ نئے بول گاندھی جی نے جو چھانٹ چھونٹ کے نکالے تھے ان پر جب پوچھا گچھی آگے بڑھنے لگی تو مہاتما جی بس ٹ پائے
۔ کوئی بات بن کے نہ آئی تو اپنے ان پھندیتوں کو دیکھنے لگے جو پہلے ہی سے یہ جھگڑا چکانے کے لئے ادھر اُدھر بٹھائے گئے تھے
اسے سکھا پڑھا دیا گیا تھا۔ کہی بدی ہو چکی تھی۔ مہاتما جی کے پوچھتے ہی سبھوں نے اسی کی ہامی بھری جو وہ چاہتے تھے۔ یہ
ت دیکھ کے کتنا کتنا لوگ کہتے رہے ان سب کی ہامی بھرنا ٹھیک نہیں۔ کسی بھاشا کی گتھیاں سُلجھانا ہنسی کھیل نہیں ہے۔ اس
ے گنے چُنے ہوئے انہیں لوگوں سے بات چیت کی جائے جو ایسے ہتھکنڈے جانتے ہوں۔ پر گاندھی جی نے اپنی بات کے آگے
کچھ نہ چلنے دی اور وہی کیا جو وہ کہہ چکے تھے۔ اسی "ساہتیہ پریشد" میں گاندھی جی کے منہ سے کچھ ایسی باتیں بھی نکل گئیں جنہیں
، کچھ تو ہنستے ہنستے لوٹ گئے اور کچھ ہکا بکا ہو کے مہاتما جی کے اس کہنے پہ اُن کا مُنہ تکنے لگے:۔

"اُردو زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے۔ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا
اور پھیلایا مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں"۔

باتیں بہت پھیلاؤ چاہتی ہیں اس لئے پھر کبھی ان باتوں پہ جی بھر کے لکھوں گا اور مہاتما جی سے کچھ کہہ سکوں گا۔
گاندھی جی نے دیس کے لئے سب کچھ تج دیا اور جیتے جی مہاتما کہلائے۔ پر اسے کیا کہیں جب مہاتما ہو کر بھی دیس والوں
ے سب کے سب کو وہ ایک آنکھ سے نہ دیکھ سکیں تو اوروں سے پھر کیا کہا جا سکتا ہے۔

سچ ہے جب کوئی کسی اونچی جگہ تک پہنچنے کے لئے ہاتھ پاؤں ہلاتا ہے، دوڑ دھوپ کرتا ہے، دن رات کا سُکھ اس کیلئے
نا ہے اور دُکھ پہ دُکھ سہتا چلا جاتا ہے۔ اس پہ بھی بیچ میں کوئی ایسی بھاری روک آ جائے جو لاکھ لاکھ جتن کرنے پر بھی وہ
ں جگہ تک نہ پہنچنے دے تو پھر بات بات میں اس کا چڑچڑا پن سوچ بچار کے دُکھ سے چھُڑا کے اسے ہٹ کرنا سکھا دیتا ہے
ہی ہو وہ اپنی ہی بات پر اڑا رہے اور دوسرا کیسی ہی اچھی سے اچھی بات کیوں نہ کہے اپنی بات کی پچ اُسے نہ سننے دے
بھی تو سُنی کو ان سُنی بنا دے۔

کہیں ایسا ہی تو نہیں مہاتما جی اب تک جتنی چالیں چلے سب میں انہیں ہار کا بھیانک مُنہ دیکھنا پڑا۔ سوراج مانگا نہ مل سکا۔ چھوت چھات کے بندھنوں کو توڑنا چاہا نہ ٹوٹ سکے۔ اچھوتوں کے لئے مندر کھلوانے چاہے نہ کھُل سکے۔ یہ تو جو ہونا تھا وہ ہُوا منجھے ہوئے کھلاڑی ہار جیت سے بھی بڑھ کر چالوں کو دیکھا کرتے ہیں۔ مہاتما جی کی اب تک کی سب چالیں ٹھیں تو پکے کھلاڑیوں کی سی آپس میں پھوٹ نہ پڑی ہوتی اور ایکا ہو جاتا تو پھر پو بارہ تھے۔ پر مہاتما جی جانتے ہوں گے ان کی اب تک ہار یہ ہار آپس ہی کی پھوٹ سے ہوئی اور ہو رہی ہے) اس لئے اب سوچ بچار کے بکھیڑے سے الگ تھلگ ہو کے "بھارتیہ ساہتیہ پریشد" کے پرچار کی دُھن میں کھوئے ہوئے ہیں۔ کوئی کتنا ہی گلا پھاڑ پھاڑ کے انہیں پکارے وہ کسی کی کچھ سنتے ہی نہیں اور یہ ایک اور پھوٹ کا بیج کب بویا جا رہا ہے جب دیس کو میل ملاپ کی دیوی کی پوجا کرنے کے ساتھ ساتھ جو گتھیاں پہلے سے بھی بڑھ کے اُلجھتی چلی جا رہی ہیں انہیں سلجھانا چاہیئے۔

لنکا میں سے جو نکلا وہ باون ہاتھ کا' یہ کہاوت یہیں ٹھیک اُترتی ہے۔ جسے دیکھو وہ اونچی نوک پر اپنا پھرتا ہے پر جو بھر پور وار کیا جاتا ہے وہ اپنے ہی اوپر۔ جو بات نکلتی ہے وہ اپنے ہی دُکھ کی۔ اُونچ نیچ نہ دیکھنے سے ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھانے پر بھی آنکھ نہیں کھُلتی۔ بے پیئے کی ہنکار پینے والوں کی اُچھل کود سے بھی کہیں بڑھی ہوئی ہے۔ اپنے ہاتھ سے اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے لئے نت نئی چالیں سوچنے میں ہندی کی چندی نکالی جا رہی ہے۔

ایسی لبڑ دھوں دھوں دیکھ کر یہی کہا جا سکتا ہے اب تک دیس والے جیسی کانٹوں بھری جھاڑیوں میں مارے مارے پھرتے اور ہر جگہ اُلجھ اُلجھ کے گرتے رہے نہ جانے آپس کی پھوٹ ابھی انہیں اور کیسے کیسے سنسان، ڈراؤنے بنوں، جنگلوں میں لئے لئے پڑی پھرے گی۔ دیس والوں کے دُکھ بھرے بُرے دن کٹ چکے ہوتے تو سُکھ کے اچھے دن آنے کے لئے یہ رُت جا کے دوسری رُت کب کی آ چکی ہوتی اور سب سے پہلے آپس کی لاگ ڈانٹ، آپا دھاپی، ہٹ دھرمی کا بیج ایسا مارا جاتا جو ڈھونڈے سے بھی کہیں نہ ملتا۔ یہ بٹوارہ کہاں تک کیجئے اور یہ دُکھڑا کب تک رویئے۔ جو نہ ہونا چاہیئے تھا وہی اب تک ہُوا اور جو ہونا چاہیئے تھا وہ کچھ بھی نہ ہُوا۔ یہی دن رات رہے تو آگے اس سے بھی بڑھ کے ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ اسے کیا یہ کہیں دیس کا بھاگ ٹھیک نہیں۔ نہیں تو ایسا کبھی نہ ہوتا۔

میرے لکھنے کا یہ ڈھنگ نہیں جو آپ نے دیکھا۔ آپ کی انوکھی لکھت دیکھ کر دھیان آیا۔ ٹھیٹ اُردو ہی میں آپ سے بات چیت کروں اور ہو سکے تو عربی' فارسی کو ہاتھ نہ لگاؤں اور دکھاؤں کہ اہل ہمپتی، ابھیاس، نشچئے۔ جیسے بھولے بسرے بے ڈھب بولوں کو چھوڑ کے ٹھیٹ اُردو یوں لکھی جا سکتی ہے۔ اس میں عربی، فارسی کے بول جن سے آپ کو چڑ ہے اتنے بھی نہیں جتنے آٹے میں نمک۔ عربی' فارسی نہ چھوڑنے سے دیکھئے ساری لکھت کیسی رُوکھی پھیکی ہو کے رہ گئی۔ جس تھوڑی سی جگہ میں دیکھا

اور ست سٹاکے بھی بیٹھنا دوبھر ہو وہاں میل کے کیسے بیٹھا جا سکتا ہے۔ گنتی کے کچھ بولوں کی اُلٹ پلٹ اور ہیر پھیر سے جو ہو سکتا وہ کیا۔ کوئی ان پڑھ سمجھ کا ہیٹا ہی ایسا ہوگا جو ہندی کی گھلاوٹ اور مٹھاس کو نہ مانے۔ پر نری مٹھاس ہی مٹھاس کھائی بھی تو نہیں سکتی۔ اس کا جوڑ چٹپٹا پن ہے۔ چٹپٹے پن کے ساتھ مٹھاس ہو تو کیا کہنا۔ سونے پہ سہاگا ہے۔ جیسے ہندی کی مٹھاس مانی ہوئی ہے ویسے ہی عربی فارسی کا چٹپٹا پن بھی۔ یہ دونوں ساتھ ساتھ ہوں تو پھر کیا پوچھنا۔ اسی لکھت میں کہیں کہیں بھی عربی فارسی کا جوڑ لگا دیا ناتوان پھولوں کی مہک اور ان کا روپ دیکھنے کا ہوتا۔ پر یہ بات بھی سُن لیجے یہ ڈھب ایسا نہیں ہے جو سب جگہ نبھ سکے۔

سرکس کا گھوڑا تھوڑی سی جگہ میں لیٹ کے، بیٹھ کے، کھڑے ہو کے نت نئے کرتب دکھاتا ہے۔ پر جب کوئی بھاری بوجھ لاد کے سی لمبی چوڑی سڑک پر اُسے ڈالا جائے تو وہ گھڑی گھڑی اڑتا اور رکتا ہے۔ مارنے، پیٹنے، چمکارنے کسی ڈھب سے بھی وہ نہیں ٹلتا ر گھڑی بھر بھی اس سڑک پہ نہیں چل سکتا۔ اس لکھت کا بھی یہی ڈھنگ ہے۔ یوں تو کانا پھوسی اور کچھ کھلی ڈلی باتیں یہ بنا سکتی ہے رجب کٹھن باتیں چھڑ جائیں اور اُن کا گہرا پن جوں کا توں دکھانا ہو تو پھر یہ اپاہج بن جاتی ہے، اور اپاہج بھی ایسی جیسے "ان تلوں تیل ی نہیں رہتا کبھی"۔ اس کے اپاہج ہو جانے سے عربی، فارسی کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے اور یہ دونوں مل ملا کے کیسی ہی اُلجھی ہوئی گتھیاں لیوں نہ ہوں گھڑی بھر میں انہیں پورا سلجھا دیتی ہیں اور پھر کوئی اُلجھاؤ ہی نہیں رہتا۔ کٹھن سے کٹھن بھید کھُل کھُل کے ایسے دکھائی دینے لگتے ہیں جیسے ہاتھوں کی لکیریں۔

یہاں تک جو کچھ لکھ گیا ہوں سوچ بچار کی آنکھوں سے آپنے اسے دیکھا تو پھر آپ ناک بھوں نہیں چڑھائیں گے۔ کیا اپنے 'ہندستانی' میں جگہ دے کے آپ اس پہ کچھ لکھیں گے۔

یہ نوشتہ کئی مہینے اُدھر کا لکھا ہوا ہے۔ بات یہ ہوئی اسے لکھ ہی رہا تھا جو مجھے باہر جانا پڑا۔ وہاں سے آ کے کچھ دنوں تک اِدھر اُدھر کے بکھیڑوں میں اُلجھا رہا۔ جب ان سے چھٹکارا ملا تو اس کا دھیان آیا۔ دھیان آتے ہی جگہ جگہ ڈھونڈا۔ پر یہ ایسا لٹپٹ ہوا جو کہیں بھی نہ ملا۔ کئی دن ہوئے جو یہ ایکا ایکی ہاتھ آ گیا جسے چھپنے کے لئے بھیجتا ہوں۔

سید ابوالقاسم

اکبر

اُردو میں جو سب شریک ہونے کے نہیں
اس مُلک کے کام ٹھیک ہونے کے نہیں
ممکن نہیں شیخ امرؤ القیس بنیں
پنڈت جی بالمیک ہونے کے نہیں

بادشاہی اور سیہ کاری
رومی ملوکیت کی خونیں داستان کا ایک ورق

دنیا کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ "ملوکیت" نے نظمِ عالم کو اکثر درہم و برہم کیا ہے اور انسانیت کی لطیف و نازک روح زمانہ میں "ملوکیت" کے زہر آلود تیروں سے مجروح ہوئی ہے۔ بات یہ ہے کہ شخصی منفعت اور انفرادی آرام و راحت کا سوال اعتی نظام کے فوز و فلاح کی ضد ہے۔ ملوکیت اور شہنشاہی (Imperialism) کا ہیولیٰ جور و استبداد سے تیار ہوتا ہے، اس کے بغیر ملوکیت کی گاڑی ایک قدم نہیں چل سکتی، ملوکیت کے سطوت و وقار کی عمارت میں حقوقِ رعایا کا خون چوسنے اور رے کا کام دیتا ہے۔ ملوکیت کا استحکام اور رعایا کی خوشحالی ایک دوسرے کے رقیب ہیں، دونوں کے مفاد ایک دوسرے سے راتے ہیں، جب ملوکیت کا آفتاب ضو فشاں ہوتا ہے تو رعایا کی خوشحالی کا چراغ ٹمٹمانے لگتا ہے اور جب رعایا اطمینان و سکون ن سانس لیتی ہے تو ملوکیت پر نزع کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔

ملوکیت کا عفریت رعایا کو اُبھرنے کا موقع نہیں دیتا۔ وہ چاہتا ہے کہ رعایا میں ترقی کا جذبہ کبھی پیدا ہی نہ ہو اور نشو و نما ن فطری استعداد ہلاک ہو جائے۔ ملوکیت رعایا کو ایک مرکز پر متحد نہیں دیکھ سکتی، ملوکیت ملک میں نفاق و عداوت کا بیج بوتی ہے۔ کیت رائے عامہ سے بہت گھبراتی ہے، اس لئے وہ ہر اُس گلے کو گھونٹ دیتی ہے جس سے احتجاج کی آواز بلند ہونے کا امکان ہو۔

روم جو رواقی فلسفۂ اخلاق کے باعث نیک نام تھا، ملوکیت اور شہنشاہی کے ہاتھوں اس قدر تباہ ہوا کہ اُس کے اخلاق ہمیشہ کے لئے ذلیل ہو گئے اور دنائت و سفاہت کی منحوس روح رومیوں میں حلول کر گئی۔ روم کا تمدن، یونان کے تمدن سے ر کھاتا تھا لیکن ملوکیت کی زہریلی ہواؤں نے رُومی تمدن کے سدا بہار پودوں کو جھلسا دیا۔

رومن شہنشاہی نے اگرچہ باضابطہ طور پر جمہوریت کے نظام کو منقلب نہیں کیا، لیکن فی الحقیقت جمہوریت کے پردے میں لوکیت کی مشین لگا دی۔ جس کی حرکت سے مملکت کا سارا نظم و نسق وابستہ تھا۔ نظامِ سلطنت کی ہیئت بظاہر جمہوری نظر آتی تھی مگر باطن میں ملوکیت کا دیوتا اپنے آہنی گرز کا حکومت پر سایہ کئے ہوئے تھا۔ شہنشاہ کے وجود کے ارد گرد حکومت کا نظامِ شمسی گردش کرتا تھا، شہنشاہ کی زبان قانون تھی، اور اُس کا قلم رعایا کے نوشتۂ قسمت کا محرر۔ شہنشاہ کی انگلی کی ایک جنبش میں

مگی، موت سے بدل جاتی تھی۔ شہنشاہ رعایا کے سامنے قطعاً غیر مسئول تھا۔

بادشاہ اور خدائی منصب!

جاہ پرستوں اور ضمیر فروشوں نے ملوکیت کے شعلوں کو ہمیشہ اپنی ذلیل فطرت کے ناپاک دامن سے ہوا دی ہے۔ ان لوگوں نے ایک
یت تکبر و انانیت کا چسکا لگا کر بادشاہوں کے دماغ خراب کر دیئے اور دوسری طرف غریب رعایا کو گمراہ کن فریب میں مبتلا کر دیا
ں کا نتیجہ یہ نکلا کہ بادشاہوں کو صفاتِ باری سے متصف سمجھا جانے لگا۔ اور وہ خلیفۃ اللہ اور ظلِ سبحانی بن گئے۔ بادشاہوں کی
رحانی عظمت اور نیم ربانی تقدس کے ثابت کرنے کے لئے معجزات اور کرامات کو اُن کی ذات سے منسوب کیا گیا تاکہ مذہبی نقطۂ نظر
سے بادشاہ کے کسی فعل پر خردہ گیری نہ کی جا سکے۔

روم میں بھی بادشاہوں کے متعلق ایسے افسانے گھڑے گئے جن پر خوارقِ عادات اور استدراج کا اطلاق ہوتا ہے شہنشاہ
طس (Augustus) کے بارے میں یہ مشہور کیا گیا کہ جس بستر پر اغسطس پیدا ہوا تھا اس پر کسی نے سونا چاہا، فوراً
ب غیبی ہاتھ نمودار ہوا جس نے بستر پر پیر رکھنے والے کو منہ کے بل زمین پر گرا دیا۔ اغسطس بہت ہی کمسن تھا کہ ایک غیبی ہاتھ
سے گہوارہ سے اٹھا کر لے گیا اور اسے ایک بلند چوٹی پر جا کر بٹھا دیا جہاں اُس کا چہرہ سورج کی طرح چمکنے لگا ——— بادشاہ
ی اس مذہبی سطوت اور روحانی تقدیس کا جادو عوام پر اس طرح کارگر ہوا کہ بادشاہ فی الحقیقت مامور من اللہ سمجھا جانے لگا۔ ایک
دمی زمیندار کو جب بدکاری کے جرم میں سزا دی جانے لگی تو اُس نے اپنی برات میں یہ عذر پیش کیا کہ وہ اُس قطعۂ ارض کا
میندار ہے جس پر اغسطس نے جنم لیا تھا۔ گویا کہ اغسطس کی جنم بھومی کا زمیندار حکومت کے احتساب اور قانون کی دار و گیر سے
مستثنیٰ ہے۔

خوشامدی مصاحبوں اور ضمیر فروش درباریوں کی اس جدوجہد کا یہ اثر ہوا کہ خود بادشاہ اپنے کو خدا کا سایہ، خدا کا خلیفہ، خدا کا
دستِ راست، خدا کا نائب اور خدا سمجھنے لگے۔ شہنشاہ کیلوگا اپنے کو ہمیشہ خدا خیال کرتا رہا۔ چنانچہ اسی جذبہ کے تحت اُس نے
جیپیٹر (مشتری۔ Jupiter) کے مجسّموں کے بجائے اپنے مجسّمے نصب کرا دیئے۔ شاہ ہیلیوگیبلس (Heliogabalus)
نے بھی خدائی کا دعویٰ کیا، اور اپنی پرستش کے لئے بھی لوگوں کو دعوت دی۔

بادشاہ پرستی کے اسی جذبہ کے تحت بادشاہوں کے مجسّمے دیوتاؤں کے دوش بدوش معابد میں نصب کئے گئے، اُن کی پوجا
ونے لگی اور اُن کی بے ادبی اور بے حرمتی کرنے والوں کو سزا دی گئی۔ ایک عورت صرف اس جرم میں پھانسی کے تختہ پر لٹکا دی
ئی کہ وہ شاہ ڈومیٹیئن (Domitian) کے بُت کے آگے برہنہ ہوگئی تھی۔ ایک انگوٹھی پر بادشاہ کی تصویر کندہ تھی، اسی انگوٹھی کو
ہن کر کسی نے ناپاک برتن کو چھو لیا، اس جرم میں اُس غریب کو شدید سزا دی گئی۔

شہنشاہی کے آخری دور میں ربانی عظمت اور الوہیت کی آڑ لے کر شہنشاہوں نے جو اخلاقی جرم کئے ہیں اُن کی تفصیل پیش کرنا کسی مہذب انشا پرداز کا کام نہیں۔ "النّاس علیٰ دینِ ملوکہم" ایک کامیاب ضرب المثل ہے جب بادشاہوں کے اخلاق بگڑ گئے تو رعایا کا دامنِ اخلاق کس طرح اچھوتا رہ سکتا تھا۔ رومیوں کے کردار پر شہنشاہوں کی سیاہ کاریوں کا اتنا بُرا اثر پڑا کہ روم کا خطہ شیاطین کا مسکن بن گیا۔

روم اور غلامی

ملوکیت کے ساتھ "غلامی" کی رسم بھی عام ہوگئی۔ غلاموں کے متعلق اوّل تو اسی مسئلہ کا کوئی تصفیہ نہ ہوسکا کہ "غلاموں میں روح ہوتی بھی ہے یا نہیں" جب غلاموں کے متعلق رومیوں کا یہ خیال ہو تو اُن سے کسی رحم و کرم کی توقع رکھنا حماقت ہے۔ غلاموں کے پیروں میں بوجھل زنجیریں ڈال کر اُن سے کھیتوں میں ہل چلانے کی خدمت لی جاتی۔ ضعیف اور از کار رفتہ غلاموں کو جزیرہ ٹائیبر میں چھوڑ دیا جاتا جہاں وہ بھوک پیاس کے مصائب کا شکار ہو کر دم توڑ دیتے۔ غلاموں کی شادی قانونی طور پر ناجائز قرار دے دی گئی۔ شہنشاہ اگسطس کا ایک بدنصیب غلام شہنشاہ کی بٹیر بھون کر کھا گیا، اس جرم میں اُسے سولی کی سزا دی گئی۔ ویڈیس پولیو نے مچھلیاں پالی تھیں، غلاموں کا گوشت ان مچھلیوں کو بطور غذا کے دیا جاتا۔ ایک دفعہ فلاسینس کے یہاں ایک مہمان آیا جس کی تفریح کے لئے ایک غلام کو ذبح کیا گیا اور مہمان رقصِ بسمل کا تماشا دیکھ کر بہت محظوظ ہوا۔ عورتوں کی یہ عام تفریح تھی کہ غلاموں کے جسموں میں تیز نکیلے بھونکتیں اور اُن کے چہروں سے خون ٹپکاتیں۔ آقاؤں کو غلاموں پر ہر طرح کا اختیار حاصل تھا، یونان کے خوشرو اور نازک اندام چھوکرے عورتوں کی طرح رومیوں کے تصرف میں آتے۔

یہ سب ملوکیت اور شہنشاہی کے اثرات تھے جن کے باعث روم کا خطہ خونخوار درندوں کا بھیانک جنگل بن گیا۔

خونیں مناظر

شہنشاہوں کی تفریحات میں اس قدر بہیمیت اور درندگی شامل ہوگئی تھی کہ انسانی جسم سے خون کے فوارے چھٹتے دیکھ کر اُن کے ذوقِ مسرت کو تسکین ہوتی تھی۔ عام دستور تھا کہ خونخوار درندوں کے سامنے انسانوں کو چھوڑ دیا جاتا۔ یہ وحشت ناک لڑائی تھیٹر اور سینما کی طرح دیکھی جاتی، اس نوع کی بہیمانہ لڑائی کو "سیافی" اور لڑنے والوں کو "سیاف" کہتے تھے۔

شہنشاہ کلاڈیس کو مقتولوں کی حالتِ نزع کے تماشے میں خاص لطف آتا تھا، مرنے والے کی آخری ہچکی اُس کے کانوں کے لئے خوش آہنگ نغمے کا کام دیتی اور رگوں کا آخری تشنج اُس کی نگاہوں سے دادِ ستائش وصول کرتا۔

شاہ ہیلیو گیبولس اور گیلیریس کے متعلق تاریخی روایات سے ثابت ہے کہ یہ اپنے سامنے قیدیوں کو درندوں کے سامنے چھوڑ دیتے اور درندے جب قیدیوں کے جسموں سے گوشت نوچتے اور وہ آہ و بکا کرتے، تو ان شقی القلب بادشاہوں کو بڑا لطف محسوس ہوتا۔

گیلیریس کے متعلق تو یہ روایت مشہور ہے کہ انسانی خونریزی کا نظارہ کئے بغیر اُس کے حلق سے نوالہ نہ اُترتا تھا۔

ٹریجن نے "سیافی" کا جو تماشا ایک عرصہ تک جاری رکھا، اُس میں دس ہزار آدمیوں کو لہولہان ہونا پڑا۔ اسٹیرو (ص ۳۰۷)

اپنے باغ میں جو خونیں چراغاں کیا، اُس کی نظیر دُنیا کی تاریخ میں مفقود ہے۔ اس چراغاں کی تفصیل لکھتے ہوئے قلم کانپتا ہے مگر پتھر کی سل رکھ کر آخر اس منظر کو پیش کیا جاتا ہے۔

نیرو نے اپنے باغ کی روشوں پر مسیائیوں کو کھڑا کیا اور اُن کی قمیصوں پر تیل چھڑک کر اُن میں آگ لگادی، تمام باغ بقعۂ نور بن گیا اور مسیائیوں کی چربی چراغوں کے کام آئی۔

ڈومیٹین کے زمانہ میں مُلک بھر کے ضعیف الجثہ اشخاص کو ایک دوسرے سے لڑادیا گیا اور اس جبری مقاتلہ کا منظر طبیب خاطر بن گیا۔ جب درندے انسانوں کو پھاڑتے ہوتے تو ٹائیٹس (Titus) ہنسی مذاق کرتا، ٹائٹس کا یہ ظالمانہ فعل خوش مزاجی اور زندہ دلی سے تعبیر کیا جاتا تھا۔

روم کا مشہور فلسفی پلینی (Pliny) ٹریجن (Trajan) کی تعریف اس لئے کرتا ہے کہ ٹریجن ایسے کھیلوں اور تماشوں کی سرپرستی کرتا تھا، جو انسان کو ہلاکت و جراحت کا عادی بناتے تھے اور انسان کے مزاج میں نسائیت اور بزدلی کو داخل نہ ہونے دیتے تھے۔

بادشاہوں کے اس ذوقِ مقاتلہ نے روم میں تھیٹروں کے اداکاروں کی طرح سپاہیوں کی ایسی جماعت پیدا کردی جو بھوکے شیروں اور غضبناک ریچھوں کے سامنے بیدھڑک کود پڑتی اور اُن سے لڑتی۔ پھر یہ لڑائی حیوانوں اور درندوں ہی تک موقوف نہ تھی، آدمیوں کو آدمیوں سے لڑایا جاتا، اور انسانی خون کی ہولی کا منظر دیکھ کر بادشاہوں اور اُمراء کے کلیجوں میں ٹھنڈک پڑتی۔ بعض وقت عورتوں کو بھی ان اکھاڑوں میں اُترنا پڑتا۔

ایک مرتبہ بہت سے قیدیوں کو جنگلی جانوروں کی کھال پہنا کر، بیلوں کے سامنے چھوڑ دیا گیا۔ بیلوں کے جسموں میں گرم آہنی سلاخیں چبھیدی گئیں، جن سے وہ مشتعل ہوگئے اور انہوں نے بیچارے قیدیوں کو روند ڈالا۔

یہ روم کی خونیں تاریخ کے وہ چند اوراق ہیں، جو تمام تر انسانی خون میں ڈوبے ہوئے ہیں اور جن کو ملوکیت اور شہنشاہی کے نام سے معنون کیا گیا ہے۔

ملوکیت اور شہنشاہی نے دُنیا کے نظام کو ہمیشہ صدمہ پہنچایا ہے، اگر جن سعید روحوں نے بادشاہی کے تخت پر بیٹھ کر رحمدلی، مدارس، نیک نیتی اور عدل و انصاف کے مظاہرے پیش کئے ہیں، اُن کے نام سُورج کی کرنوں سے زیادہ تابناک اور روشن ہیں۔

ماہر القادری

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

دردِ فراق

کارگر عشق میں اب تک غمِ پنہاں نہ ہُوا
میں ابھی بے خبرِ کلفتِ ہجراں نہ ہُوا

سرِ دار آج یہ کیا نعرۂ مستانہ ہے
ہائے وہ درد جو شرمندۂ درماں نہ ہُوا

کیا وہ ہستی غمِ پنہاں سی جو دل تنگ نہیں
وہ بھی شیرازہ ہے کوئی جو پریشاں نہ ہُوا

آج تک صبحِ ازل سے وہی سنّاٹا ہے
عشق وہ گھر ہے جو شرمندۂ مہماں نہ ہُوا

دشتِ غربت میں پریشاں نہیں بےچین نہیں
ابھی دیوانہ ترا قابلِ زنداں نہ ہُوا

نگہِ ناز ہے اور اہلِ ہوس کے دل ہیں
ہائے وہ تیر جو پیوستِ رگِ جاں نہ ہُوا

حُسن گلزار سے دل چاک ہُوا جاتا ہے
جوشِ گُل چارہ گرِ تنگیٔ داماں نہ ہُوا

میں نے دیکھا ہے وہ اندازِ جنوں بھی جو کبھی
چاکِ دل، چاکِ جگر، چاکِ گریباں نہ ہُوا

سرد کر دے دلِ سوزاں کو، مگر تو جانے
بزمِ ہستی میں جو یہ سوختہ ساماں نہ ہُوا

باغ میں بادِ صبا بھیجنے والے ہر روز
ہم اسیرانِ قفس پر کبھی احساں نہ ہُوا

اہلِ زنداں کی یہ محلس ہی ثبوت اس کا فراقؔ
کہ بکھر کر بھی یہ شیرازہ پریشاں نہ ہُوا[1]

فراقؔ گورکھپوری

---

[1] سنہ ۱۹۲۰ء میں یوپی کے ہر ضلع کے سیاسی قیدی مختلف جیل خانوں سے آگرہ سنٹرل جیل میں یکجا کر دیے گئے تھے اور وہیں سیاسی قیدیوں نے بزمِ مشاعرہ منعقد کی تھی۔ میں بھی تھا اور پہلا مشاعرہ جو ہُوا اس کے لئے یہ غزل کہی تھی۔ فراقؔ

بنگال کے انقلابی شاعر نذرالاسلام کا

ایک گیت

ہاں اے سکھی! تجھے اپنی نشیلی آنکھوں کا واسطہ
مجھے شراب دے دے۔ شراب!
اے سکھی! ہاں یہی انگور کی رگوں کا خون
یہ خون خراب نہیں ہے۔

ایامِ مصیبت کا ایک صبر آزما دن ہے
اور میں نے مے خانے میں پناہ لی ہے
صحرا میں آفتاب کی درخشاں آگ نے
میرے آنسوؤں میں ڈوبے ہوئے دل کو کباب بنا دیا ہے۔
میرے دل کو اب تابِ انتظار ہی نہیں
کسی کے خیال سے میرے دل میں دمبدم ایک ہوک سی اُٹھتی ہے۔
جب ہی تو میں ان نیلگوں پیالیوں میں بے حساب شرابِ ارغوانی پئے چلا جاتا ہوں۔

اس شراب کے رنگا رنگ نشہ میں
میں اپنے آنسوؤں کے رنگ کو چھپا لیتا ہوں

مَیں اپنی زندگی کی آخری حد تک تاریکی ہی دیکھ رہا ہوں۔
تو ہاں پھر اس پیمانے کو بھر دے تاکہ میں "سرخ خواب" دیکھ سکوں۔

مَیں بزمِ عشرت میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ
کوئی میرے دل کی خلوت میں
اُس ساز کو چھیڑے جاتا ہے جس کے تار "درد" کے ہیں
اور اسی لئے میں خالقِ درد کی یاد میں رباب بجا رہا ہوں۔

کیا یہ رنگین پانی حرام قرار دیا گیا ہے
اور آنکھوں کا پانی حلال ——— ؟
اچھا مجھ کو دوزخ قبول ہے
میرے دوستو! الوداع! ——— یہ میرا آخری سلام ہے

اے شاعر! اپنی محبوبہ کی ایک جھلک دیکھ لے
اس پیالے میں
اِس سرخ شیش محل (جامِ شراب) کے اُس کنارے سے وہ کچھ پیغام دے رہی ہے۔
ہاں پیغام!

(ترجمہ)
س۔ اختر امام بی۔ اے (علیگ)

دُنیا کی تقسیم دو جماعتوں میں

جماعتِ غالب کے تفوّق کا پُرلطف خاکا

(مزاحیہ رنگ میں ایک امرِ واقع)

قلم دوات کاغذ موجود۔ ایں جانب لکھنے کو بھی تیار۔ مگر مضمون کا موضوع ابھی عدم میں۔ لہٰذا ناچار کارخانۂ مضمون سازی یعنی گھر سے نکلے اور اِدھر اُدھر گھومنے لگے۔ سوچتے تھے کہ دورانِ خون تیز ہو گا تو عجب نہیں کہ تخیل کی بلند پروازی اول تو یہاں نزدیک ہی چند میل کے فاصلے سے یعنی فضا سے مضمون کا موضوع اُتار لائے اور اگر یہ نہیں تو خلا بلکہ عالمِ بالا سے کھینچ لائے۔

آزاد اخبار نویسی میں یہی سب سے بڑی قباحت ہے۔ ملازم ایڈیٹروں کو کم از کم اس مصیبت سے بروقت نجات حاصل ہے۔ اُن کو مضمون تلاش کرنے کی حاجت نہیں۔ صرف اتنی تکلیف کافی ہے کہ دفتر میں گئے۔ اُس روز کے برقی پیغامات پڑھے۔ تازہ ڈاک میں آئے ہوئے مکتوبات ملاحظہ فرمائے، ہم عصروں کے مقالات سرسری طور پر یا ذرا غور سے دیکھ ڈالے۔ ان سب میں سے دو چار باتوں کو چن لیا۔ ایک مالا میں پرویا اور مضمون دھر گھسیٹا۔ اس کے خلاف آزاد مقالہ نگار سے پہلا مطالبہ یہی کیا جاتا ہے کہ حضرت! کوئی نئی بات پیدا کیجیئے ورنہ آج کا دن فاقہ سے رہیئے۔ مگر ایں جانب کے مزاج کی افتاد ہی ایسی پڑی ہے کہ فاقہ سے طبعاً نفرت ہے۔ اس لئے فیصلہ کیا کہ موضوع کے لئے اپنے اڈیٹر صاحب سے مشورہ کیا جائے۔

اُن کے کمرے میں پہنچتے پہنچتے ایک مضمون کے متعلق کچھ خیال سا ذہن میں آ چکا تھا مگر اسے ابھی خیالِ خام سے بڑھ کر حیثیت حاصل نہ ہوئی تھی۔ پھر بھی مشورے کے لئے کافی تھا۔ چنانچہ ایڈیٹر صاحب سے پوچھا:۔

"حضرت! ہم عام طور پر دُنیا کو کتنی جماعتوں میں تقسیم کر سکتے ہیں؟"

ایڈیٹر صاحب:۔ "بالکل سیدھی سی بات ہے۔ ایک جماعت تو یہی ہم آپ جو اخبار لکھتے ہیں اور دوسری جماعت اُن کی جو اخبار پڑھتے ہیں۔"

ہم یہ جواب سُن کر چُپکے سے چل دیئے کیونکہ ہمارے مطلب کے لئے ناکافی تھا۔ جب بازار میں پہنچے تو ایک گداگر ملا۔ ہم نے یہی سوال اُس سے کیا۔ وہ بولا:۔

"جناب! دنیا میں دو ہی قسم کے تو لوگ ہیں۔ ایک ہم بھیک مانگنے والے اور دوسرے آپ یعنی بھیک دینے والے"
ہماری تشفی اس جواب سے بھی نہ ہوئی۔ ہم نہ ان میں داخل نہ اُن میں شامل۔ بالخصوص دوسری قسم سے تو دُور کا واسطہ بھی نہیں۔ پہلی میں کبھی کبھار بھے جائیں تو مضائقہ نہیں۔ ہم اس کے بعد چلتے چلتے اتفاقاً وزیر . . . . . کی کوٹھی کے سامنے سے گزرے۔ٹ داخل ہوئے۔ کارڈ بھیجا۔ اُنہوں نے فوراً بلایا۔ یہ صاحب ہم سے کچھ بے تکلف ہیں۔ ہم نے ان کی خدمت میں اپنا سوال ہرایا۔ بولے :۔ "تم اخبار نویس بھی عجیب معجون بے تمیزی ہو۔ جب تک بال کی کھال نہ اُتار لو تمہیں چین ہی نہیں آتا۔ اول تو سوال ہی کچھ بیہودہ سا معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے اس کا جواب بھی سہل ہے۔ دنیا میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک ہم یعنی حاکم اور ایک تم یعنی محکوم"۔

اِس پر ہم نے بہ نظرِ احترام اور پھر بہ رعایت و خوشامد کہنے کو تو کہہ دیا کہ ہمیں اپنے سوال کا صحیح حل مل گیا۔ مگر دل میں خیال کیا کہ جناب وزیر کے سر میں حکومت کا سودا سمایا ہے۔ ان کو حاکم محکوم حکومت کے سوا کچھ سُوجھتا ہی نہیں۔ جیسے بعض لوگوں کو زن زر زمین کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔

الغرض ہم مایوس ہو کر اِدھر اُدھر گشت کر رہے تھے کہ مس . . . . . سے دوچار ہوئے۔ ان کی ہماری دُور کی صاحب سلامت ہے۔ وہ ملتی تو ہیں مگر میل ملاپ کی حقیقت فقط اتنی کہ ؎

سرسری اُن سے ملاقات ہے گاہے گاہے   محفلِ غیر میں گاہے سرِ راہے گاہے

بالخصوص محفلِ غیر یعنی نگار خانہ میں۔ چلئے ایں ہم غنیمت است۔ ان سے بھی پوچھا۔ بولیں :۔ "آپ دُنیا کو صرف دو حصّوں میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں کیا؟"

ہم نے بہ طورِ اثبات سر ہلایا تو آپ نے مسکرا کر فرمایا "ایک ہم یعنی فلم بنانے والے لوگ اور ایک آپ یعنی فلم دیکھنے والے لوگ"۔
ظاہر ہے کہ ہم نے جس طرح جنابِ وزیر کی خوشامد کی تھی ان کی بھی ہاں میں ہاں ملائی اور رخصت پائی۔ اب بالکل کبیدہ خاطر ہو کر (اس لئے نہیں کہ مضمون کا موضوع نہ ملا بلکہ اس لئے کہ اگر ایک آدھ گھنٹے تک کوئی اچھوتا خیال ذہن میں نہ آیا تو . . . . .)
غرض کبیدہ خاطر ہو کر ہم کنج خانہ میں واپس آئے۔ اس وقت ہمارا دماغ کچھ اس طرح پریشان خیالی میں منہمک تھا :۔

"عجب بے سوپا دنیا ہے۔ بھیّا گداگر کے نزدیک بھیک مانگنے والوں اور بھیک دینے والوں کے علاوہ تیسری قسم کے لوگ پیدا ہی نہیں ہوئے۔ مگر اہلِ غرض کی تنگ نظری کو کیا کہئے۔ اور مس . . . . . نے وہ فلم بنانے اور دیکھنے والوں کی بھی ایک ہی کہی۔ مگر نہیں یہ ایک اندازِ دلربایانہ ہے۔ اور فلم بنانے والوں کی دُنیا بھی تو ایک جُداگانہ دُنیا ہے۔ ان کو دوسروں سے کیا مطلب۔ رہے ایڈیٹر صاحب۔ یہ ٹھیرے مصروف آدمی اُنہوں نے ایک بات کہہ کر ہم سے چھٹکارا پایا۔ پر ان باتوں

سے اتنا ضرور ثابت ہُوا کہ دُنیا کا ہر شخص ہر چیز کو اپنے ہی نقطۂ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ان کو ہم آزاد اخبار نویسوں کی سی فراخ دلی سے کیا کام۔ البتہ جنابِ وزیر نے دل لگتی بات کہی۔ کیا کہا تھا؟ "حاکم اور محکوم؟" ہاں اس میں سچائی ضرور ہے۔ مگر پوری سچائی نہیں یہ لازم تو نہیں کہ جو حاکم ہو وہ حکومت بھی کرے۔ شاہانِ بے تاج، نوابانِ بے ملک اور مختارانِ بے اختیار کی اِس دُنیا میں کمی نہیں"۔

ہم اس طرح عقل کے گھوڑے دوڑا رہے تھے کہ بیگم صاحبہ نے ہمیں متفکر دیکھ کر حال پوچھا۔ ہم جواب تو کیا دیتے وہی سوال ان سے بھی کیا۔ اُنہوں نے جواب دیا: "دو جماعتیں؛ تمہاری عقل درست ہے؛ یہ تو سیدھی سی بات ہے۔ ایک جماعت تم اور تمہارے بھائیوں کی جو روٹی کماتے ہیں۔ اور دوسری جماعت ہم اور ہماری بہنوں کی یعنی ہم جو کھاتے ہیں"۔

بہت خوب کہہ کر ہم اپنے کمرے میں جا گھسے۔ سوچتے تھے کہ جنابِ وزیر کی طرح ہماری گھر والی کے جواب میں بھی سچائی ضرور ہے مگر . . . . . .

ہم موضوع مضمون کی تلاش میں پریشان حال تھے کہ میز پر بابو شیشر کمار گھوش مرحوم کا منتخب مجموعۂ مضامین نظر پڑا۔ امرتا بازار پتر کا کے بانی اور مدیرِ اوّل یہی تھے۔ ہم نے بہ ظاہر دل بہلانے کے بہانے اگر در اصل "مطلب سعدی دیگر" کے مصداق نہ صرف موضوع ڈھونڈنے بلکہ بدرجۂ آخر مضمون تک چرانے کے لئے کتاب اُٹھائی اور حسبِ عادت طرزِ حکیمانہ اختیار کیا۔ یعنی سائنٹیفک طریقِ کار۔ چنانچہ ناشر کی تمہید پڑھی تو باچھیں کھل گئیں۔ معلوم ہُوا کہ یہ سب مضمون پہلے پہل ۱۸۹۸ء سے پیشتر طبع ہوئے تھے یعنی ۱۹۳۶ء کے مضمون چور بھائیوں کی دزدیدہ نگاہوں سے غالباً دُور، چوری آسان ہوگی۔ آگے چل کر پتہ چلا کہ یہ تمہید جو ۱۹۱۷ء میں تحریر میں آئی مضامینِ مذکور کو سدا بہار کا تمغۂ عنایت فرماتی ہے اور کہتی ہے کہ دورِ حاضر کے سیاست دان (بالخصوص ہمارا طبقۂ مدیران) اِس سے خوشہ چینی کرے تو عین واجب ہے کیونکہ ان کا امتیازِ خصوصی یہ ہے کہ یہ مستقل دلچسپی کے مضامین ہیں اور آج کل کے صحیفہ نگاروں کے دماغ کی جولانی اور فہم رسانی بلکہ اُن کی رہنمائی اور عقدہ کشائی کے لئے تیر بہدف ثابت ہوں گے اس پر ہم اُچھل ہی تو پڑے اور سوچا کہ لو بھیا پہبارہ ہی پو بارہ بہار) سے موضوع ملے اور زیچ کھیت ملے۔

غرض ورق گردانی کی اور خوب دل لگا کر۔ انجام کار دامنِ مُرادگُلِ مقصود سے بھر ہی لیا۔ وہ جو ادنٰی سے زیچ کی صورت ایک سوال ذہن میں آیا تھا کہ ساری دُنیا کو عام طور پر کن دو جماعتوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اِس کا واقعی درست اور قطعی طور پر صحیح جواب مل ہی گیا اور ہماری ۱۹۳۶ء کی مشکل ایک چالیس سال پہلے کے مضمون کے طفیل حل ہوگئی۔

آپ پڑھتے جایئے اور اخیر تک پہنچ کر محترم مرحوم شیشر بابو کی بالغ نظری کی داد دیجئے اور دیکھئے کہ انہوں نے کس خوبی سے "حدیثِ دیگراں" کے ذریعے سے "سرِ دلبراں" کا افسانہ بیان کیا ہے اور روزمرہ کی آپ بیتی کے پردے میں احوالِ واقعی کا بھید کس صفائی سے کھول کر رکھ دیا ہے۔

یہ کہنے کی شاید ضرورت نہ ہوگی کہ امرتا بازار پتر کا کے ایڈیٹر نے یہ کہانی انگریزی میں لکھی تھی اور ہم اسے کسی قدر تفصیل اور تصرّف کے ساتھ اپنے الفاظ میں تحریر کریں گے اور ہاں ہم اس بات کی داد چاہتے ہیں کہ گو چوری تو کر رہے ہیں مگر ڈنکے کی چوٹ! سنئے :۔

پچاس برس کے لگ بھگ ہوئے ہوں گے ۔ ایک تھا برہمن اور ایک تھا نیچ ذات کا آدمی ۔ دونوں کلکتے جا رہے تھے کہ راہ میں مڈبھیڑ ہوئی ۔ راستہ لمبا اور دونوں پیدل ۔ پھر دونوں کا ہمسفر ہو جانا اور ایک دوسرے کی سننا ایک قدرتی بات تھی ۔ باتوں باتوں میں معلوم ہُوا کہ دونوں بے روزگار ہیں اور تلاش ملازمت یا کاروبار کے لئے آوارہ وطن ہوئے ہیں ۔ سمجھتے ہیں کہ کلکتہ ٹھیرا مرکزِ حکومت ۔ یہاں کوئی نہ کوئی ڈھنگ سَر کا موقع مِل ہی جائے گا جس سے پیٹ بھرے ۔ گھنٹہ آدھ گھنٹہ اکٹھے چلے ہوں گے کہ برہمن بولا :۔ " دیکھو بھئی! تم ہو ایک ادنیٰ ذات کے آدمی ۔ تم کو خدمت گاری کے سوا اور کوئی نوکری چاکری ملنے سے رہی ۔ اس لئے تمہاری بگڑی تو ابھی کھڑے کھڑے یہیں بن سکتی ہے ۔ میں تمہیں اپنا نوکر رکھ لیتا ہوں ۔ اور واجبی تنخواہ برابر دوں گا ۔ کہو رامو! ہے منظور ؟"

رامو ۔ " ست بچن مہاراج ست بچن "۔

اب سنئے کہ برہمن کے کپڑے تھے میلے کچیلے ۔ مگر رامو جب گھر سے چلا تو سر بسر صاف ستھری دھوتی اور قمیص اور پگڑی پہن کر نکلا تھا ۔ اس لئے آپ برہمن کو یقیناً حق بجانب ٹھہرائیں گے جب اُسے یہ کہتے ہوئے سنیں گے :۔

" رامو! یہ تو ٹھیک نہیں ۔ اِسے کون بھلا آدمی پسند کرے گا کہ میں تمہارا آقا تو سفر کروں پھٹے حالوں، پہنوں میلے کچیلے کپڑے اور تم میرے چاکر ہو کر نیا اور صاف ستھرا لباس پہنو ۔ دنیا کی یہ ریت نہیں ۔ قانون قاعدہ کوئی چیز یہ بات برداشت نہیں کر سکتی ۔ لوگ دیکھیں گے تو مجھ پر ہنسیں گے ۔ پر مجھے اس کی پروا نہیں ۔ ہاں جب تمہاری ہنسی ہوگی تو مجھ سے یہ برداشت نہ ہوگا ۔ اس لئے آؤ کپڑے بدل لیں "۔

رامو تھا تو ادنیٰ ذات کا آدمی مگر فطری دانائی اُس نے برابر پائی تھی ۔ دُنیا کے رسم و رواج سے بے خبر نہ تھا ۔ پھر برہمن نے جب یہ بتایا کہ رامو تیری ہنسی ہوگی تو سارا فلسفہ شرافت اُس کے دل میں اُتر گیا ۔ اُس نے جھٹ اپنے کپڑے برہمن کو پہنا دیئے ۔ اور اُس کے خود پہن لئے ۔

جب کلکتے پہنچے تو برہمن نے ایک چھوٹی سی کٹیا کرائے پر لی اور رامو سے پوچھا کہ تمہاری گرہ میں کچھ ہے یا نہیں ۔ رامو نے کہا " مہاراج! میں جب گھر سے چلا تو دو روپے لے کر نکلا "۔

برہمن ۔ " لاؤ وہ دو روپے مجھے دو ۔ مالک اور ملازم کے لئے فوری ضرورتوں کا بھی تو انتظام ہونا چاہیئے ۔ پھر ایک روپیہ کرایہ کا

پیشگی ادا کرنا ہے۔"

ظاہر ہے کہ رامو نے بڑی خوشی سے اپنے آقا کا یہ دوسرا مطالبہ بھی پورا کیا۔ یہ اُس کا فرض تھا۔ دیکھتے دیکھتے کٹیا میں دونوں کی سائش کا بندوبست ہوگیا۔ رامو بازار گیا اور دال چاول آٹا لکڑی وغیرہ لایا۔ واضح ہو کہ یہ سب سامان رامو کے دوسرے روپے کے طفیل مہیا کیا گیا۔

اب برہمن نے رامو کو یوں مخاطب کیا:۔

"سنو رامو! تم ہو میرے نوکر اور میں ہوں تمہارا مالک۔ اس لئے تمہارا پہلا فرض یہ ہے کہ مجھے مطلق کوئی تکلیف نہ ہونے دو تمہیں گھر کا سارا کام کاج کرنا ہوگا۔ یاد رکھو کہ دُنیا میں کاہل آدمی کبھی نہیں پنپتا۔ اس کے علاوہ میرا مزاج کچھ سخت گیر واقع ہوا ہے۔ چنانچہ اگر میں نے تمہیں کاہل پایا تو ملازمت سے فی الفور برطرف کر دوں گا۔ سمجھ لیا؟ اچھی طرح سمجھ لیا؛ اچھا اب بتاؤ کہ گھر کا سب کام ہو چکا؟"

رامو۔ "جی ہاں سرکار ہو چکا۔ دال بھی تیار ہے اور چاول بھی۔"

برہمن نے پہلے تین حصے کھانا خود کھایا۔ باقی رامو کے حوالے کیا۔ جب رامو کھا چکا تو برہمن نے کہا:۔

"رامو! اب دوپہر ہو گئی۔ ہم دو گھڑی آرام کریں گے۔ تم شہر میں جاؤ۔ گلی گلی پھرو اور بھیک مانگو۔ مگر خبردار آوارہ نہ پھرنا زور زور سے پکارنا۔ جب بھیک لے کر واپس آؤ گے تو میں اُس کی مقدار سے اندازہ کرلوں گا کہ تم نے اچھی طرح محنت سے کام کیا یا کہیں سُست ہو کر بیٹھ رہے۔"

اس پر رامو بھیک مانگنے گیا اور اُس کا آقا سوتا رہا۔ جب شام کو رامو واپس آیا تو جیب پیسوں سے بھر کر لایا۔ یہ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ جو کچھ رامو لایا تھا۔ وہ اُس کے مالک کا حق تھا۔ حق بہ حقدار رسید۔ تقسیم کار کے مسئلہ کا یہی تقاضا ہے اور خواجہ و بندہ کے فرائض کی تقسیم ازل سے ہو چکی ہے۔

غرض یہ دونوں اسی طرح زندگی کاٹنے لگے۔ رامو پہلے گھر کا کام کاج کرتا۔ پھر بھیک مانگنے کو چلا جاتا اور شام کو واپس آتا تو اُس کا آقا برہمن اُس کی کمائی اپنے قبضے میں کر لیتا۔ جب دو مہینے گزر گئے تو برہمن کی پٹاری میں تیس چالیس روپے جمع ہو گئے

ایک روز برہمن نے رامو سے کہا:۔

"رامو! تم میرے گاؤں کو جاؤ۔ مجھے اپنی گھر والی کو روپیہ بھیجنا ہے کیونکہ اُس کو خرچ کے لئے روپے کی سخت ضرورت ہوگی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں کوئی معقول رقم نہیں بھیج سکتا۔ مگر سب قصور تمہارا ہے۔ تم بہت ہی کم پیسے روزانہ لاتے ہو۔ اور اصل بات تو یہ ہے کہ میں تمہیں کب کا برطرف کر چکا ہوتا۔ تمہاری کاہلی کی مناسب سزا یہی تھی۔ مگر کیا کروں تم پر رحم

آتا ہے۔ اگر میں نے نکال دیا تو جاؤ گے کہاں؟ در بدر ٹھوکریں کھاتے پھرو گے اور فاقے کرتے کرتے اگلے جہان سدھارو گے۔ بہرحال میں ابھی چند روز اور تمہارے ساتھ گزارہ کروں گا اور دیکھوں گا کہ تم اپنا چلن درست کرتے ہو یا نہیں۔ اچھا کل کلکتہ سے چلے جانا اور یہ سارا روپیہ جو میں نے بڑی جان جوکھوں سے بچایا ہے میری گھر والی کو پہنچانا۔ مگر نہیں ٹھیرو۔ جب چلے گئے تو بھیک کون مانگے گا، میرا پیٹ کیسے بھرے گا۔ ایک ایک پیسہ تو میں گھر بھیج رہا ہوں۔ نہیں نہیں۔ تم دو روز اور جاؤ۔ اور خوب یاد رکھو کہ ان دو دنوں میں صبح سے آدھی رات تک بھیک مانگنا۔ تاکہ اتنا تو میرے پاس ضرور ہو کہ تمہاری غیر حاضری میں گزارا ہو سکے۔"

اس حکم پر اچھی طرح سے عمل کیا گیا۔ پانچ چھ روپے برہمن کے مصارف کے لئے جمع ہو گئے۔ جب روانگی کا وقت آیا تو را نے اپنے آقا سے درخواست کی کہ زادِ راہ کے طور پر کچھ عنایت فرمایا جائے۔ رامو کی یہ بات سُن کر برہمن سخت برافروختہ ہوا اور ظا ہے کہ اُس کا یہ غصہ اور غضب بالکل جائز تھا۔ برہمن نے طیش میں آ کر کہا:۔

"رامو! تم نے یہ کیا کہا؟ میں اور تمہیں زادِ راہ دوں؟ سفر خرچ مہیا کروں؟ یاد رکھو میں اتنا فضول خرچ نہیں ہوں کہ نوکروں پر روپیہ برباد کرتا پھروں۔ تم نوکر نہ ہوئے میرے لئے ایک فضول عیش ہوئے۔ تم سخت کمینہ خصلت آدمی ہو۔ تمہارے دل میں اپنے آقا و مولا کے لئے ذرہ برابر درد نہیں۔ ہے پرماتما کیسے خود غرض سے پالا پڑا۔ رامو! کیا یہ ہے تمہاری نیت کہ تم کو سفر خرچ دے کر میں تمہاری غیر حاضری میں خود فاقے کروں؟ نہایت شرم کی بات ہے۔ کیوں نہ ہو۔ کلجگ ہے کلجگ!!! تم احمق بھی کتنے ہو۔ ابے گدھے! یہاں سے وہاں تک سارے سفر میں گاؤں نہیں؟ قریے قصبے نہیں؟ یا وہاں آدمی نہیں بستے؟ جاؤ اور راستے میں بھیک مانگتے اور پیٹ پالتے چلے جاؤ۔ فضول خرچی نہ کرنا۔ کچھ بچا کر بھی لانا اور ہاں سُنو۔ خبردار پھر کبھی مجھ سے ایسا خود غرضانہ مطالبہ نہ کرنا۔ یاد رکھنا اور کبھی نہ بھولنا کہ میں تمہارا مائی باپ ہوں۔ کیا میں نے تمہیں روزی کمانے کے ڈھنگ پر نہیں ڈالا؟ تمہیں ملازمت نہیں دی۔ اگر میں یہ کُٹیا کرایہ پر نہ لیتا اور ہر طرح تمہاری رکھوالی نہ کرتا تو تم گلیوں میں مارے مارے پھرتے اور فاقے کرتے کرتے مر جاتے۔"

برہمن کی یہ کھری کھری باتیں سُن کر رامو بڑا شرمسار ہوا۔ حیران تھا کہ مجھ سے یہ کیا حماقت ہوئی۔ کہتا تھا کہ واقعی میں بڑا احسان فراموش ہوں۔ اُس نے اپنے آقا سے معافی مانگی اور برہمن کے وطن کو چل پڑا۔

سفر تو لمبا نہ تھا مگر کئی دن راہ میں صرف ہو گئے کیونکہ صبح سے سہ پہر تک وہ بھیک مانگتا اور شام کو پیدل سفر کرتا۔ بہرحال وہ برہمن کے گاؤں میں پہنچا اور جو روپیہ مالک سے لایا تھا اُس کی بیوی کے حوالے کیا۔

برہمن کی گھر والی بڑی نیک مزاج اور عقلمند عورت تھی۔ اُس نے پہلے اپنے پتی کے نوکر کو کھانا کھلایا پھر پوچھا۔

"راموا یہ تو بتاؤ کہ تمہارے مالک نے کونسی ملازمت حاصل کی ہے کہ تھوڑے ہی دنوں میں مجھے یہ رقم بھیج سکا۔"

رامو نے جواب دیا:۔" سرکار! کوئی خاص ملازمت نہیں۔ میں جو آپ کے پتی کا نوکر ہوں گلیوں میں بھیک مانگتا ہوں۔ اور اُسی کی آمدنی سے اُنہوں نے اپنے اور میرے گزارے کا بھی بندوبست کیا اور آپ کو بھی یہ روپیہ بھیجا!"

اس پر یہ معزز خاتون گھڑی بھر کے لئے سوچ میں پڑ گئی۔ پھر بولی:" تو میں سمجھتی ہوں کہ تم اکیلے ہی بھیک مانگنے نکلتے ہو اور تمہارا مالک تمہارے ساتھ نہیں جاتا۔"

رامو۔ "جی ہاں! میں اکیلا ہی جاتا ہوں۔"

برہمنی۔" اچھا۔ تو پھر جب تم واپس آتے ہو تو تمہارا مالک تم سے ٹھیک ٹھیک حساب مانگتا ہے اور پوچھتا ہے کہ تم کتنے دروازوں پر گئے۔ اور کس کس سے کیا کیا پایا؟"

رامو۔" نہیں سرکار! وہ یہ تو نہیں پوچھتے۔ البتہ جو کچھ میں لاتا ہوں اُن کے حوالے کرتا ہوں۔"

اِس پر برہمنی کو غصہ تو آیا مگر ضبط کر کے بولی:" اچھا یہ بات ہے! میں پہلے ہی سے جانتی تھی کہ تمہارا آقا بڑا بے پروا آدمی ہے۔ اُس کے مزاج کو احتیاط اور خبرداری تو چھو تک نہیں گئی۔ اُسے بے وقوف بھی کہہ ڈالیں تو ٹھیک ہے۔ غضب کا فراخ دل انسان ہے۔ کیا کہا تم نے؛ وہ بھیک کا حساب مانگتا ہی نہیں۔ کتنا سادہ لوح ہے۔ دوسروں پر کتنا بھروسا کرتا ہے۔ ایسے کاہل آدمی بھلا دُنیا میں کیا خاک مالدار ہو سکیں گے۔ جو اپنے نوکروں سے اپنی آمدنی کا حساب تک نہیں پوچھتے۔ میں سمجھتی ہوں کہ اُسے یہ بات کبھی سوجھی ہی نہیں کہ تم اگر بددیانتی پر اُتر آؤ اور اپنے فرائض فراموش کر بیٹھو تو بڑی آسانی کے ساتھ ہر روز کی کمائی کا کچھ حصہ چھپا کر الگ کر لو اور اپنے ہی قبضے میں رکھو۔ نہیں نہیں میرے پتی کی فراخ دلی اُسے تباہ کر کے رہے گی۔ مگر راموا سنو۔ خبردار تم کبھی اپنے مالک کی فیاضی سے ناجائز فائدہ نہ اُٹھانا۔ یہ بڑی بُری بات ہے۔ اس سے تو آدمی ادھرمی ہو جاتا ہے۔ یاد رکھنا اور کبھی نہ بھولنا کہ تم اپنے آقا کے قرض دار ہو اور یہ قرض اتنا بڑا ہے کہ تم اسے کبھی ادا نہیں کر سکتے۔ پس جہاں وہ فیاضی کرتا ہے تم وفاداری کرنا۔"

لیجیئے۔ شیشر بابو نے کہانی یہاں ختم کر دی اور اصل میں بیان کرنے کے قابل کوئی اور بات باقی ہے بھی نہیں اس لئے ہم بھی اسے یہیں ختم کرتے ہیں۔ کیونکہ ہمیں اپنے سوال کا جواب مل گیا ہے اور چونکہ آپ کو بھی یقیناً مل گیا ہوگا۔ (عقلمند کو اشارہ کافی ہے) اس لئے کہانی کہئے یا مضمون اس پر مزید اضافہ بے سود ہوگا۔

مفتی غلام جعفر

پیاس میں آس

پتھروں میں ہے آگ پریم کی لوہا اپنا کاٹ دکھائے
پانی سے بجلی یوں نکلے جیسے سوجھ آنکھ سے جائے
ہوا جدھر سے ہو کر نکلے دنیا کا سب میل اُڑائے
مٹی بھی بیکار نہیں جو طرح طرح سے کام میں آئے
پھر بھی نہیں سمجھ میں آتا ہم اِس دنیا میں کیوں آئے
اِس جینے کا مطلب کیا ہے اس کا بھید نہ کوئی پائے

شاید دام نام سب دھوکا سیدھی راہ خدا ہی لگائے

چھوٹی عقل اور علم بھی تھوڑا لالچ اپنا جال بچھائے
دل کو لاگ بُرائی سے ہے اچھی بات سے جی گھبرائے
بھلی بات کا دھیان کرو تو کوئی سنکوئی شک آجائے
بُری بات کے نام ہی پر جی میں کچھ ایسی آن سمائے
جس کی تہ کو پہنچنے میں شیطان کی عقل بھی چکر کھائے
اس جینے کا مطلب کیا ہے اس کا بھید نہ کوئی پائے

شاید دام نام سب دھوکا اپنی راہ خدا ہی لگائے

آخر یہ ظالم اور جاہل لوگ ہیں دُنیا پر کیوں چھائے
پتا نہیں ایک دوسرے کا جانی دشمن کیوں ہو جائے
اور یہ اندھے، لُولے لنگڑے اس دنیا میں کیونکر آئے
خبر نہیں بے نام و نشاں کیوں کوئی جیتے جی کر مر جائے
اہلِ ہنر دُنیا میں کم ہوں کاہل سے دُنیا بھر جائے
اِس جینے کا مطلب کیا ہے اس کا بھید نہ کوئی پائے

شاید دام نام سب دھوکا سچی راہ خدا ہی دکھائے

حال نہ پوچھو پڑھے لکھوں کا بھینس بھلی جو دودھ کھلائے
ایسے علم سے پتھر اچھے، جن سے جا کر سر ٹکرائے
بھلا تعجب ہو نہ تو کیا ہو اپنے کیے پر دھیان نہ جائے
مُنہ سے کہے "یہ بات بُری ہے" پھر بھی اپنے مُنہ کی کھائے
ہے افسوس کہ ایسے لوگوں کا بھی دھرتی بوجھ اُٹھائے
جنہیں رُوند کے پھول پھول کے خلقت آگے بڑھتی جائے

شاید دام نام سب دھوکا، اپنی راہ خدا ہی لگائے

اور اس قوم کا کون ٹھکانا جس کی قسمت ہی سو جائے
سونا بھی وہ ایسا سونا، جیسے دُنیا سے کوئی جائے

۔ جاگے — توبہ توبہ — جاگ کے فتنے نئے جگائے
ے سے غفلت بھلی نہ آگ لگا کر اُدھم مچائے
رے سونے والے اسی طرح تو جی سے جائے
ند کے کھل کھل کے دُنیا آگے بڑھتی جائے

شاید دام نام سب دھوکا سیدھی راہ خدا ہی دکھائے

بھروں کے جینے کا مطلب سمجھ میں کیسے آئے
ھوں کی اس حالت پر آنسو کیسے کوئی بہائے
ح پر خدا جو ہم کو اس جینے کا بھید بتائے
ر یہ دنیا کی گردش یونہی نرالے رنگ دکھائے
لے آگے دن آئے اور دن جائے تو رات آجائے
ندیس میں بھی دن تھا اب پیارے کے بادل چھائے

شاید دام نام سب دھوکا اپنی راہ خدا ہی لگائے

ری حالت یہ ہے جیسے اندھیرے میں کوئی جائے
دکھے نہیں کچھ آگے پیچھے، پھسلے پاؤں کہ ٹھوکر کھائے
اپنا ہاتھ سانپ کا پھن ہو بھوت بنا کوئی جیسے آئے
غیر اور اپنا کوئی نہ سوجھے جان اپنی دوبھر ہو جائے
جیسے بھیڑ چھُٹے گلّے سے آندھی پانی میں چلّائے
باپ اور ماں سے چھوٹ کے بچہ دھوئیں دھار طوفان میں آئے

شاید دام نام سب دھوکا سیدھی راہ خدا ہی دکھائے

باپ اور ماں سے چھوٹ کے جیسے وہ آندھی طوفان میں آئے
لئے دیا اِک پریم کا دھیما گھور گرج میں راہ نہ پائے
ہوس کی آندھی حرص کا تھپیڑ مار کے پریم کی آگ بجھائے
گھٹا ٹوپ اور دُھند اندھیرا پریم کی ناؤ بھنور لے جائے
اس مایا طوفان میں پھنس کر دُکھی رُوح یہ آس لگائے
وہی خدا جو چاہے تو پھر دُونی پریم کی آگ جلائے

شاید دام نام سب دھوکا سچی راہ خدا ہی دکھائے

مقبول احمد پوری

نگارخانۂ چین

شانگ یا !

شانگ یا ! میں تم سے محبت کرنا چاہتا ہوں،
ایسی محبت جو ہمیشہ ہمیشہ رہے،
کبھی فنا نہ ہو
یہاں تک کہ تمام پہاڑیاں میدان بن جائیں
دریا سوکھ جائیں
موسمِ سرما میں کوندتی ہوئی بجلی کی مہیب گرج سنائی دینے لگے
موسمِ گرما میں برف پڑنے لگے۔
مینہ برسنے لگیں
اور آسمان وزمین آپس میں مل جائیں
لیکن میں کسی حالت میں بھی تم سے جُدا نہ ہوں۔

سنہ ۱۰۰ ق۔م (نامعلوم)

او جگنو!

بارش تیری لال ٹین نہیں بجھا سکتی !
ہوا اس کا نور اور بڑھا دیتی ہے۔ !
او جگنو ! دور نیلے آسمانوں میں چلا جا !
اور چاند کے نزدیک ستارہ بن کر چمک !

سنہ ۶۲-۷۰۵ء (لی۔پو)

فلسفی ؟

"جو بولتے ہیں وہ کچھ نہیں جانتے،
جو جانتے ہیں خاموش رہتے ہیں" !
یہ الفاظ مشہور فلسفی لوزو نے کہے تھے !

اگر ہم فرض کریں کہ لوزو خود "جاننے والوں" میں سے تھا
تو آخر یہی بتائے کہ اُس نے
پانچ ہزار لفظوں کی ایک کتاب کیوں لکھی ! ؟

(لوزو)

شبنم

ادرک کے پتے پر شبنم
کتنی جلدی جلدی خشک ہو رہی ہے
شبنم جو اتنی جلدی خشک ہو گئی ہے
کل پھر یہیں ہو گی
لیکن جسے ہم قبر میں سُلا آئے ہیں
وہ کبھی واپس نہ آئے گا

(نامعلوم)

سنہ ۱۰۰ قبل مسیح

جسے طلاق مِل گئی تھی

وہ جڑی بوٹیاں لینے کے لئے پہاڑ پر چڑھ گئی
واپس آئی تو راستے میں اس کا پہلا شوہر کھڑا تھا
وہ اس کے سامنے ادب سے جھک کر کھڑی ہو گئی
اور کہنے لگی "تمہاری موجودہ بیوی کیسی ہے" ؟

"اگرچہ میری موجودہ بیوی کی گفتگو بہت چُلبلی ہوتی ہے
لیکن اس نے مجھے پہلی بیوی کی طرح اپنا بنا لینے کی کوشش نہیں کی۔
چہرے کی خوبصورتی کو چھوڑو !
محبت میں میری دوسری بیوی پہلی بیوی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔

میری نئی بیوی دس قدم آگے بڑھ کر مجھ سے ملنے آتی ہے
میری پُرانی بیوی بیس قدم بڑھ کر مجھ سے ملنے آتی تھی۔
میری نئی بیوی ریشم پر خوبصورت پھول کاڑھ سکتی ہے۔

میری پرانی بیوی معمولی کپڑے پر سادہ پھول کاڑھ سکتی تھی

ریشم پر دن بھر میں صرف دو تین خوبصورت پھول کاڑھے جا سکتے ہیں
معمولی کپڑے پر دن بھر میں کئی پھول بنائے جا سکتے ہیں۔
تمہارے سادہ کپڑے سے جب میں اس کے ریشم کا مقابلہ کرتا ہوں
تو مجھے پتہ چلتا ہے کہ اس کا ریشم تمہارے سادہ کپڑے کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں"

(نامعلوم) (سنہ ق م)

شباب

دریا کے کنارے
سبز سبز
گھاس اُگی ہے
باغ میں
موٹے موٹے
بید کے درخت اُگے ہیں
ایک عورت مینار کی چھوٹی کھڑکی میں
اُداس اُداس
نظر آ رہی ہے
اس کا گدرایا ہوا
گورا گورا
بدن جوانی کے نشے میں مخمور ہے
اس کے حسین چہرے کو
سُرخ سرخ
غازہ چوم رہا ہے
اس کا چھوٹا سا اور
نازک نازک

ہاتھ صاف صاف نظر آرہا ہے
کبھی وہ رقص گاہ کی ایک مغنیہ تھی
اب وہ ایک آوارہ گرد کی بیوی ہے
آوارہ آدمی کہیں چلا گیا ہے
اور اس کے لئے
رات بسر کرنی دشوار ہو رہی ہے۔

(می شینگ) سنہ ۱۰۰ ق م

سرما کی رات

تمہارے بغیر میرا بستر تنہا اور اُداس ہے
مجھے نیند کیسے آئے

سردی بڑھ رہی ہے
رات کی ہوائیں چلنے لگی ہیں

پردوں میں سرسراہٹ پیدا ہو رہی ہے
جیسے سمندر کی لہریں سسکیاں بھرتی میری طرف آ رہی ہوں

کاش یہ لہریں ہی ہوں
اور مجھے تمہارے پاس لے جانے کے لئے آ رہی ہوں۔

وین تی (شہنشاہ چین) سنہ ۶۰۰ء

شادی کے پلنگ کے پردے سے خطاب

(یہ نظم چین کے ایک مشہور جرنیل کی بیوی نے اس وقت لکھی تھی جب اس کے شوہر نے ایک دوسری عورت کے دام محبت میں اسیر ہو کر اُسے گھر سے نکال دیا تھا)

عروسی پلنگ کے سامنے پھڑپھڑاتے ہوئے پردے!
میں نے تجھے اس لئے یہاں لٹکایا تھا کہ
دن کی روشنی بھی مجھے میرے محبوب سے ہم آغوش ہوتے نہ دیکھے
مَیں تجھے اپنے والدین کے گھر سے یہاں لائی تھی
اب تجھے وہیں واپس لے جا رہی ہوں

ابھی تجھے تہ کر کے صندوق میں رکھ دُوں گی
او پردے! کیا میں تجھے پھر بھی کبھی صندوق سے باہر نکالوں گی؟

اُس گھر میں

۳۰۰ء

وہ دروازہ سفید پانیوں کے سامنے کھلتا تھا ——
لکڑی کے پُل کے بہت قریب
یہاں ایک جوان عورت رہتی تھی۔
تنہا —— بغیر کسی محبت کرنے والے کے۔

(چنگ سی)

طوفان

آوارہ بادل لڑھکتے چلے جا رہے ہیں
تھمی ہوئی بارش کے قطرے آہستہ آہستہ ٹپک رہے ہیں
آٹھوں سمت جھٹپٹا چھا رہا ہے
ہموار میدان ایک بڑا دریا بن گئے ہیں
میرے پاس شراب ہے
جسے میں مشرقی کھڑکی میں بیٹھا سُستی سے پی رہا ہوں۔
مجھے اپنے دوستوں کا بے تابی سے انتظار ہے
لیکن نہ کوئی کشتی آتی ہے نہ گاڑی۔

(تاؤ-چی-ساین)

دل شگفتہ ہو گئے

۲۷۳ء

میں نے پیغام بھیج کر
اپنے دوستوں کو بُلا بھیجا
سب کے سب آ موجود ہوئے
گلا پھاڑ پھاڑ کے چلاتے رہے
زبانیں خوب چلیں

سادہ خوراک تھی
فلسفے پر بحث ہوتی رہی
حکمتوں کی تحقیق ہوئی
دماغ ایک ہو گئے
جوش و خروش کا طوفان بہ نکلا
اور دِل شگفتہ ہو گئے۔

(چینگ۔ کونگ سوئی) ۷۷۳ء

مرحوم محبوبہ سے

"رات میں نے تماری لمبی لمبی آہیں سُنیں
اور جان لیا کہ تم مجھی کو یاد کر رہے ہو گے!"
میری محبوبہ نے یہ لفظ کہے اور بہشت کا دروازہ کھُل گیا
ہماری روحیں ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگیں
میں نے اس کا چہرہ بھی دیکھ لیا
اس نے مجھے آرام کرنے کے لئے ایک تکیہ دیا
اور میرے لئے دُودھ اور گوشت لے آئی۔

جہاں وہ لیٹی تھی میں اس کے قریب کھڑا ہو گیا
اور پھر یکایک چونک کر اُٹھ کھڑا ہُوا
وہ وہاں نہیں تھی
کسی نے نہ جانا کہ اس وقت کس طرح میری روح
تار تار ہو گئی
اور کس طرح میرے آنسوؤں سے میرا سینہ شرابور ہو گیا۔

(پاؤ۔ چاؤ)

مہدی علی خاں

جگنو

جگنو میں ایسی نُدرت اے ذوالجلال کیا ہے
کیڑا ہے اک ذرا سا اِس میں کمال کیا ہے

شہباز سے بھی بڑھ کر کیا حوصلہ ہے اِس کا
افزوں عقاب سے بھی کیا مرتبہ ہے اِس کا

ہاں حُسن و رنگ پایا کب اِس نے مور کا سا
ہاں جوشِ عشق کب ہے اِس میں چکور کا سا

پروانے کی سی دِل میں اِس کے خلش کہاں ہے
سوز و گداز کب ہے درد و طپش کہاں ہے

اِس سے زیادہ دلکش رنگت ہے تیتری کی
اِس سے تو خوبصورت ہوتی ہے بیر بہوٹی

سُرعت کے ساتھ اِس میں پرواز تک نہیں ہے
نغمہ سرائی کیسی آواز تک نہیں ہے

پھر اِس میں ایسی خوبی ہے کون سی الٰہی
کیوں دی گئی اِسی کو یہ روشنی الٰہی

لیکن خرد ہے اپنی کب رازدانِ قدرت
ورنہ ہر ایک شے سے پیدا ہے شانِ قدرت

بُوٹی بھی ہے تو اُس کی تاثیر ہے نرالی
پتّی بھی ہے تو اُس میں اِک بات ہے انوکھی

پتھر سے لعل نکلا اور آگ سے سمندر
دَوڑا رہے ہیں جھرنے بجلی کی لہر گھر گھر

پشہ ہے اِتنا چھوٹا لیکن وہ اُڑ رہا ہے
ہے کوہ اِتنا اُونچا لیکن وہ چُپ کھڑا ہے

ہوتا ہے بہرہ ور وہ، تو چاہتا ہے جس کو
چُون و چرا کی اِس میں یارب مجال کس کو

داتا ترے تصدّق تیری عطا کے صدقے
اِس نامُراد کی بھی اک التماس سُن لے

طالب نہیں ہوں اس کا تو مال دے نہ زر دے
تاریک میرا دل ہے روشن اسے بھی کر دے

میر سعادت حسین نجیب

شہرت، دولت، محبّت

مَیں شہرت کے گھر گیا
دربان نے روکا — نام؟
دُنیا میں نام ہوتا تو مِلنے کیوں جاتا؟

مَیں دولت سے مِلنے گیا
دربان نے کہا — بخشش؟
جیب میں دام ہوتے تو جاتا کیوں؟

مَیں محبّت کے پاس پہنچا
دربان نے روکا اور کہا — حُسن؟
اگر مَیں حسین ہوتا
تو محبّت کی بھیک کیوں مانگتا؟

(انگریزی سے چوری) م م ش

؟

رات جب جگمگا تے تھے تارے | چُپ کھڑی تھی میں گنگا کنارے
چاند پانی میں تھا عکس افگن | مائی گنگا کا پُر نور جوبن
نقرئی لہریں لہرا رہی تھیں | آ رہی تھیں، کبھی جا رہی تھیں
چاندنی کا وہ پُر لُطف منظر | نورِ وادیٔ ایمن کا مظہر
ٹھنڈے ٹھنڈے وہ جھونکے ہوا کے | گویا لے جاتے تھے دِل اُڑا کے
دیکھ کر ایسا دلکش نظارا | شدّتِ غم میں مَیں نے پُکارا

بن میں داسی تری نیم جاں ہے
میں یہاں رام میرا کہاں ہے

(۲)

چرخ پر گھومنے والے بادل! | مَہ کا مُنہ چومنے والے بادل!
آسماں تک ہے تیری رسائی | دُور افتادہ مَیں ناسزائی
عرشِ اعلےٰ پہ تیری نظر ہے | فرشِ خاکی پہ دُکھیا کا سر ہے
یوسفِ گم شدہ کا پتا دے | ڈھونڈ کر مجھ کو اتنا بتا دے

چاند کس بُرج میں وہ نہاں ہے
میں یہاں رام میرا کہاں ہے

(۳)

اے لو! کس زور سے بجلی کڑکی | رُوح قالب میں گھبرا کے پھڑکی

بوندیں پڑتی ہیں جھم جھم زمیں پر ہے نیا رنگ ہر دم زمیں پر
چھائی ہے کیا گھٹا کالی کالی چاند نے ڈر کے صورت چھپا لی
خوف سے میرا دل بھی ہے مضطر مَیں چھپوں کس کے دامن میں جا کر

آہ، کس جا مرا جانِ جاں ہے
مَیں یہاں، رام میرا کہاں ہے

(۴)

کوئی بیکس کا رہبر نہیں ہے مہرباں کوئی مجھ پر نہیں ہے
لاکھ رو رو کے مَیں نے پکارا محوِ غفلت ہے سنسار سارا

یاس کی اوس برسی جو دِل پر دی صدا رعد نے یہ گرج کر
دیکھ، ہے پرمشر مجھ میں تجھ میں رام تجھ میں ہے، ہے رام مجھ میں
رام ہے جان میں، رام تن میں رام گلشن میں ہے، رام بن میں
رام کا ذکر ہر نام میں ہے رام سب میں ہے، سب رام میں ہے
وہ تو امجد! بد و نیک میں ہے شان اِک ہَر کی ہر ایک میں ہے
دل کے ہمرہ دل آرام بھی ہے تو جہاں ہے وہاں رام بھی ہے

کِس لئے پھر یہ شور و فغاں ہے؟
مَیں یہاں، رام میرا کہاں ہے

سید امجد حسین امجد

جاپان اور اسلام

جاپانی حکومت کیوں اسلامی ممالک کے ساتھ اپنے تعلقات استوار کر رہی ہے؟

مسٹر واسود یوجی مہتہ نے "انڈین ریویو" کی ایک اشاعت میں ذیل کا مضمون لکھا ہے۔ اس مضمون میں اسلام کی طرف جاپان کے رجحان کے جو وجوہ بیان کئے گئے ہیں وہ اگر درست بھی ہوں تو پھر بھی یہ اس عالمگیر مساوات و اخوت کا پیغام دینے والے مذہب کا معجزہ ہی ہے۔ ورنہ دنیاوی پہلو سے دنیا میں آج کل عیسائیوں کو جو طاقت حاصل ہے وہ محتاج تشریح نہیں لیکن جاپانی جانتے ہیں کہ کسی دوسری مذہبی جمعیت میں وہ اس طرح شیر وشکر نہیں ہو سکتے جس طرح جمعیت اسلام میں۔ یہ بجائے خود اسلام کی روحانیت اور حقانیت کا اعتراف ہے۔ اور اس کی موجودگی میں صاحب مضمون نے جس سوءِ ظن کا اظہار کیا ہے وہ غیر ضروری سا ہے۔ "ھمایوں"

ٹوکیو کی مذہبی درسگاہ

"صرف چین کی تسخیر ہی جاپان کا نصب العین نہیں بلکہ اس کے اولوالعزمانہ عزائم کا دائرہ روز بروز زیادہ وسیع ہو رہا ہے اس سال کے آغاز میں جب مجھے جاپان جانے کا اتفاق ہوا تو یہ بات مجھے خاص طور پر محسوس ہوئی کہ جاپانی مذہب اسلام میں زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں۔ اور اپنی سلطنت کے مختلف حصوں میں مساجد تعمیر کر رہے ہیں۔ گذشتہ جنگ یورپ سے پہلے جب میں جاپان میں تھا تو مجھے وہاں کوئی جاپانی مسلمان نظر نہ آتا تھا لیکن اس دفعہ میں بہت سے جاپانی مسلمانوں سے ملا۔ ٹوکیو میں ایک خوبصورت مسجد اور درسگاہ بنائی گئی ہے۔ اس مسجد کے امام ایک صاحب قربان علی ہیں جو مسلم اور غیر مسلم جاپانی عہدہ داروں میں ادب و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ ٹوکیو کی اس اسلامی درسگاہ سے تمام ملک میں اسلامی مطبوعات کی اشاعت کی جاتی ہے۔

عربی اور فارسی کے جاپانی پروفیسر

جنگِ عظیم سے قبل ایسے جاپانی کا ملنا ایک مشکل امر تھا جو عربی فارسی یا ترکی زبان جانتا ہو اور جاپانی یونیورسٹیوں میں ان زبانوں کی تحصیل کے لئے کوئی پروفیسر نہیں تھا لیکن اب وہاں ایسے جاپانیوں کی ایک معقول تعداد نظر آتی ہے جو مذکورہ بالا زبانوں میں مہارت رکھتے ہیں اور جاپانی یونیورسٹیوں میں ان زبانوں کے پروفیسر ہیں۔

ایک اہم سوال

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جاپان کیوں مذہبِ اسلام میں دلچسپی لے رہا ہے کیا اسے پیغمبر عرب (صلے اللہ علیہ وسلم) سے

حقیقت میں ارادت ہے اور کیا اس کے نزدیک اسلام ان اخلاقی اور روحانی مسائل کو جنہیں وہ سلجھانا چاہتا ہے ایک بہترین حل ہے، نہیں! جاپانی اس قدر دنیادار اور کاروباری واقع ہوئے ہیں کہ وہ کسی مذہب کی حقانیت کے متعلق تحقیق کی زحمت گوارا نہیں کرنا چاہتے ۱۸۶۸ء کے سیاسی دور سے پہلے ان کا سرکاری مذہب بدھ مت تھا لیکن اس کے بعد "شنٹوازم" سرکاری مذہب بن گیا۔ اس لئے نہیں کہ ہندوستانی معلم (مہاتما بدھ) کے مذہب سے "شنٹوازم" زیادہ اخلاق اور روحانیت کا علم بردار یا مذہبی ضروریات کے لحاظ سے زیادہ مکمل تھا بلکہ یہ قوم پرستی کا سبق دیتا تھا جس سے ان کے حب وطن کے جذبات برانگیختہ ہوتے تھے۔

ایک مجلس تحقیقات

چند سال کے بعد جاپانی حکومت نے ایک خاص کمیشن اس غرض سے مقرر کیا کہ وہ اس امر کے متعلق تحقیقات کرے کہ دنیاوی نقطۂ خیال سے حکومت کے لئے کونسا مذہب بہترین ثابت ہوگا۔ جاپانی اس وقت اپنے قومی مذہب کو بھی خیرباد کہنے کے لئے تیار تھے بشرطیکہ نیا مذہب زیادہ سُرعت کے ساتھ انہیں دورِ حاضرہ کی ضروریات کے پورا کرنے میں مدد دیتا۔ دوسرے الفاظ میں جاپان کا یہ مذہب نہیں کہ کسی روحانی استاد کی تعلیم اس کے لئے لازمی ہے۔ اس کا مذہب صرف قوم پرستی ہے۔ جاپان کئی ہزار سال سے بدھ مت یا کنفیوشس کو مانتے آئے ہیں لیکن اپنے وطن کی محبت کے مقابلہ میں ان کی مذہبی ارادت وعقیدت کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ چند سال ہوئے جاپان کے ایک اعلےٰ سرکاری افسر نے یہ کہا تھا کہ "اگر مہاتما بدھ کنفیوشس کے ساتھ جوان کا لفٹنٹ ہو ہمارے ملک پر حملہ کریں تو ہم جاپانی اس وقت تک دم نہیں لیں گے جب تک کہ ہم حملہ آور روح اور اس کے لیڈروں کے پرخچے نہ اُڑا دیں"۔ اس لئے ظاہر ہے کہ جاپانی اگر مذہب اسلام میں دلچسپی لے رہے ہیں تو کسی اور غرض کے لئے نہیں بلکہ صرف اپنے دنیاوی مفاد کے لئے۔

جاپان کا سیاسی نصب العین

جب جاپان میں بہت سے لوگ مسلمان ہوجائیں گے تو جاپانی ایشیا اور افریقہ کے تیس کروڑ مسلمانوں کی ہمدردی حاصل کرسکتے ہیں۔ اس ہمدردی کی بدولت انہیں تین باتیں حاصل ہوجائیں گی۔ اوّل یہ کہ تمام اسلامی ممالک کی منڈیوں پر ان کا قبضہ ہو جائے گا۔ دوم وہ اسلامی ممالک کے کالجوں اور مدرسوں کے لئے اپنے پروفیسر بھیج سکیں گے جہاں انہیں فرزندانِ اسلام اور مشرقی ممالک کے باشندوں کو بین المللی اتحاد کا درس دینے کا موقع ملے گا۔ سوم وہ مشرقی ممالک کی فوجوں میں اپنے فوجی معلم بھیج سکیں گے۔

جاپان اور ٹرکی

جاپان وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ اس نے اسلامی ممالک میں اپنا اثر اور رسوخ بڑھانا شروع کردیا ہے۔ جب ٹرکی میں

ری حکومت قائم ہوگئی تو اس نے کچھ عرصہ کے بعد پہلی مرتبہ ترکوں کے دارالحکومت میں اپنا سفیر بھیج دیا۔ اسی طرح جاپان میں ں نے اپنا سفیر بھیج دیا۔ استنبول میں جاپانی مصنوعات کی نمائش کا اہتمام کیا گیا۔ گذشتہ چند سال کے دوران میں جاپان نے ں کے مختلف حصوں میں پارچہ بافی کے کئی کارخانے قائم کئے ہیں اور ترکی حکومت کے لئے جنگی جہاز بھی تیار کئے ہیں۔

جاپان اور افغانستان

کابل میں افغانستان اور جاپان کا ایک ایوانِ تجارت قائم کیا گیا ہے۔ افغان گورنمنٹ نے جاپانی انجنیئروں، پروفیسروں اور علموں کی خدمات حاصل کی ہیں جو افغانستان کو زمانہ کی رفتار کے مطابق ترقی کی شاہراہ پر لانے کے فرائض انجام دے ے ہیں۔ کابل میں جاپان کے پہلے تجارتی وفد کا قائد ایک جاپانی مسلمان تھا۔

جاپان عربستان اور ایران

جاپانی مدرسوں اور یونیورسٹیوں میں عرب ممالک کے طلبہ کو مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ ان کے قیام و طعام کے مصارف ربھی حکومت نے اپنے سر لے رکھا ہے۔ ہر سال جاپان کے بحری کالجوں میں ایرانی طلبہ کی ایک معقول تعداد داخل ہوتی ہے۔ مانہ دور نہیں جب حکومت ایران اپنی ریلوں کے بنانے اور معدنی وسائل کو ترقی دینے اور اپنی بری اور بحری فوج اور ی جمعیت کو فوجی تعلیم سے مستفید کرنے کے لئے جاپانی ماہرین کی خدمات حاصل کرے گی۔

غلام حیدر خاں

بھید

کیا بھید ہے اس میں؛
کیا بھید ہے اُس میں؛
ہر بات کی تہ میں کیا بھید چھپا ہے؛

ٹھیراؤ میں تاروں کے، ہواؤں کی فغاں میں،
کیا راز نہاں ہے؛
کیا بحر کی موجوں کی اذیت میں ہے پنہاں،
کیا میرے دلِ زار کی خلوت میں دبا ہے،
کیا بھید چھپا ہے؛

میرا جی

نوجوان اہلِ وطن کے نام

پھر زمانے پہ عیاں قوتِ ایماں کر دے / بت پرستانِ غلامی کو مسلماں کر دے
اس طرح ہو ترے خورشیدِ یقیں کی تابش / پرتوِ حق سے جو دنیا کو فروزاں کر دے
یوں نکل عرصۂ پیکار میں شمشیر بکف / کہ زمانے کو تو انگشت بدنداں کر دے
پھر ترے دل میں وہ ذوقِ تپش اندوزی ہو / ذرہ ذرہ کو جو خورشید بداماں کر دے
باغِ عالم میں دکھا دے وہ بہارِ جلوہ / غنچۂ قلبِ فسردہ کو جو خنداں کر دے
پھر زمانے میں ہو اس طرح ترا لطفِ عمیم / قطرہ دریا بنے ذرّے کو بیاباں کر دے
پھر تری ذات بنے مایۂ اعزازِ چمن / اپنی ہستی کو چمن والوں پہ قرباں کر دے
موت طاری ہے ترے جسم پہ اے محوِ سکوں / اُٹھ زمانے میں بپا شورشِ طوفاں کر دے
پھر ستاروں میں ترے نور سے پیدا ہو چمک / ماہ و خورشید کو کچھ اور بھی تاباں کر دے
پھر زمانہ ترے اعجاز کا قائل ہو جائے / اُٹھ خزف ریزوں کو پھر لعلِ درخشاں کر دے
دیکھ پھر چرخ پر آئے ہیں اُمنڈ کر بادل / فکرِ بے مایہ کو مستِ مئے عرفاں کر دے
کر نہ اس بزم میں ساقی کے تغافل کا گلہ / طلبِ مے کے لئے جان کو قرباں کر دے
اُٹھ کہ ہے وقتِ سحر! بادِ سحر کی صورت / غنچے غنچے کو چمن میں گلِ خنداں کر دے

دیکھ پھر اہلِ جہاں کی ہیں نگاہیں تجھ پر
ہوشؔ پھر اُٹھ کے کوئی کارِ نمایاں کر دے

محمد ابراہیم ہوشؔ کلکتہ

آسٹریائی گیت

دِل اور رُوح

یک خوشرو گل اندام حسینہ نے کھڑکی سے جھانکا۔

س نے مجھ سے میری روح مانگی۔ میں نے اُسے اپنا دل دے دیا۔

س نے مجھ سے میری روح مانگی۔ میں نے اُس سے مُنہ موڑ لیا۔

فاختہ

ایک فاختہ جو برف کی طرح سفید ہے۔ سبزہ زار میں اُتری۔ وہ نہانا چاہتی ہے۔

اس کے پر سنہرے ہیں۔ اس کا چہرہ دودھ کی طرح سفید ہے۔ آنکھیں زیتونی ہیں۔

اے فاختہ سبزہ زار کو نہ جا۔ آ۔ میرے ساتھ آ

اے فاختہ سبزہ زار کو نہ جا۔

بیوی

وہ شخص جسے نیک خصلت بیوی درکار ہو۔ اسے کھیل تماشوں میں اس کی تلاش نہیں کرنی چاہئے بلکہ گھر میں دیکھنا چاہئے۔ جہاں وہ اسے معمولی لباس میں نظر آئے گی۔

شام

چرواہے گلّوں کو لئے چلے جا رہے ہیں۔ وادی پر ایک سکوت چھایا ہوا ہے۔ زندگی کے آثار مٹ گئے ہیں۔

محبت

تم کہتے ہو کہ تم مجھ سے اس لئے محبت نہیں کرتے کہ میں نے محبت کرنے میں پہل نہیں کی۔

جو پھول سب سے پہلے کھلتا ہے اُسے ہوا کے جھونکے پہلے ہی گرا دیتے ہیں۔

جُدائی

جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ تم دُنیا میں موجود ہو لیکن میرے لئے مر چکے ہو۔

تو میرا دل رنج و غم سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔

تاریکی

تاریکی بڑھتی جا رہی ہے۔

آہ۔ میرے جنگل سے نکلتے ہی تاریکی بڑھنے لگی ہے۔

اے گاؤں کی خوبرو دوشیزہ! آج رات مجھے پناہ دے۔

اُف کس بلا کی تاریکی ہے

اُف کیسی رات ہے اور کتنی تاریک اور کس قدر پُرسکوں۔

کاش میرے جذبات میں بھی ایسا ہی سکون ہوتا۔

محمد یحیٰی صدیقی

کنجِ عافیت

مجھے دُنیا سے نفرت بھی نہیں ہے
مگر کچھ اس سے اُلفت بھی نہیں ہے
مرے دل کی فقط یہ ہے تمنّا
رہوں جا کر کسی جنگل میں تنہا
جہاں خاموش چشمے بہہ رہے ہوں
کنول کے پھول جن میں تیرتے ہوں
جہاں اُڑتی ہوں ننھی مُنّی چڑیاں
جہاں ہنستی رہیں ہر وقت کلیاں
جہاں اُڑتی ہوں بگلوں کی قطاریں
جہاں رہتی ہوں ساون کی بہاریں
جہاں کویل خوشی میں گا رہی ہو
پپیہے کی صدا بھی آ رہی ہو
جہاں ہوں سبز شاخیں لہلہاتی
پہاڑی ندیاں ہوں گیت گاتی
جہاں ہوں تتلیوں کے جُھنڈ اڑتے
جہاں ہوں خوشنما پھولوں کے تختے

جہاں ناکام رہتی ہو عداوت
جہاں گمنام رہتی ہو شقاوت
وہاں چھوٹا سا اِک میرا مکاں ہو

"ر۔ب"

رات

(ولیم بلیک کی ایک نظم کا ترجمہ)

آفتاب غروب ہو رہا ہے اور زہرہ چمک رہا ہے۔ طیور اپنے اپنے آشیانوں میں خاموش دبکے پڑے ہیں۔ اب مجھے بھی
لم تلاش کرنا چاہیے۔
مہتاب تر و تازہ پھول کے مانند آسمان کے بلند خلوت کدے میں خاموش جلوہ گر جوشِ انبساط سے رات کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔

اے ہرے بھرے سرسبز اور شاداب کھیتو اور خوشگوار درختوں کے جھنڈو! الوداع۔ تمہارے سائے میں دن کو تو ریوڑ آرام پاتے
ں اور بکری کے بچے کلیلیں کرتے ہیں۔ مگر رات کو یہاں فرشتوں کے قدم بھی آہستہ آہستہ پڑتے ہیں۔ وہ چپکے چپکے ہر ایک شگوفے، پتے
رکلی اور سونے والے ایک ایک جاندار پر خدا کی رحمت کا نور برساتے ہیں اور کائنات میں آسودگی کی ایک بے پایاں لہر دوڑا دیتے ہیں۔
وہ ان تمام خاموش گھونسلوں میں جہاں پرندے بےفکر اور مگن سو رہے ہیں جھانکتے ہیں۔ وہ درندوں کے ہر ایک غار میں جاکر
ہیں غریب چوپایوں کو نقصان پہنچانے سے باز رکھتے ہیں۔
رات کے سناٹے میں جب تمام دنیا آرام کرتی ہے اگر وہ کسی کو آنسو بہاتے دیکھتے ہیں تو اسے نیند کی شیریں آغوش میں سلا دیتے
ں۔ اور اس کے سرہانے بیٹھ جاتے ہیں۔ جب بھیڑیے اور شیر اپنے شکار کی تلاش میں دہاڑتے ہیں، چیختے اور چلاتے ہیں تو ان فرشتو
ان وحشیوں پر بھی رحم آجاتا ہے، وہ آٹھ آٹھ آنسو روتے ہیں اور ان کی بھوک فرو کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ وہ بھیڑوں کو ان سے
فوظ رکھتے ہیں لیکن اگر یہ خونخوار جانور ان پر حملہ کر دیتے ہیں۔ تو فرشتے ان کی نازک روح کو بڑی حفاظت کے ساتھ نئی دنیا میں پہنچا
یتے ہیں۔ اس پاک دنیا میں جہاں شیروں کی خوں فشاں آنکھوں سے رحم اور شفقت کے آنسو ٹپکیں گے۔ اور وہ مقتول جانوروں
ا چیخ پکار سن کر ان پر ترس کھائیں گے ــــــــ جہاں وہ بھیڑوں کے باڑے کی خود حفاظت کریں گے اور کہیں گے :۔
"ہمارے غصے کو یسوع کے رحم نے اور ہمارے عیوب کو اس کی نیکیوں نے اس غیر فانی دنیا سے نکال دیا ہے۔"
"اب ہم ممیاتے ہوئے بکروٹے کے پاس آرام سے سو سکتے ہیں۔ اب ہم حیاتِ ابدی کے دریا میں نہا چکے ہیں۔"
"ہم بھیڑوں کے باڑے کی حفاظت کریں گے اور اچھے اچھے کام انجام دیں گے۔"

امرت لال عندلیب

برکھا رُت میں

پیت ہماری ریت
رے ساجن!
پیت ہماری ریت

(۱)

نیلی نیلی بدلی چھائی
ٹھنڈی ٹھنڈی پُروا آئی
ہلکی ہلکی بوندیں برسیں
نین ترے درشن کو ترسیں
آ، مل گائیں گیت
رے ساجن!
پیت ہماری ریت

(۲)

مند مند کلیاں مسکائیں
جھوم جھوم بیلیں لہرائیں
تجھ بن رہ رہ جی گھبرائے
تُو آئے تو من کل پائے
یہ اگنی ہو شیت
رے ساجن!
پیت ہماری ریت

(۳)

آ مل مل کر جھولا جھولیں
جگ کا اِک اِک سنکٹ بھولیں
سیر کریں ہم پریم نگر کی
آ جا برکھا کی یہ رُت بھی
جائے نہ یونہی بیت
رے ساجن!
پیت ہماری ریت

امر چند قیس جالندھری

اچھوت

(ٹیگور کا تازہ ترین افسانہ)

بسنت رُت کی پہلی پورنماشی تھی۔ جنوب سے آنے والی ہوا آم کے مور کی کیف آور خوشبو سے لدی ہوئی کمرے کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ ایک بیکل کوئل کی آواز جو باغ میں تالاب کے کنارے اِلچی کے ایک پرانے درخت کی گھنی اور تاریک شاخوں میں بیٹھی کُوک رہی تھی، ہنمیتا کی خاموش خوابگاہ کی فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔

فضا کی بے چینی ہنمیتا پر بھی اپنا اثر کر رہی تھی۔ وہ کبھی اپنی بیوی کے بالوں کی ایک لٹ کھول کر اپنی اُنگلی کے گرد لپیٹ لیتا اور پھر اُنہیں چھوڑ دیتا تھا۔ کبھی اُس کی باہیں پکڑ کر طلائی کڑوں کو آپس میں ٹکراتا اور کبھی اُس کے بالوں میں گندھے ہوئے چنبیلی کے پھول نکال نکال کر اُس کی پیشانی پر ڈال دیتا تھا۔ غرض یہ کہ نسیم بہار کی رُوح جو باہر باغ میں نازک ٹہنیوں کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر کبھی اِدھر کبھی اُدھر جھکا رہی تھی کہ سوتے ہوئے پھول بیدار ہو جائیں، اس وقت ہنمیتا کے دل کو بھی گدگدا رہی تھی لیکن اس کے برعکس اُس کی بیوی کُسم جس کی نظریں روشن خلا پر گڑی ہوئی تھیں، کھڑکی کے قریب پلنگ کی پٹی پر خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کے شوہر کی یہ محبت بھری حرکات آج اُس کے دل کے کسی تار کو نہیں چھیڑ رہی تھیں۔ آخر ہنمیتا نے اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر انہیں بھینچتے ہوئے کہا "کُسم آج تم مجھ سے دُور کہاں چلی گئی ہو؟ . . . . . . اتنی دُور کہ تمہیں دوربین سے بھی دیکھوں تو تم بہت بڑے فاصلے پر ایک چھوٹا سا نقطہ معلوم ہو گی۔ مجھے آج تمہارے قرب کی کتنی خواہش ہے! دیکھو تو! رات کس قدر دلفریب ہے۔"

کُسم نے افسردگی سے اپنی نظریں آسمان پر سے ہٹا کر شوہر کے چہرے پر جمادیں اور کہا "مجھے ایک ایسا منتر یاد ہے جس سے بہار، چاندنی اور فضا کا سارا حُسن ایک لمحے میں غائب کر دیا جا سکتا ہے۔"

ہنمیتا نے انگڑائی لیتے ہوئے جواب دیا "اگر یہ صحیح ہے تو بہتر یہ ہوگا کہ ایسے منتر کو تم اپنے پاس ہی رکھو۔ ہاں! اگر تمہیں کوئی ایسا منتر بھی آتا ہے جس سے ہفتے میں دو تین اتوار لائے جا سکیں یا رات کو اگلے دن کی شام تک طول دیا جا سکے تو خوشی سے اُسے آزماؤ" یہ کہتے ہوئے اُس نے کُسم کو اپنے قریب کھینچنے کی کوشش کی۔

کُسم اس کی گرفت سے بچنے کے لئے ایک طرف کو ہٹتی ہوئی بولی "مَیں آج تم پر ایک راز افشا کرنا چاہتی ہوں جسے میرا ارادہ تھا کہ بسترِ مرگ ہی پر ظاہر کروں گی لیکن میں محسوس کرتی ہوں کہ میں اس وقت اپنی سزا زیادہ آسانی سے برداشت کر سکوں گی۔"

قریب تھا کہ کسم کا شوہر جواسے متعلق جے دیو کی محبت آفریں غزلوں میں سے ایک شعر پڑھ کر اس کی پژمردگی کو ہنسی کے ایک ریلے میں بہالے۔ مگر کسی کی کھڑاؤں کی آواز نے جو اس کے کمرے کی طرف آنے والی سیڑھیوں پر تیزی کے ساتھ چڑھ رہا تھا، اس کے خیالات کو منتشر کردیا۔ اور وہ ٹھٹک کر رہ گیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کے بوڑھے باپ ہری ہر کرجی کا رات کے وقت اس تیزی اور غصے میں اُدھر آنا نیک شگون نہیں تھا۔

ہری ہر کرجی کمرے کے دروازے پر پہنچ کر غصے سے کانپتی ہوئی آواز میں پکارا "ہمنیتا! اپنی بیوی کو فوراً اس گھر سے نکال دو!"

ہمنیتا کی سراپا استفہام نظریں کسم کے چہرے پر جم گئیں۔ لیکن وہاں حیرت و استعجاب کا کوئی نشان نہ تھا۔ البتہ جب اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس دُنیائے دُوں سے باہر، بہت دُور نکل جانا چاہتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کوئل کی آواز بدستور آرہی تھی لیکن اُسے کوئی سُن نہیں رہا تھا۔ دُنیا کس قدر حسین ہے اور کتنی بے ثبات!!

(۲)

ہمنیتا باپ سے گفتگو کرکے واپس لوٹا تو اس نے بیوی سے پوچھا "کیوں! کیا یہ درست ہے؟"

کسم نے جواب دیا "بالکل درست۔"

"تم نے اتنا عرصہ مجھے اندھیرے میں کیوں رکھا؟"

"میں بہت پاپی ہوں۔ میں نے بارہا کوشش کی لیکن جرأت نہ ہوئی۔"

"اچھا اب سب کچھ مجھ سے صاف صاف کہہ دو۔"

کسم نے متانت اور استقلال سے جیسے کوئی جادوگر دہکتے ہوئے کوئلوں پر چلنے کا تماشا دکھا رہا ہو، سارا قصّہ اُسے سنایا۔ اور ایک لمحے کے لئے بھی یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ ان واقعات کو بیان کرنا اُسے سخت اذیت پہنچا رہا ہے۔

ہمنیتا دم بخود سنتا رہا اور جب کسم ختم کرچکی تو کچھ کہے بغیر اُٹھ کر باہر نکل گیا۔ کسم نے اس وقت محسوس کیا کہ اُس کا شوہر اُس سے ہمیشہ کے لئے چھن گیا۔ لیکن اس میں کوئی چیز اُسے غیر متوقع نظر نہیں آتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ روزمرہ کی زندگی کا یہ بھی ایک ادنےٰ سا واقعہ ہے۔ فرق صرف یہ تھا کہ جہاں دنیا پہلے خوشیوں کا ایک معمورہ تھی، اب محض ایک خلا تھی جس میں سے محبت و درد سب کچھ نکال لیا گیا ہو!

ہمنیتا کی محبت کی یادیں تیرتی ہوئی اُس کے دل میں آئیں اور ایک خفیف سا خشک تبسم اُس کے لبوں پر چھوڑ گئیں۔ مگر یہ تبسم ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اُس کی ہستی کے ایک سرے سے دُوسرے سرے تک چاقو کا ایک گہرا زخم لگا دیا گیا ہے! محبت جسے وہ اس

قدر عمیق اور اتھاہ محبت تھی، جس میں ذرا سی جدائی ایک پہاڑ تھی اور وصال کا ہر ایک لمحہ ایک مسرتِ جاوید۔ جو زمان و مکان کی قیود سے سراسر آزاد معلوم ہوتی تھی۔ . . . . . . کیا اُس ساری محبت کی کائنات صرف اتنی تھی کہ سماج کے ظالم ہاتھوں کا ایک ادنیٰ لمس اُس کی ساری عظمت کو مٹھی بھر خاک میں تبدیل کر دے!!

ابھی چند منٹ پہلے ہنمیتا نے وفورِ محبت سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا تھا "رات کتنی دلفریب ہے!" رات اب بھی اُتنی ہی دلفریب تھی! اُسی کوئل کی آواز اب بھی آ رہی تھی! جنوب سے آنے والی ہوا اب بھی مسہری کی جالی سے کھیل رہی تھی اور چاندنی اب بھی محبت کے نور میں نہائی ہوئی دوشیزہ کی طرح پلنگ کے ایک طرف لیٹی ہوئی تھی! کیا یہ سب دھوکا تھا محض ایک سراب؛

محبت بالکل جھوٹی چیز ہے . . . . گفتار اور کردار دونوں میں مجھ سے کہیں زیادہ جھوٹی!" یہ تھے کسُم کے جذبات۔

(۳)

اگلے دن صبح ہوتے ہی ہنمیتا جو رات بھر جاگتے رہنے کی وجہ سے بے حد پریشان اور کسل مند نظر آتا تھا، بوڑھے پیارے سکھ شل کے مکان پر جا پہنچا۔ پیارے سے نے نرمی سے پوچھا "کہو بھئی کیا خبر ہے؟"

ہنمیتا جس کا سارا جسم غصے سے کانپ رہا تھا، صرف اتنا ہی کہہ سکا "تم نے ہمارے گھرانے کو بھرشٹ کر دیا ہے اور ہمارا گھر تباہ و برباد۔ لیکن یاد رکھو! تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔" آواز اُس کے گلے میں اٹک گئی تھی۔

پیارے سے نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "اور تم نے؟ تم لوگوں نے تو میرے گھرانے کو پوتر کر دیا۔ مجھے سماج میں رکھ لیا۔ ہمیں تباہی سے بچا لیا! ہے نا؟ کتنے نیک اور میرے کتنے خیر خواہ ہو تم لوگ!"

اگر ہنمیتا کا غصہ پرانے زمانے کے برہمنوں کے سراپ جتنا مؤثر ہوتا تو پیارے سے وہیں بھسم ہو کر رہ گیا ہوتا۔ لیکن حالت یہ تھی کہ جہاں نوجوان ہنمیتا کا قلب انتہائے غیظ و غضب سے بھُن رہا تھا وہاں بوڑھا پیارے سے نہایت اطمینان سے مسکرا رہا تھا۔

ہنمیتا نے وفورِ غضب سے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں پوچھا "کیا میں نے کسی طرح کبھی تمہیں کوئی نقصان پہنچایا ہے؟"

پیارے سے نے جواب دیا "کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ میری لڑکی، میری اکلوتی بچی، میری ساری متاعِ حیات نے تمہارے باپ کو کیا نقصان پہنچایا تھا؟ اچھا خیر! تمہیں معلوم نہیں ہے۔ بیٹھ جاؤ اور غصے کو ضبط کر کے سنو۔ اگرچہ یہ کہانی لمبی ہے لیکن دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

"جس وقت میرا داماد اپنی بیوی کے زیور چرا کر ولائت بھاگ گیا تھا تو تم ابھی بچے تھے۔ لیکن شاید تمہیں کچھ یاد ہو جب پانچ سال بعد وہ بیرسٹر بن کر واپس آیا تھا تو ہمارے گاؤں میں بہت شور مچا تھا۔ لیکن نہیں۔ تم تو اس وقت کلکتے میں سکول میں پڑھ رہے ہو گے۔ تمہارے باپ نے برادری کو اکٹھا کیا، سب کو بھڑکایا اور فیصلہ کیا کہ اگر میں اپنی لڑکی کو اُس کے شوہر کے ہاں

ا فیصلہ کروں تو مجھے ساری عمر اُس سے کوئی سروکار نہیں رکھنا ہوگا . . . . .

"میں نے اُس کی بہت منتیں کیں۔ اُس کے پاؤں پڑا۔ اپنے آپ کو بہت ہی ذلیل کیا اور کہا کہ ایک بار ہمیں معاف کردو۔ پنے داماد کو اس بات پر راضی کرلوں گا کہ جو پرائشچت برادری کے لوگ تجویز کریں گے اُسے اُس میں کوئی عذر نہیں ہوگا۔ صرف برادری میں رکھ لیا جائے۔ لیکن تمہارا باپ اڑا رہا۔ مجھے یہ حوصلہ نہیں تھا کہ میں اپنی اکلوتی بچی کو تمام عمر کے لئے چھوڑ دیتا نے جاتی اور برادری کو چھوڑ دیا اور کلکتے میں آکر آباد ہوگیا۔

"لیکن سماج کے ظلم نے یہاں بھی ہمارا پیچھا کیا۔ جب میرے بھتیجے کی منگنی ہوئی تو تمہارے باپ نے لڑکی والوں سے مل کر فسخ کرادی۔ وہ وقت تھا جب میرے صبر کا پیمانہ چھلک گیا اور میں نے قسم کھائی کہ اگر میں اس کا بدلہ نہ لوں تو برہمن کا پوت نہیں۔

"اب تمہیں واقعات کا تھوڑا سا علم ہوا ہے۔ غور سے سنو گے تو کہانی کا باقی حصہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ پاؤ گے۔

"جب تم کالج میں داخل ہوئے تو بپرداس جسے میں چچا کہہ کر پکارا کرتا تھا، تمہارے مکان کے قریب ہی رہا کرتا تھا۔ اُس اپنے گھر ایک نوجوان کائستھ لڑکی کو جو ایامِ طفلی ہی میں بیوہ ہوگئی تھی، پناہ دے رکھی تھی۔ لڑکی اس قدر رُندر تھی کہ چچا بپرداس سے کالج کے نوجوانوں کی توجہات سے بچانے کے لئے کافی سردردی کرنا پڑتی تھی۔ وہ لڑکی کسم تھی۔

لیکن ایک نوجوان لڑکی کے لئے ایک بوڑھے آدمی کی آنکھوں میں دھول جھونک دینا کون سا مشکل کام ہے! اُسے اکثر سے سکھانے یا اِدھر اُدھر کے کاموں کے لئے چھت پر جانا پڑتا تھا۔ اُدھر تمہارا یہ حال تھا کہ چھت پر بیٹھے بغیر تمہارا پڑھائی میں جی لگتا تھا۔

"چھت ہی چھت پر تم دونوں میں کیا کیا گزری۔ یہ تو تمہیں ہی معلوم ہوگا۔ لیکن گھر میں لڑکی کے طور طریقوں سے بپرداس کے میں کچھ شبہ سا پیدا ہونے لگا۔ گھر کے کام کاج میں اُس کا دل لگتا ہی نہ تھا۔ بھوک جاتی رہی تھی اور چہرہ روز بروز بے رونق ہا تھا۔ ایک دن بپرداس نے اُسے اکیلے بلاوجہ روتے دیکھا۔ بیچارا بہت پریشان ہوا۔ آخر اُسے معلوم ہوگیا کہ تم دونوں میں ت ہی چھت پر کیا راز و نیاز ہو رہے تھے۔ اُسے یہ بھی پتا چلا کہ تم اپنی تعلیم سے روز بروز لاپروا ہو رہے تھے۔ کالج سے اکثر غیر حاضر ہوتے تھے اور تمہاری زندگی کا صرف ایک ہی مقصد رہ گیا تھا یعنی چھت پر برساتی کے نیچے کتاب سامنے رکھ کر اکیلے بیٹھے رہنا۔

"بپرداس اپنی اس پریشانی میں مجھ سے مشورہ لینے کے لئے آیا۔ میں نے اُس سے کہا کہ چچا تم کتنی مدت سے بنارس یاترا کا ارادہ کر رہے ہو۔ اب چلے جاؤ اور لڑکی کو میرے پاس چھوڑ جاؤ۔ میں اُس کی نگہداشت کروں گا۔ وہ میرا بہت شکرگزار ہوا اور یاترا کے لئے چلا گیا۔ میں نے کسم کو اپنے دوست سرتی چیٹر جی کے گھر بھیج دیا جو میرے ساتھ والے مکان میں رہتے تھے اور یہ ظاہر کرنا شروع کر دیا کہ کسم انہی کی لڑکی ہے۔

اس کا کیا نتیجہ ہُوا۔ تمہیں مجھ سے زیادہ اچھی طرح معلوم ہے۔ بہرحال مجھے یہ سارے واقعات تمہیں سنا کے بہت خوشی ہوئی ہے۔ یہ ایک رومان معلوم ہوتے ہیں۔ اگر لکھے جائیں تو بھی شاید رومان سمجھ کر پڑھے جائیں گے۔ لیکن مجھے لکھنا نہیں آتا۔ میرا بھتیجا کہانیاں لکھا کرتا ہے۔ شاید کسی دن میں اس سے یہ کہانی لکھنے کے لئے کہوں۔ لیکن اگر میں اور تم دونوں مل کر لکھیں تو شاید کوئی بھی اس سے بہتر نہ لکھ سکے کیونکہ اس کا آخری حصّہ مجھے ابھی تک معلوم نہیں ہے۔"

ہنمیتا نے پیارے کے آخری الفاظ اپنے خیالات کی رَو میں توجہ سے نہیں سُنے تھے۔ اُس نے پوچھا "کسُم نے ایسی شادی کے خلاف کوئی آواز نہیں اُٹھائی تھی؟"

پیارے نے جواب دیا "اس کا جواب دینا میرے لئے بہت مشکل ہے۔ تمہارے تجربات زندگی تمہاری مدد کریں گے تم جانتے ہو عورت کیا چیز ہے۔ جب وہ 'ہاں' کہنے کے لئے مر رہی ہوتی ہے تو بھی زبان سے 'نہیں' ہی کہتی ہے جب کسُم پہلے پہل نئے گھر میں آئی تھی اور تمہارے روز کے درشنوں سے محروم ہوگئی تھی تو جس قدر قلق اُسے ہُوا ہوگا اُس کا اندازہ تم خود لگا سکتے ہو۔ اُس کے بعد مجھے معلوم ہوگیا کہ تم نے اُس کے ٹھور ٹھکانے کا پتہ چلا لیا ہے۔ تم کالج جاتے جاتے راستہ بھول جایا کرتے تھے اور کتابیں ہاتھ میں لئے سری پتی کے مکان کے سامنے یوں کھڑے ہوتے تھے جیسے کوئی کھوئی ہوئی چیز تلاش کر رہا ہو۔ میں اس سے یہ تو سمجھ ہی نہیں سکتا تھا کہ تم وہاں اپنے کالج کا راستہ ڈھونڈ رہے ہو۔ اس لئے کہ شرفا کی کھڑکیوں میں کا راستہ صرف پردار کیڑوں اور محبت زدہ دلوں کے لئے مخصوص ہے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود مجھے بیچاری لڑکی کو اس قدر اذیت میں دیکھ کر اور تمہاری تعلیم کے حرج کا خیال کر کے بے حد رنج تھا۔

"میں ایک دن سری پتی کے ہاں گیا اور کسُم کو علیحدہ بٹھا کر کہا "بیٹی! تمہیں اپنے بوڑھے چچا سے اتنا حجاب واجب نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے دِل کی یہ بُری حالت کس وجہ سے ہے۔ اُدھر اُس نوجوان کا بھی بُرا حال ہے اگر میں تمہارے ملاپ میں کچھ مدد کر سکوں تو مجھے اس سے بہت خوشی ہوگی۔" کسُم رونے لگی اور کمرے سے بھاگ گئی لیکن میں برابر وہاں جاتا رہا اور کسُم سے تمہارے متعلق کہتا سنتا رہا۔ آخر میں نے اُس کی حیا پر فتح پالی اور اُسے یقین دلایا کہ سوائے شادی کے اور کوئی چارہ نہیں ہے لیکن پھر بھی وہ یہی کہتی رہی 'یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟' رفتہ رفتہ جب ہم اپنے تمام موافق و مخالف دلائل ختم کر چکے تو کسُم نے مجھے تمہاری رائے معلوم کرنے کے لئے کہا۔ میں نے جواب دیا 'اُس بیچارے کا تو پہلے ہی بُرا حال ہے۔ اُسے ان معاملات کے متعلق کچھ بتانا اُس کی ساری عمر کے ارمانوں اور آرزوؤں کو خاک میں ملانا ہوگا۔ جب ایک بار شادی ہو جائے گی تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ کیونکہ کسی دوسرے آدمی کو اصلیت معلوم ہو جانے کا کوئی امکان نہیں۔' میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ کسُم سب کچھ سمجھ گئی تھی یا نہیں لیکن وہ چُپ چاپ آنسو بہاتی رہی۔ آخر جب میں نے کہا "اچھا تو یہ فیصلہ ہو گیا" تو وہ بالکل پھُوٹ پڑی اور خوب روئی۔

"یہ تھی صورت حالات جب میں نے سری پتی کو تمہارے باپ کے پاس شادی کی تجویز پیش کرنے کے لئے بھیجا۔ جیسا کہ مجھے معلوم ہے تم نے قبول کرنے میں کوئی دیر نہیں لگائی اور معاملہ طے پا گیا۔

"مقررہ دن سے کچھ روز پہلے کشم بدل گئی اور کہنے لگی "چچا! پرماتما کے لئے میرا بیاہ روک دو! میں نے اُسے سمجھایا " اب جو بات پکی ہو چکی ہے۔ سب انتظامات مکمل ہیں۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میں اُن لوگوں کو کیا جواب دوں"۔ وہ روتے ہوئے بولی "مجھے کہیں بھیج دو اور ان سے کہہ دو کہ میں مرگئی ہوں"۔ مجھے ایک اور بات سوجھی اور میں نے پیار سے اُس سے کہا " اُس غریب نوجوان کا بھی تو خیال کرو۔ اگر میں عین اُس وقت جب کہ اُس کی عمر بھر کی آرزوئیں پوری ہونے والی ہیں اُسے تمہاری موت کی اطلاع دونگا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسرے خط میں مجھے تمہیں اُس کی موت کی اطلاع دینی پڑے گی اور واپسی ڈاک سے مجھے تمہاری موت کی خبر سُننی پڑے گی۔ کیا تم چاہتی ہو کہ میں اس بڑھاپے میں برہم ہتیا اور استری ہتیا کے خوفناک جُرموں کے داغ اپنی روح پر لگا لوں؟

"شبھ دن اور نیک گھڑی میں تمہارا بیاہ کر دیا گیا اور میری قسم پوری ہو گئی۔ باقی سب کچھ تم خود جانتے ہو"۔

ہنمیتا نے نہایت افسردگی سے پوچھا " جو کچھ تمہیں ہم سے کرنا تھا وہ تو تم کر چکے تھے۔ لیکن بعد میں تم نے اِسے ظاہر کیوں کیا؟"

"جب مجھے معلوم ہُوا کہ تمہاری بہن کی بات ٹھہر چکی ہے تو میرے ضمیر نے مجھے پھر ستانا شروع کر دیا۔ ایک برہمن کا جنم تو مجھے اس لئے بھرشٹ کرنا تھا کہ میں نے قسم کھا رکھی تھی۔ اب میرا یہ بھی فرض تھا کہ ایک دوسرے برہمن کے دھرم کو بھرشٹ ہونے سے جس طرح ہو سکے بچاؤں۔ اِس لئے میں نے لڑکے والوں کو لکھ دیا کہ میرے پاس ہنمیتا مکرجی کی بیوی کے اچھوت ہونے کا ثبوت موجود ہے"۔

ہنمیتا نے قہر وغضب کے جذبات پر بمشکل قابو پاتے ہوئے کہا " اب جو میں اس لڑکی کو نکال دوں تو اُس کا کیا بنے گا۔ کیا تم اُسے پناہ دو گے؟"

"میں نے صرف وہی کیا ہے جو میرا فرض تھا۔ لوگوں کی چھوڑی ہوئی بیویوں کو پناہ دینا میرا کام نہیں" یہ کہتے ہوئے پیارے نے نوکر کو آواز دی " ادھر آؤ۔ ہنمیتا بابو کے لئے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس لاؤ، جلدی"۔

ہنمیتا نے اس خنک مہمان نوازی کا انتظار نہ کیا۔

(۴)

پورنماشی سے پانچویں رات تھی۔ کوئل کی کُوکُو آج خاموش تھی۔ لیچی کا درخت تالاب کے کنارے پر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے تاریک پس منظر پر سیاہی کا ایک دھبہ ہو۔ بادِ جنوب چل رہی تھی لیکن اندھیری اور ڈراؤنی رات میں اُس کی سائیں سائیں

بھوتوں کی بھیانک آواز معلوم ہوتی تھی۔ ستارے تاریکی پر یوں نظریں جمائے ہوئے تھے جیسے کسی غیر المعقول سوال کا حل تلاش کر رہے ہیں۔

ہنمیتا کی خواب گاہ میں روشنی نہ تھی۔ وہ اپنے پلنگ کی پٹی پر بیٹھا باہر تاریکی پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ فرش پر کسُم اس کے قدموں پر جھکی ہوئی تھی۔ وقت کی رفتار کسی طوفانی سمندر کی طرح جو یکایک ساکن و خاموش ہو جائے، دفعتہً رُک گئی تھی . . . . گویا وہ اُن دو ہستیوں کی تصویر کے نظارے میں محو ہو گیا تھا جو تقدیر کا مصور رات کے غیر فانی پردے پر پیش کر رہا تھا . . . . دو خاموش اور ساکت ہستیاں جن کے گرد جذبات کا ایک طوفان موجزن تھا . . . ایک منصف اور دوسری دادخواہ!

معاً کھڑاؤں کی آواز آنے لگی اور آنِ واحد میں ہری ہر نے دروازے سے آواز دی "تم اب کیا کر رہے ہو۔ نکالا کیوں نہیں اس چھوکری کو؟"

ہری ہر کی گرج سن کر کسُم اپنے شوہر کے پاؤں سے لپٹ گئی۔ جب اس نے فقرہ ختم کیا تو کسُم نے ہنمیتا کے پاؤں کی دھول ماتھے کو لگا کر آخری نمسکار کی اور جانے کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

ہنمیتا نے جوش سے جواب دیا "میں اپنی دھرم پتنی کو نہیں نکالوں گا!"

ہری ہر گرجا۔ "تو کیا ہمارے اونچے برن کو بھرشٹ کر دو گے؟"

"جات پات کی اونچ نیچ میں میرا وشواس نہیں۔"

"اچھا تو پھر تم دونوں اس گھر سے منہ کالا کر جاؤ!"

(ٹیگور)

چوہدری محمد اقبال بی۔ اے
(ملیگ)

مقابلۂ حق و باطل

(جس میں سیرت حضرت امام حسین و کردارِ یزید کا مقابلہ بصورتِ مکالمہ درج ہے)

مقابلہ غلط و حق کا ہے خلافِ اُمید / کہاں حسین کی ہستی، کہاں یزید پلید
حسین دین سراپا، یزید دنیا ہے / حسین پاک و مصفا، پلید دنیا ہے
ہزار ظلم ہوئے ایک مردِ برحق پر / چلا نہ زور زمانے کا کچھ مگر حق پر
قدم، کہ جادۂ حق پر تھا، ڈگمگا نہ سکا / کوئی بھی زلزلہ اُس کوہ کو ہلا نہ سکا

صداقتوں کے بہت سے نشان ہوتے ہیں / کہ اک حسین کے سو امتحان ہوتے ہیں
وہی ہے اصل جو سو آنچ میں رہے باقی / ہزار حشر ہوں پھر جانچ میں رہے باقی

حسین آئے نظر کربلا کے میداں میں / خدا نے رکھے ہیں کیا کیا کمال انساں میں
ہوا خلاف، زمیں غیر، آسماں دشمن / خدا کا دوست اِدھر ہے، اُدھر جہاں دشمن
مگر نہ خوف ہے کوئی نہ کوئی اندیشہ / کھڑا ہوا ہے کوئی کوہ استقامت کا

اثر وہ رکھتا ہے یہ واقعہ حقیقت میں / کہ روح پھونک دے مردہ عروقِ ملت میں
مگر سنا ہی نہیں واقعہ شہادت کا / ابھی لیا ہی نہیں درس، عزم و ہمت کا
خطیب نے ابھی یہ ماجرا کہا ہی نہیں / ہمارے کان حقیقت سے آشنا ہی نہیں
ہزار حیف کہ وہ قوم پست ہمت ہو / کہ جس کے سامنے شبیر کی شہادت ہو

یزید کا دعویٰ اور مطالبہ

کہا یزید نے سلطانِ ذی وقار ہوں مَیں — عظیم رتبہ شہنشاہ و تاجدار ہوں مَیں
پناہ مانگتی ہے خلق میری قوّت سے — جہان لرزہ براندام میری ہیبت سے
زمانہ آ کے جھکاتا ہے سَر مرے آگے — کوئی اُٹھا نہیں سکتا نظر مرے آگے
مرے اشارے میں اہلِ جہاں کی موت و حیات — قضائے مبرم و تقدیر ہے مری ہر بات
مرے حضور میں کس کو مجالِ چشم زدن — کمالِ بے ادبی ہے خیالِ چشم زدن
زبان پر جو مری حکم ہو وہی حق ہے — نہیں ہیں جانتا اُس کے سوا کوئی حق ہے
جو میرا حکم نہ مانے اُسے دکھا دوں گا — کہ نام اُس کا زمانے سے مَیں مٹا دوں گا
حسین! حکم میں دیتا ہوں تم کو بیعت کا — اسی کو فیصلہ سمجھو تم اپنی قسمت کا
تمہیں یہ ماننا ہو گا کہ میں خلیفہ ہوں — کہ جانشین میں اِک نائبِ خدا کا ہوں
ثبوت دینا پڑے گا تمہیں عقیدت کا — حلف اُٹھانا پڑے گا تمہیں اطاعت کا
حسین! ورنہ تمہیں میں تباہ کر دوں گا — سمجھ لو اچھی طرح، گردِ راہ کر دوں گا
تمہارا نام نہ رکھوں گا میں زمانے میں — کسی کو باقی نہ چھوڑوں گا میں گھرانے میں
نہ آ کے روئے گا کوئی تمہاری غربت پر — چراغ بھی نہ جلائے گا کوئی تربت پر
نہ حکم مانے جسے ہو نہ اپنی جان عزیز — نہ ساتھ جان کے ہو اپنا خاندان عزیز

جو بات مانو بہت تم کو مال و زر دوں گا — بہت غریب ہو تم کو امیر کر دوں گا
حسین! آؤ مرے ہاتھ پر کرو بیعت — ہے میرے ہاتھ میں دُنیا کی وقعت و عزت

حضرت امام کی تعلیم اور جواب

شہیدِ اعظمِ توحید نے یہ فرمایا — یزید! اپنی حکومت سے تو ہمیں نہ ڈرا

یہاں ہے خوف کسے غیر کی خدائی کا
ہے شرک نام، اسی ننگِ انتہائی کا
یزید اور خلیفہ، نبیِ رحمت کا
پلید اور خلیفہ، نبیِ رحمت کا!!
عجب ہے ظلم کہ ظلمت ہو روشنی کی جگہ!
یہ فاسق! اور ہو اللہ کے نبی کی جگہ!
حسین اور تری بیعت، خدا کی شان ہی یہ
دلِ حسین کا کیا کوئی امتحان ہے یہ
اگر یہی ہو تو سو امتحان اور سہی
کہ میرے ساتھ مرا خاندان اور سہی
ارے اسیرِ ہوس! بندۂ خدا ہے حسین
ازل سے غیر کا قائل نہیں ہؤا ہے حسین
جسے خدا نے بڑھایا وہ گھٹ نہیں سکتا
قدم حسین کا پیچھے کو ہٹ نہیں سکتا

جو راہِ حق میں مرے وہ ہزار بار مرے
جو بار بار ہو زندہ تو بار بار مرے
کہ لطفِ زیست ہے حق پر نثار ہونے میں
دلوں کے خون سے پیدا بہار ہونے میں

نہ خوفِ غیر ہے ہم کو نہ حرصِ لعل و گہر
حسین طالبِ دُنیا ہے اور نہ بندۂ زر
حسین درس زمانے کو دینے آیا ہے
ازل سے ساتھ دلِ حق پرست لایا ہے
ہمیں بتانا ہے، ایمان کس کو کہتے ہیں،
شہید کس کو، مسلمان کس کو کہتے ہیں،

یہ اپنی شان سے ناداں ڈرا رہا ہے کسے
یہ اپنی قوت و دولت دکھا رہا ہے کسے
مرے لئے تری ہستی مزارِ دُنیا ہے
تو اور کچھ نہیں لیکن غبارِ دُنیا ہے
نگاہِ اہلِ حقیقت غبار سے نہ رُکے
بڑھے جو دشتِ طلب میں وہ خار سے نہ رُکے

یزید! ہوش میں آجا بھٹک رہا ہے تو
کدھر خیال ہے تیرا بھٹک رہا ہے تو

سرِ حسین، درِ غیر پر، معاذ اللہ — بجز خدا کے کسی پر نظر معاذ اللہ
زمانہ سر کو ہمارے جھکا نہیں سکتا — کوئی بھی غیر کو سجدہ کرا نہیں سکتا

یہ کیا کہا کہ مٹا دے گا تو مری ہستی — خبر نہیں ہے تجھے اے خراب بدمستی
سفینہ اہلِ حقیقت کا غیر فانی ہے — کہ موجِ قلزمِ توحید جاودانی ہے
یزید! جتنا زمانہ گزرتا جائے گا — حسین اتنا جہاں میں اُبھرتا جائے گا
کہ رفتہ رفتہ حقیقت جہان بنتی ہے — زمین بنتی ہے، پھر آسمان بنتی ہے
ہمارا نام بڑھے گا بہت زمانے تک — کھلے گا رنگِ شہادت قیامت آنے تک
حسین کو کبھی عالم حسین مانے گا — کہ ذرہ ذرہ شہِ مشرقین مانے گا

زمین پر ہمیں توحید کا نشان سمجھ — بلند اپنی نگاہوں سے آسمان سمجھ
کمند پھینکنا بیکار آسمانوں تک — پہنچ نہیں ہے شیاطیں کی ان جہانوں تک

کہا ہے تو نے کہ روئے گا کون غربت پر — چراغ کون جلائے گا میری تربت پر
ہماری قبر بھی ہوگی چراغ عالم کا — کرے گی خاک بھی روشن دماغ عالم کا

میں جانتا ہوں کہ مجھ کو شہید ہونا ہے — گواہ حق کا مجھے چشم دید ہونا ہے
ہمارا خون مگر کربلا میں، ہونا ہے — کہ بیج حق کا اُسی سرزمیں میں بونا ہے

میں دیکھتا ہوں کہ گھر لُٹا جا رہا ہے مرا — غمِ سکینہ سے دل لُٹا جا رہا ہے مرا

شہید بچوں کی تربت ہے سامنے میرے نہیں ہے شک کہ قیامت ہے سامنے میرے
پڑی ہیں دشت میں بچوں کی بے کفن لاشیں اُٹھاتا پھرتا ہے شبیرِ خستہ تن لاشیں
نظر میں ہے مری انجام میں جو ہونا ہے سلوک بعد کو اس شام میں جو ہونا ہے
وہ سب ہے علم میں جو کوئی کہہ نہیں سکتا کہے جو کوئی تو بے تڑپے رہ نہیں سکتا
وہ سب گوارا ہے لیکن نہیں ہے یہ منظور حسین خلق میں ملّت فروش ہو مشہور
حرم کو فخر ہو جس پر وہ ننگِ دیر بنے حسین ہو کے حسین اور غلامِ غیر بنے

ہماری نظروں میں تنویرِ مصطفےٰ کی ہے ہمارے سامنے تفسیرِ والضحٰے کی ہے
جہاں کو ہم سے ہے اُمید رہنمائی کی توقع رکھتا ہے تو کفرِ انتہائی کی
ہزار کفر سے بدتر ہے، بیعتِ ناحق کہ لا الٰہ بھلا کر ہے، بیعتِ ناحق

نہیں ہے بات کوئی دولت و حکومت کی کہ قدر کرتے ہیں انسان آدمیت کی
یہ کہہ دیا ہے کہ حُجت تمام ہو جائے جو بات حق ہے وہ خورشیدِ بام ہو جائے
حسین آیا ہے دُنیا میں بہرِ قربانی کہ آشکار ہو رنگِ کمالِ انسانی
دِکھا کے قوّتِ اخلاق کا کمال حسین بنے گا اہلِ جہاں کے لئے مثال حسین
جو بندے حق کے ہیں حق پر نثار ہوتے ہیں غریقِ رحمتِ پروردگار ہوتے ہیں
کبھی حقیقتیں باطل سے دب نہیں سکتیں تجلّیاں تو کسی ظِل سے دب نہیں سکتیں
نبی نے پھول ہمیں اپنا اس لئے ہے کہا کہ سارا رنگ ہے ہم میں اُسی حقیقت کا
نہ پوچھ ہم سے کہ دنیا میں تیری بات ہے کیا یہ ہم سے پوچھ کہ دُنیا کی کائنات ہے کیا
فریب خوردۂ دولت! ہے کس خیال میں تُو حسین اور تری بیعت، ہے کس خیال میں تُو

کوئی ہو غیر کا کوئی اثر نہیں ہم پر — بتانِ دیر کا کوئی اثر نہیں ہم پر
ہمارے خون سے پیدا بہار پھر ہوگی — زمینِ تشنۂ حق لالہ زار پھر ہوگی
ہمارے خون کا ہر قطرہ رنگ لائے گا — ہزاروں حق و صداقت کے گل کھلائے گا
بنے گا رہبرِ عالم ہمارا نقشِ قدم — اُدھر کو آئیں گے محرم، جدھر گئے ہیں ہم
ہمارا ضبط تڑپتوں کے دل بڑھائے گا — ہمارا صبر مصیبت میں یاد آئے گا
غرضکہ قدرِ مراتب بقدرِ ہمت ہے — نہ سر بلند ہو کیوں منصبِ شہادت ہے
خدا کی راہ میں قربان ہونا سہل نہیں — ارے یزید! مسلمان ہونا سہل نہیں

مقابلہ نہیں گویا یہ راز دانی ہے
زبانِ حال و حقیقت کی ترجمانی ہے

سلام

نہ پھول باغِ رسالت کا بے چمن کے رہے — ہُوا یہ حکم کہ جزوِ درود بن کے رہے
لطافت اُن کی، جمال اُن کا، مرتبہ اُن کا — جو چشمِ پاکِ نبی میں نگاہ بن کے رہے
ہزار طرح سے کھینچے بہار کے نقشے — مگر نگاہ میں دو پھول اک چمن کے رہے
بہت بلند تھے خونِ حسین کے چھینٹے — بہارِ خُلد کے نقش و نگار بن کے رہے
کہا حسین نے آغوشِ حق میں جب پہنچے — شہید ہو کے نہ محتاج ہم کفن کے رہے
پڑی ہوئی تھیں کہیں چند بے کفن لاشیں — سحر کے بعد بھی آثار انجمن کے رہے
اُنہیں سے سلسلہ اہلِ نظر کا ملتا ہے — جو تار باقی شہیدوں کے پیرہن کے رہے

نہیں بعید خدا کے کرم سے کچھ گویا
کہ خاکِ پائے حسین آفتاب بن کے رہے

گویا جہان آبادی

دو انگوٹھیاں

ایک باغ میں ہرے ہرے پتوں سے لدے ہوئے گھنے درختوں کے نیچے ایک لڑکی اور ایک لڑکا کھڑے تھے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب خلیج بنگالہ کا نیلگوں پانی تاملوک کے قدیم شہر کی فصیل سے ٹکرا کر گزرتا تھا اور اُس کی موجوں کا شور شہر کے گلی کوچوں میں سنائی دیتا تھا۔ شہر کے باہر کچھ فاصلے پر ایک بہت بڑی عمارت نظر آتی تھی اور اس سے تھوڑی دُور ایک باغ میں ایک اور مکان تھا۔ یہ عمارتیں ایک دولت مند سوداگر دھن داس کی ملکیت تھیں۔ اسی سوداگر کی حسین لڑکی ہیرامنی اس وقت باغ میں کھڑی ایک خوبصورت نوجوان سے باتیں کر رہی تھی۔

ہیرامنی کی عمر اُس حد سے آگے بڑھ چکی تھی جس میں اکثر ہندو لڑکیوں کی شادی ہو جاتی ہے۔ واضح رہے کہ اس ڈھیل کے لئے ہیرامنی کسی طرح ذمہ دار نہ تھی۔ اپنی گیارھویں سالگرہ سے لے کر اب تک، برابر پانچ سال سے وہ ساگر الیشوری (سمندر کی دیوی) سے دعائیں کر رہی تھی کہ اس کا منظورِ نظر شوہر اسے مل جائے لیکن اب تک اُس کے دل کی بات پُوری نہ ہوئی تھی۔ مجھے ڈر ہے کہ پڑھنے والے اُسے بُرا نہ سمجھنے لگیں، اس لئے میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہر شخص یہ جانتا تھا کہ سماج کے دستور کے خلاف اس نوجوان کنواری لڑکی نے کیوں اپنے جوان ساتھی کو تخلیہ کی اس ملاقات کا موقع دیا تھا۔ جب ہیرامنی کی عمر چار سال کی تھی اُس وقت یہ لڑکا آٹھ سال کا تھا۔ اس کا باپ شوشسوتا چیٹی، دھن داس کا قریبی ہمسایہ تھا اس لئے دونوں بچے اکٹھے کھیلا کرتے تھے۔ وہ عموماً بہت کم ایک دوسرے سے جُدا نظر آیا کرتے۔ کبھی یہ اُس کے گھر چلی جاتی اور کبھی وہ اس کے گھر آجاتا۔ اگرچہ لڑکی اب سولہ سال کی ہوگئی تھی اور لڑکا بیس سال کا بانکا گبرو بن چکا تھا مگر وہ لڑکپن کی دوستی اور بے تکلفی اب تک نہ گئی تھی، ہاں اب ضرور کچھ مدت سے اُن کے رستہ میں ایک روڑا اٹک گیا تھا۔

بات یوں ہوئی کہ جب یہ دونوں جوان ہوئے تو اُن کے ماں باپ میں دونوں کی شادی کر دینے کا قول و قرار ہو گیا تھا۔ شادی کی تاریخ بھی مقرر کر دی گئی تھی لیکن یکایک ہیرامنی کے باپ نے اعلان کر دیا کہ میں اپنے دوست کے بیٹے سے اپنی لڑکی کو نہیں بیاہونگا۔ سننے والے یہ سن کر حیران رہ گئے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اس فیصلے کے بعد لڑکی کا اپنے بچپن کے ہمجولی سے بے تکلفانہ میل جول مناسب نہ تھا چنانچہ آج بھی پُر اندر متواتر التجاؤں کے بعد ہیرامنی کو اس عذر کے ساتھ بہت مشکل سے اِس ملاقات پر آمادہ کر سکا کہ میں تم کو ایک نہایت ضروری بات بتانا چاہتا ہوں۔

ہیرا منی نے درختوں کے اس جھنڈ میں پہنچتے ہی جہاں نوجوان اس کا منتظر کھڑا تھا تیزی سے کہا "تم نے مجھے کیوں بلایا ہے؟ تم جانتے ہو میں اب کوئی ننھی بچی نہیں ہوں اور ہمارا اس طرح تنہا ملنا ٹھیک نہیں۔ اگر تم نے پھر کبھی مجھے بلایا تو میں ہرگز نہ آؤں گی۔"

سولہ سال کی اس بچی نے بڑی بوڑھیوں کا سا متین بشرہ بنا کر عجیب پُرلطف انداز سے یہ بات کہی "تم جانتے ہو میں اب کوئی ننھی بچی نہیں ہوں"، مگر افسوس اس وقت وہاں کوئی اس کی اس بات سے لطف اُٹھانے والا موجود نہ تھا۔ پورا ندر کی عمر اور اس وقت کے دردناک جذبات نے اُسے لڑکی کے اس قول کا بے ڈھنگا پن محسوس نہ ہونے دیا۔ اس نے ایک بیل سے جو قریب کے ایک درخت کے تنے کے اردگرد بل کھاتی اور چکر لگاتی ہوئی اوپر نکل گئی تھی ایک پھول توڑا اور سودائیوں کی طرح اس کی پتیوں کو مسل مسل کرادھر اُدھر پھینکنے لگا۔ پھر اُس نے گلوگیر آواز سے کہا "میں اب کبھی تمہیں نہ بلاؤں گا۔ میں بہت دُور جا رہا ہوں لیکن رخصت سے پہلے تمہیں یہ بات ضرور بتا دینا چاہتا تھا۔"

لڑکی نے حیران ہو کر کہا "بہت دُور! تم کہاں جاؤ گے؟"

اس نے جواب دیا "میں لنکا[1] جا رہا ہوں۔"

لڑکی نے کہا "لنکا؟ یہ کیا! لنکا کیوں جا رہے ہو؟"

اُس نے جواب دیا "اس لئے جا رہا ہوں کہ ہم تاجر لوگ ہیں اور سمندر کے سفر سے ہمارا کاروبار چلتا ہے۔"

جب وہ یہ باتیں کر رہا تھا اُس نے بہت ضبط کی کوشش کی لیکن پھر بھی اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ ہیرا منی اُس وقت یوں نظر آتی تھی جیسے وہ کچھ سُن ہی نہیں رہی۔ اُس نے پھر کوئی بات نہ کی۔ اُس وقت اس کی نگاہیں آس پاس کے نظاروں پر دوڑ رہی تھیں اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس کی بڑی بڑی کھلی ہوئی معصوم آنکھیں سمندر کی چمکتی ہوئی لہروں پر سورج کی کرنوں کا ناچ دیکھ رہی ہیں۔ صبح کا وقت تھا اور ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ سمندر کی ننھی ننھی مصفّا اور روشن لہریں جنہیں ہوا دھکیل کر لا رہی تھی پرے باندھے ہوئے آتیں اور کنارے سے ٹکرا ٹکرا کر ٹوٹ جاتیں۔ نیلگوں پانی پر جھاگ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے نیلے لباس پر موتی ٹنکے ہوں۔ ساحل کی ریت پر سفید بھوری پرندوں کے غول کے غول کلولیں کرتے پھرتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا ہیرا منی ان دلکش نظاروں میں کھو گئی ہے۔ سمندر کا نیلا نیلا پانی، اُس کی جگمگاتی ہوئی موجوں کے سینے پر سورج کی شعاعوں کا والہانہ رقص اور کنارے کے قریب ننھی ننھی لہروں کے سروں پر کف کے سفید گالوں کی کلغیاں گویا اس کی پوری توجہ کو جذب کئے ہوئے تھیں۔ پھر اُس نے دُور ایک بادبانی جہاز پر اُچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور اس کے بعد وہ بہت فاصلے پر ایک پرندے کو دیکھنے لگی جو نیلے اور روشن افق پر ایک دھبا سا دکھائی دیتا تھا۔ آخر اس کی نگاہ پلٹ کر ایک کمھلائے ہوئے پھول پر جم گئی جو باغ کی گزرگاہ پر گرا تھا۔ اس نے بہت کوشش سے یہ الفاظ کہے "لیکن اب تم کیوں جاتے ہو؟ پہلے تو ہمیشہ تمہارے ابا جان جایا کرتے تھے۔"

---

[1] بادبانی جہازوں کے اس دور میں لنکا کی وہی حیثیت تھی جو آج ر... قلیپین کی ہے۔

پورانذر نے کہا " اباجان اب بوڑھے ہوگئے ہیں اور اب وہ زمانہ آگیا ہے کہ میں اپنے ہاتھ پاؤں خود ہلاؤں۔ میں نے خود اُن سے درخواست کی ہے کہ مجھے اپنی جگہ کام کرنے دیجئے "

کھڑے کھڑے ہیرامُنی نے اپنی پیشانی پاس کے درخت کے تنے پر رکھ دی۔

پورانذر نے دیکھا کہ اس کے ماتھے پر شدّتِ رنج سے بے شمار شکنیں پڑگئی ہیں۔ اس کے ہونٹوں پر کپکپی طاری تھی اور اس کے نتھنے لرز رہے تھے۔ آخر لڑکی رونے لگی۔

پورانذر نے تیزی سے رُخ پھیر لیا اور اپنے گردوپیش ساحل اور شہر اور آسمان اور زمین پر بے سبب نظریں دوڑانے لگا لیکن اس سے کچھ فائدہ نہ ہُوا۔ آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبانے لگیں اور ڈھلکے ہوئے آنسو رخساروں پر لڑھکنے لگے۔ اس نے جھنجھلا کر انہیں پونچھ دیا اور پھر جلدی سے کہا " یہی بات تھی جو میں تمہیں بتانا چاہتا تھا۔ جس دن مجھے معلوم ہُوا کہ تمہارے ابا ہماری شادی پر رضا مند نہیں میں نے اسی دن لنکا جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مجھے امید ہے . . . . . امید ہے کہ شاید میں وہاں سے کبھی واپس نہ آؤں گا۔ ہاں اگر کبھی میں تمہیں بھول سکا تو واپس آجاؤں گا ورنہ نہیں۔ اب زیادہ میں کیا کہوں اگر میں کچھ کہوں گا بھی تو تم سمجھ نہ سکو گی۔ مگر یہ سُن لو کہ اگر تمام دُنیا اور اُس کی تمام دولت تمہارے مقابلہ میں تول کر رکھ دی جائے تو میری پیاری میں پھر بھی تمہیں کو چنوں گا "

یہ کہہ کر لڑکا ایک طرف ہوگیا اور تیز تیز اِدھر اُدھر پھرنے لگا۔ جب رونے کی قابلِ نفرت خواہش ذرا دب گئی تو اس نے لوٹ کر کہا " یہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے مگر اب ایک نہ ایک دن تم کسی اور کی دُلہن بن جاؤ گی اس لئے تمہیں اپنے دل سے میرا خیال نکال دینا چاہئے، دعا کرو کہ ہم دونوں پھر کبھی ایک دوسرے سے نہ ملیں "

یہ بات کہتے کہتے بیچارا پورانذر ہڑبڑا کر وہاں سے بھاگ گیا۔ ہیرامُنی بیٹھ گئی اور رونے لگی پھر ذرا سنبھل کر اس نے سوچا کہ اگر میں آج مر جاؤں تو شاید پورانذر لنکا نہ جائے۔ اچھا ہے اگر میں ان ہری ہری بیلوں کا پھندا گلے میں ڈال کر پھانسی لے لوں یا سمندر کی اُن لہروں میں کود پڑوں۔ لیکن پھر اُس نے عقل سے سوچا کہ اگر میں مر ہی گئی تو چاہے پورانذر لنکا جائے چاہے نہ جائے میرے لئے ایک ہی بات ہوگی

ہیرامُنی دیر تک یہی باتیں سوچتی رہی اور چپ چاپ آنسو بہاتی رہی۔

(باقی آئندہ)

بنکم چندر چیٹرجی
(ترجمہ از حامد علی خاں)

محفلِ ادب

خاتونِ مشرق

غنچۂ دل مرد کا روزِ ازل جب کھل چکا   جس قدر تقدیر میں لکھا ہوا تھا مل چکا
دفعتہً گونجی صدا پھر عالمِ انوار میں   "عورتیں دنیا کی ہوں حاضر مرے دربار میں"
عورتوں کا کارواں پر کارواں آنے لگا   پھر فضا میں پرچمِ اسلام لہرانے لگا
ناز سے حوریں ترانے حمد کے گانے لگیں   عورتیں بھر بھر کے اپنی جھولیاں جانے لگیں

جب رہا کچھ بھی نہ باقی کیسۂ انعام میں
کانپتی حاضر ہوئیں پھر ایشیا کی عورتیں

دل میں خوفِ شومیٔ قسمت سے گھبرائی ہوئی   رعب سے نیچی نگاہیں، آنکھ شرمائی ہوئی
حلم کے سانچے میں روحِ نازکو ڈھالے ہوئے   گردنوں میں خم، سروں پہ چادریں ڈالے ہوئے

آخر اس انداز پر رحمت کو پیار آ ہی گیا
میکدے پر جھوم کر ابرِ بہار آ ہی گیا

مسکرا کر خالقِ ارض و سما نے دی ندا   اے غزالِ شرقی! آ تخت کے نزدیک آ!
نعمتیں سب بٹ چکیں لیکن نہ ہو نا مضمحل   سب کو بخشے ہیں دماغ اور لے تجھے دیتے ہیں دل
یہ وہی دل ہے جو مضطر ہو کے سوز و ساز سے   میرے پہلو میں دھڑکتا تھا عجب انداز سے
تجھ کو وہ رُخ اپنی سیرت کا دیئے دیتے ہیں ہم   جس میں پنہانی نسائیت کی لغزشیں ہیں کم
آ کہ تجھ کو صاحبِ دردِ وفا کرتے ہیں ہم   لے خود اپنی جنبشِ مژگاں عطا کرتے ہیں ہم!

پہلوئے خاتونِ مشرق میں بصد تمکین و ناز
منتقل ہو جا اُمومت کے سینے کے گداز!

عورتیں اقوامِ عالم کی بھٹک جائیں گی جب   تو رہیگی بن کے اس طوفاں میں اک موجِ طرب
حسن ہو جائیگا جب اور ملک کا وقفِ خاص و عام   دیدنی ہوگا ترے خلوت کدے کا اہتمام
عالمِ نسواں پہ کالی رات جب چھا جائیگی   یہ ترے ماتھے کی بِندی صبح کو شرمائیگی
عورتیں ناچیں گی جب اسٹیج پر با رقص و چنگ   اپنی آنکھوں کی لگاوٹ اپنے رخساروں کا رنگ
اُن کے آگے ہر نیا میداں ہوگا جلوہ گاہ   اور ترا اسٹیج ہوگا صرف شوہر کی نگاہ
گودیاں پھیلا کے جب مانگیں گی باصدق و صفا   عورتیں اولاد کے پیدا نہ ہونے کی دعا
مژدہ باد اے ایشیا کی دخترِ پاکیزہ تر!   آنچ آئے گی نہ تیرے عادلانہ ذوق پر
ماؤں کی غفلت سے جب بچوں کو پہنچیگا گزند   جب فضائل سے تری تربیتِ اولاد کی ہوگی بلند
صرف اِک تیرا تبسم اے جمالِ تابناک   سینۂ اطفال میں پیدا کریگا روحِ پاک
وہ حرارت تیرے ہونٹوں کی نہ ہوگی پائمال   جس کے شعلوں سے نکھر جاتا ہے رنگِ نونہال
وہ تری معصوم رعنائی نہ ہوگی مضمحل   بخشتی ہے نسلِ انسانی کے پیکر کو جو دل

وہ بھی دن آئیگا جب تجھ کو ہی اے بنتِ حجاب
زیب دیگا "مادرِ اولادِ آدم" کا خطاب

جب کرے گی صنفِ نازک اپنی عریانی پہ ناز   صرف اک تو اس تلاطم میں رہیگی پاکباز
اُن کے دل جب ہونگے بارِ معصیت سے پاش پاش   تیرے رُخ پر ایک بھی ہوگی نہ ماضی کی خراش
اُن کی آہیں خوفِ رسوائی سے ہونگی جب دراز   تیرے سینے میں کبھی شب کا نہ ہوگا کوئی راز
دہشتِ فردا سے تھرائے گا جب اُن کا غرور   حال سے تو ہوگی راضی خوفِ مستقبل سے دُور
جب اُڑیگی اُن کی چشمِ ظلم پروردہ میں خاک   نرم ہونگے تیری آنکھوں کے ڈورے تابناک
نرم ہونگے تیرے جلوے بھی، تری گفتار بھی   باحیا ہوگی تری پازیب کی جھنکار بھی

چھاؤں بھی ہوگی نہ تیری بزمِ ناؤ نوش میں
تیرا پرتو تک رہے گا شرم کے آغوش میں

اے شعاعِ ارضِ مشرق! تیری عفت کا شعار — کج کرے گا کلکِ قدرت کی کلاہِ افتخار
آبرو ہوگا گھرانے بھر کی تیرا رکھ رکھاؤ — دے گا تیرا باپ شانِ فخر سے مونچھوں پہ تاؤ
تیری آنکھوں کی کرن سے اے جہاں افتاب — جگمگائے گی نسب ناموں کی لوحِ زرنگار
بوالہوس کا سر جھکائے گی تری ادنیٰ جھلک — ہوگی لہجے میں ترے نسبتِ طہارت کی دمک

تیری پیشانی پہ چھلکے گا مثالِ برقِ طور
طفل کا نازِ شرافت، اور شوہر کا غرور!

علم ہے ہر چند تجھ کو کم کیا ہے بہرہ مند — لیکن اس سے ہو نہ اے معصوم عورت درد مند
جب مزاجِ عورت سے زیادہ ناز فرماتا ہے علم — عارضِ تاباں سے بھولے پن کو کھا جاتا ہے علم
نطق بوجھل ہوتا ہے علمی اصطلاحوں سے اس — لعلِ لب میں شہد کی باقی نہیں رہتی مٹھاس
علم اٹھا لیتا ہے بزمِ جاں سے شمعِ حجاب — خالِ مشکیں کی صورت سے چہرے کی شانِ حجاب
قصرِ وحشت کی طرف مڑتی ہے اکثر راہِ فن — جھانکتی رہتی ہے اس رخ سے سی چشمِ اہرمن
چھوڑ دیتی ہے تکلم کو ملائم قیل و قال — علم کا حد سے گزر جانا ہے توہینِ جمال
علم سے بڑھتی ہے عقل اور عقل ہے معبدِ دماغ — جو بجھا دیتی ہے سینے میں محبت کا چراغ
علم سے باقی نہیں رہتے محبت کے صفات — اور محبت ہی فقط لے دے کے تیری کائنات
دیکھ تجھ پر علم کی ہجر کی پڑ جائے نہ ضرب — جاگ اس بڑھنے میں ہیں شیطاں کے آلاتِ حرب
علم سے رہتی ہے پابندِ شکن جس کی جبیں — نازِ شعلوں پر اس کی زلف لہراتی نہیں
وقت سے پہلے بلا لیتے ہیں پیری کو علوم — عمر سے آگے نکل جاتے ہیں جو ہے بالعموم
حسن والوں کو چاٹ پڑ جاتی ہے قیل و قال کی — انکی گرمی کو ترستی ہے جبیں اطفال کی
اک جنوں پرور بگولا ہے وہ علمِ بے ذوق — جس کی گردش میں کانپتے لگتے ہیں شوہر کے حقوق

مدعی سے اپنے علمِ جہل پہ یہ کلام — حسنِ نسواں کو بنا دیتا ہو جو جاگیر
جس جگہ حورانِ جنت کا کیا ہے تذکرہ — کیا کہا ہو اور بھی کچھ ہم نے جز حسن
تذکرہ حوروں کا ہے محض ایک تصویرِ جمال — ہم نے کیا اُن کو کہا ہے صاحبِ فضل و کمال

یہ سچ ہے سرخی، زیور، غازہ، افشاں، رنگ، خال
حسن خود اپنی جگہ ہے سو کمالوں کا کمال

چاندنی، قوسِ قزح، عورت، شگوفہ، لالہ زار — علم کا ان نرم شانوں پر کوئی رکھتا ہے بار
روشنائی میں کہیں گھلتی ہے موجِ ماہتاب — کیا کوئی اوراقِ گل پر لکھا کرتا ہے کتا
میرے عالم میں نہیں اہلِ مذاق کا شعار — کاکلِ افسانہ ہو دوشِ حقیقت سے
حسن کا آغوشِ رنگیں، دلفریب و دلربا — علم سے بن جائے اقلیدس کا معمہ ک
مصحفِ رخ کے کتابی رو کشِ نازِ گلاب — اور بن جائے لغت، یا دفترِ علمِ حساب
نغمۂ شیریں کہ جس میں ہے شورِ کائنات — بزمِ کاوش میں جلے شمعِ شبستانِ حیات
گرم ہو تیزاب کی کھولن سے لالے کا ایاغ! — غنچۂ نورس کا طاق، اور سپیرِ مکتب کا
شہپرِ بلبل پہ کھینچی جائے تصویرِ شغال! — موتیوں پر ثبت ہو طوفان کی مہرِ جلا
صبح فرقِ بحث ہو غنچے کھلانے کے عوض! — درس دیں موجیں صبا کی گنگ نے

تو نہ کرنا مغربی متوالیوں کی ریس دیکھ
گھات میں تیری لگا ہے فتنۂ ابلیس دیکھ!

تو نہ اُن کی طرح بھرنا عرصۂ فن میں چھلانگ — کوکھ تا ٹھنڈی رہے بچوں سے اور صندل سے مانگ
دخترانِ مغربی کو دے نہ عورت کا خطاب — یہ مجسم ہو گئے ہیں کچھ گنہگاروں کے خ
پھر رہی ہیں یا تری نظروں کے آگے پُر فضا — عورتوں کے بھیس میں شیطان کی تل

علم حاصل کر فقط تدبیرِ منزل کے لئے
مرد ماؤں کے لئے ہیں اور تو دل کے لئے

مولانا حالی اور طوائف کا مکان

مولانا خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم ایک مرتبہ کسی ضروری کام سے دہلی آئے اور مولانا سید وحید الدین سلیم پانی پتی مرحوم کے پاس مقیم
رہے۔ اتفاق سے مولانا سلیم مرحوم نے ابھی دنوں مکان تبدیل کیا تھا اور جو مکان انہوں نے اب کرایہ پر لیا تھا اُس میں پہلے ایک طوائف رہتی
تھی۔ رات کا وقت تھا۔ مولانا سلیم اور مولانا حالی دونوں آرام کر رہے تھے۔ اتفاق سے طوائف کا ایک دوست اس مغالطہ میں کہ شاید وہ طوائف
ابھی تک اسی مکان میں رہتی ہے زینہ پر چڑھا دروازہ بند تھا اس نے دستک دینا شروع کی۔ جب اندر سے کوئی جواب نہ ملا تو اس نے آواز دی
بی جان طبیعت کیسی ہے جو آج اتنی جلد سو گئیں!

مولانا سلیم مرحوم نے اس آدمی کو اندر سے ڈانٹا وہ یہ سمجھ کر کہ کمرے کے اندر طوائف کا کوئی دوسرا دوست داد عیش دے رہا ہے
گالی گلوچ کرنے لگا۔ مولانا سلیم مرحوم کی طبیعت میں غصہ زیادہ تھا دروازہ کھول کر باہر نکل آئے اور مغالطہ کا شکار نو وارد ان سے لڑنے لگا۔ وہ
مار کھانا چاہتا تھا اور مولانا سلیم مرحوم اسے روک رہے تھے۔ خواجہ حالی مرحوم جو فطری طور پر بہت بردبار اور صلح پسند تھے تصفیہ کرانے کے لئے
باہر تشریف لائے۔

چونکہ مولانا حالی مرحوم دہلی میں قومی مجالس وغیرہ میں شرکت کے لئے برابر آتے جاتے تھے۔ اس لئے طوائف کا دوست مولانا مرحوم
کو خوب پہچانتا تھا۔ اس نے مولانا کی صورت دیکھتے ہی جھک کر سلام کیا اور کہا "واہ مولانا صاحب واہ! یہ آپ کی نورانی صورت اور آپ
کی بزرگی۔ دوسروں کو آپ بُری باتوں سے بچنے کی نصیحت کرتے ہیں اور جب قومی جلسوں میں نظمیں پڑھتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے
مسلمانوں کا سارا درد آپ ہی کے دل میں سما گیا ہے مگر ماشاءاللہ حرکتیں آپ کی یہ ہیں کہ راتیں طوائف کے مکان پر گزاری جاتی ہیں۔"

خواجہ حالی مرحوم کو یہ فقرہ سُن کر بہت ہنسی آئی۔ سمجھ گئے کہ معاملہ کیا ہے۔ نووارد کو مکان کے اندر لے جا کر اصل حالات سے مطلع
کرنا چاہا لیکن وہ اس قدر مشتعل تھا کہ اس نے کوئی بات سُننا بھی گوارا نہ کی اور خواجہ حالی مرحوم سے یہ کہہ کر چلتا بنا "جس طوائف کے یہاں
آپ ایسے بزرگ تشریف لاتے ہوں وہاں مجھ غریب آدمی کا کام نہیں ہے۔ آپ اطمینان سے رات گزاریئے۔"

دوسرے دن مولانا سلیم مرحوم نے اس مکان کی سکونت ترک کر دی۔

ریاست

مرزا غالب مرحوم کا روزنامچہ غدر ۱۸۵۷ء

ہے عوام کے نقشہ میں ملا لکھے ——— صرف اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

میرٹھ سے ... کہ یہاں بڑی آفت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں ہے ...

مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھتا ہے۔ جو باہر کے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے ہاں پانچ پانچ بید لگتے ہیں یا دو دو روپیہ جرمانہ لیا جاتا ہے۔ آٹھ دن قید رہتا ہے۔ اس کے علاوہ سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو کون بے ٹکٹ مقیم ہے اور کون ٹکٹ رکھتا ہے۔ تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے۔ یہاں کا جمعدار میرے پاس بھی آیا۔ میں نے کہا بھائی تو مجھے نقشہ میں نہ لکھ میری کیفیت کی عبارت الگ لکھ۔ عبارت یہ کہ اسد اللہ خاں پنشن دار ۱۸۵۰ء سے حکیم پٹیالے والے کے بھائی کی حویلی میں رہتا ہے۔ نہ کالوں کے وقت میں کہیں گیا۔ اور نہ گوروں کے زمانہ میں نکلا۔ اور نکالا گیا۔ کرنیل براون صاحب بہادر کے زبانی حکم پر اس کی اقامت کا مدار ہے۔ اب تک کسی حاکم نے وہ حکم نہیں بدلا۔ اب حاکم وقت کو اختیار ہے۔ پرسوں یہ عبارت جمعدار نے نقشہ کے ساتھ کوتوالی میں بھیج دی ہے۔ کل سے یہ حکم نکلا کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان دکان کیوں بناتے ہیں جو مکان بن چکے ہیں انہیں ڈھا دو اور آئندہ کو ممانعت کا حکم سنا دو۔ اور یہ بھی مشہور ہے کہ پانچ ہزار ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔ جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے بقدر مقدور نذرانہ دے۔ اس کا اندازہ مقرر کرنا حاکم کی رائے پر ہے۔ روپیہ دے اور ٹکٹ لے۔ گھر برباد ہو جائے۔ آپ شہر میں آباد ہو جائے۔ آج تک یہ صورت ہے۔ دیکھئے شہر کے بسنے کی کون صورت ہے۔ جو بستے ہیں وہ بھی اخراج کئے جاتے ہیں۔ یا جو باہر پڑے ہوئے ہیں وہ شہر میں آتے ہیں۔ الملک للہ والحکم للہ۔

سوسائٹی کی بربادی کا ماتم :۔ اس چرخ کج رفتار کا برا ہو۔ ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ ملک و مال جاہ جلال کچھ نہیں رکھتے تھے۔ ایک گوشہ و توشہ تھا۔ چند مفلس و بے نوا ایک جگہ فراہم ہو کر کچھ ہنس بول لیتے تھے ؎

اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا — سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک

یہ شعر خواجہ میر درد کا ہے، کل سے مجھ کو سیکش بہت یاد آتا ہے۔ وہ صحبتیں اور تقریریں۔ آنسوؤں سے پیاس نہیں بجھتی۔ یہ تحریر تلافی اس تقریر کی نہیں کر سکتی۔

(سیکش کے پھانسی پانے کے بعد عالم غم والم میں یہ تحریر لکھی گئی ہے۔ ہائے کتنا درد حروف کے کلیجہ میں بھرا ہے پڑھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔) (حسن نظامی)

دلی سے انتہائی محبت اس کے اجڑنے کی خاک بھی آنکھوں میں :۔ آنکھوں کے غبار کی وجہ یہ ہے کہ جو مکان دلی میں ڈھائے گئے اور جہاں جہاں سڑکیں نکلیں جتنی گرد اڑی اس سب کو از راہ محبت اپنی آنکھوں میں جگہ دی۔

(دلی سے محبت کرنے کی یہ انتہائی مثال غالب نے لکھی ہے کہ آنکھیں دکھنے آئیں تو اس کا سبب یہ قرار دیا کہ دلی کے مکان اجاڑے گئے اور ان کے مٹنے سے خاک اڑی تو اس کو آنکھوں میں بٹھا لیا۔ گویا اس کے اثر سے آنکھیں دکھنے لگیں۔ اپنے وطن سے محبت اس طرح کیا کرتے ہیں۔ کوئی آج کل کے محبان وطن کو غالب کے یہ چند لفظ سنائے۔) حسن نظامی

منادی

"سوزِ ناتمام"

ادبیاتِ اُردو میں گرانقدر اضافہ

حضرت عاشق بٹالوی کے دلآویز افسانوں کا نادر مجموعہ "سوزِ ناتمام" کے نام سے اکتوبر میں شائع ہو رہا ہے۔ عاشق صاحب کے افسانے اردو کے مشہور ادبی رسائل میں شائع ہو کر شہرتِ دوام اور نقادان فن سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ اب ان ہی گرانمایہ جواہر ریزوں کو ایک سلک میں منسلک کر کے ملک کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ ادب و انشا کی خوبیوں۔ زبان و ادائے بیان کی سحر طرازیوں اور فن افسانہ نگاری کے محاسن کے اعتبار سے یہ کتاب اُردو ادب میں ایک یادگار چیز ہو گی۔

آپ خریداروں کی فہرست میں ابھی اپنا نام درج کرا لیجئے۔ تاکہ کتاب شائع ہوتے ہی آپ کی خدمت میں پہنچ سکے۔ **قیمت** صرف ایک روپیہ مجلد جس پر سنہری حروف میں کتاب کا نام لکھا گیا ہے۔ عہ

مینیجر ہمایوں۔ ۲۳ لارنس روڈ۔ لاہور

سید عبداللطیف پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ ہمایوں ۲۳۔لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا۔

قواعد

۱۔ "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲۔ علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پُورے اُتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ۱/ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتّر صفحے ماہوار اور سوا نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہئے
اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتہً بھیجا جائے گا۔

۸۔ جواب طلب امُور کے لئے ۱/ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہئے۔

۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے چھ آنے ششماہی تین روپے (مع محصولڈاک) فی پرچہ ۸/

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتا تحریر کیجئے۔

۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافے پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھئے۔

مینیجر رسالہ ہمایوں
۲۲۔ لارنس روڈ لاہور

Titel & Picture Printed at the Half tone Press, Dav Samaj Road, Lahore.

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگار علامہ فضیلۃ آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

اردو کا علمی وادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔ اے

جلد (۳۵)　　　　نمبر (۶)

فہرست مضامین

ہمایوں بابت ماہ دسمبر ۱۹۳۶ء

تصویر ــــــ حسنِ صحرا

چندہ سالانہ ۵ر مع محصول　ششماہی ۳ر　قیمت فی پرچہ ۸ر

"بزمِ ہمایوں"

مصیبت اکثر حیات انگیز ثابت ہوتی ہے، بچھڑے ہوؤں کو ملا دیتی ہے، روٹھے ہوؤں کو منا دیتی ہے، جہاں کبھی طعنے ہوا کرتے تھے وہاں اب محبت کی باتیں ہونے لگتی ہیں، اُردو والوں پر ہندی کی مصیبت ٹوٹی تو اُن کے آپس کے مناقشے، طول طویل مباحثے، بے سود بے معنی جھگڑے کم ہونے شروع ہوئے پھر اس مصیبت کو اب ہم مصیبت کیوں سمجھیں؛ وہ مصیبت جو ملا دے جگا دے ترقی کی نئی نئی راہیں سجھا دے وہ مصیبت کیسی، شکر ہے وہ آئی شکر ہے ہم نے دیکھ لیا سمجھ لیا کہ چیزوں کی حقیقت کیا ہے لوگوں کی نیت کیسی ہے؟

کبھی وہ زمانہ تھا کہ اہلِ پنجاب کو اہلِ زبان کنکھیوں سے دیکھتے تھے اُن کے لب و لہجہ پر اُن کے محاورے پر آوازے کسے جاتے تھے اب جو ہمارے پُرانے دوست اُردو کے سر پر تلوار تولے آ کھڑے ہوئے تو اہلِ زبان اور غیر اہلِ زبان کے سب امتیاز اُٹھ گئے۔ بھئی جس بیچاری کے لئے ہم تُو تُو مَیں مَیں کرتے تھے، ایک اُسے اِدھر کو کھینچتا ایک اُدھر کو، اُس غریب کی جان کے تو لالے پڑ گئے۔ یہ دیکھنا تھا کہ سب لڑائیاں ختم ہوئیں اور ایک گھرانے کے رہنے والے سب پھر بھائی بھائی بن گئے۔ اب نہ دہلی لکھنؤ والوں کے پنجاب پر طعنے نہ پنجاب والوں کی اُن سے خفگی۔ ہاں وہ تو فراغت اور فرصت اور عیش و عشرت کی رنگ رلیاں تھیں اب جہد للبقا کے خونخوار حالات میں صحیح فکر اور مسلسل عمل کی پکار ہے کہ اُٹھو، دیکھو، مِلو اور مِل کر سوچو اور مِل کر کام کرو!

اِس ضمن میں بعض وہ خطوط یاد آتے ہیں جو "انجمن اردو پنجاب" کے قیام کے متعلق راقم کو وقتاً فوقتاً موصول ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن یہاں فقط اتنی گنجائش ہے کہ قاضی عباس حسین صاحب دہلوی کے ایک مکتوب کا اقتباس شکریے کے ساتھ درج کیا جائے جو کچھ عرصہ پہلے ملا تھا:۔

"محترمی و مکرمی آداب عرض ہے۔ آپ کا نہایت ضروری اور بیش قیمت مضمون بعنوان "انجمنِ اُردو پنجاب" ہفت روزہ "تاج" مورخہ ۵ ستمبر ۱۹۳۶ء میں پڑھا۔ آڈٹ آفس کی مسلسل تیس سال کی ملازمت نے میری رگ رگ میں آڈٹ بھر دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میں ہر بات کو آڈٹ کی نظر سے دیکھتا ہوں سو زبانِ اُردو کے معاملے میں جو کچھ اس وقت عرض کرتا ہوں اپنی دانست میں حقیقت سمجھ کر لکھتا ہوں:۔

اُردو کی ترقی کا سہرا پنجاب کے سر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حیدرآباد نے اُردو کی بہت زیادہ خدمت کی ہے اور بڑی ٹھوس خدمت کی ہے۔ اگر ترازو کے ایک پلڑے میں پنجاب کی خدمت اور دوسرے میں حیدرآباد کی رکھی جائے تو حیدرآباد کا پلڑا یقیناً جھکتا رہیگا مگر مقابلہ برابر کا نہیں اس لئے کہ حیدرآباد نے جو کچھ کیا حکومت کے بل پر، رسوخ کے بل پر اور پیسے کے بل پر کیا مگر پنجاب نے زنِ تیل

لکڑی کے فکر میں رہ گیا فقط اپنے دماغ سے کیا اپنی قلم سے کیا دلی محبت سے کیا۔ بھلا جب کبھی میں اس کے متعلق سوچتا ہوں اور اکثر سوچتا ہوں تو میری آنکھوں میں خوشی کے آنسو آجاتے ہیں۔ ہر شخص کو قدرۃً اور فطرۃً اُسی زبان سے لگاؤ اور محبت ہوتی ہے جو اُس کی گھٹی میں پلی ہوئی ہوتی ہے چاہے وہ زبان دوسروں کو کیسی ہی کڑوی کسیلی اور کرخت معلوم ہوتی ہو مگر وہ اُسی زبان میں حد درجے کی شیرینی اور لطافت محسوس کرتا ہے۔ بھلا اس ایثار اور اُردو کی اس محبت کا کیا ٹھکانا ہے کہ اہلِ پنجاب نے اردو کے کارن اپنی مادری زبان چھوڑی۔ پنجابی زبان کو ترقی دینے کی جگہ اُردو کو اس قدر بلند مقام پر لے گئے کہ اس کے عروج سے مہاتماؤں کو حسد ہونے لگا۔ بڑا جی خوش ہوتا ہے جب پنجاب کے اہلِ قلم اور ادیبوں کے مضامین پڑھتا ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں پنجاب کے ہر شخص کا مضمون دل سے پڑھتا ہوں، چاہے وہ کیسے ہی مبتدی کا ہو اور کتنا ہی بُرا ہو۔ آؤٹ تو میں وہاں بھی لگاتا ہوں مگر غلطیاں بُری نہیں معلوم ہوتیں، دل کہتا ہے اس بیچارے نے اپنی زبان چھوڑ کر ہماری اُردو کی خدمت کی ہے آدمی ماں کے پیٹ سے قابلیت لے کر نہیں پیدا ہوتا رفتہ رفتہ یہ بھی ادیب شہیر بن جائے گا۔ حیرت ہوتی ہے کہ پنجاب والوں نے اس قدر تھوڑے سے عرصے میں کتنی ترقی کر لی۔ جناب جوش ملسیانی کی نظم و نثر کو دیکھتا ہوں تو عش عش کرتا ہوں کہ اقبال تو اقبال ہی ہیں یہ ایک چھوٹے سے قصبے کا رہنے والا جس کی پنجابی بھی ٹھیٹ پنجابی ہے جسے لاہور اور امرتسر کے پنجابی بھی مشکل ہی سمجھتے ہوں گے یہ شخص کس فضا میں پلا اور بڑا ہوا اس کی گھٹی میں کیسی زبان پڑی ہوئی تھی ایسے شخص سے کیونکر اور کس طرح اُمید ہو سکتی تھی کہ اُردو میں ایسے ایسے گُل کھلائے گا اور یوں موتی بکھیرے گا۔

میرے محترم! مجھے رونا آتا ہے اس حالتِ جمود پر کہ غریب اردو کی یوں مٹی پلید کی جا رہی ہے لوگ ہندی کے لئے تن سے من سے دھن سے کیا کچھ نہیں کر رہے مگر ہم ہیں کہ ٹس سے مس نہیں ہوتے اس وقت جمعیت کی ضرورت ہے۔ اگر ایک کے بس کا کام ہوتا تو اس قحط الرجال کے زمانے میں بھی کوئی اللہ کا بندہ اُٹھ کھڑا ہوتا مگر مصیبت تو یہ ہے کہ یہ ایک کے بس کا روگ نہیں سب کے کرنے کا کام ہے۔

آپ نے "انجمن اردو پنجاب" کی بنیاد ڈالی گویا سوکھے کھیتوں میں پانی پڑ گیا۔ میں نے تو جس دن محترمی جناب مولوی عبدالحق صاحب کا مضمون پڑھا تھا یقین کر لیا تھا کہ جہاں اُردو کو معراجِ ترقی پر پہنچانے کا سہرا پنجاب کے سر ہے وہاں اسے اغیار کی دستبرد سے بچائیں گے بھی تو پنجاب ہی کے جواں مرد۔ مجھے یقین ہے کہ پنجاب میں ایک کیا بیسیوں انجمنیں قائم ہونگی زبانی جمع خرچ کرنے والی نہیں بلکہ ٹھوس کام کرنے والی۔

اللہ پاک ہم سب کو توفیق دے کہ تذکیر و تانیث کے جھگڑوں میں وقت نہ گنوائیں "اہلِ زبان" اور "اُردو کے مرکز" کی ناگوار بحث میں نہ پڑیں۔ اندھا دھند تنقیدوں کو بالائے طاق رکھیں اور سب مل کر ایک جان اور کروڑوں قالب ہو جائیں۔

آپ نے انجمن کا چندہ ایک روپیہ سالانہ رکھا ہے آپ نے سوچ سمجھ کر رکھا ہوگا مگر میری رائے میں یہ بہت ہی کم ہے اقلاً ازکم ایک روپیہ ماہوار ہونا چاہئے تھا خیر آپ اسے بہتر سمجھ سکتے ہیں مجھ ہیچمدان کو بھی خادموں میں سمجھئے۔ پانچ روپیہ کی حقیر رقم اسی مد میں ارسالِ خدمت ہے۔ منی آرڈر غالباً اس عریضے کے ساتھ ہی ساتھ پہنچے گا۔

بشیر احمد

جہاں نما

تعلیم اور فطری آزادی

بچوں کی دماغی نشوونما

"تعلیم میں فطری آزادی کی ضرورت" کے موضوع پر علّامہ عبداللہ یوسف علی نے حال ہی میں ایک اہم تقریر کی۔ انہوں نے بتایا کہ "تعلیم کا اہم ترین مقصد یہ ہے کہ وہ انسان کی فطری آزاد روح سے اشتراکِ عمل کے ساتھ اس کی باقاعدہ ذہنی تربیت اور نشوونما میں حصّہ لے محض قوتِ متخیلہ کی مدد سے تعلیم دینا بیکار ہے۔ یہ لازم ہے کہ انسان کی تمام انفرادی اور معاشری صلاحیتوں کو اس مصرف کے لئے استعمال کیا جائے۔

بچہ بھی اپنی شخصیت کے احساس سے اسی طرح لطف اُٹھاتا ہے جس طرح ایک بچھیرا اپنی رفتار یا ایک شکاری کتے کا پلّا اپنی قوتِ شامہ کے احساس سے خوش ہوتا ہے۔ بچہ اپنے گردوپیش کی دُنیا کے اسرار سے واقف ہونا چاہتا ہے۔ کنڈرگارٹن کے سبق میں ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ بچے کے دل میں مختلف گول اور چوکور یا ٹیڑھی اور سیدھی شکلوں کو دیکھ کر کس طرح مختلف سوال پیدا ہوتے ہیں۔ یہ سوالات خالص عقلی نہیں ہوتے۔ بچہ کا تعلق اس عمر میں زیادہ تر مادی اشیاء سے ہوتا ہے۔ روحانی دنیا کے تصوّر سے ابھی اس کا دماغ آشنا نہیں ہوتا۔ یہی بیرونی مشاہدات بالآخر اس کے دل میں مادی روحانی یا اخلاقی تجربوں کا سرچشمہ بنتے ہیں۔

بدقسمتی سے پنجاب میں ہماری تعلیم شروع ہی سے مشاہدہ کے اس شوق کے جراثیم کو فنا کرنا شروع کر دیتی ہے۔ یہ قدرت کے تمام مناظر کی طرف سے بچے کے ہنوز نشوونما پاتے ہوئے دماغ کی کھڑکیاں بند کرنا شروع کر دیتی ہے اور اس بیچارے کو تاریک عمارتوں، بند کمروں اور ایک غیر فطری اور مصنوعی فضا میں پرورش پائے ہوئے گڈمڈ تخیلات کے حوالے کر دیتی ہے۔

اس غلط طریقِ تعلیم سے بچے کی سوجھ اندھی، گونگی، بہری غرض ہر طرح سے اپاہج ہو جاتی ہے۔ اپاہج بنانے کا یہ سلسلہ ابتدائی تعلیم سے لے کر برابر بی۔ اے اور ایم۔ اے تک جاری رہتا ہے۔

آزاد ممالک کا تعلیمی تصوّر اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ آزاد ممالک سے مراد وہ ملک ہیں جہاں عورتیں اور مرد کسی روک ٹوک کے بغیر انفرادی سیرت اور معاشری زندگی میں ترقی کی منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں اور جہاں وہ اپنے اپنے ذوق کے مطابق زندگی کے



حسن صحرا

مختلف شعبوں کی خدمت وفاداری سے انجام دے رہے ہیں۔ میرا یہ قول سیاست پر اور اس سے زیادہ معاشرت پر حاوی ہے۔ اس طریقے سے ایک ایسی معاشری زندگی پیدا ہو سکتی ہے جو "مجبور و مقہور" ہونے کے بجائے آزاد اور صحت مند ہو۔

تعلیم میں فطری آزادی کا خیال رکھا جائے تو یہ خاص خاص قسم کے لیبل لگے ہوئے تنگ نظر ذہنی غلام پیدا کرنے کے بجائے آزاد فضا میں چلنے پھرنے والے منفرد شخصیتوں کے مالک اور آزاد انسان پیدا کرے گی۔ ایسی آزاد فضا میں ترقی کی دوڑ کبھی ختم نہیں ہو سکتی اور انسان کی ذہنی نشوونما کے لئے وقت کی کوئی حد مقرر نہیں ہو سکتی۔ تمہارے اندر جو آزاد روح ہے اس کے تقاضا کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس کے بدلے میں تمہیں اعلےٰ درجہ کی تعلیم اور تہذیب و ثقافت حاصل ہو گی۔

نئی غلامی

آلمر ماڈ نے جو ٹالسٹائی کی تصنیفات کے انگریزی تراجم کے لئے مشہور ہے حال ہی میں ایک مضمون لکھا ہے جس میں اس نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ عہدِ حاضر کے جن ملکوں پر آمروں کی حکومت ہے وہاں درا صل وسیع پیمانے پر غلامی کا نظام رائج ہو چکا ہے جنگ کی مجرمانہ حیثیت کے متعلق ٹالسٹائی کے مشہور خیالات کی یاد دلاتے ہوئے آلمر ماڈ نے لکھا ہے کہ:—

"اُن فرمانرواؤں کو جو انسانوں کے قتلِ عام کا سامان کرتے ہیں در اصل "حبِ وطن" کے فرسودہ توہمات پر بھروسا ہوتا ہے۔ وہ اپنی رعایا کو یقین دلا دیتے ہیں کہ اس کی نسل، اُس کی تہذیب اور اُس کی قوم دوسروں پر ہر طرح فائق اور ہر لحاظ سے دُنیا میں بہترین ہے۔ اس لئے اس کو حق حاصل ہے کہ دوسروں پر غلبہ حاصل کرے اگر دوسرے اس کا قتلِ عام کریں یا اُس پر غلبہ پالیں تو یہ ایک ہولناک مصیبت ہو گی لیکن اگر وہ دوسروں کا قتلِ عام کرے اور اُن پر غلبہ پالے تو یہ تہذیب کی ترقی ہو گی۔ اس تہذیب کا ثبوت قتلِ عام کے فن میں دسترس حاصل کرنے سے دیا جاتا ہے اور اس دسترس سے کام لینے پر فوری آمادگی اخلاقی قوت کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔"

جب حُبِّ وطن کے متعلق یہ ہولناک توہمات عوام کی رگ و پے میں سرایت کر جاتے ہیں تو پھر دوسرا قدم یہ اُٹھایا جاتا ہے کہ انہیں یقین دلایا جائے کہ اس حُبِّ وطن کے جذبے کو دوسروں پر ظاہر کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایک آمر یا حکمراں مقرر کیا جائے جو ضرورت کے وقت سلطنت کی قوت کی سطح کل کو فوراً حرکت میں لا سکے۔

"اس تدبیر کو مؤثر بنانے کے لئے ہر اُس خیال کا قلع قمع کر دینے کی کوشش کی جاتی ہے جو رحم، امن پسندی یا انسانی اخوت وغیرہ کی تلقین پر مشتمل ہو۔ رفتہ رفتہ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر مخالف آواز دب جاتی ہے اور قوم کی قوم اپنے حکمراں کی من مانی خواہشات کے مطابق پوری طرح مسحور ہو جاتی ہے۔ اس سحر کا اثر اتنا ہوتا ہے کہ آزادی لٹ گئے، آزادیٔ ضمیر کا

اعتقاد اور آزادیٔ احساس کا کوئی امکان ہی نہیں رہتا۔ لوگوں کی ذہنیت پر یوں قبضہ پا لینے کے بعد فوج میں جبری بھرتی کے ذریعہ سے اُن کے جسموں پر بھی قبضہ حاصل کر لیا جاتا ہے۔ تمام نوجوان مردوں کو (اور اب بعض ملکوں میں نوجوان عورتوں کو بھی) انسانی قتل کے نئے سے نئے گر سکھائے جاتے ہیں۔ سائنس کی معلومات اُن کی مدد کے لئے وقف کر دی جاتی ہیں اور انہیں وقتاً فوقتاً لاکھوں کی تعداد میں قتل کرنے اور قتل ہونے کے احکام دیئے جاتے ہیں۔ غلامی کی یہ نئی صورت بھی اتنی ہی ہولناک اور اتنی ہی ذلت انگیز ہے جتنی اس کی کوئی پرانی شکل اور اس کی وجہ زیادہ تر لامذہبیت اور مادہ پرستی ہے؟

شاعری کی نامقبولیت

مسٹر سٹینلے جیمز نے شاعری کی موجودہ نامقبولیت کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ شاعری گفتگو کا بالکل ابتدائی طریقہ ہے۔ ستاروں اور پھولوں کے اُن ناموں میں جو ابتدائی لوگوں نے انہیں دیئے شاعری کا سراغ ملتا ہے۔ شاعری انہیں زمانوں میں زیادہ پھلی پھولی جب عوام تعلیم سے محروم تھے۔ اس دعوے کے حق میں دلائل پیش کئے جا سکتے ہیں کہ تعلیم کے عام ہو جانے سے ہماری سخن فہمی اور سخن شناسی کی قابلیت سلب ہو رہی ہے۔ ہمارا تفلسف ہمیں منطق کی پیدا کی ہوئی دُنیا سے دُور دُور لئے جا رہا ہے۔ جب تک ہم بچوں کی طرح معصوم نہ ہو جائیں ہم شاعری کی سرزمین میں داخل نہیں ہو سکتے۔ شاعری کی دنیا سادہ ہے اور وہاں ہر چیز سادہ طریقے ہی سے دیکھی جا سکتی ہے۔ وہاں تجزیہ کا دخل نہیں نظارے کا عمل ہے۔ جب شاعری اخلاقی تعلیم دیتی ہے تو پھر بھی یہ مشکل اور ناقابل فہم مسائل پیش نہیں کرتی بلکہ مقبولِ عام تشبیہات و ضرب الامثال کو کام میں لا کر جانی پہچانی ہوئی عام صداقتوں کا حُسن دکھاتی ہے۔ تعلیم و تہذیب کے زیادہ ترقی یافتہ زمانوں کی شاعری بھی عموماً عام فہم صداقتوں کے اظہار ہی تک محدود رہتی ہے۔ تفلسف تجزیہ اور قطع و برید کے شوق نے ہمیں شاعرانہ احساس سے محروم کر دیا ہے حالانکہ یہ احساس زندگی کی مسرتوں کے لئے ناگزیر ہے۔ شاعری تعیشات میں نہیں انسانی ضروریات میں داخل ہے۔

حامد علی خاں

جشنِ یومِ ولی

ہمیں مسرت ہے کہ اہلِ اُردو میں اپنے اکابر و اسلاف کی قدر و منزلت پہچاننے کا جذبہ پیدا ہوتا جاتا ہے۔ مولوی ابو الفضل خلیل احمد صاحب آزاد نائب صدر انجمن اتحاد کلیہ بلدہ حیدرآباد دکن نے یومِ ولی منانے کے متعلق ہمیں ذیل کی اطلاع بھیجی ہے جو ہم مسرت کے ساتھ درج کرتے ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ ملک کی دوسری سربرآوردہ ادبی انجمنیں بھی انجمن اتحاد کلیہ کی تقلید کریں گی۔ ولی کے متعلق کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے وہ اگر اُردو کا اولین صاحب دیوان شاعر نہیں تو ہمارے اولین شعراء کا سرتاج ضرور ہے۔

"ہمایوں"

"کلیہ بلدہ کی جانب سے ۲۸ تا ۳۰ جنوری ۱۹۳۷ء جشنِ "یومِ ولی، آدم الشعرائے دنیائے اُردو" منایا جائے گا جس کے سلسلے میں ذیل کے عنوانات پر مقالے درکار ہیں۔ ملک کے اہلِ قلم حضرات سے قوی توقع کی جاتی ہے کہ ان عنوانات پر تحقیقی مقالے تحریر فرما کر بنام نائب صدر انجمن اتحاد گورنمنٹ سٹی کالج ۲۵ دسمبر ۱۹۳۶ء تک روانہ فرما دیں گے۔

کل ہند بین الجامعاتی تحریری مسابقت کے لئے عنوان "اُردو شاعری میں ولی کا رُتبہ" مقرر کیا گیا ہے۔ گریجویٹ اول آنے والے صاحب کو ۵۰ روپے اور انڈر گریجویٹ اول آنے والے صاحب کو ۲۵ روپے انعام دیا جائے گا۔

مقالات کے عنوان

۱۔ دکن میں اُردو شاعری کی ابتداء۔
۲۔ ولی سے پہلے دکن کی اُردو شاعری۔
۳۔ ولی کے زمانہ میں اُردو شاعری کی عام حالت
۴۔ دکن میں قدیم اُردو شاعری کے مختلف ادوار اور نامور شعراء کے حالاتِ زندگی۔
۵۔ ولی کے ہم عصر شعراء
۶۔ ولی اور غزل گوئی۔
۷۔ دکن میں غزل گوئی۔
۸۔ ولی کی شاعری کا اثر دہلی کی شاعری پر۔
۹۔ ولی کی سیر و سیاحت دہلی
۱۰۔ ولی کے تلامذۂ دہلی۔
۱۱۔ ولی کے بعد دکن کی اُردو شاعری۔
۱۲۔ اُردو زبان کی شاعری و ارتقاء میں دکن کا حصہ۔
۱۳۔ ولی کے حالاتِ زندگی
۱۴۔ عہدِ ولی میں اُردو کی عام حالت مختلف صوبہ جاتِ ہند میں۔
۱۵۔ اُردو شاعری میں ولی کا رتبہ۔
۱۶۔ ولی کو اُردو شاعری کا باوا آدم کیوں کہتے ہیں
۱۷۔ دکن کے وہ شعراء جنہوں نے ولی کی تقلید میں شمالی ہند کا سفر کیا۔
۱۸۔ ولی کی زبان۔
۱۹۔ ولی کا اسلوبِ شعر اور جدید شاعری
۲۰۔ ولی کی شاعری کی خصوصیت
۲۱۔ شمالی ہند کے وہ شعراء جنہوں نے دکن کا سفر کیا۔
۲۲۔ محاسنِ کلامِ ولی۔

ابو الفضل خلیل احمد آزاد
نائب صدر انجمن اتحاد کلیہ بلدہ حیدرآباد دکن

نظیری کے چند شعر

نظیری ← → ترجمہ

ساقی بشوِ دو رنگیِ اُمید و بیم را
بنما بما حقیقتِ رنگِ قدیم را

دھو دے پیارے ساقی دھو دے آس یاس کی فکر دو رنگی
پھر سے دکھا دے وہی پُرانی آن بان اپنی یک رنگی

حرفِ فریبِ آدم و ابلیس تا بہ چند
چندے بگو ترانۂ نُقل و ندیم را

آدم اور ابلیس کی آخر رام کہانی کہے گا کب تک
یاد دلا پھر بھُولے ہوؤں کی دل سے جائے یہ دل کی تنگی

از ساغرے درست خودم بخش جرعۂ
بر طاق نہ حکایتِ جامِ دو نیم را

اس اپنے اچھّے پیالے میں بہت نہیں تو تھوڑی دیدے
ہؤا جو کوزہ ٹوٹ کے ٹکڑے اب کیوں اُس پر خانہ جنگی

گو مفلسانِ کعبہ بگریند کآبِ چشم
بر عرش بُردہ از درِ مسجد یتیم را

کعبے کے کنگال کہاں ہیں خون کے آنسو روئیں کہہ دو
بے ماں باپ کے اُس بچّے کی پہنچی عرش تلک دل تنگی

مقبول حسین احمد پوری

اُردو

ہماری زبان

ذیل کا فاضلانہ مضمون اردو کے زبردست ادیب اور محقق علامہ برجموہن صاحب دتاتریا کیفی دہلوی نے اُردو کانفرنس علی گڑھ کے موقع پر پڑھا تھا۔ اس مضمون میں علامۂ ممدوح نے تاریخی استدلال سے یہ ثابت کیا ہے کہ اُردو زبان مسلمہ طور پر ہندوستان کی متحدہ قومیت کی زبان ہے اور یہی نہیں کہ مدعیانِ چپت کے علی الرغم یہ مسلمانوں کی مذہبی زبان ہرگز نہیں بلکہ اس کی داغ بیل ہندو مسلمانوں کے بین الاقوامی تعلقات نے اُس وقت ڈالی تھی جب ہندوستان میں تو کجا شاید دنیا ہی میں اسلام کا وجود نہ تھا۔ یہی وہ زبان ہے جو بعد میں ہندی اُردو اور ہندوستانی وغیرہ کے ناموں سے موسوم ہوتی رہی۔ اوّل الذکر اور آخر الذکر نام چونکہ بوضاحت اس زبان کی قومی حیثیت کے آئینہ دار تھے اس لئے وقتاً بعد وقتٍ ہشیار دوستوں نے انہیں گول مال کر لیا اور اب یہ نام وہ اپنی متعصبانہ مصلحتوں کے پیشِ نظر ایک ایسی زبان کے سر چپکا دینا چاہتے ہیں جسے ہندوستان کی دوسری قومیں تو کجا بڑے بڑے ودوان پنڈتوں کے علاوہ خود ہندو عوام بھی کبھی نہ جانتے تھے۔ ناموں کی چوری سے اردو زبان لنڈوری نہیں ہو سکتی۔ اس کا تیسرا نام اور پھر باقی سب نام بھی یارانِ تیز گام کی نذر ہیں۔ ”ہمایوں“

اللہ بخشے خواجہ میر دردؔ دو مصرعوں میں کتنی گہری نفسیاتی حقیقت بیان کر گئے ہیں۔ فرمایا ہے: ؎

اے دردؔ کہوں کس سے بتا رازِ محبت　　　　عالم میں سخن چینی ہے یا طعنہ زنی ہے!

لیکن حضرات! آج سخن چینی اور طعنہ زنی کے خوف کو اونچے سے طاق پر رکھ کر آپ سے دو چار باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ وہ باتیں روکھی پھیکی سہی لیکن دل سے نکلی ہوئی ہیں اور دل سے سننی چاہئیں۔

یہ کھُلی بات ہے کہ کچھ مدت سے اُردو ہندی کا معاملہ ایک ہنگامہ خیز معرکہ بن رہا ہے۔ اس وقت اس سے بحث نہیں کہ ایسا کیوں ہوا؛ بحث اس سے ہے کہ اس بارے میں ادبی اور تواریخی واقعات کن امور پر روشنی ڈالتے ہیں؛ سب سے پہلے میں اس سوال پہ کچھ تاریخی کوائف اور چند ادبی اور لسانیاتی حقیقتیں آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

لوگ ہماری زبان کے نام پر اکثر بے موقع طبع آزمائی اور غیر ضروری طوالت سے کام لیتے ہیں۔ میں اس مسئلہ کو چند جملوں میں ختم کر دوں گا۔ کہا جاتا ہے کہ جان گلگرسٹ نے صرف ہندوستانی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ مانا۔ اگر میرا حافظہ ستم ظریفی نہیں کرتا تو شاید انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں بھی ہندوستانی ہی آیا ہے اور تذکرہ ہے اُردو کا۔ ڈنکن فاربس اپنی اُردو کی قواعد کا نام ہندوستانی گرامر رکھتے

ہیں۔ لیکن اسی کتاب میں ایک مقام ایسا آیا ہے جو اس امر کو صاف کر دیتا ہے کہ اُردو اور ہندوستانی دو زبانیں نہیں۔ یہی صاحب اس گریبر کے حواشی کے صفحہ ۸۰ پر لکھتے ہیں" ہندوستانی یا اُردو یا زبان ریختہ"۔ یعنی ہندوستانی اور اُردو اور ریختہ مترادف الفاظ ہیں۔ اس کتاب میں تمام قواعد زبان اُردو پر حاوی ہیں۔ رسم پرستی سے کتاب کے نام میں ہندوستانی لکھ دیا۔ جان گلگرسٹ کا نام نامی ابھی مذکور ہؤا۔ اس نام کا جو تعلق فورٹ ولیم کے کالج اور مطبع سے تھا اس کی صراحت کی ضرورت نہیں۔ انہی صاحب کی تحریک سے میر امّن مرحوم نے باغ و بہار لکھی جو فورٹ ولیم کے تاریخی مطبع نے چھاپی اور شائع کی۔ اس کے مقدمہ میں میر امّن اُردو کا ذکر کچھ تفصیل سے کرتے ہیں اور اپنی کتاب کی زبان کو اُردو ہی بتلاتے ہیں۔ ایک اور امر قابل ذکر یہ ہے کہ مسلمان اور ہندو مصنف بھی اب ایک صدی پہلے اور اس ... تک بھی اُردو کو ہندی کہا کرتے تھے۔ شاہ عالم بادشاہ کے عہد میں ایک صاحب منشی محبوب لال دہلوی نے ایک کتاب تالیف کی جس میں موضوع کی پابندی سے مختلف شعراء کے اشعار جمع کئے، گلستان مسرت اس کے بعد اور اس کو سامنے رکھ کر مرتب ہوئی ہے۔ اس کتاب کے دیباچہ میں منشی صاحب موصوف لکھتے ہیں:۔

" ازانجا کہ ریاحین اشعار ہندی کہ خالی از آب و رنگ لطافت نیست ...."

اور ابواب کی تفصیل میں فرماتے ہیں:۔

"گلدستۂ ہفتم مشتمل بر ہشت گل۔ گل اول در بیان افراد و قطعات و رباعیات ہندی ...."

حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب میں ہندی کا کوئی چھند، ایک دوہا تک نہیں ہے۔ تمام و کمال کلام فارسی ہے یا اُردو، اُردو میں میر، مصحفی، انشا اور معروف تک کا کلام ہے۔ یہ کتاب قدیم نستعلیق ٹائپ میں مسٹر ہنری پرنسپ کی سرپرستی میں چھپی، اس ضخیم کتاب کا نام گلدستۂ نشاط ہے۔ بڑی تقطیع کے چار سو سے زیادہ صفحوں کی ہے اور میرے کتب خانہ میں موجود ہے۔ یہ بھی مطبع فورٹ ولیم سے شائع ہوئی۔

اب یہ قضیہ صاف ہوگیا کہ ناموں کی گڑبڑ سے استدلال فضول ہے۔ ہندوستانی، ریختہ اور اُردو وغیرہ ایک ہی زبان کے نام ہیں۔ امپیریل گزیٹیر آف انڈیا مطبوعہ ۱۹۰۸ء میں صرف اُردو کا لفظ ہی استعمال ہؤا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ سید انشا کی تاریخی تصنیف رانی کیتکی کی کہانی ہو یا جناب آرزو لکھنوی کی فارسی الفاظ سے معصوم غزلیں۔ یہ سب اُردو ہیں۔ ہماری اصطلاح میں ایسی انشاپردازی کو نکھار اُردو کا نام دیا گیا ہے۔

نام کی نسبت اسی قدر کہنا کافی ہے۔ اب اس پر سرسری نظر ڈالنی ہے کہ اُردو کیونکر بنی اور کون لوگ اس کے بنانے کے زیادہ تر ذمہ دار ہیں؛ یہ بحث بہت طوالت اور تفصیل چاہتی ہے۔ یہاں صرف اتنا کہا جائے گا کہ ہندوستان میں اسلامی حملوں اور فتوحات سے پیشتر اُردو کی داغ بیل پڑجانا قرین قیاس ہے۔ ایک صدی کے قریب زمانہ گزرا کہ منشی قمر الدین نے ایک کتاب مسمی بہ احقیق اللسان

تصنیف کی اس میں لکھا ہے ۔

"پیش از سلطنتِ اسلام نیز رایان و راجگانِ ہند باسر برآرایانِ ایران و افغانستان نامہ ہا و مکاتیب بزبانِ پارسی می نوشتند و پیغامہا بہ زبانِ سفیر پارسی می گزاشتند۔"

اس کے ساتھ ہی یہ امر تنقیح بھی نظر میں رکھنا ہے کہ البیرونی نے جو ہندوستان میں پنڈتوں سے سنسکرت پڑھی تو درس و تدریس کی زبان کیا تھی ؛ کوئی مشترک زبان ضرور ہوگی ورنہ استاد شاگرد کو درس کے معنی اور مطلب کس طرح سمجھا سکتا۔ اُس زمانے میں کنڈر گارٹن تو نکلا ہی نہ تھا کہ چرخے اور گھوڑے کی تصویر دکھا کر اُستاد شاگرد کو سمجھا دیتا کہ یہ ہے چرخا اور یہ ہے گھوڑا۔ اور شاگرد اپنی زبان کا مناسب لفظ اس کے لئے قرار دے دیتا۔

اوپر کا فارسی اقتباس یہ قیاس نہیں یقین دلاتا ہے کہ ہندوستان کے رایوں اور راجاؤں کے دربار سے جو فارسی مراسلے اور خریطے اسلامی ملکوں کو جاتے تھے وہ ضرور ہندو پرشین سکرٹریوں کے لکھے ہوئے ہوں گے۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ ان مراسلوں کی نوعیت سیاسی ہوگی اور اندازِ تحریر مدبرانہ ہوگا۔ یہ اہم ذمہ داری وہ ہندو دربار غیر ملک کے لوگوں کے سپرد نہیں کر سکتے تھے۔ لابُد ہے کہ وہ پرشین سیکرٹری ہندو ہی ہوں گے اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ تلک جو محمود غزنوی کے زمانے میں ہوا ہے فارسی بہت اچھی جانتا تھا تو جو کچھ ابھی کہا گیا قیاس کی حد سے بہت آگے پہنچ جاتا ہے۔ ثابت یہ ہوا کہ ہندوستان میں اسلامی تسلط سے پیشتر فارسی کا علم کم و بیش موجود تھا جبھی تو چند کوی کی نظموں میں فارسی الفاظ اور کہیں کہیں فارسی مرکبات ملتے ہیں جو بعض محققوں کو چونکاتے ہیں۔

یہ تو ہوئیں پرانی باتیں جو عہدِ حاضر کے قضیہ لسانیہ سے مبادیات کا تعلق رکھتی ہیں۔ ہماری اُردو ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترک مساعی اور اتحاد کا نتیجہ ہے۔ اس کی تنظیم و تدوین میں ان دونوں فرقوں کی شرکت ہے۔ یہ تنظیم سلطان اور رعایا، حاکمی و محکومی، افسری اور ماتحتی کی لم سے مبرا ہے۔ وہ ایک مبارک ثمر تھا اُس ادبی کل برکش اور طوبیٰ کے پیوند کا جو قدرت نے ہندوستان کی زمین پر بھیجے۔ یہاں معاشرت نے انہیں پیوند کیا۔ رواداری نے اس کو تہذیب تمدن کے امرت سے سینچا اور شائستگی نے اس کی منزوی شاخ تراشی کی، حسنِ سلیقہ اور شعورِ نفسیاتی نے موافق ہوا مہیا کی، تب یہ قلمی پودا پروان چڑھا اور پھولا پھلا۔ اب انہیں باغبانوں کی نسلیں اگر اس سرسبز نونہال کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنا چاہیں تو سمجھ لیجئے کہ یہ کیا بات ہے؛ اس سے آگے میں کچھ نہیں کہوں گا۔

حضرات! آپ قیاس کر سکتے ہیں کہ سب سے بڑا سماجی گناہ کیا ہے؛ وہ ہے سچ بولنا۔ سانچ کو آنچ ہو یا نہ ہو لیکن سادہ اور زندگی میں سب سے بُرا سچ بولنے والا سمجھا جاتا ہے۔ عربی کا مقولہ اَلْحَقُّ مُرٌّ کبھی سے زیادہ آج درست بیٹھتا ہے۔ مگر میں اس سے نہیں جھجکتا۔ ابھی یہ امر واقع پایۂ ثبوت کو پہنچایا گیا ہے کہ اسلامی تسلط کے قریب بلکہ اس سے پہلے ہندو فارسی سے واقفیت رکھتے تھے۔ میں کہتا ہوں وہ ہندو ہی تھے جنہوں نے مسلمانوں سے مل کر اُردو کی تدوین کی۔ غیر مرئی زبانوں میں مفرد لغات

کا باہر سے لے کر داخل کر لینا ایک بات ہے۔ وہ مصدر اور افعال میں جو ایک زبان کی صرفی نوعیت اور ادبی حیثیت پر مستقل اثر ڈالتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ مصدر کی علامت فارسی میں دَن اور تَن ہے اور پراکرت اور شورسینی اور اس سے ماخوذ اکثر آپ بھرنش بھاشاؤں میں نَ اور اس کا ماقبل مفتوح مصدر کی علامت رہی ہے۔ اُردو میں یہ علامت نَا قرار پائی جسے بعد میں ہندی نے اختیار کیا۔ اس اختراع کے بعد انہوں نے مصدر سے تمام افعال وضع کئے اور اس میں ملکی اور غیر ملکی مادّوں کے ساتھ مساوات کا سلوک ہُوا۔ مثلاً بخشنا، خریدنا۔ بدلنا، فرمانا وغیرہ۔ مصادر جو فارسی اور عربی سے ماخوذ تھے۔ اُن کو اس طرح اپنایا گیا کہ اُن کی اور آنا۔ جانا۔ لینا۔ دینا کی حیثیت میں بال برابر بھی فرق نہ رہا۔ اُردو کا یہ اختراع ہندی کو بھی قبول ہُوا گسائیں تلسی داس کا ارشاد ہے:؎

تو غریب کو نواز ہُوں غریب تیرو

نواختن سے نوازنا مصدر بنایا گیا اور اس سے نَوَاز صیغہ امر مشتق ہُوا۔ اسے کہتے ہیں لسانیاتی تصرّف۔ یہ ہے ایک اجنبی لفظ کو اپنانا۔ لہجہ کے فرق کے ساتھ یہ مصرع لسانیاتی نقطۂ نظر سے آج کل کی اُردو زبان میں ہے۔ امر کا یہ صیغہ اور دوسرے عربی، فارسی لفظ گسائیں جی کے کلام میں کہاں سے آئے۔ اس کا ذکر آگے آئے گا۔ مصادر اور افعال اسموں کے علاوہ بڑی تعداد میں باہر کی زبانوں سے لے لئے گئے تھے جو اس ہند ایرانی زبان میں سموئے ہوئے ہیں جسے آپ اُردو کہتے ہیں۔ یہ زبان دیوناگری حروف میں لکھی گئی تو ہندی کہلانے لگی۔ چنانچہ گسائیں جی کی رامائن میں نشان، فوج، نفیری، شہنائی وغیرہ الفاظ موجود ہیں۔ ان سے پہلے کبیر داس اور گرونانک کے کلام میں وہ اختراعی اور اجتہادی ترکیبیں اور الفاظ کثرت سے ملتے ہیں جو ابتدائی اُردو والوں نے پراکرت اور اپ بھرنش بھاشاؤں سے لے کر سودھے یا بنائے۔

جو فارسی اور عربی لفظ نئی زبان میں آسمائے وہ کام ہے زیادہ تر اُن بزرگوں کا جو اُدھر عربی اور فارسی جانتے تھے اور اِدھر پراکرت اور اپ بھرنش سے واقف تھے ان میں ہندو اور مسلمان دونوں برابر کے حصّہ دار ہیں۔

اب یہ سوال اُٹھتا ہے کہ اُردو دو قوموں کے میل جول اور دیسی اور بدیسی زبانوں کے اختلاط سے پیدا تو ہو گئی لیکن کیا بعد میں بھی ہندو اس کو اپنی زبان سمجھتے رہے اور اس کو استعمال کرتے رہے؛ حضرات! میں اس تنقیح کو جو نہایت اہم ہے گمنام میں رکھنا پسند نہیں کرتا۔ سنئے ہندوؤں میں تبلیغِ مذہب تو عرصہ سے بند ہو چکی تھی۔ تقریباً دو ہزار برس کے بعد اب پھر تازہ ہوئی ہے۔ اس واقعہ کو نظر میں رکھ کر دیکھنا یہ ہے کہ ہندوؤں میں دھرم پرچار کے سلسلے میں اُردو اختیار کی گئی یا نہیں؛ اگر تحقیق سے اس کا جواب اثبات میں ملے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اُردو کو ہندوؤں نے اپنے ہندو بھائیوں کی دینی ہدایت کے لئے استعمال کیا جس طرح اسلامی تسلط کے ابتدائی عہد میں مسلمان مومنوں نے نَو مسلموں کی ہدایت کے لئے اُردو کو برتا۔

اُنیسویں صدی عیسوی کے اوّل برسوں میں اچھوت ادھار اور ہری جنوں کی تبلیغ یا شُدھی کا نام تک کوئی نہ جانتا تھا مگر ۱۸۱۹ء مطابق ۱۲۳۴ھ میں سری بھاگوت کا دسواں اسکند یعنی باب اُردو کی ایک ضخیم مثنوی مسمیٰ آئینۂ مستور کی صورت میں ظہور پزیر ہوتا ہے۔ یہ کئی سو صفحے کی قلمی کتاب میرے کتب خانہ میں موجود ہے۔ یہ مذہبی اور اعتقادی کتاب ایک ہندو اپنے ہندو بھائیوں کے لئے اچھی اُردو نظم میں تصنیف کرتا ہے۔ اس سے بدیہی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ ہندوؤں میں اُردو کہاں تک حاوی و ساری تھی۔ نمونہ کے طور پر ایک جگہ سے اس کے دو چار شعر سُننا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کرشن مہاراج دوارکا سے اودھو جی کو متھرا بھیجتے ہیں کہ وہ برجباسیوں کو سمجھائیں کہ وہ مہاراج کی لڑکپن کی لیلاؤں کو بھُلا کر جن کی یاد نے انہیں دُنیا سے بیزار کر دیا تھا اپنے اپنے کام میں لگیں۔ ملاحظہ ہو:۔

سُنا یہ گوپیوں نے ماجرا جب — تو ہو بے تاب و طاقت یک بہ یک سب
چلیں جُوں سیل سوئے قاصدِ یار — کہ تا رازِ نہاں سے ہوں خبردار
ہوئیں بر گرد اودھو اس روش جمع — کہ پروانہ ہو جوں پیرامن شمع
جو دیکھی سب نے وہ اودھو کی صُورت — بہ آبِ چشم دھو گردِ کدورت

. . . .

مختصر یہ کہ سنسکرت اور ہندی بھاشاؤں کے ہوتے ساتے ہندوؤں نے اُردو کو اوراد و وظائف سے یا زیادہ احتیاط سے یہ کہئے کہ مذہبی اور ملّی تقریبوں سے خارج نہیں کیا۔ شکت چالیسی ایک اُردو کی کتاب استوتر یعنی وظیفہ کی ہے۔ یہ اُردو کے مخمس ترجیع بند کی صنف سے ہے۔ ہر بند کے چار مصرعے ٹھیٹ اُردو میں ہیں اور ترجیع کا مصرع "نمس تسئی" چار بار آتا ہے۔ اس کو میں نے پوجن کے سلسلے میں وظیفہ یا مناجات کی طرح پڑھتے ہوئے دیکھا ہے اور یہ دھیان میں رکھنے کی بات ہے کہ تلسی داس رامائن لکھ چکے تھے۔ اس کی کتھا برابر ہو رہی تھی۔ مہابھارت اور بہت سے پُران اور دوسری مذہبی کتابیں ہندی میں منتقل ہو چکی تھیں۔ لیکن اپنے اہالیٔ ملت میں دھرم پرچار کی کمی محسوس ہوئی جب تک کہ اُردو سے کام نہ لیا گیا۔ اس ضمن میں منشی شنکر دیال فرحت، منشی رام سہائے تمنّا اور خوشتر وغیرہم حضرات نہ صرف ہندوؤں کے بلکہ تمام اُردو دُنیا کے شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے مہابھارت، رامائن، گیتا مہاتم، شو پُران، گنیشی پُران اور جانکی بجے وغیرہ دھرم پستکیں اُردو میں تصنیف اور ترجمہ کیں۔ یہ کتابیں منشی نولکشور کے مشہور عالم مطبع سے چھپکر آج تک شائع ہو رہی ہیں اور ہندوؤں میں ان کے مذہب کی تلقین اور روایاتِ ملّی کے زندہ رکھنے کا باعث بنی ہوئی ہیں۔ ان نظم کی کتابوں کے علاوہ بہت سے اُپنشد اور چھیوں شاستر اور سمرتیاں اُردو نثر میں منتقل ہو کر شائع ہوئیں اور آج تک ان کی مانگ برابر جاری ہے۔ یہی حال آریہ سماج کے لٹریچر کا ہے۔ یہ سوال بہت برمحل ہوگا کہ اگر اُردو کا ہندو دینیات یا ملّیات پر کچھ اثر ہے تو اُردو کے معترضین بتائیں اور ثابت کریں کہ ان کتابوں سے ہندو دھرم یا جاتی کی کیا ہانی ہوئی؟

...ں نے یہی نہیں کیا کہ اپنے دھرم کی کتابیں اُردو میں ترجمہ یا تالیف کیں بلکہ رواداری یہاں تک عمل پیرا ہوئی کہ دوسرے مذہب کے بانیوں اور بزرگ ہستیوں کی شان میں اُنہوں نے جو کچھ لکھا وہ دوسری جگہ بھی مقبول ہُوا۔ سُرور جہان آبادی کی نعت اِس وقت مولود شریف کے جلسوں میں نہایت خلوص سے پڑھی جاتی ہے اور اتنی ہی دلچسپی سے سُنی جاتی ہے یہ سب جانتے ہیں کہ سُرور جہان آبادی ہندو ہی رہے اور ہندو ہی مرے۔ جب نعت اور اتنی مقبول عام نعت اُردو میں لکھ کر ایک ہندو ہندو دھرم پر قائم رہ سکتا ہے تو پھر یہ خوف کہ اگر ہندو اُردو سے دل لگائیں گے تو ان کے دھرم اور مذہبی روایات کو صدمہ پہنچے گا۔ ایک مریضانہ واہمہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا، جس کا علاج نہ چرک کے پاس ہے نہ لقمان کے۔

آپ نے دیکھا کہ اُردو کی تعمیر وتدوین اور ترویج میں ہندوؤں کا کتنا مقتدر حصّہ ہے۔ آپ نے دیکھا کہ ہندوؤں کی مذہبی اور ...ی کتابیں کس کثرت سے اُردو میں لکھی گئیں۔ اور آپ دیکھتے ہیں کہ بھگوت گیتا کے ایک سے زیادہ نئے ترجمے اور تفسیریں اُردو ...ظم اور نثر میں ہر سال بلاناغہ شائع ہوتے رہتے ہیں۔ آپ نے یہ بھی دیکھا کہ نعتیہ کلام بھی ہندوؤں کو ہندومت سے برگشتہ نہ کرسکا۔ ...واقعہ بھی ذہن میں رکھنا ہے کہ ہندوؤں کے اُردو اخباروں کے خصوصی نمبر یعنی کرشن نمبر یا بجے دشمی نمبر وغیرہ میں مسلمانوں کی لکھی ہوئی چیزیں کتنی ہوتی ہیں۔ اگر کوئی ہندی والا (میرا مطلب ہے اُردو ہندی کے جھگڑے کا علمبردار) اس وقت یہاں موجود ہے تو سامنے آکر بتلائے کہ جو واقعات ابھی پیش کئے گئے ان میں سے کونسا صداقت سے محروم ہے۔

مسلمانوں نے ہندی کی جو خدمت اور اعانت کی وہ ہندی ساہتیہ کی تاریخ میں عظیم الشان جگہ رکھتی ہے۔ یہی نہیں کہ خانخاناں رحیم اور ملک محمد جائسی اور رس خاں جیسے مستند شاعر اور صاحب تصنیف اُنہوں نے پیدا کئے بلکہ مسلمان بادشاہوں نے ہندی کی سرپرستی میں تنگدلی کا اظہار کبھی نہیں کیا۔ جہانگیر اکبر کے عہد کو جانے دیجئے۔ پکّے مسلمان اورنگ زیب کے عہد اور دربار کا حال سُنئے۔ کبتا کومدی کے فاضل مصنف نے اپنی کتاب میں جابجا اُردو شاعری کے متعلق انوکھی اور نرالی باتیں لکھی ہیں۔ جو حقیقت سے کوسوں دُور اور مؤرخانہ حیثیت سے معصوم ہیں۔ لیکن وہ بھی یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ مشہور رزمیہ شاعر یعنی بیر رس کا بادشاہ بھوشن کوی کا بھائی چنتامنی کوی اورنگ زیب کے دامن دولت سے وابستہ تھا۔ اُسی کے توسّط سے بھوشن کوی مغل دربار میں دہلی پہنچے اور وہیں رہے جب تک کہ دکن پہنچ کر سیواجی کی خدمت میں باریاب نہ ہوئے۔ (دیکھو کبتا کومدی۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۲۶) صاحب کبتا کومدی نے تو صرف ہندی کے ان دو ہندو شاعروں کا ذکر کیا ہے جو اورنگ زیب کے دربار سے متعلق تھے، لیکن مسٹر ایف ای۔ کیئی (F. E. Keay, M.A.) اپنی ہسٹری آف ہندی لٹریچر میں لکھتے ہیں:۔

"سخت گیر اورنگ زیب ہندوؤں کے آرٹ اور علوم کا دلدادہ نہ تھا لیکن (ہندی کے ہندو) شعراء دربار کی اعانت اور سرپرستی سے قطعاً محروم نہیں رہے اور بہت سے شاعر اورنگ زیب اور اس کے بیٹے بہادر شاہ

(۱۶۸۸ء سے ۱۷۱۲ء تک) کے دربار سے وابستہ تھے۔" (ص ۴۶)

جب اورنگ زیب کے دربار میں ہندی کے اور ہندو شاعروں کے لئے جگہ تھی تو اور مسلمان بادشاہوں اور چھوٹی سرکاروں کا تذکرہ اس ضمن میں غیر ضروری ہے۔ یہ تو ہوئی مسلمان بادشاہوں کی پرانے زمانے کی بات۔ اب عہدِ حاضر کی سنئے۔ حضرت آرزو کا نام آگے آ ہی چکا ہے۔ میرے مکرم جناب نیاز فتحپوری اپنے مفرس اور معرب اسلوب کے لئے بہت بدنام ہیں لیکن وہ بھی جذباتِ بھاشا کی ترتیب کے بغیر چین نہ پا سکے اور ابھی کچھ مہینے ہوئے ہندی شاعری کے مختلف موضوعوں سے متعلق جو انہوں نے ایک سالم نمبر اپنے رسالہ نگار کا وقف کر دیا۔ اس امر کی دلیل ساطع ہے کہ مسلمان ہندی سے نافر نہیں ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی اس نزاع کے علمبرداروں کی آنکھ میں بہت کھٹکتی ہو گی مگر اس کا نصابِ تعلیم دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ حیدر آباد میں جہاں اردو ایک واحد مضمونِ درس ہے وہاں اردو کے ساتھ ہندی بھی بطور اس کے رکنِ اساسی کے موجود اور اس میں شامل ہے۔

دوسری طرف بھی پایا جاتا ہے کہ ہندی اور ہندی والوں سے سرد مہری اور بے اعتنائی کا سلوک ہرگز نہیں منشی پریم چند جن کا ابھی سرگباس ہوا اور جن کی بے وقت وفات کا ہم سب کو بے حد افسوس ہے، اردو میں افسانچہ نویسی کے موجد ہیں۔ انہوں نے یہ کیا کہ اردو میں اس فن کو پختگی دے کر اسے ہندی میں بھی جاری کیا۔ یہی نہیں کہ اردو میں افسانہ کو ترقی دیتے رہے بلکہ ہندی کی صحافت کا بھی پایہ بلند کیا۔ میرے دوست جناب ساحر دہلوی اپنی بزم ادب کے عظیم الشان اردو مشاعروں کے ساتھ ہندی کوی سمیلن بھی منعقد کیا کرتے ہیں۔ یہ واقعات بدیہی ثبوت ہیں اس امر کا کہ اردو والے ہندو ہوں، یا مسلمان ان کا سلوک ہندی سے معاندانہ ہرگز نہیں لیکن دوسری طرف سے جو کچھ ہو رہا ہے بیان کا محتاج نہیں ؎

توشرطِ یاری و رسم روا داری نمی دانی   ہمیں دل می توانی برد و دلداری نمی دانی

اگر ہم اردو ادب پر ایک اچٹتی ہوئی نظر بھی ڈالیں تو واضح ہو گا کہ اردو کے شعراء نے خالص ملکی یعنی ہندوستانی میں کہوں گا ہندوانی روایات اور تلازموں کو اردو زبان اور ادب سے یہی نہیں کہ خارج نہیں کیا بلکہ ان کو رواج دیا اور چمکایا یہ ٹھیک ہے کہ دجلہ اور جیحون، بدخشاں اور بیستون، اور فرہاد اور مجنوں بھی اردو میں داخل ہو گئے لیکن گھر کی مرغی مرغی ہی رہی اور گھر کا جوگی جوگنا نہیں بنا۔ گھر کا جوگی اور باہر کا برہمن دونوں یار بن گئے۔ اس ضمن میں سند کے طور پر اردو کے چند مسلمان شعراء کے کلام سے استفادہ کیا جاتا ہے جو بے محل نہیں ؎

میر

ریگستان میں جا کے رہے یا سنگستاں میں ہم جوگی   رات ہوئی بس جاگہ ہم کو ہم نے وہاں بسرام کیا

دل کی قدر کی کہی نہیں جاتی نازک ہے اسرار بہت — انچھر تو ہیں عشق کے دو ہی لیکن ہے بستار بہت

جرأت

شاید آجائے کبھی ہاتھ عروسِ گیتی — اسی اُمید پہ ہم بیٹھے ہیں آسن مارے

دردِ دل اس بُتِ بے درد سے کیسے تو کہے — جا کے یہ رام کہانی تو سُنا اور کہیں

مصحفی

چہرہ اُتر گیا ہے، نقشے بگڑ گئے ہیں، — پھر ان دنوں تو میرے لچھن سے جھڑ گئے ہیں

رنگین

ہے یہ گھر لنکا یہاں ہر کون باون گز سے کم — ایک سے ایک آہ بندی کی سہیلی قہر ہے،

نصیر

ترے ہی نام کی سمرن ہے مجھ کو اور تسبیح — توہی ہے وردِ ہر اک صبح و شام عاشق کا

معروف

غیر ہفتہ کے دن آیا جو سفر سے معروف — میں نے جانا کہ بس اب مجھ پہ سنیچر آیا

آتش

ارادہ عرشِ اعظم کا ہے آؤ صبح گاہی کو — درِ فریاد رس پر چل کے اب دھونی سمائی ہو

اسیر

چاہے قسم جو یار تو کیا کیا اُٹھائیے — قرآن سر سے آنکھ سے گنگا اُٹھائیے

وزیر

ہُوا دھوپ میں بھی نہ کم حسنِ یار — کنھیّا بنا وہ جو سنولا گیا

کب شعر ہم نے یار کے آگے لکھے نہیں — کس دن ہمارے پھول ہیر چڑھے نہیں

اُردو کیا ہے؛ دو مختلف معاشرتوں، دو مختلف مذہبوں۔ دو مختلف کلچروں کے شیر و شکر ہونے اور ارتباط کی یادگار، وہ ہے عرب کے مذہب اور ایران کی کلچر کا دنیا کی سب سے قدیم کلچر یعنی آرین تہذیب کے تصادم نہیں۔ اختلاط۔ یہ سب کچھ اپنے آپ ہُوا۔ جس وقت ہندوؤں نے فارسی پڑھنا اور اُردو کی نیو رکھنا شروع کیا تھا اُس وقت اسلامی حکومت نے

ہیکالے کے تاریخی منٹ کا سا کوئی فرمان جاری نہیں کیا تھا۔ بلکہ جو کچھ ہُوا بالطبع ہُوا۔ نتیجہ یہ کہ فریقین اپنے اپنے اعتقاد پر قائم رہ کر فروعی اختلافوں اور رسمی نقیضوں کو بھلا بیٹھے۔ تعصب اور عصبیت کی جگہ رواداری اور موالات نے لے لی۔ رہنا سہنا، خوشی اور غمی کی تقریبوں میں شرکت۔ یہ باتیں معاشرت کا روزمرّہ ہوگئیں۔ یہ سب اُردو اور اُردو کے کلاسیکل سکول کی برکت ہے۔ لٹریچر میں دَیر وحرم پر وہ سخت دعا دے ہوئے کہ الامان سبحہ و زنّار ہوا میں اُڑ گئے۔ زہد و تقویٰ کا قُل ہوگیا۔ غرضکہ کیا کچھ نہ ہُوا۔ اس میں ہندو اور مسلمان شعراء کا پلّہ برابر تھا۔ اور ہم یعنی اُردو والے خواہ کسی قوم اور مذہب کے ہوں اب تک اُسی رستے پر چلے جا رہے ہیں۔ شعر سے اخلاق اور اخلاق سے کردار متاثر ہُوا۔ اور معاشرت نے وہ رنگ پکڑا اور ایک ایسی کلچر پیدا ہوگئی جس کی مثال روما اور یونان کا میل بھی پیش نہیں کر سکتا۔

وہ ہندو ہوں یا مسلمان۔ ہندی والے ہوں یا اُردو والے جو اس ہندسمان رواداری اور ہندیرانی کلچر کو فنا کرنے کی فکر میں ہیں یقین جانئے وطن کے بدخواہ اور خود اپنے دشمن ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

فرق کیا واعظ و عاشق میں بتائیں تم کو
اُس کی حجت نہ گئی اُس کی محبت نہ گئی

اگر پوچھا جائے کہ پھر یہ گڑبڑ اور شورا شوری کیوں ہے؟ اس کا مختصر جواب تو یہ ہے کہ ؎

زرہ دور است خلق از انحراف وضع کج فہمی
وگرنہ ہیچ کس را لغزش گامے نمی باشد

جو لوگ یہ سمجھ بیٹھے ہیں اور اس تیقن کے ساتھ کھڑے ہوئے ہیں کہ ہندو دھرم قائم نہیں رہ سکتا اگر ہندی لنگوا فرینکا نہ بنے یا جن کا عقیدہ یہ ہے کہ دین اسلام کو صدمہ پہنچے گا اگر اُردو کو ہندی پست کر دے تو میں کھلے خزانے کہتا ہوں کہ وہ دونوں غلطی پر ہیں۔ میں ہندی اور ہندی والوں کو دیکھتا اور سُنتا ہوں مگر اُردو والوں کو سمجھتا ہوں اور بلا خوف اختلاف کہتا ہوں کہ اگر یہ ساٹھ برس میں نے اُردو کے پیچھے اور اُردو والوں میں بے فائدہ ضائع نہیں کئے تو میں جانتا ہوں اُردو والے جو واقعی اُردو کے کفیل اور وکیل ہیں اُن کو یہ سالنا نہیں کہ اُردو کے ساتھ دین اسلام اور ملّت بیضا پست ہو جائیں گے۔ اُن کو اور مجھ کو رونا ہے تو یہ کہ اُردو کی مخالفت جس جوش و خروش کے ساتھ اب شروع ہوئی ہے اور جو منافقانہ پراپگینڈا کیا جا رہا ہے اس کا زہریلا اثر وطنیت اور صدیوں کی بنائی ہوئی کلچر کو ملیامیٹ کر دے گا اور ہمارے ہندوستانی تمدن اور معاشرت کی وجاہت کا خون اپنی گردن پر لے گا۔

جمہور کا حال جُداگانہ ہے۔ جوش اور جذبہ۔ جوش اور جذبے کی تحریک کیا ہی کرتا ہے۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ ثقات کا کیا رویہ ہے اور اب تک رہا ہے کشش بازگشتی یا ردِّ عمل جیسا طبیعات کا اٹل قانون ہے ویسا ہی اجتماعی نفسیات کا۔ غیرت اور خودداری بے شک انسان کے شعار کا جوہر ہیں اور یہ کہنا بجا ہے کہ ؎

جان ما تاب زہر زلف پریشاں نہ خورد　　　دلِ ما آب زہر چاہِ زنخداں نہ خورد

حضرات! اُردو کچھ حلوائے بے دُود نہیں جسے کوئی چُپکے سے نگل جائے۔ اُردو کہئے یا ہندوستانی اس کی جڑیں دُور تک پہنچی ہوئی ہیں۔ اس میں اصلاح اور ترمیم کی ضرورت ہے جو ہر زندہ زبان میں ہُوا کرتی ہے اور یہ کام ہے ہمارا۔ ہندی کی ترقی سے اُردو والوں کو حسد نہیں لیکن وہ ہندی ہندی تو ہو۔ کانگرس کی مجلس عاملہ نے بہت دانائی کی جو مہاسبھائیوں کے مطالبہ کو رد کر دیا۔ اس سلسلے میں مجھے سخت افسوس ہے کہ مہاتما گاندھی کا نام بھی زبان پر آئے بغیر نہیں رہتا۔ بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے اجلاس میں جو کچھ موصوف کی ذاتِ بابرکات سے ظہور پذیر ہُوا سخت مایوس کرنے والا ہے۔ آپ کی متقدس ہستی وہ ہے جس کی عزت اور محبت ہر ذی ہوش کے دل میں ہے لیکن ؎

بے محبت نہیں اے ذوقِ شکایت کے مزے

وہ ہمارے بزرگ ہیں۔ اسی سے تو کہنا پڑتا ہے کہ جب اُنہوں نے اپنے سابرمتی کے آشرم کی بھجناولی مرتب کرنے کا حکم دیا اُس وقت بھارتیہ ساہتیہ کا یہ نظریہ جو اَب ناگپور میں ہنگامہ آرا ہُوا کہاں چلا گیا تھا؛ یہ معلوم کرنا دلچسپی کا موجب ہوگا کہ مہاتما جی کے مرحوم سابرمتی آشرم کے بھجنوں کے اس ہندی کے مجموعے میں کُل ۱۸۱ بھجن ہیں۔ جن میں ۱۰۲ بھجنوں کو ہندستانی نام دیا گیا ہے۔ باقی ۷۹ بھجن گجراتی، مرہٹی وغیرہ دوسری زبانوں کے ہیں اور یہ واضح رہے کہ ان ۱۰۲ ہندوستانی بھجنوں میں کئی غزلیں بھی ہیں جیسے ؎

ہے بہارِ باغ دُنیا چند روز　　　دیکھ لو اس کا تماشا چند روز

یہ بھجناولی ہندی میں چھپی ہے۔ اب اگر اُردو کے لفظ سے کسی وجہ سے بے اعتنائی ہو گئی تھی تو بھارتیہ ساہتیہ میں ہندستانی ہی سے کام رکھتے لیکن ہُوا یہ کہ میرے حبیب لبیب مولوی عبدالحق کو یہ شعر پڑھتے ہوئے ناگپور سے واپس آنا پڑا ؎

آپ محوِ ناز ہم اہلِ نیاز　　　کس طرح نبھتی ہے دیکھا چاہیئے

ان سب باتوں کے باوجود ماننا پڑے گا کہ مہاتما جی ہردل عزیزی کے ساتھ حق پسند ضرور ہیں۔ جب ناگپور کا شرارا شعلہ بن کر بھڑکنے لگا تو آپ نے صاف فرما دیا کہ ہنگامی فضا کا تقاضا اور بات ہے ورنہ وہ اُردو کے مخالف نہیں اور زبان کے معاملہ میں ان کا مذہب وہی ہے جو بیس برس پہلے تھا ؏

ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

ہندی نے پچھلے کئی برسوں میں بہت ترقی کی ہے اور ہم یہ دیکھ کر خوش ہیں لیکن اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ وہ ترقی ہندی کو اصلی تمول اور ادبی ارتقاء کی طرف نہیں لے جا رہی ہے۔ یہ میری رائے نہیں بلکہ ان ہندی والوں کی رائے ہے جو اس بارے میں قیادت اور انتقاد کی شان رکھتے ہیں۔ میں اشارہ کروں گا اس صدارتی خطبہ کی طرف جو پنڈت پدم سنگھ شرما نے ہندی ساہتیہ سمیلن

کے ایک متفقہ اجلاس میں فرمایا۔ کچھ مدت سے کھڑی بولی اور برج بھاشا کے محاسن سے بحث چھڑی ہوئی تھی۔ لوگ پنگل یعنی عروض کی قیود سے آزاد اور برج بھاشا کی جامعیت اور لغزبیت سے منکر ہوتے جاتے تھے۔ سمیلن کے صدر شرما صاحب نے سند اور دلیل سے اُن کو معقول کرنا چاہا۔ لیکن لوگ اسی ڈھرے پر چل رہے ہیں جو انہوں نے اختیار کیا۔

جاننا چاہئے کہ یہ کھڑی بولی ہے کیا چیز؛ یہ کھڑی بولی اصل میں میرٹھ کے ضلع کی بولی ہے۔ یعنی جس زبان میں دَلمیر کا دیوان مرتب ہوا بنارس کی ناگری پرچارنی سبھا کے سیکرٹری شیام سندر داس جی اپنی ہندی کتاب مسمّٰی ہندی بھاشا وِکاس میں لکھتے ہیں کہ مدتوں اس زبان میں ساہتیہ یعنی ادبی تصانیف کا نام ونشان تک نہ رہا اور وہ امیر خسرو کو اس زبان کا اوّلین شاعر قرار دیتے ہیں (دیکھو صفحہ ۷۵ سے) اب اس میں سنسکرت کے لغت اور مرکبات بے تحاشا آملے ہیں اور وہ کھڑی سے پڑی یا گڑبڑی بولی بن گئی ہے۔ مہاشہ پدم لال پنّالال شاستری نے اپنی کتاب ہندی ساہتیہ ومرش میں اس زبان کی موجودہ حالت پر منصفانہ روشنی ڈالی ہے سلاحظہ ہو صفحہ ۵۳ سے۔ اور ادھیاپک رام رتن جی اپنی مادِھیمک ویاکرن میں یہ لکھتے ہیں:—

"اُردو والے لکھنؤ اور دہلی کے پریوکتوں کو پرمانک سمجھتے ہیں اور ہندی والے دہلی اور آگرہ کے۔" (صفحہ ۳۵)

اب حیرانی ہے کہ ہندی سے کونسی زبان مراد لی جائے؟ آیا وہ میرٹھ کے ضلع کی بولی ہے یا وہ زبان جو دہلی اور آگرہ سے تعلق رکھتی ہے۔ آگرہ کی ہندی برج بھاشا ہے اور دہلی کی ہندی بھی برج بھاشا ہے لیکن بانگڑی اور شورسینی کا کچھ اصلی رنگ لئے ہوئے بہرحال ساہتیہ جسے کہتے ہیں وہ ان دونوں مقاموں کا برج بھاشا ہی میں ہے۔ اس پیش کردہ زبان یعنی آج کل کی ہندی گد یعنی نثر کے متعلق عام شکایت سننے میں آتی ہے کہ وہ کس قدر سنسکرت آمیز ہو رہی ہے ہندی پد یعنی نظم کی حالت گد یعنی نثر کی حالت سے بھی خراب بنائی گئی ہے، یہاں تک کہ ہندی ساہتیہ سمیلن کے اجلاس میں جو مظفرپور میں ہوا اُس کے فاضل صدر کو اپنے خطبۂ صدارت میں یہ کہنا پڑا:—

"ہمارے ہندی کے نویں کویوں کی متی گتی بالکل نرالی ہے۔ وہ کبتا کی گاڑی کے دُھرے اور پہیئے بھی بدل رہے ہیں۔ اپنے اوبھت جھگڑے میں پیچھے کی اور مڑیں ٹٹو جوت کر گنتو ستھ پر پہنچایا چاہتے ہیں ..... یہ انتی نہیں منو مکتا کا لکشن ہے، اس سے کبتا کا سدھار نہیں سنگھار ہو رہا ہے۔"

صاحب صدر آگے چل کر اُردو سے استفادہ کا مشورہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں:—

"سُدھار اسی ڈھنگ سے ہونا چاہئے جس کا نردیش مہاکوی حالی نے کیا ہے اور جس کے انوسار اُردو کے نوین کویوں نے اپنی کبتا کو سامیکتا کے منوہر سانچے میں ڈھال کر پھلتا پراپت کی ہے۔"

آپ کو معلوم ہوا جو حالت ہندی نثر اور نظم کی اس وقت ہے۔ یہ زبان کیونکر کل ملک کی زبان ہونے کا دعوےٰ کرسکتی ہے۔

اور کوئی مذاق سلیم اور ادب میں شعور رکھنے والا اُردو کو چھوڑ کر اُسے کس طرح اختیار کر سکتا ہے۔ ہندی کے نقاد اور ادیبوں کی رایوں سے اقتباس اور ان کے حوالے آگے کافی آ چکے ہیں۔ اس بارے میں زیادہ لبتار سے کام لینا محض طوالت ہے۔ ظاہر ہے کہ ہماری یعنی ہندوستان کی معاشرت اور تمدن کا ہر ادارہ اس وقت معرضِ انقلاب میں ہے اور انقلاب یعنی پریورتن کوئی مستحکم چیز نہیں ہُوا کرتا۔ نہ معلوم اونٹ کس کروٹ بیٹھے اور کل کو کیا صُورت پیدا ہو۔ حسنِ عمل اس کا متقاضی تھا کہ ہندی والے پہلے اپنے گھر کے سدھارنے کی فکر کرتے۔ پھر دوسروں کے گھروں پر شفقت کی نظر ڈالتے۔ مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہو رہا ہے۔ کتابوں کی تعداد بڑھانا ایک بات ہے اور زبان میں لسانیاتی قوت اور ادبی وجاہت پیدا کرنا دوسری بات۔ اگر کہیں کسی زبان کو ہندی رسم الخط کا جامہ پہنانے میں کامیابی ہوگئی تو یہ اتنی بڑی بات نہیں۔ کہ زمین پر پاؤں نہ رکھا جائے۔ سندھی اور لہندا اُردو رسم الخط میں لکھی جا رہی ہیں یہی حال نوّے فیصدی پنجابی کا ہے لیکن اردو والوں نے اس پر کبھی افتخار اور فتحیابی کا اظہار نہیں کیا۔ بلکہ وہ ہر عہد میں اپنی زبان کی اصلاح اور ترقی میں لگے رہے اور اب تک اسی میں مصروف ہیں ہندی والے پہلے اُن مشوروں پر کاربند ہوں جو انہیں کے بزرگ ان کو دیتے رہے ہیں۔ پھر وہ ہندوستان کی کئی سَو زبانوں اور بولیوں کی جگہ کا غذ اور زبان سے چھین لیں۔ اگر چھین سکتے ہوں۔ تب کہیں اُردو پر مُنہ آ سکتے ہیں اور لنگوا فرینکا کے دعویدار ہو سکتے ہیں۔

ہمارا لائحہ عمل ان ناگوار عوارض میں کیا ہو؟ اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں تفصیل بالاجمال مولوی عبدالحق کانفرنس کے دعوت نامہ میں دے چکے ہیں۔ یہاں کچھ اشارات اس سے پہلے آ چکے ہیں۔ اب یہ کہنا ہے کہ یہ دیکھ کر کہ ہندی والے جو ہندی میں سنسکرت کی اندھادھند بھرمار کر رہے ہیں تو ہم بھی کیوں نہ اُردو میں فارسی اور عربی کی بھرتی کرتے جائیں میں آپ سے اور اُن سے دونوں سے کہتا ہوں کہ ایسا کرنا کسی طرح بھی مستحسن نہیں یہی نہیں بلکہ لسانیاتی خودکشی کی حد تک پہنچتا ہے بلکہ جاننا چاہئے کہ جب ایک زبان کو یہ لپکا پڑ جائے کہ ضرورت پر یا بے ضرورت اپنے لسانی ذخیروں میں تلاش اور پرتال کی زحمت نہ اٹھا کر غیر زبانوں سے (یعنی سنسکرت عربی۔ فارسی وغیرہ) بلا تصرف الفاظ اور مرکبات لینے کی عادی ہو جائے تو اُس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ زبان اپنی تصریفی قوت اور اشتقاقی استعداد سے محروم ہو جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اپنی زبان کے سوا اور زبانوں کو اچھوت جان کر دُور کریں۔ یہ رویہ ہمارے لئے اچھا نہ ہوگا۔ اُردو میں اختراع کے ساتھ تصرف اور تایید کی اہلیت اعلیٰ درجہ کی ہے اور اسی کی بدولت یہ شان زبان بنی اور آئندہ ترقی کرے گی۔ مختصر یہ کہ اپنی انفرادیت قایم رکھتے ہوئے کسب تصرّف اور جلب منفعت جو اُردو میں اب تک مسلّط اور جاری اصول رہا ہے اسے معرضِ تعطّل میں ڈالنا بھی ویسا ہی غیر مفید ثابت ہوگا جیسا اندھادُھند اور بلا تصرّف استعارہ۔ کسی کا قول ہے ؎

پروانہ چراغ حرم و دیر نداند

لیکن وہ کہیں جگنو کو چراغ نہ سمجھ بیٹھے۔

آپ کی بہت سمع خراشی ہوئی۔ اب میں بھی تھک کر خاموش ہو جاتا ہوں لیکن یاد رہے کہ ؎

ہر نفس چاہتا ہے ایک صدا ہو جانا — بند ہے میری خموشی میں ہجومِ فریاد

برجموہن کیفی دہلوی

آغا شاعر کا استفسار اہلِ انصاف سے

سُنا ہے مَیں نے کہ کچھ رسمِ خط کا ہے چرچا کہ جس کے پردے میں بدلیں زبان کا نقشا
کسی کو دُھن ہے کہ اُردو ملیچھ کی ہے بھاشا کوئی یہ کہتا ہے ہندی ہیں بات چیت بجا

مگر وہ کونسی ہندی کہ جو خلش گر ہو؟
جو سنسکرت سے نکلی ہو۔ اینٹ پتھر ہو؟

کلامِ پاک سے نسبت، یہی ہے خود رائی تمہیں تعصبِ بے جا نے آنکھ دِکھلائی
یہ لشکری ہے زباں ہند میں جلا پائی مٹانے والے جو اِس کے ہیں، اُن کی موت آئی

جو مُلکی بولی کے دشمن ہوں، اُن کو سمجھائیں
وہ اس کے مٹنے سے پہلے، نہ آپ مٹ جائیں

ذرا سمجھیے تو، سُوسال کی ہو جو بھاشا تمام صوبوں میں جس کو ہو بولتی دُنیا
کہیں زیادہ کہیں کم سہی، یہ بحث ہے کیا؛ اب اُس کو میٹتے ہیں آپ ہوش بھی ہیں بجا؛

نہ یہ رہے نہ وہ رہ جائے خوش بیاں بولیں
ہم اِس کو چھوڑ کے جناتی چیستان بولیں؛

سُنا جناب نے؛ لطفِ زباں ہے ایسی چیز زبان علم کی دیوی ہے ملک بھر میں عزیز
ضرورتوں کی ہماری ہوئی اسی سے تمیز یہ دیش رانی ہے سب خوشہ چیں ہیں اس کی کنیز

ہزار کام سبر انجام دے، یہ ناممکن
بغیر اِس کے زباں کام دے، یہ ناممکن

ہمارے ملک کی دیسی زبان اُردو ہے — اسی کا نام ہے ہندی، جنم کی ہندو ہے
یہ سب میں ایک ہے، توحید کا بھی پہلو ہے — جہان بھر میں جو چلتا ہے، یہ وہ جادو ہے

جہاز میں سنو اس کو چٹان پر سن لو
خدا جو چاہے تو پھر آسمان پر سن لو

ہے قاہرہ میں یہی شے یہی ہے برلن میں — یہی ہے چین میں، جاپان میں، سوئیڈن میں
اِسی کو بولتے ہیں آج ہند و جرمن میں — اسی کے رگ اُڑانے لگے ہیں لنڈن میں

ہزار کھیل کریں، گول سب اسی کے ہیں!
ہزار رنگ ہوں شاعر میں، بول اِسی کے ہیں!

آغا شاعر

اکبر

اُردو میں جو سب شریک ہونے کے نہیں — اس ملک کے کام ٹھیک ہونے کے نہیں
ممکن نہیں شیخ امرءالقیس بنیں، — پنڈت جی بالمیک ہونے کے نہیں

طیورِ آوارہ

دن اس ننھی سی دُنیا کی شورش کے ساتھ تمام دُنیاؤں کی خاموشی کو غرق کر دیتا ہے۔

گیت غیر محدود کو محسوس کرتا ہے ہوا میں، تصویر زمین میں، شعر ہوا اور زمین دونوں میں اور یہ اس لئے کہ اس کے الفاظ اپنے اندر ایک مفہوم رکھتے ہیں خراماں اور ایک موسیقی رکھتے ہیں پر بہ ہوا۔

جب سورج مغرب کی جانب مائل ہوتا ہے تو اُس کی صبح کی مشرق اُس کے سامنے خاموش کھڑی ہو جاتی ہے۔

میں اپنی دنیا کو غلط فہمی میں ڈال کر کیوں اپنا دشمن بنا لوں۔

ستایش مجھے شرمسار کرتی ہے کیونکہ میں درپردہ اُس کا طالب رہتا ہوں۔

ہاں! میری بیکاری جس گھڑی میں بیکار رہوں اپنے سکون کی گہرائی میں اس طرح مطمئن رہے جیسے سمندر کے ساحل کی شام جب کہ اس کا طوفان زدہ پانی خاموش ہو چکا ہو۔

اے دوشیزہ! تیری سادگی جھیل کے نیلے پن کی طرح تیری صداقت کی گہرائیوں کا اظہار کرتی ہے۔

بہترین کبھی تنہا نہیں آتا وہ ہمیشہ جماعت کی مصاحبت میں آتا ہے۔

خدا کا دایاں ہاتھ نرم ہے لیکن انتہا درجہ سخت گیر ہے اس کا بایاں ہاتھ!

میری شام اجنبی درختوں میں آئی اور ایک ایسی زبان میں بولی جس سے میرے صبح کے تارے ناآشنا تھے۔

رات کی تاریکی ایک تھیلا ہے جو نورِ سحر کے سونے سے پھٹ پڑتا ہے۔

ہماری آرزو زندگی کی کہر اور دھند کو قوسِ قزح کی رنگینیاں بخش دیتی ہے۔

خدا اپنے ہی پھولوں کو انسان کے ہاتھوں سے ہدیتہً حاصل کر لینے کا منتظر ہے۔

میرے غمگین خیالات مجھ سے اپنا نام پوچھ پوچھ کر مجھے چھیڑا کرتے ہیں۔

پھل کی خدمت قیمتی ہوتی ہے، پھول کی خدمت شیریں لیکن میری خدمت تو ایسی ہی کر لے جیسے پتیوں کی خدمت اپنی پُرانکسار ریاضت کے سائے میں۔

میرے دل نے ہلکی ہواؤں کے سامنے خدا جانے کس سایہ دار جزیرے کے لئے اپنے بادبان کو پھیلا دیا ہے۔

آدمی ظالم ہیں لیکن انسان رحم دل ہے۔

مجھے اپنا ساغر بنا لے اور میری معموری کو صرف اپنے اور اپنوں کے لئے مخصوص رکھ۔

طوفان کسی مبتلائے درد دیوتا کی چیخ کی طرح ہے جس کی محبت کو دُنیا قبول نہیں کرتی۔

دُنیا مطلق نہیں تھکتی اس لئے کہ موت کوئی خشگاف نہیں ہے۔

زندگی محبت کے کھوئے جانے سے بیش بہا ہوگئی ہے۔

میرے دوست! تیرا پاک دل مشرق کے طلوعِ آفتاب کے ساتھ اس طرح چمک اٹھا جیسے پہاڑی کی برف آلود چوٹی۔

موت کا چشمہ زندگی کے ساکن پانی میں تموج پیدا کر دیتا ہے۔

اے میرے خدا! وہ لوگ جو تیرے سوا سب کچھ رکھتے ہیں اُن لوگوں پر ہنستے ہیں جن کے پاس تیرے سوا کچھ نہیں۔

زیست کی کشمکش اپنی ہی موسیقی میں اپنا سکون پاتی ہے۔

ٹھوکر زمین سے صرف گرد پیدا کر سکتی ہے اناج نہیں۔

ہمارا نام گویا ایک ایسی روشنی ہے جو رات کے وقت سمندر کی لہروں پر فروزاں ہو اور پھر اپنا کوئی نشان نہ چھوڑ کر بجھ جائے۔

بس وہی شخص کانٹے بھی دیکھے جس کی آنکھیں پھول کو حقیقتہً دیکھ سکتی ہیں۔

چڑیا کے پروں کو سونے سے مزین کر دو پھر وہ کبھی فضائے آسمان میں صعود نہ کرے گی۔

وہی ہمارے ہاں کا کنول یہاں اجنبی پانی میں بھی اُسی خوشبو کے ساتھ کھلتا ہے مگر ایک جُدا نام لئے ہوئے۔

دل کے منظر میں فاصلہ اور افزوں ہو جاتا ہے۔

چاند کی چاندنی سارے آسمان پر ہے اُس کے سیاہ دھبے فقط اسی کے دامن پر۔

یہ نہ کہو کہ "صبح ہوگئی ہے" اور پھر اک گزرا ہوا دن کہہ کر اُس سے مُنہ پھیر لو۔ اُس پر اس طرح نگاہ ڈالو گویا وہ ایک نوزائیدہ بچہ ہے جو کوئی نام نہیں رکھتا۔

دُھواں غرور کرتا ہے آسمان کے سامنے اور راکھ زمین کے آگے کہ وہ دونوں آگ کے بھائی ہیں۔

بارش کے قطرے نے یاسمین سے سرگوشی کی کہ "مجھے ہمیشہ کے لئے اپنے دل میں رکھ لے"۔ یاسمین نے ایک آہ بھری اور "ہائے" کہہ کر زمین پر گر پڑی۔

ڈرپوک خیالو! مجھ سے مت ڈرو۔ میں اِک شاعر ہوں۔

میرے دل کی تاریک خاموشی پپیہے کی الاپ سے لبریز معلوم ہوتی ہے جو آواز کی سیاہی مائل شفق ہے۔

ہوائیو! تم نے ستاروں کی توہین کی اور وہی توہین زمین پر گرتے وقت تمہارے پیچھے ہولی۔

میرے دن بھر کے پُر ازدحام سفروں میں تُو نے شام کی تنہائی کی طرف رہبری کی۔ اب رات کے سکون میں میں اُس کے حقیقی مفہوم کے سمجھنے کا منتظر ہوں۔

یہ زندگی ایک سمندر کا عبور کرنا ہے جہاں ہم سب ایک ہی تنگ جہاز میں باہم ملتے ہیں۔ موت ہمیں ساحل پر پہنچا دیتی ہے۔ اور پھر ہم اپنی الگ الگ دنیاؤں کی طرف رُخ کر لیتے ہیں۔

راستی کی ندی اپنی لغزشوں کی آبجوؤں میں سے ہو کر بہتی ہے۔

آج میرا دل عنانِ دہر کے اُس پار چند شیریں ساعتیں بسر کرنے کی آرزو میں اُداس ہو رہا ہے۔

پرندوں کا نغمہ ضیارِ صبح کی صدائے بازگشت ہے جو زمین سے پیدا ہوتی ہے۔

صبح کی روشنی نسترن کے پھول سے پوچھتی ہے "کیا مجھ کو بوسہ دینے سے تمہیں عار ہے!"

ننھے پھول نے کہا اے آفتاب "میں تجھ کو کس طرح اپنا نغمہ سناؤں اور پرستش کروں؟" آفتاب نے جواب دیا "اپنی پاکیزگی کی سادہ خاموشی سے!"

انسان حیوان سے بدتر ہے جب وہ حیوان ہو جائے۔

تاریک بادل آسمان کے پھول بن جاتے ہیں جب روشنی اُنہیں بوسہ دیتی ہے۔

تلوار کا پھل اپنے دستے کے کند ہونے پر خندہ زن نہ ہو۔

رات کی خاموشی ایک گہرے چراغ کی مانند اپنے کہکشاں کی روشنی کے ساتھ فروزاں ہے۔

زندگی کے روشن جزیرے کے گرد بحرِ موت کا غیر محدود راگ رات دن لہریں لیتا رہتا ہے۔

یہ پہاڑ کیا ایک پھول کی مانند نہیں جو اپنی پہاڑیوں کی پنکھڑیوں سے شرابِ نور کے گھونٹ پی رہا ہے؟

حقیقی اپنے غلط مفہوم اور غلط طرزِ قرأت کے ساتھ غیر حقیقی ہو جاتا ہے۔

اے دل! دنیا کی گردش سے اپنے حسن کو پالے اُس کشتی کی مانند جو ہوا اور پانی کی جنبش سے نازک خرام بن جاتی ہے۔

آنکھیں اپنی بینائی پر فخر نہیں کرتیں بلکہ اپنی عینک پر۔

میں اپنی اس تنگ سی دُنیا میں رہتا ہوں اور ڈرتا ہوں کہ مبادا یہ تنگ تر ہو جائے۔ تُو مجھے اپنی دُنیا میں اُٹھا لے اور مجھے خوشی کے ساتھ اپنا سب کچھ کھو ڈالنے کی آزادی عنایت کر۔

جھوٹ قوی ہو کر بھی کبھی سچ نہیں بن سکتا۔

میرا دل اپنی امواجِ نغمہ کے آغوش میں روزِ روشن کی اس سبز دنیا کو لینے کا آرزومند ہے۔

اے سبزۂ ماہ! تُو تاروں سے محبت کر پھر تیرے خواب پھولوں میں رُونما ہوں گے۔

بازار کی شورش کو اپنی موسیقی سے ایک تلوار کی طرح چیر ڈال۔

اس درخت کی کانپتی ہوئی پتّیاں میرے دل کو ایک ننھے بچے کی اُنگلیوں کی مانند چھُوتی ہیں۔

میرے دل کی اُداسی اُس کا نقابِ عرُوسی ہے۔ رات آئے گی اور یہ پردہ اُٹھ جائے گا۔

ننھا پھُول مٹی میں رل رہا ہے۔ یہ تیتری کا راستہ ڈھونڈنا چاہتا تھا

میں رستوں کی دُنیا میں ہوں۔ رات آتی ہے اے گھر کی دُنیا! تُو اپنا دروازہ کھول دے۔

مَیں تیرے دن بھر کے گیت گا چکا ہوں۔ اب شام کے وقت اس طوفانی راستہ میں مجھے اپنا چراغ ہاتھ میں لے کر چلنے دے۔

ترجمہ از ٹیگور

بشیر احمد

قصرِ ویراں

ڈوبا شفق کی جھیل میں خورشیدِ خاوری
انگڑائی لے کے غرب سے لیلائے شب اُٹھی

مہکے ہوئے چمن کی ہوائیں اُداس ہیں
کچھ کھو چکی ہیں آہ! فضائیں اُداس ہیں

کھڑکی میں آسمان کی حیراں ہے چاند بھی
شاید مری طرح سے پشیماں ہے چاند بھی

ہر سال آ کے دیکھتا ہوں تیرے گھر کو مَیں
اب تک عزیز ہوں ترے دیوار و در کو مَیں

یہ گھر اور اس کے گرد جو شے ہے اُداس ہے
جو مُردنی ہے دل میں وہی آس پاس ہے

جیتا ہوں پاسداریٔ زخمِ جگر کو مَیں
"اے کاش جانتا نہ ترے رہگذر کو مَیں"

مہدی علی خاں

الگ نہ ہونے والے

(۱)

شیاما چرن نے بہت ہی خوش ہو کر گردھر راج سے کہا —— "یہ خوب ہوا کہ ہمارا ساتھ یونیورسٹی میں بھی رہے گا"۔

گردھر راج نے ہنس کر کہا۔ "اس سے زیادہ خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے، میں تو خدا سے یہی دعا کر رہا تھا کہ اگر پاس ہوں تو دوں فیل ہوں تو دونوں"۔

شیاما چرن نے اشتیاق سے پوچھا۔ "اگر تم پاس ہو جاتے اور میں فیل ہو جاتا تب؟"

گردھر راج نے سنجیدگی سے جواب دیا "مجھے اپنے پاس ہونے کا بہت افسوس ہوتا"۔

شیاما چرن نے ایک قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "پاس ہونے پر افسوس ہونا ایک حیرت کی بات ہے"۔

گردھر راج نے کہا "بیشک، اوروں کے واسطے تو یہ حیرت کی بات ہے لیکن ہمارے تمہارے لئے اس میں کوئی تعجب یں۔ اچھا اگر تم پاس ہو جاتے اور میں فیل ہو جاتا تو کیا تم کو اپنے پاس ہونے کی خوشی ہوتی؟"

شیاما چرن نے جواب دیا۔ "ہرگز نہیں! ایسا کبھی ہو ہی نہیں سکتا"۔

اسی وقت کمرے کے ایک دروازے سے جس پر پردہ پڑا تھا۔ ایک لڑکی داخل ہوئی۔ اس کی عمر پندرہ سولہ برس کی ہوگی، بعبورت تھی، شکل شیاما چرن سے بہت ملتی تھی۔ اجنبی بھی دیکھ کر بھائی بہن سمجھ سکتا تھا۔

لڑکی کو دیکھ کر گردھر راج کے چہرہ پر سرخی دوڑ گئی۔ ساتھ ہی چونک بھی پڑے لیکن فوراً سنبھل کر سنجیدہ ہو گئے۔

لڑکی نے شوخی سے شیاما چرن سے کہا۔ "بھیا! اب مٹھائی کھلاؤ۔ یوں ہی مفت میں پاس ہو جانا چاہتے ہو؟"

شیاما چرن نے ہنستے ہوئے کہا "مفت میں کیوں؟ سال بھر محنت کی ہے۔ روپیہ خرچ کیا ہے تب پاس ہوا ہوں"۔

کی ہو گی۔ میں کیا جانوں۔ میں جب جانوں جب میرا منہ میٹھا کراؤ"۔

شیاما چرن نے اسی طرح ہنستے ہوئے کہا "اچھا جا دو پیسے کے بتاشے منگا کر کھا لے"۔

"دو پیسے کے بتاشے! اتنے سستے نہ چھوٹو گے۔ پانچ روپیہ کی مٹھائی منگانا پڑے گی"۔

"پانچ روپیہ کی! بڑی مٹھائی خور ہے۔ اچھا چل یہی سہی۔ اگر میرے سامنے بیٹھ کر سب کھا سکے تو ابھی منگا دوں"۔

لڑکی نے ذرا شرماکر کہا "سب میں نہیں کھاؤں گی۔ سب کو کھلاؤں گی۔ تم کو بھی دوں گی"۔
شیاما چرن نے کہا "مجھے تو مٹھائی اچھی نہیں لگتی"۔ اس پر لڑکی بولی "واہ کیا کہنے ہیں مٹھائی کے نام شکر تک نہ بیچے"۔
گردھر راج ہنسنے لگا۔ شیاما چرن بھی ہنس پڑے۔
گردھر راج نے کہا "اب تو استاد چوری پکڑ لی گئی۔ آپ مٹھائی کے اتنے شوقین ہیں؟"
شیاما چرن نے کہا "تم نے بھی اس کی باتوں پر یقین کر لیا۔ یہ تو یوں ہی بکا کرتی ہے"۔
اسی وقت ایک شریف ضعیف آدمی کمرے میں آکر بیٹھتے ہوئے بولے "کیا بات ہو رہی ہے؟"
لڑکی بولی "بھیا پاس ہو گئے لیکن مٹھائی نہیں کھلاتے"۔
شیاما چرن نے کہا "مٹھائی مجھے اچھی نہیں لگتی۔ جو چیز میں پسند کرتا ہوں وہی کھلا سکتا ہوں"۔
لڑکی نے پوچھا "تم کیا پسند کرتے ہو؟"
"مجھے؛ مجھے تو نیبو پسند ہے"۔
لڑکی نے شرماکر "ہوں" کہا۔
ضعیف آدمی نے کہا "یہ تو شیاما سچ ہی کہہ رہا ہے۔ اچھا اس کی طرف سے میں ہی مٹھائی کھلا دوں گا"۔
لڑکی بولی "آپ کیوں کھلائیں گے بابوجی؛ میں تو ان ہی سے لوں گی۔ یہ بڑے کنجوس ہیں کبھی خرچ کرنا ہی نہیں چاہتے"۔ یہ کہہ کر لڑکی اندر چلی گئی۔
ضعیف بزرگ ہنستے ہوئے کہنے لگے "مالتی کو تمہارے پاس ہونے کی بہت خوشی ہے۔ اُسے روپے دے دینا، مٹھائی منگاکر سہیلیوں میں تقسیم کر لے گی"۔
شیاما چرن نے کہا "وہ تو میں دے دوں گا۔ اسے بنانے میں بڑا مزا آتا ہے"۔
اس کے بعد ضعیف آدمی نے سنجیدگی سے کہا "اب جلد یہ فیصلہ ہونا چاہئے کہ تم کون سی یونیورسٹی میں داخل ہو گے؟"

(۲)

شیاما چرن اور گردھر راج دونوں ہم عمر تھے اور ایک ہی فرقہ میں تھے۔ چار سال سے برابر ساتھ پڑھنے سے بہت گہری دوستی ہو گئی تھی۔ شیاما چرن کے باپ رادھا چرن ایک متمول اور شریف آدمی تھے۔ ان کی خواہش شیاما چرن کی بہن کی شادی گردھر راج سے کرنے کی تھی۔ لیکن اس خواہش کو سوائے ان کی شریک زندگی کے کوئی نہیں جانتا تھا۔ گردھر راج کے والد بھی اوسط درجہ کے لوگوں میں تھے۔ ان کی بھی دلی خواہش یہی تھی کہ گردھر راج کی شادی شیاما چرن کی بہن سے ہو۔ گردھر راج اپنے باپ کی اِس

خواہش کو جانتا تھا۔ اور اسی خیال سے دل میں وہ مالتی کو اپنی ہونے والی رفیقۂ زندگی متصور کرتا تھا۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اُس کے دل میں جگہ بھی ہو گئی تھی اور محبت نے اپنا سکہ جما دیا تھا۔

آخر ایک دن دونوں لڑکے یونیورسٹی میں داخل ہونے کیلئے روانہ بھی ہو گئے۔ جا کر ایک ہی کمرے میں قیام کیا اور بہت محنت سے تعلیم حاصل کرنے لگے۔

شام کو ساتھ ٹہلنے جاتے اور ساتھ ہی واپس آتے۔ اس معمول میں کبھی فرق نہ آتا۔ دوسرے لڑکوں سے بالکل الگ رہتے۔ اسی وجہ سے اور لڑکے ہمیشہ ان کے خلاف رہتے اور حسد بھی کرتے۔ بُری بھلی افواہیں بھی اُڑتیں لیکن ان باتوں کی اِن کو پروا نہ تھی۔

ایک روز ٹہلنے کے لئے تیار ہو کر شیاما چرن نے گردھر راج سے کہا "اٹھو یار۔ تیار ہو جاؤ۔ کیا احدی بن کر پڑے ہو"

گردھر راج نے کہا "آج میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔ بدن ٹوٹ رہا ہے۔ اُٹھنے کو دل نہیں چاہتا۔ آج تم اکیلے ہی چلے جاؤ"

گردھر راج کی کلائی شیاما چرن نے آگے بڑھ کر پکڑ لی۔ اور نبض دیکھنے کے بعد بولا "کچھ خفیف سی حرارت ہے۔ اچھا۔ آج رہنے ہی دو"

گردھر راج نے کہا "تم چلے جاؤ"

"اکیلا کیا جاؤں"۔

"حرج کیا ہے؟"

"تنہا جانے کو دل نہیں چاہتا"

گردھر راج نے اصرار کرتے ہوئے کہا "طبیعت نہیں تو میرے کہنے پر چلے جاؤ۔ آج تم کو تنہا دیکھ کر سب متعجب ہوں گے، کیونکہ وہ ہم کو اُن سیپریبل (الگ نہ ہونے والے) کہتے ہیں۔ آج ان لوگوں کا یہ خیال غلط ثابت کر دو"

شیاما چرن ہنس پڑے۔

گردھر راج نے پھر کہا "بڑا مزا آئے گا یار۔ جو کوئی تم سے پوچھے آج اکیلے کیوں سیر کر رہے ہو۔ تم فوراً جواب دینا "بیکاز وی آر ناٹ ان سیپریبل" (کیونکہ ہم جدا نہ ہونے والے نہیں ہیں) قسم خدا کی بڑے کٹیں گے"

شیاما چرن نے اس طرح ہنستے ہوئے کہا "ابی چھوڑو بھی اس میں کیا رکھا ہے؟"

"رکھا تو کچھ نہیں۔ ذرا مزا آجائے گا"

شیاما چرن یکایک سنجیدہ ہو کر کچھ سوچنے لگے۔

گردھر راج نے پوچھا "کیا سوچتے ہو؟"

شیاما چرن ۔ "کچھ یوں ہی خیال آ گیا۔ کوئی خاص بات نہیں ہے ۔"

"آخر کچھ تو ہے ہی !"

"میں یہ خیال کر رہا تھا کہ اگر لوگ ہم کو اُن سیپرببل کہتے ہیں تو ہمیں ایسا ہی بن جانا چاہئے ۔"

گردھر راج نے پوچھا "کیوں ؟"

"کیونکہ حقیقت میں ہم ویسے بن گئے ہیں ۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ اب ہم کو کوئی جُدا کر سکتا ہے ؟"

"نہیں ۔ میں ایسا نہیں سمجھتا ۔"

"اگر ہم کو کوئی جُدا نہیں کر سکتا ۔ تو لوگوں کے اس خیال کو جو وہ ہم کو اُن سیپرببل کہتے ہیں غلط ثابت کرنے کے بجائے اور قوت دینا چاہئے ۔ کیونکہ کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہم کو اُن سیپرببل محض مذاق سے کہتے ہیں ۔

گردھر راج نے انجان بن کر پوچھا ۔ "کیوں ؟"

"ممکن ہے ان کا خیال ہو کہ ہم ظاہر میں جتنا اُن سیپرببل نظر آتے ہیں درحقیقت دل سے ایسے نہیں"

گردھر راج نے کہا "تمہارا یہ خیال غلط نہیں ہے ۔ کیونکہ میں نے متعدد مرتبہ دو ایک لڑکوں کو یہ کہتے سنا ہے اور ممکن ہے انہوں نے مجھے سنانے ہی کو کہا ہو کہ "زیادہ مٹھائی میں کیڑے پڑتے ہیں ۔"

"دیکھا ! وہی بات آئی نا ؟ میں تو پہلے ہی سمجھتا تھا ۔ بعض تو صبح اُٹھتے ہی یہی خیال کرتے ہوں گے کہ آج ضرور ان دونوں میں پھوٹ پڑے گی ۔"

گردھر راج ہنس پڑے اور بولے "بیوقوف ! وہ کیا جانیں ہم کو دُنیا کی کوئی طاقت جُدا نہیں کر سکتی ۔"

شیاما چرن نے سنجیدگی سے کہا ۔ "نہیں ۔ ایسا نہ کہو ! ایک طاقت ایسی ہے جو جُدا کر سکتی ہے ۔"

گردھر راج نے حیران ہو کر پوچھا "وہ کیا ؟"

شیاما چرن نے کہا "موت !"

کمرے میں موت کا لفظ گونج اُٹھا ۔ گردھر راج کا دل دھڑکنے لگا ۔ دونوں کچھ دیر سناٹا کھینچے بیٹھے رہے ۔ ایسا معلوم ہوا کہ دونوں نے اس بات کو تسلیم کر لیا ہے ۔ یکایک گردھر راج کا چہرہ تمتما اُٹھا ۔ اُنہوں نے کہا "ہم کو جدا کرنے میں موت کو بھی مشکل پڑے گی ۔"

شیاما چرن ہنس پڑے ۔ بولے "ٹھیک کہتے ہو !"

(۳)

ایک دن شام کو دونوں سیر سے واپس آ رہے تھے ۔ راستے میں کالج کی تین لڑکیاں ملیں ۔ ان کو دیکھ کر ایک نے آہستہ

سے کہا۔" دی اَن سیپریبل پیر" (جدا نہ ہو سکنے والا جوڑا) اور بعد میں تینوں نے قہقہہ لگایا۔
دوسری بولی:" دونوں بھائی بہن کی طرح ساتھ رہتے ہیں"۔
تیسری بولی:" بھائی بہن کی طرح یا شوہر بیوی کی طرح؟"
اس پر پھر تینوں نے قہقہے لگائے۔ اتنی دیر میں وہ دُور نکل چکی تھیں۔ شیاما چرن نے گردھر راج سے کہا" سُنا؟"
" ہاں سنا! اب تو لڑکیاں بھی ہم پر پھبتیاں کسنے لگیں"۔
شیاما چرن اُداس ہو گئے۔ انہوں نے کہا" دُنیا کتنی تنگ خیالات کی ہے۔ باہم کسی کی اُلفت برداشت نہیں کر سکتی"۔
" برداشت کیسے کریگی۔ دولت، علم، طاقت، محبت ایسی نعمتیں ہیں جو جانفشانی کرنے پر حاصل ہوتی ہیں۔ جو اس سے لطف اندوز ہوتا ہے لوگ اس سے حسد کرتے ہیں"۔
اسی طرح کی گفتگو کرتے ہوئے وہ واپس آگئے۔ گردھر راج اسی طرح رہے لیکن شیاما چرن بہت پژمردہ ہو گئے۔
سوتے وقت گردھر راج نے کہا" آج تم کچھ غمگین معلوم ہوتے ہو"۔
شیاما چرن نے کہا" غمگین تو نہیں ہوں"۔
" ہو کیسے نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان چڑیلوں کی باتوں نے تمہارے دل کو صدمہ پہنچایا ہے"۔
" ہاں۔ شام سے میرا خیال ایسا ہو گیا ہے کہ دُنیا ہم کو اَن سیپریبل نہیں رہنے دے گی"۔
" بڑے حساس ہو! ذرا سی بات سے ہمت کھو بیٹھے"۔
" ہمت کی بات نہیں۔ یکایک خیال آگیا"۔
" اگر کتوں کے شور کی پرواہ کروگے تو راستہ چلنا مشکل ہو جائے گا"۔
" پرواہ کرنا تو فضول ہی ہے"۔
" پھر رنجیدہ بھی نہ ہونا چاہئے"۔
" میری طبیعت آج خراب ہے نہ معلوم کیا کیا لگتا ہے"۔
" کیا لگتا ہے؟"
" طبیعت اُچاٹ سی ہے"۔
" گھر کی یاد آتی ہے کیا؟"
" کیا بتاؤں کس کی یاد آتی ہے"۔

"اچھا سو جاؤ۔ صبح طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔"

× × × × × × × × ×

رات کے دو بجے کچھ آہٹ ہونے سے گردھر راج کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا کمرے میں روشنی جل رہی ہے اور شیاما چرن پلنگ پر پڑے کراہ رہے ہیں۔ گردھر راج اُٹھ کر بیٹھ گیا اور بولا "شیاما چرن! کیا بات ہے؟"

شیاما چرن نے کہا "دو دست ہو چکے ہیں اور تین چار بار قے۔ پیٹ میں سوئیاں سی چبھ رہی ہیں۔"

گردھر راج گھبرا کر پلنگ سے اُترتے ہوئے بولا "مجھے جگایا کیوں نہیں؟"

قریب جا کر گردھر راج نے شیاما چرن کا مُنہ دیکھا تو اس کا کلیجہ دہل گیا۔ شیاما چرن کا چہرہ اتنا اُتر گیا تھا جیسے بہت دن کا بیمار ہے۔ چہرہ پر سیاہی آ گئی تھی۔ اور آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں۔ گردھر راج نے باہر جا کر دوسرے لڑکوں کو جگایا۔ اسی وقت شیاما چرن پھر اجابت کے لئے گئے اور اس مرتبہ اتنے کمزور ہو گئے کہ خود آ بھی نہ سکے دو لڑکے پکڑ کر بستر تک لائے۔

کچھ ہی دیر میں یہ خبر ہوسٹل کے اس حصّے میں بجلی کی طرح پھیل گئی چند لڑکے دوڑ کر ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ کو خبر دے آئے انہوں نے اسی وقت ڈاکٹر کو بلوایا۔ ڈاکٹر نے آ کر امتحان کیا اس کے بعد سپرنٹنڈنٹ کو الگ لے جا کر کہا "بہت سخت ہیضہ ہے میرے خیال میں صبح ہونے تک ختم ہو جائے گا۔ تاہم کوشش کرتا ہوں۔"

گردھر راج نے بھی ڈاکٹر کی بات سُنی۔ اس کے حواس جاتے رہے۔ وہ زور سے رونے لگا اور شیاما چرن کے کمرے کی طرف دوڑا۔ لیکن بیچ میں چند لڑکوں نے پکڑ کر ایک کمرے میں بند کر دیا۔

دوا ہونے لگی لیکن فائدہ نہ ہُوا۔ صبح ہوتے ہوتے سکرات کا عالم طاری ہو گیا۔ مرنے سے کچھ دیر پیشتر اس نے کہا "گردھر راج کہاں ہے؟"

گردھر راج بلایا گیا۔ اس وقت اس کی حالت پاگل کے مانند تھی۔ اس کو دیکھ کر شیاما چرن نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "آخر ہم جُدا گئے اور ہمیشہ کے لئے۔"

گردھر راج نے مشکل سے یہ کہا "بھائی! مجھے یقین نہیں ہوتا۔" اور پھر رونے لگا۔

لڑکوں نے اسے پھر وہاں سے ہٹا دیا۔ چند لڑکوں نے اسے سمجھانا شروع کیا۔ کچھ دیر بعد ایک لڑکے نے کمرے سے آتے ہی یہ کہا۔

"سب ختم ہو گیا! آہ کیا جوڑی تھی —— آج بچھڑ گئی! خدا جانے کس کی نظر کھا گئی۔"

گردھر راج نے یہ سنا اور "ہائے" کہہ کر گر پڑا۔

(۴)

گردھرراج تعلیم چھوڑ کر گھر آ گئے۔ دیوالی کے بعد بھیا دوج[1] کا دن آیا۔ شیاما چرن کے بعد یہ پہلی بھیا دوج ہے۔ گردھرراج اپنے کمرے میں بیٹھا ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ اسی وقت ایک عورت کمرے کے سامنے سے یہ کہتی ہوئی گزری ــــ "بیچاری بیٹی رو رہی ہے کس کے ٹیکا کرے۔ بھائی تو چل بسا"۔

گردھرراج چونک پڑے۔ انہوں نے پکارا ــ "نوکرانی!"

عورت رک گئی۔ گردھرراج نے پوچھا "کون بیٹی رو رہی ہے؟"

نوکرانی نے کہا ــ "مالتی بی بی کے یہاں گئی تھی۔ وہ رو رہی ہیں۔ آج بھیا دوج ہے۔ کس کو ٹیکا کریں۔ ایک بھائی تھا وہ بھی نہ رہا۔ مجھے تو بڑا رنج ہوا"۔

اتنا کہہ کر وہ چلی گئی۔ کچھ دیر گردھرراج خاموش بیٹھا رہا۔ اس کے بعد یکایک اُٹھ کھڑا ہوا۔ جلدی سے کپڑے پہنے اور باہر چلا گیا۔

ایک گھنٹہ کے بعد واپس آیا۔ اس کی پیشانی پر تلک لگا ہوا تھا۔ پہلے باپ سے سامنا ہوا۔ اُنہوں نے تلک دیکھ کر کہا "یہ تلک کہاں سے لگوا آئے؟"

گردھرراج نے کہا "مالتی نے لگایا ہے۔ آج بھیا دوج ہے"۔

جواب سن کر اس کے باپ سناٹے میں آ گئے۔ بولے "تم نے بڑا غضب کر دیا۔ مجھ سے پوچھے بغیر کیوں چلے گئے۔ تم کو یہ نہیں معلوم ہے کہ اس سے تمہاری شادی ہونے والی ہے"۔

گردھرراج نے رنج بھری ہنسی سے کہا "معلوم تھا! لیکن میں نے اس کا شوہر ہونے کی بہ نسبت بھائی ہونا زیادہ ضروری خیال کیا۔ شوہر تو اسے مجھ سے بہتر مل سکتا ہے لیکن ایسا بھائی کہاں ملے گا۔ جو اُسے اسی طرح سمجھے جس طرح شیاما چرن سمجھتے تھے۔ شیاما چرن کی کمی صرف میں ہی پوری کر سکتا ہوں۔ اگرچہ موت کے ظالم ہاتھوں نے ہم کو جدا کر دیا۔ لیکن شیاما چرن کی روح کو میری روح سے جدا نہیں کر سکتی۔ اس کی روح میری روح سے ملی ہوئی ہے"۔

یہ سُن کر اس کے والد خاموش ہو گئے۔

(ہندی سے ترجمہ) ــــــــــــــــــــــــ ہیم لتا استھانہ

[1] یہ دیوالی سے تیسرے دن ہوتی ہے۔ اس دن بہن بھائی کی پوجا کرتی ہے اور روزہ رکھتی ہے۔ جس کا بھائی نہیں ہوتا وہ نہیں کرتی۔

شاعر اور فلسفی

فلسفی شاعر سے :-

ظلمتِ خط و خال میں گم ہیں ترے تخیّلات
میری نگاہِ شوق ہے شرحِ جمالِ کائنات

میرا خیالِ برق رُو اور فلک کی سرحدیں
تیری مجالِ بال و پر اور حدِ تعینات

میری حدیثِ شوق کیا ایک بہارِ جاوداں
تیری نغانِ عشق کیا چند فسردہ واقعات

تیرے خیالِ پست سے پست دلوں کے حوصلے
میرے کشود و بست سے جنبشِ نبضِ کائنات

میری تپش تپش نہیں بلکہ ہے سوزِ زندگی
تیری خلش خلش نہیں بلکہ ہیں کچھ مطالبات

میری خودی خودی نہیں بلکہ ہے حکمرانِ شوق
تیری خودی خودی نہیں بلکہ خدائے خواہشات

طائرِ فکرِ ما گذشت از حدِ چرخِ چنبری
تو کہ اسیرِ دامِ عشق کے بھوائے ما پری

شاعر فلسفی سے :-

میرا ہر ایک شعر ہے تازہ پیامِ زندگی
تیری ہر ایک فکر ہے باعثِ رنجِ کائنات

میرا ہر ایک داغِ دل، باغ و بہارِ آرزو
دفترِ عقل میں ترے خونِ وفا کے واقعات

فکرِ فلک رسا مری دخترِ جبرئیلِ جذب
تیرا دماغ پست اور بندگیٔ توہمات

میری حدیثِ آرزو، پُر زِ سرورِ سرمدی
تیری حدیثِ آرزو، چند شریر خواہشات

میرا ہر ایک جذبِ دل نکہتِ گُل کا ہے نچوڑ
خشک ترے تخیلات، سُست ترے توہمات

میرے خیال میں جہان ایک نتیجۂ عظیم
تیرے خیال میں جہان کچھ نہیں چند حادثات

میرے ہر ایک نطق سے نشو و نمائے زندگی
تیری ہر ایک فکر سے خشک ہے مزرعِ حیات

دستِ خیالِ ما گرفت دامنِ لیلیٰ اُمید
پنجۂ اختیارِ تو جامۂ شوقِ خود درید

احسن احمد اشکؔ جمیلی
از کلکتہ

نغمۂ شاعر

محفلِ کائنات میں میرا ہی اہتمام ہے
میرے ہی دم سے ہے سحر میرے ہی دم سے شام ہے

میرا سرودِ دلنشیں، میری نوائے آتشیں
شب کے سکوت کیلئے صبح کا اِک پیام ہے

میرے ہی اشکِ پاک سے کشتِ خلوص ہے ہری
میری ہی آہِ گرم سے آتشِ عشق عام ہے

نغمۂ ذوق وشوق میں میرا ہی سحر ہے نہاں
میرے ہی دم سے مستیِ بادۂ لعل فام ہے

میری ہر ایک سانس ہے آئینۂ جمالِ دوست!
میرے حریمِ رُوح میں جلوۂ یار عام ہے

میری ہی ہاو ہُو سے ہے گرمیِ بزمِ کائنات
حُسن مرا سرود ہے عشق مرا پیام ہے

میں وہ مہِ تمام ہوں جس کو نہیں غمِ زوال!
میری ضیا ہے جاوداں میرے لئے دوام ہے

میرے بغیر عشق کا سوز ہے ناتمام اگر
میرے بغیر جلوۂ حُسن بھی ناتمام ہے

اہلِ ریا کے واسطے، اہلِ دغا کے واسطے
میری نگاہِ حق نگر خنجرِ بے نیام ہے

مظہرِ نورِ حق ہوں میں سجدہ گہِ ملک ہوں میں
غیرتِ صد فلک ہوں میں میرا عجب مقام ہے

شاعرِ حق پرست ہوں، بادہ کشِ الست ہوں
عشق ہی میرا ساز ہے عشق ہی میرا جام ہے

اثر صہبائی

معصوم محبّت

لوئی نے کہا:۔

ہاں جناب تو پھر بجائے اِس کے کہ آپ ہمیں روزانہ اپنی کتابوں کی کہانیاں سنایا کریں، یا چوری، ڈکیتی اور خودکشی کے واقعات بیان کیا کریں، ایک دفعہ تو کوئی محبت کا قصہ سنایئے۔ پاک اور سچّی محبت کا۔ ایسے نوجوان مرد اور عورت کی محبت کا جو عنفوانِ شباب میں ہوں اور جن کی بقول شخصے جوانی کی راتیں اور مرادوں کے دن ہوں۔ اس قسم کی کوئی بات سنایئے تاکہ دل ہی بہلے اگر آپ نہیں سناتے تو پھر میں ہی عرض کرتا ہوں۔ میری بھی ایک داستان ہے۔ ایک لڑکی کا قِصّہ ہے جس نے مجھ سے خاص محبت کی تھی۔ نہیں بلکہ یوں کہئے کہ ایک بچی کا قِصّہ جو مجھے دل سے پوجتی تھی۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میری عمر چھبیس سال کی تھی۔ گرمی کے دن تھے جب آدمی پیرس چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور وہاں کی گرمی سے بچنے کے لئے دامنِ کوہ یا ساحلِ بحر کے کسی چھوٹے سے گاؤں میں پناہ لینی پڑتی ہے۔ چنانچہ میں بھی ایک ایسے ہی گاؤں میں پہنچا۔ اور چھوٹا سا مکان لے کر اُس کے ایک حِصّہ میں رہنے لگا۔ دوسرے حِصّہ میں مالکِ مکان اپنے کنبہ سمیت رہتا تھا۔ یہ کنبہ ایک بیوی اور دو بیٹیوں پر مشتمل تھا۔ ان میں سے ایک کا نام جولیٹ تھا۔ اِس کی عمر کوئی پندرہ سال کی ہوگی۔ دُوسری اُس سے چھوٹی تھی شارلوت، یہ تقریبًا بارہ سال کی تھی۔ پڑوس کی وجہ سے میرے اس گھرانے کے ساتھ خوب تعلقات ہو گئے۔ کبھی وہ مجھے اپنے ہاں مدعو کرتے کبھی میں اُن کو بُلا لیتا۔ راتوں کو ہم اکثر کہانیاں کہا کرتے تھے میں چھوٹی لڑکی شارلوت سے مذاق کیا کرتا تھا کہ میں تو تجھ پر عاشق ہو گیا ہوں، اور اب تیرے ہی ساتھ بیاہ کروں گا۔ بچّی خوشی سے پھولی نہ سماتی اور تالیاں بجانے لگتی۔ اکثر آتی اور میری گردن میں باہیں ڈال دیتی۔ میری ہی گود میں سر رکھ کر سو جاتی تھی۔ پھر کچھ شرمانے سی لگی۔ اظہارِ محبت تو کم کر دیا مگر چپکے چپکے آنکھ بچا کر میری طرف دیکھتی رہتی۔ اِس کی باتوں کی اس کے ماں باپ کو بھی خبر تھی۔ وہ بھی اُس سے مذاق کیا کرتے تھے۔

میں نے اسی طرح وہاں تین مہینے گزار دیئے۔ جب میرے چلنے کے دن نزدیک آئے تو میں نے مالک مکان کو اپنے ارادے کی اطلاع دی کہ اب میں مکان چھوڑ رہا ہوں۔ آخری رات میں نے اپنے ہی والے حِصّہ میں بسر کی۔ آدھی رات جا چکی تھی کہ مجھے اپنے کمرے کا دروازہ کھلتا ہُوا محسوس ہُوا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ شارلوت چادر اوڑھے ہوئے ننگے پاؤں چلی آ رہی ہے۔

اس کی صورت دیکھ کر پہلے تو میں یہی سمجھا کہ اسے بخار چڑھا ہوا ہے اور اسی کی گھبراہٹ میں اُٹھ کر چلی آئی ہے۔ مگر اُس نے اندر آکر پہلے تو کمرے کے کواڑ بند کئے پھر میرے قدموں پر آن گری اور روتے ہوئے کہنے لگی ” مجھے نہ چھوڑو۔ میں تمہیں چاہتی ہوں“۔ پھر میرے گلے سے لپٹ کر میرا مُنہ چومنے لگی۔ جب میں نے دیکھا کہ بات مذاق کی حد سے گزری جارہی ہے۔ تو میں نے اُسے آہستہ سے ہٹانا چاہا مگر وہ نہ مانی۔ پھر میں نے سختی کے لہجہ میں اسے سمجھایا کہ تو بڑی بے وقوفی کر رہی ہے۔ جب تیرے گھر والے تجھے پلنگ پر نہیں پائیں گے تو نہ جانے کیا سمجھیں گے۔ اور ایسا نہ ہو کہ کہیں اس کا نتیجہ بُرا نکلے۔ مگر اس نے میری بات نہ سُنی اور اُلٹا میری منتیں کرنے لگی۔ میں اس گیارہ بارہ سال کی لڑکی اور اس کی محبت کی وجہ سے عجب اُلجھن میں پھنس گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ بہت دیر تک سوچ کر میں نے اس سے کہا ” اچھا شارلوت یوں ہی سہی۔ مجھے بھی تجھ سے محبت ہے۔ اب تو سورہ۔ صبح میرے ساتھ چلنا“۔ میں نے اپنے ہاتھوں پر اُٹھا کر اسے اپنے بستر پر لٹا دیا۔ مشکل سے پانچ منٹ گزرے ہونگے کہ لڑکی خرّاٹے لینے لگی۔ تڑکے ہی میں نے اس کو جگا کر کہا کہ اب تو احتیاط کے ساتھ اپنے کمرے میں چلی جا۔ اور سفر کی تیاری کر۔ لڑکی نے نظر بھر کر میری طرف دیکھا۔ اسے میری بات پر کچھ شک ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ اور وہ بغیر کچھ کہے کمرے سے چلی گئی۔

آٹھ بجے میری روانگی تھی۔ ماں، باپ اور بڑی لڑکی مجھے رُخصت کرنے کے لئے آئے۔ شارلوت کے متعلق میں نے پوچھا تو معلوم ہُوا کہ وہ اپنے کمرے سے نہیں آنا چاہتی اور نہ مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔

خیر میں وہاں سے چلا آیا۔ کتنے ہی سال بعد پھر ایک مرتبہ مجھے اس گاؤں میں جانے کا اتفاق ہُوا۔ شارلوت کے متعلق دریافت کرنے پر پتا چلا کہ وہ تو پندرہ سال کی عمر میں ایک خانقاہ کی راہبہ بن گئی تھی۔

(فرانسیسی سے ترجمہ) مستجاب احمد انصاری

خاکِ پاک

لحم مقلوبِ محل ہے، اور محل ہے عین کاخ
کاخ کو بھی آپ اگر مقلوب کر دیں، خاک ہے
شاہدِ مقصود، دو پردے اُلٹ کر مِل گیا
اصل میں یہ صورتِ لحمی ہماری، خاک ہے
خواہ تو ہو، خواہ میں ہو، خواہ بد ہو، خواہ نیک
خاک میں جو مِل گیا، وہ سر سے پاتک پاک ہے
خاک ہوں، اور خاک پر ہوں، خاک ہی میں جاؤں گا
خاک ہی خوراک ہے اور خاک ہی پوشاک ہے
خاک کی بدلی ہوئی صورت ہے ساری کائنات
ابتدا بھی خاک ہے اور انتہا بھی خاک ہے

(۲)

خاک کیا ہے؛ خاک ہے اک پاک طاقت کا نزول
خاک سے خوراک ہے، خوراک سے ادراک ہے
ہستیِ خاکی ہی کا صدقہ ہے ساتوں آسماں
شاہدِ اس میرے سخن پر معنیٔ لولاک ہے

احمد حسین امجد

ہندوستان کی موجودہ سیاسیات

اس وقت جب کہ متمدن دُنیا سکون و راحت کی تلاش میں جنگ کی طرف جا رہی ہے، اس وقت جب کہ یہاں کے بسنے والے اپنی موت میں آنے والی نسلوں کے لئے کسی پائدار نظامِ حیات کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ یہ دیکھنا کہ ہندوستان میں اب کیا ہو رہا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہم کسی تیز رفتار موٹر سے اُتر کر ایک چھکڑے میں سوار ہو گئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان میں موت سے ہم آغوشی کیا معنی ابھی "زندگی" پیدا ابھی نہیں ہوئی۔ نژادِ نَو کو اتنی فرصت نہیں کہ وہ آنے والے طوفانوں کے مقابلہ کی تیاری کرے۔ ہندوستان کے بوڑھے نکتہ چینی کی قوت رکھتے ہیں، اُن میں اتنا خون ہے کہ فرسودہ اداروں کی بقا کیلئے اس کے خون کا آخری قطرہ تک بہا دیں۔ مگر یہاں کے نوجوان ہر طرح سے مجبور ہیں۔ اُن میں نئی دُنیا کی تعمیر کی صلاحیت تو کیا پُرانی دُنیا کی تخریب کی ہمت بھی نہیں۔

اس وقت ہم ایک نئے دَور کا استقبال کر رہے ہیں۔ پچھلے برسوں میں جو کچھ ہُوا۔ وہ نہایت اُمید افزا تھا لیکن موجودہ حالت بہت مایوس کُن ہے۔ کشمکش، زندگی کا لازمی عنصر ہے، ہر چیز مائل بہ تغیر ہے۔ سکون، موت نہیں تو موت کا پیش خیمہ ضرور ہے۔ ہماری گذشتہ زندگی بھی ایک ایسے دَور سے گزر چکی ہے جس کا نمایاں جوہر ہماری بے چینی تھی، وہ بے چینی جو ایک انقلاب کی پیش رَو ہوتی ہے —— ہم اپنی جنگ میں کامیاب ہوئے یا نہیں یہ دوسرا سوال ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس وقت ہم میں زندگی تھی، قوت تھی، ایک اُمنگ تھی، مگر اب افسردگی چھا رہی ہے، بازو شل نہیں ہوئے مگر اُن میں ایک شکستگی سی پائی جاتی ہے، کیا یہ بے حسی، پھر اُس عظیم اضطراب کی پیغامبر ہو سکتی ہے جس نے ہندوستانیوں کو زندہ قوموں کی صف میں جگہ دی؛ اس سوال کا جواب سطورِ ذیل میں دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ جہاں تک ممکن ہو سکا، تمام مسئلہ کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا گیا ہے، اور اسی لئے ہندوستان کی آئندہ سیاسی ہیئت پر کوئی قطعی حکم نہیں لگایا گیا۔ مگر واقعات اس قدر صاف و سادہ ہیں کہ ہر شخص اُن قوتوں کا اندازہ کر سکتا ہے جو نئے ہندوستان کی تعمیر کریں گی —— جدید ہندوستان کی سب سے بڑی اور منظم جماعت کانگرس ہے۔ کسی زمانہ میں یہی مرکزی قوت تھی مگر اب بوجوہ، بہت سی جماعتیں اس کے پروگرام سے متفق نہیں۔ اس نفاق کے اسباب پر بحث، کانگرس کی تحریکوں کا مختصر سا ذکر چاہتی ہے، کانگرس کی موجودہ روش کے مطالعہ کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اس کے شاندار ماضی کا غائر مطالعہ کیا جائے کیونکہ اس زمانہ میں یہ تحریک بالکل آزادانہ۔ کسی عارضی قوت سے متاثر ہوئے بغیر چل رہی تھی، اس کا ارتقاء اس کی فطری قوت کا مرہونِ

منت تھا۔ مگر اب ایسا نہیں کیونکہ یہ تحریک دُنیا کی دوسری تحریکوں کے اثرات قبول کر رہی ہے۔ پہلے یہ تھا کہ اس کا پروگرام صرف انگریزوں کی حکومت کا خاتمہ چاہتا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟ اس پر کسی نے غور نہیں کیا تھا۔ جب کبھی کسی نے اس پر غور کیا، اُس کے خیالات پریشاں ہو گئے۔ دماغی توازن جاتا رہا۔ ذہنی انتشار نے اس کے اعمال پر تباہ کن اثر ڈالنا شروع کیا۔ یہی وجہ تھی کہ ہندوستانی رہنماؤں میں یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ وہ چاہتے کیا ہیں۔ کبھی درجۂ نوآبادیات اور کبھی آزادی، اور ان میں سے بھی اگر کچھ نہ ملا تو چند مراعات پر قناعت کر لی —— اس میں شک نہیں کہ آزادی سب چاہتے تھے، جو میدانِ جنگ میں آتا تھا، وہ غلامی کے شدید احساس کے زیرِ اثر لیکن جس کا دماغ آنے والے خطرات کا حل نہ سوچ سکا، اس نے سپر ڈال دی۔ اور یہی سبب تھا کہ ۱۹۲۱ء جیسی عظیم الشان تحریک بھی کامیاب نہ ہو سکی، بظاہر انگریزوں سے نجات پانے کی خواہش تھی مگر اس خواہش کو کامیاب بنانے کے لئے جس متحدہ عمل اور ذہنیت کی ضرورت تھی وہ مفقود تھے، مختلف جماعتوں نے کانگرس کو مدد دی، مگر غالباً سب کے دماغ میں یہ خیال موجود تھا کہ انگریزوں کی ہجرت کے بعد وہ یہ چیز لے گا اور یہ وہ —— اس کشمکش کے نتائج نے وہ سب کچھ ظاہر کر دیا، جس کے بیان کرنے کی جرأت ان مختلف پارٹیوں میں نہ تھی مگر جن کے حصول کے لئے یہ تحریکِ آزادی میں شامل ہوئے تھے۔ ۱۹۲۱-۲۲ء میں حکومت نے صنعتوں کو اپنے زیرِ سایہ کرنے کی ترکیب نکالی۔ ہر جگہ کارخانے کھلنے لگے۔ زرعی ہندوستان میں صنعتی ترقیوں نے ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ اور وہ لوگ جو بدیشی کپڑے جلایا کرتے تھے۔ جنہوں نے انگریزی مال کا بائیکاٹ کیا تھا۔ اب مطمئن ہو گئے، کیونکہ اُن کی ایک شرط پوری ہو گئی تھی —— دراصل جنگِ عظیم سے پہلے ہندوستان کی حرفتی صلاحیتیں دبی پڑی تھیں۔ حکومت نے کبھی اس طرف توجہ نہ کی تھی کہ ہندوستان کی وہ آبادی جو پہلے گھریلو صنعتوں اور دستکاریوں پر جیتی تھی، اب غیر ملکی میکانکی صنعت کے مقابلہ کے باعث بے گھر اور بے زر تھی۔ جنگِ عظیم آئی تو جنگی سامان کی تیاری و رسد وغیرہ کا بار ہندوستان پر پڑا۔ یہاں کی خفتہ قوتیں بیدار ہوئیں۔ معلوم ہوا کہ ہندوستان صرف زرعی نہیں بلکہ صنعتی ملک بھی ہو سکتا ہے۔ اختتامِ جنگ پر ایک دفعہ پھر غیر ملکی سرمایہ نے قبضہ کرنا چاہا مگر اب وہ جنہوں نے جنگ کے "سرمایہ خیز" دن دیکھے تھے، خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے عام بے چینی سے فائدہ اُٹھایا اب دو قوتیں ایسی تھیں جو قومی آزادی کی جدوجہد میں شریک تھیں، ایک تو عوام جو غیر ملکی سرمایہ کی دست درازیوں کا شکار تھے، دوسرے ہمارے نوخیز سرمایہ دار، تیسری قوت ان کے ساتھ اس چھوٹی سی جماعت کی تھی؟ جو انگریزی پڑھ کر غیر ملکی سیاست سے متاثر ہو رہی تھی، اور جسے صرف اپنے ملک کی آزادی کی تمنا تھی۔ یہی جماعت اپنی ذہنی و ملی فوقیت کے باعث، تحریکِ آزادی کی رہنما ثابت ہوئی —— چوتھی جماعت مسلمانوں کی تھی جو خلافت کی تحریک کے سلسلہ میں برطانوی شاطروں سے ناراض تھی اور صرف "بغضِ معاویہ" کے باعث شامل ہوئی ——

اب ان طاقتوں کے مختلف مقاصد پر غور کیجئے، یہ سب ایک دشمن سے لڑ رہے تھے، مگر اس متحدہ عمل کی طرح ایک متحدہ

پروگرام، ایک متحدہ ذہنیت غائب تھی۔ یا بالفاظِ صحیح تر ان میں سے ہر ایک پارٹی جُداگانہ اور ایک مبہم پروگرام کے ماتحت عمل کر رہی تھی، لہٰذا جب کسی پارٹی کو اپنے مقاصد کا عشرِ عشیر بھی حاصل ہوا۔ اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ تاجروں اور سرمایہ داروں کو صنعتی پروگرام ملا۔ اُنہوں نے کارخانے کھولنے شروع کئے۔ ہندو مسلمان فرقہ وار جماعتوں کو نئے آئین کے مطابق وزارتیں ملیں۔ انہوں نے کانگرس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس کے بعد پُرخلوص مگر مبہم تمنائیں رکھنے والے رہنماؤں کی چھوٹی سی جماعت رہ گئی۔ یہ لوگ غرض پرستوں کے ہتھکنڈوں سے ناواقف تھے اور اپنا کوئی مخصوص پروگرام نہ رکھتے تھے، اس لئے اپنوں کی غداری اور حکومت کے جبر نے ان کو منتشر کر دیا۔ اور عوام ـــــ وہ جن کے سہارے پر یہ کھیل کھیلا گیا۔ رہنمائی کے بغیر پہلے کی طرح دب کر رہ گئے ـــــ

جب یہ متحدہ محاذ ٹوٹا تو لوگوں کا عام خیال تھا کہ اب یہ آزادی طلب قوتیں دب جائیں گی۔ مگر ایسا نہیں ہُوا کیونکہ وہ چھوٹی سی جماعت جو دل سے آزادی چاہتی تھی برابر میدانِ جنگ میں ڈٹی رہی۔ اس میں شک نہیں کہ اُس نے بارہا پروگرام تبدیل کئے اُس کی گھاتیں بدلتی رہیں۔ مگر وہ شعلۂ آزادی جو بھڑک اُٹھا تھا، نہ بُجھا۔ اب کی اُس کے ساتھ پچھلی ناکامیوں کا تجربہ تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ عوام میں بیداری پیدا کر چکی تھی، اور اس کی اُمید تھی کہ اُن کے ساتھ براہِ راست تعلق اُس میں اپنی قوت کا اعتماد پیدا کر سکتا ہے۔ چنانچہ ان لوگوں نے مکمل آزادی کے حصُول کی کوشش شروع کی۔ مگر ابھی تک اس پروگرام میں ایک سیاسی تحریک کے پورے لوازم شامل نہ ہوئے تھے۔ ہر وہ قوم جو غیر ملکی حکومت کے زیرِ سایہ زندگی بسر کرتی ہے، اپنے اندر ایک انقلابی آگ رکھتی ہے، ایک ایسا موقع آتا ہے جب غلام کے سینہ میں بھی دم گھٹنے لگتا ہے۔ اس وقت صدیوں کے جمُود کے بعد اس کا غضب دُنیا کا جائزہ لینے لگتا ہے۔ ایسے موقع پر اگر اس کے پاس تخریب کی اصلاح کے لئے کوئی پروگرام ہوتا ہے تو وہ تباہی کے بعد اپنے ملک کو سنبھال لیتا ہے اور اپنے منتشر عناصرِ حیات کو جمع کر لیتا ہے، ورنہ مخالف قوت جس کے پاس یقیناً اپنا مستقل نظام ہوتا ہے، دوبارہ مسلط ہو جاتی ہے دُنیا کی دوسری تحریکوں سے بے تعلق ہونے کے باعث اس جماعت میں بھی یہی کمی تھی۔

فرقہ وارانہ ذہنیت سے پاک شدہ کانگرس صرف چند مخلص ہستیوں کا مجمُوعہ ہے، اس مٹھی بھر جماعت کی یہ کوشش کہ فرقہ پرست رہنما اُس کے ساتھ شامل ہو جائیں، اکثر و بیشتر ناکام رہتی ہے اور وہ ہمیشہ سمجھتی ہے کہ اُس کی ناکامی کا سبب اسی نفاق میں مضمر ہے یہ ایک حد تک صحیح ہے، مگر اس کے علاوہ ایک اور وجہ ہے جو خود اُس میں نااتفاقی کا سبب ہے ـــ عمل و ذہنیت کا یہ تفاوت روز بروز نمایاں ہوتا جا رہا ہے۔ کانگرس کا وہ زمانہ گزر چکا جب وہ ایک غلام کی اندھی خواہشِ آزادی کے زیرِ اثر کام کرتی تھی۔ اب اُس نے گردوپیش کا مطالعہ شروع کر دیا ہے اور اپنی تحریکِ آزادی کو دوسری معاشی و سیاسی تحریکوں کی روشنی میں منظم کرنا شروع کیا ہے۔ اسی "نشاۃِ ثانیہ" کا نتیجہ ہے کہ اس میں بہت سے متشکک، بہت سے باغی اور کچھ قدامت پسند پیدا ہو گئے ہیں۔ کانگرس کی اس نئی جماعت کے سامنے یہ سوال ہے "کہ اگر آزادی مِل گئی، تو وہ کس قسم کی آزادی ہو گی، کس جماعت کو زیادہ فائدہ پہنچیگا، کونسی جماعت معاشی

سائل میں انقلابی ترقی کی مخالفت کرے گی۔ ہمارے سیاسی ادارے کس طبقہ کے ہاتھ میں ہوں گے ...... حکومت کسی خاص گروہ کی ملکیت ہوگی یا عوام کی قوت رائے کے زیر اثر۔" (جواہرلال نہرو)

کانگرس کے اس نئے دور میں سب سے نمایاں ہستی جواہرلال کی ہے۔ جو اپنے ماضی کو بھول کر، حال کی طرف زیادہ اور مستقبل کی طرف اس سے بھی زیادہ توجہ دینا چاہتا ہے۔ مگر چونکہ کانگرس کے ساتھ مہاتما گاندھی کا نام ایسے ہی لیا جاتا ہے جیسے ہندوستان کے ساتھ انگریزوں کا، لہٰذا ہم پہلے اُن کی پالیسی پر تبصرہ کریں گے۔

مہاتما گاندھی کے متعلق سر فریڈرک وائٹ[1] کے یہ الفاظ کسی حد تک صحیح ہیں "وہ ایک سوشل ریفارمر ہے، مگر بدقسمتی سے سیاست کے جنگل میں آن پھنسا، اور اب اُسے باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملتا۔"

افریقہ میں ہندوستانی حقوق کے لئے جنگ اور کانگرس کی سب سے پہلی پیکار حریت ۱۹۲۱ء میں گاندھی اپنے اصلی روپ میں ظاہر نہیں ہوئے تھے ــ مگر ملک کو اُن کا شکرگزار ہونا چاہئیے کہ اُس وقت اُنھوں نے عوام کو جگایا، اُن کو غلامی کا احساس دلایا۔ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ ایک شخصِ واحد نے عوام کو بیدار کرنے کی کوشش کی، سیاسی آزادی کے لئے صرف عوام کی قوتِ رائے پر بھروسا کیا، اُن کو بتایا کہ ان کی مشکلات کا حل خود اُن کے ہاتھ میں ہے ــ یہ سب کچھ کرنا، ہر انسان کا کام نہیں، اس کے لئے غالباً گاندھی ہی کے عزم اور ذاتی ایثار کی ضرورت تھی ــ گاندھی اُس زمانہ میں ایک انقلابی تھا۔ مگر اس کے بعد اُن کی "مذہبیت" اُن پر غالب آگئی۔ اور اُن کے اعمال پر کسی اندرونی قوت کا اثر پڑنے لگا۔ اُن کا "ضمیر" تازیانہ کا کام کرتا تھا اور اُن کا دماغ ایک بے حس باربردار جانور کا ــ اور اس سے بھی زیادہ اُن کی خالص فرقہ وارانہ روش نے بہت سے لوگوں کو چوکنا کر دیا۔ وہ واشگاف الفاظ میں پُرانے "دَورِ زریں" کی تبلیغ کرنے لگے، جب کہ میکانکی آلات نہ تھے، کارخانے نہ تھے، صنعت صرف گھریلو دستکاری پر منحصر تھی۔ جب ایک گاؤں دوسری قریب کی آبادی سے بے نیاز تھا اور جب شاید اشلوک اور منتر لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے۔

اس کے بعد ایک اور کروٹ لی اور اچھوت اودھار کے لئے برت رکھا۔ یہ بذاتہ ایک عظیم الشان خدمتِ انسانی ہے۔ مگر اس کا سیاسی مصالح کی بنا پر شروع ہونا، قدرۃً شبہات پیدا کرتا ہے، مسلمان فرقہ پرستوں نے فوراً سوچنا شروع کیا، کہ گاندھی جی نے یہ برت ہندو، مسلم مفاہمت کے لئے کیوں نہ رکھا؛ فرقہ پرستوں کا یہ خیال چاہے کتنا ہی جانب دارانہ ہو مگر گاندھی جیسے سیاسی رہنما کا یہ اقدام قدرۃً ایک ایسی جماعت میں جو خود تقریباً مردہ ہو اور جو اپنی سیاسی زندگی کے لئے کسی دوسرے کے سہارے پر جیتی ہو، بہت خطرناک شبہات پیدا کرتا ہے ــ

[1] Future of East and West —— By Sir Frederick Whyte.

اس سے قطع نظر گاندھی جی کی موجودہ روش بھی کچھ کم خطرناک نہیں۔ اُن کا ذاتی رجحان "نیم فاسستی" ہے۔

اشتراکیت کو وہ بالکل نہیں مانتے، سماج کی معاشری تفریق کو مٹانا اُن کے پروگرام میں داخل نہیں، سرمایہ دار اور مزدور کی ناگزیر کشمکش میں وہ خود مصالحت کرادینا چاہتے ہیں۔ بڑے بڑے جاگیرداروں اور کسانوں میں جو آئے دن جنگ ہوتی رہتی ہے اُس کا فیصلہ جاگیرداروں کے رحم و کرم پر چھوڑنا مناسب سمجھتے ہیں۔ مشینوں کا استعمال نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن ہندوستان اسی میکانکی دنیا میں رہے گا، جس کے ساتھ لین دین کئے بغیر وہ بالکل ترقی نہیں کرسکتا۔ ایک طرف آبادی بڑھتی رہے گی اور دوسری طرف اُن کو پالنے کے لئے گھریلو صنعتیں ہونگی،

گاندھی جی نے جولائی ۱۹۳۴ء میں جاگیرداروں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا:۔

"جاگیرداروں اور کسانوں کے باہمی تعلقات تالیفِ قلوب کے ذریعہ خوشگوار بنائے جاسکتے ہیں اور وہ دونوں امن اور آرام سے رہ سکتے ہیں۔ میں زمینداری یا جاگیرداری نظام کو ختم نہیں کرنا چاہتا۔ جو لوگ ایسا چاہتے ہیں وہ نہیں جانتے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں ایسی تجویز میں شریک نہیں ہوسکتا جس کا مقصد شخصی جائداد ضبط کرنا ہو۔ میں تو تمہارے دلوں تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ تاکہ تمہیں تسخیر کرسکوں اور اس کے لئے تیار کرسکوں کہ تم اپنی جائداد (زمین وغیرہ کو) مزارعین کا وقف سمجھو اور اسے اُن کی بہتری کے لئے استعمال کرو ——— فرض کرو کوئی ایسا وقت آئے جب تمہیں کسی "معقول وجہ" کے بغیر اپنی جائداد سے محروم کرنے کی کوشش کی جائے، تو اس وقت تم دیکھو گے کہ میں تمہارے دوش بدوش ان دشمنوں سے لڑوں گا۔ اشتراکیت اور کمیونزم چند ایسے تصورات پر مبنی ہے جو ہمارے حالات سے بالکل مختلف ہیں۔ ایک ایسا مفروضہ انسان کی فطری خود غرضی ہے ...... ہماری اشتراکیت اور کمیونزم وہ ہے جو عدم تشدد اور سرمایہ و محنت [1] کسان اور جاگیردار کی خوشگوار مفاہمت پر استوار کی جائے"۔

یہ ہے مہاتما گاندھی کا وہ پروگرام جسے وہ ایک آزاد ہندوستان میں نافذ کریں گے۔ اس زمانہ میں جبکہ دوسرے ممالک نظامِ سرمایہ داری کو چھوڑکر نئے تجربے کررہے ہیں، ہمارا سیاسی رہنما ——— معلوم نہیں کتنے برس بعد جب دنیا کی خبر نہیں کیا حالت ہو ——— تالیفِ قلوب اور "معقول اسباب" کے نسخوں سے فرسودہ نظامِ جاگیرداری کا علاج کرے گا۔

مہاتما گاندھی کی یہ "ریاست پرستی" اس وقت بالکل عیاں ہوجاتی ہے جب وہ اُن مظلوم باشندوں کو جو دیسی ریاستوں میں سانس لیتے ہیں، اپنے سوراجی ہندوستان سے خارج کردیتے ہیں۔ وہ بارہا اعلان کرچکے ہیں کہ ریاستی باشندوں کو اپنے مسائل کا حل خود سوچنا چاہئے۔ گاندھی گروپ کے ایک ممتاز رکن سردار پٹیل [2] نے ایک موقعہ پر فرمایا تھا:۔

"کارکنوں کو چاہئے کہ ریاستوں میں حکومت کی عائد کردہ پابندیوں کے ماتحت کام کریں۔ اور نظامِ حکومت پر نکتہ چینی کی

---

[2] "ہندوستان ٹائمز" ۶ر جنوری ۱۹۳۵ء۔ تقریر بمقام بڑودہ۔

بجائے اُن کی یہ کوشش ہونی چاہئے کہ وہ حاکم اور محکوم میں خوشگوار تعلقات قائم کرنے میں مدد دیں۔" ممکن ہے اس پالیسی کے پیچھے اُن کی یہ پُرخلوص خواہش کام کر رہی ہو کہ ریاستی نظام پر "خردہ گیری" حکومتِ ہند کو تصرّفِ بے جا کا موقع دے گی، مگر اُن کو مطمئن رہنا چاہئے کہ ایسا ہونا انگریزی سیاست کے منافی ہے، ترقی پسند ہندوستان کی ہر ایک تحریک کے دشمن ہندوستانی ریاستوں ہی میں ملیں گے ہر وہ شخص جو دوسروں کے سہارے پر جیتا ہو، حالات میں ہر طرح کے تغیر سے گھبراتا ہے، ریاستوں کے مالک جو ریاست کی ہر ایک چیز اور چپہ چپہ زمین کو اپنی ذاتی ملکیت تصوّر کرتے ہیں، کبھی یہ نہ چاہیں گے کہ وہ موجودہ حالات میں کوئی تبدیلی کریں، لہٰذا اُنہیں کسی قسم کی تحریکِ آزادی، معاشری اصلاح یا سیاسی ترقی سے ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ دوسری طرف انگریز جو اس نکتہ کو سمجھتے ہیں، ریاستوں کے مالکوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے ہر وقت تیار ہیں، ریاست میں کتنی ہی بدنظمی کیوں نہ ہو، ان کے نمائندہ کو اُس سے کچھ سروکار نہیں ہوگا۔ ہاں البتہ اگر اُن کی اطاعت سے انحراف کا سوال پیدا ہوگا تو آئینی مشین فوراً حرکت میں آئے گی، اس قسم کے فرسودہ اور رجعت پسند عناصر کا زندہ رکھنا، ہر ملوکیت پسند قوت کی پالیسی ہوتی ہے۔

گاندھی گروپ کے ایک اور ممتاز رکن مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی ہیں۔ مسٹر ڈیسائی اور وہ گروپ جس کی قیادت وہ آج کل اسمبلی میں کر رہے ہیں، ایک جدید طاقتور ہندوستان کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ اُس ہندوستان کا جو صنعتی لحاظ سے ترقی یافتہ ہو، جہاں مشینی قوت مصروفِ عمل ہو جس میں چند شہروں کا تمام دیہاتی آبادی پر تسلط ہو اور جو اپنے ڈھانچے میں فاسِزم سے متاثر ہو۔ وہ مبہم تخیلات جو گاندھی وغیرہ کی پریشان خیالی کا باعث ہیں، مسٹر ڈیسائی کے دماغ میں پہنچ کر ایک خاص صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ اپنے راہبر کو پہچانتے ہیں اور اُن کی منزلِ مقصود متعین ہو چکی ہے ——— پچھلے اسمبلی الیکشن[1] کے سلسلہ میں وہ علی گڑھ تشریف لائے تھے اُنہوں نے ایک تقریر کی جس میں اٹلی، جرمنی اور جاپان کی طاقت، اُن کی قوم پرستی اور صنعتی ترقی پر مفصل تبصرہ کیا گیا تھا۔ ان قوموں کے جوشِ عمل سے وہ ہندوستان کے بے عمل نوجوان کو اُبھارنا چاہتے تھے، اور بتاتے رہے تھے کہ وہاں نئی دُنیا پیدا ہو رہی ہے، نئے خیالات جڑ پکڑ رہے ہیں . . . . اُن کی قوتِ عمل سے دُنیا خائف ہے . . . . . . اسی پر بس نہیں کی بلکہ چلتے چلتے "Ludwig" کی کتاب، جس میں فاشزم کی تعریف جی بھر کر کی گئی ہے، نوجوانوں کے مطالعہ کے لئے سفارش کر گئے۔ تقریر کے آخر میں جب ایک صاحب نے اعتراض کیا کہ "ہمارے سامنے کوئی پروگرام نہیں، کانگرس کی پالیسی ناکام ہو چکی ہے، اس جماعت کے سربرآوردہ ارکان نے (یہ اشارہ احمد آباد اور بمبئی کے سرمایہ داروں اور لبرل لیڈروں کی طرف تھا) خود غرضانہ عمل سے ملک کی تحریکِ آزادی کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا . . . . . اور اب جب کہ سب پیچھے ہٹ گئے ہیں کسان اور مزدور بے چارہ پھر بھوکا، بے گھر اور بے کار ہے" . . . . تو اس کے جواب میں مسٹر ڈیسائی نے جو فرمایا وہ سننے کے بجائے دیکھنے کے قابل تھا ——— ایسا معلوم ہوتا

[1] ۱۹۳۵ء کے آغاز میں۔

تھا گویا کوئی چٹان پہاڑ سے رہرووں پر آ گری۔ اُن کی گرجدار آواز، مضبوط بازوؤں میں ارتعاش، سخت الفاظ کی مسلسل بوچھاڑ، یہ سب کے سب اشتراکیت کی مذمت میں مدد دے رہے تھے، پندرہ منٹ کے "پتھراؤ" کے بعد جب سکون ہُوا تو بے ساختہ گاندھی جی کی "عدم تشدد" کی پالیسی یاد آئی۔ جو شخص بے چارگی کے عالم میں زبان و دہن سے اس قدر متشددانہ کام لے سکتا ہے۔ اُس کے مضبوط بازو اور انتقام جو دماغ، خود اختیاری کے عالم میں کیا کچھ نہیں کر سکتے! اس میں شک نہیں کہ یہ واقعہ ایک ذاتی حیثیت رکھتا ہے اور اسے سیاسی اہمیت دینا خطرناک ہو سکتا ہے مگر چونکہ وہ ایک گروہ کے لیڈر ہیں، اس لئے اُن کے اقوال، ایک خاص جماعت کی ذہنیت ظاہر کرتے ہیں۔ اشتراکیت کی ہجو کا محرک صرف "کسان اور مزدور کے بے گھر بے کار اور بھوکا ہونے" والا فقرہ تھا ورنہ اشتراکیت کا لفظ تک بھی کسی کے منہ سے نہیں نکلا تھا، اتنی سی تحریک پر اُن کے دماغ کا اُبل پڑنا ظاہر کرتا ہے کہ وہ ایک مخصوص معاشی نظام کی ذہنی تشکیل کر چکے ہیں، اور اُن کی آئندہ چالیں اس کی عملی تعمیر کی کوششیں ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ موجودہ کانگرس غیر متفق جماعتوں کا مجموعہ ہے، "تسلطِ غیر سے نجات کی خواہش" اسی کا ایک جذبۂ مشترک اُن میں پایا جاتا ہے اور اسی کے طفیل وہ مل بیٹھتے ہیں ورنہ اُن کی راہیں الگ اور منزلیں مختلف ہیں۔ فاشزم سے متاثر رہنماؤں کا مختصر سا ذکر ہو چکا ہے اب ہم ایک جدید رُجحان کا جائزہ لیتے ہیں، یہ رجحان کانگرسی اشتراکیت کی تحریک ہے۔ اور اس تحریک کا علمبردار جواہرلال نہرو ہے۔ جواہرلال غالباً پہلے ہندوستانی لیڈر ہیں، جنہوں نے ہندوستانی تحریکِ آزادی کی بین الاقوامی اہمیت ظاہر کی اور قومی و ملکی مسائل کا حل غیر ملکی حالات کی روشنی میں تلاش کیا۔ پنڈت جی کا خیال ہے کہ دنیا کے موجودہ مصائب کا تنہا ذمہ دار سرمایہ دارانہ نظام ہے، وہ سرمایہ داری جس نے آلاتِ پیداوار کو چند لوگوں کی ذاتی ملکیت بنا دیا۔ یہ لوگ اپنی بڑھتی ہوئی پیداوار کے لئے ـــــ جس کا واحد مقصد طلبِ زر ہے ـــــ غیر ممالک میں منڈیاں تلاش کرتے ہیں۔ یہ منڈیوں کی تلاش اور خام اشیاء کی خواہشِ حصول ہے جو ملوکیت اور شہنشاہیت پیدا کرتی ہے، اگر سرمایہ داری کے نظام کے بجائے کوئی ایسا نظام قائم کیا جا سکے جو نفع کے لئے نہیں بلکہ "ضرورت" کے لئے پیدا کرے تو دنیا کی مشکلات کا خاتمہ ہو سکتا ہے ـــــ پنڈت جی اس فلسفہ کی روشنی میں ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان، ایک تجارتی منڈی تھا، اب ایک محکوم ملک ہے اور اس کی آزادی، ملک کی معاشی فلاح کی پہلی شرط ہے مگر آزادی کے بعد اگر یہی غاصبانہ اغراض، غیر ملکی عناصر کے بجائے، ہمارے سرمایہ داروں پر غالب آ جائیں تو ہندوستان کی سیاسی آزادی ملک کے اصلی مسائل کا حل نہیں کہی جا سکتی۔ دراصل ہمارا سیاسی انقلاب، معاشی نظام کے ردّ و بدل کے لئے لازم ہے اور ہمارے معاشی نظام میں انقلاب، سیاسی آزادی کا اصلی مقصد ہے، ان خیالات کے باعث پنڈت جی نے اشتراکیت کو اپنا پروگرام بنا لیا ہے۔

[1] مجھے کامل یقین ہے کہ دنیا ـــ اور ہندوستان ـــ کے مسائل کا واحد علاج صرف اشتراکیت ہے اور جب میں اشتراکیت کہتا

---

[1] خطبہ صدارت پنڈت جواہرلال نہرو، لکھنؤ ۱۹۳۶ء

ہوں تو میں یہ لفظ محض انسانی ہمدردی کے جوش یا کسی مبہم معنی میں استعمال نہیں کرتا بلکہ اس سے ایک سائنٹیفک معاشی فلسفہ مراد ہے ۔ ۔ ۔ اشتراکیت کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے سیاسی اور معاشی اداروں میں انقلابی تغیرات واقع ہوں، زراعت وصنعت میں ہر ایک طبقہ کے مخصوص اغراض ختم کردیئے جائیں، جاگیرداری اور ریاستی نظام کو مٹا دیا جائے۔"

پنڈت نہرو کی اشتراکیت سماج میں دو متصادم گروہوں کو تسلیم کرتی ہے، اُن کے متضاد مفاد ہمیشہ برسرپیکار ہیں، تاریخی قوتوں کے زیر اثر طبقۂ بالا کو شکست ہوگی مگر کیسے؛ اس کے جواب میں پنڈت نہرو کسی باطنی قوت، روحانی اثر یا ستیہ گرہ کے مبہم تخیلات کی طرف اشارہ نہیں کرتے، بلکہ وہ اس کے حصول کے لئے قوتِ بازو کے استعمال کو جائز سمجھتے ہیں۔ ہندوستان میں زراعتی ترقی صنعتی پروگرام کے برابر مستحقِ توجہ ہوگی، ذرائع پیداوار اشتراکی حکومت کے تصرف میں ہوں گے، شخصی ملکیت اور ذاتی منافع معاشی زندگی سے خارج کردیئے جائیں گے۔ ۔ ۔ ۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ ضروری نہیں کہ ہندوستان کے اشتراکی، اندھا دھند رُوس کی تقلید کریں۔ بعض شعبوں میں ہندوستان کے مخصوص حالات کے ماتحت تبدیلیاں کرنی پڑیں گی!

یہ سب کچھ ہے مگر پنڈت نہرو یہ نہیں چاہتے کہ اشتراکیت کے جوش میں قومی جدوجہد کی طاقت کو کمزور کردیں۔ اُن کی کوشش ہے کہ تمام ملوکیت دشمن جماعتوں کو ایک محاذ پر جمع کردیں ـــ یہ بات قابلِ غور ہے کہ یہ جنگِ آزادی ایک نئی معاشی دُنیا قائم کرنے کا ذریعہ ہے یہ نیا ہندوستان اُن جغرافی حدود میں محصور نہیں ہوگا جو برٹش راج کو ظاہر کرتی ہیں۔ بلکہ اس کی ہمہ گیر قوت ہندوستان کے چھوٹے، بڑے دُور و نزدیک سب حصوں پر حاوی ہوگی۔

یہ پنڈت نہرو کا پروگرام ہے، گاندھی جی کی فاشزم اس پروگرام کے لئے اتنی خطرناک نہیں جتنی بھولا بھائی ڈیسائی اور اُن کی عملی قوت ہوسکتی ہے۔ کانگرس میں صرف یہی دو گروہ ہیں جو تحریکِ آزادی کو ایک خاص نظام کے قیام کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔ دونوں کی کامیابی کے لئے عوام کی قوت وشرکت ضروری ہے، اب تک صرف جواہر لعل کا گروہ ایسا ہے جو عوام میں اشتراکیت کا پرچار کر رہا ہے۔ گو ابھی تک لوگوں میں ایسی نمایاں بیداری پیدا نہیں ہوئی جس کے لئے کہا جاسکے کہ وہ اشتراکی پروپیگنڈا کا نتیجہ ہے۔ تاہم یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ دن دُور نہیں جب عوام روٹی اور کپڑا دینے کا وعدہ کرنے والے کی رہنمائی قبول کرلیں۔ پنڈت نہرو کانگرس کو چند پڑھے لکھے، غرض مند، حریت پسند قوم پرستوں کی جماعت دیکھنا نہیں چاہتے وہ سمجھتے ہیں کہ کانگرس کی اصلی قوت کسان اور مزدور کے عمل میں پنہاں ہے۔ جب تک کانگرس ان کے مفاد کو پیش نظر نہیں رکھے گی، ملک میں آزادی کا جذبہ پیدا نہیں ہوسکتا۔

اس کے مقابلہ میں دوسرا گروہ صرف سرمایہ داروں کی حمایت میں لڑ رہا ہے۔ وہ ہندوستان کی صنعت کے تحفظ جاپان کے

ا؎ "Co-pulsion or Conversion" Auto biography (1936)

سالہ تجارتی معاہدہ، ذمہ دار ملازمتوں میں ہندوستانیوں کے حصہ پر لڑتے رہتے ہیں۔ لیکن ابھی تک یہ لوگ عوام کے پاس کوئی پروگرام لے کر نہیں پہنچے۔ ان کا سہارا صرف گاندھی اور کانگرس" کا وہ جادو آمیز اثر ہے جو ابھی تک ہندوؤں کے ایک نچلے طبقہ کو مسحور کئے ہوئے ہے۔ تاہم اس سے یہ سمجھنا چاہئے کہ ہندوستان میں فاشزم کی کامیابی کے امکانات بہت کم ہیں۔ کیونکہ یہ ایک ایسی قوت ہے جس میں عوام کے توہمات اور نوخیز قومی عصبیت کو حسب منشا تحریک دینے کی حیرت انگیز صلاحیت ہے۔

کانگرس حلقہ سے باہر دو جماعتیں اور نظر آتی ہیں۔ ایک لبرل اور دوسرے فرقہ پرست، لبرل جماعت کے تقریباً تمام رہنما ہندو ہیں، مگر فرقہ پرستوں میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں۔

ہندوستان کی لبرل جماعت ایک دھوکا دینے والا تخیل ہے۔ یہ جماعت دراصل، انگلستان کی لبرل جماعت کی روایات کی پیروی کرنا چاہتی ہے، انگلستان کی تاریخ، مختلف نظریوں کی عملی داستان ہے، اس کی سیاست کے کئی دور بنائے جا سکتے ہیں جن میں سے ہر ایک دور، ایک مخصوص اور مختلف سیاسی یا تجارتی نظریہ سے متاثر تھا۔ مثلاً ایک زمانہ میں انگلستان "تجارتی پالیسی" پر عامل تھا۔ اس کے بعد "صنعتی تحفظ" کے پروگرام کے زیر اثر رہا۔ اور پھر ایک ایسا دور آیا جب سیاست اور تجارت میں "آزادی اور غیر مداخلت" سے کام لیا گیا۔ اس دور میں تقریر کی آزادی، تحریر کی آزادی، خیالات کی آزادی، مذہب کی آزادی، . . . . سب قسم کی آزادیاں بخشی گئیں۔ اس سیاسی دور کی یہ "لبریت" اس کو دوسرے تاریخی ادوار سے ممتاز کرتی ہے۔ اب ہماری لبرل جماعت بھی کچھ اسی قسم کی آزادیوں کی دعویٰ دار ہے، مگر جہاں تک اس کے اعمال کا تعلق ہے، وہ اس پالیسی پر بہت کم عمل کرتی ہے۔ سب سے معمولی اور پہلی آزادی —— یعنی آزادئ تقریر و تحریر کی بھی یہ لوگ مخالفت کر بیٹھتے ہیں، جیسا کہ سر تیج بہادر سپرو کی اس روش سے ظاہر ہے جو انہوں نے پنڈت نہرو کی "سول آزادی" کی انجمن کے سلسلہ میں اختیار کی۔ دراصل ان کی تمام پالیسی یہ ہے کہ ہر شعبۂ حیات میں "ہندوستانیت" پائی جائے۔ سرکاری ملازمت، فوج، پولیس وغیرہ میں ہندوستانی عنصر کی اکثریت ہو، یہ لوگ کسی انقلابی تحریک سے متاثر نہیں ہوئے، ان کا ارادہ ہندوستان کو آہستہ آہستہ ایسی آزادی دلانے کا ہے جس میں اعلےٰ خاندان کے لوگ حکومت برطانیہ سے تعاون کیا کریں، یہی وجہ ہے کہ اکثر وزارتوں پر یہی لبرل حضرات مقرر کئے جاتے ہیں اور وہ حکومت کی سرپرستی میں تمام ترقی پسند رجحانات کو کچل دینا چاہتے ہیں، بالفاظِ دیگر یہ لوگ انہی حقوق کو غصب کرتے ہیں جن کی بقاء حیات کے یہ دعویٰ دار ہیں، اس پارٹی کے بڑے بڑے لیڈر سرینواس شاستری، سر تیج بہادر سپرو، پنڈت ہردے ناتھ کنزرو، سطرسی وائی، چنتا منی وغیرہ ہیں ——

اسی لبرل جماعت کی دوسری شاخ جو فاشزم کی طرف زیادہ رجحان رکھتی ہے، اس کوشش میں ہے کہ اشتراکیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکے، اس مقصد کے لئے سب سے پہلے ان لوگوں (سرکاؤس جی جہانگیر و سر فیروز شاہ سیٹھنا وغیرہ) نے بمبئی میں ایک فاشی پارٹی کی بنیاد ڈالی، اور اس کے بعد حکومت کی سرپرستی میں، اشتراکیت کو تباہ کرنے کا عملی اقدام کیا۔ فاشی پارٹی کا افتتاح

ماہِ ستمبر ۱۹۳۶ء میں کیا گیا اور ۲۹ ستمبر[ف۱] کو سر فیروز سیٹھنا نے کونسل آف سٹیٹ میں گورنمنٹ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اُس اشتراکیت کو جس کا پرچار کانگرس کا صدر جواہر لال نہرو کر رہا ہے، ہندوستان کی سرزمین سے نکالنے کی کوئی مؤثر تدبیر اختیار کرے ——— اس طرح سے ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان میں اشتراکیت کے تین خطرناک دشمن ہیں (۱) سرمایہ دار (۲) لبرل (۳) کانگرس کے فاشی قوم پرست! ان جماعتوں کے ساتھ اینگلو انڈین پریس بخوشی تعاون کرے گا۔ ان حالات میں جواہر لعل کا کانگرسی قوم پرستوں کے ساتھ اشتراکِ عمل سمجھ میں آجاتا ہے۔ کانگرس کے نئے پروگرام میں کہیں کہیں جو تضاد پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے۔ مثلاً پنڈت نہرو کی خواہش ہے کہ جدید آئین کو عملاً کامیاب نہ ہونے دیں لہٰذا وہ قوم پرستوں کے زیرِ اثر کونسلوں کے داخلہ کی حمایت کرتے ہیں۔ مگر جب وزارتوں کے قبول کرنے کا مسئلہ پیش ہوتا ہے۔ تو پنڈت جی شدید ناراضی کا اظہار کرتے ہیں۔ کیونکہ اُن کا خیال ہے کہ وزارتوں کا قبول کرنا، برٹش امپریلزم سے تعاون کرنا ہے۔ پنڈت نہرو قوم پرستوں کا اس حد تک ساتھ دے سکتے ہیں کہ وہ کونسلوں میں جاکر حکومت کے ان اقدامات پر جو قومی مفاد کے منافی ہوں نکتہ چینی کریں، معاشی و اصلاحی قانون پاس کریں مگر وہ نہیں چاہتے کہ کانگرسی ارکان حکومت کے استبدادی آئین کے نفاذ میں مدد دیں۔

فرقہ پرستوں میں سب سے پہلا نمبر ہندو مہاسبھائیوں اور مالویہ کے قوم پرستوں کا ہے۔ اُن کی اُمیدوں کا منتہا یہ ہے کہ مالوی جی کو وزیرِ اعظم، بھائی پرمانند کو وزیرِ ہند اور ڈاکٹر مونجے کو وائسرائے بنا دیا جائے، اس کے بعد یہ لوگ ہندوستان پر راجیہ کریں گے ——— ان کی کوششیں اس قدر غیر تاریخی امکانات پر مبنی ہیں کہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کو ان سے زیادہ خطرہ نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ حالاتِ حاضرہ میں اِن کی ریشہ دوانیاں، اِن کے جوڑ توڑ، قومی تحریکِ آزادی کو سخت نقصان پہنچا رہے ہیں۔ مگر ہمارا ان کا تعلق دُور کا ہے۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ کیا اِن لوگوں کے خواب کبھی پورے ہو سکتے ہیں، اور کیا یہ گمراہ قوت ہندوستان کو اس ہندوستان کو جو تغیر پذیر دنیا میں ایک انقلابی کروٹ لیا چاہتا ہے، اس قدر مفلوج کر سکتی ہے کہ یہاں کے معاشی حالات، مخصوص تاریخی اسباب اور معاشری ماحول اس کے غیر مستقل اثرات قبول کر لیں۔

ہندو قوم پرستوں سے خطرہ کی صرف ایک وجہ ہے اور وہ ان کی قوتِ عمل ہے۔ صدیوں کے جمود کے بعد ردِ عمل ہونا ضروری تھا۔ یہ صرف احساسِ زیاں ہے جو اُن کو ترغیبِ عمل دے رہا ہے۔ اُن کی اکثریت، سیاسی بیداری، شاندار ماضی کا تخیل، یہ سب کے سب اُن کو ہر قوت سے برسرِ پیکار رکھتے ہیں۔ اور گو یہ خیالات عمل میں سرگرمی پیدا کر سکتے ہیں۔ مگر تاریخی قوتوں کو شکست دے کر ایک غیر قابلِ عمل نظام قائم نہیں کر سکتے ——— دُوسرے اُن کا سماجی نظام کچھ اس قسم کا ہے کہ اس میں بھی صرف ایک محدود قوت کی حکومت ہوتی ہے اور یہ ہمیشہ یونہی رہے گی، اور جب تک اس جماعت میں ایک غالب قوت کا غرور باقی رہے گا جدید دنیا کے عوام

ف۱ Statesman, 29, September, 1936

پرحکومت کرنا غیرممکن ہے ـ پنڈت مالویہ اور مسٹر اینے کی کوششیں، عوام سے متعلق نہیں، اُن کی قوت کا راز کسی مستقل سماجی یا معاشی پروگرام میں نہیں بلکہ وہ قوت کٹر دھرم پرستوں کی ایک محدود جماعت کے مذہبی میلانات میں پائی جاتی ہے ۔ ان کا جماعتی اور معاشری غرور و تفوق اُن کو عوام سے ہمیشہ جدا رکھتا ہے ۔ اِن حالات میں ـــ جب کہ ہماری سیاست غیر شعوری طور پر عوام کی معاشی مشکلات سے اثر پذیر ہو رہی ہے اس جماعت کی کامیابی محال ہے، اس معاشری تفریق کی اہمیت صرف اس وقت ظاہر ہو سکتی ہے جب کہ کوئی دوسری قوت (مثلاً مسلمان فرقہ پرست) اپنے مذہبی احساسات کے زیر اثر، ہندوؤں کی سی قوت عمل کے ساتھ میدان جنگ میں کود پڑیں ـ مسلمانوں میں سماجی طبقے نہیں پائے جاتے یا اگر ہیں تو وہ اس قدر مصنوعی اور غیر مستقل کہ مذہبی تحریک کے سامنے بالکل بے حقیقت ہو جائیں ـــ اس وقت عوام کی قوت اتنی خوفناک ہو سکتی ہے جتنی جرمنی میں نازیوں کی . . . . . !

ہندو فرقہ پرستوں کے مقابلہ میں مسلمانوں نے بھی ایک جماعت آراستہ کی ہے ـ لیکن یہ جماعت اس قدر بے حس، بے جان اور منتشر ہے کہ یہ ہندوستان کو تو کیا خود اپنی قوم کو فائدہ نہیں پہنچا سکتی ـ اس کی سب سے بڑی وجہ وہ خرابی ہے جو اس کی تعمیر میں مضمر ہے جتھا بندی کی یہ کوشش کسی تاریخی قوت کے زیر اثر عمل میں نہیں آئی بلکہ یہ ہندو فرقہ پرستوں کے زر سیاست کا نتیجہ ہے ـ وہ ولولۂ حریت جو ہر زندہ قوم کے سینہ میں دھڑکتا ہے، اس مدقوق مریض کی خواہش آزادی میں تبدیل ہو گیا ہے جو اپنی یقینی موت کے خیال کے باعث ہر مضر چیز کا استعمال جائز سمجھتا ہے، ان کے پاس چونکہ کوئی پروگرام نہیں، اس لئے ان کا ہر کام سرکار کے زیر سایہ انجام پاتا ہے ـ ۱۹۲۱ء کی تحریکِ خلافت کو چھوڑ کر ان کی سیاسی زندگی کے واقعات مذہبی قتل پر فساد، فرقہ وارانہ تناسب، قربانی، باجے اور مسجد کے مسائل پر مشتمل ہیں ـ

مسلمان قوم پرستوں کا اڈا پنجاب ہے ـ اور غالباً اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہاں کی بیشتر آبادی جس میں اکثریت مسلمانوں کی ہے ـ ہندو ساہوکاروں کے قرضہ تلے دبی ہوئی ہے ـ مگر چونکہ ان فرقہ پرست مسلمانوں کی رہنمائی اونچے طبقہ کے ہاتھوں میں ہے جو صرف اپنا فائدہ پیشِ نظر رکھتا ہے اس لئے عوام (کسانوں) کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا ـ ورنہ قرضہ ایک ایسا معاشی مسئلہ ہے جو مسلم قوم پرستوں اور دوسری قرضہ کی مخالف[1] قوتوں میں ذریعۂ اشتراک ہو سکتا تھا ـ مگر غرض پرست رہنماؤں کے درمیانہ طبقہ کی ذہنیت ان کو ہمیشہ ملازمتوں اور وزارتوں کے تناسب پر لڑاتی رہتی ہے ـــ ظاہر ہے کہ یہ رہنما قرضہ کی اہمیت سے واقف ہیں ـ وہ جانتے ہیں کہ یہ ایک ایسا معاشی مسئلہ ہے جو مذہب کی تفریق مٹا کر مقروض اور قرضدار کو قریب تر کر سکتا ہے ـ وہ کسان کی اس ضرورت سے واقف ہیں جو اس کو ہر اس شخص کا جو اسے روپیہ دے، غلام بنا ڈال سکتی ہے، کیونکہ ایسے ہی خیالات تھے جن کے باعث جداگانہ انتخاب کا شور مچایا گیا ـ کہ کہیں ایسا نہ ہو، مقروض قرضہ کے بار یا روپیہ کے لالچ میں ہندوؤں کو ووٹ دے ـــ مگر ان سب

[1] مثلاً کانگرس کی اشتراکی پارٹی ـ

حالات سے واقفیت کے باوجود مسلم فرقہ پرست کسان کے لئے کیا کر رہے ہیں؛ یہی کہ اس کو ترمنگی بلا سے نجات کا وعدہ دے کر ووٹ لے لیں! ان کی خود غرضانہ روش ہر اس موقع کا فائدہ اُٹھاتی ہے جو ان پڑھ، سیاسی گھاتوں سے ناواقف عوام کے اوہام لوازِ تخیلات میں ہیجان برپا کر سکے۔

یہ حالات پنڈت جواہر لعل کے ان فقروں کی صداقت ظاہر کرتے ہیں:۔

"فرقہ وارانہ مسئلہ بنیادی طور پر ہندو مسلمانوں کے متوسط طبقہ کی نئے آئین کے ماتحت قوت اور ملازمتیں حاصل کرنے کے لئے جنگ ہے۔ اس کا عوام سے کوئی تعلق نہیں۔ فرقہ وارانہ مطالبات میں سے کوئی بھی مطالبہ معاشی مسائل یا عوام کی ضروریات سے متعلق نہیں۔ اگر ان مطالبات کا بنظرِ غور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ ان کا تعلق یا تو کونسل کی نشستوں سے ہے، یا آئندہ آنے والی ملازمتوں سے۔"

پنجاب سے باہر نکل کر مسلمانوں کی وہ واحد جماعت نظر آتی ہے جس کا دعویٰ ہے کہ وہ تمام ہندی مسلمانوں کے جذبات کی ترجمان ہے۔ یہ جماعت مسلم لیگ ہے جو ۱۹۰۶ء میں تقسیم بنگال کے موقع پر ہندوؤں کے ایجی ٹیشن کے خلاف برٹش حکومت سے تعاون کی غرض سے قائم کی گئی تھی۔ اس کا مقصد حکومت سے مراعات حاصل کرنا تھا، موقع بھی غنیمت تھا۔ کیونکہ اس وقت ہندوؤں کا تعلیم یافتہ طبقہ جو مسلمانوں سے بلحاظ سیاست و وطن پرستی بڑھا ہوا تھا حکومت کے عتاب کا شکار تھا۔ جب تک انگریزوں کو ان کے ساتھ اشتراک کی ضرورت تھی، حکومت نے مسلم نوازی سے کام لیا ..... مگر اس کے بعد یہ جماعت ہر طرح سے منتشر اور غیر اہم ہو گئی، کیونکہ اب سرکاری سایہ اُٹھ چکا تھا ــــ اب پھر کچھ عرصہ سے مسٹر جناح نے اس میں روح پھونکنا شروع کی ہے۔ اُن کی کوشش تھی کہ تمام مسلم رہنماؤں کو یکجا جمع کر دیا جائے۔ اس کے لئے اُنہوں نے دورے کئے، مسجد شہید گنج کا فیصلہ کرانے کا تہیہ کیا۔ تقریریں کیں اور یہ اطمینان دلایا کہ یہ جماعت اب ایک عملی پروگرام پر عامل ہو گی۔ کیونکہ اُن کی رائے میں وہ اب صرف رزولیوشن پاس کرنے والی مشین کے درجہ سے نکل چکی تھی ــــ یہ ان کا اپنا الیکشن پروپاگنڈا تھا۔ مگر ہندوستان میں اور مسلمان بھی بستے ہیں، اُنہیں بھی الیکشن سے دلچسپی ہے، لہٰذا اُن میں پھر پھوٹ پڑ گئی۔

پارلیمنٹری بورڈ کی پالیسی نئے آئین کے ماتحت بھی فرقہ پرستانہ رہے گی۔ کیونکہ الیوارڈ کی سلامتی اور نئے آئین کے نفاذ میں مدد، اس کے پروگرام میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر باوجود اس کے اس بات کی پوری کوشش کی جائے گی کہ دوسری قوم پرست جماعتوں سے اشتراکِ عمل کی کوئی صورت نکل آئے۔ اس دو عملی سے گھبرا کر نواب چھتاری وغیرہ نے بورڈ کی ممبری سے استعفیٰ دے دیا۔ کیونکہ اُن کا خیال ہے کہ وہ ہندو مسلم دونوں فرقوں کی ایک ایسی جماعت تیار کریں گے جس کا صرف یہ کام ہو کہ وہ نئے آئین کو کامیاب بنانے کی کوشش کرے۔ اس جماعت کو فرقہ پرستی اور ملک کی آزادی سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔

ﮯ "India & the world" By Jawahar lal Nehru.

یہ ہیں سب اور تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی روش ہے[1] ان میں سے صرف ایک معمولی اقلیت ایسی ہے جو کانگرس کی حلیف ہے مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری کسی مستقل پروگرام کا نہ ہونا ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ ابھی "بادہ نیم رس" ہے، ان کا کوئی لیڈر ایسا نہیں جو کسی وسیع جماعت کا نمائندہ ہو اور دل سے کامل آزادی کا خواہاں ہو۔ مگر ان کے مقابلہ میں ہندوؤں کی تقریباً تمام اہم جماعتیں کامل آزادی کی طلبگار رہیں۔ اُن میں سے کوئی مسلمان کے ساتھ تعاون کرکے آزادی حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس کے بعد اُن کو برابر کا شریک سمجھ کر ملک میں حکومت کرنا چاہتا ہے۔ اور کوئی مسلمانوں کو مغلوب کرکے ہندو راج قائم کرنا چاہتا ہے، اور کوئی ہندو پارٹی کی فاشزم کا عروج دیکھنا چاہتا ہے ..... مگر ان سب میں ایک بات مشترک ہے اور وہ کامل آزادی ہے اسی لئے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ پنڈت مالویہ کی قوم پرست پارٹی پنجاب میں کانگرس کے ساتھ تعاون کرنا چاہتی ہے یا مسٹر اینے صرف اتنی سی بات پر اس پارٹی سے الگ ہونا چاہتے ہیں کہ اس کے مقاصد کانگرس کے پروگرام سے مختلف ہیں ... جب تک سیاسی آزادی ہندوستان کو نصیب نہیں ہوگی، اُس وقت تک معمولی اصلاحات زیادہ مفید نہیں۔ اور مسلمان جب تک سیاست میں کامل آزادی کا علم بلند نہ کرے گا، اُس کی سیاسی کامیابی اور رہنمائی ہمیشہ فرقہ وارانہ رہے گی .....

ہندوستانی سیاست پر یہ تبصرہ جواہر لعل نہرو کے مندرجہ ذیل الفاظ کی مفصل داستان ہے :۔

"ہندوستان میں مختلف ذہنیات (idealogies) کی کشمکش جاری ہے اور ایک بڑے ملک کی ہر زندہ تحریک میں ایسا ہونا ناگزیر ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ برطانوی ملوکیت کے خلاف تمام جماعتوں میں یک جہتی پائی جاتی ہے، سوائے اُن گروہوں کے جو یا تو اس سے (ملوکیت) فائدہ اٹھاتے ہیں یا جو خود اُس کی پیداوار ہیں، مگر اس میں بہت کم شبہ کی گنجائش ہے کہ مستقبل قریب میں ہندوستان میں تغیرات ہوں گے اور وہ آزادی کے بہت قریب ہو جائے گا"

محمد صدیق تاؤنی
بی۔اے (علیگ)

---

[1] India and the World — By Jawahar Lal Nehru (1936)

حفاظتِ نسل

سراچۂ شعور میں مَیں جبکہ نو رسیدہ تھا / مسافرانہ یاس کے ہجوم میں جریدہ تھا
کسی پری جمال کی شبیہ روبرو نہ تھی / جہانِ آرزو میں تھا مگر کچھ آرزو نہ تھی
شکار و سیر کیلئے جبال و دشت۔ اُور مَیں / جب آئی نیند، سو گیا وگرنہ گشت۔ اُور مَیں
کئی بہاریں عمر کی اسی طرح گزر گئیں / مری وہ بے شعوریاں خبر نہیں کدھر گئیں

مرے شعورِ تام کا سبب "بنی کنانہ" ہے / نشاطِ آفریں مری بہار کا زمانہ ہے
شکار و سیر کے لئے میں جا رہا تھا ایک دن / کہ راستہ میں کر دیا اسی نے مجھ کو مطمئن
ملی اسی قبیلہ سے مری نظر کو تازگی / وہ اس کی آنِ تمکنت! وہ اسکی شانِ سادگی!!
مرا یقیں گواہ ہے کہ اب میں بامراد ہوں / رفیقۂ حیات کی مخاطبت سے شاد ہوں

میں اس کا ہمخیال ہوں وہ میری ہمخیال ہے / نشاطِ بارِ زندگی کا آٹھواں یہ سال ہے
ہمارے زیرِ سایہ تین دختر و پسر ہیں خوش / ہم اپنے وارثوں کو خود بھی دیکھ دیکھ کر ہیں خوش
ہمیشہ ساتھ دیتے ہیں یہ بچے شرب و اکل میں / خدا کا فضل ہی مجسم ان کی پیاری شکل میں

نصیب جب ہوئی مجھے یہ "عارفانہ زندگی"
گناہ بے مزہ بنی "مجردانہ زندگی"

علی منظور حیدر آبادی

دو انگوٹھیاں

(۴)

شادی کے بعد دمن داس اپنے گھر لوٹ آیا۔ اس کے بعد اور چار سال گزر گئے۔ پورا ندر اب تک مفقود الخبر تھا لیکن اگر اب وہ واپس آ بھی جاتا تو ہیرا منی کو اُس سے کیا واسطہ تھا!

پھر بھی ہیرا منی کا دل اس خیال سے کچھ بجھا بجھا سا رہتا کہ اُس کے بچپن کے ساتھی کا سات سال سے کچھ پتا نہیں۔ وہ دل میں کہتی "میں کس طرح یقین کروں کہ اتنے سال سے وہ محض اس لئے باہر ٹھہرا ہُوا ہے کہ اب تک وہ مجھے بھول نہیں سکا۔ کس کو خبر ہے وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ اگرچہ اب میں کسی اور کی بیوی بن چکی ہوں اور میرے دل میں پورا ندر کو دیکھنے کی خواہش پیدا نہیں ہونی چاہئے لیکن میں اس کی سلامتی کی اُمید کیوں نہ رکھوں اور یہ دُعا کیوں نہ کروں کہ میرا بچپن کا رفیق زندہ ہو۔"

اسی زمانے میں اُس کے بڈھے باپ کے چہرے سے روز بروز سخت گھبراہٹ اور بیکلی ظاہر ہونے لگی اور آخر وہ بہت بیمار ہو کر مر گیا۔ دمن داس کی بیوی نے فیصلہ کیا کہ میں اپنے شوہر کے بعد زندہ نہیں رہوں گی۔ ہیرا منی کا اب ماں کے سوا اور کوئی رشتہ دار نہ تھا۔ اس نے رو رو کر اپنی ماں سے التجا کی کہ وہ اپنے اس خوفناک ارادے کو بدل دے۔ لیکن سوداگر کی بیوی دُھن کی پکی تھی چنانچہ ہیرا منی دُنیا میں بالکل اکیلی رہ گئی۔

مرنے سے پہلے ہیرا منی کی ماں نے اسے دلاسا دینے کی کوشش کی۔ اس نے کہا: "دیکھو میری بچی! تمہیں فکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ آخر تم ایک بیاہی ہوئی عورت ہو۔ کیا عجب ہے کہ مقررہ میعاد گزرنے پر تمہیں اپنا شوہر مل جائے۔ اس کے علاوہ دولت جو دُنیا میں انسان کی سب سے بڑی مددگار ہے تمہیں حاصل ہے۔ تمہارے باپ نے تمہارے لئے اس کا مناسب انتظام کر رکھا ہے۔"

افسوس کہ بیچاری ماں غلط فہمی میں مبتلا تھی۔ دمن داس کی موت کے بعد جب اس کی جائداد کا جائزہ لیا گیا تو معلوم ہُوا کہ دولت کی ڈھلتی پھرتی چھاؤں کہیں کی کہیں پہنچ چکی تھی اور اب لڑکی کی ملکیت میں اس کے زیور کے علاوہ باقی صرف اس کا آبائی مکان اور اس مکان کا سازوسامان ہی تھا۔ اب یہ بات کھلی کہ اس کے بڈھے باپ کو کاروبار میں مدتوں سے گھاٹے پر گھاٹا پڑ رہا تھا۔ اس نے اپنے اس خسارے کا ذکر کسی سے نہ کیا تھا اور خاموشی کے ساتھ اس کی تلافی کی کوششوں میں مصروف رہا۔ لیکن آخر جب

اسے کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو وہ مایوس ہو کر بیٹھ گیا۔ یہی فکر اور پریشانی اس کی بیماری اور موت کا باعث بنی۔

جب بدقسمت تاجر کی ناکامیوں کا چرچا ہُوا تو قرضخواہوں نے ہیرامنی پر تقاضوں کی یورش کر دی۔ ہیرامنی کو تحقیق کرنے پر معلوم ہُوا کہ قرضخواہوں کے مطالبات درست ہیں۔ چنانچہ اس نے ایک سچے سوداگر کی بیٹی کی طرح اپنے باپ کے نام کی عزت کو برقرار رکھنے کے لئے اپنی باقیماندہ تمام منقولہ و غیر منقولہ جائداد فروخت کر کے ایک ایک پائی ادا کر دی۔

اب بیچاری لڑکی بالکل بے سروساماں رہ گئی۔ اس نے قصبے کے ایک سرے پر پھوس کا ایک چھپر کرائے سے لیا اور اس میں غریبی کے دن اور مفلسی کی راتیں کاٹنے لگی۔ اب اس کے دل کو لے دے کے ایک اپنے گرو انند سوامی ہی کا سہارا تھا لیکن بدقسمتی سے وہ ان دنوں کہیں بہت دُور نکل گیا تھا اس لئے بیچاری لڑکی اپنے تنہا مددگار اور سرپرست کی دلجوئی سے بھی محروم تھی۔

(۵)

ہیرامنی نوجوان اور حسین عورت تھی۔ اس کا اپنے گھر میں تنہا سونا مناسب نہ تھا۔ ظاہری خطرے کے علاوہ اس سے بدنفس عوام کو ہلیلے اُٹھانے کا موقع بھی ہاتھ آ جاتا۔ اتفاق سے ایک گوالے کی بیٹی املا قریب ہی رہتی تھی۔ یہ عورت بیوہ تھی۔ اس کا ایک ننھا بچہ اور دو چھوٹی چھوٹی بچیاں تھیں۔ اس کی جوانی اور دلکشی کی بہار ختم ہو چکی تھی اور وہ اپنے اڑوس پڑوس میں نہایت نیک سیرت اور پارسا مشہور تھی۔ چنانچہ ہیرامنی نے جلد ہی یہ معمول بنا لیا کہ وہ رات کو املا کے گھر چلی جاتی اور وہیں سوتی۔

ایک رات جب ہیرامنی اپنی نئی سہیلی کے گھر پہنچی تو املا نے اس سے کہا "میں نے آج ایک نئی خبر سُنی ہے۔ کہتے ہیں پوراندر چیٹی آٹھ سال کے بعد اپنے گھر واپس آیا ہے"۔

یہ غیر متوقع خبر سنتے ہی ہیرامنی نے اپنا رُخ پھیر لیا کہ کہیں املا آنسوؤں کے اُن اُبلتے ہوئے چشموں کا راز نہ پا لے جو یہ خبر سنتے ہی اس کی حسرت زدہ آنکھوں سے پھُوٹ بہے تھے۔ اسے یوں معلوم ہُوا گویا اس دُنیا کے ساتھ اس کے رشتے کی آخری گرہ بھی کھل گئی ہے۔ پوراندر ضرور اپنے دل سے اس کا خیال نکال دینے میں کامیاب ہو گیا ہو گا ورنہ وہ واپس ہی کیوں آتا؟ یہ درست ہے کہ اب پوراندر کا اس کو بھُول جانا یا اُسے یاد رکھنا بظاہر اس کے لئے یکساں تھا لیکن پھر بھی یہ خیال اسے بہت گراں گزرتا تھا کہ وہ جس کی محبت عمر بھر اس کی زندگی کا رہنما ستارہ بنی رہی اسے بھُول جائے۔ پھر اُسے یہ خیال آیا "شاید وہ مجھے نہ بھُولا ہو۔ آخر وہ کب تک اپنے گھر سے دُور رہتا۔ اس کے باپ کا بھی انتقال ہو چکا ہے اور اب گھر میں اس کی موجودگی بہت ضروری ہے"۔ پھر اُسے خیال آیا "میں بھی محض ایک آوارہ مزاج اور اوباش عورت ہوں ورنہ بیاہتا ہو کر میں پوراندر کے خیالوں میں پڑی ہی کیوں ہوں؟"

املا نے حیران ہو کر پوچھا "کیا تم نوجوان پوراندر کو بھُول گئی ہو؟ میں بُوشسوتا چیٹی کے بیٹے پوراندر کا ذکر کر رہی ہوں"۔

ہیرامنی نے کہا "ہاں مجھے وہ یاد ہے"۔

املا نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا " اچھا تو سنو وہ ان گنت خزانوں سے بھرے ہوئے جہاز ساتھ لے کر واپس آیا ہے کہتے ہیں وہ اتنی دولت لے کر آیا ہے کہ اس سے پہلے تاملوک میں کبھی نہیں دیکھی گئی۔"

ہیرامنی کے دل میں رقابت کی سی کسی چیز کی ایک عجیب چبھن محسوس ہوئی۔ اسے اپنی قلاشی کا خیال آیا اور پھر وہ پرانی تجویز بھی یاد آئی کہ وہ پوراندر کی بیوی بننے والی تھی۔ غریبی کا دکھ جھیلنا یوں بھی بہت کٹھن ہوتا ہے لیکن یہاں تو کبھی یہ بھی امکان رہ چکا تھا کہ یہ تمام دولت جس کا ذکر املا کر رہی تھی آج ہیرامنی کی ہوتی۔ کچھ دیر تک ہیرامنی چپ سادھے اپنے خیالوں میں کھوئی رہی پھر اس نے گفتگو کا رخ پھیر کر ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔ آخر جب دونوں سونے لگیں تو ہیرامنی دفعتہً بولی " اچھی میری املا! کیا نوجوان تاجر کے ساتھ اس کی بیوی بھی ہے؟"

املا نے جواب دیا " نہیں ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی۔"

یہ سن کر ہیرامنی کے جذبات میں ایک عجیب سا ہیجان پیدا ہو گیا۔ کچھ دیر وہ سوچ میں پڑی رہی۔ آخر اس نے دل سے کہا نہیں میں اور کوئی سوال نہ کروں گی اور خاموشی سے اپنے بستر پر دراز ہو گئی۔

(۶)

چند دن بعد املا ہیرامنی کے پاس گئی۔ اس دن املا کے گرہستنوں کے سے بشرے سے اخلاص آمیز غصہ جھلک رہا تھا۔ اس نے چھوٹتے ہی ہیرامنی سے کہا " اچھا تو بی صاحبہ! اب میں آپ کے چال چلن کے متعلق کیا اندازہ قائم کروں؟"

ہیرامنی نے پوچھا " میں نے اب کیا کیا ہے؟"

" تم نے اب تک یہ بات مجھ سے کیوں چھپائے رکھی؟"

" کون سی بات ہے جو میں نے تمہیں نہیں بتائی؟"

" یہی کہ پوراندر چیٹی سے تمہاری اتنی عزیزانہ دوستداری ہے اور یقیناً ہے۔"

یہ حملہ ناگہانی تھا۔ اس لئے ہیرامنی کا چہرہ شرم سے تمتا گیا لیکن اس نے فوراً جواب دیا " ہاں یہ لوگ میرے بچپن کے دنوں میں ہمارے پڑوسی تھے۔ یہ کوئی خاص بات بتانے کی نہ تھی۔"

" صرف پڑوسی؟ اچھا دیکھو یہ میں کیا لائی ہوں۔"

یہ کہہ کر املا نے ایک نفیس ڈبا نکالا۔ اس میں فی الواقع ایک عجیب و غریب چیز تھی یعنی ہیروں کا ایک مالا جو بے انتہا خوبصورت اور نہایت بیش قیمت تھا۔

سوداگر کی بیٹی جواہرات کو پرکھ سکتی تھی اس نے حیران ہو کر کہا " یہ مالا تم نے کہاں سے لیا۔ یہ تو اتنا بیش بہا ہے کہ ایک

راجہ کی دیت قرار پا سکتا ہے۔"

"یہ پوراندر نے تمہارے لئے بھیجا ہے۔ اس نے یہ سُن کر کہ تم میرے گھر میں رہتی ہو مجھے بُلایا اور اپنی طرف سے تمہیں دینے کو یہ تحفہ میرے سپرد کیا۔"

ہیرامنی نے ایک لمحہ کے لئے تامل کیا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر وہ یہ بیش قیمت تحفہ قبول کرلے تو اس کے تمام دلدر دُور ہو سکتے ہیں۔ وہ ایک امیر سوداگر کی ناز و نعمت میں پلی ہوئی بیٹی تھی۔ اس لئے افلاس اور محتاجی کا عذاب اس کی بُری گت بنا رہا تھا۔ وہ کچھ ہچکچائی لیکن آخر ایک آہ بھر کر بولی "املا! یہ مالا سوداگر کے پاس واپس لے جاؤ اور اس سے کہو کہ میں اسے قبول نہیں کرسکتی۔"

املا کو یہ سُن کر بہت اچنبھا ہُوا۔ اس نے کہا "یہ کیا؛ تمہاری مت ٹھکانے نہیں یا تمہیں میرے قول کا اعتبار نہیں آیا؟"

ہیرامنی نے دھیمی آواز سے کہا "پیاری میرے حواس بجا ہیں اور جو کچھ تم نے کہا ہے مجھے اس کے حرف حرف کی صداقت کا یقین ہے لیکن میں یہ تحفہ نہیں قبول کرسکتی۔"

املا نے بہتیرا سمجھایا بُجھایا لیکن ہیرامنی نے اس کی ایک نہ سُنی۔ آخر ناچار وہ مالا لے کر تاملوک کے راجہ مدن دیو کے پاس پہنچی اور کورنش بجالا کر عرض گزار ہوئی کہ مہاراج یہ مالا قبول کیجئے۔ یہ بیش بہا تحفہ مہاراج ہی کے لائق ہے۔ راجا نے مالا لے کر املا کو کافی انعام دیا۔

چند دن کے بعد پوراندر کے گھر کی ایک خادمہ ہیرامنی کے پاس آئی اور اس سے کہا کہ میرے آقا نے آپ کے نام پیغام بھیجا ہے کہ میں یہ کسی طرح برداشت نہیں کرسکتا کہ آپ بھُوس کے اس جھونپڑے میں رہیں۔ آپ کے باپ کے گھر کو وہ اپنا دوسرا گھر سمجھتے ہیں۔ وہ آپ سے یہ تو کہنے کی جرأت نہیں کرسکتے کہ آپ اُن کے مکان میں آکر رہیں لیکن انہوں نے اپنے قرضداروں سے آپ کے والد کا مکان خرید لیا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ یہ مکان آپ کی خدمت میں تحفہ کے طور پر پیش کردیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ اگر آپ میری خاطر سے اپنا قدیم مکان قبول فرمالیں گی تو میں دل سے آپ کا احسانمند ہوں گا۔"

ہیرامنی کے لئے اپنی ناداری کے نتائج میں جو بات سب سے زیادہ سوہانِ روح تھی وہ اپنے بچپن کے مسکن سے جُدائی اور محرومی کا خیال تھا۔ آہ یہ خیال کس قدر دردناک تھا کہ وہ اس پیارے گھر میں اپنی زندگی کے دن نہ گزار سکتی تھی جہاں وہ لڑکپن میں کھیلتی رہی تھی، جہاں اس کے ماں باپ نے سالہا سال تک اچھے دن گزارے اور جہاں اس نے ان دونوں کی موت کا سماں دیکھا تھا۔ پُرانے گھر کے ذکر ہی نے ہیرامنی کے تمام زخم آلے کردیئے اور اس کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔

اس نے خادمہ کا شکریہ ادا کیا اور اسے دعائیں دے کر کہا "مجھے معلوم ہے کہ میرے لئے یہ تحفہ قبول کرنا مناسب نہیں لیکن میں اپنے دل کی اس تمنا کو دبا دینے کے قابل نہیں ہوں۔ خدا تمہارے آقا کا بھلا کرے۔"

خادمہ آداب بجا لاکر رخصت ہوئی۔ املا بھی اس ملاقات کے دوران میں پاس ہی بیٹھی تھی۔ ہیرامنی نے اس سے کہا "سنو! میں وہاں تنہا نہ رہ سکوں گی۔ تمہیں بھی میرے ساتھ چلنا ہوگا اور ساتھ رہنا ہوگا۔"

املا نے اس کی تجویز قبول کرلی اور اس کے ساتھ دھن داس کے قدیم مکان میں منتقل ہوگئی۔ لیکن ہیرامنی نے املا کو سختی سے منع کردیا کہ آئندہ وہ پوراندر کے مکان کی طرف قطعاً نہ جائے۔ املا نے اس بات کا اقرار کرلیا اور بظاہر کوئی وجہ نہیں کہ اس کے وعدے کا اعتبار نہ کیا جائے۔

اپنے قدیم گھر میں آنے کے بعد ہیرامنی کے لئے ایک بات بہت حیران کرنے والی تھی۔ وہ یہ کہ ایک دن املا نے اُس سے کہا "اب تمہیں گھر کے خرچ کے لئے غم کھانے یا مشقت اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے راجہ کے محل میں ایک کام مل گیا ہے، اس لئے اب ہمیں روپے کا توڑا نہ رہے گا۔ خانہ داری کا انتظام اب میں اپنے ہاتھ میں لے لوں گی لیکن گھر کی مالک اب بھی تمہیں رہو گی اور میں ہمیشہ اپنے آپ کو تمہاری خادمہ سمجھوں گی۔"

ہیرامنی کو جلد ہی اندازہ ہوگیا کہ املا کے پاس روپے کی خاصی ریل پیل ہے۔ چنانچہ اُس کے دل میں نہایت تکلیف دہ شبہات پیدا ہونے لگے۔

(۷)

آخر ہیرامنی کی شادی کو پانچ سال گزر گئے اور اب اساڑھ کے مہینے کی پانچویں تاریخ کی مقررہ گھڑی سر پر کھڑی تھی۔ شام کا دھندلکا آفاق پر چھاؤنی چھائے جارہا تھا اور وہ اس واقعہ کو یاد کرکے اپنے خیالوں کی دُنیا میں گم تھی۔ ہیرامنی یہ سوچ رہی تھی کہ اگرچہ گروجی کے حکم کے مطابق میں کل وہ انگوٹھی پہن سکتی ہوں لیکن یہ مجھے پہننی بھی چاہئے یا نہیں۔ فائدہ کیا؟ ممکن ہے اس کی مدد سے میں اپنے شوہر کو تلاش کرسکوں لیکن مجھے اس کو ڈھونڈنے کی ضرورت بھی ہے یا نہیں؟ میرے دل میں کیوں ہر وقت کسی اَور کی مُورت بسی رہتی ہے۔ میں اپنے پاپی من کو ضرور قابو میں لاؤں گی اور اسے سزا دوں گی ورنہ میں سخت گنہگار ٹھیروں گی۔"

اسی وقت املا سراپا حیرت و اضطراب بنی ہوئی اندر داخل ہوئی اور چلّائی "یہ عجیب بات ہے۔ میں حیران ہوں کیا کروں۔ اب کیا ہوگا؟"

ہیرامنی نے کہا "کیوں کیا بات ہے؟"

"ابھی خادموں اور خادماؤں کا ایک گروہ کا گروہ تمہیں راجہ کے محل میں لے جانے کے احکام لے کر پالکی لئے اِدھر آرہا ہے۔"

"بھولی عورت تمہاری عقل کہاں گھاس چرنے گئی ہے؟ بھلا مجھے وہ کیوں راجہ کے محل میں لے جائیں گے؟"

دیکھتے ہی دیکھتے شاہی محل کی ایک خادمہ واقعی آن موجود ہوئی اور بولی "مہاراج کا حکم ہے کہ ہیرامنی دیوی فوراً ہمارے ساتھ محل کو تشریف لے چلیں۔"

ہیرامنی حیران رہ گئی لیکن وہ انکار کی جرأت نہ کرسکتی تھی، راجہ کے احکام کی خلاف ورزی ممکن نہ تھی۔ اس کے علاوہ مدن دیو کے محل میں جانا خطرناک بھی نہ تھا۔ اُس کی شرافت اور نیک نفسی کی شہرت دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی اور وہ نہ صرف خود ہی نیک نہ بلکہ اس کی بیدار مغزی کے طفیل اس کے محل میں کسی عورت کو توہین یا ایذا کا مطلق خطرہ نہ تھا۔

ہیرامنی نے املا سے کہا "میں مہاراج کی خدمت میں حاضر ہوں گی لیکن تم بھی میرے ساتھ چلو۔"

املا نے ساتھ جانے پر رضامندی ظاہر کی اور ہیرامنی پالکی میں بیٹھ کر خدم وحشم کے ساتھ محل کو روانہ ہوئی۔ وہاں پہنچ کر ایک باندی نے راجہ کو ہیرامنی کی آمد کی اطلاع دی اور اس کے بعد فوراً واپس آکر وہ اسے اپنے ساتھ حضوری میں لے گئی۔

املا حیران اور بے قرار دل کے ساتھ باہر منتظر بیٹھی رہی۔

(۸)

ہیرامنی راجہ کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئی۔ وہ ایک دراز قد، خوبصورت اور شاندار ڈیل ڈول کا آدمی تھا۔ اس کا سینہ فراخ تھا، اس کی پیشانی بلند تھی اور اس کی بڑی بڑی روشن آنکھوں کی چبھتی ہوئی نگاہیں اس کے سپاہیانہ انداز کے ساتھ مل کر ایک عجیب شکوہ آمیز اثر پیدا کر رہی تھیں۔ پردہ میں رہنے والی عورتیں عموماً ایسی دلکش اور دلفریب مردانہ صورتیں کم ہی دیکھتی ہیں لیکن خود راجہ کو بھی معلوم ہو گیا کہ سوداگر کی بیٹی کی سی خوبصورت لڑکیاں بادشاہی محلات میں بھی کم دیکھنے میں آتی ہیں۔

راجہ نے دریافت کیا "یہ ہیرامنی ہے؟"

ہیرامنی نے کہا "مہاراج میں حاضر ہوں۔"

راجہ نے کہا "اچھا سنو میں نے تمہیں کیوں بُلایا ہے۔ کیا تمہیں اپنی شادی کی رات یاد ہے؟"

ہیرامنی نے جواب دیا "مہاراج مجھے یاد ہے۔"

"تمہارے پاس وہ انگوٹھی ہے جو انند سوامی نے اس رات تمہیں دی تھی؟"

"مہاراج وہ انگوٹھی اب تک میرے پاس ہے۔ مگر یہ بڑی راز کی باتیں ہیں، حضور کو کیونکر ان سے آگاہی ہوئی؟"

راجہ نے جواب دینے کے بجائے کہا "تمہاری انگوٹھی کہاں ہے؟ مجھے دکھاؤ۔"

ہیرامنی نے جواب دیا "حضور وہ انگوٹھی گھر پر ہے یہاں میرے پاس نہیں ہے۔ پانچ سال کی میعاد کے پورا ہونے میں ایک گھنٹے سے کچھ زیادہ وقت باقی ہے اس لئے انگوٹھی پہننے کے متعلق گروجی کے تنامی حکم کی تعمیل ابھی ضروری ہے۔"

"اچھا خوب! اگر یہ تو بتاؤ تم اس کے ساتھ کی دوسری انگوٹھی پہچان سکتی ہو جو انند سوامی نے تمہارے شوہر کو دی تھی؟"

"دونوں انگوٹھیاں ایک جیسی تھیں۔ میں دوسری انگوٹھی کو پہچان سکتی ہوں کیونکہ میری انگوٹھی بھی بالکل ویسی ہی ہے۔"

شاہی اشارے پر ایک کنیز زیور کا ایک چھوٹا سا ڈبا اُٹھا لائی۔ راجہ نے اس میں سے ایک انگوٹھی نکال کر ہیرامنی کو دی اور کہا دیکھو یہی وہ انگوٹھی ہے!"

ہیرامنی نے چراغ کی روشنی میں اس کا اچھی طرح معائنہ کیا اور کہا "مہاراج واقعی یہ میرے شوہر کی انگوٹھی ہے لیکن حضور کو یہ کہاں سے ملی!" پھر سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے اس نے کہا "حضور اس کو دیکھ کر میں نے سمجھ لیا ہے کہ میں بیوہ ہو چکی ہوں یقیناً میرے شوہر کی موت کے باعث یہ انگوٹھی مہاراج تک پہنچی ہے کیونکہ راج پاٹ کے والی ہونے کی وجہ سے ہر لاوارث چیز کے حق دار رہی ہیں۔ اگر میرا شوہر زندہ ہوتا تو وہ کبھی اس انگوٹھی کو جدا نہ کرتا۔"

راجہ نے ہنس کر کہا "مطمئن رہو خاتون! تم بیوہ ہرگز نہیں ہو"

"تو پھر معلوم ہوتا ہے میرا شوہر مجھ سے بھی زیادہ دکھوں میں پڑا ہے اور اس نے فاقے کی موت سے بچنے کے لئے یہ انگوٹھی فروخت کی ہے۔"

"نہیں بلکہ تمہارا شوہر تو ایک امیر آدمی ہے۔"

"تو پھر حضور نے شاید جبر یا دغا سے یہ انگوٹھی میرے شوہر سے ہتیائی ہے!"

راجہ اس کی جرأت پر ذرا حیران ہوا۔ اس نے کہا "تم بہت منہ پھٹ نوجوان لڑکی ہو۔ آج تک اور کسی نے راجہ مدن دیو پر جبر یا دغا باز ہونے کا الزام نہیں لگایا۔"

"مہاراج پھر یہ انگوٹھی کیونکر آپ کے ہاتھ لگی؟"

"تمہاری شادی کی رات انند سوامی نے یہ انگوٹھی مجھے پہنائی تھی۔"

یہ سُن کر اُس کا سر شرم سے جھک گیا اور وہ بولی "مہاراج اپنی لونڈی کے اس جرم کو بخش دیجئے۔ میں بالکل نادان ہوں اور نادانستہ مجھ سے یہ لغزش ہوئی ہے۔"

(۹)

ہیرامنی یہ سُن کر بھونچکا سی رہ گئی کہ وہ ایک اتنے رفیع المنزلت آدمی کی بیوی ہے۔ لیکن نہ اس کے دل میں غرور پیدا ہوا نہ اسے مسرت کی کوئی رمق محسوس ہوئی بلکہ اس کا دل کچھ بجھ سا گیا۔ اس نے سوچا "اب تک یوں تو میں پورانندر سے جدا ہی رہی لیکن کم از کم میں کسی اور کی بیوی نہ بنی تھی۔ اب مجھے بے محبت کی شادی کا دکھ بھوگنا پڑے گا۔ اس کے علاوہ دل میں تو میں

پورانندر ہی کی بیوی ہوں۔ میں دل میں کسی اور کی محبت چھپائے ہوئے اس عظیم الشان آدمی کی بیوی بن کر اس کے گھر کو اپنے وجود سے کیوں ناپاک کروں؟"

وہ اسی سوچ میں پڑی تھی کہ راجہ نے کہا "ہیرا منئی حیران کیوں ہوتی ہو۔ واقعی تم میری دھرم پتنی ہو۔ لیکن محل میں داخل کرنے سے پہلے میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے تین سوالوں کا جواب دو۔ یہ بتاؤ کہ تم کرایہ ادا کئے بغیر پورانندر کے مکان میں کیوں رہتی ہو؟"

ہیرا منئی شرم سے سر جھکائے کھڑی رہی۔

پھر راجہ نے کہا "یہ بتاؤ کہ تمہاری نوکرانی املا کیوں ہر وقت پورانندر کے گھر میں آتی جاتی رہتی ہے؟"

ہیرا منئی شرم سے اور بھی کٹ گئی اس نے دل میں خیال کیا۔ راجہ شاید عالم الغیب ہے۔

راجہ نے پھر کہا "ایک اور بہت اہم بات ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم نے جو ایک بیاہی عورت ہو پورانندر کی طرف سے ایک نہایت بیش قیمت مالا تحفتہً کیوں قبول کیا؟"

اب ہیرا منئی نے دلیری سے کام لے کر کہا "مہاراج مجھے معلوم ہو گیا آپ عالم الغیب نہیں ہیں۔ میں نے وہ مالا واپس کر دیا تھا"

"نہیں نہیں۔ تم نے وہ میرے پاس فروخت کر دیا تھا۔" یہ کہتے ہوئے راجہ نے زیور کے ڈبے سے مالا نکال کر ہیرا منئی کو دکھایا۔ اس نے مالا کو فوراً پہچان لیا اور پوری طرح لاجواب ہو کر منہ دیکھتی رہ گئی۔

آخر اس نے کہا "لیکن مہاراج کیا میں خود یہ مالا فروخت کرنے کے لئے حضور کے پاس لائی تھی؟"

"نہیں تم تو نہیں مگر تمہاری گولی یا پیغام رساں املا اسے لے کر میرے پاس آئی تھی۔ اگر کہو تو بلاؤں اُسے؟"

ہیرا منئی کچھ جھلا سی گئی لیکن پھر ایک خیال سے جو اسی وقت اس کے دل میں پیدا ہوا مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ اس نے جلدی سے کہا "پران پتی! میں اپنے گناہ کا اقرار کرتی ہوں۔ املا کو بلانے کی ضرورت نہیں۔ میں مانتی ہوں کہ میں نے ہی یہ مالا آپ کے پاس فروخت کیا تھا۔"

اب راجہ کی باری تھی کہ حیران ہو۔ اس نے کہا "تم عورتوں کی باتیں سمجھنی کس قدر دشوار ہیں۔ یہ بتاؤ کہ ایک بیاہی ہوئی عورت ہو کر تم نے پورانندر کا یہ تحفہ کیوں قبول کیا؟"

"اس کو مجھ سے بے انتہا محبت ہے اور یہ مالا میں نے اُسی محبت کی نشانی کے طور پر قبول کیا تھا۔"

راجہ یہ سُن کر اور بھی زیادہ حیران ہوا۔ اس نے کہا "صاف صاف بتاؤ تمہارا کیا مطلب ہے۔ یہ کس قسم کی محبت ہے؟"

"میرے آقا! میں ایک بڑی عورت ہوں۔ میں آپ کی بیوی بننے کے قابل نہیں۔ میں آداب بجا لاتی ہوں۔ مجھے

رخصت کر دیجئے اور یہ بھول جائیے کہ کبھی مجھ سے آپ کی شادی ہوئی تھی"۔

وہ آداب بجا لا کر رخصت ہونے ہی کو تھی کہ راجہ کا متذبذب چہرہ خوش مزاجی کے ایک قہقہے سے چمک اُٹھا۔ ہیرا منی نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا تو راجہ نے کہا "ہیرا منی تم نے مجھے خوب مات دی ہے۔ میں ہار مانتا ہوں۔ دیکھو تم بُری عورت نہیں ہو اور نہ میں تمہارا شوہر ہوں۔ ابھی ذرا ٹھہرو"۔

ہیرا منی نے کہا "مہاراج پھر مجھے بتائیے یہ کیا معاملہ ہے۔ میں ایک غریب عورت ہوں اور مجھے حضور سے یہ توقع نہیں کہ آپ مجھے یوں اپنی دل لگی کا سامان بنائیں گے"۔

راجہ نے جو اب بھی قہقہہ پر قہقہہ مار رہا تھا جواب دیا "مجھ سے بڑے آدمی ہمیشہ اس قسم کی پُر اسرار باتوں کے شائق ہُوا کرتے ہیں۔ اچھا اب مجھے بتاؤ چھ سال پہلے تمہیں اپنے زیور کے ڈبّے میں کاغذ کا ایک پُرزہ ملا تھا یا نہیں؛ کیا وہ پُرزہ تمہارے پاس ہے"؟

"مہاراج آپ عالم الغیب ہیں۔ وہ پُرزہ ابھی تک میرے پاس ہے"۔

راجہ نے کہا "اچھا تو ابھی پالکی میں بیٹھ کر گھر جاؤ اور وہ پرزہ لے آؤ۔ جب تم وہ پُرزہ لے کر آؤ گی تو مَیں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا"۔

(۱۰)

ہیرا منی راجہ کے حکم کے مطابق پالکی میں بیٹھ کر اپنے گھر گئی اور اس نے وہ پھٹا ہُوا کاغذ لا کر راجہ کے حوالے کیا۔ راجہ نے اسے غور سے دیکھنے کے بعد ایک اور ویسا ہی کاغذ کا پُرزہ نکال کر ہیرا منی کو دیا اور کہا کہ ان دونوں پُرزوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ کر دیکھو۔ ہیرا منی نے ایسا ہی کیا اور دیکھا کہ دونوں پُرزوں کے سرے ایک دوسرے میں راست بیٹھتے ہیں۔ راجہ نے کہا اب اس کاغذ کی عبارت پڑھو۔ ہیرا منی نے ذیل کے الفاظ پڑھے:۔

"ستاروں کو دیکھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تمہاری تجویز منحوس
ثابت ہوگی۔ (ہیرا منی کی سی سونے کی مورت) کو عمر بھر کے رنڈاپے
کے خطرے میں نہیں ڈالنا چاہئے۔ اس کی شادی اس (عمر میں
ایک خوفناک مصیبت) ثابت ہوگی۔ وہ بالکل نوعمری میں بیوہ ہو جائیگی۔
ہاں اگر دولہا دُلہن پانچ (برس تک ایک دوسرے سے الگ) رہیں
تو (پھر ہو سکتا ہے) کہ میری بتائی ہوئی تجویز پر عمل کرنے سے وہ
ستاروں کے نحس اثر سے بچ جائیں"۔

جب ہیرامنی یہ تحریر پڑھ چکی تو راجہ نے کہا " یہ خط انند سوامی نے تمہارے باپ کو لکھا تھا۔"

ہیرامنی نے کہا " مہاراج اب میں بھی ہماری شادی اس عجیب پُراسرار طریقے سے کیوں ہوئی تھی۔ اب مجھے معلوم ہوا کیوں ہماری آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی گئی تھیں اور کیوں ہمیں پانچ سال تک انگوٹھی پہننے کی اجازت نہ دی گئی تھی۔ یہ سب تو میں سمجھی لیکن باقی باتیں اب بھی میرے لئے ایک اَن بوجھی پہیلی سے کم نہیں۔"

راجہ نے کہا " اتنا تو یقیناً تم سمجھ گئی ہو گی کہ تمہارے باپ نے اس خط کے ملنے پر کیوں پوراندر سے تمہاری نسبت توڑ ڈالی اور کیوں پوراندر نے نا اُمید ہو کر لنکا کا سفر اختیار کیا۔ اس اثنا میں انند سوامی برابر ایک نیک بخت دولہا کی تلاش میں مصروف رہا۔ آخر وہ اس میں کامیاب ہوا۔ نوجوان کا زائچہ دیکھنے سے اسے معلوم ہوا کہ اگر اٹھائیس سال کی عمر میں وہ ایک حادثہ سے بچ جائے تو وہ اسی سال کی عمر کو پہنچ سکتا ہے۔ اپنے علم سے اس نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ اٹھائیس سال کی عمر سے پہلے اور اپنی شادی کے بعد پانچ سال کے اندر اندر اس کے بستر عروسی کے بستر مرگ میں تبدیل ہو جانے کا شدید خطرہ ہے۔ لیکن ستاروں کے حساب سے صاف طور پر معلوم ہو گیا کہ پانچ سال کی یہ خطرناک مدت صحیح وسلامت گزار لینے کے بعد وہ عمر طبعی کو پہنچ جائے گا۔

" چنانچہ یہ فیصلہ ہوا کہ شادی اس وقت ہو جب دولہا تئیس سال کی عمر کو پہنچے۔ لیکن ادھر یہ بھی خطرہ تھا کہ اگر اتنے سال تک تمہیں بظاہر بن بیاہے چھوڑ دیا گیا تو تم کوئی نادانی کی حرکت کر بیٹھو گی یا خفیہ طور پر کسی اور سے شادی کر لو گی۔ اسی لئے تمہیں ڈرانے کے لئے کاغذ کا یہ پُرزہ زیور کے ڈبے میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ تمہیں یہ تو معلوم ہی ہے کہ اس بات کا پورا انتظام کر دیا گیا تھا کہ پانچ سال کی آزمائش کے زمانے میں تم اپنے شوہر کا منہ نہ دیکھ سکو۔ اسی لئے شادی کی رسوم میں بھی تمہیں ایک دوسرے کو دیکھنے کی اجازت نہ ملی تھی لیکن چند مہینے گزرے ہیں کہ حالات نے ایسا خلاف توقع پلٹا کھایا کہ یہ تمام دانشمندانہ تدابیر کسی حد تک درہم برہم ہو گئیں۔ چند مہینے گزرے جب انند سوامی خفیہ طور پر یہاں آیا تو اسے یہ سُن کر سخت رنج ہوا کہ تم افلاس کا شکار ہو گئی ہو۔ اگرچہ تمہیں معلوم نہیں لیکن اس نے تمہیں خود دیکھا بھی تھا۔ اس کے بعد میرے پاس آ کر اس نے تمہاری شادی کے تمام دلچسپ واقعات مجھے بتائے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ لڑکی پر یہ بپتا آ کر پڑے گی تو میں پہلے ہی سے اس کا انتظام کر دیتا۔ اب اس نے تمہیں آسائش بہم پہنچانے کا کام میرے سپرد کیا، اور اس کے متعلق تمام مصارف کا بار اپنے سر لیا۔ اس کے علاوہ اس نے ایک اور فرض بھی مجھ پر عاید کیا۔ اس نے مجھے یہ بتا کر کہ تمہارا شوہر اسی شہر کا رہنے والا ہے مجھ سے ایسے ذرائع اختیار کرنے کے لئے استدعا کی کہ تم دونوں کے ایک دوسرے سے ملنے کا کوئی امکان پیدا نہ ہو سکے۔ اس نے مجھے یہ بھی بتا دیا کہ تمہارا شوہر کون ہے۔ اس سمجھوتے کے بعد میں تمہارے آرام و آسائش کے لئے ملاگو روپیہ بہم پہنچاتا رہا۔ تمہارے باپ کا مکان در اصل میں نے ہی خرید کر تمہارے حوالے کیا تھا۔ میں نے ہی تمہیں ہیرے کا لالچ بھی بھیجا تھا۔ اس طرح میں تمہاری وفاشعاری کا امتحان لے رہا تھا۔"

ہیرامنی نے پوچھا "مگر مہاراج آپ کو یہ انگوٹھی کیونکر ملی؟ اور آپ نے مجھے یہ کہہ کر شرمندہ کیوں کیا کہ حضور ہی میرے پتی ہیں ؛ اس کے علاوہ حضور نے مجھے اس فریب میں مبتلا رکھنا کیوں مناسب سمجھا کہ میں پورااندر کے مکان میں رہتی ہوں۔ اور اسی کی ممنونِ احسان ہوں ؟"

راجہ نے کہا "جس دن آنندسوامی نے تمہارے متعلق مجھے ہدایات دیں اسی دن میں نے تمہاری نگرانی کے لئے آدمی مقرر کردیئے۔ میں نے ہی املا سے کہا تھا کہ تمہیں مالا کے تحفے سے ورغلانے کی کوشش کرے۔ چونکہ مجھے یہ معلوم تھا کہ آج تمہاری طویل آزمائش کی مدت انجام کو پہنچنے والی ہے۔ اس لئے میں نے تمہارے شوہر کو بلاکر بتایا کہ میں تمہاری زندگی کے متعلق تمام عجیب وغریب واقعات سے واقف ہوں۔ میں نے اس سے یہ بھی کہا کہ آج تمہاری بیوی تمہارے حوالے کردی جائے گی۔ اس نے کہا حضور کا ہر فرمان میرے سر آنکھوں پر لیکن مجھے اپنی بیوی کے دیکھنے کی تمنا نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے سے نہ ملیں۔" لیکن میں نے کہا "نہیں یہ میرا حکم ہے" اس نے جواب دیا "تو پھر تعمیلِ ارشاد کے سوا میرے لئے کوئی چارہ نہیں۔" لیکن اس کے بعد اس نے پھر اعتراض کیا کہ "مہاراج آپ ہی یہ بہتر جانتے ہوں گے کہ اتنے سال اس کی زندگی کیسی رہی ہے اور وہ ایک شریف آدمی کے گھر میں رہنے کے قابل ہے بھی یا نہیں۔ مجھے امید ہے کہ حضور جن کی شرافت کا شہرہ دُور دُور تک ہے مجھے ایک ایسی عورت کے ساتھ زندگی بسر کرنے پر مجبور نہ کریں گے جس کی شہرت طعنہ زنی کا نشانہ بن چکی ہو۔" میں نے اس کے جواب میں اس سے کہا کہ تم اپنی انگوٹھی یہاں چھوڑتے جاؤ۔ اس کی مدد سے میں تمہاری بیوی کی وفاداری کا امتحان کروں گا۔" سو ہیرامنی اب میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم اس آزمائش میں ہر طرح پوری اُتری ہو۔"

ہیرامنی نے کہا "لیکن مہاراج میں اب بھی اس آزمائش کا مقصد سمجھنے سے قاصر ہوں جس میں آپ نے مجھے ڈالا ہے۔"

یہ بات ابھی اس کے لبوں ہی پر تھی کہ محل کے شاندار کمرے شادی کے نغموں کی دلآویز صداؤں سے گونجنے لگے۔ راجہ نے کہا "گیارہ بج گئے ہیں۔ اب میں ان باتوں کی تفصیل کسی اور موقع پر اُٹھا رکھتا ہوں۔ تمہارا دُولہا آگیا ہے۔ اب تم اس نیک ساعت میں اُس کی صُورت دیکھو گی۔" اسی وقت ہیرامنی کی پشت پر ایک دروازہ کھُلا اور ایک دراز قامت خوبصورت جوان متانت کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔

راجہ نے کہا "ہیرامنی اپنے شوہر سے ملو۔"

ہیرامنی نے نظر اُٹھائی تو اس کا دماغ چکرا گیا۔ وہ حیران تھی کہ یہ خواب ہے یا بیداری۔ کیونکہ نووارد پورااندر تھا۔

دولہا دولہن دونوں فرطِ حیرت سے بُت بنے کھڑے تھے، نہ ان میں ہلنے کا سکت تھا اور نہ بات کرنے کی ہمت۔ دونوں کو اپنی نظر پر اعتبار نہ آتا تھا۔

راجہ نے کہا "دوست پوراندر! ہیرا مُنی تمہاری محبت اور احترام کی ہر طرح مستحق ہے۔ اسے سچی چاہت کے ساتھ اپنے گھر میں لے جاؤ۔ آج کے دن تک اسے تم سے ویسی ہی محبت ہے جیسی پہلے دن تھی۔ میں نے دن رات اس پر کڑی نگرانی رکھی ہے اور مجھے معلوم ہے کہ اس کے دل میں تمہارے سوا کبھی اور کے لئے گنجائش ہی نہیں۔ میں نے تمہارے ہی کہنے پر اسے ایک بالکل غیر ضروری آزمائش میں ڈالا۔ میں نے اس سے یہاں تک کہہ دیا کہ تم میری ہی بیوی ہو۔ لیکن شاہی شان و شوکت کا لالچ بھی اس کے دل سے تمہاری وفا کا خیال نہ نکال سکا۔ میں نے اسے یہ بھی اشارہ کیا کہ میری بیاہتا ہونے کے باوجود تم نے اپنے دل میں پوراندر کی مجرمانہ محبت کی پرورش کر رکھی ہے۔ اگر وہ اس سخت الزام سے شرماتی اور معذرت خواہی کرتی اور شاہی محل میں داخل ہونے کے لئے مجھ سے معافی کی خواستگار ہوتی، تو میں سمجھتا کہ اس کے دل سے تمہاری عمر بھر کی محبت نکل گئی ہے لیکن تمہیں معلوم ہے اس بیچاری نے اس قدر سخت تہمت سُن کر کیا کہا۔ اب سنو اس نے کہا "مہاراج! میں ایک بری عورت ہوں اور اس قابل نہیں کہ حضور مجھے اپنے محل میں داخل کریں"۔ ہیرا مُنی جس جذبے سے متاثر ہو کر ایک شریف عورت نے یہ تہمت قبول کر لی۔ اُس نے میرے دل میں حیرت اور احترام کی ایک لہر دوڑا دی۔ بے محبت شادی کی زندگی قبول کرنے کے بجائے تم نے ایک شرمناک بہتان قبول کر لیا۔ میری بچی! میں سچے دل سے تمہیں اور تمہارے شوہر کو دعا دیتا ہوں کہ خدا تم دونوں کو عمر بھر خوش رکھے"۔

ہیرا مُنی اب بھی کشش و پنج میں پڑی تھی۔ اس نے کہا "مہاراج ایک بات میں ضرور دریافت کروں گی۔ اگر پوراندر لنکا میں تھا تو یہ شادی کے دن بنارس کیوں کر پہنچ گیا۔ اور اگر یہ کسی طرح بنارس پہنچ سکا تو ہم سب کو اس کی اطلاع کیوں نہ مل سکی"۔

راجہ نے کہا: "یہ تو سیدھی سی بات ہے۔ تمہارے باپ اور گرو نے مل کر یہ انتظام کر لیا تھا کہ پوراندر لنکا سے سیدھا بنارس پہنچے اور شادی کی رسوم ادا ہو چکنے کے بعد واپس چلا جائے۔ راستے میں وہ اپنے گھر نہیں ٹھہرا تھا"۔

پوراندر نے سر جھکا کر کہا "مہاراج جس طرح آج آپ نے میرے دل کی عزیز ترین تمنا پوری کی ہے میری دعا ہے کہ خدا حضور کی ہر تمنا بھی اسی طرح پوری کرے۔ آج مہاراج کی تمام پرجا میں کوئی شخص اتنا خوش نہیں جتنا یہ ناچیز گنہگار پوراندر سیٹھی۔

بنکم چندر چیٹرجی

ترجمہ از حامد علی خاں

منظومات

ہدیۂ اخلاص

عقیدت سے بنا کر "ملوہ" بادام بھیجا ہے
پھر اس پر لطف سے لکھ کر ہمارا نام بھیجا ہے

تمنا ہے غمِ فرقت کی تلخی دُور ہو جائے
لبِ اعجاز سے کیا جاں فزا پیغام بھیجا ہے

کسی کا نام کندہ ہے ہمارے گوہرِ دل پر
کسی نے لوز پر لکھ کر ہمارا نام بھیجا ہے

خدا تم کو ہمیشہ بامراد و شادماں رکھے
ہمیں تریاقِ سمِّ اُلفتِ ناکام بھیجا ہے

کہاں قربِ حیات افزا، کہاں بُعدِ رواں فرسا
کہاں تھے ہم، کہاں اے گردشِ ایام بھیجا ہے

رشید اُن کو غزل بھیجی ہے یا حُسنِ تشکر سے
مئے اخلاص سے رنگیں مرصع جام بھیجا ہے

رشید اکبرآبادی بی اے، ایل ایل بی

الوداع

الوداع اَے زندگی کی زندگانی الوداع
پیکرِ اُلفت ۔ محبت ۔ مہربانی الوداع

تیرے جانے سے دلوں پر اوس سی پڑ جائے گی
سرد سے ہو جائیں گے ہنگامہ ہائے زندگی

وقت کا یہ دستِ سنگیں کس قدر بے درد ہے
اپنی اُمیدوں کا چہرہ آج کتنا زرد ہے

آہ لیکن چارہ سازِ دردِ دل اس کا علاج؟
کون ہے جو وقت کے سیلاب کو روکے گا آج؟

الوداع اے رونقِ محفل، بنائے نشرِ نور
جا رہا ہے دُور ہم سے دل سے ہوگا تُو نہ دُور

تُو بڑھے اور بڑھ کے پھیلے، پھیل کر پھولے پھلے
زندگانی کی بہاروں کے مزے لُوٹا کرے

رحیم

محفلِ ادب

غزل

عشق میں آتی ہے لذت زہرِ غم کھانے کے بعد
زندگی ملتی ہے یاں جاں سے گزر جانے کے بعد

ہائے اُلفت کا فسانہ بھی ہے کتنا دلپذیر
پڑ گیا پھیکا ہر افسانہ اس افسانے کے بعد

اللہ اللہ کیا قیامت ہے مری دیوانگی
خود بھی دیوانہ ہے ناصح مجھ کو سمجھانے کے بعد

تیرے شعلوں میں وہ کیا شے ہے کہ اے شمعِ جمال
گر رہا ہے شوق سے پروانہ پر جلنے کے بعد

چھوڑ کر دیر و حرم آئے تھے مے خانے کو ہم
اب خدا جانے کہاں جائیں گے مے خانے کے بعد

کم نہ ہو جائے کہیں یارب مرا ذوقِ جنوں
ختم ویرانہ ہُوا جاتا ہے ویرانے کے بعد

اس کی ہستی بھی اثرؔ قائم ہے سوز و ساز سے
دِل کہاں باقی رہے گا دردِ مٹ جانے کے بعد

اثرؔ صہبائی — ادبِ لطیف

اکابرِ عالم کے اقوال

۱۔ اہلِ عالم کو صرف باتوں سے درسِ اخلاق دینا بے سُود ہے۔ تہذیب و تربیت کے آرزومندوں کو چاہیئے کہ خود پند و نصیحت کا ایسا عملی نمونہ پیش کریں کہ دوسرے لوگ اُن کے اتباع پر مجبور ہو جائیں۔

۲۔ جنت ایک مخلوقِ خیالی ہے جو خیال پرست شعراء کی طبیعت سے پیدا ہوئی ہے اور اس کی مثال اُس بُلبُلے کی سی ہے جسے بچہ صابون سے بناتا ہے اور جو ایک لحظہ میں ٹوٹ جاتا ہے۔ "فریڈرک اعظم"

۳۔ انسان فطرت کی طرف سے متعدد مخفی زنجیروں میں اسیر ہے۔ آزادی ملاحظاتِ تقیدات کے محیط میں معتدلانہ حرکت کا نام ہے۔ "فریڈرک اعظم"

۴۔ بدن کی سلامتی کی بہترین خدمتگزار اور صحیح ترین امین فراغتِ ضمیر اور راحتِ قلب ہے۔

۵۔ حقیقت ممکن ہے ایک عرصہ تک وہ تاخیر و تعویق میں مخفی رہے لیکن وہ ہمیشہ اپنی اصلی حالت پر قائم رہیگی اور موقع پاتے ہی ظاہر ہو جائے گی۔ "گوئٹے"

۶۔ ہم حقیقت کو عقل کی استعانت سے نہیں پہچانتے بلکہ صرف دلی تعلقات کی بنا پر اُس سے آشنائی پیدا کرتے ہیں۔ "پاسکال"

۷۔ تمام مواقع اور جملہ حالات میں صرف حقیقت ہی بلند اور طبعی چیز ہے۔ "مادام سوینیہ"

۸۔ تفکر ایک ایسی عبادت ہے کہ ہم حقائق مخفیہ کے لئے ادا کرتے ہیں تاکہ وہ ہم پر آشکار ہوکر ہمارے لئے تسکین کا سامان پیدا کریں۔ "مالبرانش"

۹۔ حقیقت ایک ایسا الماس ہے جس کی شعاعیں صرف ایک ہی طرف کو منور نہیں کرتیں بلکہ جملہ اطراف کو اپنے نور میں مستغرق کرتی ہیں۔ "شاتو بریاں"

۱۰۔ اگر ہر چیز کی تبدیلی انسان کے اختیار میں ہوتی تو یہ انتظام و ترتیب جو ہم دنیا میں مشاہدہ کر رہے ہیں کبھی کا مختل ہو جاتا۔

۱۱۔ ایک بھاری پتھر جس کا حرکت دینا محال ہو اُس کے متعلق یہ خیال کرنا کہ یہ مناسب جگہ پر نہیں ہے یقیناً دیوانگی ہے۔

۱۲۔ تصمیم مسافرت اور رستے پر قدم رکھنے کے بعد مشکلاتِ راہ ایک غیور اور باعزم شخص کے قوی ارادہ میں حائل نہیں ہوسکتیں۔

۱۳۔ اگر دنیا کے تمام آدمی اپنے ہی حال میں مشغول رہیں تو کسی کو اتنی بھی فرصت نہ ہو کہ دوسرے کی طرف توجہ کر سکے۔

۱۴۔ نیک کاموں کا اقدام فی الحقیقت ایسے لوگوں کو درس دیتا ہے جو اعمالِ زشت کے مرتکب ہوتے ہیں لیکن افسوس کہ شاگرد اس درس سے استفادہ نہیں کرتے اور برخلاف اس کے خود معلمین ہی کو ضرر پہنچتا ہے۔

۱۵۔ لازم ہے کہ تدبیر اور عقل سے کام کا آغاز کیا جائے اور سرعت اور جسارت کے ساتھ اُسے اتمام پر پہنچایا جائے۔

۱۶۔ تمول، اقتدار، عقل، آزادی اور تندرستی میں سے کوئی جملہ ضروریات کے پورا کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔ کامیابی کی پہلی اہم شرط ثبات و متانتِ ارادہ ہے۔ "شیر زون لوبرگ"

۱۷۔ اگر تو چاہتا ہے کہ جملہ ممالکِ عالم پر حکمرانی کرے تو لازم ہے کہ تیری عقل تجھ پر حکمران ہو۔

۱۸۔ لائق ترین خدمت جو تم ایک ملت کے لئے سرانجام دے سکتے ہو یہ ہے کہ اُس ملت کے افراد کو حقیقی علم و ادب سکھاؤ اور نہ یہ کہ اُن کے ایوان خانوں کو نقش نگار سے آراستہ کرو۔ وہ ارواحِ عالیہ جو فقیرانہ جھونپڑیوں میں رہتے ہیں اُن اشخاص سفلہ سے کہیں اعلیٰ و ارفع ہیں جو عظیم الشان محلات میں قیام پذیر ہیں۔

۱۹۔ اگر ہماری بُرائیاں فقط ہمیں تک محدود رہتیں اور دوسرے اُن سے اثر پذیر نہ ہوتے تو گرفتارانِ بلا کی تعداد آج یقیناً کم ہوتی۔ "چسٹر فیلڈ"

"کلیم"

مثنوی گوتم بدھ کا ایک منظر

شیطان کا مع اپنے چیلوں کے گوتم بدھ کو مغالطہ دینے کے لئے آنا اور مایوس ہوکر واپس جانا

حضرت وحشی کانپوری سے اکثر اہلِ ذوق مثنوی گوتم بدھ طلب فرما رہے ہیں۔ اُن کا ارشاد ہوا ہے کہ اس مثنوی کی اشاعت میں ابھی ...

تاخیر ہے۔ اہلِ شوق انتظار فرمائیں۔ "ادارہ"

سن کے مشتِ خاک کی عظمت کا حال — آگیا شیطان کے دل میں ملال
رات جب آئی تو بہرِ امتحاں — ہو گیا وہ خود سوئے گوتم رواں
ساتھ چیلے بھی تھے اس کے بے شمار — جا رہے تھے سب قطار اندر قطار
کبر و نخوت طرۂ دستار تھے — غصہ و نفرت علم بردار تھے
دائیں بائیں ہو رہے تھے ہمرکاب — خیرگیٔ عقل و ارمانِ شباب
تھی جہالت بھی جلو میں ساتھ ساتھ — خوف کے کاندھے پہ رکھا اپنا ہاتھ
اپنی اپنی قوتوں سے برملا — سب نے آکر کر دیا طوفاں بپا
نخوت و پندار نے بڑھ کر کہا — مرحبا اے فخرِ انساں مرحبا
کون کر سکتا ہے تیری ہمسری — کیا کرے گی خلق تیری پیروی
اُٹھ کہ مقصد تیرا حاصل ہو چکا — دیوتاؤں میں تُو شامل ہو چکا
سُن کے گوتم نے دیا اُن کو جواب — دُور ہو نظروں سے اے خانہ خراب
دھوکا دینا ہے تو جا کر اُس کو دو — شانِ خودداری کا جس کو پاس ہو
پیکرِ خطرات نے پھر جا کے پاس — یہ کہا گوتم سے با اندازِ یاس
سب تماشا ہے حقیقت کچھ نہیں — صانعِ فطرت کی فطرت کچھ نہیں
سعیٔ لاحاصل ہے جس کی جستجو — جس میں ہو کچھ بھی حقیقت کی نہ بُو
رُک نہیں سکتا کبھی دورِ ممات — پا نہیں سکتا بشر اس سے نجات
دوڑنا سائے کے پیچھے فائدہ — نیستی کیا نیستی کا علم کیا!
جھوٹی مایا کا یہی دستور ہے — آدمی اس دہر میں مجبور ہے
سُن کے گوتم نے کہا اس سے کہ ہاں — سُن چکا میں تیری سب سرگوشیاں
اپنی عیاری میں تُو بے باک ہے — تُو قوی تر دشمنِ ادراک ہے

جا کہ مجھ سے تیرا کچھ مطلب نہیں
مَیں جو پہلے تھا وہ گوتم اب نہیں

مطبوعات

ایشیا۔ اس رسالے کا ستمبر نمبر ہمارے پاس ریویو کے لئے آیا ہے۔ بحث ونظر کے عنوان سے جو اداریہ لکھا گیا ہے اُس میں اُردو ہندی کے قضیئے پر ایک غائر نظر ڈالی گئی ہے اور ظاہر کیا گیا ہے کہ اس مسئلے کے متعلق پنڈت جواہر لال نہرو کے خیالات صداقت پر مبنی ہیں اور اس مشکل کا بہترین حل ہیں۔ ایڈیٹر صاحب لکھتے ہیں کہ "شاید پنڈت جی سب سے پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے اپنی آزادیٔ ضمیر کو مہاتما جی کی مسحور کن شخصیت اور اُن کے اثر کی جادوگری کے مقابلے میں ڈنکے کی چوٹ واضح کیا ہے۔" غالباً ساغر صاحب نے پنڈت جی کے خط کا وہ حصہ بغور نہیں پڑھا جس میں انہوں نے گاندھی جی کے رویے کی حمایت کی ہے۔ بہر حال جواہر لال صاحب کا یہ قول کہ "میں اُردو کو اپنی زبان سمجھتا ہوں" اور کانگرس کے فیصلے کا اعلان کہ "ہندوستانی ہماری ملکی زبان ہو گی اور وہ اُردو اور ہندی دونوں رسم الخطوں میں لکھی جائے گی" ایک حد تک تسلی بخش ہے۔ اخیر میں بانوں کے ملاپ کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے یہ لکھا گیا ہے کہ "ضرورت ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو، ڈاکٹر سید محمود اور تمام صحیح الخیال کانگرسی لیڈر زبان کے مسئلے کو آل انڈیا کانگرس ورکنگ کمیٹی میں تجدید کے لئے پیش کریں۔"

زیرِ نظر پرچے میں بعض مفید مضمون درج ہیں۔ بالخصوص اختر حسین صاحب رائے پوری کا مضمون "ادب اور زندگی" جو اُردو سے نقل کیا گیا ہے اس قابل ہے کہ زبان وملک کا ہر بہی خواہ اسے بار بار پڑھے۔ رسالہ ایشیا جدت پسندی اور ترقی پسندی کا علم بردار ہے اور ہم اُس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

شاہجہان (دہلی) اس رسالے کا اگست ۱۹۳۶ء کا پرچہ ہمیں ریویو کے لئے موصول ہوا ہے۔ یہ اب ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا رسالہ قرار دیا گیا ہے۔ زیرِ نظر نمبر میں شاہد صاحب کے دلچسپ "پیش لفظ" کے علاوہ ادب کی غرض وغایت پر منشی پریم چند کا وہ عالمانہ خطبہ درج کیا گیا ہے جو انہوں نے ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس منعقدہ ۱۰ اپریل ۱۹۳۶ء میں بمقام لکھنو صدارتی خطبے کی حیثیت سے پڑھا تھا۔ اس کے علاوہ اُردو ادب اور زندگی پر ممتاز حسین صاحب کا مضمون توجہ کے قابل ہے۔ ہم ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے کارکنوں کو خاص طور پر اس مضمون کے اُس حصے کی طرف توجہ دلاتے ہیں جس میں واقعیت پسندی سے بحث کی گئی ہے۔ صاحبِ مضمون کہتے ہیں کہ " *Realism* " کا مفہوم اگر زندگی کے متنوع پہلوؤں کی تصویر کشی ہے تو ظاہر ہے کہ کسی سنجیدہ آدمی کو اُس کے خلاف ایک لفظ کہنے کی بھی گنجائش نہیں بلکہ ہم نے تمہید میں اس نظریہ کی تائید کی ہے اور اس مضمون میں اسی حقیقت پر زور دیا ہے کہ ادب کو زندگی کا آئینہ دار ہونا چاہیئے، مگر اُردو ادب کی بدقسمتی سے ہمارے یہاں یورپ زدہ نوجوان ہندوستانیوں کا ایک ادبی گروہ ایسا بھی پیدا ہو گیا ہے جو چمنستانِ ادب کو اپنی ناآسودہ جنسی آرزوؤں کے "انگاروں" سے خاکستر کرنا چاہتا ہے اور انگریزی لفظ *Realism* کا اس پر پردہ ڈال کر ادب میں اجتہاد کا دعویٰ دار ہے۔"

ہم ترقی ضرور چاہتے ہیں، ہمیں اپنے قدامت پسندوں سے برسرِ پیکار بھی ہونا ہے لیکن اس کا یہ طریقہ نہیں ہونا چاہیئے کہ ہم اپنی سوسائٹی کی بنیادوں کو یکسر اُکھیڑ کر سمجھ لیں کہ بس ہم نے ایک بڑا کام کر دیا اور ترقی کر لی۔

ب

جدید فہرست کارخانہ مفت طلب فرمائیے

اعلیٰ طبقہ کی خواتین سر میں لگانے کیلئے اس کارخانہ کا تیار کردہ تیل استعمال کرتی ہیں۔

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ

طبقۂ نسواں میں اس کارخانہ کا عطرِ عروس نہایت مقبول ہے۔

یہ کارخانہ سنہ ۱۸۳۹ء سے نیک نامی کے ساتھ جاری ہے۔

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۳۶۳

قواعد

۱۔ "ھمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲۔ علمی وادبی، تمدنی واخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پُورے اُتریں درج کئے جاتے ہیں

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ۱/ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جاسکتا ہے۔

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتّر صفحے ماہوار اور سوا نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہئے اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتہً بھیجا جائے گا۔

۸۔ جواب طلب امور کے لئے ۱/ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہئے۔

۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے چھ آنے ششماہی تین روپے (مع محصولڈاک) فی پرچہ ۸/

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتا تحریر کیجیے۔

۱۱۔ خط وکتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافے پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھئے

مینیجر رسالہ ہمایوں

۲۳۔ لارنس روڈ۔ لاہور

Titel & Picture Printed at the Half tone Press, Dav Samaj Road, Lahore.